مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ الفتح - سورۂ الحجرات - سورۂ ق
سورۂ الذاریات - سورۂ الطور - سورۂ النجم

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۂ الفتح - سورۂ الحجرات - سورۂ قٓ
سورۂ الذاریات - سورۂ الطور - سورۂ النجم

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان (سورۃ البقرہ جلد 1)
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25 بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	فروری 2014ء
مطبع	....	باقر یونس پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق ' دل بند و راہ مصطفٰےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۴۷ از۔علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الفتح

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الفتح (آیت 1)

موسمی حالات کے پیشِ نظر کچھ وضاحتیں ______ 37

سورۃ الفتح کی نمایاں خصوصیت کا تذکرہ: مدینہ میں ایک مملکت کا قیام ______ 38

عربوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے خدوخال کے علاوہ قرآنی حکومت کی وضاحت ______ 38

ہجرت سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے دل میں کعبہ کے متعلق پیدا ہونے والی ایک آرزو کہ یہ ایک عالمگیر برادری کا مرکز ہو ______ 39

جس شے کو بھی خدا اپنی کہے تو دراصل اس پر پوری نوعِ انسانی کا حق ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک کا ______ 40

قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر برادری کی تشکیل کا مرکز اور مثال سے اس کی تشریح ______ 40

کعبہ کی حیثیت کو قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کی طرف مرکوز کرنا ہے جیسے کمونسٹ کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے ______ 41

نظامِ صلوٰۃ کی معنوی اور مرکزی محسوس شکل وصورت ______ 41

کعبہ کے سلسلہ میں دین کے پیش کردہ تصور سے ہٹ کر مذہب کے پیدا کردہ تصورات کا نتیجہ ______ 42

مسلمانانِ ملت کی منزلِ منتہا کی عملی شکل اور اُس کی مثال ______ 42

کعبہ کی طرف بار بار نبی اکرم ﷺ کی اٹھنے والی نگاہوں کے سلسلہ میں ارشادِ خداوندی ______ 43

توحید کے بلند ترین نصب العین کی خاطر کعبے سے بلند ہونے والی اذان کو عملی شکل دینا ہے: خدا کا وعدہ ______ 43

قبل از اسلام کعبہ کی کیفیت اور ہجرت کے 6 سال بعد آپ ﷺ کے خواب کا ذکر ______ 44

نبی اکرم ﷺ کا چودہ سو کے قریب صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرے کے سفر کی روداد ______ 44

قرآنِ حکیم کے نزدیک مسلمان ہونے کے لیے ایک معاہدے کا پابند ہونا ضروری ہوتا ہے ______ 46

حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان کی روداد ______ 46

بیعتِ رضوان کے دوران ہر دو فریقین کے مابین طے پائی جانے والی شرائط اور ان کا تجزیہ ______ 47

صلح کے دوران حضرت عمرؓ کی طرف سے کیے گئے اعتراضات' حقیقت کے آئینہ میں ______ 48

صلح نامے کے برعکس بخاری شریف میں تو آپ ﷺ

کے عمرہ کرنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے: یہ بھی ہے اور وہ بھی ____ 49
مدینہ منورہ میں قرآنی معاشرے کی بنا پر مرتب ہونے
والے نتائج کے نقوش ____ 50
آٹھ ہجری میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دس ہزار فوج کا لشکرِ جرار:
کامیابیوں کے دروازے کھل گئے ____ 51

دوسرا باب: **سورة الفتح** (آیات 1 تا 5) (مسلسل)

سابقہ درس کی تجدیدِ یادداشت ____ 53
مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا کے ساتھ کیے جانے
والے معاہدہ کی نوعیت اور معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط ____ 55
صلح حدیبیہ کے بعد فتحِ مبین کے سلسلہ میں
کامرانیوں کا سلسلۂ دراز ____ 56
سیرت النبیؐ کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم
کی کیفیت: یاللعجب!! ____ 57
لفظ ذنب کا لغوی اور قرآنی مفہوم ____ 57
نبی اکرم ﷺ پر لگائے جانے والے الزامات اور اُن کی حقیقت 57
کفار کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے
اہلِ خانہ کو دی گئی اذیت ناکیوں کی کیفیت اور دعوے ____ 58
محسوسات کی شکل میں نبوت کی دعوت کا ماحصل اور
قبیلہ عامر کا بوڑھا سردار ____ 58
قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کے کردار، آپ ﷺ کی
شفقت اور صبر و استقلال کے بارے میں اعتراضات ____ 59
قرآنی تعلیم کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے پروگرام کا
عملی طریق اور مخالفین کے اعتراضات ____ 60
نبی اکرم ﷺ کا عثمان ابن طلحہ شیبی کے ساتھ کعبے کی زیارت کا
اور اس کی کنجیوں کا معاملہ اور الزامات کا دُھلنا ____ 60
فتحِ مبین کے بعد آپ ﷺ پر لگائے گئے تمام الزامات ختم ہوگئے 61
فتحِ مبین کے بعد مکے کے رؤسا کی کیفیت: یہودیوں کا انجام _ 61
فتح کے موقعہ پر کعبے کی کلید کے سلسلہ میں شیبانی سے کیا جانے
والا سلوک اور عظمتِ رسول ﷺ ____ 62
شمشیر کی فتح اور قلوب کی فتح میں فرق ____ 62
نبی اکرم ﷺ نے نبوت کے تیئیس سال معرکوں کے
دوران کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا ____ 63
انسانی زندگی کے لیے سب سے بڑی نعمت صحیح منزل
کی طرف راہنمائی ہے ____ 63
صلح حدیبیہ کے بعد فتحِ مبین میں نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ
پر بیعت کا بھی کافی دخل ہے ____ 64
فتح کے دوران سماوات کے جنود کا مفہوم ____ 64
قرآنِ حکیم نے قدم قدم پر انسان کو عقل وفکر سے کام لینے
کی تاکید کی ہے ____ 65
قرآنِ حکیم انسانی عقل کو جلا تو بخشتا ہے لیکن اُسے
ماؤف نہیں کرتا: اب ساری دنیا ایک جہنم ہے ____ 66
حضرت عمرؓ کے دَورِ خلافت میں فتوحات کی نوعیت اور ثمرات _ 66
انسانی زندگی میں تدبیری غلطیوں کا 'نسیان کی تلافی کا'
ممکن بنانے کا فارمولا ____ 67
نجات کا مذاہب عالم میں مفہوم ____ 68
قرآنِ حکیم انسانی زندگی کو فوز کی منزل سے متعارف کراتا ہے 68

تیسرا باب: سورۃ الفتح (آیات 6 تا 10)

مومنین، منافقین اور مشرکین کی خصوصیات ______ 69
تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں ''معرکۂ دین ووطن''
کی روشنی میں تحریکِ طلوعِ اسلام کا کردار ______ 70
پاکستان میں اسلامی نظام کی جمہوریت کے نفاذ کے خدوخال
کا تجزیہ اور خودساختہ مذہب کے استعمال کا طریق ______ 71
قرآنِ حکیم کی پکار یہ ہے کہ کیا قرآنِ حکیم تمہارے لیے کافی ہے!
مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں ______ 73
قرآنی قوانین کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے
قانون کو ملانا شرکِ عظیم ہے ______ 75
ہمارے ہاں قرآنی قوانین کے ساتھ انسانوں کے بنائے
ہوئے قوانین کو شامل کرنے کی ایک دو مثالیں: رجم اور وصیت 76
مسلم کی حدیث کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے
قرآن کریم کے سوا کچھ نہ لکھو مگر یہ ظن السوء میں ہیں ______ 77
ارض وسما کو وجود میں لانے کا مقصد ہر انسان کے ہر عمل
کی نگہبانی کرنا ہے ______ 78
سائیکولوجسٹ کے مقابلے میں فلسفہ کی حیثیت
صرف ذہنی عیاشی کی ہے ______ 78
مذہب کی دنیا میں اُمت کا کوئی تصور نہیں ہوتا مگر اسلامی نظام
میں سربراہِ مرکز کی ذمہ داری احکام خداوندی کا نفاذ ہے ______ 79
لفظ سبح اور تسبیح کا لغوی اور قرآنی مفہوم اور قرآنی نظام کی
سنٹرل اتھارٹی کی وضاحت ______ 80
خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد اس مرکز کی اطاعت ہے
جو قرآنی نظام کو متشکل کرتا ہے اور تصوف کی بیعت! ______ 81
تصوف کی بیعت کے برعکس نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر کی
جانے والی بیعت کی نوعیت اور اس کا نتیجہ ______ 82
نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا دراصل جان ومال کا
خدا کے ہاں فروخت کرنا ہے ______ 83
میدانِ بدر میں ہاتھ نبی اکرم ﷺ کا لیکن ذمہ داری خدا کی ______ 84

چوتھا باب: سورۃ الفتح (آیت 11 تا 17)

حضور ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی ______ 85
قرآنِ حکیم کی تعلیم ایک آئینہ ہے: اعراب کی مثال کہ
یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ______ 86
آج کرۂ ارض پر کہیں بھی اسلامی مملکت نہیں، یہاں تو پیدائش
کے اعتبار سے تصورِ قومیت کا ہے ______ 87
1953ء میں فسادات پنجاب کے موقعہ پر منیر کمیٹی میں
علمائے کرام سے مسلمان کی تعریف کے متعلق کیا گیا سوال ______ 87
دل کی گہرائیوں میں ایمان نہ اترنے کا نتیجہ نیز حدیبیہ
کے واقعہ کا ذکر ______ 88
دل اور زبان کی ہم آہنگی کی اہمیت اور منافقت ______ 89
دنیائے سیاست کی بنیادی کیفیت اور خدا کے قانون کے ذرائع 90
مملکتِ اسلامیہ کے لیے مختلف ذرائع کی اہمیت ______ 91
حدِ بشریت انسانی عقل وشعور اور فہم وفراست کی عظمت
کا ذکر اور منافقین کے لیے انتباہ ______ 91
قرآنی اصولوں کی راہنمائی ہر انسان کے لیے سدا بہار
خصوصیات کی حامل ہے پھر حیلہ سازی کیوں؟ ______ 92

لفظ مغفرت اور مَنْ یَّشَآءُ کی بحث اور کتاب التقدیر ____ 94
غلطی کے ازالے کا طریق حسنات کے عمل میں پنہاں ہے:
برائیوں اور اچھائیوں کا پلڑا ____ 95
جنت کا معاملہ ہو یا دوزخ کا' یہ انسانی اعمال پر منحصر ہے ____ 95
قرآنی آیات کے آخر میں مختلف صفاتِ خداوندی کو
پیش کرنے کی وضاحت اور مصلحت ____ 96
قانونِ مکافاتِ عمل کے غیر متبدل اصول کی وضاحت
اور اس کا طریقِ کار ____ 96
انسان کی نفسیاتی کیفیت اور دلوں کا حال ____ 97
غیر متبدل اصول وہی ہوسکتا ہے جس میں جذبات
کو دخل نہ ہو اور توبہ کے لیے شرط ____ 98
یہودیوں کے ساتھ خیبر کی آخری جنگ جو نہایت ہی نتیجہ
خیز ثابت ہوئی ____ 98
انسان کا ہر وہ عمل جو جذبۂ صادقہ کے تحت سرانجام پائے
وہ ہمیشہ سکونِ قلب سے معمور ہوتا ہے ____ 99
مکافاتِ عمل کے نتیجہ میں ہم جیسے مسلمان اپنی سلطنت تک
کے بھی وارث نہیں رہتے ____ 99

پانچواں باب: **سورۃ الفتح** (آیت 18 تا 26)

تجدیدِ یادداشت ____ 101
مسلمان ہونے کے لیے بنیادی شرط اور بیعت کے
سلسلہ میں تجدیدِ عہد کا مرحلہ ____ 103
رضی اللہ کا مروجہ اور قرآنی مفہوم ____ 104
صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآنِ حکیم کی شہادت مگر یہ کہا گیا کہ
یہ آپس میں دو پارٹیاں تھیں ____ 104
قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے مدارج کی وضاحت _ 105
صحابہ کرامؓ کو ایمان کی پختگی نے سکونِ قلب سے مالا مال کر دیا _ 107
نبی اکرم ﷺ کی سرپرستی میں مکے اور مدینے کی سرزمین
پر برپا ہونے والا انقلاب اپنی مثال آپ ہے ____ 107
وادیٔ غیر ذی زرع میں مالِ غنیمت کی اہمیت اور
اس میں کی گئی اصلاحات ____ 108
ایران کی فتوحات کے موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا جانے والا
خط اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ کو خراجِ تحسین 109
قرآنی حکومت کا اقتدار خدا تعالیٰ کی دو صفات عزیز
اور حکیم کا ہی مظہر ہے ____ 109
جہاد کا جذبۂ محرکہ دوسروں کو مغلوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ
خوف و حزن سے پاک معاشرے کی تشکیل ہوتا ہے ____ 110
صراطِ مستقیم پر نہ چلنے کا نتیجہ بنی اسرائیل جیسی مغلوب قوم
کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ____ 111
جماعت مومنین کی کامیابی کے محسوس نتائج کی نوعیت
اور خدا کے غیر متبدل قوانین ____ 111
قرآنِ حکیم میں کلمت اللہ اور سنۃ اللہ کا مفہوم ____ 113
مظلومیت کے سلسلہ میں جہادِ اسلامی کی نوعیت کہ اللہ تم
سب کے کاروبار پر نگاہ رکھتا ہے ____ 113
بیت الحرام کی تعظیم و تکریم کے باوجود قریش نے
مخالفت کی انتہا کر دی ____ 114
حج کے موقع پر سامانِ خورد و نوش کے انتظامی امور کی وضاحت 114

مکے پر چڑھائی کرنے سے روکنے کی بنیادی وجہ ______ 115

ایمان لانے کے بعد تربیت کے مراحل سے گزرنے کی اہمیت 116

چھٹا باب: **سورۃ الفتح** (آیت 27 تا اختتام)

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا صحیح طریق نیز روایات کے ______

مطابق نبی اکرم ﷺ کے خواب کی تفسیری نوعیت ______ 119

ہمارے ہاں ان شاء اللہ کے الفاظ کے استعمال کی نوعیت

اور خواب کے لیے تاریخ کا تضاد ________ 121

قرآنِ حکیم کی روشنی میں دین کی منزل تک پہنچنے کے لیے

تاریخ کتب کی تطہیر لازم ہے __________ 122

فتح مکہ نے مجاہدین کے لیے کامیابیوں کے پھاٹک

کھول دیئے نیز کلمت اللہ اور سنت اللہ کا مفہوم ______ 122

کلمات اللہ کے ہوتے ہوئے صدیوں سے ہماری زبوں

حالی کا علاج: نظام بطورِ دین نہیں ہے ________ 123

قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ ہے دین کا عطا کردہ نظامِ حیات

دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا: اس کی مثال ______ 124

قرآنی معاشرے میں نظامِ خداوندی کی ایک بنیادی خصوصیت 125

قرآن نظام کے ثمر بار ہونے کی بنیادی شرط __________ 126

نبی اکرم ﷺ کے دَور میں قرآن کے نظام کے نفاذ کے

تدریجی مراحل کی نوعیت ________________ 127

قرآنی لفظ فضل اور رضوان کا حقیقی مفہوم __________ 128

ماتھے پر محراب کا مفہوم ایک عظیم نشاندہی کا ترجمان ہے ____ 128

نفسیاتی طور پر اطمینان اور خود فریبی میں بنیادی فرق ہوتا ہے:

انجیل مارکس میں نبی اکرم ﷺ کی علامات __________ 129

قرآنی معاشرے کے قیام کی ابتدائی شکل وصورت اور اس

کے ثمرات کی تصویر کشی ________________ 130

سورۃ الفتح کی آیت 29 کا وہ مفہوم جو ''مفہوم القرآن''

میں پیش کیا گیا ہے __________________ 131

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الحجرٰت

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الحجرٰت (آیات 1 تا 8)

دین مذہب نہیں، اس کا قیام ہمیشہ اپنی مملکت کا
متقاضی ہوتا ہے ______ 135
اسلامی مملکت کی بنیاد سیرت و کردار کی محکم بنیادوں پر استوار
ہوتی ہے اور یہی نبی اکرم ﷺ نے کیا ______ 135
ظہورِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کی ذہنی تمدنی اور علمی سوچ _ 135
فتح مکہ کے بعد شورائیت کا نظام قائم کیا، آداب و قوانین
سکھائے اور دنیائے عرب کے علاوہ ایران و روما کی
تہذیب و تمدن تک بدل دی ______ 136
اللہ اور رسول کی قرآنی اصطلاح کے برعکس اب اللہ اور رسول
کے متعلق مذہب کی دنیا میں ایک الگ تصور پیش کیا جاتا ہے 137
حدیثوں کے مختلف مجموعوں میں اختلافات کی انمٹ نوعیت 137
اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم اسلامی مرکزِ ملت ہے __ 138
قرآنِ حکیم میں نہ تو قانون کا لفظ ہے اور نہ ہی حکومت کا:
قرآن کریم نے مرکزِ ملت کی اصطلاح استعمال کی ہے
کہ فیصلہ اسی کا چلے گا ______ 139
قرآنِ حکیم کے نزدیک مجلس کے آداب اور ان کی
اہمیت اور ہمارے ہاں کی تصویر کشی ______ 140
وحی کی روشنی میں معاشرتی آداب کی ایک جھلک اور
ہماری زندگی کے معمولات کی ایک کہانی ______ 142
معاشرتی روابط کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان ______ 144
انسانی ذمہ داریوں کی اہمیت کے معیار کا تعین ______ 144
امورِ مملکت کے انتظامی لوازمات نیز رسول اور اُولی الامر
کے الفاظ کی تشریح ______ 145
واقعہ افک کی اصلیت، ہماری گمراہیوں کی کیفیت کا نتیجہ
اور قرآنِ کریم کا زیرِ سماعت ہونے کا تصور ______ 145
تہمت تراشی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی ______ 146
قرآنِ حکیم نے واقعہ افک کے سلسلہ میں صرف ایک
اصول بیان کیا ہے، کسی کا نام نہیں لیا ______ 147
نتائج کے لحاظ سے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی
کا بنیادی فرق ______ 147
ہاتھ سے دین کے چھوٹ جانے کی بنیادی وجہ: ایک ابہام _ 148
رسول ﷺ کی زندگی کے بعد قرآنی نظام کو قائم و دائم رکھنے
کا طریق ______ 148

حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کے فوری بعد حضرت صدیق اکبرؓ
کا بصیرت افروز خطاب ______ 149
ہر کسی نظام کی بقا کا راز ہمیشہ شخصیات کی بجائے اصولوں سے
وابستہ ہوتا ہے ______ 149

دوسرا باب: سورۃ الحجرٰت (آیات 9 تا 13)

فتح مکہ کے بعد قلب و نگاہ کی تطہیر کے سلسلہ میں کیریکٹر
کی بنیادی خصوصیات کی اہمیت کا ذکر ______ 151
نظامِ مملکت کے خدوخال کی ہدایات کے سلسلہ میں ایک
جان کی اہمیت اور صلح میں ایک تیسری پارٹی کا ذکر ______ 152
مروجہ اصطلاحات کو قرآنی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھنا
ضروری ہے نیز کسی قسم کے الجھاؤ کی شکل میں مملکت کا کردار 154
ایران اور عراق کی باہمی جنگ کا ماجرا کہ صلح کرانے کے لیے
یہ ''تم'' نہیں ہو ______ 154
امتِ اسلامیہ کے کردار کے بغیر باقی صرف وعظ رہ جاتا ہے:
ایران اور عراق کی مثال ______ 155
مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ لفظ ''تُو'' کی افادیت سے
محروم ہے اور یہ گُشتوں کے پشتے!! ______ 155
ایران اور عراق کی باہمی جنگ کے سلسلہ میں ہماری
بہانہ سازی ______ 157
صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآنِ حکیم کی شہادت ہمارے سب کے
لیے مقدم ہے مگر فوقیت تاریخ کو ______ 158
تمام مومنین کے باہمی تعلقات ''اخویکم'' کی محکم بنیاد
پر استوار ہوتے ہیں ______ 158
عربی میں مومنوں کے صیغے میں مؤنث اور مذکر دونوں کا
ایک ہی صیغہ ہوتا ہے ______ 159
قرآنِ حکیم کے ہاں جنسیاتی مسئلے کا حل ایک لفظ میں ______ 159
ملتِ اسلامیہ یا اُمتِ مسلمہ کی بنیادی خصوصیت اور لفظ
تمسخر اور مزاح کے درمیان استعمال کی لطافت ______ 160
ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام رکھنے کا انداز، اس
کے عواقب اور کسی بات پہنچنے پر پہلا ردِّعمل ______ 161
بدظنی کی شکل میں پیدا ہونے والے غلط تصورات کا نتیجہ ______ 162
کسی کے معاملے میں ٹوہ میں مبتلا رہنا مناسب نہیں ہوتا ______ 163
بدخواہی یا غیبت انسان کو بزدل اور منافق بنا دیتی ہے، قرآن کریم
نے اصول دیئے اور چھوٹی چھوٹی معاشرتی باتیں بھی کیں ______ 163
تحریکِ پاکستان کی بنیاد ______ 163
پاکستان کے وجود میں آ جانے کے بعد اس کی بنیاد کو
روندا جا رہا ہے ______ 164
انسانیت کو ہندو دھرم کی طرح نسلی بنیاد پر رکھنا سب سے
بڑا جرم ہے یہی نسل پرستی اب پاکستان میں ہے ______ 164
قرآنِ حکیم نے تو نسل پرستی کی بجائے ہمیشہ الناس کو
مخاطب کیا ہے ______ 165
دین کے برعکس مذہب پرستی کے اندر عورت کا مقام ______ 165
قبائلی تصوّر کے متعلق قرآنِ حکیم کی وضاحت ______ 166
ذات برادری کے تصوّر پر قرآنِ حکیم کی قدغن ______ 167
ایک اعتراض کا جواب: لفظ ''جَعَلْنٰکُم'' کا مفہوم ______ 167
خدا کی طرف سے رشتے بنانے کی ایک مثال ______ 168

تیسرا باب: **سورة الحجرٰت** (آیات 14 تا 15)
ایمان کی پہلی شرط جان اور مال بیچنے کی بیعت ہے' صرف مملکت کے سامنے جھکنا نہیں ہے ____ 170
عملی طور پر دل و دماغ کی ہم آہنگی کے بغیر ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا ____ 171
انسان کا ہر عمل اس کے ایمان کا زندہ ثبوت ہوتا ہے ____ 171
قومیت کے لحاظ سے مسلمان ہونے اور ایک مومن ہونے میں بنیادی فرق ہے ____ 172
کسی غیر مسلم کا مسلمان ہونے اور مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے مسلمان میں فرق ____ 172
قرآنِ حکیم تو ہم مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی دعوت دیتا ہے 173
یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرستوں کے علاوہ ایمان لانے والے مسلمانوں کو ایمان لانے کی دعوت ____ 173
قرآن مجید موت کے وقت لائے جانے والے ایمان کو قبول ہی نہیں کرتا ____ 174
سنکھیے یا سگریٹ کے متعلق یہ جان لینا کہ یہ مہلک ہے کافی نہیں ہوتا: TV کے اشتہارات کی مثال ____ 175
کسی بات کو جاننا اور پھر اس کا دل کی گہرائیوں میں اترنا دو علیحدہ علیحدہ کیفیات ہیں ____ 176
حیوان کے لیے کسی بات کا مضر جاننا اس کے لیے قدم قدم پر زندگی بھر عملی طور پر جاننا ہوتا ہے ____ 176
سگریٹ کے سرطان سے بچنے کے لیے اختیار کردہ تدبیریں: بس قانون کی شرط پوری کرنا ہے ____ 176
ہمارے ہاں ملکی سطح پر اسلامائزیشن کا طریق اور قرآنی اسلامی مملکت کا فریضہ ____ 177
اسلامی مملکت کے انتظامی امور کی خاطر لفظ ''فَاَصْلِحُوْا'' کی ترغیب کی افادیت ____ 178
قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کے ختم ہو جانے کا نتیجہ ____ 179
اسلامی نظام کے فیصلے کی خلاف ورزی امر اللہ کی خلاف ورزی ہوگی ____ 179
مرکز کے نہ ہونے کی وجہ سے آج دنیا بھر میں دین کی بجائے مذہب کا احیا ہو رہا ہے ____ 179
خلفشار کے محرکات: دماغ اور دل میں عمل کا محرک کون ہے؟ 180
رسول جس پر وحی نازل ہوتی ہے سب سے پہلے اسی کو اس وحی پر ایمان لانا پڑتا ہے ____ 181
نبوت اور رسالت: میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے قرآن کریم میں فرمان رسول ____ 182
وحی ہمیشہ ہر قسم کے انسانی جذبات سے ماورا ہوتی ہے اور نبی کو بھی حکم ہے کہ اس نے اس کے مطابق کرنا ہے ____ 182
وحی کا مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے تو وہ انسان کو حیوانی سطح سے اونچا لے جاتی ہے ____ 183
انسانی جذبات و خواہشات کو کنٹرول کرنے کے لیے وحی کا کردار اور حیوانوں میں جبلت ____ 183
چوتھا باب: **سورة الحجرٰت** (آیات 16 تا اختتام)
ایمان کے سچا ہونے کا ثبوت انسان کے ذاتی عمل سے وابستہ ہوتا ہے ____ 185

قرآنِ حکیم کا خطاب ہر دَور کے تمام انسانوں کے لیے
باعثِ منفعت ہے ____ 185
انسان کا خدا پر ایمان لانا خدا پر کوئی احسان نہیں ہوتا ____ 186
لفظ من کا لغوی اور قرآنی مفہوم ____ 187
انسانی زندگی کو وحی جیسے عظیم عطیہ کا بغیر کسی مزد و معاوضہ کے
ملنا قدرت کا احسانِ عظیم ہے ____ 187
انسان اور حیوان میں قدر مشترک ____ 188
حیوانی زندگی پر فطرت کا کنٹرول ____ 188
حیوانیت کے مقام سے انسانیت کی منزل کی طرف
انسانی اختیار و ارادہ ____ 189
تنہا عقلِ انسانی کی پیدا کردہ کشمکش کے باعث مغرب کے
پیدا کردہ جہنمی نظام کا نتیجہ ____ 190
قوموں کے ہاتھوں قوموں کی پٹائی اور پھر اجتماعی
چیخ و پکار کی کیفیت ____ 190
عقلِ انسانی کا جوہر بذاتِ خود نہ نیک ہے، نہ بد ____ 190
علامہ اقبالؒ کے نزدیک عقل کی کیفیت: ہر انسانی عقل اپنا
ہی فائدہ پیشِ نظر رکھتی ہے ____ 191
قرآنِ حکیم اپنے ہاں عقلِ خود بیں کی بجائے عقلِ
جہاں بیں کا معیار قائم کرتا ہے ____ 192
وحی کی طرف سے میسر آنے والی روشنی انسانی جذبات
کی رنگینیوں سے بہت بلند ہوتی ہے ____ 193
وحی کے عمل سے ہٹ کر انسان کی ہیئت کا ذکر ____ 194
ذاتِ خداوندی انسان کو اس کے اختیار و ارادہ کی نعمت
سے محروم نہیں کرتی ____ 194
صحیح راستے کا تعین وحی کی راہنمائی ہی کر سکتی ہے
جو نوعِ انسانی کو محیط کرتی ہے مگر ہے یہ اس کے اپنے اوپر ____ 195
ملتِ اسلامیہ کی سوختہ بختی ____ 195
ہم مسلمان دوہرے جرم کے مجرم ہیں ____ 196
قانونِ مکافاتِ عمل کا ترازو ہر آن انسانی عمل کو ساتھ
ساتھ تولتا رہتا ہے مگر یہ ہے عقول کی جنگ انسانوں میں ____ 197
انسانیت کا آخری سہارا ____ 197

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ قٓ

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ قٓ (آیات 1 تا 8)

حروفِ مقطعات کے تحت لفظ ق کے مفہوم کی وضاحت ___ 200
قرآنِ حکیم کی عظمت قرآنِ حکیم کے آئینہ میں ______ 200
قرآنِ کریم کا بہت بڑا اعجاز توہم پرستی اور شخصیت پرستی کے تصور کر مٹا دینا ہے ______ 201
دنیا بھر کی عظیم تر شخصیتِ انسانیت کے امام نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ قبل از نبوت بھی ______ 201
نبی کی ذات کے علاوہ وحی کو آن میرٹ لو ______ 202
نبی اکرم ﷺ نبوت کے عظیم ترین مقام پر فائز اور ہم صاحب کرامات! ______ 202
نبی اکرم ﷺ کی طرف سے پیش کردہ خدا کی کتاب ہی معجزہ ہے مگر ہم ہیں صاحبِ کرامات یا مداری کے پیچھے ___ 203
نزولِ قرآن کریم کا مرکزی پروگرام عقلِ انسانی کی نشوونما کے پیشِ نظر اس کی بصیرت کو پروان چڑھانا ہے ______ 203
ہمارے ہاں عقل و بصیرت سے ہٹ کر معجزوں اور کراماتوں پر لکھی جانے والی ہزاروں کتب کے ڈھیر ____ 204
ملامتیہ فرقے کی بنیاد کی وجہ اور حضور اکرم ﷺ کا منشور ___ 204
قرآنِ حکیم کی تعلیم، جو عقل کو جلا بخشتی ہے، کو ماؤف کرنے کی سازش ______ 205
اقبالؒ کے الفاظ میں مروجہ اسلام وہی اسلام ہے جس کا حرکاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے ______ 205
مذہب کے نام پر عجمی اسلام کی جادوگری کی سعی و کاوش ____ 206
عورت کا آدھا ووٹ، آدھی گواہی، اور آدھے خون بہا کے لیے دنیا بھر میں اس کی تبلیغ اور حضرت صاحب! ______ 206
کچھ ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص سوچنے نہ پائے ______ 207
حضور ﷺ کی ایک بات، صرف ایک لفظ کی ایک بات اور وہ یہ کہ ”سوچا کرو“ ______ 207
مذہب کی دنیا میں اپنے لیے الگ لباس اور الگ تمدنی زندگی کیوں؟ دیکھیے مِّنْهُم کا قرآنی مفہوم ______ 207
انسانی جسم کے اندر ”میں“ اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے اور اُسی سے مواخذہ ہے ______ 208
دین کی بنیاد انسانی عمل اور اس کے اختیار و ارادے کی راہنمائی پر موقوف ہے مگر اس پر یقین نہیں ہے ______ 209
انسانی جسم کے اندر ”میں“ کی شکل میں پایا جانے والا

جوہرِ حقیقی موت کے ذائقے سے ناآشنا رہتا ہے ______ 210
مردہ جسم کے بعد انسانی ''میں'' کے متعلق چودہ سو سال
پیشتر وحی کا بیان اور آج سیکولرازم کی تعریف ______ 210
موت کے بعد مردہ انسانی جسم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی
وضاحت اور لفظ تخفُّص کا مفہوم اور نتائج اعمال ______ 211
ایمان بالآخرت کی نوعیت اور اس پر ایمان لانے کا نتیجہ ___ 212
قلب ونگاہ کی تبدیلی اپنی ذات پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی
ہے: اُس خیمے کی بچی کی مثال ______ 212
تعمیری سوچ کے لیے خلش کا پیدا ہونا اوّلین قدم ہوتا ہے
اور مکے میں تعلیمی کیفیت ______ 213
کائنات کے محیر العقول سلسلہ کو قانون کی زنجیروں میں
جکڑنے والی ہستی انسان کو قدم قدم پر غور وفکر کی دعوت
دیتی ہے مگر نظر نہیں آتی ______ 213
نظامِ شمسی میں یہ کائناتی کرّے دیکھنے میں کچھ ہیں لیکن
حقیقت میں کچھ ______ 214
یہ وہ کائناتی قوتیں (ملائکہ) ہیں جو نظر نہیں آسکتیں ____ 215

دوسرا باب: سورۃ قٓ (آیات 9 تا 25)

کسی شخص کو فوق البشر تسلیم کرنا شخصیت پرستی سے کم نہیں
اور حیاتِ آخرت پر ایمان ایک انقلاب ______ 217
ایمان کی قوت تو انسان میں ایک اندرونی انقلاب برپا کر دیتی ہے 217
موجودہ زندگی میں ایمان کی بنیاد پر پیدا ہونے والے انقلاب
کی نوعیت اور ہمارے ہاں کا قانون ______ 218
خدا تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اُخروی زندگی پر قرآنِ حکیم
کی راہنمائی ______ 219
قرآنِ حکیم کا عملی زندگی میں خدا پر یا قیامت پر ایمان
لانے کا تقاضا کیوں؟ ______ 219
یہودیوں کا آخرت میں جنت کا حصول صرف بنی اسرائیل
کے لیے ہی مختص ہے ______ 219
جنت کے حصول کے لیے نصاریٰ کا حضرت مسیح کے خوں بہا
پر ایمان لانا ضروری ہوگا: عیسائیت کا قول ______ 220
آواگون کا عقیدہ تو ہندو دھرم کا بنیادی تصور ہے:
بتیس کروڑ چکر ہیں ______ 220
قرآنِ حکیم میں ایمان بالآخرت کے معنی اور منافقت کی
ایک جیتی جاگتی عملی زندگی کا نقشہ ______ 221
حیاتِ آخرت کا قرآنی مفہوم جنتی معاشرے کی نوید ہے
اور دین کا استحکام بھی ______ 222
دنیا بھر کی تعزیرات ایک طرف اور حیاتِ آخرت پر ایمان
دوسری طرف، پلڑا دوسری طرف ہی جھکے گا ______ 222
معاشرے کی تبدیلی کا دار و مدار قلب ونگاہ کی تبدیلی کا رہینِ منت
ہوتا ہے اور ہم ڈور کو سلجھا رہے ہیں، سرا ملتا نہیں ______ 223
مومنانہ فراست اور ایمان کی پختگی نظامِ کائنات پر غور وفکر
کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی ______ 223
موت کا فرشتہ جسمِ انسانی کو چھوتا ہے مگر اس کے مرکز سے ہمیشہ
دُور رہتا ہے: بیج کی ایک مثال اور اس کے تحفظ کی نوعیت _ 224
انسان کے ساتھ اس کی اپنی ذات کے باہمی تعلق کی نوعیت
کے علاوہ ذات کی قدر و قیمت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم

کی تاریخی محسوس مثال ____ 226
یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی مخالفت کی نوعیت کا تذکرہ _ 227
خدا تعالیٰ کا تعارف خود خدا تعالیٰ کے ہاں سے ____ 228
انسان کا تو ہر عمل اس کے نفس پر ایک نشان کندہ کرتا ہے:
یہ ہے نفس کے اندر محفوظ ریکارڈ ____ 229
خدا تعالیٰ کے حضور انسان کی حاضری دراصل نفس انسانی کی
حاضری ہوگی: سکراتِ موت کے بالحق ہونے کی تشریح __ 229
قرآنِ حکیم کے آخری دو پاروں میں نفخ فی الصور کی قرآنی
وضاحت: پیکروں میں از سرِ نو توانائی کا بھرنا ____ 230
قرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انداز بڑا ابلغ ہوتا ہے'
دھاندلی نہیں ہوتا ____ 231
میدانِ حشر میں عدالت خداوندی کی تصویر کشی کا ایک
محاکاتی انداز مگر اس کی داد سائیکالوجسٹ دیں گے ____ 231
قرین کا کردار جحیم اور دولت کو اپنے لیے ہی سمیٹنے کا انجام __ 232

تیسرا باب: سورۃ قٓ (آیات 26 تا 35)

گزشتہ سے پیوستہ نفسِ مضمون ____ 234
زمین زیست کا ذریعہ پیدائش ہے اور اسلامی مملکت کا
قرآنی تصور ____ 235
سورۃ الماعون کا قرآنی مفہوم اور صلوٰۃ کا ذکر ____ 236
مال جمع کرنے کی وعید اور جہنم میں اس کا ورود ____ 238
یہ بادشاہوں کی فقہ ہے ____ 239
تثلیث' مولویت اور تراشیدہ خدا ____ 239
الٰہ' انسان' ملکیت ارض اور معاش کا مسئلہ ____ 240
جنت اور جہنم صرف اگلی دنیا میں' جنت و جہنم میں مکالمے اور
قصہ آدم' ذمہ داری کا احساس ____ 242
غیر متبدل قانون خداوندی اور قانون اور حکم کی تعریف
اور تکمیلِ دین ____ 244
ہم بندوں پہ ظلم نہیں کرتے مگر اعمال کا بدلہ ٹھیک ٹھیک
دیتے ہیں ____ 246
قانون کی محکمیت ____ 246
جہنم کیا ہے؟ ____ 247
جنت کیا ہے؟ ایمان بالغیب کیا ہے؟ اس میں کیا ملے گا؟ __ 247

چوتھا باب: سورۃ قٓ (آیات 36 تا اختتام)

مقامِ مومن کے سلسلہ میں لفظ مَا یَشَآءُ کی اہمیت ____ 250
انسانی خواہشات کے مقابلے میں مشیتِ خداوندی ____ 251
قرآنِ حکیم کے علاوہ دنیا بھر کے لٹریچر میں مومن کی خدا کے
قالب میں ڈھلنے کی یہ بیان کردہ صفات کہیں نہیں ملتیں __ 252
قرآنِ حکیم نے افراد کے بجائے ہمیشہ اقوام اور معاشرے
کی بات کی ہے ____ 252
انسانی معاشرے کی اہمیت کے پیشِ نظر قوموں کی
تباہی کو بیان کرنے کا مقصد ____ 253
غلط نظام کا انجام تباہی ہے خواہ وہ قوم سپر ہو یا لوئر'
اعلیٰ ہو یا پست ____ 254
تاریخی حقائق کو بیان کرنے کا مقصد دراصل عقلِ انسانی
کو غور و فکر کی دعوت دینا ہے ____ 254
خدا تعالیٰ کی طرف سے کائنات کی پیدا کردہ وسعتوں کی

کیفیت اور انسانی غلط سوچ کا ذکر ____ 255
کائنات کی تخلیق اور گردشِ افلاک کا انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی
کا باہمی ربط ____ 256
کائنات کی وسعت میں ہر آن اضافہ ____ 257
خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو استقامت کی تلقین
اور تسکین ____ 257
سَبِّحْ بِحَمْدِ کا مفہوم، نماز کے اوقات کے تعین کا معاملہ،
قرآن کریم اور فرقہ بندی ____ 258
نمازوں کے سلسلہ میں فرقہ اہلِ قرآن کا فتویٰ اور پرویزؒ صاحب
کی طرف سے جاری کردہ پمفلٹ ____ 259
قرآنِ حکیم میں شروع سے آخر تک کوئی ایک بھی اختلافی
بات نہیں پھر اہل قرآن کا یہ دعویٰ کیوں؟ ____ 259
نمازوں کے سلسلہ میں اپنے متعلق علامہ پرویزؒ کی
وضاحت اور سَبِّحْ کا مفہوم ____ 260
کفار کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی بنیادی
وجہ قرآنی نظام کا نفاذ ہی تھا ____ 261
سپر پاورز کی طرف سے آج دنیا بھر میں مسلمانوں کی
مخالفت کی اصل وجہ اور وجہ جنگ بدر ____ 261
ظہورِ نتائج کا وقت صرف آخرت پر ہی کیوں؟
یہ ہمارا قانون فیصلہ کرتا ہے ____ 262
جنگِ بدر کی شکست کے بعد کفار کی کیفیت اور خدا کی تسلیاں 263
جہاد کا مقصد قرآنی نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنا نہیں ہوتا
بلکہ قرآنی نظام کا تحفظ ہوتا ہے ____ 264
قرآنِ حکیم کا سب سے بڑا معجزہ عقلِ انسانی کو جلا بخشنا ہے،
اِسے ماؤف کرنا نہیں ہے ____ 264
دوسروں کو مسلمان بنانے کے سلسلہ میں سنتِ رسول ﷺ _ 265
نبی اکرم ﷺ کی سب سے بڑی سنت کہ میں تم سے
کوئی معاوضہ نہیں مانگتا صرف ہدیت دیتا ہوں ____ 265
ہمارے ہاں دوسروں کو صحیح راستے پر لانے کا طریق
جبر ہے جو قرآن کریم کا نہیں ہے ____ 266
ہمارے ہاں مرتد کی سزا قتل تجویز کی جاتی ہے ____ 266
دل کی رضامندی کے بغیر مسلمان رہنا تو منافق کہلاتا ہے،
جنگ کے قیدیوں کی مثال ____ 267
جنگ کے قیدیوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی فقہ کا
خلاف قرآن کریم قانون ____ 267

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الذٰریٰت

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: **سورۃ الذٰریٰت** (آیات 1 تا 19 نامکمل)

قرآنِ حکیم کے دل کش انداز میں بمعہ سیاق وسباق کے
کائنات کے چاروں گوشوں کی وضاحت ________ 270

قرآنی انقلاب کے برپا ہونے پر ظہورِ نتائج کے محسوس خدوخال 271

لفظ ذٰریٰت کا مفہوم: Broadcasting (نشرواشاعت) 272

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نورانی انقلاب کا پہلا مرحلہ زمِ
روی سے نشرواشاعت پر منحصر ہوتا ہے ________ 272

اسلام کی تحریک، نمودِ سحر کی طرح، معاشرے میں سورج کی
شعاعوں کی مانند الدین کو لیے ہوئے جلوہ بار ہوتی ہے ___ 273

حضور ﷺ کی زندگی میں برپا ہونے والے انقلاب کی تفصیل 274

عربی زبان کی جامعیت کے سلسلہ میں علامہ غلام احمد پرویزؒ
کا ارشاد ________ 275

قرآنی لفظ ''حبک'' کا لغوی مفہوم ________ 276

14 سوسال پیشتر قرآنِ حکیم کی طرف سے کائنات کی
پستیوں اور بلندیوں پر غور وفکر کرنے کی دعوت ________ 277

خدائے علیم کی طرف سے کائناتی کنٹرول کی کیفیت مگر
تمہارے خیالات بھی الگ الگ اور منزلیں بھی الگ الگ ___ 277

آج کرۂ ارض پر ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی کیفیت
اور اس کی وجہ جواز ________ 278

خدا کا قانون انسان کے ہر عمل کے نتائج کو ساتھ کے ساتھ
مرتب کرتا چلا جاتا ہے مگر یہ جھگڑتے ہیں ________ 279

آج کے اخبارات مناظروں کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں:
کوئی سند نہیں، کوئی دلیل نہیں ________ 279

لفظ ''ساھون فی اور عن'' کے مفاہیم کی وضاحت ________ 280

انسانوں کے خودساختہ نظام کے سوختہ جگر نتائج ہمیشہ
ظہور پذیر ہو کر رہتے ہیں ________ 280

حقائق پر مبنی نظام کے خوش گوار ثمرات کی نوید ________ 281

مومنین کی جماعت کی تشکیل اور نبی اکرمؐ کے ذمے پروگرام _ 282

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کی جماعت کی رفاقت کی
اہمیت اور پروگرام کی ذمہ داریاں ________ 283

ہمارے ہاں کی کتبِ تفاسیر میں بیان کردہ روایات کی نوعیت
اور عبادت کا مفہوم ________ 283

مذہب کے پیش کردہ تصورات کے برعکس دین کو عملی طور
پر مستحکم کرنے میں بنیادی فرق اور مخالف سلطنتیں ________ 284

وحی کی روشنی میں اسلامی مملکت کے محسوس نتائج کے
سلسلہ میں ارشادِ نبوی ﷺ ____ 284
لفظ اعتکاف کا لغوی مفہوم اور ہمارا طرزِ فکر ____ 285
قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے ہاں لفظ استغفر اللہ کا استعمال 286
جشنِ نزولِ قرآن کریم کا تہوار جس کو منانے کا حکم خدا نے
دے رکھا ہے ____ 286
دوسرا باب: **سورۃ الذٰریٰت** (آیات 19 مسلسل تا 23)
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں عبوری دور کے احکام ____ 288
قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کے خدوخال کی
غلط توضیح وتشریح ____ 288
قدرت ذرائع رزق تو پیدا کرتی ہے لیکن انسانوں میں
انہیں خود تقسیم نہیں کرتی ____ 290
قرآنی نظامِ حیات میں ذرائع رزق ضروریات زیست کے لیے
مملکتِ اسلامیہ کی تحویل میں بطورِ امانت ہوتے ہیں ____ 290
علامہ پرویزؒ کی زندگی بھر کا مشن اور ایک اہم سوال کی
طرف اشارہ ____ 291
نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور میں عرب کی معاشرتی
زندگی کے خدوخال ____ 291
قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لیے نبی اکرم ﷺ کے تدریجی
عمل کا طریق اور حضرت عمرؓ کا دورِ تکمیل ____ 292
قرآنی معاشرے کے ابتدائی احکام منسوخ نہیں ہوتے
صرف معطل ہوتے ہیں جیسے وضو میں پانی اور مسح کی مثال ہے 293
قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی انتہائی منزل ''قل العفو'' ہے
اور اس تک پہنچنے کے لیے عبوری دور کے احکام ____ 294
قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام میں سرمایہ داری نظام
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ____ 294
سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے کے لیے وضعی روایات کا سہارا
نیز حضرت عمرؓ کی نبی اکرم ﷺ کے حضور درخواست کا ذکر ____ 295
زکوٰۃ کا مروجہ خودساختہ تصور اور اس پر عمل پیرائی کا نتیجہ ____ 296
قرآن حکیم نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا مگر ملوکیت میں
پھر اس کا رواج ہوا ____ 297
عباسیوں کے دور میں محلات کے اندر تین تین ہزار لونڈیوں
کا وجود اور آج بھی یہی احکام لا رہے ہیں ____ 297
غلام اور لونڈیوں کے سلسلہ میں مودودیؒ کا فتویٰ، پاکستان کی
پارلیمان میں ایک مولانا کا مطالبہ اور عورت کا مقام ____ 298
قرآنِ حکیم کے عبوری دور کے احکام ہی آخر کار رائج العمل
سمجھے جاتے ہیں پھر پانی کی موجودگی میں مسح کیوں نہیں کیا جاتا 299
خیرات انسان میں احساسِ کمتری کے مرض کو جنم دیتی ہے،
وہ کمائی سے بطورِ حق مانگتے ہیں ____ 300
زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں، اجر محنت کا ہوتا ہے،
طبقاتی تقسیم کا نہیں ____ 301
انسانی جسم کی مشینری نظامِ ربوبیت کی بڑی ٹھوس مثال ہے ____ 302
خدا اپنا ہر وعدہ اپنے دیئے گئے نظام کے تحت پورا کرتا ہے ____ 302
کائنات کا ذرّہ ذرّہ نظامِ ربوبیت کی ایک زندہ شہادت ہے ____ 303

تیسرا باب: سورة الذّٰريٰت (آیات 24 تا 47)

قرآنِ حکیم مکافاتِ عمل کے قانون کی متعین طور پر بار بار
وضاحت پیش کرتا ہے اور جنسی بدنہادی کی بھی ______ 305
حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی باہمی ملاقات کا تذکرہ
اور صاحبِ علم بیٹے کی حضرت ابراہیمؑ کو خوشخبری ______ 306
حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے کی عمر میں اولاد کی
خبر کوئی معجزہ نہ تھا ______ 307
بڑھاپے کی عمر میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اولاد کی بشارت کے
سلسلہ میں آپ کی بیوی کا اسی قسم کا ذکر ______ 308
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضور کچھ فرشتوں کا کھانا کھانے کی روایات کا
ماجرا اور تفسیروں میں کی جانے والی لاحاصل بحثوں کا معیار _ 309
ہم تو ہزار برس سے Out of the Text (نصاب سے ورے)
سوالوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں: ویلی جٹی اُن ویلے 310
دین کے نام پر نونو سال کے کورس کی تیاری کے ماحصل کا نتیجہ 310
65ء کی جنگ میں پاک فوج کی فتح کا راز: ''کھان پین دے
کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے'' ______ 311
نونو سال کے بعد فارغ التحصیل ہونے والوں کے مابین
بحثیں اور مُرسلین کا انتباہ ______ 311
جرائم اور آفاقی آفتوں کا تعلق؛ قومِ لوطؑ کا گھرانہ اور
کھنڈرات بطور سامانِ عبرت ______ 312
قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد ثبوت
کے طور پر حقائق کو سچ ثابت کرنا ہے ______ 313
حضرت موسیٰ علیہ السلام، فرعون کے دربار میں اپنے محکم دلائل کے ساتھ:
یہ جادوگری نہیں تھی ______ 313
جنگِ اُحد میں شکست کی وجوہات اور پھر فتح کی نوید ______ 314
قومِ نوح علیہ السلام کی تباہی کے اسباب اور اس سے محفوظ رہنے
کا طریق ______ 315
قومِ عاد اور قومِ ثمود کے غلط نظامِ حیات کا نتیجہ: قوت کا نشہ ___ 316
دولت اور قوت کے نشہ نے انسان کو اَنا اور انی کے فرق کو
محسوس کرنے سے ہمیشہ محروم رکھا ہے ______ 316
ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا ______ 317
انسانی زندگی کا جوہر خود اعتمادی کی بنیاد پر استطاعت
پیدا کرنے میں مضمر ہے ______ 317
طبقاتی تفریق تو انسان کو انسانیت کے مقام سے
متعارف ہی نہیں ہونے دیتی ______ 318
وحی کی روشنی میں تعمیر کردہ معاشرتی بند قوموں کو سیلاب کی
تباہی سے محفوظ کر دیتا ہے: قرآنِ حکیم کا ایک سنہری اصول ___ 318
قومِ سبا کی تباہی کی وجۂ جواز ______ 319
قومِ مسلم کی عملی تفسیر اور اس کا سدِ باب ______ 320

چوتھا باب: سورة الذّٰريٰت (آیات 48 تا اختتام)

قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم کا نکتۂ ماسکہ اور کائناتی شواہد کو
پیش کرنے کا مقصد ______ 321
کائنات کی تخلیق کے بعد اس پر کنٹرول اور پھر قدم قدم
پر اس کی وسعت کا تذکرہ ______ 322
شہادت کے طور پر اس کائنات کے قانون میں زمین کی نوعیت
اور ہر شے میں زوج کا تصور ______ 323

لفظ زوج کا لغوی مفہوم اور مرورِ زمانہ سے لسان میں
معنی کا فرق ________ 324
عربی زبان پر عباسیوں کے دَور میں ایرانی چھاپ کے
اثرات اور فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ کا قرآنی مفہوم ________ 325
ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کے تراجم نے حقیقی تعلیم کو ہی بدل
کر رکھ دیا ہے ________ 326
جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مخالفت اور عقلِ انسانی کی
فسوں کاری، کرامات اور معجزات ________ 327
نبی اکرم ﷺ پر جادوگری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان
اور ہمارے ہاں کے نظریات ________ 327
قرآنی اقدار کے برعکس تواتر کا تصور آنے والے دَور کے
لیے سند بن جاتا ہے ________ 328
تواتر پرستی کی بنیادی وجہ: قوانینِ خداوندی کی خلاف
ورزی سے فائدہ اُٹھانا ہے ________ 329
مسلمانوں کی حکومتوں میں یزید کی فراہم کردہ ملوکیت کی
بنیاد کا نتیجہ خدا کی کتاب سے دُوری ہے ________ 329
نبی کے نزدیک ہجرت اپنے اندر ایک بلند ترین مقصد لیے
ہوتی ہے: سونا ملی ریت کی مثال ________ 330
نبوت کے پروگرام کا دوسرا مرحلہ: حقائقِ قرآنِ کریم
کو آخری وقت تک پہنچائے چلے جاؤ ________ 330
لفظ عبادت کے ایک غلط مفہوم نے قرآنِ حکیم کی پوری
تعلیم کو ہی بدل دیا ________ 331
لفظ یَعْبُدُوْنِ کا لغوی مفہوم: خدا کی محکومیت اختیار کرنا ________ 332
خدا کی محکومیت کے نظام میں کیا ہے؟ دل و جاں سے جھکنا ________ 333
انسانیت کی منفعت کے پروگرام کے سوا کوئی عمل
ثمر بار نہیں ہوسکتا ________ 333
قوموں کے نشیب و فراز کا دارومدار ان کی اجتماعی زندگی
کے اعمال سے وابستہ ہوتا ہے ________ 335
قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے:
آیات کی ترتیب میں بھی اور سورتوں میں بھی ________ 335

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الطور

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ الطور (آیات 1 تا 16)

ہمارے ہاں کے تراجم اور عربوں میں ''وَ'' کا استعمال ____ 338
قرآنِ کریم کی بلاغت وفصاحت درجۂ کمال پر ہوتی ہے ___ 339
1965ء پاک بھارت کی جنگ: سینے میں میرے درد سوا ہوتا ہے اور بات ہے غیر محسوس صداقتوں کی ____ 340
قرآنِ کریم مجرد حقائق کو تشبیہات کے انداز میں پیش کرتا ہے _ 341
قرآنِ کریم کے متعلق ایک گہری سازش اور پارچمنٹ ____ 342
قرآنِ کریم کی حفاظت کے متعلق بنیادی تصورات اور ہمارے ہاں کی روایتی افسانہ نگاری ____ 343
اسلام سے پہلے کعبہ کی کیفیت مکافاتِ عمل کا عمل دخل ____ 344
تاریخی شواہد پیش کرنے کا قرآنی طریق ____ 345
پھر وہی تراجم اور ہماری تفاسیر کی گنجلک ____ 345
قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کا ایک دوسرا طریق لغوی نہیں بلکہ مجازی بھی ہے ____ 346
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق ____ 347
نار کے اور سحر کے مجازی معنی اور بیان کا ایک انداز ____ 349
قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز اور سحر کی مثال ____ 350
مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں وارن (Warn) کرنا نبی اکرم ﷺ کی ذات تک ہی محدود نہ تھا ____ 350
آج ہم بھی اسی طرح تکذیب کرتے ہیں ____ 351
اپنی اصلاح کی خاطر مہلت کا وقفہ (Respite) ایک غنیمت ہے ____ 352
قانونِ مکافاتِ عمل اور ہمارے ہاں سزا کا تصور ____ 352

دوسرا باب: سورۃ الطور (آیات 17 تا 25)

حضرت عمرؓ کی زبانی تقویٰ کا مفہوم ____ 354
قرآن کریم کے نزدیک سزا کا لفظ ہی صحیح نہیں جنت اور جہنم کا تصور ____ 355
خانہ بدوش عربوں کے ہاں ایران جیسی عظیم سلطنت اور روما کے خزائن' جنت ارضی کی مثال ہیں ____ 357
اُخروی زندگی میں نیک و بد اعمال کے لیے میزان کھڑی کرنے کا مفہوم ____ 358
جہنم کے بعد جنت کے حصول کا تصور صحیح نہیں ____ 358
جنّتی زندگی اور ہمارے ہاں کی طبقاتی زندگی ____ 359
لفظ زوج کی تفصیل قرآن کریم کے آئینہ میں ____ 360

انفرادی زندگی کا تصور تصوف کا پیدا کردہ ہے قرآن کریم کا نہیں 362
جنت میں فرد نہیں جماعت جاتی ہے' افراد جاتے ہیں ____ 362
حُورٍ اور عِینٍ کا مفہوم اور عربی زبان کے مصادر ________ 362
عقل کا ایک اپنا مقام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ____ 363
لفظ حور کے بعد لفظ عین کے معنی اور اس کا مفہوم ________ 365
جنّتی زندگی کے مکینوں کی بنیادی خصوصیات __________ 365
جنت میں ماں باپ کے ساتھ اولاد بھی لیکن ایک شرط
کے ساتھ واجب التکریم انسان ہے ___________ 365
قرآنِ حکیم کے نزدیک خون کے رشتہ کی یا ذریت کی
اہمیت نہیں ہے ________________________ 366
ہر انسان اپنے اپنے اعمال کے عوض رہن رکھا ہوتا ہے ____ 367
جو کچھ تم چاہو گے ملے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ _______ 367
مشروبات کی کیفیت بے تکلف محفل ____________ 368
قرآن کریم کے ہاں غلمان کے معنی اور اُن کا کیریکٹر _____ 369

تیسرا باب: **سورۃ الطور** (آیات 26 تا 38)

آخرت میں ہر قسم کی منافقت اور پرہیزگاری تمام جاننے
والوں کے سامنے عیاں ہو جائے گی اور وہ پہچانتے ہوں گے:
گزشتہ سے پیوستہ وضاحت ________________ 371
اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا تقابلی جائزہ ____________ 372
مومنین کا جذبہ شکرگزاری _______________ 373
جنت کا یہ پھل دنیا میں باہمی چاہت' شفقت اور محبت کا
نتیجہ ہوتا ہے ______________________ 373
انسان کو دنیا میں ہی اعمالِ صالحہ کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی
تو یہ دنیا جنت بن جائے گی ______________ 374
اُخروی جنت کے لیے پہلے دنیا کی جنت کا حصول ضروری ہوگا 374
ہمارے ذہنوں میں نتائج کے بجائے سزا کا تصور ہی پایا جاتا
ہے جو غلط ہے ______________________ 375
ہلاکت کا اثر سنکھیے کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور میزان کا تصور 376
چودہ سو سال پیشتر کے بیان کردہ حقائق' آج کی تحقیق اور
ضابطہ ہدایت کو آواز دینا ________________ 376
انسان کی ہر پکار کا جواب کیسے ملتا ہے؟ ___________ 377
ہم ہر سوال کا جواب تو دیتے لیکن یہ نہیں کہ ہر دعا قبول
کر لیتے ہیں _______________________ 377
ذکر کا قرآنی مفہوم اور ہمارا تصورِ حیات __________ 378
داعیِ حق کو پیش آنے والی مشکلات اور ہمارے ہاں کے
کاہن اور مذہبی پیشوا ____________________ 378
نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کریم کی طرف سے تردید کہ
وہ کاہن ہے اور نفع نقصان کے معیار __________ 379
نفع اور نقصان' جنون اور عقل کے معیار میں فرق ______ 379
اے رسول! تُو کاہن نہیں' پاگل نہیں اور نہ ہی تُو شاعر ہے ____ 380
سروش اور الہام کے علاوہ ہمارے ہاں وجدان کی حقیقت ___ 380
ان ہر دو پروگرام کے نتائج خود بتا دیں گے کہ کون حق پر ہے _ 382
قانونِ فطرت یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی ______ 382
آج کے دور کا سیاسی دعویٰ اور قرآنِ حکیم کی راہنمائی _____ 383
وعظ و نصیحت اور بحث و مباحثہ کی بجائے عمل کا نتیجہ بطور ثبوت
زیادہ مؤثر ہوتا ہے ____________________ 383

آج کفار کی کوشش یہ ہے کہ ''ہونہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں'' ______ 383

رسول اکرم ﷺ کی مخالفت کی اصل وجہ ______ 384

کفار کی ہزار سالہ حجتیں اور قرآنِ حکیم کا ارشاد ______ 385

تخلیقِ کائنات کی مثال اور انسان کی بے بسی ______ 386

وحی اور علمِ انسانی میں فرق ______ 387

چوتھا باب: **سورة الطور** (آیات 38 مسلسل تا اختتام)

یہودیوں کے ہاں پیشین گوئی کرنے والے کو نبی کہا جاتا تھا مگر قرآن کریم نے اسے چیلنج کر دیا: گزشتہ سے پیوستہ ______ 388

عربوں کے ہاں شاعری کا مقام: آسمان کی باتیں جاننا ______ 389

علم کی تعریف اور وحی کا علم ______ 390

وجدانی علم کی کیفیت ______ 390

نوائے سروش کی کوئی دلیل نہیں ہوتی ______ 391

پیشین گوئی کے تمام تصورات قرآنِ حکیم کے علی الرغم ہیں ______ 392

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بجز وحی کے مجھے بھی غیب کا علم نہیں ______ 392

تقدیر کا لکھا یا قسمت کا لکھا خالص ایرانی تصور ہے، قرآن کریم کا نہیں ہے ______ 392

وحی کی روشنی میں مکافاتِ عمل کے نتائج سے آ گاہی اور کہانت کے دعویٰ کا انداز ______ 394

الہام اور سروش کے بالمقابل قرآنِ کریم اپنے دعوے کی تائید پیش کرتا ہے ______ 395

قیاس آرائیاں کرنے والے عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی ______ 396

عیسائیوں کے ہاں فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانا جاتا تھا ______ 396

خدا کا بیٹا ہونے کے سلسلہ میں قرآن کریم کا جواب ______ 396

ہر نبی کا دعویٰ یہ رہا تھا کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا ______ 397

ظہورِ اسلام کے وقت قریش کی مفاد پرستیوں کی کیفیت ______ 398

باطل کی بنیاد پر اقتدار حاصل کرنے والی تدبیروں کا نتیجہ ______ 399

قوت کے نشے میں بدمستی کی کیفیت ______ 399

آخر کار ایسے لوگوں کے لیے خدا کا ارشاد ______ 400

دوسروں کے سہاروں اور وعدوں پر جینے والی قوموں کا حشر ______ 401

ان تمام خطرات سے بچنے کا ایک ہی طریق ہے ______ 402

انسان کے ہر عمل کی نگرانی ساتھ کے ساتھ ہو رہی ہے ______ 402

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ النجم

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پہلا باب: سورۃ النجم (آیت 1)

واقعہ معراج کے سلسلہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ ہیکل سلیمانی کا تذکرہ ____ 406
واقعہ معراج کے متعلق ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کے تصورات کی مکمل تفصیل اور ہیکل سلیمانی کا متضاد تعارف ____ 407
1969ء میں یہودیوں کے معبد کی تاریخی حیثیت ____ 408
مسجد اقصیٰ کے متعلق جناب مودودیؒ سے کیا گیا ایک سوال اور اس کا جواب ____ 409
حضور ﷺ تو پہلے دن سے ہی کعبہ کی طرف رُخ کرتے تھے:
دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ____ 410
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ____ 410
عیسائیوں کے نزدیک یروشلم کی اور پادری کی اہمیت اور حضرت عمرؓ کی ادائیگی نماز کے لیے جگہ کا انتخاب ____ 411
عیسائیوں اور یہودیوں کی باہمی عداوت اور نفرت کی بنا پر یہودیوں کی عبادت گاہوں کا حشر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بلند نگہی ____ 412
بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عیسائیوں کے مابین ہونے والے ایک عہد نامہ کی نوعیت ____ 412
صلیبی جنگوں کی تباہ کاریاں اور مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک ____ 413
یہودیوں کا دیوارِ گریہ کے سامنے افسردگی کا اظہار ____ 413
صدیوں بعد ایک چھوٹے ٹکڑے پر اسرائیلی حکومت کا قیام اور پوری ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار ____ 414
مسجدِ اقصیٰ کی تاریخی حیثیت اور جناب مودودیؒ کی قابلِ غور متضاد بیانی ____ 414
قرآنی آیات کی رو سے مسجدِ اقصیٰ سے متعلق ہمارے ہاں کے غلط تصورات اور ان کا حقیقی مفہوم ____ 415
72ھ میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کی اصل تختی آج تک وہاں کندہ ہے ____ 415
قرآنِ حکیم کی روشنی میں مسجدِ اقصیٰ کا واضح تعین اور خدا کی نشانیوں کا ذکر ____ 415
نبی اکرم ﷺ کا مسجدِ اقصیٰ کی طرف سفر کا ذکر جس سے مراد مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت ہے ____ 416
علامہ عنایت اللہ عصری اہلِ حدیث کی تائیدی تحقیق اور پہلی ہجرت ____ 416

مکہ کے ناگفتہ بہ حالات کے برعکس مدینہ منورہ میں
نبی اکرم ﷺ کو بہت بڑے تمکن کی نوید ____ 417
لفظ مسجد سے مراد وہ مرکز ہوتا ہے "جہاں خدا کی حاکمیت عملی
طور پر متشکل ہو" ____ 417
مدینے کا احتراماً ایک نام مسجدِ اقصیٰ بھی تھا ____ 418
وہاں تو یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ موجود ہی نہ تھی بلکہ
وہاں تو کھنڈرات ہی کھنڈرات تھے ____ 418
قرآنِ حکیم کی اس مذکورہ آیت کا مفہوم تو کچھ یوں ہے ____ 418

دوسرا باب: **سورۃ النجم** (آیت 1 مسلسل)

واقعہ معراج کا دوسرا حصہ یعنی آپ ﷺ کا بیت المقدس سے
یروشلم اور پھر یروشلم سے عرش پہ پہنچ کر خدا سے ملاقات کرنا ____ 420
پہلے آسمان پر حضرت آدم سے ملاقات کے علاوہ وہاں کے
منظر نامے کا حال ____ 421
پہلے آسمان کے بعد دوسرے آسمان کی تصویر کشی کے
دوران حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ____ 422
ساتویں آسمان کے بعد سدرۃ المنتہیٰ کی طرف قصد
اور وہاں جنت کا مشاہدہ ____ 422
بارگاہِ جلالِ ربی سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنے
کی تفصیل کا ذکر ____ 422
ربِ جلال و جمال کی بارگاہ سے واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے
ملاقات اور خدا کی بارگاہ سے ملنے والے تحفوں کی واپسی کا معاملہ 423
واپسی پر بیت المقدس میں تمام پیغمبروں سے ایک بار پھر ملاقات'
مکہ کی واپسی پر ملاقات کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ____ 423

واقعہ معراج کے مروجہ تصور کو بیان کرنے کے بعد ایک الجھن 424
تبدیلِ قبلہ کا مروجہ تصور اور اس کی اصل حقیقت ____ 424
نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اگر ذریتِ ابراہیمی علیہ السلام تھی تو آپ ﷺ
ملتِ ابراہیمی علیہ السلام سے بھی ہیں ____ 425
کعبے کے مقابلے میں بیت المقدس کی عظمت کو بڑھانے
کی غرض سے ایک گہری سازش کا وجود قائم کیا گیا ____ 425
روایات کا باہمی تضاد اور پھر پچاس نمازوں کے تحفہ کو واپس
کرنے کے قصے میں حضرت موسیٰؑ کی ذات کا سہارا ____ 426
یہودیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں
نبی اکرم ﷺ کے مقامِ بلند کو نیچا دکھانے کی کوشش ____ 426
حضور ﷺ کی عظمت کے بارے میں قرآنِ حکیم کا ارشاد
اور یہودیوں کے لیے پیغام ____ 427
ہمارے ہاں کی روایات میں بیت المقدس اور نبی اکرم ﷺ
کی عظمت کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا ____ 427
حضرت عیسیٰؑ کے متعلق عیسائیوں کے مختلف غیر قرآنی عقائد
کو ہم نے پوری طرح تسلیم کر رکھا ہے ____ 428
احادیث کے متعلق ہمارے ہاں کی پیش کردہ تعلیم ____ 428
ہمارے ہاں کی وضعی روایات نے ہی بیت المقدس
یا ہیکل سلیمانی کی قانونی حیثیت کو ابھار رکھا ہے ____ 428
ستمبر 1969ء میں ہیکل سلیمانی کی بابت مولانا مودودیؒ
کی متضاد بیانی قابلِ غور ہے ____ 429
اس قدر واضح حقائق کے باوجود ہم آج تک اسے قبلہِ اول
ہی کہتے چلے آرہے ہیں۔ آخر کیوں؟ ____ 430

واقعہ معراج کا دوسرا حصہ جس میں آپ ﷺ کا عرش پر
خدا تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے یعنی Time & Space
کا معاملہ اور اس کا حل ______ 430
عام لوگوں کی طرف سے اعتراض اور اس کا جواب ______ 431
قرآنِ حکیم کا خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق ارشاد ______ 431
خدا کو دیکھنے کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش کا جواب 432
عرش پر لے جانے کے سلسلہ میں لا حاصل دلائل ______ 432
خدا کے متعلق وہ تصوّر جو قرآنِ حکیم نے پیش کیا ہے دنیا بھر
کے اندر کسی شکل میں بھی موجود نہیں ______ 432
خدا کا تصوّر تو ادراکِ انسانی میں آ سکتا ہی نہیں ______ 433
سورۃ النجم میں نبی اکرم ﷺ کے کسی جگہ آنے کا ذکر ہی نہیں
لہٰذا اگر اس سلسلہ میں وحی کی ماہیت کو سمجھ لیا جائے
تو ساری الجھن ختم ہو سکتی ہے ______ 433
نبی اکرمؐ کو پورے کا پورا قرآن حکیم وحی کے ذریعہ ہی ملا تھا _ 434
عربی زبان میں نبی کا مفہوم تو مقامِ بلند پر کھڑے ہونے کا ہے 434

تیسرا باب: سورۃ النجم (آیات 1: مسلسل تا 8)

واقعہ معراج کے متعلق سابقہ دو درسوں کا ملخص نیز
مقامِ محمدی ﷺ کے سلسلہ میں سورۃ النجم کا مقام ______ 435
خارجی کائنات کا وہ گوشہ جہاں سے انبیائے کرامؑ کو وحی ملتی تھی
اس کا ادراک انسان کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے 435
قرآنِ حکیم کے بیّن تعلیمی حقائق کے وہ بنیادی اوصاف جن کی تلاش
میں عقلِ انسانی سرگرداں ہے اور جولین ہکسلے کا بیان ______ 436
عربوں کو قندیلِ آسمانی کی روشنی سے آگاہ کرنے کا
قرآنی طریق ______ 437
قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف ______ 438
وحی اور عقلِ انسانی میں فرق کی وضاحت اور پھر عقل کو
وحی کے تابع رکھنے کا نتیجہ اور وحی کا پہنچانا ______ 439
ستاروں کی طرح وحی کی راہنمائی انسان کو یقینی طور پر
منزلِ مقصود تک پہنچا دے گی ______ 440
نتائج کے حصول کے لیے اپنے اپنے پروگرام پر
عمل پیرا ہونے کی تجویز ______ 440
کائناتی انکشافات کے سلسلہ میں سر جیمز کی طرف سے
کی گئی تحقیق کی اہمیت اور وحی کا بیان ______ 441
مذہب اور دین کی سوچ اور پروگرام میں بنیادی فرق ہوتا ہے 442
نظامِ ربوبیت شروع سے آخر تک بدلتے ہوئے تقاضوں پر یقینی
طور پر پورا اترتا ہے: بچے کی غذائیت کے لیے دودھ کی مثال 443
خدا تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی خصوصیات، نظامِ ربوبیت کو
عملی شکل میں متشکل کرنے والی ہستی کی خصوصیات ______ 444
مقامِ نبوت میں صفاتِ حسنہ کا تعارف ______ 444
دورِ حاضر میں سائیکولوجی کے علم کی اہمیت اور اس کا انکشاف 445
دلوں کا روگ انسان کے اندر کی صلاحیتوں کے بگڑ جانے کا
ہی نام ہے ______ 445
نبی اکرم ﷺ کی حسین و جمیل استویٰ پر مبنی، متوازی شخصیت
جو معراجِ انسانیت کی بلند ترین چوٹی پر ارجمند ہے ______ 446
دنیائے تصوّف کی انتہا تارک الدنی کی تاریک راہوں
پر متواتر سفر کرنا ہے ______ 446

مقامِ نبوت آسمان کی بلندیوں سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے
بعد انسانیت کی تاریک راہوں کو منوّر کرنے کا عملی پروگرام ہے 447
خطباتِ اقبالؒ میں تصوّف اور مقامِ نبوت کی وضاحت کے
سلسلہ میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ذکر قابلِ غور ہے
نکتہ آغاز سے نکتہ تکمیل تک ___ 448
وحی کی تعلیم میں علم کی وسعت اور حکمت و دانش دونوں
بدرجۂ اتم ہوتی ہیں ___ 449
قاب قوسین کا حقیقی مفہوم اور ہمارا مروجہ تصور ___ 450

چوتھا باب: سورۃ النجم (آیات 9 تا 13)

وحی کی خصوصیات اور نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ___ 451
خدا کا رسول ﷺ سماسے حاصل کردہ زندگی کے رموز سے حیات
انسانی کو جنت ارضی میں بدلنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے ___ 451
واقعہ معراج کے قصے میں خدا تعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کے مابین دو
کمانوں کے فاصلے کی حقیقت اور مقامِ نبوت ___ 452
رسولوں کی بعثت کا مقصدِ عظیم اور خدائے کریم کی
کرم نوازی کا ذکر ___ 452
پیغمبری کے تاج سے سرفراز ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا ___ 453
قادرِ مطلق کی طرف سے حضرت موسیٰ کی شخصیت کے چناؤ
کا مقصدِ عظیم فرعون کی سرکشی کا سدِ باب کرنا تھا ___ 454
انسانوں کی دنیا میں خدا کی مشیت انسانوں کے ہاتھوں ہی
بروئے کار آتی ہے ___ 455
نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصدِ عظیم اور جماعتِ مومنین کا کردار ___ 455
قرآنی نظام میں حکومت وقت کی ذمہ داریوں کا تعین جنہیں
خدا تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے ___ 456
نعت کی دنیا میں غالب کا ایک بلند ترین شعر ___ 456
جنتِ ارضی کی تشکیل کے لیے جماعت مومن کی ضرورت
اور اس کی اہمیت ___ 457
قاب قوسین او ادنیٰ کے روپ میں خدا اور رسول ﷺ
کے باہمی تعلقات کی نوعیت ___ 457
خدا تعالیٰ کے ساتھ نبی اکرمؐ کی لازوال رفاقت قاب قوسین
سے بھی آگے او ادنیٰ کی ترجمان ہے ___ 458
خدا تعالیٰ کا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہم کلامی کا سلسلہ صرف
وحی کا طریق اختیار کیے ہوئے تھا ___ 458
پہلے لفظ سے آخری لفظ تک پورے کا پورا قرآن حکیم بذریعہ
وحی زمین پر قلب نبوی پر ہی ہوا تھا ___ 459
نبی اکرمؐ کا مقامِ محمود پر مامور ہونا سیرتِ طیبہ کی معراج ہے ___ 460
لفظ وحی کی خصوصیت اس کی اہمیت اور مقام نبوت کی حدود ___ 460
وحی کے مقابلے میں تنہا عقل انسانی کی کیفیت اور کشف والہام
کے تصور میں پائی جانے والی بنیادی کمزوری ___ 461
علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا وہ حصہ جو تصوف کی
وادیوں کی نذر رہا ___ 462
نبی اکرم ﷺ کے متعلق ایک بڑھیا کا خواب ___ 462
تصوف کی دنیا میں انسانی خواب کا حصہ 40 فی صد ہے؟ ___ 463
وحی کی کیفیت انسانی خیالات وتصورات سے ہمیشہ الگ
نوعیت کی حامل ہوتی ہے ___ 463
خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ملنے پر نبی اکرم ﷺ کا

دل وجان سے تصدیق کا اظہار ______ 464
قرآن حکیم کے نزدیک وحی کے معاملے میں عقل وشعور کی
اہمیت، دلیل وبراہین کی اہمیت ______ 465
وحی کے مقابلے میں کشف والہام کا تمام تر تصور
دلائل وبراہین سے کوسوں دور ہوتا ہے ______ 465
انسانی خواب کی حقیقت اور اس کا مقام مگر وحی سے الگ __ 466
نبی کے علاوہ وحی کے ملنے کے سلسلہ میں کوئی شخص آگہی
حاصل کر ہی نہیں سکتا ______ 466

پانچواں باب: **سورۃ النجم** (آیات 14 تا 18)

مقامِ نبوت کے سلسلہ میں سورۃ النجم بنیادی خصوصیات کی
حامل ہے: گزشتہ سے پیوستہ ______ 468
لفظ قاب قوسین کی حقیقت اور ہمارے ہاں کے
تراجم کی کیفیت ______ 469
خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی ملنے کی کیفیت کوئی دوسرا شخص
جان ہی نہیں سکتا ______ 470
سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات
کے برعکس اس کا لغوی مفہوم ______ 471
ہمارے ہاں پائی جانے والی مذہبی تعلیم نے نوجوان نسل کو ذہنی
طور پر متنفر کر دیا ہے اور عالمی سطح پر وحی کی ضرورت کا احساس 471
علامہ پرویزؒ کی سعی وکاوش کے خلاف مذہبی پیشوائیت کا منفی
کردار، اس کا نتیجہ اور انسان نے کیا سوچا؟ ______ 472
دانش کدۂ اقبالؒ کے ہاں دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی
کا باہمی فرق ______ 473
یورپ کے مفکرین کے نزدیک تنہا عقلِ انسانی کا مقام
اور وحی کی اہمیت ______ 473
جو صداقت تجربات کی کسوٹی پر پورا نہ اترے اسے وحی کہا
ہی نہیں جا سکتا ______ 474
علامہ پرویزؒ کی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کی اہمیت _ 475
لفظ سدرۃ المنتہیٰ کا لغوی مفہوم اور قرآنی الفاظ کے سلسلہ
میں چناؤ کی اہمیت ______ 475
قرآنِ حکیم میں محاکاتی انداز کا اختیار کرنا حقائق کو سمجھنے کا
ایک بلیغ انداز ہے ______ 477
قرآنی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں بخاری شریف میں
پہلی وحی کے نازل ہونے کی روداد ______ 478
غارِ حرا میں چلّے کاٹنے کے دوران آپ ﷺ کی طرف جبرئیل
کی معرفت وحی کا ذکر اور اس کا طریق ______ 478
وحی کے ملنے پر آپ ﷺ کی اضطرابی کیفیت اور
ورقہ بن نوفل کا بیان ______ 479
قرآنِ حکیم کا بیان نبی اکرم ﷺ کی عظمت اور عقل انسانی کی
حدود اور قرآنی نظام کی تشکیل ______ 480
قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ زندگی قیامت تک انسان کے
ہاتھوں متشکل ہو سکتا ہے مگر بہانے بازی! ______ 481
آیاتِ کبریٰ کا مفہوم اور اس کے عملی نتائج ______ 483
یہ آیات جنہیں معراج کا واقعہ کہا جاتا ہے دراصل یہ مکے
سے مدینے کی طرف ہجرت کے متعلق ہیں ______ 483

چھٹا باب: **سورة النجم** (آیات 19 تا 25)
مقامِ نبوت کی عظمت کو ذہن نشین کرانے کے لیے قرآنِ حکیم
کا ایک حسین ولازوال محسوس انداز ____ 485
وحی کی راہنمائی کے بغیر انسانی سوچ کی پستی کا عملی مظاہرہ:
بتوں کے سامنے سجدے ____ 486
خدا کا غلط اور صحیح تصور انسانی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی
پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے تو پھر اللہ کا صیغہ مونث کیوں؟ 486
حضور ﷺ کی بعث سے پہلے خدا تعالیٰ کے متعلق پائے
جانے والے تصور کی وضاحت ____ 487
بت پرستی کی حقیقت کو بیان کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم
کا ایک عظیم اور بلیغ اندازِ بیان ____ 487
کسی شے کا یا کسی شخص کا احترام ہؤا س کی عزت اس کے
نام سے نہیں بلکہ اس کی خصوصیات سے ہوتی ہے ____ 488
قائداعظمؒ کی گاندھی سے ایک خوبصورت چپقلش اور اس
کے سوٹ کیس میں رکھی گئی مورتی کی پوجا کا ذکر ____ 489
قرآن حکیم کے نزدیک مشرک کی تعریف ____ 489
''داتا صاحب'' کے مزار کے متعلق مولانا احمد علیؒ کا انکشاف
کہ آپ کی ذات یہاں دفن ہی نہیں: اسے دبا دیا۔ کیوں؟ _ 490
خدا تعالیٰ کی ذات اپنے ناموں کی صفات سے متعارف ہے، وہ تو
کائنات کے وجود سے پہلے بھی خدا تھا اور آخر بھی خدا رہے گا 491
پتھروں سے تراشیدہ بتوں سے مرادیں پوری کرانے کی
امیدیں اور حضرت صاحب کے نام پر نذرانے کی داستانیں 492
اذہان اور اعصاب پر حکومت، عذاب کی نوعیت اور لفظ تعبدون
کا مفہوم اور مروجہ قرآنی تراجم کی نوعیت ____ 492
وحی کی راہنمائی سے ہٹ کر کوئی سند قبول نہیں کی جائے گی _ 494
انسان اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتا ____ 494
حکومت کی بجائے خدا کی پرستش کا عمل خالصتاً ایک
جذباتی چیز ہے ____ 495
پیر اسی شخص سے مالی فائدہ اٹھاتا ہے جو شخص اسے اپنا پیر
سمجھے، دیکھیے اس میں دین خداوندی نے کیا کہا ____ 495
ہندو کے نزدیک کائناتی قوتوں کو ہی خدا مانا جاتا ہے:
اٹھو! قوانینِ فطرت کو مسخر کرو ____ 496
مذہب کی دنیا میں خدا کا صحیح اور منزہ تصور پیش ہی نہیں
کیا جاتا جس کا نتیجہ مقام انسانیت سے محرومی ہے ____ 497
ذہنی پستی کی انتہا! ____ 498
صرف قرآن حکیم کا پیش کردہ نظام حیات ہی تمام
معاشرے کو جنت ارضی میں تبدیل کرسکتا ہے ____ 499
ساتواں باب: **سورة النجم** (آیات 26 تا 32)
صرف نام رکھنے یا بدلنے سے اس کی خصوصیات نہیں بدلتیں 500
مروجہ اسلام جس پر صدیوں سے مسلمانوں کے ہاں عمل
ہو رہا ہے یہ فرقہ بندی پر مبنی خودساختہ اسلام ہے ____ 501
ملت اسلامیہ کی برومندی کا راز اس دین کو تسلیم کرنے میں
ہے جس کی سند خود خدا کی کتاب ہے ____ 501
ذاتی خواہشات کی تکمیل کی خاطر خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے
قبولیت حاصل کرنے والے وسیلے اور طریقے ____ 502
انسانی فکر کو جلا بخشنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم کا ملخص

سفارش نہیں، قوانین کی پاسداری ہے ________ 502
مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی اور
ہمارے ہاں کے غلط قرآنی تراجم ________ 503
قصہ آدم کو قرآن حکیم کے آئینہ میں سمجھے بغیر قرآنی حقائق
سمجھ میں نہیں آسکتے ________ 503
اسلام اور سائنس کے عنوان پر لکھے گئے ایک مضمون کی مخالفت 504
قانون خداوندی کے مطابق تسخیر کائنات کے ماحصل کا
استعمال کائناتی قوتوں کو اپنے ساتھ کھڑا کرنا ہے ________ 504
ملت اسلامیہ کی موجودہ حالتِ زار ہماری توہم پرستی اور حق
سے دوری کا نتیجہ ہے ________ 505
حق کیا ہے اور باطل کیا اور ہماری سوچ کیا؟ ________ 505
انسانی زندگی کے دو اہم رخ اور ان کی قدر و منزلت کے
باہمی فرق کی وضاحت ________ 506
ناگفتہ حالات کے باوجود حق کی آواز کو آخری سانس تک
بلند کرنے کی ہدایت ________ 507
آخر کار حق و باطل کا فیصلہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہی ہوگا
نہ کہ انسانوں پر ________ 507
اخلاقیات یعنی خیر و شر (Good & Evil) کے مسئلہ کی
اہمیت اور اس کا حل ________ 508
خیر و شر کے فرق کو سمجھنے یا جاننے کے لیے قرآن حکیم اور خدا
پر ایمان لانے کی ضرورت کیوں؟ ________ 508
ذہنی، دلی اور عملی طریق اختیار کرتے ہوئے خدا پر ایمان لائے
تو تب ہی اسے ایمان کہا جاسکتا ہے ________ 509
فکرِ قرآنی انسانی زندگی کو ایک جوئے رواں قرار دیتی ہے،
شخصیت باقی رہتی ہے ________ 509
انسانی زندگی کے اعمال کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں کائنات
کے وجود کا ذرہ ذرہ ہر آن مصروفِ عمل ہے ________ 510
مکافاتِ عمل کے نتیجہ خیز ہونے کی وضاحت ________ 510
انسانی معاشرے میں اسلامی نظام کے ذمہ دار اور
مکافاتِ عمل کی نوعیت ________ 511
زندگی کے لمحات میں ہونے والی لغزشوں سے بچاؤ کا طریق 511
انسان کے لیے توبہ کی قبولیت کا فارمولا اس سے عملی زندگی
کا تقاضا کرتا ہے ________ 512
خدا کا قانون ربوبیت انسانی زندگی کے ساتھ روزِ اول سے
وابستہ ہے، سائنس بھی اس پر تحقیق کر رہی ہے ________ 512
ایک غیر مسلم قرآن کریم کا محقق ہونے کے باوجود
مسلمان کیوں نہ ہوا؟ ________ 513
اب تحقیق کا وہ دور شروع ہو چکا ہے کہ جس میں نت نئے
انکشاف ہوں گے ________ 514
کسی انسان کو اپنی ذات کے متعلق خود ہی خوش فہمی میں مبتلا
نہیں ہو جانا چاہیے اور بات سرسید احمد خاں کی ________ 514
خدا تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئی کائناتی نعمتوں سے
اظہارِ نفرت کا نتیجہ ________ 515
تزکیہ کا خودساختہ معیار جو قرآن حکیم کے معیار کے برعکس ہے 516

آٹھواں باب: **سورۃ النجم** (آیات 33 تا 40)

قرآن حکیم کے نزدیک ریاست کی طرف سے معاشی

ذمہ داریوں کا تعین ______ 517
قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام سے منہ موڑ لینے کا
نتیجہ خدا کے سامنے تھا: ایک غور طلب نکتہ ______ 518
نظامِ سرمایہ کے برعکس اسلام نے ایک نئے معاشی نظام کی بنیاد
رکھی مگر ہم اَعْطٰی قَلِیْلاً ہو گئے ______ 519
دولت کے انبار میں سے تھوڑا سا دینے کا یہ جذبہ کیونکر
پیدا ہوا؟ ______ 519
دولت کے سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت اور
اس کے برعکس قرآن حکیم کا ارشاد ______ 520
نظام سرمایہ داری کو جائز کروانے کے لیے حضرت عمر فاروقؓ
کے چناؤ کی ایک روایت اور قرآن کریم کا حکم ______ 521
خدائے علیم اپنی طرف دی گئی اقدار کو کبھی نہیں بدلتا ______ 522
قرآن حکیم اپنے معاشی نظام کی بنیاد سرمائے پر نہیں بلکہ محنت
کے صلہ پر رکھتا ہے اور یہی انسانیت کا آخری سہارا ہے ___ 522
نظام سرمایہ داری کے خدوخال اور اس کے عملی نتائج ______ 523
قرآن حکیم کے نزدیک ربوٰ کا لغوی مفہوم اور دیئے گئے
قرضوں کی واپسی کا حل ______ 524
ربوٰ کے سلسلہ میں فریب دہی کی خاطر ہم نے جو نام تجویز
کر رکھے ہیں ان کی ایک دو محسوس مثالیں ______ 525
قرآن حکیم نے معیشت جیسے بنیادی مسئلہ کا حل صرف
چار لفظوں میں پیش کر رکھا ہے: معاوضہ محنت کا ہے ______ 525
مارکس جہاں ناکام رہ گیا اس سے آگے: ایک اور سنہری اصول 525
غیر قرآنی معاشرے میں احساس ذمہ داری کی تصویر کشی ___ 526
اپنی ذمہ داری دوسروں سے پوری کرانا ہی گداگری ہے ___ 527
معاشرے کو گداگری سے محفوظ رکھنے کا طریق ______ 527
قرآن حکیم کے ایک لفظ تولّیٰ کے مفہوم کو بدلنے کا نتیجہ ___ 527
ظہور نتائج کے وقت کو ہی قرآن حکیم نے قیامت کے
لفظ سے پکارا ہے ______ 528
قرآنِ حکیم کے نزدیک نظام عدل کی ذمہ داریوں کا تعین ___ 528
فرعون کی فرعونیت کو ختم کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کو دی گئی
ذمہ داری کا تذکرہ ______ 529
فرعون کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا حقیقی مقصد ______ 529
قرآن حکیم کا پیش کردہ انقلاب انسانیت کی موجودہ زندگی
سے متعلق ہے جس کی تفصیل ملاحظہ ہو ______ 530
نواں باب: **سورۃ النجم** (آیت 40: مسلسل تا اختتام)
قرآن حکیم کی پیش کردہ سورہ النجم کی ہر آیت کی جامعیت
ایجاز کے ساتھ قابل صد غور و فکر ہے ______ 532
قرآن حکیم جیسی قندیل آسمانی کو صدیوں سے ہم نے قیامت پر اٹھا
رکھا ہے قیامت کا مروّجہ محدود مفہوم اسی سلسلہ کی ہی ایک کڑی ہے 533
لفظ قیامت انسانی معاشرے کے نظم و ضبط کے نتائج کی
عکاسی کا ہی دوسرا نام ہے ______ 534
کوئی قوم اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوتی تاوقتیکہ اسے
حقائق سے آگاہ نہ کر دیا جائے ______ 535
قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظام حیات انسان کی
معاشرتی اور تمدنی زندگی سے ہے ______ 535
کامیابیوں اور ناکامیوں کو پرکھنے کا عملی طریق: تم اپنا کام کرو

اور مجھے اپنا کرنے دو ____________ 536
جنت ارضی کی تشکیل کی خاطر صدا اوّل کی تاریخ ایک شہادت
طور پر پیش کی جاسکتی ہے ____________ 537
مذکورہ آیاتِ قرآنی کے متعلق دنیائے تصوف کے
خودساختہ تصورات کے تحت لفظ وصال وعروس کا مفہوم ___ 537
قرآنِ حکیم کے نزدیک امت مسلمہ کا فریضہ نیز
وانا اللہ وانا علیہ راجعون کا قرآنی لغوی مفہوم ______ 538
قوانین خداوندی پر ایمان لانے والوں کے لیے امروز وفردا
کی زندگی کی نوعیت ____________ 540
قوموں کی موت وحیات کا معاملہ ہو یا عروج وزوال کا' یہ
ہمیشہ قوانین خداوندی سے مشروط ہے اور بچے کی پیدائش کا بھی 540
انسانی اور حیوانی زندگی میں فرق صرف اختیار وارادے
اور عقل وشعور کا ہے ____________ 541
اختیار کی بنا پر احساسِ ذمہ داری کا یہ ملکہ صرف اور صرف
انسانی زندگی سے ہی وابستہ ہے ____________ 541
لفظ اغنیٰ اور تکاثر کا بنیادی مفہوم اور اس کے اثرات ____ 542
لفظ ربوبیت کی بنیادی خصوصیت اور ستارہ پرستی ______ 542
انسانی شعور کی ربوبیت کو اقبالؒ نے لفظ خودی سے تعبیر کرتا ہے 543
اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات قرآن حکیم کے فلسفۂ حیات
کی صداقت کا ثبوت قابلِ غور ہے ____________ 543
قوموں کی تباہی وبربادی کی اصل وجوہات کی نشاندہی ____ 544
قرآن حکیم میں قوانین خداوندی کے الفاظ' جو اپنے اندر ایک
خاص مفہوم رکھتے ہیں' کی وضاحت ____________ 545
میزانِ خداوندی میں انسان کی طرف سے تمام بہتری کے اعمال
ظلم واستبداد کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتے _____ 546
جس قوم کا تاریخی حافظہ کمزور ہوجائے وہ قوم تباہ ہوجاتی ہے 546
کینسر کے مرض میں مبتلا قوم اپنی تباہی کا ادراک نہیں کرتی _ 547
قرآن حکیم کے مروّجہ تراجم نے ہمیں کہا سے کہاں پہنچادیا؟ 547

سورة الفتح

پہلا باب: سورة الفتح (آیت 1)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1982ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفتح 48ویں سورۃ سے شروع ہوتا ہے: (48:1)۔

موسمی حالات کے پیشِ نظر کچھ وضاحتیں

جس قسم کا موسم ہے وہ آپ احباب کے سامنے ہے لیکن جو سامعین ٹیپ کے ذریعے درس سنیں گے' ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس مرتبہ لاہور کا موسم درس کے اعتبار سے بڑا ہی ناسازگار رہا ہے۔ آج بھی رات سے بارش ہو رہی ہے' صبح سے اس وقت تک مسلسل بارش ہے۔ بارش کے دن ہمارے لیے ایک دشواری ہوتی ہے' صبح سے ہی احباب ٹیلی فون پر یہ پوچھنا شروع کرتے ہیں کہ آج درس ہوگا یا نہیں' تو ہمارے لیے غالب کے الفاظ میں ''گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل'' کیا بتائیں کہ ہوگا یا نہیں' تو ہم بھی محکمہ موسمیات کی طرح ایک پیشین گوئی کر دیتے ہیں کہ اگر وقت پر بارش تھم گئی' احباب آ گئے تو درس ہوگا' ایسا نہ ہوا تو درس نہیں ہوگا' جھوٹے بھی نہ پڑیں' سچی بات بھی نہ کہیں' احباب آ جاتے ہیں تو جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں' اس موسم میں تعداد کا تھوڑا ہونا تو ضروری ہے لیکن اس کے باوجود جو احباب آتے ہیں ان کا ذوق' ان کا تجسس' ان کی ہمت' یقیناً ایسی ہے جس کی داد دینا پڑتی ہے۔ اگر اب درس نہ کیا جائے تو انہیں گلا رہ جاتا ہے کہ ہم تو اس قسم کے موسم میں بھی درس کی خاطر کشاں کشاں آ گئے اور یہاں ہم مایوس رہے۔ درس ہوتا ہے تو جو اس مجبوری کی وجہ سے نہیں آ پاتے' انہیں شکایت ہو جاتی ہے کہ ہمارا تو کوئی قصور نہیں تھا' ایک پورے درس سے ہم محروم رہ گئے اور پھر چونکہ ہمارے درس کی کڑیاں آگے بھی ملتی ہیں' اس لیے آگے جا کر بھی جب اس کا کوئی حوالہ دیا جاتا ہے تو انہیں اپنا یہ جو خلا ہوتا ہے' یہ جو درس کو مس کر جاتے ہیں' ہر بار کھٹکتا رہتا ہے تو بڑی دشواری ہوتی ہے۔ ہمارے لیے بہرحال آپ احباب کی تشریف آوری کا تقاضا ہے تو آپ کو تو درس سے محروم نہ کیا جائے۔ ٹیپ پہ ہو رہا ہے اس لیے باہر والوں کو تو فرق نہیں پڑتا' جو احباب نہیں آئے ان میں سے کچھ چاہیں گے تو انہیں ہم ٹیپ سنا دیں گے اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

سورۃ الفتح کی نمایاں خصوصیت کا تذکرہ: مدینہ میں ایک مملکت کا قیام

درس کا آغاز جیسا میں نے عرض کیا ہے سورۃ الفتح سے ہے اور ہر بار یہ کہنا کہ صاحب! یہ سورۃ بڑی اہم ہے' یہ آیت بڑی ہی جلیلہ ہے' اور قرآن کریم کے متعلق میں سمجھتا ہوں' ایسا کہنا ہی نہیں چاہیے' اس کا تو ایک ایک لفظ اپنے اپنے مقام پر بڑا ہی عظیم الجلیل ہے لیکن بعض سورتیں ایسی ہیں' ان میں واقعات اس قسم کے آجاتے ہیں جو دین کے مجموعی نظام پر بڑی عمدگی سے روشنی ڈالتے ہیں' اس اعتبار سے کہنا پڑتا ہے کہ اس پورے سلسلہ کے اندر یہ آیات یا یہ جو سورۃ ہے' اس کا مقام بڑا نمایاں ہے۔ یہی کیفیت سورۃ الفتح کی ہے۔ نبی اکرم ﷺ مکے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لے گئے اور جیسا کہ آپ کو اب معلوم ہے قریشِ مکہ نے ان مہاجرین کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ ہر بار یورش کر کے اس زمانے کے معیار کے مطابق عظیم لشکر اپنے ساتھ لے کر بار بار حملے کرتے تھے اور یہ آج کی اصطلاح میں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پناہ گزینوں کی مختصر سی بے ساز و ویراق جماعت جن کے لیے پناہ گاہ بھی بمشکل ملی تھی' مدینہ کے رہنے والے مسلمان بھی بڑی ہی قلیل تعداد میں تھے اور وہ قریش کے مقابلے میں بڑے کمزور بھی واقع ہوئے تھے' پھر مدینہ کے اندر اور دشواری یہ تھی کہ یہاں یہودیوں کی' انصار کی' اور ایسے قبائل کی آبادی زیادہ تھی جو یا تو قطعاً ایمان لائے ہی نہیں تھے یا وہ دل سے ایمان نہیں لائے تھے۔ قرآن کریم میں بار بار منافقین کا جو ذکر آتا ہے' وہ یہی آبادیاں ہیں۔ اس قسم کی ایک مخلوط آبادی کے اندر یہ مہاجرین آکر بسے تھے۔ اندر سے یہ خطرہ تھا' باہر سے ان کی یورشیں مسلسل تھیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان یورشوں پر کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ جو داخلی امور تھے ان کو بھی سنوارنے کے بعد' گرفت میں لینے کے بعد' یہ کہنا بجا ہے کہ یہ نبی اکرم ﷺ اور **والذین معہ** کا معجزہ نہیں ہے کہ مدینے میں ایک اسلامی مملکت قائم کر دی۔ حضور ﷺ اور آپ کے رفقاءؓ کا یہ کارنامہ معجزانہ تھا کہ انہوں نے ان حالات میں ایک مملکت قائم کر لی۔

عربوں کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کے خدوخال کے علاوہ قرآنی حکومت کی وضاحت

اس میں ایک اور بات بھی خصوصیت کی ہے کہ عربوں کے ہاں مملکت اور حکومت کا تصور ہی نہیں تھا۔ یہ قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ یوں سمجھیے جیسے پنچائیت کی سی زندگی ہوتی ہے یا ہمارے ہاں کے گاؤں کی سی زندگی۔ گاؤں تو پھر بھی ایک بڑی حکومت کے تابع ہوتے تھے' وہاں تو سرے سے کوئی حکومت ہی نہیں ہوتی تھی نہ مملکت نہ حکومت۔ ان حالات میں' ان عربوں میں' ایک باقاعدہ مملکت قائم کرنا' ایک نظام قائم کرنا' ایک حکومت قائم کرنا' پھر وہ حکومت بھی ایسی کہ جس کی نظیر نہ اس سے پہلے تاریخ میں کہیں ملتی تھی اور نہ ہی اس زمانے میں جو ہم عصر اقوام تھیں' جن کے ہاں مملکتیں بھی تھیں اور حکومتیں بھی تھیں' وہاں بھی یہ نظام نہیں ملتا تھا' جو نظام یہاں قائم کیا گیا کہ ایک خدا کی محکومیت ہو اور کسی انسان کی حکومت نہیں حالانکہ آج بھی یہ دنیا سیاست میں' معاشرت میں' معاشیات میں اتنی آگے جا چکی ہے۔ یہ تصور

بہت کم اقوام کے ذہن میں آتا ہے کہ یہ کس انداز کی حکومت ہے جس میں کوئی انسان حاکم ہی نہیں' نہ ایک فرد' نہ افراد کا گروہ' نہ کوئی پارلیمان' ان میں سے کوئی بھی حاکم نہیں ہے' حکومت خدا کی ہے اور خدا وہ ہے جو کبھی کسی کے سامنے نہیں آتا۔ اس کی حکومت اس طرح سے ہے کہ ایک ضابطہ قوانین ہے جو اس نے نازل کیا ہے۔ یہ حکومت درحقیقت اس کتاب کی حکمرانی تھی۔ اسے آپ آج کی اصطلاح میں ضابطہ قوانین ہی کہہ لیجیے' جس میں کسی انسان کی حکومت کا دخل نہ ہو۔ آج ساری دنیا میں سیکولرازم کی حکومت چلی آ رہی ہے خواہ وہ مسلمانوں کی اقوام ہوں' یا غیر مسلموں کی' اس کا سوال ہی نہیں کہ انسان کا دخل نہ ہو اور حکومت قائم ہو جائے خواہ وہ آئینی حکومت بھی کیوں نہ ہو' قوانین سازی بھی کیوں نہ ہو' وہ تو انسان قانون بناتے ہیں۔ اگر ہیئت نافذہ جو ہے' جو نافذ کرنے والی Executive Authority ہے' اس کو قانون سازی میں دخل نہ بھی ہو تو قانون تو پھر بھی انسانوں کا ہی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک بنا بنایا ہوا ضابطہ قوانین ازلی وابدی ہے جس میں انسانوں کو کسی قسم کی تبدیلی کا بھی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اسے بطور حکومت کے ضابطے اور قانون کے نافذ کرنا ہے حتیٰ کہ خود نبی اکرم ﷺ کے متعلق بھی قرآن کریم میں ہے کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ وہ خود بھی اس کتاب کا محکوم ہوگا اور دوسروں کو بھی اسی کتاب کا محکوم بنائے گا۔ اس قسم کی حکومت حضور ﷺ نے قائم کی تھی۔

ہجرت سے پہلے نبی اکرم ﷺ کے دل میں کعبہ کے متعلق پیدا ہونے والی ایک آرزو کہ یہ ایک عالمگیر برادری کا مرکز ہو

عزیزانِ من! نبی اکرم ﷺ نے اس قسم کی عظیم الشان مملکت قائم کی اور پھر ایران اور روما جیسی اتنی بڑی سلطنتوں اور مملکتوں کو اس کی تہذیب و تمدن تک کو انہوں نے ختم کر دیا اور مملکتیں ختم کر کے رکھ دیں جو ایک عظیم کارنامہ تھا۔ قرآن کریم نے جیسا کہا ہے کہ یہ سب ایمان اور اعمال صالحہ کی بنا پر تھا' شمشیر کے زور پہ نہیں تھا' بلکہ حسنِ اخلاق کے زور پر' کتاب کی اطاعت کے زور پہ ہوا تھا۔ بہرحال مملکت قائم کی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس اپنی مملکت' اپنی حکومت کے بعد اور تو کچھ چاہیے نہیں لیکن اس کے باوجود قرآن کریم کہتا ہے کہ حضور ﷺ کے دل میں ایک خواہش بڑی شدت سے ابھرتی تھی' بار بار ابھرتی تھی' آپ کے دل کی' بہت بڑی آرزو تھی۔ یہ کیا چیز تھی؟ یہ جو میں نے کہا ہے کہ ابھرتی تھی تو یہ قرآن کریم کے الفاظ میں ہی ہے۔ حضور ﷺ مدینے میں تشریف رکھتے تھے' کعبہ مکے میں تھا۔ کعبے کا مقام کیا ہے یوں تو ایک مختصر سی چار دیواری کا ایک کوٹھا ہے' جسے کہتے ہیں۔ وہ کوئی عالیشان محل بھی نہیں ہے' کوئی بڑا مکان بھی نہیں ہے' کوئی خوبصورت عمارت بھی نہیں ہے لیکن وہ ایک Symbol (علامت) ہے' خدا نے اسے اپنا گھر کہا ہے' اپنی حکومت کا مرکز قرار دیا ہے۔ یاد رکھیے! جسے آپ کیپٹل سٹی کہتے ہیں اور وہ دارالخلافہ ہو سکتا ہے لیکن وہ ایک نظام کا مرکز ہے جسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ معنوی مرکز ہے' اسے

قرآن حکیم نے کعبہ کہا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (3:96) تمام نوعِ انسانی کے مرکز بننے کے لیے ایک مقام' جو ہم نے تجویز کیا' وہاں ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے ایک مکان بنایا اور دنیا میں وہ خدا جس کا سب کچھ ہے' ساری کائنات اس کی تخلیق کردہ ہے اور اس کے باوجود وہ خود لامکاں بھی ہے' اُس نے اس مکان کو' اس کوٹھے کو' میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ وہ ایک ایسا کوٹھا سا ہی ہے' بیت کہا ہے' میرا کہا ہے۔ یہ اس مقام کی انفرادیت ہے کہ جس کا سب کچھ خدا ہے' وہ کائنات میں خالق بھی ہے' مالک بھی ہے' حاکم بھی ہے' وہ اس نہایت سادہ کوٹھے کو ''میرا گھر کہتا ہے''۔

جس شے کو بھی خدا اپنی کہے تو دراصل اس پر پوری نوع انسانی کا حق ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک کا

یاد رکھیے! جس چیز کو بھی خدا نے ''میری'' کہا ہے' خاص طور پہ اس کے معنی ہیں کہ ''اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ثابت ہوسکتی۔'' ارض یا زمین کو کہا ہے کہ ''یہ میری ہے یا اللہ کی ہے'' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی انسان اس کا مالک نہیں بن سکتا تو اس مکان کے متعلق کہا کہ یہ بیت میرا مکان ہے۔ یہ بڑی اہمیت کا ہے کے لیے ہے؟ اس لیے کہ یہ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ہے' یہ کسی خاص فرد کا' اس کے خاندان کا' اس کے قبیلے کا' اس کی قوم کا' مکان نہیں ہے۔ اسے ہم نے پوری نوعِ انسانی کے لیے تجویز کیا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک عالمگیر برادری کی تشکیل کا مرکز اور مثال سے اس کی تشریح

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی تعلیم کا منتہیٰ یاد رکھیے! یہ ہے کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213) وہ تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر امت یا قوم یا ملت بنانا چاہتا ہے۔ یہ اقوام کی اور قبائل کی' جتنی تفریقات ہیں' وہ ان سب کو مٹا کر صرف انسانیت کی Bases (بنیادوں) پر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری متشکل کرنا چاہتا ہے اور اس عالمگیر برادری کا ایک مرکز اس نے تجویز کیا ہے' جسے کعبہ کہا جاتا ہے۔ یہ ہے کعبے کا مقام۔ اس کی اہمیت آج کی اصطلاح میں یوں سمجھ میں آئے گی کہ جب ہم مثلاً کہتے ہیں کہ یہ ماسکو نواز ہے یا اس کا تعلق ماسکو سے ہے تو اس کے معنی ایک شہر کے نہیں ہوتے جس کو ہم ماسکو کہتے ہیں۔ ماسکو ایک نظریہ زندگی کی' ایک فلسفہ حیات کی' ایک نظامِ مملکت کی' ایک علامت ہے۔ جسے کمیونزم کہتے ہیں۔ وہ آپ دیکھیں گے کہ عام طور پہ کمیونزم نہیں کہا جاتا۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ ماسکو نواز ہے۔ تو یہ اس قسم کے جو شہر ہوتے ہیں وہ درحقیقت اس نظریہ حیات کی علامت بن جاتے ہیں جن کا وہ مرکز ہوتا ہے۔ ماسکو کے معنی ہی کمیونزم کا مرکز ہے۔ اس سے اب سمجھ میں بات آجائے گی کہ جب قرآن کریم نے یہ کہا کہ مکہ نوعِ انسانی کی مرکزیت کی علامت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نظامِ حیات جو خدا نے تجویز کیا ہوا ہے' اس کے مطابق پوری نوعِ انسانی جب ایک امت' ایک ملت' کی شکل میں متشکل ہو گی تو ان کے اس نظریئے کی جو علامت ہے وہ کعبہ ہو گا' وہ مکہ ہو گا۔ یہ ہے کعبے کی حیثیت اسلام کے نظام میں' قرآن

کریم کے نظام میں۔

کعبہ کی حیثیت کو قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نظامِ حیات کی طرف مرکوز کرنا ہے جیسے کمونسٹ کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے

قرآن کریم نے جہاں کہا ہے کہ جہاں بھی تم ہو فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (2:144) تو اپنی نگاہ کے سامنے، جسے آپ نگاہ کا نصب العین کہتے ہیں، کعبے کو رکھو جہاں بھی تم دنیا میں ہو۔ دنیا کے کسی حصے میں بھی تم ہو تمہاری نگاہوں کا منتہیٰ، نصب العین، جہاں جا کر کسی کی نظر ٹکتی ہے، اسے رکھو۔ لہٰذا تمہاری دنیا کا نصب العین وہ کعبہ ہونا چاہیے خواہ تم کہیں بھی کیوں نہ ہو۔ آپ نے غور کیا کہ اس کے معنی کیا ہیں، پھر میں اسی (سابقہ) روس کی مثال پر آتا ہوں۔ امریکا میں بھی کمیونسٹ ہیں تو ان کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے۔ اگر وہ افریقہ میں ہیں، پھر بھی ان کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے۔ ہندوستان، پاکستان میں، دنیا کے کسی خطے میں، بھی اگر وہ کمیونسٹ ہے تو ہم کہیں گے کہ اس کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے۔ ماسکو وہ مرکز ہے جو اس کے نظریہ حیات میں ایک جامعیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ماسکو پہ ہوتی ہے کے معنی یہی ہیں کہ وہ اپنی نگاہ کمیونزم پر رکھتا ہے۔

نظامِ صلوٰۃ کی معنوی اور مرکزی محسوس شکل وصورت

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ تم دنیا کے کسی خط میں بھی کیوں نہ ہو، اپنی نگاہ کا نصب العین کعبے کو قرار دو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ صلوٰۃ کا نظام، جو خدا کی طرف سے دیا گیا ہے، اس نظام کا مرکزِ محسوس، اس نظام کا معنوی مرکز، تو قرآن کریم ہے، اس کا مرکز محسوس، وہ کعبہ ہے تو کہا کہ جہاں بھی تم دنیا میں ہو، اپنی نگاہ کا منتہیٰ، نصب العین، کعبے کو رکھو یعنی اس نظام کو رکھو جس کا محسوس مرکز ہم نے کعبے کو قرار دیا ہے۔

عزیزانِ من! ضمناً بات آ جاتی ہے کہ جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر وہ الفاظ ہی رہتے، وہ رسم ہی رہتی ہے۔ یہ جو قرآن کریم کا چودہ سو سال پہلے، اس قسم کا نظام دینا اور اس میں یہ تصورات دینا، دنیا کی تاریخ میں آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ وہاں عیسائیوں کو کہیں یہ نہیں کہا ہوا ہوگا کہ تم اپنی نگاہ کا رخ قسطنطنیہ کی طرف یا روم کی طرف رکھو، مجوسیوں کو کہیں نہیں کہا گیا کہ تم اپنی نگاہ کا رخ تہران کو رکھو، ہندوؤں سے کہیں نہیں کہا گیا، وہ تو خیر ہندوستان سے باہر کہیں جاتے ہی نہیں تھے کہ تم اپنی نگاہ کا رخ مثلاً ہر دوار کو رکھو یا بنارس کو رکھو۔ یہ چیز قرآن کریم نے پہلی دفعہ کہی کہ جو مملکت کسی نظریہ یا نظام کے تابع وجود میں آئے گی، اس کا جو مرکز محسوس ہوگا، وہ تمہاری نگاہوں کا منتہا اور نصب العین ہونا چاہیے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جہاں بھی تم ہو تمہاری نگاہ کا منتہیٰ اور نصب العین کعبہ ہونا چاہیے۔

کعبہ کے سلسلہ میں دین کے پیش کردہ تصور سے ہٹ کر مذہب کے پیدا کردہ تصورات کا نتیجہ

میں کہہ رہا تھا کہ یہ تو دین میں کعبے کی پوزیشن ہے اور جب دین مذہب میں بدلتا ہے تو پھر وہ الفاظ تو وہی رہتے ہیں' بلکہ وہ رسم بھی وہی رہتی ہے (مثلاً) نماز کی نیت میں آپ کو یاد ہے کہ ہمیں کہنا پڑتا ہے ''منہ طرف قبلہ شریف کے'' بس اب وہ قبلہ شریف کا ہمارے لیے صرف یہ مقصد رہ گیا ہے کہ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو وہ چار رکعت نماز فرض' نماز ظہر' پیچھے امام کے' منہ طرف قبلہ شریف کے' اللہ اکبر رسمی طور پر ہی یہ الفاظ ہم بول دیتے ہیں۔ اس کی پابندی بھی اتنی ہوتی ہے کہ رُخ تمہارا صحیح نہیں ہوا' نماز نہیں ہوئی' مسجدوں کا رخ قبلے کی طرف کرنے کے لیے بڑی احتیاط برتی جاتی ہے لیکن یہ صرف مسجد کا رخ ہے' نماز میں آپ کا منہ قبلے کی طرف' بس اتنا ہی رہ گیا ہے۔ وہ جو ایک نظریہ حیات' ایک نظامِ زندگی کا مرکز' ایک خدا کی کتاب کی اطاعت کا مرکز محسوس تھا وہ تصور کہیں باقی نہیں ہے۔ ساتھ کی مسجد والا بھی یہی کہتا ہے ''منہ طرف قبلہ شریف کے'' اس مسجد والا بھی کہتا ہے ''منہ طرف قبلہ شریف کے'' دونوں کی نمازیں الگ الگ ہوتی ہیں' پھر ''منہ طرف قبلہ شریف کے'' ان سب کا مشترک رہ گیا ہے۔ ''رخ کعبے کی طرف قلب اور نگاہ کا مرکز اسے ہونا'' یہ کہیں باقی نہیں ہے۔ مذہب میں آ کر مفہوم بدلتا ہے۔ رسم وہی رہتی ہے' الفاظ وہی رہتے ہیں لیکن اس کا مفہوم بدل جاتا ہے۔ مسلمانوں کی مملکتیں اتنی ہیں' ہر ایک کا اپنا اپنا نظام' اپنے اپنے ضوابط وقوانین ہیں' اپنی اپنی مملکتیں ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ جنگیں بھی ہوتی ہے' لڑائیاں ہوتی ہیں' برسوں تک بھی چلتی ہیں' دونوں جب نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو ''منہ طرف قبلہ شریک کے'' دونوں کہتے ہیں۔ یاللعجب!!

مسلمانانِ ملت کی منزلِ منتہا کی عملی شکل اور اُس کی مثال

اب بس ''قبلہ شریف کا مقصد'' اتنا ہی رہ گیا کہ ''منہ طرف قبلہ شریف کے'' یہ الفاظ کہہ دیئے یا نماز میں واقعی اپنا رخ صرف قبلے کی طرف کر دیا' جب کہ وہاں تو مقصد یہ تھا کہ تمہاری نگاہوں کا منتہا' اس نظریہ حیات کے مرکزِ محسوس کی طرف ہونا چاہیے' جس کے تم پابند ہو' خواہ تم دنیا میں کہیں بھی کیوں نہ ہو۔ اقبالؒ کی مثال بھی بڑی جامع ہوتی ہے۔ وہ اس امت کے متعلق کہتا ہے' کیا خوبصورت مثال ہے! کہ یہ پرندے سارا دن ان فضا کی پہنائیوں میں اڑتے رہتے ہیں' سینکڑوں ہزاروں میل کی مسافت طے کرتے ہیں' فضا کے اندر سارا دن رہتے ہیں' اپنے آشیاں سے معلوم نہیں کتنی کتنی دور یہ چلے جاتے ہیں' پھر کوئی سڑک نہیں ہے' کوئی Signals نہیں ہیں' کوئی اشارات راہ نہیں ہیں' لیکن شام ہوتی ہے تو وہ سیدھے اپنے آشیاں کی طرف آ جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس امت کی کیفیت یہ تھی کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ

یہ فضا کی پہنائیوں میں یگانہ اڑتی ہے اور کسی دوسرے کو اپنے ہمدوش بھی نہیں ہونے دیتی' یگانگی میں اکیلی ہے اور

نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ

وہ پرندہ کہیں بھی اڑتا ہوا جائے' اس کی نگاہوں میں ہر وقت اپنا آشیانہ رہتا ہے۔ اس لیے جب بھی اس کا جی چاہتا ہے بغیر کسی قسم کے نشانِ راہ کے سیدھا اپنے نشیمن میں آ جاتا ہے۔ یہ تھا مقام کعبے کا۔

کعبہ کی طرف بار بار نبی اکرم ﷺ کی اٹھنے والی نگاہوں کے سلسلہ میں ارشادِ خداوندی

اب یہاں سے یوں بات سمجھ میں آ جائے گی کہ مدینے میں سب کچھ حاصل ہے' مملکت حاصل ہے' حکومت حاصل ہے اور اس کے بعد تو پھر مدینے کی اپنی آبادی بھی' وہ تھی کہ مسلمانوں پر مشتمل تھی' کسی غیر کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ سب کچھ حاصل تھا۔ اس کے باوجود یہ بھی کہ ''نگاہِ او بہ شاخِ آشیانہ'' کتنی خوبصورتی سے حضور ﷺ کی اس قلبی آرزو کو قرآن حمید نے ادا کیا! کہا کہ قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِکَ فِی السَّمَآءِ (2:144) اے رسول! ہم جانتے ہیں کہ تُو بار بار آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر کس آرزو کے لیے خدا سے دعا کرتا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ نَرٰی (2:144) ہم دیکھتے ہیں' آہاہاہا! ہم تمہاری آنکھوں کو دیکھتے ہیں کہ کس اشتیاق سے تم یہ آرزو اپنے دل میں رکھتے ہو! یہ آرزو کیا ہے؟ کہا کہ فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا (2:144) تم نگاہیں آسمان کی طرف اٹھا کر دل میں آرزو رکھتے ہو' خواہ زبان پہ نہیں بھی لاتے لیکن ہم تو دلوں کی بات بھی جانتے ہیں' تو اطمینان رکھیے۔ تم جو کہتے ہو کہ مملکت خداوندی ہو اور اس مملکت کا محسوس مرکز جو ہو' وہ دوسروں کے قبضے میں ہو' اس پر ہمارا اقتدار و اختیار نہ ہو' یہ بات تو کوئی جچتی نہیں ہے' ہم نے یہاں (مدینہ میں) اپنی مملکت قائم کی' حکومت قائم کی' یہ ہمارا دار الخلافہ بھی ہے۔ لیکن اس نظریۂ زندگی کی علامتِ محسوس تو کعبہ ہے تو ہماری مملکت اس نظریۂ زندگی پر استوار ہو اور اس کا جو مرکز محسوس ہے' وہ غیروں کے قبضے میں ہو۔ کہا کہ یہ ہے وہ اضطراب جو تمہارے دل میں ایک ہیجان بن کر بار بار اُٹھتا ہے اور تم اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھاتے ہو۔ کیا خوبصورت انداز ہے کہ ہم دیکھتے ہیں تمہاری نگاہوں کو کہ کس قدر اشتیاق بھری نگاہیں ہیں! یہ تو کوئی بات نہیں' یہاں سے یہ کہا کہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس پر اقتدار تمہارا ہی ہوگا اور یہ چیز مدینے کی زندگی میں کہی جا رہی ہے۔

توحید کے بلند ترین نصب العین کی خاطر کعبے سے بلند ہونے والی اذان کو عملی شکل دینا ہے: خدا کا وعدہ

یہیں وہ آیت آئی جس کو میں نے عرض کیا تھا۔ کہا ہے کہ فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ (2:144)۔ اس دوران بھی تم یہی کہو کہ اگرچہ وہ کعبہ تمہاری تولیت میں نہیں ہے لیکن تم اپنی نگاہوں کا رخ اسی طرف رکھو کہ وہی ہونا ہے اور یہ ہے وہ اگلا فقرہ وَ حَیۡثُ مَا کُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَکُمۡ شَطۡرَهٗ (2:144) دنیا کے کسی گوشے میں بھی تم کیوں نہ ہو' اپنی نگاہوں کا رخ اسی سمت کو رکھو۔ یہ ہے توحید' عزیزانِ من! محسوس توحید! یہ ہے حکومت: صرف ایک خدا کی کتاب کی' مملکت کا قیام اسی نظریہ پر' اور اس کا مرکز محسوس کعبہ۔ ہر فرد جتنے بھی تمہارے ہاں ہیں' خدا پر اور قرآن پاک پر ایمان رکھنے والے' ان کی نگاہوں کا منتہا یہ کعبہ ہو۔ کہیں بھی' دنیا کے کسی گوشے میں تم

کیوں نہ ہو اپنی نگاہوں کا رخ وہیں رکھو تمہارا منتہا اور نصب العین وہی ہونا چاہیے۔ تو اب کعبے کی اہمت ہمارے ذہن میں آ گئی کہ کیوں بار بار حضورﷺ کی نگاہوں کا رخ آسمان کی طرف اُٹھتا تھا۔ اس آرزو کو قلب میں لیے ہوئے کہ کعبے پہ تولیت تو ہماری ہی ہونی چاہیے اور خدا اس کا وعدہ کرتا ہے کہ یہ ہوگا' یہ ہم کر دیں گے۔ یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ سورۃ الفتح اس اعتبار سے بڑی عظیم ہے' اس میں یہ بات آئی ہے۔

قبل از اسلام کعبہ کی کیفیت اور ہجرت کے 6 سال بعد آپﷺ کے خواب کا ذکر

ہجرت کے چھ برس گزر گئے۔ ابھی مسلمانوں پر حج فرض نہیں ہوا تھا۔ حج تو پہلی دفعہ 9 ہجری میں فرض ہوا ہے۔ مشرکینِ عرب صرف عرب ہونے کی حیثیت سے کعبے کو اپنا مرکز مانتے تھے اور وہ حج کیا کرتے تھے۔ یہ اصل میں ملتِ ابراہیمی کے اتباع میں کیا کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرتِ اسماعیلؑ کو یہاں بسایا تھا۔ یہ حجاز کے یا کعبے کے گرد کے مسلمان یا قریش وغیرہ' جو بھی تھے' یہ انہی کی نسل سے تھے' کعبہ انہی کا تعمیر کردہ تھا' یہ اپنی اس قبل از اسلام زندگی میں بھی کعبے کو اپنی زندگی کا مرکز ہی مانتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں کعبے کی بڑی اہمیت تھی اور کعبے کے متولی ہونے کی جہت سے' قریش کی بڑی اہمیت تھی۔ عرب کے دیگر قبائل میں تو یہ حج بھی کیا کرتے تھے' عمرہ بھی کیا کرتے تھے اور حج کے ایام میں تو قریباً ایک مہینے تک یہاں میلے لگا کرتے تھے لیکن وہ حج یہ نہیں تھا جو قرآن کریم نے تجویز کیا ہے کہ یہاں پہنچ کر تم خدا کے احکام پہ قربان ہو جانے کے اپنے وعدے کی تجدید کیا کرو۔ وہ میلے کی ایسی شکل ہوتی تھی لیکن اجتماع بڑا عظیم ہوتا تھا' وہ حج کا مقصد بھی ہوتا تھا۔ قریباً چھ برس گزر گئے۔ یہ ہجرت کے بعد مسلسل لڑائیوں میں گزرے۔ 6 ہجری کا یہ واقعہ ہے' تاریخ میں یہ ہے' قرآن کریم میں اس خواب کا ذکر ہے کہ نبی اکرمﷺ نے اپنے خواب میں دیکھا کہ آپؐ مکے تشریف لے گئے ہیں' حج کر رہے ہیں یا عمرہ کر رہے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ نبی کے خواب یا دوسروں کے خواب میں کیا فرق ہے۔ نفسیاتی طور پر' سائیکلوجیکلی' شدت آرزو انسان کے نفسِ غیر شعوریہ کے اندر جاگزیں ہو جاتی ہے۔ وہ رات کو' جب شعور معطل ہوتا ہے' تو وہ جو آرزوئیں ہوتی ہیں' وہ ابھر کر خواب کی شکل میں انسان میں آ جاتی ہیں۔ یہ خواب کا عام فلسفہ ہے جو سائیکلوجیکلی (نفسیاتی طور پر) بیان کیا جا رہا ہے۔ کوئی بھی وجہ ہو' میں نے کہا ہے کہ میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ میں صرف واقعاتی بات عرض کرتا ہوں۔

نبی اکرمﷺ کا چودہ سو کے قریب صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرے کے سفر کی روداد

آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپﷺ حج کر رہے ہیں۔ یہ ذیقعد کا مہینہ تھا۔ اس کے بعد کا ذی الحج ہوتا ہے۔ آپﷺ نے ارادہ کیا' کہ اس سال ہم عمرے کے لیے چلتے ہیں یعنی حج کے لیے بھی نہیں بلکہ اس سے پہلے عمرے کے لیے۔ آپﷺ نے اس آرزو کا'

اپنے اس ارادے کا اظہار فرمایا تو ظاہر ہے کہ یہ جو جانثارانِ حضورﷺ تھے ان کے دل میں بھی تو حج یا کعبے کا خیال ابھرا یا مکے میں جانے کی آرزوئیں ایسی ہی تھیں خواہ اتنی شدید نہ بھی ہوں لیکن بہرحال ان کے دل میں بھی تھیں اور پھر یہ کہ جب حضورﷺ نے اس ارادے کا اظہار فرمایا تو یہ صحابہؓ کی جماعت ازخود ساتھ تیار ہوگئی تو قریباً چودہ سو کی تعداد تھی جوانؓ کے ہمراہ تھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانے میں یہ بہت بڑی تعداد ہوتی تھی اور مدینے سے مکے کا سفر بھی تو آپ دیکھیے کہ اس زمانے کا سفر اتنا طویل ہوتا تھا تو بہرحال چودہ سو کی جماعت حضورﷺ کے ساتھ عمرے کے ارادے سے نکلی، آپﷺ ساتھ تشریف لائے۔ مکے سے ایک منزل پہلے یعنی کچھ میل پہلے ہی، ایک مقام ہے، اسے حدیبیہ کہتے ہیں۔ عام طور پہ وہاں بستی ہوتی تھی جہاں کوئی پانی کا چشمہ ہو، وہی نخلستان ہوتا تھا، وہیں کچھ تھوڑے سے جھنڈ کھجوروں کے درخت کے ہوتے تھے اور وہیں ایک چھوٹی سی بستی بس جاتی تھی۔ تو اس مقام پہ حضورﷺ نے صحابہؓ کے ساتھ قیام فرمایا۔ اہلِ مکہ کو پیغام بھیجا کہ ہم لوگ صرف عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں، ہمارا کوئی اور ارادہ نہیں ہے تو امید ہے کہ تم مزاحمت نہیں کرو گے۔ عربوں کے ہاں قبائل کو یہ عام اجازت تھی کہ حج اور عمرہ کے زمانے میں وہ بلا کسی قسم کی رکاوٹ کے مکے آسکتے تھے، حج کر سکتے تھے یا عمرہ کر سکتے تھے، واپس جاسکتے تھے اس میں کسی قسم کی اجازت کی بھی ضرورت نہیں تھی، نہ کبھی کوئی مزاحمت ہوتی تھی۔ یہ ان کے ہاں کی ایک روایت تھی، عربوں کی ایک Tradition (رسم) تھی کہ ایسا ہوتا تھا تو اس اعتبار سے بھی یہ جو نبی اکرمﷺ اور آپﷺ کے صحابہؓ ساتھ تشریف لائے تو عرب کی اس Tradition (رسم) کے مطابق بھی آپﷺ وہاں عمرے کے لیے جاسکتے تھے لیکن اس اعتبار سے کہ ان قریش کے ساتھ، اتنے سالوں یہ لڑائیوں کا سلسلہ جاری ہے، مبادا ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ ہم کسی اور ارادے کو لے کر آئے ہیں تو حضورﷺ نے اس ارادے کا اظہار فرما دیا اور بتانے کے لیے آدمی بھیج دیا لیکن انہوں نے نہ مانا۔ انہوں نے دیکھنے کے لیے فوج کا ایک دستہ بھیج دیا تو وہ جو دستہ فوج تھا، حضورﷺ کے ساتھیوں نے ان کو آسانی سے گرفتار کر لیا۔ ایک تو کسی قسم کی جنگ کا ان کا ارادہ ہی نہیں تھا اور پھر یہ چار مہینے میں جن میں جنگ کرنا منع ہے، کیوں کہ عرب جاہلیت کے زمانے سے ان کے ہاں کی یہ روایت چلی آتی تھی کہ سال میں وہ چار مہینے ایسے رکھتے تھے کہ جن میں جو لوٹ مار یا جنگ و جدل تھا، ان کے ہاں ان کی Tradition (روایت) یہ تھی کہ اس زمانے میں جنگ نہیں کی جائے گی تو یہ مہینہ بھی وہی تھا جس میں ان کی روایت کے مطابق بھی جنگ نہیں کی جاسکتی تھی اور حضورﷺ نے پھر اطلاع بھی ان کو بھیج دی۔ اس کے باوجود انہوں نے فوج کا دستہ بھیج دیا یعنی اپنی روایت کے خلاف یہ کیا لیکن صحابہ کرام نے ان کو گرفتار کیا ہے تو گرفتار کرنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ نہ ہمارا جنگ کا ارادہ تھا اور نہ ہی وہ مہینہ ہے جس میں جنگ کی جاسکتی ہے اس لیے ہم تمہیں چھوڑتے ہیں۔ انہیں چھوڑ دیا، وہ واپس چلے گئے۔ آپﷺ نے حضرتِ عثمانؓ کو بھیجا کہ آپؓ جا کر مکے والوں سے بات کر آئیے کہ تمہیں پھر غلط فہمی پیدا ہوئی جو تم نے فوج کا ایک دستہ بھیج دیا ہے۔ ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے، ہم

صرف عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ تشریف لے گئے تو یہ خبر مشہور ہوگئی کہ قریش نے آپؓ کو گرفتار کر کے نظر بند کر لیا ہے۔ اب اس کے معنی ان کی طرف سے اعلانِ جنگ کے تھے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مسلمان ہونے کے لیے ایک معاہدے کا پابند ہونا ضروری ہوتا ہے

یہ وہ مقام تھا جہاں اس سورۃ میں آتا ہے کہ نبی اکرمﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ اسلام لاتے وقت تم اپنے خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہو کہ اِنَّ اللّٰهَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ وَ اَمۡوَالَهُمۡ بِاَنَّ لَهُمُ الۡجَنَّةَ(9:111) یہ جسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص مسلمان ہوگیا' ہم تو خیر مسلمان ہوئے ہی نہیں ہیں' مسلمان کے گھر میں پیدا ہوگئے' تو وہ مسلمان ہونے کے لیے صرف کلمہ پڑھنا ہی کافی نہیں ہے۔ یہ ایک معاہدہ کیا جاتا ہے' یہ ایک Agreement (عہد) کیا جاتا ہے اور وہ عہد یہ ہے کہ ''میں اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچتا ہوں اور خدا اس کے مقابلے میں کہتا ہے کہ میں اس کے عوض میں تمہیں جنت عطا کرتا ہوں۔'' یہ ایک معاہدہ ہوتا ہے جو اس عہد نامے پر دستخط کرے کہ میں اپنا جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچتا ہوں۔ وہ مسلمان ہوتا ہے تو اس اعتبار سے تو یہ عہد نامہ ان سب نے کیا ہوا تھا لیکن پھر ایسا وقت آجاتا ہے جہاں فی الواقعہ اس عہد نامے پر عمل کرنے کا ایک زمانہ آتا ہے' ایک وقت آتا ہے' ایک موقعہ آتا ہے تو جیسے یہ فوج کے Reservists ہوتے ہیں' یوں وہ سارا وقت فوجی ہوتے ہیں' ان پہ ذمہ داریاں ہوتی ہیں لیکن اپنا کام کاج کرتے ہیں' جنگ کا اعلان ہوتا ہے تو انہیں پھر اس سپاہی کی حیثیت سے میدانِ جنگ میں جانا پڑتا ہے۔ اس زمانے میں مومنین کی یہ کیفیت تھی۔

حدیبیہ کے مقام پر بیعتِ رضوان کی روداد

اب جو حضورﷺ نے بھانپا کہ ان لوگوں کی نیت نیک نہیں ہے تو آپﷺ نے وہیں حدیبیہ کے مقام پر' ایک درخت کے نیچے' جسے شجر رضوان کہا گیا ہے' اس عہد کی تجدید کی۔ یہ اس سورۃ میں آگے آتا ہے۔ یہ بڑا حسین منظر ہے کہ آپﷺ نے پھر صحابہؓ سے کہا کہ لو بھائی! وہ جو تم نے خدا کے ساتھ معاہدہ کیا تھا' اس معاہدے پر عمل پیرا ہونے کا موقع اب آ گیا ہے تو آؤ تجدیدِ بیعت کرو۔ یہ بیعت کے معنی اب آپ سمجھے۔ یہاں تو بیعت حضرت صاحب کی ہوتی ہے کہ میں فلاں حضرت صاحب کا بیعت ہوں۔ جی! میں نے وہاں سے بیعت کر لی ہے۔ بیع کے تو معنی ''بیچ دینا'' ہوتا ہے یہ جو اِنَّ اللّٰـهَ اشۡتَرٰی (9:111) ہے کہ خدا نے خرید لیا تو مومن نے اپنی جان اور مال بیچ دیا۔ بیع کے معنی تھے یہ بیع ہوتا تھا بیچنے والا' خدا مشتری ہوتا تھا خریدنے والا۔ اس معاہدے کو بیعت کہتے تھے تو وہاں آپﷺ نے کہا کہ وہ جو تمہارا بیعت کا عہد نامہ ہے اس کو عمل پیرا ہونے کا وقت آ گیا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک قریش سے جتنی جنگیں ہوئی ہیں' ان میں یہ جنگ شاید قولِ فیصل ہے کیونکہ ہم مکے کے قریب آپہنچے ہیں اور یہ اپنے گھر کے اندر ہیں۔ یہ تو مدینے میں جا کر ہمارے اوپر

حملے کیا کرتے تھے اور اب تو ہم ان کی گرفت میں ہیں اور یہ چونکہ عمرہ کی نیت سے آئے تھے' ہتھیار بھی ساتھ نہیں تھے تو یہ کہا کہ اگر اس مقام پہ انہوں نے ہمیں مار دیا تو یہی تو ساری ہماری کائنات ہے' جو ہم یہاں لے کر بیٹھ گئے ہوئے ہیں۔ حالات یہ ہیں اس لیے آپ دیکھ لیجیے آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ کتنا نازک وقت ہے' جس میں ہم اس وقت آ گئے ہیں اور یہ وقت ہے جو آپ کو اپنے ایمان کی صداقت کی شہادت پیش کرنا ہو گی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہاں پھر حضور ﷺ کے ہاتھ پہ یہ لوگ تجدید بیعت کرتے تھے' اپنا جو مال بیچا ہوا تھا اس کی تجدید کرتے تھے کہ ہاں ہم نے جان اور مال بیچ دیا ہے۔ یہ ہم اس سورۃ کے اندر ان آیات پہ آئیں گے۔ یہ بڑا حسین و جمیل منظر ہے جس میں قرآن کریم نے بیان کیا ہے۔ حضور ﷺ بیعت لینے والے ہیں' خدا بیان کرنے والا ہے۔ اب اس سے زیادہ اور جمیل و حسین منظر کیا ہو گا۔ آپ دیکھیں گے کہ وجد آفریں انداز ہے' جس میں یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ بیعت تھی جسے بیعتِ رضوان کہتے ہیں' یہ درخت ہے جس کو آج تک شجرِ رضواں کہتے ہیں یعنی وہ خدا کے معاہدے سے ہم آہنگ ہو جانا۔ یہ ہوتا ہے رضوان کے معنی لیکن اتنے میں اطلاع آ گئی کہ نہیں' انہوں نے حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا ہے اور وہ آ رہے ہیں اور انہوںؓ نے آ کر یہ بات کہی کہ وہ صلح نامہ کے لیے آمادہ ہیں' وہ صلح کرنا چاہتے ہیں' جنگ نہیں کرنا چاہتے بشرطیکہ ان کی جو شرائط ہیں وہ منظور کر لی جائیں تو آپ نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ ہمارا ارادہ تو جنگ کرنے کا تھا ہی نہیں' صلح کی شرائط کے لیے وہاں کا نمائندہ آ گیا۔ یہ نبی اکرم ﷺ سے As Head of the State (بحیثیت سربراہ مملکت)' معاہدہ ہونا تھا۔

بیعتِ رضوان کے دوران ہر دو فریقین کے مابین طے پائی جانے والی شرائط اور ان کا تجزیہ

اب وہ معاہدہ[1] جو کچھ بھی تاریخ میں آتا ہے' وہ ایسا ہے کہ جس میں نظر بظاہر یوں دکھائی دیتا ہے کہ مسلمانوں نے یا حضور ﷺ نے بڑا دب کر (Under Pressure) ان کے ساتھ صلح کی مثلاً پہلی جو چیز ہے' میں ابھی واضح کروں گا کہ اس میں کتنا تضاد ہے۔ اس معاہدے کی پہلی چیز یہ ہے کہ اس دفعہ آپ مکے میں نہیں آ سکتے' عمرہ نہیں کر سکتے' واپس چلے جانا ہو گا۔ کہا کہ اچھا' دوسری چیز یہ ہے کہ آپ کے جو مسلمان یہاں مکے میں رہ گئے ہیں' ہم ان کو نہیں جانے دیں گے۔ کہا کہ بہت اچھا۔ تیسری چیز یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اگر کوئی لوگ وہاں مسلمان کسی طرف سے بھی مکے میں آ گئے تو ہم اس کو روک رکھیں گے۔ کہا کہ بہت اچھا' چوتھی چیز یہ کہ مدینے میں اگر ہمارے ہاں کا کوئی آدمی اس وقت بھی ہے یا اس کے بعد بھی جائے گا تو اس کو آپ نہیں روکیں گے' وہ واپس مدینے میں آئے گا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ بہت اچھا۔ یہ ہیں وہ شرائط جو عام طور پہ تاریخ میں ملتی ہیں۔ ان شرائط پہ یہ صلح کی گئی تھی' تو نظر آ رہا ہے جیسے عام حالات میں کہ دب

---

[1] جسے صلح حدیبیہ (628ء) کہتے ہیں۔

کر صلح کی گئی ہوئی ہے۔ تاریخ میں یہ ہے۔ میں بار بار تاریخ کہہ رہا ہوں۔ یہ جو حدیث کی معتبر ترین کتاب مانی جاتی ہے' یہ بخاری شریف ہے۔ یہ ساری تفصیل اس میں بھی ہے اور بڑی تفصیل سے یہ سارا کچھ لکھا ہے اور اس میں یہ بھی ہے کہ ان شرائط پر' میں نے عرض کیا ہے کہ چونکہ یہ شرائط حدیثوں کے اندر' روایات کے اندر' تاریخ کے اندر ہیں جو' میں بیان کر رہا ہوں ورنہ میں خود اس سے متفق نہیں ہوں کہ صحابہؓ نے اور بالخصوص اس کے اندر جو پھر حضرت عمرؓ کا نام لیا جاتا ہے تو انہوں نے ان کی مخالفت کی۔

صلح کے دوران حضرت عمرؓ کی طرف سے کیے گئے اعتراضات' حقیقت کے آئینہ میں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے تاریخ والوں نے یا روایت کرنے والوں نے' حضرت عمرؓ کا تو عجیب قسم کا کچھ کیریکٹر چن رکھا ہے کہ جو ہر بات ہے' اس کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ (معاذ اللہ)۔ اپنی طرف سے یہ بہت خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے جو ایک بڑا دبنگ قسم کا آدمی ہے' اس کو تیار کر رکھا ہے' سوچتے نہیں کہ کس کے مقابلے میں صاحب! حضور نبی اکرم ﷺ کے سامنے آئے ہیں کہ جی! انہوں نے بڑا اعتراض کیا کہ یہ تو بالکل بدتر صلح کرنے کی بات ہے' ہم جانیں دیدیں گے' ہم یہ شرائط نہیں مانیں گے حتیٰ کہ یہ بھی بات تھی کہ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم شروع کرو تو کہا کہ یہ تو ٹکڑا مسلمانوں کا ہے اور ہم تو بسم اللہ اللھما کہتے ہیں جب کہ رحمٰن اور رحیم کو ہم نہیں مانتے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ بہت اچھا! یہ بھی لکھ لو تو پھر لکھا گیا کہ یہ عہدنامہ ہے' محمد رسول اللہ ﷺ کا قریش کے فلاں کے ساتھ کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو اگر رسول مانتے تو یہ جھگڑا ہی کیوں ہوتا۔ ہم یہ بھی نہیں لکھنے دیں گے۔ کہا کہ اچھا جی! یہ بھی نہ لکھو اور پھر آگے وہ شرائط ہیں جو میں نے ابھی عرض کی ہیں۔ تو اس پہ وہاں یہ لکھا ہوا ہے۔ اس پہ صحابہؓ عام طور پہ اور خاص طور پہ حضرت عمرؓ نے تو نبی اکرم ﷺ سے یہ کہہ دیا کہ کیا آپ ﷺ خدا کے سچے رسول نہیں ہیں؟ کہنے لگے کہ سچا رسول ہوں۔ کہنے لگے کہ پھر آپ ﷺ یہ فرما کر آئے تھے کہ وہاں ہم عمرہ کرنے کے لیے جاتے ہیں اور بغیر کیے ہوئے واپس چلے جا رہے ہیں تو اس میں لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہم اسی سال عمرہ کریں گے۔ اندازہ لگائیے' عزیزانِ من! مجھے تو بے حد دکھ ہوتا ہے جب میں یہ چیزیں بیان کرتا ہوں (معاذ اللہ معاذ اللہ)' اس قسم کی جو ایک منطقی استدلالیت ہے' وہ حضور ﷺ جیسی ذاتِ عظمت و اعلیٰ کے منہ پہ سجتی نہیں ہے کہ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کرلیں۔ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ صاحب! اگر یہ بات یقینی طور پہ نہیں تھی تو اس سال پھر عمرہ کرنے کے لیے آپ ﷺ نکلے کیوں؟ یہ ہے ہمارے ہاں کی روایات کی تاریخ کہ جی! وہ بڑے غصے میں آئے اور انہوں نے کہا کہ صاحب! پھر بہت سمجھا بجھا کر ان کو ٹھنڈا کیا' وہ آرام سے بیٹھے اور اس کے بعد یہ ہے کہ حضرت عمرؓ ساری عمر جب یہ واقعہ یاد کرتے تھے' بڑی ندامت ہوتی تھی' رویا کرتے تھے' استغفار پڑھا کرتے تھے' تو یہ کیا کرتے تھے کہ میں نے بڑی گستاخی کی' میں نے یہ کیا' کیا۔ کیا باتیں لکھی ہوئی ہیں!

صلح نامے کے برعکس بخاری شریف میں تو آپ ﷺ کے عمرہ کرنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے: یہ بھی ہے اور وہ بھی

اس کے علاوہ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ جو چیز کہی جاتی ہے وہ کس قدر نامناسب ہے۔ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ ہماری یہ تاریخ' ہماری یہ روایات' قابلِ اعتماد ہیں ہی نہیں۔ بخاری شریف کی کتاب میں جو کتاب الصلح ہے اس کے وہ Chapters (ابواب) ہیں۔ مختلف کتاب الصلح کے اندر یہ واقعہ درج ہے اور اس کے ساتھ ہی مسلسل یہ واقعہ آگے ہے لیکن اس میں کتاب الشرائط بھی ہیں یعنی اگلا Chapter ہے' جس میں مسلسل یہی واقعہ ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھیے گا جو میں ابھی کہنے لگا ہوں۔ یہ جو کتاب الصلح ہے' یہ بخاری شریف تو ہر جگہ موجود ہے' ہر جگہ پڑھائی جاتی ہے' اس کتاب الصلح میں یہ واقعہ درج ہے' اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ معاہدہ اس پہ ہوا تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ اسی سال' اسی وقت' معاہدے کے بعد مکے میں آئیں گے اور عمرہ کر لیں گے اور پھر اس معاہدے کے بعد آپ ﷺ اور صحابہؓ مکے میں تشریف لے گئے' عمرہ کیا' تین دن مکے میں رہے اور تیسرے دن قریش نے یہ کہا کہ بھئی! معاہدے کی رو سے اب وہ وقت ہو گیا' اب آپ واپس چلے جایئے اور تیسرے دن آپ ﷺ واپس آئے یعنی اسی معاہدے کے اسی سال' اس وقت وہیں سے یہ عمرہ کر کے گئے' جس پہ یہ تاثر تو دے دیا کہ وہ دب کر صلح نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ جو عمرہ کرنے کا مقصد تھا وہ تو حاصل ہو گیا تھا اور پھر یہ چیز کہ رسول اللہ ﷺ نے جو عمرہ کرنے کے لیے آئے تھے خواب میں دیکھا ہے تو وہ خواب بھی صحیح نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے عمرہ تو کیا تھا' یہ کتاب الصلح میں بخاری شریف میں لکھا ہوا ہے۔

اور اگلی سطر میں' جب شروع ہوتا ہے' تو وہ صرف Heading Chapter (باب کا سرورق) ہے' واقعہ آگے چلتا ہے اور اس میں لکھا ہوا ہے کہ انہوں نے عمرہ نہیں کرنے دیا' آپ ﷺ نے معاہدے میں لکھ دیا کہ اس سال نہیں۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ اگلے سال ہم آئیں گے تو پھر ایسا کریں گے اور آپ ﷺ بغیر عمرہ کیے واپس آ گئے۔ اسی کتاب میں' اسی ورق پر' دو سطریں آگے' درمیان میں' صرف وہ کتاب الشرائط لکھ کر' اور آگے یہ تفصیل دی ہوئی ہے اور اس تفصیل میں حضرت عمرؓ کا برافروختہ ہونا یا ناراض ہونا' یہ سارا صلح نامہ لکھا جانا' اس صلح نامے کے اندر یہ لکھا گیا ہے کہ اس سال واپس چلے جائیں گے بغیر عمرہ کیے ہوئے اور اگلے سال پھر آئیں گے اور یہاں آ کر پھر تین دن کے لیے مکے میں رہیں گے۔ یہ سارا معاہدہ لکھا ہوا ہے اس بخاری کتاب الشرائط میں' اور وہ جو ابھی میں نے عرض کیا ہے' باب الصلح کا آخری جو واقعہ ہے وہ یہی ہے اور اس میں یہ لکھا ہوا ہے کہ یہ اسی معاہدے میں تھا کہ اسی سال ابھی آپ ﷺ تین دن کے لیے مکے آ کر عمرہ کر لیجیے۔ آپ ﷺ نے عمرہ کیا۔ تین دن کے بعد انہوں نے کہا کہ معاہدے کے مطابق وقت ہو گیا ہے تو پھر آپ ﷺ تین دن کے بعد واپس تشریف لائے۔ یہ دونوں چیزیں ایک ہی جگہ' ایک ہی کتاب میں' ایک ہی ورق میں' لکھی ہوئی ہیں۔ اس صحیح بخاری

کو اصلح الکتب بعد کتاب اللہ کہا کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کے بعد اس دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے۔ یہ اس کے متعلق واقعہ ہے کہ اس کے ایک ہی واقعہ' ایک ہی Chapter' ایک ہی ورق کے اندر' یہ دو چیزیں وہاں موجود ہیں۔

اب یہ چیز ہے۔ اس تاریخ پہ مدار رکھ کر آپ سوچ لیجیے کہ یہ بات کس نتیجے پہ آ گئی بہر حال یہ سارا جو کچھ میں نے عرض کیا ہے' یہ تاریخ میں ہے۔ تاریخ کے معنی یہ ہیں کہ یہ حدیث کی کتابوں میں ہے۔ یہ اس کا پس منظر ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے۔ حدیبیہ میں معاہدہ بہر حال کوئی ہوا ہے' بیعت رضوان بھی اسی سورۃ میں آتی ہے' نظر آتا ہے کہ معاملہ بڑا نازک ہو گیا تھا لیکن اس میں جنگ کا ذکر نہیں ہے۔ اس لیے نظر آتا ہے کہ بیعت تک تو یہ بات تھی لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ قریش میں کوئی معاہدہ ہوا ہے' معاہدے میں اگر یہ بھی بات ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ مکے کے قریش اگر مدینے چلے جائیں گے تو انہیں زبردستی وہاں سے نکالا نہیں جائے گا اور اگر مسلمان مکے میں آ جائیں گے تو ان کو ہم روک رکھیں گے یا ہم ان کو واپس نہیں جانے دیں گے۔ بظاہر یہ بھی شرائط ایسی ہیں جو نظر آتا ہے کہ بڑی کمزور پارٹی ہے اور اس سے دب کر صلح کی گئی ہے' اس میں یہ چیزیں کچھ آتی ہیں لیکن اس کے باوجود میں نے دیکھا یہ ہے کہ جو غیر مسلمین مؤرخین بھی ہیں' وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ شرائط بھی اگر صحیح ہیں تو اس میں بھی بالادستی نبی اکرم ﷺ کی یا مسلمانوں کی ہے۔

مدینہ منورہ میں قرآنی معاشرے کی بنا پر مرتب ہونے والے نتائج کے نقوش

ہجرت کے بعد اس سارے چھ سال کے عرصے میں کیفیت یہ تھی کہ مکے اور مدینے کی دونوں آبادیاں Cut-off (منقطع) ہو گئیں تھیں' ایک دوسرے کے تعلقات ہی باقی نہیں رہے تھے' نہ مکے والوں کو معلوم تھا کہ مدینے میں مملکت قائم ہوئی ہے تو وہاں کیا نتائج برآمد ہوئے ہیں' نہ مدینے والوں کو یہ معلوم تھا کہ مکے میں جو رہ رہے ہیں' ان کی کیفیت کس قسم کی ہے۔ وہاں مکے کے رہنے والے غیر مسلم مدینے میں ہی دیکھنے کے لیے آ سکتے تھے۔ غیر مسلموں نے یہ لکھا ہے کہ اس سے یہ ہوا' اس شہادت کی کیا بات ہے! کہ مکے کے غیر مسلم قریش جب مدینے گئے تو انہوں نے وہاں جا کر نظام کا جو نقشہ دیکھا تو انہوں نے کہا' کہ ہم مکے میں واپس جائیں گے ہی نہیں اس کے مقابلے میں یہاں کی فضا' یہاں کا معاشرہ' یہاں کا نظام' اس قدر انسانیت ساز اور خوشگوار تھا کہ وہاں سے جو ادھر آئے ہیں تو گو ان کو واپس جانے کی اجازت تھی' ان پہ رکاوٹ نہیں تھی' وہ دونوں معاشروں میں' دونوں فضاؤں' میں تقابل کرتے تھے تو وہ خود واپس نہیں جانا چاہتے تھے' وہ یہاں رہ جانا چاہتے تھے۔ اب رہا یہ جو مسلمان یہاں سے مکے گئے' ان کو انہوں نے واپس مدینے نہ آنے دیا' شرط یہی تھی کہ لوگ مدینے واپس نہیں جائیں گے تو انہوں نے مکے سے نکل کر مکے کے باہر قریب ہی' ایک جگہ ایک سنٹر بنا لیا' تو اب دیکھیے کہ یہ مسلمان' مدینے سے ادھر آئے ہوئے' مکے والوں سے ناراض ہو کر' مکے کے قریب ہی ایک سنٹر بنا رہے ہیں اور وہاں انہوں نے مکے کی مخالفت کا ایک مرکز

بنالیا ہے یعنی یہ دونوں چیزیں مکے والوں پہ ایسی الٹی پڑیں کہ اپنا جو ادھر مدینے گیا ہے وہ واپس نہیں آ رہا' ادھر مدینے سے جو اُدھر آیا ہے تو وہ مکے کے قریب باہر آ کر بس گیا ہے اور مکے کے خلاف انہوں نے مخالفتوں کی مختلف قسم کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ مکے والے تنگ آ گئے تو مکے والوں نے دو سال کے بعد خود التجا کی تھی کہ وہ جو معاہدہ حدیبیہ ہے ہم اس کو منسوخ کرتے ہیں' اس کو توڑ دیجیے' آپس میں رضا مندی سے اس معاہدے کو منسوخ کر دیجیے۔ یہ مکے والوں نے درخواست کی تھی تو بہر حال غیر مسلم مورخین بھی کہتے ہیں کہ اگر یہ شرائط بھی صحیح ہیں' جو ہم دیکھ رہے ہیں تو یہ بھی ان کے حق میں جاتی ہیں' اور وہ تو کہتے ہیں کہ یہ جو شرائط آپ ﷺ نے مان لیں تو یہ نبی اکرم ﷺ کی سیاستِ بالا کی بہت بڑی شہادت ہے۔ اس سے تو نقشہ بدل گیا اور نقشہ ایسا بدلا کہ یہ 6 ہجری کا واقعہ ہے۔ معاہدہ حدیبیہ کا 628ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت 1400 کے قریب آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ گئے تھے۔ رمضان آٹھ ہجری میں جب مکے پر' اس معاہدے کے منسوخ ہونے کے بعد نبی اکرم ﷺ نے حملہ کی تیاری شروع کی تو اب جنگ کی ممانعت نہیں تھی۔

آٹھ ہجری میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دس ہزار فوج کا لشکرِ جرار: کامیابیوں کے دروازے کھل گئے

اب جو آخری بار جنگ کے لیے نبی اکرم ﷺ مکے تشریف لے جا رہے ہیں' دو سال کے اندر دس ہزار کی فوج آپ ﷺ کے ساتھ تھی اور اُدھر مکے والوں کی کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ آپ ﷺ گئے ہیں تو انہوں نے پہلے ہی Surrender کر دیا، جنگ کی نوبت ہی نہیں آنے دی' انہوں نے شکست مان لی۔ کہا یہ جاتا ہے اور یہی چیز ان مورخین نے کہی کہ یہ صلح حدیبیہ (628ء) تمام کامیابیوں اور کامرانیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی چنانچہ قرآنِ حکیم نے اس سورۃ جلیلہ کی ابتدا ان الفاظ سے کی کہ اِنَّـا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا[1] (48:1) آہاہاہا! اب آپ کو بات سمجھ میں آئے گی۔ فتح کے معنی Conquest ہی نہیں ہوتے اسے ہم تو یہی کہتے ہیں کہ جب کسی کی فتح ہو جاتی ہے' عربی زبان میں فتح کے معنی ہوتے ہیں ''کامیابیوں کے دروازے کھول دینا۔'' آیت کے الفاظ اب سمجھ میں آئیں گے کہ قرآن حمید کیا کہہ گیا ہے کہ یہ جو کچھ حدیبیہ کے مقام پر ہوا ہے' اس نے تو تمہارے لیے نہایت واضح کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ تم دیکھو تو سہی کہ کس طرح سے ہجوم کر کے یہ فتوحات' جسے آپ فتح اور کامرانیاں اور کامیابیاں کہتے ہیں' یعنی معنی اس کے یہ ہیں کہ اس کے لیے یہ طائرِ پیش رفت ثابت ہوگی' اس سے پیش رفت ہوگی کیوں کہ اس صلح حدیبیہ نے یہ تمہاری کامیابیوں کے لیے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یہاں سے جو ہوا ہے وہ ہے اِنَّـــا فَتَـحْـنَـــا لَکَ (48:1) تمہارے لیے ہم نے کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ مُّبِیْنًا (48:1) واضح طور پر' جس میں شک وشبہ ہی نہیں رہے گا اور اس طرح سے اس سورۃ کی ابتدا ہوتی ہے۔

---

[1] ہم نے (اے رسول!) تیرے لیے کامیابی وکامرانی کی واضح راہ کشادہ کر دی ہے اور ایک فیصلہ کن انقلاب عنقریب آنے والا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1194)

عزیزانِ من! اور آگے پھر یہ سارے واقعات آتے ہیں۔ اب درس کا ہمارا وقت پورا ہو گیا ہے تو آج اس پس منظر کے ساتھ ہی ہم اسے ختم کرتے ہیں، باقی اس کے بعد یہ جو سورۃ ہے اسے ہم آئندہ لیں گے لیکن آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ اس پس منظر کے بغیر تو یہ پوری سورۃ تو ایک طرف، پہلی آیت ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کو یہ ہمارے ہاں والے فتح ہی کہتے ہیں صاحب! کہ بہت بڑی فتح ہوئی۔ کہنے لگے کہ اتنی بڑی شکست ہوئی اور اس کا نام فتح ہے۔ یہ نہیں کہ یہ قرآن حکیم کیا کہہ رہا ہے، کہہ وہ رہا ہے جو غیر مسلم مورخین اعتراف کرتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے اندر جو حضور ﷺ نے صلح کی شرائط تسلیم کی تھیں وہ آنے والی کامیابیوں اور فتوحات کے لیے پیش خیمہ ثابت ہوئیں اور انہوں نے حضور ﷺ کے لیے دروازے کھول دیئے۔ وہ کہتے ہیں یہ تو حضور ﷺ کی سیاست عالیہ کی انتہا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں اور یہ ہے **اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا** (48:1) عزیزانِ من! اس کا اعتراف غیر مسلم بھی کر رہے ہیں۔

پہلی آیت میں ہی ہم آئے۔ اس پس منظر کو ذہن میں رکھیے اور پھر ہم آگے چلیں تو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورة الفتح (آیات 1 (مسلسل) تا 5)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1982ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفتح سے ہی سمجھیے کہ ہو رہا ہے۔ یہ 26 ویں پارہ کی 48 ویں سورۃ ہے۔

سابقہ درس کی تجدیدِ یادداشت

سابقہ جمعہ کو درس کے وقت بارش کی وجہ سے احباب بہت کم تعداد میں تشریف لائے تھے اور یہ جو سورۃ جلیلہ ہے' اس میں جو واقعہ مذکور ہے' وہ سمجھ میں نہیں آ سکتا تاوقتیکہ اس کا پس منظر سامنے نہ ہو۔ تو سابقہ درس میں وہ پورا درس اسی پس منظر کے لیے وقف ہو گیا۔ اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ احباب جنہوں نے وہ درس سنا تھا' ان کو تو کچھ دقت نہیں ہو گی لیکن جن کے سامنے وہ نہیں ہے' انہیں اس میں دقت پیش آئے گی تو میں سارے کا سارا درس تو دہرا نہیں سکتا' وہ تو پورا درس اس پر مشتمل تھا اور اب مختصر الفاظ میں اسے دہرانا ضروری بھی ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس کے بغیر آگے بات سمجھ میں آ نہیں سکے گی۔ حضورﷺ ہجرت کر کے مدینہ میں تشریف لے گئے۔ ٹھیک ہے وہاں جا کر مملکت کی تشکیل بھی ہوئی' فتوحات بھی ہوئیں لیکن جو نظامِ خداوندی ہے جس کے لیے اس الدین کو تمام نوعِ انسانی کے لیے ضابطہ زندگی اور نظامِ حیات بننا تھا' اس کے معنوی مرکز' قرآنِ کریم کے' مملکت کے' مرکز کی حیثیت سے نبی اکرمﷺ سربراہ تھے لیکن اس کا جو محسوس مرکز تھا اسے اللہ تعالیٰ نے مکے یا کعبے کو ہی قرار دیا تھا۔ ویسے بھی عربوں کو کعبے کے ساتھ خاص نسبت تھی' دل بستگی تھی۔ اسلام سے پہلے' جاہلیت کے زمانے میں بھی' اس مرکزیت کے اعتبار سے قریش کی بہت بڑی عزت تھی۔ یہاں حج ہوتا تھا' عمرہ بھی ہوتا تھا

لیکن اس کی نوعیت اور شکل کچھ مختلف تھی۔ اسلام میں آ کر وہ چیز تو قائم رہی لیکن اس کا صرف مقصد اور منتہیٰ بدل دیا تھا۔ کہنا یہ تھا کہ کعبے کی جو مرکزیت تھی، وہ قائم تھی اور نبی اکرم ﷺ نے جو نظامِ خداوندی متشکل فرمایا، اس میں بھی مرکزیت کعبے ہی کو حاصل ہونی تھی لیکن یہ عجیب چیز تھی کہ قرآن حمید میں یہ ہے کہ مدینے میں بیٹھے ہوئے بھی اے رسول! ہم دیکھتے تھے کہ **قَدۡ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِی السَّمَآءِ** (2:144) کس طرح تُو بار بار اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور یہ آرزو تمہارے دل میں مچل رہی تھی کہ بارِ الٰہا! اس نظام کا مرکز تو کعبے کو بننا ہے اور جو کعبہ ہے، وہ مخالفین کے قبضے میں ہے، مشرکین کے قبضے میں ہے۔ تو یہ بات تو جچتی نہیں ہے، اسے تو اُنہی کی تولیت میں ہونا چاہیے جو اس نظام کو قائم کر رہے ہیں۔ وہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ یہ بات ٹھیک ہے، ہم جانتے ہیں کہ کیا آرزو تمہارے دل میں مچل رہی ہے۔ یہ بڑے حسین الفاظ ہیں۔ اس کی تولیت تمہارے قبضے میں آئے گی تو یہ نظام اس وقت تکمیل تک پہنچے گا۔ لفظ تولیت قرآن کریم نے استعمال کیا ہے۔ کیا بات ہے قرآن حمید کے الفاظ کی بھی، تحویل یا قبضہ نہیں کہا، اس کے لیے بھی تولیت کہا ہے۔

6 ہجری میں نبی اکرم ﷺ نے ایک خواب کی بنا پہ، جس میں یہ دکھایا گیا کہ آپ ﷺ اپنے متبعین کے طائفہ کے ساتھ مکے میں داخل ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا، کہا کہ سارا عرب اور عرب کے قبائل، جتنے بھی ہیں، وہ مکے میں جاتے ہیں، حج کرتے ہیں، عمرہ کرتے ہیں، تو یہ جو یہاں ہماری حیثیت ہے، اس حیثیت سے نہ سہی، عام عربوں کی حیثیت سے تو ہم وہاں جا سکتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے کہا کہ ہم عمرے کے لیے چلتے ہیں۔ جب آپ ﷺ نے یہ اعلان فرمایا تو صحابہ کرامؓ بھی آپ کی رفاقت میں، ہم رکابی میں، چلے۔ یہ حج کے لیے بڑی سعادت تھی، یہ قریباً چودہ سو کے قریب صحابہؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپ ﷺ تشریف لائے۔ مکے سے باہر ایک منزل پہ، حدیبیہ جس کا نام تھا، وہاں آپ ﷺ نے ڈیرہ ڈالا اور مکے والوں کو یہ اطلاع بھیجی کہ ہم جنگ کرنے نہیں آئے، کسی قسم کا اور ارادہ نہیں ہے، ہم صرف عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور ہم اسی طرح مکے میں امن سے واپس نکل آئیں گے، ہم سے کسی قسم کی شورش نہیں ہوگی۔ مکے والوں نے بجائے اس کے کہ اس کے لیے وہ کہیں کہ ہمیں کسی قسم کا اعتراض نہیں ہے، انہوں نے دیکھنے کے لیے فوج کا ایک دستہ بھیج دیا تو وہ آپ ﷺ نے بڑی جلدی اس دستے کو قابو کر لیا چونکہ ویسے بھی حریمِ کعبہ کے اردگرد ہی سہی، وہاں تو جنگ ہوتی نہیں اور یہ جو ذیقعدہ کا مہینہ تھا اس میں تو عربوں کے ہاں معاشرتی نظام کے تابع بھی، ان چار مہینوں میں، جس کو عشر الحرام کہتے ہیں، وہ خود جنگ بند کیا کرتے تھے، تو اس اعتبار سے بھی یہ جنگ ہو نہیں سکتی تھی۔ یہ ذیقعدہ کا مہینہ بھی اسی عشیر الحرام میں آتا ہے۔ اس فوجی دستے کو آپ ﷺ نے اپنے قابو میں کر لیا، گرفتار کر لیا لیکن جنگ نہیں کی۔ کہا کہ ان مہینوں میں چونکہ جنگ بند ہے ان کو چھوڑ دیا اور کہا کہ واپس چلے جاؤ۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرتِ عثمانؓ کو بھیجا کہ جا کر مکے والوں کے متعلق بات کر و اور دیکھو کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ وہ

گئے تو یہ افواہ مشہور ہوگئی کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ کو قید کرلیا ہے۔ تو نظر آ گیا کہ ان قریش کی نیت نیک نہیں ہے۔ ایسے وقت میں آپ ﷺ صرف عمرہ کی غرض سے آئے تھے، جنگ کرنے کے لیے تو آئے نہیں تھے۔ اگر چہ چودہ پندرہ سو کے صحابہؓ کی جمعیت ساتھ تھی لیکن یہ کوئی لشکر نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ہم ایسے مقام پہ آ گئے ہیں کہ وہ قریش جس وقت جی چاہے، ایک لشکرِ عظیم لے کر ہم پہ چڑھائی کرلیں گے اور ہمارے بھاگنے کے لیے جگہ بھی نہیں ہوگی، گنجائش نہیں ہوگی تو آپ ﷺ نے وہاں ایک درخت کے نیچے، صحابہؓ سے بیعت کی تجدید کی۔ وہ بیعت تو ہر مومن کرتا ہے۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے خدا کے ساتھ کیے جانے والے معاہدہ کی نوعیت اور معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے تو جب کوئی شخص مسلمان ہوتا ہے تو وہ یہ رسمی کلمہ پڑھ کر نہیں ہوتا بلکہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، جسے کہتے ہیں کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) وہ مومن اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور خدا اس کے عوض اسے جنت کا وعدہ دیدیتا ہے۔ یہ ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ مشتری کہتے ہیں خریدنے والے کو اور بیع کہتے ہیں بیچنے والے کو اور اسے بیعت (یعنی بیع وشریٰ کا معاملہ) کہتے ہیں۔ یہ تو بیچ دینا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ میں بھی یہ جو بیعت کی چیز ہے، اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ ''مومن بیچ دیتا ہے، اپنا جان و مال خدا کے ہاتھوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ وہ جو تم نے اقرار کیا تھا، بیع نامہ لکھا تھا، جسے کہتے ہیں ''خدا کے ساتھ معاہدہ'' کیا تھا، آج اس معاہدے کے اظہار کا عملی وقت آ گیا ہے کہ یہاں جانیں دینی پڑیں اور جان دینے کے معاہدے کی تجدید کے لیے آپ ﷺ نے وہاں بیعت (یعنی بیع وشریٰ کے معاملے) کی تجدید کی لیکن اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ حضرت عثمان کی شہادت کی بات غلط تھی، حضرت عثمانؓ بحفاظت واپس تشریف لے آئے اور ان کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے ایک شخص ❶ اور آ گیا، قریش والوں کے ساتھ آپ ﷺ نے وہاں معاہدہ ❷ کیا اور معاہدے میں یہ بات تھی کہ اس سال، میں نے عرض کیا تھا کہ روایتوں میں خود بخاری میں یہ متضاد روایتیں ہیں لیکن بہر حال یہ بات تھی کہ اس سال یہ واپس چلے جائیں گے۔ آپ ﷺ اگلے سال آ کر اس طرح سے عمرہ کر سکیں گے اور اس میں یہ تھا کہ یہاں مکے کے جتنے لوگ قریش مشرکین وغیرہ مدینے جائیں گے ان کو بحفاظت واپس کر دیا جائے، اگر واپس آنا چاہیں، اگر وہاں رہنا چاہیں تو وہ امن سے رہیں گے لیکن اگر مدینے کے کوئی مسلمان مکے آئیں گے تو ہم ان کو واپس کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں، ہم ان کو روک سکتے ہیں، ہم ان کو روک لیں گے یعنی صلح نامہ کی شرطیں تھیں۔ ان شرائط میں اور چیزیں بھی تھیں جس میں نبی اکرم ﷺ ان کی ہر شرط مانتے چلے گئے۔ اس طرح اس سال بغیر عمرہ کیے ہوئے واپس تشریف لے آئے۔

---

❶ یہ قریش کا نمائندہ سہیل تھا۔ ❷ کاتبِ معاہدہ حضرت علیؓ تھے۔

صلح حدیبیہ کے بعد فتح مبین کے سلسلہ میں کامرانیوں کا سلسلۂ دراز

وہیں بعض صحابہؓ کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو بہت دب کر صلح کرنے کی بات ہوگئی۔ یہاں صلح کرنی تھی تو برابر کی سطح پہ صلح کرنی چاہیے تھی لیکن وہیں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کے متعلق جو بات کہی وہ یہ تھی کہ **اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا** (48:1)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ صلح حدیبیہ کو فتح مبین قرآن کریم نے قرار دیا ہے' جس کی شرائط آج بھی اگر ہم اس پس منظر میں بھی دیکھیں تو ایسے نظر آتا ہے کہ جیسے دب کر صلح کی گئی ہو۔ اور قرآنِ کریم نے اسے فتح مبین کہا ہے۔ عربی زبان میں فتح Conquest یا Victory کو ہی نہیں کہتے بلکہ کشادگی راہیں کھول دینے کو کہتے ہیں کہ تمہارے لیے کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرنے کے لیے جو راستے میں رکاوٹیں تھیں' اس صلح نے وہ رکاوٹیں دور کردی ہیں' تمہارے راستے آئندہ کی فتوحات کے لیے کھل گئے ہیں۔ اتنی بڑی چیز اس کو قرار دیدیا اور بعد کے واقعات نے اسے ثابت بھی کردیا۔ یہ بڑے بڑے مستشرکین یعنی غیر مسلم عیسائی مورخین بھی جو یورپ کے ہیں' وہ اس تاریخ پہ جب پہنچتے ہیں تو وہ وہاں کہتے ہیں کہ صاحب! وہ حضورﷺ کو نبی تو نہیں مانتے' رسولﷺ نہیں مانتے' ایک عظیم انسان ہی سہی' وہ کہتے ہیں کہ اس صلح سے نظر آتا ہے کہ حضورﷺ کا سیاسی تدبر کتنا اونچا تھا اور کتنی دورنگہی تھی کہ واقعی وہ صلح جو بظاہر اس کی شرائط بتاتی ہیں کہ دب کر صلح کی' آپﷺ کے بعض ساتھیوں نے بھی یہی محسوس کیا کہ دب کر صلح کی اور آپﷺ نے اس کے باوجود ان کی کوئی نہ مانی اور جو قریش کہتے چلے گئے' آپﷺ مانتے چلے گئے' انہوں نے کہا ہے کہ یہ بڑی دورنگہی تھی۔ اس ایک صلح نے آئندہ کے لیے' حضورﷺ کے لیے' فتوحات کے دروازے کھول دیئے اور اس کے بعد ہوا بھی۔

یہی یہ 6 ہجری کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد سب سے بڑی جنگ تو خیبر ❶ کی ہوئی' یہودیوں کا قصہ پاک کیا۔ یہ بہت بڑی فتح تھی۔ چھوٹی چھوٹی اور فتوحات بھی ہوئیں۔ دو سال میں اسلام نے اور مسلمان ہونے میں اتنی ترقی کی کہ جب آپﷺ 8 ہجری میں مکے کی طرف جنگ کی نیت سے آئے ہیں' اس وقت دس ہزار کے قریب آپﷺ کے ساتھ صحابہؓ تھے اور اس کے بعد حج کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں تو آپﷺ کا عرفات کے میدان میں ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا** (48:1) اس ایک صلح نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ یہ تھا وہ پسِ منظر جو میں نے عرض کیا ہے کہ پچھلے درس میں' میں نے اس کو موضوعِ سخن بنایا' یہ کچھ کہنے کے بعد اب آپ سن لیجیے۔ آیت شروع ہوتی ہے' یہ سورۃ جلیلہ جسے سورۃ الفتح کہتے ہیں' کہا ہے کہ **اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا** (48:1) ہم نے (اے رسول!) تیرے لیے کامیابی و کامرانی کی واضح راہ کشادہ کردی ہے' اور ایک فیصلہ کن انقلاب عنقریب آنے والا ہے۔

---

❶ غزوۂ خیبر سات ہجرت میں ہوا جس میں اہل کتاب (یہود) سے نبرد آزمائی ہوئی اور انہیں مسلمانوں کی رعایا بنایا گیا۔ خیبر کا یہ مقام مدینہ کے قریب دو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ اس میں چودہ سو پیادہ فوج اور دو سو سوار حضورﷺ کی معیت میں تھے (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1968ء' 276)۔

سیرت النبیؐ کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کے مروّجہ تراجم کی کیفیت: یاللعجب !!

عزیزانِ من! اس کے آگے ہے کہ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (48:2)۔ اب آپ ترجمے والا کوئی قرآنِ مجید اٹھا کر دیکھیے، وہاں آپ کو اس کا ترجمہ ملے گا کہ یہ اس لیے کیا تاکہ "اللہ تیرے وہ گناہ بھی معاف کر دے جو پہلے ہو چکے ہیں اور وہ بھی معاف کر دے جو بعد میں ہونے والے ہیں"۔ اب پہلی بات تو آپ یہ سوچیے کہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (48:1) بہت بڑی فتح ہے، کشادگی کی راہیں، تو فتوحات کی راہیں، کامیابیوں کی راہیں، کامرانیوں کی راہیں، کشادہ ہو گئی ہیں، رکاوٹیں دور ہو گئی ہیں۔ یہ کاہے کے لیے فتح نصیب ہوئی ہے؟ یہ اتنی بڑی عظیم چیز ہوئی ہے تاکہ خدا تیرے گناہ معاف کر دے جو تُو پہلے کر چکا ہے، جو تُو نے بعد میں کرنے ہیں۔ کیا دونوں میں آپ کو کوئی ربط نظر آتا ہے؟ پھر حضور نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ اتنے گناہ پہلے کیے ہوئے تھے، پھر بعد میں بھی کرنے تھے۔ معاذ اللہ۔ اور پھر ان گناہوں کے متعلق یعنی ایک اعلان خدا کی طرف سے ہوتا ہے کہ ہم نے وہ بھی معاف کر دیئے، آنے والے بھی ہم نے معاف کر دیئے۔ یا اللہ! یہ ہو رہا ہے اور یہ ہر ترجمے میں، ہر تفسیر میں، آ رہا ہے۔

لفظ ذنب کا لغوی اور قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! کیا عرض کیا جائے، اس سے پہلے بھی ہمارے سامنے ذنب کا یہ لفظ آ چکا ہے اور ہر مقام پہ میں نے اس کی وضاحت کی۔ عربی زبان میں یہ جو الفاظ ہیں ان کے متعدد معنی ہوتے ہیں، دیکھنا چاہیے کہ عرب ان لفظوں کو کس کس معنوں میں، کس کس مفہوم میں، استعمال کرتے تھے۔ بنیادی طور پر تو ذنب کہتے ہیں "یہ مویشیوں کے پیچھے جو ان کی دم ہوتی ہے، وہ ساتھ چپکی رہتی ہے۔ استعمال کے لیے، جسے آپ مجازی معنی کہتے ہیں، عرب اس لفظ کو استعمال کرتے تھے کہ کوئی چیز جو دوسرے کے ساتھ اس طرح چپکا دی جائے کہ وہ جہاں جائے اس کے ساتھ چپکی ہوئی چلی جائے۔" ویسے آپ اس قوم کے متعلق دیکھتے ہیں کہ یہ کس طرح سے جو ان کے Literal Meaning تھے، جو مجازی معنی لیتے تھے، ان میں بھی کیا خصوصیت ہوتی تھی یعنی یہ جو چیز ہے کہ جہاں کوئی چیز جائے اس کے ساتھ وہ چپکی رہے۔ وہ جو دم ہے وہ ایک ایسی چیز ہے کہ جہاں وہ مویشی، وہ جانور، جائے گا، یہ اس کے ساتھ چپکی رہے گی تو "ساتھ چپکی رہنے" کے معنوں میں یہ استعمال کرتے تھے مثلاً کسی کے خلاف بہتان تراشی، تہمت تراشی، کسی کے خلاف الزامات عائد کر دینا، جو پراپیگنڈے کے زور پہ ایسا کرے کہ جہاں وہ جائے اس کے خلاف الزام، اس کے خلاف تہمت، اس کے خلاف بہتان ساتھ چپکا رہے۔ یہ ہے ذنب۔

نبی اکرم ﷺ پر لگائے جانے والے الزامات اور اُن کی حقیقت

یہ بہتان کیا تھے، کیا الزامات تھے جو یہ عرب حضور ﷺ پہ تراشتے تھے اور کم از کم اُس وقت تک تراشتے رہے، یہاں تک کہ یہ آیت

آئی۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ اس وقت تک یہ چیز حضورﷺ کے خلاف ان کے ہاں مسلسل طور پر پراپیگنڈے کے طور پر چپکائی جاتی تھی۔ خود لفظ الزام کے معنی بھی ''کسی چیز کا چپکا دینا'' ہوتا ہے۔ یہ کیا چیز ہے چپکائی ہوئی؟ نبی اکرمﷺ کا دعویٰ کیا تھا؟ ایک یتیم جس کے ساتھ کوئی جماعت بھی نہیں ہے' غریب بھی ہے' امارت بھی نہیں ہے' حکومت بھی نہیں ہے' جب دعویٰ کیا ہے' آپﷺ نے پہلا اعلان کیا تھا تو قریش سے یہ کہا تھا کہ آؤ میری بات سنو! اس سے پہلے عربوں کے ہاں منظم حکومت کا تصور ہی نہیں تھا' حکومت تھی نہیں' ان کے ہاں مملکت تھی نہیں' ان کے ہاں قبائلی زندگی تھی' ساری پنچائتی زندگی تھی' ان کے دائیں بائیں بڑی بڑی مملکتیں اور حکومتیں تھیں' ایران میں بھی تھیں' روما میں بھی تھیں۔ عربوں کے ہاں حکومت کا تصور ہی نہیں تھا۔ کہا تھا کہ آؤ تمہیں میں بتاؤں میری دعوت کیا ہے؟ میری دعوت یہ ہے کہ میں ایسی ایک عظیم مملکت قائم کروں گا جس کے سامنے ایران اور روما کی مملکتیں بھی کچھ حیثیت نہیں رکھیں گی' مجھے اس مملکت کے امور کو سرانجام دینے کے لیے وزیروں کی ضرورت ہے' ساتھیوں کی ضرورت ہے' بوجھ بٹانے والوں کی ضرورت ہے۔ میں تم نوجوانوں سے پوچھتا ہوں کہ کون ہے جو میرا ساتھ دے؟ اس میں وہ ہنس کر چل دیئے تھے کہ

ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

کفار کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اہلِ خانہ کو دی گئی اذیت ناکیوں کی کیفیت اور دعوے

اندازہ لگایئے' یہ ہیں وہ چیزیں جو میں ابھی عرض کر رہا ہوں' ذنب کن کو کہا جائے گا' آپﷺ کی حیثیت کیا ہے اور دعویٰ کیا لے کر کہتے ہیں کہ صاحب! ایسی مملکت قائم ہوگی کہ جس میں ایران اور روما کی مملکتیں بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو جائیں گی؟ وہ مذاق کرتے تھے' تمسخر اڑاتے تھے' دوسرے تیسرے سال حالت یہ تھی کہ جو شخص آپﷺ کے ساتھ اسلام لا کر آپﷺ کے ساتھ ہوتا تھا' اسے اتنی اذیتیں' اتنی تکلیفیں بہم پہنچاتے تھے کہ زندگی اجیرن کر دیتے تھے' خود حضورﷺ اور آپﷺ کے ساتھ آپﷺ کے جو اہلِ خاندان وغیرہ تھے' تین سال تک تو ان کو ایک وادی کے اندر محصور رکھا تھا' ان کو دانہ پانی تک وہاں نہیں پہنچنے دیتے تھے۔

محسوسات کی شکل میں نبوت کی دعوت کا ماحصل اور قبیلہ عامر کا بوڑھا سردار

دعویٰ اس زمانے میں بھی آپﷺ کا یہ تھا۔ وہ قبیلہ عامر کا بوڑھا سردار' جو آپﷺ کے پاس آیا تھا' کہا تھا کہ میں نے آپﷺ کی دعوت تو سنی ہے' سوال یہ ہے کہ اس دعوت کو اگر میں قبول کر لوں گا تو آپﷺ کیا دیں گے؟ اس معاملے میں آپﷺ نے کہا تھا کہ وہ جنت کے باغات۔ کہنے لگے کہ یہ آخرت کی بات ہے۔ یہ عرب تھے' اس سے دیکھیے کہ وہ کیا ذہنیت تھی۔ کہنے لگے کہ یہ آخرت کی بات ہے جس کے متعلق نہ آپﷺ کچھ دکھا سکتے ہیں' نہ مجھے یہاں یقین آ سکتا ہے۔ میں پوچھتا یہ ہوں کہ یہاں کیا ملے گا؟ آپﷺ نے

فرمایا تھا کہ شہروں کی فتوحات اور عظیم مملکت - دعویٰ نبوت کے ابتدائی چند سالوں میں یہ چیزیں آپ ﷺ پیش کر رہے تھے اور حیثیت یہ تھی کہ اپنے گھر بار کو چھوڑ کر دوسرے وطن میں' دوسرے شہر میں' جا کر پناہ لینی پڑی جسے آپ ہجرت کہتے ہیں اور دعاوی یہ' تو آپ غور فرمائیے کہ ان حالات میں وہ قریش کیا کیا نہ کہتے ہوں گے۔ قرآن کریم میں یہ ہے کہ استہزاء اور تمسخر اور قسم قسم کے الزامات اور بہتانات اور یہ ساری چیزیں وہ چپکاتے تھے۔ ایک ہی مقام پر دو لفظوں میں تو ایسی بات کہہ دی ہے کہ سب کچھ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ وہ کیا کچھ کہا کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم میں نبی اکرم ﷺ کے کردار' آپ ﷺ کی شفقت اور صبر واستقلال کے بارے میں اعتراضات

کہا ہے فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (52:29) خدا مدافعت کر رہا ہے کہ تُو یہ بات ان تک پہنچائے جا' اس چیز کو دہرائے جا' اس سے گھبراؤ نہیں' خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ تُو تو اس کی نعمتوں سے نوازا گیا ہے' اس لیے تُو کاہن نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ کاہن ہے ان کے ہاں یہی جو مندروں کے اندر قسمتیں بتانے والے اور فال لینے والے مذہبی پیشہ ور ہوتے تھے' یہ کاہن کہلاتے تھے' کچھ تو یہ کہتے تھے کہ یہ ان میں سے ہی ہے جو بیٹھا ہوا قسمتیں بتایا کرتا ہے اور اسی بنا پہ بھی یہ کہہ رہا ہے کہ صاحب! اتنی بڑی مملکت تمہارے حصے میں آ جائے گی۔ انہیں خود رہنے کے لیے گھر نہیں مل رہا یعنی بقول ان کے کچھ کہتے تھے کہ وہ مجنون ہے' یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ معاذ اللہ۔ قرآن حمید ان چیزوں کو دہرا رہا ہے کہ وہ کیا چیزیں تھیں' وہ کون سے ذنب تھے' جو ان کے پیچھے لگاتے تھے: پاگل ہو گیا ہے یہ تو آپ سوچ لیجیے کہ جس کو دیوانہ کہا جائے وہ کتنا بڑا الزام ہے: پاگل ہے' دیوانہ ہے' کیا بات ہے اس دیوانگی کی! بے ساختہ ذہن میں وہ مصرعہ آ گیا کہ

خلق پس دیوانہ او دیوانہ بکارے

آہاہا! پاگل کے پیچھے دنیا مذاق اڑاتی ہوئی' تالیاں مارتی پھرتی ہے' لونڈے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ دیوانہ اپنے ایک مقصد کے پیچھے چلا جا رہا ہے' اس کو پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ مجھے کون کیا کہہ رہا ہے۔

خلق پس دیوانہ او دیوانہ بکارے

یہ تھی وہ دیوانگی۔ خدا کہہ رہا ہے وَّلَا مَجْنُوْنٍ (52:29) یہ پاگل پن نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ اس پہ کسی نے جادو کر دیا ہے' ٹونا ٹوٹکا کر دیا ہے' جسے کہتے ہیں کہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ کیا کہہ رہا ہے؟ یہ کہ ایران اور روما کی سلطنت کی کنجیاں میں تمہارے ہاتھ میں دیدوں گا' آپ سمجھ گئے ہیں۔ اس منظر کو سامنے رکھیے کہ حضور ﷺ کا کیا نقشہ تھا' اور کیا کچھ وہ کہتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ نہیں یار

یہ کوئی دیوانگی والی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟ پھر کیا کہا کہ اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ (52:30) کہتے ہیں کہ شاعری کر رہا ہے۔ شاعری کے معنی ہیں' تخیلات کی دنیا کے اندر گم ہوا ہے۔ شاعروں کو بھی تو دیکھیے وہ کہیں اپنے آپ کو اس حد تک پہنچائے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو شہنشاہ عظیم سمجھتے ہیں۔ شاعری ہے تخیلات کی دنیا کے اندر' جو جی میں آئے' کہو بس شاعر ہو اور عربوں کے ہاں تو پوچھو نہیں' کہ شاعر کیا ہوتا تھا صاحب! یہ کہتے تھے کہ شاعر ہے اور اگلے ہی ٹکڑے نے بات واضح کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس کو Seriously (سنجیدگی سے) مت لو جو کچھ یہ کہہ رہا ہے کیونکہ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (52:30) یہ شاعر ہے' زمانے کی گردشیں ان تخیلات کو خود مٹا دیں گی' تم کیوں فکر کر رہے ہو' شاعروں کے تخیلات کبھی بھی محسوس شکل (Concrete Form) میں متشکل نہیں ہوتے' زمانے کی گردشیں ہی ان کو خود مٹا دیتی ہیں۔

قرآنی تعلیم کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے پروگرام کا عملی طریق اور مخالفین کے اعتراضات

عزیزانِ من! عربوں کے ہاں بھی یہ چیز تھی کہ کہتے تھے کہ نَتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (52:30) تھوڑا سا انتظار کرو' زمانے کی گردشیں خود ہی مٹا دیں گی' اس کا غم ہی نہ کرو۔ خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ قُلْ تَرَبَّصُوْا (52:31) میں بھی یہ چاہتا ہوں کہ تم انتظار کرو۔ فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (52:31) اور میں بھی انتظار کرتا ہوں قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ (39:39) تم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرو جو کچھ کرنا ہے جو تم نے کہا ہے کہ انتظار کرو' مجھے تو خوشی ہوئی' میں تو چاہتا ہی یہ ہوں کہ تم اپنی جگہ اپنے پروگرام پہ عمل کرو اور پھر انتظار کرو اور مجھے اتنی اجازت دو کہ میں اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتا جاؤں' میں نہ تمہارے پروگرام میں دخیل ہوتا ہوں اور تمہارے اوپر یہ بھی شرط ہے کہ تم میرے پروگرام میں دخیل نہ ہو فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) دیر کی بات نہیں' یہ قیامت میں جا کر میں نہیں کہتا کہ وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ کیا ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) ابھی عنقریب پتہ چل جائے گا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے۔ میں تمہارے معاملات میں دخل نہیں دیتا تم جو کچھ چاہتے ہو کرو۔ کتنا کچھ بھی کرو لیکن شرط یہ ہے کہ تم میرے معاملات میں دخیل نہ ہو۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (39:39) عنقریب نظر آ جائے گا۔ یہ تھے وہ الزامات جو لگاتے تھے۔ اس حد تک یہ چیز پہنچ گئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کا عثمان ابن طلحہ شیبی کے ساتھ کعبے کی زیارت کا اور اس کی کنجیوں کا معاملہ اور الزامات کا دُھلنا

ایک تاریخی واقعہ کے مطابق حضور ﷺ کو ہجرت کی رات جب تشریف لے آنا تھا تو آپ ﷺ کعبے میں گئے اور کعبے کے قریب دربان' یہی شیبانی کا خاندان جو ہوتا ہے اس سے کہا کہ ذرا کعبے کو کھول دو' میں جاتے وقت چاہتا ہوں کہ اس کی زیارت کر جاؤں۔ اس نے

کہا کہ جا بے جا (معاذ اللہ) انہی کے الفاظ میں، میں بات کر رہا ہوں، اس نے نہیں کھولا۔ آپ ﷺ نے کہا کہ ٹھیک ہے شیبانی[1]! آج تم نے یہ نہیں کھولا، وہ وقت آئے گا کہ کعبے کی کنجی میرے ہاتھ میں ہوگی اور میں اسے جس کے ہاتھ میں دیدوں گا، قیامت تک کوئی اس سے چھین نہیں سکے گا۔ اپنے دعاوی کی صداقت پر یہ یقین تھا، یہ ایمان تھا۔ عام الفاظ میں جنہیں پیشین گوئیاں کہتے ہیں، یہ وہ بات نہیں تھی، یہ یقین تھا اس امر کا کہ جس پروگرام کو میں لے کر اٹھا ہوں، یہ انتہا تک پہنچنا ہے، اس نے کامیاب ہونا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہونا ہے لیکن وہ تو مذاق کرتے تھے۔ اب آجائیے یہاں کہا کہ یہ جو فتح مبین تمہیں حاصل ہوئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس سے پیشتر یہ جتنے الزامات تمہارے خلاف لگاتے تھے، وہ ان فتوحات کا جو منظر ہے، وہ ان کو دھو ڈالیں گے۔

فتحِ مبین کے بعد آپ ﷺ پر لگائے گئے تمام الزامات ختم ہوگئے

الزاموں کو خود مانیں گے کہ نہ یہ ساحر تھا، نہ یہ مجنون تھا، نہ یہ کاہن تھا، نہ یہ شاعر تھا۔ یہ تو سچ کہتا تھا اور اس کے بعد بھی تمہارے متعلق جو اس قسم کی باتیں کریں گے، اس کے بعد جو فتوحات تمہیں حاصل ہوں گی، کامیابیاں حاصل ہوں گی، تمہاری ہر کامیابی تمہارے دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتی جائے گی اور ان کے ہر الزام کی تردید ہوتی چلی جائے گی، اس لیے یہ جو ہم نے تمہیں فتح مبین دی ہے یہ کاہے کے لیے دی ہے؟ کہا ہے کہ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (48:2) تاکہ یہ ان الزامات کی تردید کریں، ان الزامات کو دھو ڈالیں جو تیرے پیچھے یہ آج تک لگاتے چلے آرہے تھے کہ ذرہ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر، دعاوی ملاحظہ فرماؤ، ان کی پوزیشن کیا ہے اور دعاوی کیا ہیں، یہ جو سارے الزامات ہیں، جو یہ فتح مبین ہے اور اس کے بعد جتنی بھی فتوحات حاصل ہونے والی ہیں، وہ ساری ان الزامات کو دھو ڈالیں گی جو یہ تمہارے خلاف لگاتے تھے، وہ بہتان جو تمہارے خلاف چپکاتے تھے، یہ اب بھی اور اس کے بعد بھی جو فتوحات ہونی ہیں، ہر فتح جو تمہیں حاصل ہوگی، ان کے ان الزامات کی تردید کا ثبوت بنتی چلی جائے گی۔

فتحِ مبین کے بعد مکے کے رؤسا کی کیفیت: یہودیوں کا انجام

عزیزانِ من! کیا آپ نے غور فرمایا کہ اب اس کے کیا معنی ہوگئے؟ یہ دو ہی سال کے عرصے میں حقیقت ثابت ہوئی۔ یہ صلح حدیبیہ کا 6 ہجری کا واقعہ ہے، 8 ہجری کو مکہ فتح کیا۔ کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی، حضور ﷺ تشریف لائے، انہوں نے Surrender کر دیا۔ پابجولاں یہ سارے رؤسا[2] سامنے کھڑے تھے جو دو سال پیشتر اس طرح سے سرگرم عمل تھے کہ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت میں

---

[1] ان کا اصل نام عثمان ابن طلحہ شیبی ہے (ابن ہشام (مرتبہ): سیرۃ النبی کامل جلد دوم، ترجمہ و تہذیب مولانا عبدالجلیل صدیقی و مولانا غلام رسول مہر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص 489، نیز پرویز: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1968ء، ص۔ 287۔

[2] ان رؤسائے قریش میں عتبہ، ابوجہل، ابوسفیان جیسے سرغنے موجود تھے۔

کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ انہی رؤسا قریش نے آپ ﷺ کو یہاں سے نکال دیا' وہ پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے کھڑے تھے۔ دو ہی سال کے عرصے میں ادھر مدینے کے اندر اذیت دینے والی سب سے بڑی مخالفت تھی' یہ یہود تھے' منافق تھے اور ان کے انداز وہی تھے جو آج بھی اس قوم کے ہیں۔ مدینے میں یہودیوں کا مسئلہ بڑا اہم تھا' ان کا غلبہ تھا۔ پہلے تو مدینے سے ان کو نکالا گیا اور پاس ہی وہ خیبر کی ایک بستی ہے' یہ وہاں جا کر بس گئے اور اسے اپنا اڈا بنا لیا تھا' مرکز بنا لیا تھا' مخالفت کی۔ صلح حدیبیہ کے بعد جب آپ ﷺ آئے ہیں' تو پہلی فتح تو فتح خیبر تھی اور وہ بڑی عظیم فتح ہے اور دو سال کے بعد جب مکے کی طرف آپ ﷺ تشریف لائے ہیں تو جیسا میں نے عرض کیا ہے' بغیر جنگ کیے ہوئے انہوں نے Surrender کر دیا تھا اور وہ پابجولاں حضور ﷺ کے سامنے گرفتار ہو کر آ گئے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ وہ جو الزامات آپ ﷺ کے خلاف دھرتے تھے' جو مذاق اڑاتے تھے' جو استہزا کرتے تھے' وہ کس شکل میں سامنے آ رہا ہے۔ صاحب! کیسی فتح مبین یہ ثابت ہو رہی ہے! ان کی ہر فتح اپنی زبان سے کہلوا رہی تھی کہ آپ ﷺ کے دعاوی سچے تھے جو آپ ﷺ کہتے تھے۔

فتح کے موقعہ پر کعبے کی کلید کے سلسلہ میں شیبانی سے کیا جانے والا سلوک اور عظمتِ رسول ﷺ

ہاں اور پھر وہ کعبے کی چابی والا جو قصہ ہے وہ تو پھر عظیم ہے۔ یہ فتوحات شمشیر کی نہیں تھیں' یہ قلوب کی فتوحات تھیں' عزیزانِ من! اس عثمان ابن طلحہ شیبی کو اس بات کا معلوم تھا' جس نے ہجرت کی رات کعبہ کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا تھا اور آپ ﷺ نے کہا تھا کہ کعبہ کا دروازہ کھول دو' میں اس کی زیارت سے اپنی آنکھوں کو تسکین دے لوں۔ اس نے کہا تھا کہ میں جھانکنے نہیں دوں گا۔ فتح مکہ پر آپ ﷺ کعبے کے اندر چلے گئے۔ اس کعبے کی چابی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھی اور یہ کعبے کا کلید بردار ہونا کوئی چھوٹی سعادت نہیں ہے' ان کے ہاں اب ہر ایک کے ذہن میں تھا کہ حضور ﷺ نے جاتے وقت یہ فرمایا تھا کہ جس کے ہاتھ میں' میں یہ چابی دوں گا' قیامت تک کوئی اس سے نہیں چھین سکے گا تو سوچ رہے تھے کہ نا معلوم یہ سعادت کس کے حصے میں آ رہی ہے۔ آپ ﷺ نے سب کی طرف نگاہ ڈالی اور وہی (عثمان ابن طلحہ) شیبی جو کھڑا تھا' اس کے ہاتھ میں جا کر وہ چابی دیدی۔ فتوحات تو آپ بڑے بڑے فاتحین کی دیکھیں گے' یہ فتوحات آپ کو کہاں نظر آئیں گی' عزیزانِ من! آپ ﷺ نے کلید کعبہ اسی عثمان ابن طلحہ شیبی کے ہاتھ میں دیں اور وہ اسی کے خاندان میں آج تک چلی آ رہی ہے' کوئی اس سے چھین نہیں سکتا کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت تک یہ کوئی چھین نہیں سکے گا۔

شمشیر کی فتح اور قلوب کی فتح میں فرق

عزیزانِ من! یہ ہے مقام جہاں نظر آتا ہے کہ یہ محض فتح نہیں ہے بلکہ یہ چیزیں اخلاق کی بلندی اور کردار کی درخشندگی کی ہیں۔ وہ

آپ کو کہاں ملے گی' صاحب! اور ان رؤسائے قریش سے جنہوں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو اتنی اذیتیں پہنچائیں تھیں' اب سارے پابجولاں کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا تھا کہ بتاؤ تم کس سلوک کو Deserve کرتے ہیں' جسے ہم کہتے ہیں کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں پتہ ہے کہ تُو خود بھی شریف ہے' ایک شریف باپ کا بیٹا ہے۔ وہ عرب بھی شریف لوگ تھے۔ کہا کہ جس طرح شریفوں کے ساتھ سلوک کیا کرتے ہیں' ہم اس سلوک کے مستحق تھے' میدانِ جنگ کے اندر بھی گرفتار ہو کر آئے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے پھر لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (12:92)۔ ہم کسی سے انتقام نہیں لیا کرتے' ان کی زنجیریں کھول دو' اس زمانے سے' ان کا نام ہی یہ ہے کہ جن کی زنجیریں کھول دی گئیں تھیں' جن کو آزاد کر دیا گیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے نبوت کے تئیس سال معرکوں کے دوران کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا

یہ کیا تھا؟ یہ نبوت کے اس سارے عرصے میں' تئیس سال کے عرصے میں' اتنی جنگیں ہوئیں ہیں' اتنی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں بھی ہوئیں' نبی اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ سے کسی ایک شخص کو قتل نہیں کیا۔ پھر اتنا ہی نہیں' کہا گیا ہے کہ لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (48:2) اتنی سی چیز ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جو الزامات لگاتے تھے' تہمتیں تراشتے تھے' مذاق کرتے تھے' وہ ساری بات تو صاف ہو گئی۔ یہ پھر بھی منفیانہ بات ہے' کوئی Achievement تو نہ ہوئی' Achievement تو ہے' کہا ہے کہ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ (48:2) اپنے جو انعامات خداوندی ہیں وہ تکمیل تک پہنچا دے گا تیرے لیے' پورے کے پورے تمہیں دیدے گا۔ کیا انعام ہیں؟ وہ نعمتِ خداوندی کیا ہے؟ نعمتِ خداوندی یہ ہے کہ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا (48:2) تمہاری راہنمائی اس راستے پہ کر دی جائے گی' جو تمہیں منزلِ مقصد تک پہنچا دے گی۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

انسانی زندگی کے لیے سب سے بڑی نعمت صحیح منزل کی طرف راہنمائی ہے

عزیزانِ من! وہی ہے جو ہم شروع میں ہر نماز کی رکعت کے اندر دعا مانگتے ہیں۔ یہ ہم سورۃ الفاتحہ میں کہتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ - صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (1:5-6) یہ صراطِ مستقیم کا مل جانا یعنی یہ نعمتوں کی فراوانی اور اس طرح سے اس کی بارش یہ نہیں ہے کہ آپ بیٹھے رہیں اور ہم سب کچھ آپ پر نچھاور کرتے چلے جائیں گے۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ منزل کی طرف جانے والے صحیح راستے کی راہنمائی کر دی جائے' جانا تو پھر آپ ہو گا' آپ کو راستہ جب بتا دیا جائے گا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ منزل تک بھی وہی تمہیں اٹھا کر پہنچا دے گا' چلنا تمہیں خود ہو گا۔ یہ چیز ہے کہ تمہیں صحیح منزل کی طرف جانے والے راستے کی راہنمائی کر دی۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے صاحب! البتہ اس کے ساتھ ایک اور بات آئی ہے۔ کہا ہے کہ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا (48:3) اور اس طریق سے

کہ تم اس صحیح راستے' صراطِ مستقیم پر چلتے جاؤ گے' اللہ کی نصرت حاصل ہوگی' غلبہ حاصل ہوگا۔

صلح حدیبیہ کے بعد فتحِ مبین میں نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کا بھی کافی دخل ہے

یہ اس صلح حدیبیہ (628ء) کے بعد کی فوری آیات ہیں' جو نازل ہوئی ہیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ جو صلح کی شرائط کی بنا پہ کچھ افسردگی چھا گئی تھی' صحابہ کرام سمجھتے تھے کہ یہ صلح دب کر ہوئی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو حضور ﷺ نے اس کے بعد بیعت لی تھی' جو ولولہ شہادت ان کے دلوں کے اندر ابھرا ہے' اس کی بھی وجہ تھی کہ ہمیں یہ بتانے کا موقع ہی نہ ملا کہ خدا کے ہاتھوں میں جان و مال بیچنے والوں کی کیفیت ہوتی کیا ہے۔ یہ بھی ایک چیز تھی' جس کی وجہ سے کچھ مایوسی سی تھی اور اس لیے خدا نے یہ کہا کہ **هُوَ الَّذِىٓ اَنۡزَلَ السَّكِيۡنَةَ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ** (48:4) خدا نے ان کے قلوب میں پھر ایک تسکین پیدا کر دی۔ یہ واقعات جو آئے' اس کے بعد ایک ایک واقعہ نے ان کے قلبِ مضطرب میں تسکین کا سامان کر دیا' سکون ہوا۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے' دب کر صلح والی بات نہیں تھی' اس سے ہم مغلوب نہیں ہوئے' مفتوح نہیں' محکوم نہیں ہوئے' بلکہ نصرتِ خداوندی ہمارے ساتھ ہوئی' غلبے پر غلبہ' فتح پہ فتح ہوتی چلی جا رہی ہے' قلوبِ مومنین کو قیمت مل رہی ہے اور پھر **لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ** (48:4)۔ وہ جو انگریزی کا محاورہ ہے Nothing Succeeds like Success. یہ بڑی چیز ہے' وہ جو ایک کامیابی ہوتی ہے' وہ اگلی کئی کامیابیوں کے راستے کھول دیتی ہے۔ کہا کہ ان چیزوں سے ان کا جو ایمان تھا' اس میں اور اضافہ ہو گیا۔ ایمان تو پہلے بھی تھا۔ تو ایمان میں اضافے ہوتے ہیں کہ جو دعاوی ہم لے کر اٹھتے ہیں اور ان کو ہم پہلے Abstract (غیر محسوس) طور پر صحیح مانتے ہیں' عقیدے کے طور پر صحیح مانتے ہیں کہ ایسا ہوگا' یہ بھی ایمان ہے کہ ہم اس پہ یقین رکھیں کہ ایسا ضرور ہوگا لیکن جب وہ بات فی الواقع ہو جاتی ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس میں کس قدر محکمیت آ جاتی ہے' ایمان میں استحکام آ جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ ایمان محکم ہوتا ہے کہ اپنے دعاوی کے نتائج آپ کے سامنے آتے چلے جائیں۔ یہ ہے **لِيَزۡدَادُوۡۤا اِيۡمَانًا مَّعَ اِيۡمَانِهِمۡ** (48:4) اس سے ان کے ایمان میں مزید تقویت آ گئی۔

فتح کے دوران سماوات کے جنود کا مفہوم

پہلے ان کا ایمان تھا۔ اب اس میں ہر فتح سے' ہر غلبہ سے' اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ کس طرح سے ہوا؟ کہا کہ **وَلِلّٰهِ جُنُوۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ** (48:4)۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر متعدد مقامات پہ کیا ہے۔ یہ جو جنود ہیں' جو خدا کے لشکر ہیں' یہ جوارض کے لشکر ہیں' وہ تو ہمارے سامنے ہیں' دنیا کے سامنے ہیں' تاریخ کے سامنے ہیں' یہ جتنے لشکر' یہ عساکر اور ان کی فوجیں' یہ سارے اللہ کی جنود تھے' یہ اللہ کے سپاہی تھے' اسی کے لشکر تھے لیکن وہ سماوات کے ایک جنود کا بھی ذکر کرتا ہے اور یہ ہیں وہ فطرت کی قوتیں' ملائکہ کی قوتیں' جو تقویت

پیدا کرتی ہیں۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (48:4)۔ بدر (رمضان 2ھ) کے میدان کا واقعہ قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر دہرایا ہے' حنین (شوال 8ھ) کے واقعہ میں بھی ہے۔ ثُمَّ اَنْـزَلَ اللّٰهُ (9:26)۔ حنین کا جب ذکر آئے گا تو آپ دیکھیں گے کہ بڑا سخت معرکہ تھا اور اس میں پہلے قدموں میں ان کو بڑی سخت شکست ہوئی تھی' پسپائی ہوئی تھی صاحب! بڑی ہی پریشانی کا عالم تھا لیکن اس کے بعد پھر جو پلٹا لیا ہے تو ان کی یہی شکست فتح میں بدلی ہے تو قرآن حمید نے کہا ہے کہ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (9:26)۔ یہ ہے وہ چیز جو میں کہہ رہا تھا کہ خدا نصرت کرتا ہے ایسے لشکروں سے کہ جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ دوسرے مقام پہ یہ کہا ہے کہ یہ جو جنود السموات آتے ہیں' وہ آتے ہیں کہ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47:7) تمہارے قدموں میں استقامت پیدا کر دیتے ہیں۔ سپاہی یہی ہوتے ہیں وہ اوپر سے تلواریں لے کر آتے' یہی سپاہی ہوتے ہیں اور میدانِ جنگ میں سپاہی کے قدموں میں استقامت پیدا ہو جانا بڑی چیز ہے۔ لغزش نہ پیدا ہو یہی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے۔

یہ کیا ہوتا ہے؟ جب میں وہاں آؤں گا تو پھر اس مقام پر عرض کروں گا کہ یہ استقامت اپنے ایمان کے نتائج کو جب محسوس طور پر انسان اپنے سامنے دیکھتا ہے تو اس سے اس کا یقین یقینِ محکم ہو جاتا ہے' اس سے انسان کے قدموں میں ایک استقامت آتی ہے' لغزش نہیں پیدا ہونے دیتی۔ یہ بات کہ جس بات پہ میں یقین رکھتا تھا جو میرے دعاوی تھے' وہ سچے ہو کر میرے سامنے آ رہے ہیں' اس سے ایمان بڑھتا ہے' یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ جسے قرآن کریم نے جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ کہا ہے۔ اس سے انسان کے اندر ایک نفسیاتی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس کے قدموں میں پھر لغزش نہیں آتی وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (48:4) اور یہ اس لیے ہے کہ خدا کو یہ سارا علم ہے اور پھر وہ علم کے ساتھ ایک حکمت کی جو چیز ہے' Rationally یہ سب کچھ وہ کرتا ہے۔ ایسے نہیں ہے کہ تمہیں بیٹھے بٹھائے فوق الفطرت قوتیں آ جائیں اور وہ مارتی چلی جائیں تم بیٹھے ہوئے ہو اور اس کے بعد جا کر تم میدانِ جنگ پر فتح حاصل کر لو۔ ایسا نہیں ہے۔ علیماً کے ساتھ حکیماً ہے۔ جو چیز اس طرح فوق الفطرت طریقے سے ہوتی ہے' اس میں تو کوئی حکمت نہیں ہوتی' وہ تو Rationally نہیں ہوتا' اس کے لیے آپ Reason نہیں دے سکتے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کس مقام پہ کیا لفظ آیا ہے!

قرآنِ حکیم نے قدم قدم پر انسان کو عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کی ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم کے ایک ایک لفظ پہ کھڑے ہو کر سوچا کیجیے۔ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ آتے ہیں لیکن وہ بھی جب علمِ انسانی آگے بڑھے گا' جب اس کا تجزیہ کرے گا' جب حکمت سے کام لے گا' جب ان امور کی Rationalization ہو گی' اس وقت یہ نظر آئے گا کہ یہ جو چیز تھی یہ کس طرح سے واقع ہوئی تھی۔ یہ ایسی بات نہیں کہ تمہارے ذہن میں ہی نہ آ سکے' عقل اس کو تسلیم ہی نہ کر سکے' تم اس کی Justification (وجہ جواز) نہ دے سکو' اس کے لیے کوئی Reason نہ دے سکو۔ یہ اس قسم کے معجزات نہیں تھے جو ہم نے بعد

میں اپنے ہاں پھر وضع کیے کہ صاحب! پھر وہ آسمان کی چڑیاں آتی تھیں' وہ کنکری مارتی تھیں اور اس کے ہاتھی کے اور سوار کے سر پہ لگتی تھیں' ہاتھی کے پیٹ میں سے نکل جاتی تھیں ❶۔ اس میں کسی طرح سے بھی حکمت پیدا نہیں ہوسکتی۔ وہ خدائے حکیم کا فعل نہیں ہوتا۔ آپ اس کو Explain (بیان) ہی نہیں کرسکتے کہ کیسے ہوا سوائے اس کے کہ صاحب! معجزہ تھا' ہوگیا۔

قرآنِ حکیم انسانی عقل کو جِلا تو بخشتا ہے لیکن اُسے ماؤف نہیں کرتا: اب ساری دنیا ایک جہنم ہے

بدر کے میدان میں جیسے اسی سورۃ میں ہی وہ بات آئے گی کہ جب دیکھا کہ اس طرح سے فتح نہیں ہو رہی' شکست ہو رہی ہے تو آپ ﷺ نے مٹھی بھر کر کچھ کنکریوں کو یوں مارا اور وہ قریش کے سپاہیوں کی آنکھوں میں جا کر لگیں' سب اندھے ہوگئے اور بھاگ گئے۔ یہ حکیماً نہیں ہے۔ معجزہ تو ہوتا ہی وہ ہے کہ جس میں عقل عاجز آجائے۔ یہ تو لفظ ہی عجز سے ہے۔ تو جہاں انسان کی عقل اور فکر اور تدبر عاجز آجائے' اس کام کو سمجھ نہ سکے آپ علیماً حکیماً کیسے کہہ سکیں گے صاحب! جونہی یہ بات کہی کہ وہ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ مدد دیتے ہیں' فوراً واضح کر دیا کہ علمِ انسانی جب اوپر اُٹھے گا اور ان مقامات کی طرف آئے گا تو اسے پتہ چلے گا کہ یہ ساری چیزیں حکمت پر مبنی تھیں۔ کاہے کے لیے یہ سارا کچھ کیا گیا؟ لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (48:5)۔ یہ سب کچھ جو کیا' اس کا نتیجہ یہ تھا' عزیزانِ من! میں ہر بار یہ چیز واضح کرتا ہوں کہ مرنے کے بعد کی جنت اور وہاں کے دوزخ پہ ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کریم نے جو کچھ کہا ہے' اس میں جنت یہیں سے شروع ہو جاتی ہے' جہنم یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ جنت کا تو بہرحال ہمیں پتہ نہیں ہے' ہم ایسے سعادت مند ہی نہیں کہ وہ پتہ چلے کہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جہنم کا تو پتہ ہے جہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جلتے ہوئے' بھنتے ہوئے' چیختے ہوئے' چلاتے ہوئے اور پھر یہ کیفیت ہے کہ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167) جتنا جی چاہے کوشش کرو گے یہاں سے نکل جاؤ' نکل بھی نہیں سکو گے۔ ساری دنیا اس وقت ایک جہنم میں ہے' عزیزانِ من! یہ قیامت موجود ہے:

سخن زنامہ و میزاں دراز تر گفتی
ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

اس قیامت کی باتیں تو تم بہت کرتے ہو مگر افسوس اس بات پہ ہے کہ جو موجودہ قیامت ہے وہ تمہیں نظر نہیں آرہی ہے صاحب!

حضرت عمرؓ کے دَورِ خلافت میں فتوحات کی نوعیت اور ثمرات

عزیزانِ من! قرآن کریم قیامتِ موجود کا بھی ذکر کرتا ہے۔ یہ جو اس نے کہا ہے کہ سکینت دیں گے' پھر فتوحات کشادہ ہو جائیں

---

❶ سورۃ الفیل کے سلسلہ میں دیکھیے پرویزؒ: (ڈاکٹر منظور الحق: مدیر) مفہوم القرآں فی دروس الفرقان پارہ 40 (مکمل' ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ، لاہور' 2006' ص ص۔ 559 تا 565۔

گے تو یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہوگا؟ جب میں اس دنیا کی جنت میں آؤں گا' جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایران فتح ہوا ہے' تو فتوحاتِ ایران میں جو چیزیں ان کو وہاں نظر آئیں اور ملیں' وہاں جو سپہ سالار عمر بن عاصؓ تھے' انہوں نے حضرتِ عمرؓ خلیفہ کو خط بھیجا' جس میں یہ لکھا تھا کہ قرآن حمید نے جن نعمتوں کا ذکر کیا ہوا ہے' ہم نے جنت کی ان نعمتوں کو یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ ان کے مالک بنے تھے۔ اس قسم کی نعمتیں' اس قسم کے ثمر بار درخت کہ جو کبھی خشک ہی نہ ہوں' ان کے نیچے سے ہمیشہ کے لیے رواں پانی جائے' سڑاند والا پانی نہیں' آبِ رواں' جوئے نور چلتی رہے وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ (48:5) وہاں وہ جو کہا تھا کہ وہ جو الزامات تمہاری طرف چسپا کرتے ہیں' ان کو مٹا دیا جائے گا۔

انسانی زندگی میں تدبیری غلطیوں کا' نسیان کی تلافی کا' ممکن بنانے کا فارمولا

یہاں یہ کہا کہ یہ جو ان معاملات میں چھوٹی موٹی ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں' کوئی تدبیری غلطی ہو جاتی ہے' یہ انسانوں کے ہاتھوں سے ہوتا ہے' کچھ غلطیاں ہوتی ہیں' کچھ سہو ہوتا ہے' کچھ نسیان ہوتا ہے۔ تدبیری طور پہ غلطی ہو جاتی ہے لیکن جب آخرالامر فتح ہو جاتی ہے تو وہ ساری ڈھک جاتی ہیں' وہ باقی نہیں رہتیں۔ کہا کہ یہ ساری فتوحات ہم نے اس لیے دیں کہ تمہارے خلاف جو الزامات چسپاں ہوتے تھے' وہ دور ہو جائیں اور یہ جو کچھ تدبیری غلطیاں' یا کوئی سہو ہے ان کا ازالہ ہو جائے۔ بہرحال یہ جو لشکر ہیں' یہ سپاہی ہیں' جو تمہارے ساتھی ہیں' یہ کچھ ہو سکتا ہے لیکن آخرالامر جو اتنی بڑی فتوحات ہوئیں ہیں' انہوں نے ان غلطیوں کے جو نقصانات ہونے تھے' ان نقصانات کی تلافی کر دی۔ اب یہ بھی ہمیں معلوم ہو گیا کہ نقصان کی تلافی کیسے ہوتی ہے؟ توبہ اسے کہتے ہیں کہ جو کسی تدبیری غلطی سے نقصان ہو' اس نقصان کی تلافی ہو جائے اور اس سے پھر کچھ زیادہ ملے اور قرآن کریم نے یہ فارمولا بتایا ہے کہ اگر کہیں اس طرح سے کوئی غلطیاں ہو جائیں' جسے عام طور پہ ہمارے ہاں گناہ کہتے ہیں' تو وہ کس طرح سے' جسے ہم بخشا کہتے ہیں' وہ بخشا کیسے جاتا ہے؟ قرآن کریم کا بڑا عظیم فارمولا ہے جس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) اگر کہیں تم سے ناہمواریاں پیدا کرنے والے کام ہو جائیں' کوئی تدبیری غلطی ہو جائے' کہیں سہو ہو جائے تو اس کے نقصان کی تلافی کا طریق کار یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو اس سے زیادہ نفع بخش ثمرات اور نتائج پیدا کر دیں۔ یہ ہے طریقہ۔ وہ بھی تمہارے ہاں جو نقصان ہوا ہے پورا ہو جائے اور کچھ زائد بھی تمہیں مل جائے۔ یہ ہے جی! توبہ کے معنی' جس غلطی کا نتیجہ کچھ نقصان دہ ثابت ہوا ہے اس کے بعد ایسا حسن کارانہ کام کیا جائے' آج کی اصطلاح میں ایسا بزنس کیا جائے کہ وہ جو پہلے بزنس سے' پہلے کسی طرح کے کاروبار سے' Loss (نقصان) ہوا ہے' وہ بھی پورا ہو جائے اور اس کے بعد کچھ اور زیادہ بھی مل جائے۔ یہ ہے جسے آپ توبہ کہتے ہیں اور جسے بخشش کہتے ہیں۔

نجات کا مذاہب عالم میں مفہوم

کہا ہے کہ وَکَانَ ذٰلِکَ عِنۡدَ اللّٰہِ فَوۡزًا عَظِیۡمًا(48:5)۔آہاہا! کیا لفظ آ گیا ہے! وہ جو میں اشارات میں کہہ رہا تھا تو وہ لفظ ہی سامنے آ گیا۔تمام مذاہب کے اندر جو منتہیٰ ہے وہ نجات ہے' اس کے لیے لفظ ہی یہی آ تا ہے اور انگریزی میں Salvation کا لفظ آ تا ہے' مکتی کا لفظ آ تا ہے' نجات کا لفظ آپ کے ہاں بھی آ تا ہے۔اس چیز کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہ کہ کسی عذاب میں گرفتار ہو' کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو وہاں سے چھٹکارا ہو جائے۔اسے نجات کہتے ہیں۔پہلے وہ مصیبت میں پھنسے' اس سے نکل جائے تو ملا تو کچھ نہیں۔ وہ جو اس میں گرفتاری ہوئی تھی' یہ جو بند تھے' جو ہتھکڑیاں لگی تھیں' جو قید خانے میں گیا تھا' وہاں سے آنے کے بعد یہی ہوگا کہ ''جیسا پہلے تھا ویسا ہو گیا''۔صبح کو اچھا بھلا تھا' دوپہر کو بخار ہوا' علاج کیا' شام کو بخار اتر گیا' اس مرض سے نجات ملی تو کیا ہوا؟ یہ کہ جیسا وہ صبح کو تھا ویسا ہی ہو گیا۔یہ As you were ہونا ہے۔اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ساری دنیا کے مذاہب میں نجات کا یہی تصور ہے کہ انسان سے غلطی ہوئی' گناہ ہوئے' کچھ اس کو عذاب ملا' کچھ اس کو سزا ملی' سزا ملنے کے بعد وہ تین مہینے یا چھ مہینے کی قید تھی' قید اس نے کاٹ لی' پھر واپس باہر آ گیا' تو یہ ہو گیا نجات' یعنی یہ ہے خدا کی تخلیق کا سارا سلسلہ رشد و ہدایت' کائنات کے پروگرام کے نظام کا منتہا کہ انسان جیسا پہلے تھا ویسے ہی پھر ہو جائے۔

می نہ سزد خدائے را

آپ اندازہ لگائیے کہ یہ کھیل کیا ہے؟ کہ جیسا تھا ویسے ہی ہو گیا۔

قرآنِ حکیم انسانی زندگی کو فوز کی منزل سے متعارف کراتا ہے

قرآن حکیم اس کے لیے ''فوز'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔میں کیا عرض کروں' اپنے ہاں اس کے لیے بھی کیا ہی لفظ ہے! یہ ہے جسے ہم فائز المرام ہونا کہتے ہیں۔یہ جو فوز ہے' اسے Achievement کہتے ہیں' یہ کچھ حاصل ہونا ہے' یہ ویسے کا ویسا ہو جانا جیسا پہلے تھا نہیں ہے۔اس میں کچھ حاصل ہونا ہے۔کہا ہے کہ ذٰلِکَ عِنۡدَ اللّٰـہِ فَوۡزًا عَظِیۡمًا(48:5) خدا کے قانون کی رو سے یہ بہت بڑی Achievement (فوز) ہے جو تمہیں ملے گی اور دوسری طرف ان مخالفین کو کیا ملے گا؟ اب مخالفین کے متعلق آگے کہا ہے کہ وَّیُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ الۡمُنٰفِقٰتِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ وَ الۡمُشۡرِکٰتِ الظَّآنِّیۡنَ بِاللّٰہِ ظَنَّ السَّوۡءِ(48:6) لیکن یہ ایک آیت لمبی ہے' اس کے لیے وقت لگے گا' اسے ہم آئندہ درس کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ الفتح کی پانچ آیات ختم کر بیٹھے۔آئندہ چھٹی آیت سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ(2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: **سورة الفتح** (آیات 6 تا 10)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مارچ 1982ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الفتح کی آیت 6 سے شروع ہو رہا ہے: (48:6)۔

مومنین، منافقین اور مشرکین کی خصوصیات

سابقہ آیت وہ آخری آیت تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ دو ہی گروہ ہیں: ایک مومنین کا گروہ، جن کے متعلق کہا تھا کہ وہ اس قسم کی جدوجہد کی زندگی بسر کریں گے تو اس کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوگا اور یہ فوزِ عظیم ہے، بہت بڑی Achievement ہے، نجات نہیں Achievement ہے اور دوسرا گروہ منافقین اور مشرکین کا ہے۔ میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ ان دونوں میں کتنا بنیادی فرق ہے۔ اس کے بعد اب ہم اگلی آیت پہ آتے ہیں۔ اس دوسرے گروہ میں دو صنف الگ الگ بیان کیے ہیں۔ کہا ہے کہ **وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا** (48:6)۔ دو گروہوں منافقین اور مشرکین کا ذکر آ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تو معاملہ بڑا آسان اور سیدھا سا کر لیا ہے کہ جو کچھ یہ کہا گیا ہے، یہ اس زمانے کے منافقین تھے جو زیادہ مدینے میں ہوتے تھے اور پھر وہ ختم ہو گئے اور مشرکین قریش تھے، یہ معاملہ ان کا ہو گیا یعنی یہ اسی عہد کی باتیں ہیں، وہ عہد ختم ہو گیا، یہ باتیں ختم ہو گئیں۔ قرآنِ کریم نے اس سابقہ عہد کے متعلق

یہ کہا ہے کہ جب ان سے یہ کہو کہ یہ چیزیں سنو تو وہ کہتے ہیں کہ یہ اساطیر الاولین ہیں' پرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں' جو بیان کی جاتی ہیں' ہم سے اس کا کیا تعلق ہے بعینہٖ یہی ہمارے ہاں کی چیز ہے کہ یہ سارا کچھ' جو کچھ کہا جا رہا ہے' اساطیر الاولین ہیں' اس دور کے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔ رات گئی بات گئی' جیسے محاورے میں کہتے ہے کہ وہ دور ختم ہو گیا' یہ لوگ ختم ہو گئے' بس ان کی کہانیاں قرآن کریم میں باقی رہ گئی ہیں (معاذ اللہ)۔ یہ طلسم ہوش ربا کی کتاب ہے جو اس دور کی کہانیاں اپنے اندر رکھے ہوئے ہے' ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ اس دور کی کہانیاں نہیں' عزیزانِ من! یہ ابدی حقیقتیں ہیں۔ قرآن کریم آخری انسانیت تک کے لیے ضابطہ ہدایت ہے اور اس کی بات' خواہ وہ کسی پیرائے اور انداز میں کہی گئی ہے' اس کا تعلق ہر دور کے انسان سے ہے۔ ہزار برس تو آپ چھوڑ دیجیے' اپنے دور کو لیجیے۔ ہمارے ہاں منافقین اور مشرکین کی کمی نہیں ہے' آج تو معاف رکھیے گا مومن تو شاید کہیں ڈھونڈے سے ملے بھرمار تو انہی کی ہے' صدیوں سے امت انہی گروہوں پہ مشتمل چلی آ رہی ہے۔ یہ منافقت کیا ہے؟ مذہب کو اپنی مفاد پرستی کے لیے بطور آلہ کار استعمال کرنا' یہ ہے منافقت۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ اور تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ آج ہماری امت تو انہی منافقین سے بھری پڑی ہے' مشتمل ہی انہی پہ ہے۔ مشرکین کی بات تو آگے آتی ہے۔ آپ یہ منافقین ہی دیکھتے ہیں۔ پھر سن لیجیے' مذہب کو اپنی کسی مصلحت یا مفاد پرستی کے لیے بطور ذریعۂ آلہ کار یا بطور سپر استعمال کرنا' یہ ہوئی منافقت اور مختلف تفاصیل کو تو چھوڑ یئے' پاکستان میں اس کی یہ زندہ سی بات تو ہمارے سامنے ہے۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں ''معرکۂ دین و وطن'' کی روشنی میں تحریک طلوع اسلام کا کردار

عزیزانِ من! تحریکِ پاکستان کے دوران مسئلہ اور مطالبہ یہ تھا کہ مطالبہ پاکستان کے حامی (مسلم) لیگ یا قائداعظمؒ یا جنہیں ہم اقبالؒ کہتے ہیں' کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمارے دین کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت ہو' جس میں قرآن کریم کی حکومت قائم ہو سکے۔ اس کے مقابلے میں ہندو یہ کہتا تھا کہ سلطنت حکومت مملکت کو مذہب سے کیا تعلق ہے' مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے' کچھ اعتقادات ہوتے ہیں' کچھ رسومات اور شعائر ہوتے ہیں' پرستش کی باتیں' پوجا پاٹ کی باتیں ہوتی ہیں اور یہ ایک الگ چیز ہوتی ہے۔ ہم ہر مذہب والے کو اور مسلمانوں کو بھی ان کی اجازت دیتے ہیں تو گویا مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ وہاں مقابل کا گروہ کہتا تھا اور یہی تھی' اصل بنائے نزع۔ وہاں پاک و ہند میں ہندو نے تو یہ کہنا تھا۔ ہمارے ہاں کے' جنہیں نیشنلسٹ علما کہا جا رہا ہے' سب کانگریس کے ساتھ ہندو کے ہمنوا تھے اور یہی کہتے تھے۔ یہ ان کے ہاں کے جو سرِ فہرست راہنمایان کرام وہاں موجود تھے' اسی بنا پر تو ساری بحث تھی'

ان کے بے شمار بیانات موجود ہیں' میری تحریروں میں تو آپ اکثر دیکھتے رہتے ہیں۔ طلوعِ اسلام کی ساری تاریخ اسی داستان پہ ہے' یہ حقیقت میں اسی معرکے کی تاریخ ہے اور یہی بین النزع مسئلہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے تعلق ہے یا نہیں؟ ہندو اور ہمارے نیشنلسٹ علما یہ کہتے تھے کہ ہندو ہمیں اس کی ضمانت دیتا ہے کہ آپ کے مذہبی معاملات' عقائد بھی اور عبادات وغیرہ بھی آزاد ہوں گے' اور ہمارے نکاح طلاق وغیرہ کے شخصی قوانین (Personal Laws) بھی آزاد رہیں گے۔ انگریز کی عملداری میں بھی یہی صورت تھی' ہندو اس کی ضمانت دیتا تھا۔

عزیزانِ من! آپ اسے غور سے سنیئے گا' بات آگے آئے گی کہ وہاں یہ چیز تھی جو دس برس تک لڑائی لڑتے رہے۔ ہندو کو تو چھوڑ دیجیے' ان مسلمان نیشنلسٹ علما کے ساتھ جو جنگ تھی اس دور کے طلوعِ اسلام کو آپ دیکھیے' مسئلہ ہی یہ تھا۔ وہاں ہندو کو تو خیر ہم کہہ دیتے تھے کہ تمہیں کیا پتہ کہ اسلام کیا ہے لیکن جب وہ ان کو سامنے لے آتا تھا کہ صاحب! انہیں تو پتہ ہے کہ اسلام کیا ہے یعنی آخری دور میں علامہ اقبالؒ اور مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے وہ جو ''معرکہ دین و وطن'' جسے اقبالؒ نے خود کہا ہے' وہ سارا اسی مسئلے پہ مبنی ہے۔ ٹھیک ہے وہاں لیگ کو' مطالبہ پاکستان کی تائید کرنے والوں کو' یہ لوگ یہ کہتے تھے۔ ان لوگوں کو کامیابی ہوئی' انہیں شکست ہوئی' پاکستان بن گیا اور یہ سارے نیشنلسٹ علما جو وہاں دس سال تک لڑتے رہے تھے' یہاں آئے اور آنے کے بعد کہنے لگے کہ صاحب! پاکستان اسلام کے نام پہ لیا گیا ہے' مذہب کو آپ سیاست سے الگ کر ہی نہیں سکے۔ جی پھر؟ پھر یہ کہ اسلام تم کیا جانو' اسلام ہم جانتے ہیں' اس لیے یہ جتنی اقتدار کی کرسیاں ہیں' یہ ہمارے حوالے کر دو۔ حکومت کو علما ہی چلا سکتے ہیں کیونکہ یہ تو مذہب ہے اور اسلام میں مذہب کو سیاست سے الگ کر ہی نہیں سکتے۔ تو اس دن سے یہ چلا آ رہا ہے' یہی آپ ہر جگہ سن رہے ہیں' کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا رہا۔ یہ وہ ہیں جو دس برس تک اس مسئلے پر وہاں لڑتے چلے آ رہے تھے۔ آتے ہی یہ کہا۔ کاہے کے لیے کہا؟ اب یہ درمیان میں مذہب آ گیا۔ اقتدار کی کرسیاں تھیں۔ ساری جنگ' اس تیس سال کے اندر' اسی مسئلے پہ ہوتی چلی آ رہی ہے اور اب پچھلے کچھ سالوں سے تو یہ جنگ پھر اتنی تیز ہو گئی ہے کہ آپ کو معلوم ہے کہ نظامِ مصطفیٰ کے قائم کرنے کے لیے یہ کتنی بڑی جنگ ہوئی۔ اس کے اندر' وہ بہر حال ایک Issue (مسئلہ) تھا کہ وہاں اس زمانے کی حکومت کا تو تختہ الٹ دیا اور اس کے بعد پھر نظامِ مصطفیٰ معلوم ہی نہیں کہ کہاں چلا گیا۔

پاکستان میں اسلامی نظام کی جمہوریت کے نفاذ کے خدوخال کا تجزیہ اور خودساختہ مذہب کے استعمال کا طریق

عزیزانِ من! اب پھر جمہوریت کا دور دورہ ہے کہ جی! جمہوریت عین اسلام ہے اور یہاں کی جمہوریت میں' مذہب کے یہ علمبردار ہیں۔ چلیے پھر درمیان میں مذہب آ گیا اور بات تو دور چلی جائے گی ورنہ ان سے پوچھیے کہ ان کے نزدیک جمہوریت یا شوریٰ یا مشاورت' کس باب میں ہے؟ یہ مشاورت کہیں گے۔ ان میں کچھ حضرات تو اہل حدیث ہیں' ان کا مسلک یہ ہے کہ احادیث' جس انداز میں' جن الفاظ

میں، جس طرح سے رکھی ہوئی ہیں، اسی طرح سے ان پر عمل کرنا ہے، یہ دین ہے۔ اس میں مشورے کا کوئی تعلق ہی نہیں، اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، کوئی حک واضافہ نہیں ہوسکتا، تو مشورہ کس بات میں ہے؟ دوسری اکثریت یہاں اہلِ فقہ کی ہے۔ اہلِ فقہ والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ فقہ مکمل ہو چکی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، اجتہاد کا دروازہ بند ہے، تو یہ مشورہ کاہے کے لیے ہے؟ پھر یہ مجلسِ مشاورت کاہے کے لیے تم بنوا رہے ہو؟ جمہوریت کے اندر تو مشاورت سے کچھ طے ہوتا ہے تو مشاورت تو نہ فقہ میں ہے، نہ مشاورت حدیث کے معاملے میں ہے، تو پھر مجلسِ مشاورت اور یہ جمہوریت کس بات کے لیے کر رہے ہو؟ یہ کوئی نہیں بتائے گا۔ دیکھ رہے ہیں یہ مذہب کہاں کام آ رہا ہے۔

مذہب کام آتا ہے۔ معاف رکھیے گا، یونہی یہ بات ٹپکتی ہوئی ذہن میں آ گئی۔ یہ ہندو برہمن روٹی خود پکاتے ہیں تو خود کھاتے ہیں۔ وہ مندر کے باہر چولہا لے کر بیٹھا ہوا تھا، روٹی پکا رہا تھا کہ ایک کتا آیا اور روٹی لی اور بھاگا۔ اب اس ہندو برہمن نے اِدھر اُدھر دیکھا، کچھ نظر نہ آیا، البتہ پتھر کا بنا ہوا ہندو کا بُت گنیش، اس کے پاس پڑا ہوا تھا لہٰذا اس کو اٹھایا، زور سے مارا، یہ کتے کے لگا اور وہ روٹی اس کے منہ سے نکل گئی۔ اب وہ ہندو برہمن گنیش جی کی مُورتی کو کہتا ہے: ساری عمر تیری بھگتی کرتے رہے مگر کام تُو آج آیا۔ دیکھا! مذہب کہاں کام آتا ہے۔ داستان کو مختصر ہی رکھیے۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام آتے ہیں۔ کہا ہے کہ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ [1] (48:6) مذہب کام آتا ہے۔ سمجھ لیا کہ وہ یہ ہے اساطیر الاولین۔ اس دور کے لوگوں کی باتیں ہیں۔ یہ تو، ارے! پھر اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے اور آگے ہے کہ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ (48:6) یہ وہ قریش مکہ تھے، ہم نہیں ہیں۔ بڑی مشکل ان کے لیے یہ ہے، جہاں آ کر جنوں کیندے نیں پنجابی اج کیڑے وددے نیں، مشکل آئے (جسے پنجابی زبان میں کہتے ہیں کہ کیڑے کاٹتے ہیں۔ مشکل یہ ہے) یعنی قرآن حمید کی حفاظت کا ذمہ تو خدا نے لے رکھا ہے ورنہ یہ بات یہاں تک نہ ہوتی اور وہ اب سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے اس پر یہ اتنا بڑا قبضہ کیوں رکھا ہے۔ اس کو پتہ تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا کریں گے۔ دین کی جو کوئی اور چیز ہے، وہ اپنے اصل پہ نہیں رہی۔ قرآن کریم کے الفاظ ضرور رہ گئے لیکن اس کے لیے انہوں نے طے کر لیا کہ یہ کسی کام ہی نہیں آتا، ثواب کے لیے پڑھتے چلے جائیے۔ آپ کے ہاں کا دین مذہب بنا۔ یہ تو دوسری الگ بات ہے لیکن بہر حال جو قرآنِ حمید ابھی تک مانتے ہیں، ان کے لیے یہ قرآن حکیم تو قولِ فیصل ہے۔ یہ کہا ہے کہ یہ قریشِ مکہ تھے، ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے اور وہ قرآن حمید کی سورۃ یوسف کی یہ 12 ویں آیت ہے۔ کہا کہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (12:106) ان کی اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ اللہ پر ایمان کے بھی دعویدار ہیں اور مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ تو یہ تو ایمان لانے والوں کے متعلق کہہ دیا۔ وہ جو مشرکین قریش تھے ان کی تو یہ کیفیت نہیں تھی کہ وہ ایمان لانے کے بعد مشرک کے مشرک رہے ہوں۔ یہ تو ہم ہیں اور بات تو یہاں سے نکھر آئی کہ یہ قریشِ مکہ کی بات نہیں تھی۔ پھر کیا بات ہوئی؟ کہ جی جو

---

[1] مخالفین۔ مشرکین اور منافقین۔ کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں، ان کے کیے کی سزا مل جائے (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص۔ 1195)۔

مشرک ہے' وہ بت پرست ہوتا ہے۔ اب یہاں بت پرستی تو ہوتی نہیں۔ ان کے ہاں ایک گروہ ہے جو کہتے ہیں کہ صاحب! یہ قبروں کے اوپر عرس کرنا' دیئے جلانا' پھولوں کی چادریں چڑھانا' یہ شرک ہے اور جو لوگ یہ کرتے ہیں وہ ہیں مشرک۔ تو پیچھا چھڑایا۔ ایک گروہ کو تو مشرک قرار دیا' تو آپ تو مومن ہوگئے لیکن قرآن حمید تو یہ بات کہتا ہی نہیں ہے۔ یہ بت پرستی اور قبر پرستی تو دوسری چیزیں ہیں' یہ تو ہم پرستیاں ہیں' جہالت ہے۔ شرک کیا ہے؟ توحید کسے کہتے ہیں؟ قرآن کریم نے (18:26) میں شرک کی اور توحید کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) خدا اپنے حقِ حکومت میں' اپنے احکام میں' اپنے قوانین میں' کسی کو شریک نہیں کرتا۔ تو شرک تو یہ ہے۔ توحید ہے خالص قرآن حکیم کی' خدا کی کتاب کی' خدا کے احکام کی' خدا کے قوانین کی' خالص پیروی کرنا۔ اس کی پیروی ہی توحیدِ خالص ہے اور جونہی اس کے ساتھ کسی اور کے بھی آپ نے قرآنی قوانین میں احکام اور شریعت ملالی تو یہ شرک ہو گیا اسی لیے کہا کہ لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اس باب میں اور انسان تو ایک طرف رہے' وہ تو نبی کو بھی کہتا ہے کہ نبی کو بھی اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے احکام منوائے۔ اس کا بھی منصب یہی ہے کہ وہ خدا کے احکام کی اطاعت کرائے۔ یہ شریک فی الحکم شرک ہے۔ اب اس کے لیے توحید کیا ہے؟ یہ تو شرک ہو گیا۔ عزیزانِ من! بڑی توجہ سے ان چیزوں کے نوٹس رکھیے۔ زندگی کا کیا اعتبار ہے' شاید کہیں اور نہ ملیں۔ بہر حال یہ شرک ہے کہ خدا کے قوانین کے ساتھ دوسروں کے قوانین کو شامل کر لینا۔

قرآنِ حکیم کی پکار یہ ہے کہ کیا قرآنِ حکیم تمہارے لیے کافی ہے! مگر یہ کہتے ہیں کہ نہیں

توحید کیا ہے؟ (29:51) میں توحید خالص کا کہا ہے۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ وہ اپنے حکم میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔ اس آیت میں یوں کہا ہے کہ اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (29:51) کیا یہ ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب نازل کر دی ہے' یہ Complete Course (مکمل کورس) ہے اس کے سوا کسی انسان کو کسی قسم کا کہیں سے کوئی قانون' کوئی ہدایت' کوئی احکام' کوئی شریعت' لینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ اس انداز سے مکمل ہے لہٰذا ارشاد ہے کہ کیا یہ لوگ اس کے بعد بھی اس کے ساتھ اور لوگوں کے احکام اور شریعت تلاش کرتے پھر رہے ہیں؟ کیا وہ یہ بات ہے کہ ان کے لیے قرآن کریم کافی نہیں ہے؟

عزیزانِ من! یہ جو آیت ہمارے زیرِ درس ہے اس کے اگلے جو دو الفاظ ہیں' انہوں نے توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ (48:6) وہ خدا کے متعلق بڑی بدگمانی سے کام لیتے رہے ہیں۔ ان مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو یہ خیال یا شبہ گزرتا ہے کہ وہ خالص خدا کی اطاعت یا اس کے جو قوانین ہیں وہ انہیں کامیاب نہیں بنا سکتے۔ یہ خدا کے متعلق نہایت غلط عقیدہ ہے۔ یہ ان کا ظن ہے۔ یہ ظَنَّ السَّوْءِ ہے. مشرک کے متعلق قرآن کریم بات کیا کہتا ہے؟ وہ

یہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی کتاب کے ساتھ احکام وقوانین کو اور جگہ تلاش کرتے پھرتے ہیں کہ یہ کافی نہیں ہے اور اس میں انہیں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے۔ جب بھی ان سے کہیے تو وہ بتاتے ہیں کہ ٹھیک ہے پہلی چیز تو کتاب السنّت ہے۔ یہ دو چیزیں رکھی ہوئی ہیں' سنت یا حدیث کے بعد آگے وہ فقہ والے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کتاب اور سنت جو دونوں چیزیں ہیں' وہ فقہ کے اندر آ گئیں یعنی یہ جو پہلے تھے ان کے نزدیک خالی کتاب کافی نہیں ہے اور آگے بڑھے جن کی ساری دنیا میں اکثریت ہے' انہوں نے کہہ دیا کہ کتاب اور سنت دونوں ہی کافی نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہمارے آئمہ کا اجتہاد اور ان کی جو فقہ ہے' یہ ساتھ میں لائی گئی۔ وہ جو قرآن حکیم نے بنیاد دی تو کہا کہ ان کو یہ تلاش اس لیے خدا کے سوا اوروں کے گوشوں کی طرف جا کر شریعت کے احکام لینے کی اس لیے تلاش ہوتی ہے کہ ان کے دل میں وسوسہ یہ گزرتا ہے کہ خدا کی یہ چیز کافی نہیں ہے' کچھ اور چاہیے' ایویں نہ مارے جائیے (ایسے ہی نہ مارے جائیں)۔ وہ جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ تم قرآن کریم کے اس سہارے کو پکڑ لو گے تو یہ تمہیں کبھی دغا نہیں دے گا۔ دراصل اس کے متعلق ان کے دل میں شبہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی جو رسی ہے' یہ کمزور ہے' یہ ان کے کہنے کی کیا بات ہے! معاف رکھیے گا' ہر دکاندار اپنے مال کے متعلق یہی کہتا ہے۔ کہا کہ اس سہارے پر ان کو یقین نہیں آتا۔ کیا بات ہے ظن السوء کی! کہ انہیں یقین نہیں آتا۔ اسی لیے وہ دوسرے سہارے تلاش کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! عام زندگی کے معاملات میں دیکھیے' کسی ایک کے ساتھ' کسی افسر سے سفارش ڈلوا دیجیے' وہاں یہ کام ہو بھی جائے تو دل میں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں اتنے سے کام بنے گا یا نہیں' تو کوئی اور بھی ساتھ تلاش کر ہی لو تو اچھا ہے۔ صاحب! اسے بھی پہنچا دو تو بہتر یہی ہے۔ صاحب! اسی لیے ایک اور شریک کی ضرورت پڑتی ہے کہ اسے ہم کافی نہیں سمجھتے۔ کہتا ہے کہ ان کے دل میں یہ دھڑکا ہوتا ہے کہ کافی نہیں ہے اور یہاں انہوں نے کہہ دیا اور قرآن کریم نے خود بھی کہا کہ کیا یہ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ کافی نہیں ہے۔ کہتا ہے کہ یہاں سے پھر جو بات ہے وہ آگے چلتی ہے یعنی جس وقت یہ چیز شدت اختیار کرتی ہے تو پھر عقیدہ کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحۡدَهُ اشۡمَاَزَّتۡ قُلُوۡبُ الَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِذَا هُمۡ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ (39:45) جب خدائے واحد کا ان کے سامنے نام لیا جاتا ہے' اسی کے قوانین کی بات کی جاتی ہے کہ وہی توحید خالص ہے' اس کے ساتھ کچھ اور نہیں' تو کہتا ہے کہ پھر یہ بڑا منہ بسور لیتے ہیں اور جب اس کے ساتھ انسانوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو پھر بڑے خوش ہو جاتے ہیں: بات ہوئی ناجی! سبحان اللہ، اب دین مکمل ہوا کہ دیکھیے! ہم کہہ رہے تھے کہ قرآن مجمل ہے' اس سے بات نہیں چل سکتی' اس کے اندر ملتا ہی نہیں یعنی یہ کہنے پر بڑا فخر ہے کہ کتاب ناقص ہے' کتاب مجمل ہے' مکمل نہیں ہے' ناتمام ہے' انسانوں کی کوششیں اسے مکمل بھی کریں گی' اس کے ابہام کی وضاحت بھی کریں گی' تشریح کریں گی' تفصیل بیان کریں گی' یہ ساری چیزیں ساتھ ملاؤ گے تو پھر یہ دین کافی ہوگا' وہ جو خدا نے کہا ہے کہ کیا یہ کتاب تمہارے لیے کافی نہیں ہے' دھڑلے سے کہتے ہیں کہ نہیں ہے کافی۔

آپ کو یاد ہے میں نے پچھلے یا اس سے پہلے درس میں اقتباس پڑھ کر سنا دیا تھا کہ ان خطیبوں کے ناقص العقل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کریم سے احکام تلاش کرتے رہتے ہیں یعنی یہ ہے ان لوگوں کا جرم کہ صرف قرآن کریم سے یہ لاتے ہیں صاحب! جب صرف خالص قرآن کریم کی بات کی ہے تو اس کے خلاف ہزار علماء کا فتویٰ جاری ہوتا ہے اور فتویٰ کی بنیاد ہی یہ ہے کہ یہ صرف قرآنِ خالص کو مانتا ہے اور جب اس کے ساتھ آپ ان کو کوٹ (Quote) کیجیے (مثلاً) اہل حدیث کے ہاں سے بخاری کو لے آیئے' سبحان اللہ صاحب! ان کے درس ہوتے ہیں' ان کا ''ختم'' ہوتا ہے جیسے ہی قرآن کا ختم ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے دارالعلوموں میں قرآن کریم کے ساتھ بخاری کا ختم ہوتا ہے۔ قرآن حمید کے تیس پارے ہیں اور اس کے بھی تیس پارے ہی رکھے۔ فقہ والوں کے ہاں بھی یہ ہے کہ' جب تک فقہ کا ساتھ نام نہ لیجیے' وہ مطمئن ہی نہیں ہوتے۔ نام لینے کے بعد وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں' جن کی ان کو ضرورت پڑ گئی؟ خدا نے کہا تھا کہ اس کا قرآن کافی ہے۔ کہا کہ نہیں جی۔ یہ کافی نہیں ہے' کہا کہ جن کا ساتھ ہی یہ نام لیتے ہیں یہ شرک کرتے ہیں **اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ** (42:21) یہ انسان جن کی طرف رجوع کرتے ہیں' یہ لوگ انہیں شریعت کے احکام بنا کر دیتے ہیں جس کی خدا نے کہیں اجازت نہیں دی۔ کہا ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحُكۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ** (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے' خواہ وہ صاحبِ کتاب ہو' خواہ انتظامیہ اس کے پاس ہو' Executive اس کے پاس ہو' نبی بھی کیوں نہ ہو' کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں' میرے محکوم بنو۔ کہا کہ **شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ مَا لَمۡ يَاۡذَنۡۢ بِهِ اللّٰهُ** (42:21) ان کے لیے یہ لوگ شرعی قوانین مستنبط کرتے ہیں' وضع کرتے ہیں' بناتے ہیں اور پھر ان کی کیفیت یہ ہے کہ خدا نے اپنے قوانین کے لیے جو خصوصیات رکھی تھیں اور سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ** (6:34) قوانینِ خداوندی میں تبدیلی کبھی نہیں ہو سکے گی اور **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (18:27) کوئی تبدیلی کرنے والا نہیں ہے' یہ خصوصیات انہیں بھی دے دیں۔

قرآنی قوانین کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کو ملانا شرکِ عظیم ہے

حتمی طور پر یہ کہا گیا کہ صرف اور صرف خدا کے قوانین کو' جیسے خدا کو ابدیت اور اوّلیت حاصل ہے' کسی اور کو نہیں' اسی طرح خدا کے قوانین کو بھی ابدیت حاصل ہے' خدا کی کسی مطلق صفت کے اندر کسی اور کو شریک کیا جائے تو یہ خدا پہ ایمان' اس کی توحید کو ختم کر دیتا ہے' یہ شرک ہو جاتا ہے۔ تو خدا کے ساتھ شریک کرنے کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ جو خصوصیات خدا نے اپنے کلمات کے متعلق کہی ہیں' کسی دوسرے کو وہ خصوصیت دے دی جائے تو شرک ہو گیا۔ اس نے اپنے قوانین کے متعلق کہا تھا کہ **لَا مُبَدِّلَ** (18:27) کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' ان

کے ہاں جو قوانینِ شریعت چلے آ رہے ہیں' قرآن کریم کے نہیں ہیں' خواہ وہ روایات کے ہوں خواہ وہ فقہ کے ہوں ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی' انہوں نے ان قوانینِ شریعت کو قوانین خداوندی کا ہم پایہ کر دیا۔ یہ **کلمت اللہ** کے ساتھ انہیں قانون سازی میں لے آئے تو قانون بنا کر دینے والے شریک ہو گئے۔ جو ابدیت خدا کے قانون کے لیے تھی وہ ان کو دیدی گئی۔ اس طرح یہ دونوں ہم پایہ ہو گئے۔ کہا کہ صاحب! یہ جو شرک ہے' یہ تو مکے کے قریش تھے' جن کے متعلق کہا گیا تھا' ہمارے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حمید کیا کہتا ہے اور پھر آپ اس کو سمجھ رہے ہیں کہ قرآن حکیم کو یوں یہ لوگ کیوں نہیں سمجھاتے اور کیوں نہیں سامنے لاتے۔ معلوم ہے کہ اس کے بعد قرآن کریم کے آئینے میں کیا شکل نظر آئے گی' کیا چیز باقی رہے گی؟ عزیزانِ من! شرک کو قرآن کریم نے ظلم عظیم کہا ہے' وہ جرم کہا جسے عام الفاظ میں کہتے ہیں کہ بخشا نہیں جا سکتا۔ یہ شرک کیا ہے؟ مملکتِ پاکستان کے جو قوانین ہیں' ان کو تسلیم کرنا۔ یہ ہے Loyalty (وفاداری) اس State (مملکت) کے ساتھ' وفاشعاری اس مملکت کے ساتھ۔ اگر آپ اس کے ساتھ کسی دوسری سلطنت کے قوانین کو بھی اپنے ہاں لے آئیں تو یہ اس مملکت کے خلاف بغاوت ہے۔ جب کہ کسی قانون کی جو خلاف ورزی ہے' وہ صرف جرم ہے۔ اس کی عام سزائیں ہیں' کسی کی چھ مہینے' کسی کی سال دو سال کی ہوتی ہے۔ اگر خدا کی مملکت ہو تو وہاں خدا کے قوانین کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین شامل کر لیے جائیں یا خدا کے قوانین سے انکار کر دیا جائے' تو یہ بغاوت ہے' شرک ہے۔ ہمارے ہاں ہندو بستے ہیں' عیسائی بستے ہیں' پارسی بستے ہیں۔ ان کو اقلیت قرار دیا ہے اسے آپ کفر کہیں گے۔ وہ ہمارے اسلام کے قوانین کو تسلیم نہیں کرتے' ٹھیک ہے لیکن جو اسے تسلیم کرتے ہیں اور اس کے ساتھ خدا کے قوانین اور انسانوں کے قوانین ساتھ ملاتے ہیں تو یہ تو شرک ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں قرآنی قوانین کے ساتھ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو شامل کرنے کی ایک دو مثالیں: رجم اور وصیت

عزیزانِ من! اس کے لیے مجھے مثالیں دینا ہوں گی تو اس کے لیے تو پوچھو کہ' پتہ نہیں کہ خدا کی کتاب میں مزید کتنا وقت لگ جائے مثلاً یہ ایک ہی چیز ہے کہ جس پر اگلے دنوں سے ہنگامہ بھی چلا آ رہا ہے۔ عدالت فیصلہ کرے گی۔ قرآنِ کریم میں' خدا کے قانون میں' زانی اور زانیہ کی سزا کوڑے رکھی ہوئی ہے' متعین الفاظ میں یہ وہاں آیا ہوا ہے' کوئی دوسری سزا وہاں نہیں ہے' صرف یہی سزا ہے۔ آپ کے ہاں کی شریعت یہ ہے کہ یہ جو سزا ہے' یہ غیر شادی شدہ کی ہے اور شادی شدہ کی سزا رجم ہے' سنگسار کرنا' پتھر مارنا' اور یہ قرآن کریم میں نہیں ہے۔ تو ایک ہی جرم کے لیے اب یہ جو دو سزائیں ہوئیں' تو ایک تو ہو گئی قرآن حکیم کی' اور ایک ہوئی خارج از قرآن' تو شرک تو اسے کہتے ہیں۔ اقلیت والے اس شریعت کو مانتے ہی نہیں ہیں' ان کا اپنا قانون ہے جب کہ ہمارے ہاں یہ دونوں بیک وقت مانے جا رہے ہیں۔

خدا کے قانون میں، قرآن کریم میں یہ ہے کہ جب کوئی مومن موت سے پہلے، جو کچھ بھی اس کے پاس ہے، اس کے متعلق وہ وصیت کر کے جائے کہ اس کی تقسیم میرے مرنے کے بعد کیسی ہوگی۔ یہ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ (2:180) دو دفعہ آیا ہے۔ آیت میں کُتِبَ عَلَیْکُمْ پہلے ہے۔ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ اتنا اہم ہے۔ پہلے کہا کہ ہم نے یہ فرض قرار دیا ہے کہ ایسا کرے اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہ واجب ہوگیا ہے، حق ہے ان کے اوپر کہ خدا کی طرف سے ایسا کریں، قرآن حکیم میں یہ خالص قانون موجود ہے۔ آپ کی جو شریعت کا قانون ہے وہ یہ کہتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ وصیت تیسرے حصے میں کی جا سکتی ہے اور وارثوں کے لیے نہیں کی جا سکتی۔ یہ بات قرآن حکیم میں تو کہیں نہیں ہے۔ یہ دونوں چلتے ہیں، قرآن حمید کا حکم، اس کے اندر یہ تبدیلی، اس کے ساتھ یہ دوسرا حکم، جو خدا کا نہیں ہے۔ اس میں اگر تفصیل میں آئیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو بہت کچھ نکلتا ہے۔ بنیادی یہ چیز ہے کہ ہمارے ہاں قانون کی بنیاد خدا کی کتاب ہوگی۔ یہی جو چیز ہے اس کے ساتھ دوسروں کو شریک کیا ہوا ہے، یہ حدیث ہوگئی یا فقہ ہوگیا۔ یہ مقام بڑے نازک ہیں۔ جب یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تو اس کے بعد کون ہے، جس کا سر نہ جھک جائے۔ بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو اسی لیے اپنے احکام اور ارشادات کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو دیا ہی نہیں بلکہ ان کے ہاں جو بہترین صحیح ترین کتابیں ہیں، وہ بخاری شریف اور مسلم ہیں۔ ان میں یہ ہے۔

مسلم کی حدیث کہ رسولِ کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کریم کے سوا کچھ نہ لکھو مگر یہ ظن السوء میں ہیں

عزیزانِ من! انہی کی بہترین، صحیح ترین کتاب مسلم کے دیباچے میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے قرآن کریم کے سوا کوئی دوسری چیز نہ لکھو۔ اگر کسی نے لکھی ہے تو اسے جا کر مٹا دے اور وہیں یہ چیز ہے کہ اس کے بعد صحابہؓ نے حضور ﷺ کے اقوال لکھ رکھے تھے، بعض باتیں لکھ رکھی تھیں، انہوں نے کہا کہ پھر ہم سننے کے بعد باہر گئے، اپنے اپنے پاس جس نے کچھ بھی لکھا تھا، اس کو اکٹھا کیا اور جلا دیا۔ مگر یہ کہتے ہیں کہ خالی قرآن کریم سے بات نہیں بنتی صاحب! یہ ظَنَّ السَّوْءِ (48:6) ہے، یہ خدا کے متعلق بڑی بدگمانی ہے۔ یہ عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ (48:6) ہے۔ واہ واہ! اب یہ ایک اصولی بات آگئی۔ کہا کہ یہ جو چیز ہے، اسے انگریزی زبان میں Vicious Circle کہتے ہیں یہ ایک دائرہ قائم ہو جانا، اس دائرے کے اندر وہ خود پھنس جاتا ہے۔ قرآن کریم، دیکھیے! کیا کہتا ہے۔ (35:43) میں کہا کہ یہ جو خدا کے نظام کے خلاف خفیہ تدبیریں کرتے ہیں، اس کے قوانین کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تو اس قسم کی سازشیں کرنے والے ایک دائرہ بناتے ہیں۔ وَ مَکْرَ السَّیِّیءِ وَ لَا یَحِیْقُ الْمَکْرُ السَّیِّیُٔ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (35:43) انہیں معلوم نہیں کہ اس قسم کی خدا کے خلاف سازشیں کرنے والے ہزار خفیہ تدبیریں کریں، یہ ایسا دائرہ ہے جس کے اندر یہ خود پھنس جاتے ہیں، یہ ایسے نہیں ہے کہ خود اس دائرے کے باہر ہوں یہ خود اس کی لپیٹ میں آتے ہیں۔ سمجھتے یہ ہیں کہ ہم دوسروں کو اس کے اندر پھنساتے ہیں مگر یہ خود پھنستے ہیں: دَآئِرَةُ

السَّوْءِ. یہ ہے وہ دَآئِرَةُ السَّوْءِ اور اس کا نتیجہ پھر؟ یہ کہ سیدھی سی بات ہے، یہ جھلس کر رہ جاتے ہیں، یہ تمام خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں جو خدا کے نظام سے حاصل ہونی تھیں، پھر یہ جہنم کی زندگی بسر کرتے ہیں، کتنا برا ٹھکانہ ہے! کہا ہے کہ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (48:7) ان پر غلبہ بھی ہم رکھتے ہیں اور ہمارا یہ غلبہ Reason پہ مبنی ہے، دھاندلی نہیں ہے، جباریت نہیں ہے، ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے۔ یہاں ہم عزیز ہیں، ہم قوت رکھتے ہیں، غلبہ رکھتے ہیں، ساتھ حکیم بھی ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! قرآن حمید کی مملکت کی کیفیت بھی یہ ہے کہ وہ عزیز بھی ہے، وہ حکیم بھی ہے۔ یہ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. پہلے بھی یہ فقرہ آچکا ہے تو میں نے عرض کیا تھا کہ والارض کے جنود تو مجاہدین کی جماعتیں ہیں، جو حق کی مخالفت کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے، مدافعت کرنے کے لیے، میدانِ جنگ میں سر بکف نکل آتی ہیں۔ یہ شمشیر یا تلوار کے زور سے اسلام پھیلانے کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو سوال ہی نہیں ہے کہ اگر کل کو دماغ کا اطمینان پورا نہ ہو تو اس انداز سے زبان سے بھی یہ کہنا اسلام نہیں ہے، چہ جائیکہ جبراً کوئی اس سے یہ کہلوایا جائے۔ یہ ہیں وہ حق کی مدافعت کرنے والے۔ جنود الارض تو وہ آ گیا اور جو سمٰوٰت کے جنود ہیں، وہ قرآن کریم کے سورۃ بدر کے معرکے اور غالباً حنین کے معرکے میں بھی آئے ہیں۔

ارض وسما کو وجود میں لانے کا مقصد ہر انسان کے ہر عمل کی نگہبانی کرنا ہے

قرآن کریم میں یہ ہے کہ اللہ نے اپنی نصرت کے لیے ان قوتوں کو بھیجا جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے۔ یہ ہے بڑی چیز۔ ابھی تو قرآن کریم کی ایک بڑی اہم آیت ہے۔ علمِ انسانی، میں سمجھتا ہوں کہ ابھی اتنا اونچا نہیں ہوا کہ اس کو گرفت کر سکے کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ یہ (45:22) بڑی اہم آیت ہے۔ کہا ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) کائناتی قوتیں ہم نے اس لیے بنائی ہیں، یہ جسے زمین و آسمان کہتے ہیں وہ اس طرح سے گردش کرتے ہیں کہ ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا بدلہ ملے، کسی پہ کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ یہ اس لیے محوِ گردش ہیں۔ تو یہ باہر کی جو کائناتی، خارجی کائنات ہے، اس کے اندر جو خدا کے قوانین کا نظم و نسق پھیلا ہوا ہے، ان کا تعلق انسان کے اعمال سے کیا ہے۔

سائیکولوجسٹ کے مقابلے میں فلسفہ کی حیثیت صرف ذہنی عیاشی کی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ ابھی علمِ انسانی اس سطح تک نہیں پہنچا۔ یہ جو سائیکولوجسٹ ہیں، وہ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اور آج کل بڑی محنت کر رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ باقی علوم تو آج کل بہت پیچھے چلے گئے ہیں، ان میں فلسفہ وغیرہ تو ذہنی عیاشی تھی۔ یہ بڑی محنت کر رہے ہیں یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ جو خارجی قوتیں ہیں، یہ انسان کے اعمال پہ کیسے اثر انداز ہوتی ہیں اور کس طرح ان کی رو

سے بھی ان کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور قرآن کریم میں تو یہ کہا ہے کہ تم انفس و آفاق میں ہماری نشانیاں دیکھتے چلے جاؤ گے حتیٰ کہ یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53) اور اس طرح سے ہر نشانی جو سامنے آئے گی وہ قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعوے کی صداقت کا ثبوت بن جائے گی۔ صاحب! تو یوں یہ ثبوت بنیں گی لہٰذا یہ چیزیں اور یہ نشانیاں آہستہ آہستہ سامنے آ رہی ہیں۔ ہم پچھلے دور سے بہت آگے ہیں۔ یہ ہماری کاریگری نہیں ہے' اس میں علمِ انسانی کی سطح اونچی ہوگئی ہوئی ہے صاحب! یہ ہیں جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (48:7).

مذہب کی دنیا میں اُمت کا کوئی تصور نہیں ہوتا مگر اسلامی نظام میں سربراہِ مرکز کی ذمہ داری احکام خداوندی کا نفاذ ہے

اب آیا وہ نظام' جس کے تابع اس ارض پر یہ سب کچھ ہونا ہے' اس کے لیے قرآن کریم نے ایک امت تیار کی وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143) ایک امت تیار کی' دین مذہب نہیں ہے' مذہب میں کسی امت یا قوم کا تیار کرنا مقصود نہیں ہوتا' ہر فرد انفرادی طور پر مذہب کے جو احکام ہیں ان پہ عمل پیرا ہوسکتا ہے' وہی جو وہاں میں نے کہا ہے' یہ نیشنلسٹ علما کہتے تھے کہ اس کے لیے اپنے نظام اپنی حکومت کی ضرورت نہیں ہے' نکاح طلاق وغیرہ کے مسائل دیکھیے ہم کر سکتے ہیں' سب چیز ہے' پوجا ہے' پرستش ہے' عبادت ہے' ہم وہ اس کے لیے کرتے رہتے ہیں' کہ مذہب میں جماعت تیار کرنے کی' قوم تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قوم تو تیار کی جاتی ہے تا کہ وہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143) باقی اقوام عالم کے اعمال پہ نگاہ رکھے کہ کوئی کسی پہ ظلم و ستم نہ کر سکے۔ اللہ اکبر! اور اپنا نظام کیا ہو؟ یہ کہ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (2:143) ان کا جو مرکز' ان کا جو سربراہ' ان کا جو نظام اور اس نظام کی جو Sovereign Authority ہے' وہ تو خدا ہے' اس نظام کا سربراہِ مرکز' جس نے یہ Controlling Authority نظام قائم کیا ہے' وہ ان کے اعمال کی نگہداشت کرے کہ ان میں سے کوئی غلط راستے پہ تو نہیں جا رہا۔ یہ ہے نظام۔ خدا کے احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا' یہ ہے نظامِ مصطفےٰ ﷺ نظامِ اسلامی' نظامِ خداوندی اور چونکہ احکام انسانوں کے ذریعے سے نافذ ہوتے ہیں' خالی جو کتاب ہے وہ کافی نہیں ہوتی' نافذ کرنے کے لیے کتاب تو خاموش ہوتی ہے' الفاظ تو اپنے آپ کو نافذ نہیں کر دیتے' ظاہر ہے عملی نتائج تو کسی انسان کے ذریعے' کسی اتھارٹی کی رُو سے ہی حاصل ہوتے ہیں چنانچہ حکومت کا یہ ایک بڑا نرالا سا' انوکھا سا' نادر سا' تصور تھا جو اسلام نے دیا ہے کہ حکومت تو ہو کتاب کی لیکن وہ ہونی ہے کسی نہ کسی انسان کے ہاتھوں۔ اسے کہتے ہیں حکومتِ خداوندی یا حکومتِ اسلامیہ کہ خدا کے احکام انسانون کی جماعت کے ہاتھوں سے نافذ ہوں اور سب سے پہلی یہ مملکت جو قائم کی' وہ قائم کی حضورِ نبی اکرم ﷺ نے' اس لیے

پہلے مرکز یا اس حکومت کی جو Final Authority وہ نبی اکرم ﷺ تھے۔ خدا نے اس نظام کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ اِنَّآ اَرۡسَلۡنٰکَ شَاهِدًا (48:8) اے رسول! ہم نے تمہیں اس امت پر شاہد بنا کر بھیجا' نگران بنا کر بھیجا ہے اور اس کے بعد اس امت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پوری انسانیت کے اعمال کی نگرانی کیا کرے اور وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا (48:8) غلط راستے پر چلنے والوں کو متنبہ کرے کہ تم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے' صحیح راستے پہ چلنے والوں کو شاباش دے کہ بالکل ٹھیک ہے' قدم اٹھائے جاؤ' بڑھائے جاؤ' وہ منزل آئی تمہارے قریب' وہ آئی منزل تمہارے قریب۔ کیا بات ہے صاحب! یہ ہے مقصد اس نظام سے جس کے سربراہ نبی اکرم ﷺ تھے۔ کہا ہے کہ لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا (48:9) اور اس طرح سے اللہ اور رسول پر ایمان آتا ہے اور ان کا فریضہ ہو جاتا ہے کہ پھر یہ جو وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ وَتُسَبِّحُوۡهُ (48:9) ہے گو کہ اس میں ضمیر واحد کی ہیں' تو خدا کی طرف بھی اس کا مطلب ہوسکتا ہے' رسول بھی ہوسکتا ہے لیکن اسی حد تک جہاں تک انسانیت بشریت کا تعلق ہے۔ یہ تو ہے کہ جماعتِ مومنین اس نظام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے نبی اکرم ﷺ کی مدد کرے اور اس کے لیے تعزیر نہایت ضروری ہے۔ مکینکلی یہ احکام ماننے کی بات نہیں ہے خدا کے احکام کو نافذ کرنے والی اتھارٹی کی تعزیر ضروری ہے۔

لفظ سبح اور تسبیح کا لغوی اور قرآنی مفہوم اور قرآنی نظام کی سنٹرل اتھارٹی کی وضاحت

کہا ہے کہ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا (48:9) اور اس جماعت کا فریضہ یہ ہے کہ یہ خدا کے بتائے ہوئے مناسک و مقاصد کے حصول میں صبح شام سرگرداں رہتی ہے یہ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ہمیشہ رہنے کے معنی میں آتا ہے۔ یہ صبح شام محاورہ ہے۔ سبح اور تسبیح کے معنی تو آپ جانتے ہیں۔ یہ خدا کے بتائے ہوئے مقصد کے حصول میں ہمیشہ سرگرداں رہنا ہے۔ یہ ہزار دانوں والی کھٹ کھٹ کرن والی نہیں (یہ ہزار دانوں والی کھٹ کھٹ کرنے والی تسبیح نہیں ہے)۔ یہ وَّاَصِيۡلًا (48:9) ہے' یہ اَصۡلٌ کسی چیز کے اس بنیادی حصے کو کہتے ہیں کہ اگر اسے مٹا دیا جائے تو وہ ساری چیز ختم ہو جائے۔ یہ خدا کے بتائے ہوئے مقاصد ہیں جن کے حصول میں ہر وقت کوشاں اور سرگرداں ہے۔

اور یہاں آگے بات آئی کو وقت تھوڑا سا ہے لیکن میں عرض کر رہی دوں کہ یہ نئی قسم کی ایک حکومت ہے۔ اس کا تصور' اس کا انداز' اس کا ہیولیٰ' اس کا پیکر' دنیا سے بالکل الگ ہے۔ دنیا کی ہر حکومت' خواہ وہ شخصی ہو' بادشاہت ہو' جمہوریت ہو' آخر میں جا کر فائنل اتھارٹی ایک انسان یا انسانوں کا کوئی گروہ ہوتا ہے۔ ذہنِ انسانی آج تک حکومت کا اس سے بلند تصور ہی نہیں پیدا کر سکا لیکن قرآن کریم نے یہ ایک تصور دیا کہ اس میں فائنل انسان بھی نہیں ہیں۔ یہ خدا کی طرف سے دیا ہوا قانون کا ضابطہ فائنل اتھارٹی ہے۔ وہ کتاب ہے' ان لوگوں کا فریضہ تو اس کتاب کے قوانین و احکام کو نافذ کرنا ہے' یہ صرف باہمی مشاورت سے یہ دیکھیں گے کہ اس کے نافذ کرنے کے طریقے کیا ہیں'

اطوار کیا ہیں؛ اسالیب کیا ہیں؛ جزئیات کیا ہیں؛ شروعات کیا ہیں۔ یہ یہاں تک تو ان کا فریضہ ہوگا؛ قانون سازی ان کا فریضہ نہیں ہے۔ تو اس اعتبار سے فائنل اتھارٹی جسے Sovereign Authority (اقتدارِ مطلق) کہتے ہیں؛ وہ تو صرف کتاب اللہ ہے اور ان کا فریضہ کتاب اللہ کے احکام وقوانین کو نافذ کرنا ہے۔ اب جہاں جہاں یہ چیز آتی ہے؛ میں نے عرض کیا کہ رسول اس کا پہلا مرکز تھا؛ وہ اس حکومت کا سربراہ تھا۔ اس حکومت کا جہاں اب ذکر آتا ہے؛ آپ دیکھیے گا کہ ایک انوکھا نرالا نادر تصور جو دیا ہے؛ اس کے ذکر ہی میں کیا احتیاط رکھی گئی ہے۔ کتاب تو اس کے اندر ہے۔ یہ مرکز اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول ہے۔ یہ بات میں کسی دوسرے وقت میں جا کر عرض کروں گا لیکن جو کچھ خدا نے کرنا ہے وہ ان انسانوں کے ہاتھوں سے کرا رہا ہے؛ یہ انسان جو کر رہا ہے یہ اپنی طرف سے نہیں کر رہا؛ یہ خدا کی طرف سے کر رہا ہے۔ ادنیٰ سی ایک مثال میں آپ لے لیجیے کہ جب اس چوراہے پہ کھڑا ہوا ٹریفک کا سپاہی آپ سے کہتا ہے کہ وہ بائیں طرف چلو؛ آپ کو حکم دیتا ہے۔ آپ اس کا حکم مانتے ہیں۔ یہ اس سپاہی کا حکم نہیں ہوتا؛ یہ گورنمنٹ آف پاکستان کا حکم ہوتا ہے اور اگر آپ یہ نہیں مانتے ہتھکڑی لگا دیتا ہے۔ اگر اس کے راستے میں آپ حارج ہوتے ہیں تو جیل خانے بھجوا دیا جاتا ہے۔ یہ سپاہی اس حکومت کے احکام کو نافذ کرنے کا صرف انسانی ذریعہ ہے۔ اگر وہ سپاہی بھی سائیکل پہ چلے گا تو اس چوراہے پہ آ کر اسے بھی بائیں طرف مڑنا پڑے گا۔ وہ پہلے خود ایک عہد کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں سب سے پہلے اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (6:163) ہوں؛ فائنل اتھارٹی یہاں یہ نہیں ہے۔ کہا ہے کہ میں بھی سب سے پہلے اس اتھارٹی کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔ میں اس کے سامنے سر جھکاتا ہوں اور تمہیں بھی میں یہ کہتا ہوں کہ اسی طرح سے تم بھی سر جھکاؤ۔

خدا اور رسول کی اطاعت سے مراد اس مرکز کی اطاعت ہے جو قرآنی نظام کو متشکل کرتا ہے اور تصوف کی بیعت!

تو اب یہ جو چیز ہے کہ رسول کے ذریعے سے خدا کے احکام نافذ ہو رہے ہیں؛ خدا سامنے آ نہیں سکتا؛ وہ محسوس نہیں ہے؛ لہٰذا اگر کہا جاتا ہے کہ رسول کی اطاعت کرو؛ تو اطاعت ہوگئی۔ یہ ایک فرد؛ ایک انسان کی اطاعت ہے۔ خدا کی جو کتاب ہے؛ وہ خود بول نہیں سکتی کہ اطاعت ایسے کریں۔ میں کسی دوسرے وقت میں؛ میرا خیال ہے کہ میری کتاب آپ کے سامنے آئے گی اس میں اسے میں تفصیل سے بیان کروں گا۔ کتاب خود کچھ کہہ نہیں سکتی تو یہ جو کہنے والا ہے اس کے متعلق یہ چیز ہے کہ اس کی اطاعت یہ نہ سمجھو کہ خدا کی اطاعت ہو رہی ہے۔ اگلی آیت میں یہ چیز آ گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو صلح حدیبیہ کا بتایا تھا کہ مکے سے باہر؛ جب ایسا نازک وقت آ گیا تھا؛ ذہن میں یہ آیا تھا کہ قریشِ مکہ کی نیت بد ہوگئی ہے؛ یہ غالباً ہم پہ حملہ کر دیں گے اور یہ صرف عمرہ کرنے کے لیے گئے تھے تو اس لیے جنگ والی بات نہیں تھی لیکن نظر آ رہا تھا کہ یہ ایسا کریں گے تو اس وقت نبی اکرم ﷺ نے بیعت لی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جسے ایمان لانا یا

مسلمان ہونا کہتے ہیں، وہ اتنی بات نہیں ہے کہ ایک مسجد کے امام کے ہاتھ پہ جا کر اس نے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ الا اللّٰه کہا اور انہوں نے پانچ چھ کلمے پڑھائے، تو مسلمان ہو گیا۔ یہ کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) ایک فرد اپنا جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچتا ہے، خدا خریدتا ہے اور اس کے عوض میں اسے جنت دیتا ہے۔ یہ سودا ہے، تجارت ہے، بیع اور شریٰ ہے۔ یہ دو الفاظ ہوتے ہیں۔ تجارت میں بیع ہوتا ہے بیچنے والا ہے اور مشتری خریدنے والا ہوتا ہے۔ خدا اس میں خریدنے والا ہے اور مومن اس میں بیچنے والا ہے۔ تو یہ جو خرید و فروخت کا معاملہ ہے اسے بیعت کہتے ہیں۔ بیعت کے معنی ہوا ''بیچ دینے والا''۔ مومن کی طرف سے یہ بیعت ہوتی ہے ''حضرت صاحب آلی بیعت نہیں ہوئی۔ توں کیدا بیعت ہیگاں اے؟ میں سائیں رسولی شاہ دا بیعت ہیگا واں'' (یہ حضرت صاحب والی بیعت نہیں ہوئی۔ تم نے کس کی بیعت کی ہے؟ جی! میں نے بابا رسولی شاہ کی بیعت کی ہے)۔ اور اگر یہ گناہگار آپ کو بتائے کہ تصوف کے ہاں کی جانے والی بیعت ذہنوں کے لیے کس قدر بے سود ہوتی ہے تو یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب یہ کچھ خدا کے ہاتھوں نہیں بیچا ہوا تھا۔ تو بیعت یہ ہے۔

تصوف کی بیعت کے برعکس نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر کی جانے والی بیعت کی نوعیت اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ نے اس وقت صلح حدیبیہ میں یہ کہا کہ وہ جو آپ لوگ بیعت کر چکے ہوئے ہیں، خدا کے ہاتھ اپنی جان اور مال بیچ چکے ہیں اس وقت تک تمہارے پاس تمہاری جانوں کو رہنے دیا گیا تھا کہ ضرورت پڑے گی، تو لے لیں گے، کوئی بات نہیں، تم کہیں بھاگے نہیں چلے جا رہے ہو، ہمیں تم پہ اعتبار ہے۔ خدا ان کے ہاتھ یہ جان اور مال رہنے دیتا، جب ضرورت ہو گی لے لیں گے۔ کہا کہ اب ضرورت پڑ گئی ہے، اس وقت آؤ، اس بیعت کی تجدید کرو۔ اس دور کے اندر طریقہ یہ ہوتا تھا کہ بیعت کرنے والا، بیچنے والا آتا تھا، ہاتھ آگے کرتا تھا، وہ ایک خریدنے والا یا اس کی توثیق کرنے والا، اس کے ہاتھ پر ہاتھ یوں مارتا تھا، ہمارے ہاں اب بھی یہ منڈیوں میں، میں نے دیکھا ہے، وہاں یہ طریقہ ابھی ہے۔ سودا پکا کرنے کے لیے ہاتھ لا استاد۔ یوں تو یہ طریق عرب کے ہاں بھی تھا کہ وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے تھے۔ اب رسول اللہ ﷺ نے جب یہ اعلان فرمایا تو صحابہؓ توثیق کے لیے آئے۔ تجدیدِ بیعت کے لیے یہی طریقہ اختیار کرنا تھا۔ اب وہ ہاتھ لاتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اب یہ رکھنے سے تو ذہن میں محسوس طور پہ یہ آیا تو رسول کا ہاتھ تھا، یہ خدا کی طرف سے بیعت ہو رہی تھی۔ خدا تو غیر محسوس اور غیر مرئی ہے۔ ہم کو وہ دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا ہاتھ تو وہاں ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (48:10) اے رسول! یہ جو آ کے تیرے ہاتھ تجدیدِ بیعت کر رہے ہیں یہ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (48:10) تمہارے ساتھ یہ بیعت نہیں ہو رہی، خدا کے ساتھ یہ بیعت ہوئی ہے اور آگے کہا کہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ

(48:10) ان کے ہاتھوں کے اوپر رسول تیرا ہاتھ نہیں ہے' خدا کا ہاتھ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک غیر مرئی اور غیر محسوس خدا جو ہے' اس کے Behalf پہ جو کچھ ہو رہا ہے' اسے خدا کہتا ہے کہ یہ ان کے ہاتھوں کے اوپر تیرا ہاتھ نہیں ہے' خدا کا ہاتھ ہے۔ اب بیچ میں سے انسان نکال دیا اور دنیا میں انداز بھی یہ ہے۔ یہ جتنے حکومت کے ساتھ Agreements (عہد و پیمان) ہوتے ہیں' وہ حکومت کا کوئی نمائندہ ہوتا ہے' کوئی افسرِ مجاز ہوتا ہے' جو وہاں دستخط کرتا ہے لیکن یہ اس نمائندے کا' عہد نامہ یا معاہدہ یا Agreement نہیں ہوتا۔ آپ کے ہاں ایک سلطنت کی' مملکت کی' دوسری اسٹیٹ کے ساتھ روز یہ بیعت ہوتی ہیں۔ کتنی بڑی ہوتی ہے یہ بیعت۔ وہ بھی وہاں بیٹھا ہوا کوئی ڈپٹی سیکرٹری' کوئی گورنر' کوئی سیکرٹری ہوتا ہے جو وہاں دستخط کرتا ہے اور وہ حکومت کی طرف سے معاہدہ سمجھا جاتا ہے' حکومت اس کی ذمہ داری لیتی ہے کہ یہ معاہدہ ہے اور پھر آگے اس معاہدے کے اندر بات ہوتی ہے کہ ہم ذمہ دار ہیں' ہمارے بعد آنے والے' ہمارے جانشین جو حکومت ہوگی' وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جو فرمایا تھا "علیکم بسنتی وسنۃ خلفائے راشدین" تم پر میرا طریقہ واجب ہے اور میرے جانشین' جو بعد میں آئیں گے' اسی نظام کو آگے بڑھانے والے' ان کی اطاعت بھی تمہارے اوپر لازم ہو جائے گی۔ اپنے جو Successors (جانشین) ہیں ان کے اوپر بھی وہ ذمہ داری ڈال دیتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا دراصل جان و مال کا خدا کے ہاں فروخت کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ عجیب نظام تھا جس کے متعلق یہ کہا کہ یہ خدا کا ہاتھ ہے' تمہارا ہاتھ نہیں ہے اور اس کے بعد یہ صرف خدا کا ہاتھ یوں کرنے سے بات نہیں بنی' خدا جو انسانوں کے معاملے میں اپنی ذمہ داریاں لیتا ہے وہ ذمہ داریاں بھی ان کو ادا کرنی ہوتی ہیں' پوری کرنی ہوتی ہیں' وہ براہِ راست آ کر نہیں ادا کرتا۔ وہ جو کہتا ہے کہ وَ مَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا (11:6) روئے زمین پہ جو بھی جاندار ہے' اس کے رزق کی ذمہ داری اللہ کے اوپر ہے۔ براہِ راست تو اللہ اس کو پوری نہیں کرتا۔ یہ تھے جو خدا کے Behalf پر' اس کی طرف سے' اس کے نمائندے کی حیثیت سے' بیعت لے رہے تھے' یہ ذمہ داریاں ان پر عائد ہو جاتی تھیں۔ تو اس کی ذمہ داریوں کو بھی انہوں نے پورا کرنا ہوتا تھا۔ کہا کہ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (48:10) ان کے ہاتھوں کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں ہے' خدا کا ہاتھ ہے اور دیکھیے! سب کچھ یہ کرتے ہیں اور وہ جو میں نے کہا ہے کہ وہ جو اعلیٰ حکومت ہوتی ہے' وہ اس کی پوری ذمہ داری (Responsibility) لیتی ہے' کہ یہ نہیں کر رہے' ہم کر رہے ہیں' یہ سپاہی تمہیں نہیں ٹوک رہا' ہم اس سے ٹوک رہے ہیں یہ گرفتار نہیں کر رہا' ہم گرفتار کر رہے ہیں۔ بدر کے میدان میں' جب اتنا بڑا گھمسان کا رن پڑا ہے' تو اس معرکے کے بعد یہ عین اس وقت عظیم آیت ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْھُمْ وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ قَتَلَھُمْ (8:17) تلواریں بے شک تمہاری ہی چل رہی تھیں' تم نہیں قتل کر رہے تھے' ہم قتل کر رہے تھے۔ کتنی عظیم بات ہے صاحب! ساری Responsibility (ذمہ داری) خدا لے رہا ہے۔ یہ نکل گئے بیچ میں سے۔ ان پر قتل کا جرم ہی عائد نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں ہیں'

قاتل ہم ہیں اور ایسے خدا کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔

میدانِ بدر میں ہاتھ نبی اکرم ﷺ کا لیکن ذمہ داری خدا کی

عزیزانِ من! وہی حکومت قابلِ اعتماد ہے جو اس طرح ذمہ داری لے کر کہے کہ **فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى** (8:17) اے رسول! یہ جو تیر چل رہے تھے، یہاں نکل تو رہے تھے تمہاری کمان میں سے، لیکن یہ تم نہیں چلا رہے تھے، خدا چلا رہا تھا، Responsibility (ذمہ داری) وہ لیتا ہے۔ تو یہ تو معاملہ ہی خدا کا ہے۔ خدا کے احکام کو یہ نافذ کرتے ہیں۔ جو کچھ یہ خدا کے احکام کے مطابق کرتے ہیں، خدا اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ کہا ہے کہ **فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ** (48:10) اور جو اس عہد نامے کو پھر توڑتا ہے تو یہ بات نہیں ہے کہ اس نظام کو نقصان پہنچا، خدا کو نقصان پہنچا یا رسول کو، نہیں بلکہ یہ تو اپنا آپ تباہ کرتا ہے پھر کہا کہ **وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا** (48:10) اور جو اس عہد کو پورا کرتا ہے تو اس کا اجر خدا کے ہاں سے ملتا ہے۔ دیکھا! ذمہ داری بھی اس کی یہ نہیں کہ تم جانو یا تمہارا رسول جانے، ان کے ہاتھ میں تم نے ہاتھ دیا تھا، ان کے ہاتھ اپنا سب کچھ بیچا تھا اس سے جا کر مانگو، ہم درمیان میں کہاں آئے تھے، ہم تو وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ کہا ہے کہ نہیں، یہ ہماری ذمہ داری ہے اور اس کا جو بدل ہے، اس کا جو معاوضہ ہے، وہ ہم دیں گے، وہ ہمارے ذمہ ہے۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الفتح کی آیت دس تک آ گئے۔ 11 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ شکریہ!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چوتھا باب: **سورۃ الفتح** (آیت 11 تا17)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج اپریل 1982ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفتح کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (48:11)۔

حضور ﷺ کی بعثت کے وقت عربوں کی معاشرتی زندگی

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں صلح حدیبیہ کا تذکرہ چلا آ رہا تھا۔ اس واقعہ کی اہمیت اور نزاکت کا اندازہ اس سے بھی لگ سکتا ہے کہ قرآنِ کریم نے بڑی تفصیل سے اس کا ذکر کیا ہے' قریب قریب یہ پوری سورۃ الفتح اسی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک خاص بات اور بھی آئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے خلاف جو کشمکش اور شورش تھی' اس میں ایک تو یہ قریش تھے' یہ کھلے بندوں دشمن تھے' میدانِ جنگ تک کے لیے آنے والے تھے۔ یہ ان کا Characteristic کہہ لیجیے' ان کی قومی خصوصیت کہہ لیجیے

کہ یہ کھلے بندوں دشمنی ہوتی تھی' کھلے بندوں دوستی ہوتی تھی۔ یہودیوں کو تو چھوڑ دیجیے' شروع سے ہی ان کا کیریکٹر' ان کا کردار یہی چلا آ رہا ہے کہ ہر قسم کی منافقت ان کے ہاں جائز ہے لیکن خود عربوں کے ہاں بھی بعض قبائل جو زیادہ تر مدینہ طیبہ کے گرد و پیش کے قبائل تھے' ان کی بھی یہ کیفیت تھی اور انہیں اعراب کہا جاتا تھا۔ حضور ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو یہ قبائل بھی اسلام لے آئے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم ایک آئینہ ہے: اعراب کی مثال کہ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے

عزیزانِ من! ان اعراب کے اسلام کے متعلق خود قرآنِ کریم نے جو بات واضح کی' وہ بڑی اہم چیز ہے لیکن ہماری اہمیت تو قرآن کریم کی تلاوت تک ہی رہ گئی۔ یہ سب چیزیں تو اس لیے بیان ہوئی تھیں کہ ہم اس آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھیں کہ ہماری شکل کیسی ہے۔ کہا ہے کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (49:14)۔ میں نے عرض کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مسلمان ہو چکے ہیں' قرآن کریم ان کے اس قول کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ کہا کہ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (49:14) اے رسول! ان سے کہہ دو کہ نہیں' تم ایمان نہیں لائے۔ یہ غور طلب چیز ہے۔ کہا ہے کہ وہ ہماری اصطلاح میں مسلمان ہو چکے ہیں' وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' یہ نہیں کہا گیا کہ نہیں' یہ مسلمان نہیں ہوئے' یہ کافر کے کافر ہیں۔ کہا کہ نہیں' یہ ایمان نہیں لائے۔ کیوں؟ یہاں ان سے کہا کہ ان سے کہو کہ یہ ایمان نہیں لائے۔ وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (49:14) تمہیں ابھی یہی کہنا چاہیے کہ ہم نے اس مملکت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر لیا ہے۔ یہ اتنی سی چیز ہے جو انہوں نے کی ہے اور کہو کہ یہی بات کہیں' وہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں یعنی یہ وہ ہے کہ جیسے اپنے آپ کو کہتے ہیں کہ سلطنت کے سامنے' مملکت کے سامنے' سرِ تسلیم خم کرنا ہے' Surrender کرنا ہے۔ انہوں نے مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا' یہ نہیں تھا کہ وہ کافر کے کافر رہے تھے۔

عزیزانِ من! ایک تو یہ شکل بھی تھی' ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اپنے مذہب کو نہیں چھوڑا تھا' مملکت کے سامنے انہوں نے سرِ تسلیم ختم کیا تھا' معاہدے بھی کیے تھے' صلح بھی کی تھی' شکست بھی کھائی تھی' اس کے باوجود اپنا مذہب نہیں بدلا لیکن یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے مذہب تبدیل کر لیا جو کچھ بھی پہلے تھا جسے ہم کہیں گے کہ مسلمان تو یہ ہو گئے' وہ اپنے آپ کو مومن کہتے تھے'' امنا'' کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ کہا کہ ان سے کہو کہ ابھی یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' ابھی تو وہ اتنا ہی کہیں کہ ہم نے اس نظام' اس مملکت کے سامنے اپنا سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ کیوں یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں؟ ایسا کیوں کہا گیا کہ ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں؟ اس لیے کہ وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (49:14) ابھی ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ تو ہمارے سامنے آئینہ ہے کہ جس میں ہم اپنے ایمان کی شبیہہ کو دیکھیں جو ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا' اس کے متعلق کہا گیا کہ ان سے کہو کہ

یہ کہیں ہی نہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' یہی کہیں کہ ٹھیک ہے مملکت کے سامنے ہم نے سر جھکا دیا۔ آج تو وہ اسلامی مملکت کہیں بھی نہیں ہے جس کے سامنے سر جھکانے کی بات ہے۔

آج کرۂ ارض پر کہیں بھی اسلامی مملکت نہیں' یہاں تو پیدائش کے اعتبار سے تصورِ قومیت کا ہے

آج ہماری کیا کیفیت ہے؟ یہ کہ مسلمان نام رکھانے والی قوم کے گھرانے میں ہم پیدا ہو گئے اور ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ ہم مومن ہیں' مسلمان ہیں۔ وہ کہہ رہا ہے ان سے کہو کہ یہ نہ کہیں۔ اب ایک چیز تو ہے مسلمان قوم۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمان قوم کے فرد تو ہم بن جاتے ہیں۔ پیدائشی اعتبار سے یہ جسے Nationality کہتے ہیں' جسے آج کل کی اصطلاح میں قومیت کہتے ہیں' وہ پیدائشی قومیت ہی ہوتی ہے: جو قومیت باپ کی ہو' پیدائش کے اعتبار سے وہی قومیت بچے کی بھی ہوتی ہے۔ یہ نیشنلٹی کا Law (قانون) ہے۔ یہ جو ہم مسلمان ہیں' یہ اسلام ہماری Nationality ہے' اس اعتبار سے مسلمان قوم کے افراد ہیں کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گئے' وہ بھی اس اعتبار سے اور اگلی جو بات ہے جس سے روکا ہے کہ یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہ سوچنے کی بات ہے۔

1953ء میں فساداتِ پنجاب کے موقعہ پر منیر کمیٹی میں علمائے کرام سے مسلمان کی تعریف کے متعلق کیا گیا سوال

عزیزانِ من! اپنے اپنے دل کو ٹٹولنے کی بات ہے۔ کیا دل کی گہرائیوں میں ایمان کی ہمیں کہیں کوئی رمق بھی نظر آتی ہے؟ ہم سے تو اگر کوئی پوچھے کہ تم کیوں مسلمان ہو؟ ہمیں تو اس سادہ سے سوال کا جواب بھی نہیں آئے گا۔ یہ تو یہ بات رہی کہ مسلمان کہتے کس کو ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی ہمارے پاس نہیں ہے۔ شاید آپ متعجب ہوں کہ یہ شخص Extremist (انتہا پسند) ہے' بات کرتا ہے تو شدت تک پہنچ جاتا ہے۔ عزیزانِ من! میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ رہا' یہ جواب عوام کی طرف سے نہیں دے رہا۔ یہ جواب آپ کے ہاں کے بڑے بڑے جید علمائے کرام' جو پنجاب میں 1953ء کے مارشل لاء کے بعد' منیر کمیٹی قائم ہوئی تھی' کی طرف سے ہے۔ اس کی تحقیقاتی رپورٹ بھی شائع ہو چکی ہے' وہ موجود ہیں' اس کمیٹی کی عدالت کی حیثیت تھی' جسٹس منیر مرحوم اس کا چیئرمین تھا' انہوں نے ملک بھر کے جید علمائے کرام سے پوچھا تھا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یہ وہی ہے جسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ اس کو Define کر دیجیے۔ آپ حیران ہوں گے کہ ان حضرات میں سے اکثر و بیشتر تو وہ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ We require notice کہ یہ ایسا سوال نہیں ہے کہ ہم فوراً ہی کھڑے کھڑے اس کا جواب دیدیں۔ اس پہ تو بہت کچھ غور و فکر کی بات ہے' سوچنا پڑے گا'

تحقیق کرنا پڑے گا' اس کے بعد کہیں جا کر یہ پتہ چلے گا کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ جیسے یہ روز بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ فلاں تارا مسیح آیا اور ہم نے اس کو مسلمان کر لیا' وہ ہمارے ہاتھ پہ ایمان لے آیا' فلاں مولانا صاحب کے دستِ سعادت پہ مشرف بہ اسلام ہو گیا' مسلمان ہو گیا' مسلمان نام رکھ دیا۔ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ پوچھا گیا تھا کہ مسلمان کہتے کس کو ہیں؟ بیشتر نے تو یہ کہا تھا کہ صاحب! ہمیں تحقیق کرنے کے لئے' مطالعہ کرنے کے لیے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں' خاصا وقت چاہیئے پھر بتا سکیں گے اور جنہوں نے کچھ جواب دیا کسی ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا۔ اب بھی ان میں سے دو مختلف فرقوں کے حضرات سے پوچھ کر دیکھ لیجیے' آپ دیکھیے کہ کیا جواب ملتا ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی جائیں گی کہ مسلمان کسے کہتے ہیں۔ یہ جو چیز ہے' قرآن کریم نے جو معیار بتایا ہے کہ یہ کہنے کا حق اسی کو پہنچتا ہے کہ میں ایمان لے آیا ہوں' جس کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اتر چکا ہو۔ ایمان تو کہتے ہی اسی کو ہیں جو قلب و دماغ کی پوری رضا مندی اور اطمینان کے ساتھ' علیٰ وجہ البصیرت' دلائل و براہین کی رو سے ہو۔ یہ جو قرآن کریم کے دعاوی ہیں' ان کو صحیح تسلیم کرنا اور ایسا تسلیم کرنا کہ پھر یونہی یہ دل سے نہ نکل جائے۔ وہ اس کی گہرائیوں میں اتر چکا ہو۔ یہ ہے **وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ** (49:14)۔

دل کی گہرائیوں میں ایمان نہ اترنے کا نتیجہ نیز حدیبیہ کے واقعہ کا ذکر

اب اس کے بعد مومن ہونے کے لیے اگلی بات ہے۔ کہا ہے کہ **وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ** (49:14) (اگر تم اس نظام کی اطاعت کرتے رہو گے جو اللہ کے قوانین کے مطابق اس کے رسول کے ہاتھوں متشکل ہوا ہے' تو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ تمہیں ملتا رہے گا۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی اور تمہیں بھی اس نظام کی طرف سے حفاظت اور ربوبیت (Nourishment) کا سامان اسی طرح ملتا رہے گا جس طرح دوسروں کو ملتا ہے)۔ باقی رہا یہ کہ صاحب! جب اسی حالت میں اب ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم بھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں' اب یہ جتنے اعمال ہیں' یہ جتنے احکام ہیں' اگر ان کی ہم اطاعت کرتے رہیں تو پھر کیا ہو گا؟ کیا وہ سب ضائع جائیں گے؟ کہا کہ یہ بات نہیں ہے' ان کے اجر میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی لیکن تمہیں مومن نہیں تسلیم کیا جائے گا' جب تک کہ ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہ اتر چکا ہو۔ یہ تو قیامت تک کے لیے ایمان کا ایک معیار قائم ہو گیا' یہ تھے وہ اعراب! یہ دل کی گہرائیوں میں جو ایمان نہیں اترا تھا تو اس کا نتیجہ کیا تھا؟ وہی چیز جو منافقین کے متعلق قرآن کریم نے کہی ہے' وہ یہی لوگ تھے۔

حدیبیہ کا واقعہ (628ء) جو میں نے عرض کیا ہے کہ اس دور کی تاریخ میں بڑا اہم اور بڑا نازک تھا۔ اس سے پہلے چھ سال کے اندر قریش کے ساتھ مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں' یہ چھ ہجری کا واقعہ ہے۔ ان واقعات میں وہی ہجوم کر کے آتے تھے۔ آپ انہیں ان کی

مدافعانہ جنگیں کہیے۔ یہ باہر نکل کر مکے تک نہیں پہنچے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب یہ طے کیا گیا کہ جنگ کے لیے نہیں' صرف کعبہ کے لیے نکلے۔ آپ اسے عمرہ کہہ لیجے کیونکہ ابھی تو حج کے دن بھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ یہ عمرہ کے مقصد کے لیے گئے تھے۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ ہم صرف عمرہ کے مقصد کے لیے آ رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے تو کعبہ یا مکہ' جسے Open City کہتے ہیں' ساری دنیا کے لوگ' تمام قبائل' تمام عرب لوگ' وہاں آتے تھے' جاتے تھے' ہجوم رہتا تھا' میلے لگتے تھے' اور پھر حج کے دنوں میں تو پوچھو ہی نہیں کہ وہاں اس قریش کی کتنی بڑی جمعیت ہوتی تھی۔ قیادت اور امارت قائم ہی اسی بنا پر تھی۔ تو آپ نے یہ کہلا بھیجا کہ ہم عمرہ کے مقصد کے لیے آ رہے ہیں۔ چودہ سو کے قریب صحابہؓ آپ ﷺ کے ہمراہ تھے' جنگ کی کوئی بات نہیں تھی۔ مکے سے روانہ ہو رہے تھے تو جن کے دلوں میں ایمان اتر چکا تھا' ان کو تو اس سے بڑی خوشی تھی کہ ایک تو کعبے کی زیارت ہوگی پھر نبی اکرم ﷺ کے زیر قیادت اس قسم کا باسعادت سفر پوچھیے نہیں ان کی خوشی کا ٹھکانہ کیا تھا لیکن یہ جو اعراب تھے' ان کے دل میں یہ کھٹکا تھا کہ وہ قریش تو ہم لوگوں کو یہاں بیٹھے ہوئے چین نہیں لینے دیتے' اور اب یہ فیصلہ ہے کہ ان کے گھر چلیں۔ ان کے ذہن میں تھا کہ وہاں تو وہ ہمیں بھون کر رکھ دیں گے چنانچہ یہ ساتھ نہیں گئے۔ یہاں سے بات شروع ہوتی ہے' پیچھے تو وہ تھے۔ وہ جو صحابہؓ صاحبِ ایمان تھے' جب وہ نازک وقت آیا ہے اور حضور ﷺ نے کہا ہے کہ آؤ! جو تم نے اپنے خدا سے بیع وشریٰ کا ایک معاہدہ کر رکھا ہے' اپنی جانیں بیچ دی ہوئی ہیں' اس بیعت کی تجدید کرو' جو بیچا ہے۔ بیع کے معنی ہیں ''بیچ دینے والی چیز'۔ جو کچھ تم نے بیچا ہے اس کی تجدید کرو' تصدیق کرو' توثیق کرو' Confirm کرو' کیونکہ اس عہد نامہ کے پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے' اور وہاں یہ جسے بیعت رضوان کہتے ہیں' وہاں یہ بیعت لی گئی تھی۔ اس بیع کے معاہدے کی تجدید کہیے اور اس کی اہمیت یہ تھی کہ کہا یہ گیا کہ اے رسول! یہ آتے ہیں' تیرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیعت کی توثیق کرتے ہیں۔ ان سے کہو کہ ان کے ہاتھ کے اوپر تمہارا ہاتھ نہیں' خدا کا ہاتھ ہے۔ یہ تھی اہمیت اس بیعت کی اور اس میں ایسے موقع پر یہ جو پیچھے رہے' انہوں نے کہا کہ وہاں جا کر تو خواہ مخواہ اپنے آپ کو شیر کے غار میں پھینک دینے والی بات ہے' وہاں سے تو بچ کر ہی نہیں آ سکتے۔ ہم نہیں گئے صاحب!

دل اور زبان کی ہم آہنگی کی اہمیت اور منافقت

عزیزانِ من! اب آپ نے دیکھا کہ وہ جو کہا تھا کہ ''تمہارے دل کی گہرائیوں میں ایمان نہیں اترا''، عمل کے وقت میں کس طرح اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ کہا کہ سَيَقُولُ لَكَ الْمُخَلَّفُونَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا فَاسْتَغْفِرْ لَنَا[1] (48:11)

---

[1] جو بدّو تمہارے ساتھ شریک نہیں ہونگے' پیچھے رہ جائیں گے' وہ کہیں گے کہ یہ اس لیے ہوا کہ ہم اپنے مال مویشی اور گھر بار والوں کے متعلق ضروری انتظامات میں مصروف رہے اس لیے شریک جہاد نہیں ہو سکے۔ لہٰذا اسے ہمارے خلاف جرم قرار نہ دیا جائے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص 1197)۔

جب تم اب ان سے جا کر پوچھو گے بھئی! کیا بات تھی؟ تم ہمارے ساتھ نہیں چلے؟ پیچھے کیوں رہ گئے؟ کہا کہ یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ نہیں صاحب! بات یہ تھی کہ ہمارا گھر بار ننگا تھا؛ کوئی پیچھے دیکھنے بھالنے والا نہیں تھا؛ حفاظت نہیں تھی؛ ہمارے مال مویشی ایسے تھے اس لیے ہم ان کی دیکھ بھال کے لیے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہمارا وہ جرم سنگین نہیں ہے کہ ہم نے بغاوت کی ہے؛ سرکشی کی ہے؛ غداری کی ہے؛ بس یہ اتنی سی بات تھی جس کے لیے ہم نہیں گئے؛ اس لیے ہمیں معاف کر دیا جائے؛ بارگاہِ خداوندی سے ہمارے لیے معافی طلب کی جائے۔ کہا کہ یَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِهِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ (48:11)۔ یہ ہوا ایمان کے دل کے اندر نہ اترنے کا دوسرا معیار کہ ''یہ لوگ زبان سے وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو کچھ ان کے دل میں نہیں ہے۔'' تو ایمان کی ایک شناخت تو یہ ہوئی؛ ایک نشانی یا ایک معیار یہ ہوا کہ ''دل اور زبان دونوں ہم آہنگ ہوں''

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
(اقبالؒ)

قلندر کے معنی ہی ''مردانِ مومن'' ہیں۔ ''زباں ہو دل کی رفیق'' دل اور زبان یعنی جو دل میں ہو؛ وہی زبان پر ہو۔ پہلی شناخت یہ ہے کہ ان دونوں میں ہم آہنگی ہو۔ اگر یہ بات نہیں تو وہ منافقت ہے؛ کفر نہیں؛ کفر میں ہم آہنگی ہوتی ہے؛ انکار ہی سہی؛ دل سے انکار کرتے ہو؛ زبان سے اس کا اعلان کرتے ہیں؛ یہ نہیں ہوتا کہ دل میں انکار ہوتا ہے زبان پہ اقرار ہوتا ہے۔ یہ ان کی بات ہے۔ یہ پہلی نشانی ہے۔ اب دوسری نشانی یہ ہے کہ لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ (61:2) جو کچھ تم کہتے ہو پھر وہ کر کے کیوں نہیں دکھاتے یعنی قول اور عمل کی ہم آہنگی۔ کوئی ایمان کی لڑی یوں ہوئی کہ قلب اور زبان کی ہم آہنگی ہو اور جو زبان سے کہا جائے اس کی اور عمل کی یک رنگی ہو؛ مردانِ مومن وہ ہیں جو دل ہے وہ زبان پہ ہو؛ جو کہا ہے وہ کر کے دکھایا۔ غور فرمایا؛ عزیزانِ من! اس آئینے کو آپ نے۔ دونوں چیزیں ہی یہاں آ گئیں۔ اس کے برعکس یہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں جو ان کے دل میں نہیں ہے اور ویسے تو اب اس دور کے اندر تو قریباً قریباً ہر ایک کے ہاں یہی کیفیت ہے لیکن یہ جو ''مردانِ سیاست'' ہیں ان کا تو شیوہ ہی یہ ہوتا ہے۔ ایسی میکاوَلی سیاست ساری دنیا پر چھا گئی ہے

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

عزیزانِ من! سیاست نام ہی اس چیز کا ہے۔

دنیائے سیاست کی بنیادی کیفیت اور خدا کے قانون کے ذرائع

سیاست کی Diplomatic Language ایک خاص زبان ہوتی ہے کہ وہ الفاظ استعمال کیے جائیں کہ جب جی چاہے؛ ان کا

کوئی دوسرا معنی پہنا دیا جائے۔ انہیں ذومعنی الفاظ بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ یہ الفاظ وہ ہوتے ہیں' اس میں بڑی ٹریننگ ہوتی ہے خاص طور پر وہ بڑی الگ زبان ہے۔ الگ زبان کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگریزی زبان وہ نہیں ہوتی' ایسے ہوتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایسے ذومعنی الفاظ استعمال کیے جائیں کہ جب جی چاہے ان کا الٹا معنی اس میں سے نکل آئے۔ یہ ہے Diplomatic Language۔ سیاست کا معیار ہی آج یہ ہے۔ جو اس میں سب سے زیادہ شاطر ہے' وہ سب سے زیادہ کامیاب ہے یعنی یَقُوۡلُوۡنَ بِاَلۡسِنَتِہِمۡ مَّا لَیۡسَ فِیۡ قُلُوۡبِہِمۡ قُلۡ فَمَنۡ یَّمۡلِکُ لَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا اِنۡ اَرَادَ بِکُمۡ ضَرًّا اَوۡ اَرَادَ بِکُمۡ نَفۡعًا بَلۡ کَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا[1] (48:11) یہ جو تم نے کہا ہے کہ نہیں، ہم تو اس لیے رک گئے تھے کہ مال مویشی کی حفاظت کا سامان نہیں تھا' کیوں وہ بات کہتے ہو جو حقیقت نہیں ہے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کی منافقت سے' اس قسم کی دروغ گوئی سے' تم قانون کو جھٹلا سکو گے' تم خدا کو فریب دے سکو گے؟ خدا کا قانون اس سے بڑا بالا ہے اور اس کے پاس معلوم اور تحقیق کرنے کے ذرائع ہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو فی الواقع وہی ہے یا تم منافقت برت رہے ہو اس لیے اس کی بالادستی سے تم نہیں بچ سکتے۔

مملکتِ اسلامیہ کے لیے مختلف ذرائع کی اہمیت

تو یہ دو چیزیں اب ہمارے سامنے آگئیں۔ جسے آپ اسلامی نظام یا مملکت کہیں گے' اس میں یہ چیز بھی ہوگی کہ اس میں بالادستی قانونِ خداوندی کی رہے گی' مملکت کے پاس ایسے ذرائع ہونگے اور ہونے چاہئیں جن سے وہ معلوم کر سکے کہ کہنے والا جو کچھ کہہ رہا ہے یہ حقیقت ہے یا یہ فریب دے رہا ہے اور یہ محض کسی وہم پر یا گمان پر نہ ہو' فی الواقعہ ایسے ذرائع ہوں جن سے یہ چیزیں معلوم کی جا سکیں۔

حدِ بشریت انسانی عقل وشعور اور فہم وفراست کی عظمت کا ذکر اور منافقین کے لیے انتباہ

یہ جو کہا ہے کہ بَلۡ کَانَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (48:11) یہ یہی بات نہیں ہے کہ خدا کو اس کا علم ہے۔ خدا کو اگر علم ہے اور وہ علم ادھر نہیں آتا' تو اس مملکت کو یا اربابِ حل وعقد کو اس سے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچتا' خدا کو اس کا علم ہے' خدا کو کس بات کا علم نہیں ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ منافقین کے متعلق خدا نے خود رسول اللہ ﷺ سے کہہ دیا تھا کہ ہم تمہیں نہیں بتائیں گے' تمہیں خود اندازہ لگانا ہوگا۔ جتنا انہوں نے تنگ کیا ہے' کسی اور نے نہیں کیا۔ یہ جو ان کے ساتھ قریش یا اور جو دوسرے لوگ تھے ان کے ساتھ میدانِ جنگ میں کھلی ہوئی

---

[1] لیکن یہ ان کی محض بہانہ سازیاں ہیں۔ ان کی نیت کچھ اور تھی۔ ان سے کہہ دو کہ تمہارے متعلق خدا کا قانون ہی کچھ فیصلہ کرے گا۔ اگر اس کی رو سے تمہیں کچھ فائدہ یا نقصان پہنچنا ہوگا تو کسی کو اس کا اختیار نہیں کہ اس کے خلاف کچھ کر سکے۔ خدا تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔ اسی کے قانون کی رو سے تمہارا فیصلہ ہوگا (اس میں میری یا کسی اور کی ذاتی مرضی کا کوئی سوال نہیں)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 1197)۔

لڑائیاں ہوئیں ہیں۔ جتنی تکالیف اس مسلسل کشمکش کے اندر منافقین نے پہنچائی ہیں وہ اتنی زیادہ اذیت رساں نہیں تھیں جتنی ان منافقین کی چالیں تھیں۔ یہ چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتے تھے۔ یہ کیفیت تھی۔ بہت جی چاہتا تھا حضور ﷺ کا بھی اور صحابہؓ کا بھی' یوں کہیے کہ یہ ذرا نکھر کر معلوم ہو جائے کہ ان میں سے کون کون سے اس طرح کے منافق ہیں۔ خدا نے رسول سے کہہ دیا تھا کہ ہم نہیں تمہیں بتائیں گے' تمہیں خود ان کی چال' اطوار' کیریکٹر سے' باتوں سے' اندازہ لگانا ہوگا کہ ان میں سے منافق کون ہے اور پرخلوص مومن کون ہے۔ ہم نہیں بتائیں گے۔ تو خدا نے جو کہا ہے کہ ہم جانتے ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے تو وہ جب تک وحی کے ذریعے خدا حضور ﷺ کو نہ بتائے' جو خدا کا علم ہے تو از خود حضور ﷺ کو علم نہیں ہوتا۔ از خود کے لیے وہی طریقہ بتایا جو ہمارے آپ کے بھی کام آسکے کہ تمہیں خود معلوم کرنا ہوگا ورنہ اگر خدا اپنے علم کی رو سے' جو معلوم کیا' ان منافقین کے متعلق رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دے دیتا تو وہ ٹھیک ہے وہ پہلے دن سے ان کو خارج کر دیا جاتا لیکن یہ ہمارے لیے اسوۂ رسول اللہ ﷺ تو نہ بن سکتا اس لیے کہ ہمیں تو خدا وحی کے ذریعے سے نہیں بتلائے گا کہ اس سے بچ کر رہیں' یہ منافق ہے' فریب دے جائے گا' دھوکا دے جائے گا تو ہمارے لیے کیا بات اس وقت ہوئی؟ یہ کہ خدا نہیں بتائے گا' تمہیں خود معلوم کرنا ہوگا۔ کیا بات ہے!

قرآنی اصولوں کی راہنمائی ہر انسان کے لیے سدا بہار خصوصیات کی حامل ہے پھر حیلہ سازی کیوں؟

عزیزانِ من! غور فرماتے ہیں کہ قرآن حمید کی ہدایت کس طرح ہمارے لیے ابدی طور پر بھی ایک ہدایت نامہ بن چکی ہے۔ کہا کہ ان سے کہو کہ اصل میں بات یہ ہے کہ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا ۢ بُوْرًا[1] (48:12) کہنے لگے ہمارے دل میں یہ بات تھی کہ یہ جا تو رہے ہیں لیکن وہاں سے بچ کر نہیں آئیں گے۔ یہ تھا تمہارے دل میں ان کے متعلق اعتماد اور یہ ظن جس کی بنا پر تم نے یہ کہا کہ ہمیں ساتھ نہیں آنا چاہیے' یہ تو اپنے آپ کو ہلاکت کے منہ میں دھکیلنے کی بات ہے۔ یہ تھا تمہارا گمان تو آپ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں' جتنی بھی ہیں' قدم قدم پہ نظر آتی ہیں کہ منافقین کا یہ شیوہ ہوتا ہے۔ دل میں بات یہ تھی' اس لیے ساتھ نہیں گئے تھے۔ پوچھا تو یہ کہا کہ نہیں صاحب! دل سے تو ہم آج آپ کے ساتھ ہی تھے' بات اصل میں یہ تھی کہ گھر بار خالی تھا' حفاظت کرنے والا کوئی نہیں تھا' اس لیے ہم پیچھے رہ گئے۔ قرآن کریم بتاتا چلا جا رہا ہے کہ یہ

---

[1] (ان سے کہہ دو کہ) تمہارا خیال تھا کہ رسول اور اس کے ساتھ اس کی جماعت' سب اس جنگ میں ختم ہو جائیں گے اور ان میں سے کوئی بھی اپنے گھروں کو لوٹ کر نہیں آئے گا۔ اس خیال سے تم بہت خوش ہوئے۔ (اور یہ فیصلہ کر لیا کہ ہمیں ان کے ساتھ جنگ میں نہیں جانا چاہیے) حالانکہ یہ خیال بہت ہی برا تھا جو تمہارے دل میں پیدا ہوا۔ اور انہی باتوں نے تمہیں تباہ کر دیا۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص 1197)۔

بات تھی' انہوں نے گمان ہی یہ کیا تھا کہ تم بچ کر نہیں آسکو گے اور یہ ایک ایسی چیز تھی کہ جو ان کے دل میں تھی۔

قرآن کریم نے کہا ہے کہ بدترین وقت انسان کے لیے وہ ہوتا ہے' جس میں اس کی تباہی آجاتی ہے کہ اس کے غلط کاموں کو شیطان بڑا مزین بنا کر دکھاتا ہے' غلط کام بہت بڑا نیکی کا کام' اچھا کام' بن کر نظر آتے ہیں' یعنی اس کے جذبات اسے مزین بنا دیتے ہیں' خوشنما بنا دیتے ہیں۔ شیطان تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ اس کے مفاد پرستانہ جذبات ہوتے ہیں' وہ اپنے غلط کام کو بڑا حسین اور مزین بنا کر دکھاتے ہیں' غلط کام اگر غلط کی حیثیت سے سامنے آجائے تو پھر تو کوئی بھی بجز ان چند کے' جو دانستہ غلط کرنا چاہیں' باقی کوئی بھی اس کام کو غلط نہیں کہتے' نقصان رساں کام کو کوئی بھی نقصان رساں نہیں کہے گا وہ تو ہوتا یہ ہے کہ وہ ہوتا ہے تباہ کن نقصان رساں لیکن انسان کے مفاد پرستانہ غلط جذبات اس کو مزین کر کے دکھاتے ہیں۔ یہ جس قدر معاشرے میں تباہیاں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں' وہ اس نکتے کی بنا پہ ہیں۔ بہت تھوڑے لوگ ہوتے ہیں جو غلط کام کو' جرم کو' گناہ کو' سمجھتے ہوئے کہ یہ غلط کام ہے' پھر بھی اس کے علی الرغم کرتے ہیں' دھڑلے سے یوں کرنے والے بہت کم ہوتے ہیں' اکثریت انہی کی ہوتی ہے جو اپنے غلط کاموں کو اپنے مفاد پرستی کے جذبات سے بہت مزین کر کے دکھاتے ہیں' پھر ان کے لیے بڑی بڑی تاویلیں' بڑے بڑے دلائل پیش کرتے ہیں کہ نہیں صاحب! وہ بات اصل میں یوں ہے' کوئی بات نہیں ہے ایسا کرنے میں صاحب! اور آج تو اس کے لیے لمبی چوڑی کسی دلیل وتاویل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ کسی سے پوچھیے کہ صاحب! آپ دولت جمع کرنے کا یہ غلط طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! میں نے ہی کیا ہوا ہے' سب کر رہے ہیں۔ چلیے! سونار کی ایک لوہار کی۔ ایک ہی دلیل ہے کہ سب کر رہے ہیں کہ جو غلط کام ہے وہ صحیح ہو جاتا ہے وہ اسے مزین کر کے دکھا دیتے ہیں لیکن ان کو بتا دیجیے کہ ایمان کی بات ہم نے بتائی تھی کہ اس میں دل اور زبان کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے تو سنو! وَمَنۡ لَّمۡ يُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ سَعِيۡرًا (48:13) یاد رکھو جو اس طرح سے ایمان نہیں لاتا کہ ایمان دل کی گہرائیوں میں اتر چکا ہو' دل اور زبان ہم آہنگ ہو' قول اور عمل کے اندر یک رنگی ہو' اس کا نام ایمان ہے' جو یوں ایمان نہیں لاتا تو پھر سمجھ لیجیے کہ اس کے عمل وامید کی کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں' جسے تباہی کہتے ہیں' وہ اس کا مقدر بن کر رہ جاتی ہے' باقی رہا خدا یعنی اس کو ان کی اس امداد کی یا نصرت کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ان کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو تو کسی کی بھی ضرورت نہیں ہوتی' اس کے لیے تو وَلِلّٰهِ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (48:14) ساری کائنات کے اندر اسی کے قانون کی کارفرمائی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہم سے یہ جو بھول ہو گئی ہے کہ نہیں ساتھ جا سکے' یہ اس کے لیے وجہ اور دلیل ہے اور یہ ایسا کہا کہ اس کی ہمیں معافی دے دیجیے یا خدا سے کہیے وہ ہمیں معاف کر دے۔

لفظ مغفرت اور مَنۡ یَّشَآءُ کی بحث اور کتاب التقدیر

جسے مغفرت کہا جاتا ہے اور آپ کو تو معلوم ہے' آپ احباب تو برسوں سے درس سنتے چلے آ رہے ہیں' درس کی یہ اصطلاح' قرآن حکیم کی یہ اصطلاحات بھی آپ کے سامنے آ چکی ہیں' اس لیے ہر موقع پر مجھے زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور مشکل البتہ یہ ضرور ہوتی ہے کہ جو احباب درس میں نئے نئے آتے ہیں ان کے دلوں کے اندر کوئی سوالات اور اس قسم کے شکوک ابھرتے ہیں وہ پھر بعد میں مجھ کو کوئی چٹھیاں لکھتے ہیں' کوئی آ کر پوچھتے ہیں لیکن یہ تو درس میں ہو نہیں سکتا کہ ہر مقام پہ وہ ساری تفصیل' جو میں بیس برس سے بیان کرتا چلا آ رہا ہوں' ہر درس میں اس کو دہراتا جاؤں۔ درس میں یہ نہیں ہوتا۔

یہ کہا کہ یہ اس کے لیے کہتے تھے کہ اس معاملے میں خدا سے کہیے' جسے عام طور پہ معاف کر دینا کہتے ہیں' کر معاف کر دے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے ہماری حفاظت کی جائے' جو نقصان اس سے ہمیں ہوگا اس سے ہماری حفاظت کر دے۔ کہا کہ یہ خدا سے کہتے ہیں کہ خدا سے یہ کہا جائے۔ یہ بات اس کی نہیں ہے۔ یہ جو ہے کہ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ (48:14) یہ اس قسم کی مَنۡ یَّشَآءُ والی جو بات ہے وہ تو سارے قرآن کریم میں بھری ہوئی ہے' ہر مقام میں آپ دیکھیں گے' ترجمے ہمارے ہاں یہی ہونگے کہ خدا جس کو چاہے بخش دیتا ہے جس کو چاہے وہ پکڑ لیتا ہے۔ اس ایک مفہوم سے' ان الفاظ کے معانی سے' عزیزانِ من! قرآن کریم کا سارا مکافاتِ عمل کا نظام ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں کا جو نظامِ عدل بھی ہے وہ اسلامی نظام تو خدا کے اسی نظامِ اصولِ مکافاتِ عمل پر قائم ہوتا ہے۔ انسان کے اپنے عمل کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ تباہی آتی ہے اس کی وجہ سے' حفاظت ہوتی ہے' اس کی وجہ سے' کامیابیاں ہوتی ہیں' اس کی وجہ سے' ناکامیاں ہوتی ہیں' یہ اس کی اپنی وجہ سے ہے۔ خدا نے تو قوانین دے دیئے ہیں' راہنمائی دی ہے' سیدھے راستے پہ چلنا' غلط راستے کی طرف قدم اٹھانا' یہ اس کے اپنے فیصلے پہ ہے' اس نے صرف دونوں راستے دکھائے ہیں' یہ نہیں ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے صحیح راستے پہ چلا دیتا ہے' جسے چاہتا ہے غلط راستے پہ چلاتا ہے' تو اس کے بعد جو اگلی بات ہے کہ پھر غلط راستے پہ چلنے والوں کو جہنم میں بھیج دیتا ہے تو وہ تو جسے چاہتا ہے' غلط راستے پہ چلا دیتا ہے اور پھر اس کو جہنم میں بھیج دیتا ہے' تو یہ بات میں نے عرض کیا ہے کہ پہلی دفعہ نہیں آئی' بیس سال سے آتی چلی آ رہی ہے' شکوک پیدا ہوتے ہیں' یا اگر آپ احباب سمجھنا چاہتے ہیں تو میں نے آپ احباب کی محنت بچانے کے لیے یہ سب کچھ لکھ بھی دیا ہے۔

آپ میری یہ ''کتاب التقدیر'' دیکھ لیجیے مَنۡ یَّشَآءُ والی جو بحث ہے' میرا خیال ہے کہ کتاب کا پورا کوئی چوتھا حصہ اسی پر مشتمل ہے۔ یہ بڑا اہم ہے' یہ جو نہی آپ نے یہ ترجمہ کیا کہ جسے چاہتا ہے وہ ہدایت دیتا ہے' جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اس کے بعد اگلی بات کہ جو گمراہ ہوتا ہے اس کو جہنم میں بھیجا دیتا ہے' سوچیے کہ قرآن کریم کے متعلق کیا کیا چیزیں ذہن میں آتی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس

نے تو کہا ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ خدا سے کہو کہ ہمیں معاف کر دے یا ہماری مغفرت کر دے۔

غلطی کے ازالے کا طریق حسنات کے عمل میں پنہاں ہے: برائیوں اور اچھائیوں کا پلڑا

عزیزانِ من! یہ بات ایسے نہیں ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے مغفرت کر دیتا ہے' جو شخص ان نقصانات سے محفوظ رہنا چاہتا ہے' وہ اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے' جو ایسا نہیں کرتا اسے بہر حال نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور اس کا طریقہ بتا دیا کہ **اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ** (11:114) غلطی ہوگئی ہے' اس کے نقصان رساں نتائج سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے ذرا بہت بڑا اچھا کام کر کے دکھاؤ۔ حَسَنٰتِ جو ہیں' وہ سَیِّاٰتِ کو لے جاتی ہیں۔ یہ ہے مَنْ یَّشَآءُ کے معنی کہ اگر غلطی ہوگئی ہے اور کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے جو نقصان رساں نتائج مجھے بھگتنے پڑیں گے' اس سے میں کسی طرح سے محفوظ رہ جاؤں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس سے زیادہ وزنی نیکی کا کوئی کام کرو' نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس سہو اور خطا اور اس برائی کے نقصان رساں نتائج سے بھی محفوظ کر دے گا اور اس کے بعد کیونکہ یہ بہت بڑا وزنی کام ہوگا اور کچھ کامیابیوں کی چیزیں بھی تمہارے حصے میں آ جائیں گی۔ اس نے **ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ** (101:6) اور **خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ** (101:8) کا ایک اصول دیا ہے' میزان کھڑی کی ہے' اس کے اندر پلڑے ہیں' جسے ہم برائیوں کا پلڑا اور بھلائیوں کا پلڑا کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر کسی وقت تمہاری برائیوں کا پلڑا جھک گیا ہے' زیادہ ہوگئی ہیں تو اس کو اونچا کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ خدا سے کہو کہ ذرا اس کو اونچا کر دیجیے۔ طریقہ یہ ہے کہ بھلائیوں کے پلڑے میں زیادہ ڈال دیجیے خود بخود وہ پلڑا جھک جائے گا اور دوسرا اٹھ جائے گا۔

جنت کا معاملہ ہو یا دوزخ کا' یہ انسانی اعمال پر منحصر ہے

عزیزانِ من! غور فرمایا کہ ایک تشبیہ سے قرآن کریم کتنے اہم معنی بیان کرتا ہے' حقائق بے نقاب کر دیتا ہے۔ کیا طریقہ اس نے بتایا ہے مغفرت حاصل کرنے کا؟ یہ میزان کے پلڑے ہیں۔ اور وہ چیز یہ ہے کہ اس نے ایک ایک ذرہ کا یہ کہا کہ **فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗo وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ** (99:7-8) عمل کا ایک ایک ذرہ اس میزانِ خداوندی میں' قانونِ مکافاتِ عمل کی میزان میں' تلتا ہے۔ اب اس میں تو یہ ایک دلیلی بات ہے کہ جس قسم کے اعمال ایک پلڑے میں جائیں گے' وہ پلڑا جھکے گا' تمہاری غلطیوں کے' ان گناہوں کے' جرموں کے' جو ذرات جس پلڑے میں جمع ہو رہے ہیں' اگر وہ جھک گیا ہے تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ بچ سکتے ہو' اگر دوسرے پلڑے کے اندر' بھلائیوں کے ذرات' زیادہ داخل کر دو اور یہ طریقہ ہے **مَنْ یَّشَآءُ** کا' یہ انسان پر ہے' یہ اپنے ہر کام کا ذمہ دار ہے۔ یہ نہیں ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے جہنم میں بھیج دیتا ہے' جسے چاہتا ہے جنت میں بھیج دیتا ہے۔ جو جنت میں جانا چاہتا ہے وہ جنت میں جانے والے کام کرے' وہ جنت میں چلا جائے گا' جو نہیں جانا چاہتا' جہنم میں جانا چاہتا ہے وہ برائیوں کا کام کرے' جہنم میں چلا جاتا ہے۔

قرآنی آیات کے آخر میں مختلف صفاتِ خداوندی کو پیش کرنے کی وضاحت اور مصلحت

جو اس قسم کے کاموں کے بعد اشکِ ندامت اس کی پیشانی پہ آتے ہیں اور پھر وہ صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ جسے ہم توبہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! میری توبہ' اس نے کہہ دیا اور معاملہ ختم ہو گیا۔ وہ کام کرے کہ جو ان غلط کاموں کے نقصان رساں نتائج کا ازالہ کر سکے اور اس کے حصے میں کچھ مثبت (Positive) کام بھی آ جائیں تو کہا کہ جب یہ کچھ کرو گے تو کَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (48:14) خدا کا قانون ہمیشہ تمہاری حفاظت اور ربوبیت چاہتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ زیادہ اچھے کام کرو تو ایک تو وہ جو غلط کاموں کا نقصان رساں نتیجہ تھا' اس سے بچ جاؤ گے۔ وہ تو ہو گیا غفور' اس سے بچانے والا' بخشنے والا نہیں ہے' بخشش کا سوال نہیں ہے۔ وہ بچاتا ہے' یہ برے کاموں کے نتائج سے بچنا ہے۔ مغفرت کے معنی بچنے کے ہوتے ہیں۔ تو وہ غفور بھی ہے اور اس کے بعد جب تمہارا یہ بھلائیوں کا' حسنات کا' پلڑا اتنا زیادہ بھاری ہوگا کہ اس کا ازالہ تو اس نے کر دیا' پھر اور بھی اس کے اندر ہے۔ تو کہا کہ پھر سامانِ نشوونما بھی ملے گا' رحمت بھی ملے گی۔ یہ ہے غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (48:14)۔ میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! قرآن کریم کی آیات میں جہاں خدا کی صفات آتی ہیں' وہاں کھڑے ہو کر سوچنا چاہیے کہ قرآنِ کریم یہ دو الفاظ کیوں لایا ہے' ایک لفظ کیوں نہیں لایا' یہ بڑا اہم ہوتا ہے اور وہ تو اس کے جو نکات ہیں' جو پہلے بیان کیا گیا ہے' حقیقت میں اس کی تائید میں ہوتے ہیں۔ یہ جو خدا کی صفات بیان ہوتی ہیں' یہ یونہی نہیں ہوتیں کہ شاعری ہے' کہ کہیں غفور لکھ دیا' اور کہیں رحیم لکھ دیا' یہ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (48:14) حفاظت اور ربوبیت کے لیے کیے ہیں۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے غیر متبدل اصول کی وضاحت اور اس کا طریقِ کار

کہا ہے کہ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ (48:15) جب تم کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ غنائم جو تمہیں حاصل ہوں گے' جنگ سے مالِ غنیمت ملے گا اور جو کچھ حاصل ہوگا' اس کی جھولیاں بھر بھر کر واپس لوٹو گے' تو اب ان کا جی للچائے گا کہ اوہو! ہم ساتھ کیوں نہ چلے گئے' ہمارے حصے میں بھی یہ کچھ آ جاتا۔ کہا کہ یہ اس وقت کہیں گے کہ صاحب! ہمیں جو ہوا ہے' اس کو تو چھوڑ دو' اب ہم تمہارا ضرور اتباع کریں گے' اطاعت کریں گے اور ہمارے اس وعدے کی بنا پہ اس میں سے ہمیں حصہ دیدو' ہماری توبہ۔ تو یہ ہوتی ہے' زبان سے یہ کچھ کہہ دینا کہ ہاں صاحب! ہماری بھول ہو گئی یا اللہ! میری توبہ تا کہ اس میں سے ہمیں کچھ حصہ مل جائے' وہ جنت کی نعماء' جن کا وعدہ کیا گیا ہے' وہ اتنا کہنے سے مل جائے۔ کہا ہے کہ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ (48:15) ہم نے قانون بتایا ہے کہ کیا ہے اور قانون یہ ہے کہ جو سیأت ہیں' ان کا ازالہ حسنات کا پلڑا جھکے گا' تو ہوگا۔ یہ ہمارا قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ اب یہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے پہلے غلطیاں کر لیں' گناہ کر لیے' جرم کر لیے' اس کی وجہ سے

سیأت کا پلڑا جھک گیا۔ ہمارے ہاں کا تو یہ نہیں کہ اس کے ازالے کا جو کچھ قرآن کریم نے طریقہ بتایا ہے' خدا نے جو قانون بتایا ہے' اس کے مطابق یہ کچھ حسنٰت کریں' تو وہ دیتے' یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کی صرف بات مان لی جائے کہ ہاں صاحب! جو کچھ پیچھے ہوا' اس کو چھوڑ یئے' اس کے اوپر مٹی ڈالیے' آئندہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور جو کچھ یہ غنائم وغیرہ ہیں' وہ ہمیں بھی دیجیے۔ کہتے ہیں' یہ خدا کے قانون کو تبدیل کر دینا چاہتے ہیں' چاہتے یہ ہیں کہ خدا کا قانون ان کے حق میں تبدیل ہو جائے حالانکہ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62) وہ کسی کے حق میں کبھی تبدیل نہیں ہوا کرتے۔ قانون تو وہی قابلِ احترام ہوتا ہے جو کسی وجہ سے جس میں تبدیلی نہ آ سکے۔ اگر وہ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں تو وہاں تو یہ ہوتا ہے کہ جس قسم کا جی چاہا' بنایا اور جس قسم کا جب جی چاہا' اس کو ترمیم کر لیا۔ ترمیم کے معنی اس قانون کو بدل دینے کے ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں یہ نہیں ہوتا جب کہ یہ چاہتے ہیں کہ خدا کا قانون ان کی مرضی کے مطابق بدل جائے۔ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ (48:15) کہا کہ یہ جو خدا نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہارے دل کے اندر کچھ اور ہوتا ہے' زبان پہ کچھ اور ہوتا ہے' اس کی بنا پہ یہ بات بھی یوں قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ تم نے یہ کہہ دیا کہ جو پیچھے ہو چکا ہے اس کو درگزر کیجیے۔ آئندہ ہم ایسا کریں گے کہ اتنے سے ہی تمہاری بات مان لی جائے اور ہم کہہ دیں کہ ہاں صاحب! مخلصانہ طور پہ تم مومن ہو گئے ہو اور آؤ ہمارے ساتھ۔ کہا کہ یہ نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو اس کے بعد اپنے عمل سے' اپنی روش سے' تمہیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ فی الواقعہ جو کچھ ہم کر گزرے' اس پہ ہمیں ندامت ہے' آئندہ ایسے کام کر کے دکھاؤ جس سے معلوم ہو جائے کہ فی الواقعہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں ایمان اترا ہوا ہے۔ یہ ہے طریقہ' تمہیں ایسے کرنا ہوگا فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا (48:15) سو تم ان سے یہ کہو گے کہ نہیں' اس طرح سے یونہی ایک عرضی دیدنے سے تو معافی نہیں مل سکتی' اس کے لیے تو یہ کچھ کرنا ہوگا۔

انسان کی نفسیاتی کیفیت اور دلوں کا حال

کہا کہ ہم نے جو کہا تھا کہ ان کے دلوں میں کچھ اور ہے' تم دیکھو گے اس کے بعد یہ کہیں گے کہ صاحب! یہ اتنی شرطیں ورطیں' جو تم ہم پہ عائد کر رہے ہو' اصل میں بات یہ ہے کہ تم ہم سے حسد کرتے ہو کہ یہ بھی ہمارے جیسے کیوں بن جائیں' حسد کرتے ہو' یہ بالکل ٹھیک بات ہے۔ اس کا جواب کسی غصے میں نہیں دیا' گالی نہیں دی' پھٹکار انہیں ہے۔ کہا کہ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا (48:15) بات یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے کہا ہے' یہ اس کو سمجھ ہی نہیں رہے' سمجھنا چاہتے نہیں' بہت تھوڑے ہیں جو تفکر سے کام لیتے ہیں' سمجھ سے کام لیتے ہیں' یعنی آپ غور کیجیے کہ قرآنِ حکیم نے ان کے خلاف کیا بات کہی ہے۔ حقیقتاً بات تو یہی ہے کہ یہ سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات ایسی نہ تھی جو سمجھ میں آ نہ سکتی۔ وہ ساری جذباتی باتیں کیے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے غلط بیانی کی' پھر جھوٹے دلائل دیئے' پھر منافقت کا پردہ ڈالا' پھر اس قسم کا

وعدہ کیا کہ جی! آئندہ ہم یہ کچھ نہیں کریں گے۔ یہ جذباتی چیزیں تھیں۔ قرآن کریم دلائل دے رہا ہے کہ نہیں' بھئی! قانون کی رو سے یہ بات ہے' یہ تو حسنات کا پلڑا ہے' جو سیأت کے پلڑے کا ازالہ کر سکے گا۔ بات سمجھنے کی ہے' سوچ لو۔ کہا کہ بات یہ ہے کہ یہ سمجھ بوجھ سے تو کام نہیں لینا چاہتے' جذباتی طور پہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ بھی جذباتی طور پہ آپ کے لیے کچھ کہیں' آپ بھی جذباتی طور پہ کہہ دیں کہ اچھا! چلو جاؤ' معاف کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ بات یہاں نہیں ہے' قانون اسی کا قانون کہلا سکتا ہے' عزیزانِ من! جو جذبات سے بلند ہو۔

غیر متبدل اصول وہی ہو سکتا ہے جس میں جذبات کو دخل نہ ہو اور توبہ کے لیے شرط

جب بھی کوئی قانون' کسی انسان' کسی بشر کے قلب کے اندر سے نکلے گا' تو قلب کی رنگینی کا اثر' اس میں کسی نہ کسی حد تک آ جائے گا' خواہ ایک فرد ہو' آمریت ہو' خواہ اس قسم کی جمہوریت ہو' خواہ ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کیوں نہ قانون بنا لیں' اس میں ان کے اپنے جذبات کی رنگینی کا عکس ضرور آ جائے گا اور یہی ہے بنیادی نقص' جو مغرب کی جمہوریت میں ہے۔ اسلام قانون سازی کا حق کسی انسان کو دیتا نہیں ہے۔ قانون صرف خدا کے بنائے ہوئے دیئے ہوئے ہیں۔ اس میں جذبات کی بات نہیں ہوتی۔ خدا تو جذبات سے بہت بلند ہے اور وہی قانون ہے جو ابدی بھی کہلا سکتا ہے' غیر متبدل کہلا سکتا ہے' مکمل کہلا سکتا ہے' بدل نہیں سکتا' اس میں جذبات نہیں ہوتے۔ تو قانون کی پہلی شرط یہ ہے کہ جذبات کا دخل نہ ہو اور وہ سیاسی جماعت کی طرح روز مصلحتوں کے تابع بدلتا نہ رہے۔ کہا کہ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (48:16) ان سے کہو کہ بات بڑی صاف سی ہے' یونہی زبانی کچھ کہہ دینے سے اور تسبیحوں پہ یہ توبہ کے ورد کر لینے سے تو بات نہیں بنتی۔ تم کہہ رہے ہو کہ آئندہ آپ دیکھیے گا کہ ہم اطاعت کریں گے اور آپ کے ساتھ جائیں گے تو کہنے لگے کہ یہ کوئی دور کی بات نہیں ہے' یہ لڑائیوں کا سلسلہ تو جاری ہے' اس کے بعد جو جنگ ہوگی' اسی میں دیکھ لیجیے گا' آ جائے گا' اگر تم نے صدقِ دل سے ساتھ دیا' میدانِ جنگ میں ساتھ گئے' آپ نے جاں فروشیوں کا ثبوت دیا' تو یہ جو پہلے آپ سے غلطی' خطا' سہو ہو گیا ہے' جسے تم معافی کہتے ہو' اس کی معافی یوں ملے گی۔ اس کے لیے تو خون کی قیمت دینی پڑے گی تو دیکھ لیں گے ہم دیر کی بات کیا ہے چلیے یوں سہی۔ دیکھ لیا آپ نے توبہ کے لیے شرط کیا لگائی گئی ہے۔

یہودیوں کے ساتھ خیبر کی آخری جنگ جو نہایت ہی نتیجہ خیز ثابت ہوئی

حدیبیہ کی صلح (628ء) کے بعد پہلی جنگ جو ہوئی تھی' وہ خیبر کی جنگ (7ھ) تھی۔ وہ یہودیوں کے ساتھ ہوئی ہے' یہ بڑی سخت جنگ تھی اور غنیمت ہے کہ یہ پھر ان کے ساتھ آخری جنگ تھی جو کرنی پڑی تھی۔ پہلے تو انہیں مدینے سے نکالنا پڑا' روز کوئی نہ کوئی سازش'

روز کوئی نہ کوئی شرارت ہوتی تھی' لہٰذا انہیں وہاں سے خیبر ❶ کے مقام پر بسا دیا گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے بھی باہر کی طاقتوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ یہ جنگ پہ اتر آئے ہوئے تھے۔

حدیبیہ سے واپسی پر نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہود اِدھر اُدھر کے قبائل سے ساز باز کر رہے ہیں تا کہ مل کر مدینہ پر حملہ کیا جائے۔ تو یہاں سے فارغ ہونے کے بعد پھر اگلی جنگ جو ہوئی ہے' وہ خیبر کی جنگ تھی' وہ آخری جنگ تھی جہاں سے ان کو پھر پورے ملک سے ہی نکال دیا۔ یہ وہ قوم ہے جو اصلاح کی حد سے آگے بڑھ چکی ہوئی ہے۔ اس کے منافقت کے مرض لاعلاج ہو چکے ہوئے ہیں۔ انہیں ملک میں نہیں رہنے دیا گیا۔ یہ تھی وہ جنگ خیبر' جس کے متعلق کہا کہ جنگ آنے والی ہے' ہونے والی ہے' آؤ اس میں شریک ہو جاؤ۔ اگر وہاں تم نے واقعی اطاعت کی تو پھر دیکھو گے کہ کتنا اَجۡرًا حَسَنًا (48:16) ملتا ہے تمہیں اور اگر اسی طرح سے تم پھر گئے' جیسا کہ اس سے پہلے پھرا کرتے تھے' تو پھر یہ جو تمہارے خلاف سزا ہے' وہ پہلے سے بھی زیادہ الم انگیز سزا ہو گی جو کچھ تم کر رہے۔ ہاں تو یہ قرآن کریم ہے کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اسی طرح سے اگر تم پیچھے رہ گئے تو پھر وہی کچھ کیا جائے گا جو ہم کہہ رہے ہیں لیکن لَيۡسَ عَلَى الۡاَعۡمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الۡمَرِيۡضِ حَرَجٌ ط (48:17) جو مریض ہیں' ٹھیک ہے' وہ نہیں جا سکتے' لولے لنگڑے ہیں' وہ نہیں جا سکتے' اندھے ہیں' وہ نہیں جا سکتے تو یہ جو ہم نے کہا تھا کہ جو نہیں جائے گا' اس کے خلاف یہ سزا دینے والی تدبیر اختیار کی جائے گی' تو یہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ نہ سمجھ لیں کہ صاحب! ہم تو اس معذوری کی وجہ سے نہیں جا سکے' ان کی معذوری تو قابلِ فہم ہے' وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

انسان کا ہر وہ عمل جو جذبۂ صادقہ کے تحت سر انجام پائے وہ ہمیشہ سکونِ قلب سے معمور ہوتا ہے

کہا کہ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (48:17) اور پھر جو خدا رسول کی اطاعت کرے گا' اس اطاعت کے بدلے میں کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ یہ کامرانیاں فائز المرامی ہے' جس کو وہ جنت سے تعبیر کرتا ہے' اور آپ کو معلوم ہے' وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر جو ایک مملکت قائم ہوتی ہے' اس کے نتائجِ حسنات کو وہ اس دنیا کے اندر جنت قرار دیتا ہے اور یہی پھر آگے بڑھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ آخرت کی جنت بھی اس کا نام ہو جاتا ہے۔ کہا کہ ادھر یہ کچھ حاصل ہو جائے گا۔ وَمَنۡ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبۡهُ عَذَابًا اَلِيۡمًا (48:17) اور جو پھر اس سے پھر جائے گا' پھر اس کو دردناک سزا دی جائے گی۔

مکافاتِ عمل کے نتیجہ میں ہم جیسے مسلمان اپنی سلطنت تک کے بھی وارث نہیں رہتے

آپ کو پتہ ہے کہ یہ پھر جانے والوں کے متعلق قرآن کریم نے قوموں کی زندگی میں جو دردناک سزا کہی ہے' وہ سزا کیا ہوا کرتی

---

❶ یہ مقام مدینہ سے قریب دو سو میل کے فاصلے پر ہے۔

ہے؟ کہا کہ سن لو! وہ سزا کیا ہوتی ہے؟ قومیں جب حق کے راستے سے پھر جاتی ہیں' تو اس کے بعد ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ وہ غلط نظام قائم کر لیتی ہیں' خواہ وہ ان اعراب کی طرح اپنے آپ کو مسلمان ہی کیوں نہ کہنے والی ہوں' اور یہ تو مخاطب ہی ان کو کیا گیا ہے جو واقعی مسلمان قوم تھی۔ کہا کہ **وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا** (47:38) ان سے کہد و کہ اگر تم اس نظام سے پھر گئے **یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ** (47:38) تو وہ تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئے گا' **ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ** (47:38) وہ پھر تمہارے جیسے نہیں ہوگی۔ یہ استبدال قومی ہے۔ یہاں افراد کے جرائم کا ذکر نہیں ہو رہا' قوم کی قوم کا ذکر ہو رہا ہے' اگر قوم غلط نظام قائم کرتی ہے اور اس کے تابع زندگی بسر کرنے پہ مطمئن ہو جاتی ہے تو پھر اس کا جو آخری عذاب ہے' جس کو ہم سمجھتے ہیں' ہمارے ذہن میں وہی ہوتا ہے کہ وہاں جا کر قیامت میں' جہنم میں جائیں گے۔

عذاب ❶ کے معنی یہ ہیں: ''اس کی ایسی سزا ایسا انجام' اس کے ایسے عواقب' اس قسم کے نتائج جہاں انسانی صلاحیتیں جھلس جائیں' خاکستر ہو جائیں۔ اس نے یہ بتایا کہ قوم جب یہ کرتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور قوم آ جاتی ہے' وہ لے لیتی ہے تو وہ اس قوم جیسی نہیں ہوتی' پھر انہی جیسی اگر وہ قوم ہو تو پھر اس تبدیلی کے معنی کیا ہوئے' پھر تو کوئی بات ہی نہ ہوئی۔ وہ ان سے بہتر قوم ہوگی' جو ان کا جائزہ لے گی لیکن بہر حال یہ جو قوم ہے' اس کو ہٹا دیا جائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا دردانگیز عذاب کیا ہے کہ قوم زندہ تو رہے لیکن ایک دوسری قوم کی' محکوم ہو جائے' جو اس کی جگہ آ جاتی ہے۔ جگہ آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ان سارے افراد کو یہاں سے جھاڑ و پھیر کر نکال دیتی ہے اور ان کی جگہ آ کے آ جاتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیشتر ان میں سے قتل ہو جاتے ہیں' بیشتر ان میں سے بھاگ جاتے ہیں' قید کر لیے جاتے ہیں' لیکن قومی استبدال کے معنی یہ ہیں کہ ایک قوم کی حکومت کامرانی' کامیابی' اس کی جگہ دوسری قوم آ جاتی ہے' وہ ان پہ غالب آ جاتی ہے' یہ دوسری قوم کے محکوم ہو جاتے ہیں اور یہ قرآنِ کریم نے سب سے بڑا عذاب گنایا ہے۔

سورۃ الفتح کی آیت 17 تک ہم آ گئے' عزیزانِ من! 18 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

---

❶ تاج العروس اور محیط المحیط میں یہ لکھا ہے: عَــذَابٌ سزا' نیز بھوک' پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں۔ اس کا مادہ ع ذ ب ہے۔ نیز دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961ء ص ص۔ 1143 تا 1144۔

پانچواں باب: سورۃ الفتح (آیت 18 تا 26)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ گرامی قدر، سلام ورحمت! آخری درس دو اپریل 1982ء کو ہوا تھا' اس کے بعد میں ارض حجاز کی خاک بوسی اور عمرہ کی سعادت سے بہرہ یاب ہونے کے لیے چلا گیا' ابھی واپس آیا ہوں۔ آج 7 مئی 1982ء سے درس کا سلسلہ پھر شروع ہو رہا ہے (48:18)

تجدیدِ یادداشت

سابقہ درس میں ہم سورۃ الفتح کی 17 ویں آیت تک پہنچے تھے۔ اسی سورۃ کی 18 ویں آیت سے درس کا آغاز ہوگا لیکن چونکہ درمیان میں قریب ایک مہینہ کا انقطاع ہوا ہے' تو پس منظر کو سامنے رکھنے کے لیے مختصراً عرض کر دوں کہ سورۃ الفتح کا تعلق صلح حدیبیہ (628ء) سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لے گئے' حج ابھی فرض نہیں ہوا تھا لیکن عرب تو شروع سے ہی حج اور عمرہ ادا کیا کرتے

تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے قلبِ مطہر میں یہ آرزو بار بار مچلتی تھی کہ کعبہ' جسے مملکتِ اسلامیہ یا نظامِ خداوندی کا مرکز قرار دیا گیا ہے' اسے مخالفین اسلام کے قبضے یا تحویل میں تو نہیں رہنا چاہیے' مرکز کو تو بہرحال اسی نظام کی تحویل میں ہونا چاہیے' جس کا وہ مرکز ہے۔ قرآن کریم نے بڑے حسین انداز میں یہ بات کہی ہے کہ ہم دیکھتے تھے کہ کس طرح تُو اے رسول! للچائی ہوئی نظروں سے بار بار آسمان کی طرف تکتا ہے اور ہم نے یہ کہا تھا کہ یہ ایسا ہوگا' نظام کا مرکز اہلِ نظام کے ہاتھوں میں ہی ہونا چاہیے لیکن مشیّت کے پروگرام کے مطابق تو ہر بات اپنے وقت پر جا کر ہوتی ہے۔

میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ عرب حج اور عمرہ اپنے اطوار پر ادا کیا کرتے تھے تو اس اعتبار سے بہرحال قریش کی مخالفت برابر چھ سات سال سے جاری تھی لیکن ان کا عرب ہونا تو اس کے منافی نہیں تھا۔ ان کے رسوم و رواج کے مطابق مکہ مکرمہ میں آنے جانے کی عام اجازت تھی اور لوگ حج اور عمرہ بھی کرتے تھے۔ قرآن کریم میں بھی ہے کہ حضور ﷺ نے ایک خواب دیکھا کہ آپ ﷺ مکے تشریف لے گئے ہیں' وہاں حج یا عمرہ کر رہے ہیں۔ چھ ہجری میں ذیقعد کے مہینہ میں آپ ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ مکے چلیں اور وہاں اگر حج نہیں تو کم از کم عمرہ تو کر آئیں۔ یہ خبر سن کر صحابہؓ کی ایک کثیر جماعت ساتھ تیار ہوگئی۔ آپ ﷺ تشریف لے گئے تو مکہ سے ابھی ایک منزل کے فاصلے پر تھے' جس مقام کو حدیبیہ کہا جاتا ہے' کہ قریش نے آپ ﷺ کو وہیں روک دیا اور آپ ﷺ کی مخالفت کے لیے ایک لشکر تیار کر لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کوئی ساز و سامان یا ہتھیار اسلحہ سے لیس ہو کر نہیں آئے' ہمارا ارادہ جنگ کرنے کا ہے ہی نہیں' ہم تو عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں اور پھر یہ جو مہینے ہیں' ان میں تو ویسے ہی تمہارے یہ عرب کے قدیمی معاشرتی رسومات تھیں' آداب تھے' روایات تھیں' وہ ان چار مہینوں میں جنگ مشکل ہی کیا کرتے تھے' لڑائی کیا ہی نہیں کرتے تھے تو آپ ﷺ نے کہا کہ یہ تو وہ مہینہ ہے کہ جس میں ویسے تمہارے عام رواج کے مطابق بھی جنگ نہیں ہوتی' تو ہم تو جنگ کے ارادے سے آئے ہی نہیں لیکن انہوں نے پھر بھی ایک دستہ بھیج دیا اور اسے صحابہؓ نے جلد ہی مغلوب کر لیا لیکن اس کے بعد ان سے کچھ نہیں کہا۔ ان سے کہا کہ مکے واپس چلے جاؤ' ہم نے جنگ نہیں کرنی۔ حضرتِ عثمانؓ کو آپ ﷺ نے بھیجا کہ جا کر اہلِ مکہ سے ذرا گفتگو کریں کہ ہم تو اس غرض کے لیے آئے ہیں' تم مقابلے میں اس طرح لشکر کشی کیوں کر رہے ہو' تو حضرتِ عثمانؓ وہاں گئے۔ بعد میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ انہوں نے حضرتِ عثمانؓ کو گرفتار کر لیا ہے۔ اب یہ سننا تھا تو صحابہ کبارؓ تڑپ اٹھے کہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے' پھر ہم خاموش کس طرح سے بیٹھے رہیں۔ آپ ﷺ نے بھی اس کا اندازہ لگایا کہ قریش کی نیت بد ہے' ہم ان کے گھر کے پاس آ گئے ہیں' اسلحہ تک ہمارے پاس نہیں ہے' جمعیت اتنی کم ہے' ہمارے پاس کوئی چودہ سو کے قریب' روایات میں ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ صحابہؓ تھے اور وہ مکے کے اندر آ پہنچے ہوئے ہیں' ان کی پوزیشن بڑی نازک ہے' ہوسکتا ہے کہ ہمیں یہ واپس ہی نہ جانے دیں۔

مسلمان ہونے کے لیے بنیادی شرط اور بیعت کے سلسلہ میں تجدیدِ عہد کا مرحلہ

آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ایک شخص اس وقت مسلمان ہوتا ہے جب وہ یہ عہد کرتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشۡتَرٰی مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اَنۡفُسَھُمۡ وَ اَمۡوَالَھُمۡ بِاَنَّ لَھُمُ الۡجَنَّۃَ (9:111) میں اپنی جان اور اپنا مال' یا جو کچھ بھی ہے' خدا کے ہاتھ بیچتا ہوں اور خدا اس کے معاوضے میں کہتا ہے کہ میں تمہیں جنت دیدوں گا تو یہ خدا اور مومنین کا آپس میں ایک عہد اور معاہدہ ہوتا ہے' اب یہ ظاہر ہے کہ خدا تو تصورات کی دنیا سے بھی ماورا ہے چہ جائیکہ وہ اس معاہدے پر عملدرآمد کرانے کے لیے خود سامنے آئے کہ لاؤ بھئی! جو تم نے ہمارے ہاتھ میں بیچا تھا ہمیں دیدیجئے' تو یہ جو کچھ تھا' وہ اسلامی نظام کی وساطت سے ہوتا تھا' نبی اکرم ﷺ اس نظام کے مرکز اور سربراہ تھے۔ حضور ﷺ اس وقت' روایت میں ہے' کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ نے یہ کہا کہ دیکھو بھئی! وہ جو تم لوگوں نے خدا سے جان اور مال دینے کا معاہدہ کر رکھا ہے تو مال تو وقتاً فوقتاً دیتے ہی رہے ہو' آج وقت آ گیا ہے کہ یہاں جان دینی پڑے گی تو آؤ! وہ جو تمہارا معاہدہ ہے اس کی تجدید کرو۔ بیچ دینے کے لیے بیع کا لفظ آتا ہے اور یہیں سے لفظ بیعت ہے۔ تو وہ جسے بیعت کہتے ہیں' اس کے لیے نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ اپنے اس معاہدے کی تجدید کرو' جس کی رو سے تم نے اپنی جانوں کو اور مال کو خدا کے راستے کے لیے بیع کر دیا ہوا ہے تو اس تجدیدِ بیعت کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے۔ یہ آیت تو پہلے گزر چکی ہے۔

عزیزانِ من! اب آیت 10 ویں میں یہ چیز آئی تھی کہ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ (48:10)۔ کیسے بلیغ انداز میں قرآن کریم کہتا ہے کہ اے رسول! یہ صحابہؓ تمہارے ہاتھ پہ بیعت کی تجدید کر رہے تھے' یہ تم سے یہ بیعت نہیں کر رہے تھے' درحقیقت یہ خدا سے بیعت کر رہے تھے اور ان کے ہاتھ پر اس بیعت کی توثیق کے لیے' پختہ کرنے کے لیے جو تمہارا ہاتھ ہوتا تھا' تو یہ تمہارا ہاتھ نہیں تھا۔ یہ جسے ہم On behalf of Allah کہتے ہیں' تم خدا کی طرف سے اس بیعت کو لے رہے تھے' اس لیے یہ ان کے ہاتھ پر خود اللہ کا ہاتھ تھا۔ میں ان آیات کو جب سامنے لایا تھا تو عرض کیا تھا کہ اسلامی نظام کا تصور کس حسین انداز میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے کہ یہ تو سب کچھ خدا کے احکام کی تعمیل کے لیے ہوتا ہے' لیکن خدا تو محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا' محسوس شکل میں جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ اسلامی نظام کرتا ہے' اسلامی نظام کا جو سربراہ یا مرکز ہے وہ کرتا ہے' تو اسے قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ یہ ان کے ہاتھ پر اے رسول! تمہارا ہاتھ نہیں تھا' خدا کا ہاتھ تھا تو گویا یوں خدا' جو میں نے عرض کیا ہے کہ تصور و تخیل سے بھی بالاتر ہے' محسوس طور پر اس کی شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ خدا کے نظام کا نمائندہ' وہ خدا کے Hehalf پہ' یہ سب چیزیں کرتا ہے' اس لیے اسے خدا کی چیزیں کہا جاتا ہے اور وہاں یہ کہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے' وہ درحقیقت خدا تھا' جو ان سے بیعت لے رہا تھا تو انہوں نے جانیں دیدینے کی بیعت وہاں کی۔

رضی اللہ کا مروجہ اور قرآنی مفہوم

اور اب 18 ویں آیت ہمارے سامنے ہے، جس سے آج درس کا آغاز ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ **لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ** (48:18) کیا بات ہے جماعت مومنین کی، جو اس درختِ رضوان کے نیچے حدیبیہ کی تمہارے ہاتھ پہ بیعت کر رہے تھے۔ اے رسول! اب ان کے لیے **لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ** (48:18) ہے۔ ہمارے ہاں عام ترجمہ تو رضی اللہ کا یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا بلکہ جو پورا فقرہ ہے، وہ تو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ہے، اللہ ان سے راضی ہو گیا، یہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ راضی ہو جانے کے تصور سے صحیح بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ آپ جانتے ہیں راضی تو وہ ہوتا ہے کہ پہلے کہیں جھگڑ ہوا ہو، کوئی غصے میں ہو، اس کو منا لیا جائے تو ہمارے ہاں تو یہ لفظ اس طرح استعمال ہوتا ہے کہ وہ اب راضی ہو گیا ہے اور خدا تو انسانی جذبات سے ماورا ہے، وہ نہ خوش ہوتا ہے، نہ ناراض ہوتا ہے، نہ غصے میں آتا ہے، نہ ان الفاظ کے اعتبار سے راضی ہوتا ہے۔ راضی تو وہ ہوتا ہے جو پہلے کسی سے بگڑا ہوا ہو۔ خدا تو ان چیزوں سے بلند اور ماورا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو ادھر جماعتِ مومنین یا عظیم ترین مومن ہیں، اللہ کے اس پیمانے پہ پورا اترے اور سب سے بلند ترین اللہ تعالیٰ نے جو شرف کی بات کہی ہے، وہ یہ کہی ہے۔ اس کا مفہوم اگر ہم ''آہنگ ہونا'' کہیں تو عربی زبان کے قاعدے کی رو سے بھی صحیح ہے۔ جو دو چیزیں ایک دوسرے سے یکسر ہم آہنگ ہو جائیں ان کے لیے وہ یہ لفظ بولتے تھے۔ تو یہ ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جو یکسر مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں، یہ قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہیں اور خدا نے جو وعدہ کر رکھا تھا کہ جب تم یہ کرو گے تو اس کے نتیجے میں ہماری طرف سے یہ ہوگا، تو وہ پورے کا پورا اس سے ہم آہنگ ہو گیا، یہ دونوں طرف سے رضی اللہ ہونا، ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا ہے۔ یہ ہے جس کو راضی ہو جانا کہتے ہیں اور صحابہ کرامؓ کے متعلق تو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر یہ دہرایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بلند ترین کوئی اور شرف نہیں ہو سکتا جو خدا کسی کے متعلق یہ کہے کہ اللہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔

صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآنِ حکیم کی شہادت مگر یہ کہا گیا کہ یہ آپس میں دو پارٹیاں تھیں

صحابہ کبارؓ کے شرف و مجد کے متعلق قرآنِ کریم کی آیات بھری پڑی ہیں اور چھوٹا منہ بڑی بات ہے کہ صحابہؓ کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قرآنِ حمید کی اس شہادت کے بعد ان کے بلند ترین مقامات کے متعلق کسی قسم کے شبہ اور ابہام کی ضرورت نہیں رہتی، قرآن حمید بار بار دہراتا ہے، میں نے متعدد بار اس کے متعلق آیات پیش بھی کی ہیں، پھر دہرائے دیتا ہوں، کیوں کہ یہ بات پھر سامنے آ گئی ہے۔ صحابہؓ میں کون کون سے لوگ شامل ہیں کہ جن کے متعلق قرآنِ کریم نے یہ سند دی ہے، یہ شہادت دی ہے؟ کہا ہے کہ

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ (8:74) وہ لوگ کہ جنہوں نے خدا کے راستے میں ہجرت کی اور پھر اس نظام کے قائم کرنے میں' استحکام میں' مسلسل جدوجہد کرتے رہے یا جسے اللہ کے راہ میں کہتے ہیں کہ کام کرتے رہے' ایک طرف تو یہ مہاجرین آ گئے اور وہ جنہوں نے مدینے میں ان کو پناہ دی' ان کی مدد کی' جنہیں انصار کہا جاتا ہے' وہ سارے صحابہؓ دو ہی حصوں میں تعارف کی غرض سے ہوئے ورنہ ان کے اندر یہ کوئی جماعتی تفریق نہیں تھی اور وہ تو پوچھو نہیں کہ اس قرآن حمید کے ساتھ کیا کچھ کیا جا رہا ہے۔ وہ پچھلے دنوں کسی صاحب نے یہ کہا تھا' ہم تو لکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں پارٹی بازی یا فرقہ بندی شرک ہے' امت واحدہ ہے' اس میں نہ سیاسی پارٹیاں ہوسکتی ہیں' نہ مذہبی فرقے ہوسکتے ہیں' تو ایک صاحب نے اس کی تردید میں یہ لکھا تھا کہ ہو کیوں نہیں سکتے' اب دیکھیے کہ صحابہ کبارؓ دو سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے: مہاجر اور انصار۔ اللہ اکبر! یعنی قرآنِ کریم نے ان کے تعارف کے لیے بات کہی ہے کہ وہ جو مکہ سے مدینہ کی طرف آئے' وہ مدینہ میں مہاجر تھے جنہوں نے ان کو پناہ دی' ان کی مدد کی' ان کو انصار کہا ہی اس لیے گیا ہے' اس سے پیشتر نہ وہ مکے والے مہاجر کہلاتے تھے' نہ یہ مدینے والے انصار کہلاتے تھے' اور نہ ہی آپس میں یہ دو پارٹیاں تھیں کہ وہ الیکشن میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہوا کرتے تھے۔ بہر حال یہ باتیں اب کیا کی جائیں۔

سینہ تمام داغدار پنبہ کجا کجا نہم

یہ دَور ایسا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے مدارج کی وضاحت

صحابہ کبارؓ کے متعلق قرآنِ حکیم ان میں سے جنہوں نے ہجرت کی یا مدینے کے انصار' جنہوں نے ان کی مدد کی تھی' ان تمام کے متعلق کہتا ہے اُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا (8:74)۔ اس سے بڑا Certificate' عزیزانِ من! کیا ہوسکتا ہے کہ خدا کہے کہ یہ پکے اور سچے مومن ہیں' یہ مومن حقا خود خدا ان کو کہہ رہا ہے۔ ان کے ایمان کے متعلق دیکھیے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم مومن حقا ان کے متعلق کہہ رہا ہے (8:74) کہ جنہیں خدا مومن حقا کہے' وہ بلا استثنا ہے۔ اس کے اندر تمام مہاجرین' تمام انصار سارے ہی صحابہؓ آ جاتے ہیں اور ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ مومن حقا تھے۔ یہ اتنا ہی نہیں کہا بلکہ ان مومنین کے متعلق کہا کہ ذہن میں یہ خیال آ سکتا تھا کہ ایک تو وہ تھے کہ جو شروع میں ہجرت کر کے آ گئے' ایک وہ تھے جو بعد میں ان کے ساتھ آ کر شامل ہوئے۔ قرآنِ کریم نے اس کی بھی تصریح کر دی کہ بعد میں کہیں یہ بات نہ ذہن میں پیدا ہو جائے کہ صاحب! یہ جو ہیں' یہ ان سے ذرا پست درجے پر ہے' ان کو شامل نہیں کیا گیا۔ کہا کہ وَ

السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ (9:100) جنہوں نے پہل کی' جو سب سے پہلے آئے' وہ دو شقوں میں شامل ہوئے: ایک مہاجرین کی شق میں اور دوسرے انصار کی شق میں۔ پہلی بار جو شامل ہوئے' وہ بھی وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ (9:100) اور جو ان کے بعد بھی اسی طرح حسن کارانہ انداز سے ان میں شامل ہوئے' ہجرت بھی جاری رہی تھی' گروہ در گروہ لوگ آخر تک آتے رہے تھے' اور اسی طرح سے یہاں یہ انصار کی نصرت بھی رہی تھی۔ اور ان کے لیے جو کچھ انہوں نے کیا تھا' پناہ دہی کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا' تو اب ایک تو وہ تھے جو سالِ اوّل کے اندر ہی آ گئے تھے' انہیں قرآن کریم نے سابقون الاوّلون کہا اور اس کے بعد کہا کہ پھر وہ جو بعد میں بھی ان کے ساتھ آ کر ملے ہیں۔ اب دیکھیے اس میں کسی ایک کی استثنٰی کی گنجائش ہی نہ رہی۔ اس قدر قرآنِ کریم میں جامع طور پر (Comprehensively) یہ بات کہہ دی کہ وہ جو پہلے پہلے آئے' جو بعد میں بھی ان کے ساتھ آ کر ملے اور یہاں وہ لفظ آیا ہے کہ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (9:100) یہ مشیت خداوندی سے یکسر ہم آہنگ ہو گئے' جو خدا کے انعام و اکرامات تھے وہ ان کے ہم آہنگ ہو گئے اور اس کا نتیجہ خود ہی بتا دیا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ کہا کہ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (9:100) ان کے لیے خدا نے پہلے سے جنت تیار کر رکھی ہے۔ وہ شادابیوں کی' خوشگواریوں کی' سرسبزیوں کی' ابدی جنت ہے اور یہ بہت بڑی Achievement ہے' فوز ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ حمید نجات (Salvation) نہیں کہتا۔ Salvation تو پہلے کسی عذاب یا مصیبت میں مبتلا ہو تو اس سے Salvation (نجات) کے معنی ہوتے ہیں اور پھر وہ ویسے کا ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ نجات کا تصور قرآنی نہیں ہے۔ قرآن حکیم فوز کہتا ہے' یہ Achievement ہے' یہ کچھ حاصل کرنا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے جو انہوں نے حاصل کی اور یہ صحابہ کبارؓ ہیں' ان کے بلند مرتبہ کا کیا کہنا ہے! نبی اکرم ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ (8:62) اے رسول! کوئی بات نہیں' خدا تیرے لیے کافی ہے۔ اب یہ آیت 62 ویں ہے' اسی کے ساتھ کہا کہ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ (8:62) خدا نے تمہیں تقویت پہنچائی ہے' کس چیز سے؟ اپنی طرف سے ایک نصرت اور مدد سے اور اس جماعت مومنین کی طرف سے' اپنی نصرت کے ساتھ مومنین کی جماعت کا ذکر ہے اور اگلی آیت میں تو بات ہی صاف کر دی ہے۔ کہا کہ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (8:64) اے رسول! تیرے لیے اللہ کافی ہے۔ یہ کہنے کے بعد تو کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ جس کے ساتھ اللہ ہو' اس کو اور کیا چاہیے۔ کہا کہ نہیں' تنہا اللہ ہی نہیں' یہ جماعت مومنین ساتھ ملا کر ہے۔ یہ ہیں لوگ جو آپ کے ساتھ تھے۔

عزیزانِ من! ذرا اس مرتبہ بلند کو ملاحظہ فرمائیے۔ اے رسول! تیرے لیے تنہا اللہ کافی نہیں ہے' اس کے ساتھ یہ جماعت مومنین بھی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے' جماعت یا امت کے بغیر تو یہ نظام قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ تھے وہ صحابہؓ جن کے

متعلق کہا کہ لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ (48:18) واہ واہ! واہ واہ! کہا کہ یہ جو کچھ کر رہے تھے' یہ نہیں تھا کہ انہیں مکینکی طور پر بہر حال کچھ کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ آ رہے تھے' ہاتھ پہ ہاتھ رکھ رہے تھے' چلے جا رہے تھے۔ کہا کہ نہیں' یہ اپنے دل کی گہرائیوں سے' ایثار اور قربانی کے لیے یہ وعدہ کر رہے تھے اور خدا جانتا تھا کہ ان کے دل میں کیا ہے' یعنی خدا نے بھی جو یہ کہا ہے کہ لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (48:18) تو یہ نہیں کہا کہ ان کے جو ظاہرہ اعمال و حرکات وسکنات تھے' صرف ان کی بنا پہ کہہ دیا۔ دنیا میں تو یہی ہوتا ہے کہ جو بھی کر جائے اس طرح سے جا کے سیلوٹ مار دیتا ہے' اس کے متعلق Certificate دے دیا جاتا ہے کہ یہ Loyal (وفادار) ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات نہیں' ہم جانتے تھے کہ ان کے دلوں میں یہ بات ہے کہ ہم نے اپنی جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ رکھا ہے۔

صحابہ کرامؓ کو ایمان کی پختگی نے سکونِ قلب سے مالا مال کر دیا

کہا کہ فَعَلِمَ مَا فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ فَاَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ عَلَیۡھِمۡ (48:18) معرکہ بڑا خطرناک تھا' مکے کے قرب میں بیٹھے ہوئے تھے' نہ جائے ماندن' نہ پائے رفتن' اور قریش جیسے دشمن جنہوں نے گزشتہ پانچ چھ سال سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا' ان کے ساتھ کتنی جنگیں لڑنی پڑیں' ان کے گھر میں آ کر بیٹھے ہیں' ہتھیار بھی پاس نہیں ہے اور ان کی نیت بد نظر آ رہی ہے۔ یہ بڑی چیز تھی۔ کیا بات تھی کہ اللہ تعالیٰ خود یہ کہہ رہا ہے کہ پھر یہ مومن تھے کہ جب انہوں نے تجدید بیعت کر لی اور رسول نے کہہ دیا کہ تمہارا خدا تمہارے ساتھ راضی ہوا ہے۔ یہ الفاظ ہیں۔ کہا کہ اس سے ان کے قلوب میں ایک سکون پیدا ہو گیا' کوئی اضطراب باقی نہ رہا' کسی قسم کے خطرے کا احساس باقی نہ رہا' سامنے موت نظر آ رہی ہے' کہاں بیٹھے ہیں' لیکن اتنی چیز سے کہ ہم نے اپنے عہد کی تجدید کر دی ہے' یہ تو خدا کی ہمارے پاس امانت تھی جو ہمارا یہ سر ہے' ہماری جان ہے' اس نے مانگ لی ہے' ہم نے پیش کر دی ہے۔ کہا کہ اس تجدید بیعت سے ان کے دلوں میں سکون پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ہے مقامِ مومن' عزیزانِ من! جان دے رہے ہیں اور دل کے پورے سکون کے ساتھ جان دے رہے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی سرپرستی میں مکے اور مدینے کی سرزمین پر برپا ہونے والا انقلاب اپنی مثال آپ ہے

کہا کہ انہوں نے یہ کیا اور ہم نے یہی نہیں کہ ان کے دلوں میں سکون پیدا ہو گیا بلکہ کہا کہ وَاَثَابَھُمۡ فَتۡحًا قَرِیۡبًا (48:18) اس کیفیت میں ان کے لیے قریبی زمانے میں ہی فتح کے اور دروازے کھول دیئے صاحب! یہاں کوئی جنگ نہیں ہوئی لیکن یہ جوان کا انداز تھا کہ اتنے کٹھن خطرے کے زمانے میں اپنی جانوں کو لے کر حاضر ہو گئے' واقعی اس سے قریش کے دل پر بھی جو اثر ہوا تھا وہ اگلے ہی سال' جب وہی قریش فتح مکے کے لیے آئے ہیں تو یہ ہیں جنہوں نے سات سال تک تین تین سو میل کے فاصلے پہ جا کر بھی مخالفت نہ چھوڑی

تھی۔عزیزانِ من! کبھی پھر عرض کروں گا کہ وہاں جا کر کیا کچھ دیکھ کر آیا ہوں! یہ جو اس انقلاب کی عظمت ہے جو حضور ﷺ اور حضور ﷺ کے ساتھیوں کے ہاتھوں برپا ہوا تھا' بے نقاب ہو کر مشہود طور پر' سامنے آ جاتی ہے۔ان مقامات اور ان انقلابات کے متعلق چالیس سال تک میں لکھتا رہا' وہ سارا کچھ میں نے دیکھا۔وہ محض اپنے تصور کی' خیالات کی' اور مطالعاتی معلومات کی' بات تھی' اب آنکھوں سے دیکھنے کے بعد جو کیفیت ہوتی ہے' سوچیے وہ ویسے نہیں حاصل ہوتی' وہاں اس انقلابِ عظم کی جو حقیقت تھی' وہ مشہود ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔اللہ اکبر! تو یہ جو چیز تھی' ان کا کہنا ہے کہ یہ ان کا Reaction (ردِّعمل) انہوں نے دیکھا کہ اس قدر مہین خطرے کے عالم میں جس جماعت کی یہ کیفیت ہے وہ بڑھ چڑھ کر اپنی جانیں پیش کر رہے ہیں اور نہایت پرسکون ہیں' کوئی اضطراب نہیں' کوئی پریشانی نہیں' کوئی حزن نہیں' کوئی قلب میں خوف کا کسی قسم کا اثر تک نہیں ہے۔انہوں نے کہا کہ اس جماعت سے دنیا کے اندر کون ہے جو ٹکر لے' جو اس جماعت پر غالب آ سکتا ہے تو یہ تھی جس نے یہ صلح حدیبیہ کے اندر کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے۔قرآنِ کریم میں الفتح اس سورۃ کا نام ہی اس لیے رکھا ہے۔فتح کے معنی Victory نہیں ہوتا بلکہ فتح کے معنی ہوتا ہے'' کامیابیوں کے دروازے کھول دینا''۔ان کے اس کردار کے مظاہرے نے ان کے اوپر کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے صاحب! بلا جنگ کیسے مکہ فتح ہو گیا' وہ بعد کی بات ہے اور یہ قریبی جنگ ہے۔اس بیعت رضوان کے بعد جو یہودیوں کے ساتھ جنگ ہوئی تھی وہ بہت بڑی جنگ تھی اور بہت بڑا فتنہ تھا جس کو ختم کر دیا گیا۔ان کو وہاں سے نکال ہی دیا گیا۔

وادیٔ غیر ذی زرع میں مالِ غنیمت کی اہمیت اور اس میں کی گئی اصلاحات

کہا گیا کہ وَمَغَانِمَ كَثِيرَةً يَّأْخُذُونَهَا (48:19) جسے مالِ غنیمت کہا جاتا ہے تو جنگ وجدال تو عرب کے معاشرے کا جزو بن چکی ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس ذریعہ رزق کوئی تھا ہی نہیں' وہاں پیدا ہی کچھ نہیں ہوتا اور اس زمانے میں Import Export (درآمد برآمد) جسے آپ کہتے ہیں' کا تصور ہی نہیں ہو سکتا تھا۔وہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا تھا۔قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ وادی غیر ذی زرع ہے اور وہاں جا کر پتہ چلتا ہے کہ غیر ذی زرع وادی کیسی ہوتی ہے' ہم یہاں نہیں تصور کر سکتے' عزیزانِ من! جہاں کچھ پیدا نہ ہو تو ان کے لیے جو ذریعہ معاش تھا' یہ مالِ غنیمت ہی تھا' جنگوں میں اسی لیے تو ہمیشہ لڑتے بھڑتے رہتے تھے اور یہ غنیمت کیا ملتی تھی؟ یہ خود جو لفظ غنیمت ہے' غنم سے ہے۔غنم کے معنی بکریاں ہیں تو ان کے پاس ہوتا کیا تھا جو ان کو ملتا تھا۔جنگ میں وہ ادھر کی بکریاں ادھر لوٹ کر لے آتے تھے ادھر کا کچھ ادھر چلا جاتا تھا۔یہ تھا اسلام سے پہلے ان عربوں کا جنگ کا جذبہ محرکہ۔اسی لیے وہ جنگ کرتے تھے۔اسلام کا جو انقلاب لایا گیا' حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت نے جو پیدا کیا' پہلی بات یہ تھی کہ مالِ غنیمت کی تقسیم انفرادی طور پر نہیں ہوتی تھی'

پہلے یہ تھا کہ جو سپاہی کے ہاتھ آ جائے' وہ اس کا مالک ہوتا تھا اور اس کے بعد حکم یہ تھا کہ جو کچھ کسی کو ملتا ہے' لا کر یہاں جمع کر دے اور آپ ہٹ کر کھڑا ہو جائے۔ یہ ایک جذبہ محرکہ تھا جو عرب کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ جنگ کے لیے پہلی ہی ہدایت کے مطابق' اس کو ختم کر دیا۔ اب مالِ غنیمت جذبہ محرکہ نہ رہا اور نہ ہی کوئی سپاہی اس کے بعد مالِ غنیمت میں سوئی تک اپنے پاس خود نہیں رکھتا تھا۔

ایران کی فتوحات کے موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کو لکھا جانے والا خط اور حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ کو خراجِ تحسین

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہے' میں نے کہا تھا کہ جب ایران کا دار الخلافہ مدائن' فتح ہوا ہے' تو حضرت عمر بن عاصؓ نے جو فتوحات کی تھیں' اس کا وہاں سے جو مالِ غنیمت (اگر آپ اسے ایران کی ہزار ہا سال کی تہذیب و تمدن کے خزانے کہیں تو اس کی وہ تفصیل پڑھنے کی ہے) ملا تھا' وہ بھیجا تو اتنا بڑا قالین تھا کہ ان سے اٹھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ ان عربوں کو کیا معلوم تھا کہ قالین کس کو کہتے ہیں صاحب! تو وہاں سے یہ جو مالِ غنیمت آیا ہے' انہوں نے ساتھ خلیفۃ المومنین حضرت عمرؓ کی خدمت میں خط لکھا تھا کہ آپؓ یہ کچھ دیکھ رہے ہیں' اسے دیکھنے کے بعد ہی آپؓ اور وہاں کے جو ہمارے دوسرے بھائی ہیں' وہ بھی یقیناً محوِ حیرت ہو جائیں گے' عربوں نے کبھی یہ چیزیں دیکھی تک نہ تھیں چہ جائیکہ وہ ان کے مالک اور قابض ہو جائیں۔ خط میں لکھا تھا کہ اس سے بڑی چیز' جو تمہارے لیے باعثِ مسرت ہوگی' وہ یہ ہے کہ یہ تمام چیزیں ملک کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی تھیں' جہاں ان سپاہیوں کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا' وہاں یہ چیزیں ان کے ہاتھ آئیں' اور کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی' ہر چیز لا کر یہاں مرکز میں جمع کر دی۔ عمرؓ! تمہارے سپاہیوں کا یہ کردار اس مالِ غنیمت سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ آپؓ نے وہ خط پڑھا' آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہا کہ یہ لکھا ہے کہ تمہارے سپاہی اتنے دیانتدار ہیں۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں کچھ معلوم ہے کہ یہ سپاہی اس قدر دیانتدار اور امین کیسے بن گئے' یہ ان کا کیریکٹر ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں' وہ اس لیے ہیں کہ تم امین اور دیانتدار ہو۔ جس قسم کا سربراہ ہوتا ہے' اسی قسم کا اس کا لشکر ہوتا ہے۔ یہ لوگ' صاحب! ایک ایک فقرے کے اندر مسائل کے مسائل حل کر جاتے ہیں۔ تو ان سپاہیوں کے لیے مالِ غنیمت بھی وجہ کشش نہ رہی' جنگ کے لیے یہ جذبۂ محرکہ نہ رہا۔ قرآن کریم میں کہا تو ہے کہ بہت کچھ مالِ غنیمت سپاہیوں کو ملے گا مگر یہ انفرادی طور پہ نہیں ملے گا' وہ اس نظام کے حصے میں آئے گا تو یہ تقسیم کریں گے۔

قرآنی حکومت کا اقتدار خدا تعالیٰ کی دو صفات عزیز اور حکیم کا ہی مظہر ہے

کہا ہے کہ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا (48:19)۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں' آخر میں' جو اللہ کی صفات

آتی ہیں، وہ بڑی غور طلب ہوتی ہیں۔ جب یہ کہا کہ تمہیں بہت سی فتوحات حاصل ہوں گی تو غلبے کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عربی زبان میں عزت کے معنی ''قوت'' ہوتا ہے اور یہاں قرآن کریم! خدا کی صفت عزیز لایا ہے۔ یہ غلبہ ہے۔ جب مومن کے متعلق کہا کہ ''رضی اللہ عنہ'' وہ اس کے رنگ میں رنگے گئے، تو صاحبِ غلبہ ہو گئے۔ خود قوت ان کو مل گئی، یہ صاحبِ اقتدار ہو گئے لیکن ان کا اقتدار دھاندلی اور دھونس کا اقتدار نہیں ہے، استبداد کا اور لاقانونیت کا اقتدار نہیں۔ یہاں عزیز کے ساتھ حکیماً کہا ہے۔ حکمت Rationalism کو کہتے ہیں، جو چیز دلائل پر مبنی ہو، شواہد پر مبنی ہو، وہ غلبہ دھاندلی پر مبنی نہیں ہوتا، بلکہ ایسے غلبہ کو براہین و دلائل وبصیرت سے، شواہد کی رو سے استعمال کیا جائے گا۔ یہ ہے نظامِ اسلامی۔

عزیزانِ من! اگر قرآن کریم کی خدا کی دو صفتوں کو اکٹھا کر دیا جائے تو اسلامی نظام بن جاتا ہے کیونکہ اسے عزیز بھی ہونا چاہیئے اسے حکیم بھی ساتھ ہونا چاہیے۔ کہا ہے کہ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (48:20) اے جماعت مومنین! تمہارے حسنِ عمل کے نتیجے میں تمہیں بہت کچھ حاصل ہونے والا ہے۔ یہ جو تمہیں فوری مل گیا ہے یہ اس کا قلیل حصہ ہے۔ یہ خدا نے تمہارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ چلو! تمہیں غنیمت کثیر ملیں گے اور بہت جلدی بھی ملیں گے، یہ چیز تو جلدی مل جائے گی جو ابھی ہم نے کہی ہے۔ یہودیوں کے خلاف جو خیبر کی جنگ تھی یہ بہت بڑی جنگ تھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ (48:20) یہ مالِ غنیمت تک کی بات نہیں ہے۔ اس سے ہوا یہ ہے کہ اس کے بعد کسی کو اس کا حوصلہ نہیں پڑے گا کہ تمہارے خلاف ہاتھ بھی اٹھا سکے۔ تم ان بڑی بڑی دشمنوں کی طاقت سے محفوظ رہو گے تو یہ بہت بڑی چیز ہے کہ کوئی ان کے خلاف ہاتھ تک نہ اٹھا سکے اور یہ چیز کس طرح سے ہو؟ یہی نہیں کہ ان کی اتنی زیادہ قوتوں کو ایسا توڑ دیا جائے کہ ان میں ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی نہ رہے، یہ بات نہیں ہے بلکہ بات کچھ اور بھی ہے۔

جہاد کا جذبہ محرکہ دوسروں کو مغلوب کرنا نہیں ہوتا بلکہ خوف وحزن سے پاک معاشرے کی تشکیل ہوتا ہے

قرآنِ کریم میں یہ پچھلی ہی سورۃ، جو ہمارے سامنے گئی ہے، وہ سورۃ محمد، 47 ویں سورۃ ہے، اس کی چوتھی آیت میں یہ کہا تھا کہ حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (47:4) یہ تمہیں جنگ کا سلسلہ صرف اس وقت تک جاری رکھنا ہے جبکہ کیا الفاظ ہیں قرآن کریم کے جنگ میں! ایک تو جو فریقِ مخالف ہوتا ہے، دشمن ہوتا ہے، دشمن کی فوج ہوتی ہے، وہ ہتھیار رکھ دیتی ہے تو ان کی شکست ہوتی ہے، تو ایک تو صرف وہ فوج ہتھیار رکھتی ہے۔ کہا ہے کہ تمہیں یہ جنگ کا سلسلہ جاری رکھنا پڑے گا تا آنکہ لڑائی خود اپنے ہتھیار رکھ دے، عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا یہ ایجاز ہے کہ وہ کم از کم الفاظ کے اندر اتنی عظیم حقیقت کو بیان کر دیتا ہے۔ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے، دشمن تو رکھے گا ہی، حتیٰ کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے اور واقعی جنگ نے ہتھیار رکھ دیئے تھے۔ اس کے بعد کہا کہ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (48:20)۔ یہ بات جو

ہم کہہ رہے ہیں کہ اس کا نظام' ان قوانین کی اطاعت کا نتیجہ' ہمارے دعاوی کی صداقت کے ثبوت میں ان مومنین کے لیے نشانی بن جائے گا کہ واقعی خدا نے ٹھیک کہا تھا اور اگلی بات ہے' عزیزانِ من! کیا بات ہے جو ہوتی چلی آ رہی ہے کہ فتوحاتِ مسلسل' مغانم کثیر کی انتہا یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی طاقت نہ ہوگی جو تمہارے خلاف ہاتھ اٹھا سکے۔ یہ کیا چیز ہے؟ کہا کہ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا (48:20) وہ صراطِ مستقیم جس پر چلنے کی تم دعائیں مانگتے ہو' نماز کی ہر رکعت میں یہ ہے' وہ صراطِ مستقیم جس پہ ہم تمہیں چلائیں گے۔ اللہ اکبر!

صراطِ مستقیم پر نہ چلنے کا نتیجہ بنی اسرائیل جیسی مغلوب قوم کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست

آپ جماعت مومنین کی صراطِ مستقیم ملاحظہ فرمایئے' نماز کی ہر رکعت میں ہم اسے پڑھتے ہیں مگر ساری دنیا کے مغلوب و مفتوح ہم بیٹھے ہیں' ایک ارب کے قریب ہیں جو مسلمان مراکش سے انڈونیشیا تک ایک بحرِ ذخار' موجیں مارتا ہوا ہے' اس سمندر کے اندر' لا انتہا سمندر کے اندر' چڑیا جتنا ایک جزیرہ' اسرائیل نے اپنا نہیں ہے' غصب کیا ہے' دوسروں کے سہارے سے' دوسرے کی مدد سے' وہ قابض ہیں۔ یہ اتنا بڑا سمندر' ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا' بددعائیں دیتا ہے' گالیاں دیتا ہے مگر وہ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور ہر نماز میں' ہر نماز کی رکعت میں' ہم اھدنا الصراط المستقیم کی دعائیں بھی مانگ رہے ہیں' یہ صراطِ مستقیم ہے جو قرآنِ حمید نے بتایا ہے کہ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرًا [1] (48:21)۔ یہ تو تازہ تازہ باتیں ابھی ہم کہہ رہے ہیں کہ یہاں یہ بھی ہوگا اور اس کے بعد بہت کچھ ابھی اور باقی ہے۔

جماعت مومنین کی کامیابی کے محسوس نتائج کی نوعیت اور خدا کے غیر متبدل قوانین

قرآن کریم نے تو یہ کہا ہے کہ تم اس معاشرے میں یا اس جنت میں جو چاہو گے ہوگا' جو مانگو گے' ملے گا۔ انتہا ہے یہ لیکن وہ انتہا تو ہمارے پیمانے کی ہے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35) اب ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ کچھ اور ہے یعنی جو تم چاہو گے ہوگا' جو مانگو گے ملے گا' انسانی ذہن اس سے آگے جا نہیں سکتا۔ کہا کہ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔ اس سے زیادہ کیا ہے؟ کہا کہ کیا تمہارا ذہن' کیا تمہاری مانگ' کیا تمہاری آرزو! وہ تو بڑی محدود ہیں' ہم جانتے ہیں کہ زندگی کی اگلی ارتقائی منزل میں تمہاری کیا ضرورتیں' تمہاری کیا خواہشات ہوں گی۔ ہمارے پاس اس کے لیے بھی ہے۔ کیا بات ہے اس دینے والی کی: جو چاہو گے ہوگا' جو مانگو

---

[1] اس قریبی کامیابی کے علاوہ' اور بھی بہت سی فتوحات ہیں جن پر تم نے ابھی مقدرت حاصل نہیں کی لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے۔ ان کا وقوع بعد میں ہوگا۔ یہ اس لیے کہ اللہ نے ہر شے کے اندازے (قوانین) مقرر کر رکھے ہیں' اور ہر بات اُن اندازوں کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص:1200)۔

گے ملے گا اور اس سے زیادہ بھی ہمارے پاس کچھ ہے اور یہ ہماری اس دنیا کی زندگی کی مانگ' اس چھوٹے سے پیمانے کی ہے' جو ہمارے دماغ چلاتا ہے' وہ تو وہی ہے جو ہمارے ہاں بچے مٹی کا گھوڑا مانگتے ہیں اور یوں چابی سے چلنے والی موٹر مانگ لیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں تو ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ یہ آخری چیز نہیں ہے جو یہ مانگ رہے ہیں' اور ہم کہہ رہے ہیں کہ ہمارے پاس بیٹا! اس سے بھی زیادہ بہت کچھ ہے' جب بیٹا جوان ہوگا تو پھر سچ مچ کا موٹر ملے گا۔ ایک لفظ میں قرآن کریم انسانی زندگی کے متعلق کیا کہہ گیا ہے کہ زندگی نے ابھی یہاں رک نہیں جانا ہے' بچے نے بچہ ہی نہیں رہنا ہے' اس نے تو بڑھنا ہے' پھولنا ہے' پھلنا ہے' جوان ہونا ہے' ان کے تقاضے بڑھتے ہیں' اس کی خواہشات بڑھتی ہیں' اس کی مانگیں کچھ اور ہونی ہیں' ہمارے پاس اس کے لیے بھی بہت کچھ ہے۔ کبھی تو اس نظام پہ عمل پیرا ہو کر تو دیکھ۔

کہا کہ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا[1] (48:22) اسی مقام پر اگر تمہارے ساتھ یہ جنگ کرنے کے لیے آ جاتے' عجیب چیز ہے' یعنی مکے کے کنارے پہ بیٹھے ہیں' اتنا بڑا جید لشکر اُن کے پاس ہے مگر یہ نہتے ہیں' کہا یہ جو کردار جس کا ثبوت انہوں نے دیا ہے' اگر وہ یہاں جنگ کرنے کے لیے بھی آ جاتے' تو اتنی بڑی شکست کھاتے تو اُن کو کہیں جگہ نہ ملتی' پناہ نہ ملتی کہیں:

مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

''لڑتا ہے'' مگر انسان کا کردار لڑتا ہے' اس کا حوصلہ' اس کے ارادے لڑتے ہیں۔ تلوار کی ضرورت ہے لیکن یہ قوت بے پناہ ہوتی ہے صاحب! کہاں کہتا ہے قرآن حکیم یہ تو! کبھی انہوں نے' خود مکے والوں نے' دیکھ لیا تھا کہ ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ ذرا لڑنے کے لیے تم باہر نکلتے تو پتہ چلتا کہ کہیں ان کو پناہ نہ مل سکتی۔ اللہ اکبر! اور کہا کہ یہ کوئی ایسی ہنگامی سی بات نہیں کہ ہم نے اس واقعہ کے متعلق کہا ہے کہ ایسا ہو جاتا' کہیں اتفاقی طور پر اس قسم کے اسباب جمع ہو گئے تھے اور ایسا ہوا۔ کہنے لگے کہ یہ بات نہیں ہے: سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (48:23) یہ تو شروع سے خدا کی ایک روش چلی آ رہی ہے اور اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی۔ آپ کو یاد ہے' میں وہ جیسے Law کی Definition' قانون کی تعریف' ان کے ہاں انگریزی زبان میں ہے۔ یہ Scientific چیز ہے۔ وہ اصل میں Law تو ان کے ہاں ہے ہی' جو سائنس کے قانون کے مطابق چیز ہوگی' تو اس کی Definition یہ ہے کہ If-Then یعنی اگر یہ ہو تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا' یہ تو ہوا' اور اس کے آگے انہوں نے جو Law بننے کے لیے کہا وہ ہے Always۔ If-Then[2] کہ ہمیشہ ایسا ہوگا مثلاً پانی کو آگ پہ رکھو گے تو پانی گرم ہو گیا۔ یہ ہنگامی بات نہیں ہے۔ جب بھی رکھو گے ایسا ہوگا تو یہ

---

1. اگر یہ مخالفین تم سے جنگ کرتے تو شکست کھا کر بھاگ جاتے۔ پھر ان کا نہ کوئی حمایتی ہوتا نہ سرپرست۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص: 1200)
2. If ----- Then ----- Always

Law بن گیا۔ کہا کہ یہ سب کچھ جو ہم نے اوپر کہا ہے یہ ہنگامی اور اتفاقی بات نہیں ہے' If-Then تو بات ہوگئی کہ اگر اس قسم کی سیرت وکردار کا مظاہرہ کرو تو کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا اور یہ بات Always (ہمیشہ) سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے' ہمیشہ ایسا ہوگا یہ **سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیۡ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلُ وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِیۡلًا** (48:23) یہ کچھ محض ہنگامی یا اتفاقی طور پر نہیں ہو رہا۔ خدا کے ان قوانین کے مطابق ہو رہا ہے جو شروع سے اسی طرح چلے آ رہے ہیں اور وہ اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

قرآنِ حکیم میں کلمٰت اللہ اور سنة اللہ کا مفہوم

قرآنِ کریم میں ایک تو کلمٰت اللہ کہا ہے اور ایک سنة اللہ کہا ہے۔ دونوں کے متعلق کہا کہ اس میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ کلمات تو آپ کہیے کہ Law in word (قانون الفاظ کی شکل کے اندر) ہے اور سنت کہیں گے کہ وہی جو Law ہے' جب وہ Operate ہو جائے' عملاً نافذ ہو جائے' اسے سنت کہتے ہیں۔ تو یہ قانون جو ہم نے اوپر بتایا ہے' اس کا یہی نتیجہ ہمیشہ نکلے گا۔ یہ سنت اللہ ہے۔ ترجمے تو ان چیزوں کے ہو ہی نہیں سکتے' روش بھی کہیں تو خدا کی روش سے کچھ اور مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم کی اصطلاحات کے ترجمے نہیں ہوتے' یہی الفاظ رہنے چاہیے کہ (مثلاً) یہ خدا کی سنت ہے یعنی یہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا ہے اور تم کبھی اس میں تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ Law (قانون) تو کہتے ہی اس کو ہیں جس میں کبھی تبدیلی نہ ہو جائے۔

مظلومیت کے سلسلہ میں جہادِ اسلامی کی نوعیت کہ اللہ تم سب کے کاروبار پر نگاہ رکھتا ہے

کہا ہے کہ **وَهُوَ الَّذِیۡ كَفَّ اَیۡدِیَهُمۡ عَنۡكُمۡ وَاَیۡدِیَكُمۡ عَنۡهُمۡ بِبَطۡنِ مَكَّةَ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَكُمۡ عَلَیۡهِمۡ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا** (48:24)۔ فتح مکہ کے متعلق بھی یہ ہے کہ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تم غالب آ رہے تھے' ہم نے تمہارے ہاتھ روک دیئے کہ بس غالب آنے کے بعد جو سپاہی دشمن کی چھاتی پہ بیٹھا ہو' اس کو کہنا کہ "بس کرو" اس تعمیل کے لیے بڑے ہی دل گردے کی ضرورت ہے۔ کوئی اور جذبہ نہ ہو' ایک جذبہ تو یہ ہوتا ہے کہ جس میں وہ دشمن بھی تو اس کی جان لینے کے لیے انتہائی کوشش کر رہا تھا' وہ محبت سے گلے ملنے تو نہیں آیا تھا' تو اگر اس کو مغلوب کر دیا ہے تو اس کے بعد تو ویسے اس کا حق بھی پہنچتا ہے کہ اس کو ایسے وقت میں قتل کر دو جب اس کو غلبہ حاصل ہو جائے۔ اسے کہنا کہ تم نے اُسے کچھ نہیں کہنا' مقصد انسانیت کی جان لینا نہیں ہے' مقصد سرکشوں کی اس قوت کا توڑنا ہے جس سے مظلوموں اور کمزوروں کے خلاف اپنی قوت استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کی رو سے جنگ کا مقصد جب اس کی قوت ٹوٹ گئی' مقصد حاصل ہو گیا' پھر اس کے گلے پہ چھری پھیرنے کا کیا فائدہ!! وہاں جو روک دینا یہ ہے' مومن کا کردار کہ جہاں کہا جائے' وہاں رک جائے۔ یہ بڑی بات ہے **بَعۡدِ اَنۡ اَظۡفَرَكُمۡ عَلَیۡهِمۡ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرًا** (48:24) حالانکہ تمہیں اُن پر کھلا ہوا غلبہ حاصل تھا۔ ہر بات

کے بعد یہ چیز ہے کہ ہم دیکھ رہے تھے کہ تم کیا کر رہے تھے۔ دیکھنے والی آنکھ ایک ہے۔ اسی کے ہاں سے تو اس کا بدلہ ملتا ہے۔

بیت الحرام کی تعظیم وتکریم کے باوجود قریش نے مخالفت کی انتہا کر دی

کہا ہے کہ هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ (48:25) ہمیں معلوم ہے کہ یہ جو تمہارے مخالفین ہیں' یہ کیا کچھ تمہارے خلاف نہیں کرتے رہے۔ وہ مسجد حرام' وہ بیت اللہ' وہ کعبہ' کہ خود عربوں کی اپنی روایات کے مطابق اس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے' وہ زمانہ قبل از اسلام میں بھی یہ جو قریش تھے' کعبہ اور اس کے احاطے کو ایک امن کی جگہ قرار دیا کرتے تھے' وہ اس زمانے میں بھی اسے بیت الحرام کہتے تھے' حرمت کا مقام کہتے تھے جس کی تعظیم وتکریم واضح ہے' سب یہاں آتے تھے' ایک ذی الحج کی تقریب ہی نہیں' بلکہ چار مہینے کے لیے انہوں نے جنگ بند کی ہوئی تھی۔ یہ چیز پہلے سے چلی آ رہی تھی صاحب! کہا کہ ان روایات کے حامل جو قریش تھے اور یہ عرب اپنی روایات کے بڑے پابند تھے' تمہارے معاملے میں' قرآن کریم کہتا ہے کہ انہوں نے نہ کوئی رشتہ داری کے اصول کو قائم رکھا' نہ اپنی روایات کو باقی رکھا' تمہارے لیے مخالفت کی انتہا کر دی' وہ اس مسجد حرام تک آنے کے راستے میں' بھی رکاوٹیں بن گئے جہاں اس سے پیشتر کسی کو یہ نہیں روکتے تھے۔ انہوں نے مخالفت کی انتہا کی تھی' حتیٰ کہ تم اپنے ساتھ تحائف لائے ہوئے تھے' جب حج کرنے کے لیے آتے تو وہاں بہت بڑا اجتماع ہوتا' جبکہ مکے والوں کے پاس تو اپنے کھانے کو بھی کچھ نہیں ہوتا تھا۔

حج کے موقع پر سامانِ خورد ونوش کے انتظامی امور کی وضاحت

قرآن حکیم نے یہ کہا کہ اتنے مہمان جو یہاں آ جائیں گے' تو ان کی روٹی کا انتظام کیا ہوگا۔ ان آنے والوں سے کہا کہ تم اپنے ساتھ اپنا کھانے کا انتظام لاؤ اور یہ آج بھی اس قسم کے علاقوں میں یہ گوشت ہی سب سے بہترین رزق کا سامان ہوتا ہے اور پھر وہ اس قسم کا سامان بصورت اونٹ لاتے تھے۔ یعنی یہ ہے حکمت کہ جس کو کہیں اٹھا کر لانے کی' لادنے کی' Trucks کی' بھی ضرورت نہ ہو' جو اس میں لاد کر لائے۔ تو کہا کہ ٹھیک ہے ان اونٹوں کو لے آؤ' ضرورت سے زائد کچھ اونٹ ساتھ رکھ لیا کرو' جب ادھر آؤ تو اس پہ مالِ تجارت لادلیا کرو' یہ وہاں جا کر جب مالِ تجارت تم ان پہ سے اتار دو گے تو یہ فالتو ہو جائیں گے' چلتا پھرتا ہوا خوراک کا ایک جہاز تمہارے پاس ہے' اس کو ذبح کرو اور چار چار دن تک کھاؤ۔ کیا انتظام ہے صاحب! وادیٔ غیر ذی زرع میں اور اب بھی یہ ہمارے ہاں ان پٹھانوں کے اندر بھی یہ ہے کہ اگر گوشت مل جاتا ہے تو وہ روٹی موٹی کی کوئی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ کہا کہ یہ جو تمہارا ساتھ دوسرے لوگ بھی دے دیتے تھے کہ آپ وہاں جانا تو ہماری طرف سے یہ چاول لے جاؤ بھئی! یہ تھوڑے سے لاد کر ان کے اوپر' ہماری طرف سے یہ کچھ گھی ہے' اسے

لے جاؤ۔ تو یہ سارا کچھ وہاں آ کر تو وہ ان کا کھانے کا انتظام تھا جسے آپ قربانی کہتے ہیں۔

مکے پر چڑھائی کرنے سے روکنے کی بنیادی وجہ

کہا کہ تمہارے ہاں کے یہ تحائف' جو تم ساتھ لا رہے تھے' وہاں تک پہنچنے کے لیے انہوں نے انہیں بھی روک دیا تھا کہ وہاں نہیں جانے دیں گے۔ وہاں ایسی حالت میں بھی ہم نے تمہیں کیوں روک دیا تھا؟ مکے میں ابھی مسلمان موجود تھے جو ہجرت کر کے ابھی وہاں نہیں گئے ہوئے تھے۔ مختلف جگہ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں۔ کیا بات ہے اس روکنے کی! کہا کہ **وَلَوۡلَا رِجَالٌ مُّؤۡمِنُوۡنَ وَنِسَآءٌ مُّؤۡمِنٰتٌ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡهُمۡ اَنۡ تَطَئُوۡهُمۡ فَتُصِيۡبَكُمۡ مِّنۡهُمۡ مَّعَرَّةٌ ۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ** (48:25) اگر اس صورت میں تم مکے پہ چڑھائی کر دیتے تو وہاں تو یہ مومن مرد عورت مختلف مقامات کے اندر تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان کی دشمنی کی وجہ سے وہاں وہ بیچارے ابھی چھپے ہوئے ہی بیٹھے ہوں' انہوں نے اس کا اظہار بھی نہ کیا ہو' لیکن بہر حال مختلف مقامات پہ تھے۔ تم حملہ کرتے۔ اس حملے میں تو پھر یہ تفریق نہیں کی جاتی کہ اس مقام پہ گولہ نہ پھینکو' اس میں اپنے بستے ہیں تو وہ تو پھر سب زد میں آ جاتے ہیں۔ کہا اگر یہ صورت پیدا ہوتی اور وہ تمہاری زد میں آ جاتے اور ان کا نقصان ہوتا' عزیزانِ من! قرآن کریم کا اعجاز ہے' الفاظ ہی نہیں بلکہ وہ تو جس کو Pronoun یا ضمائر کہتے ہیں' جس کو حرف کہتے ہیں' وہ تو اس میں بھی وہ بات کہہ جاتا ہے صاحب! جو فقروں میں نہیں کی جا سکتی۔ کہا کہ **فَتُصِيۡبَكُمۡ مِّنۡهُمۡ** (48:25) بغیر جانے ہوئے یعنی اِن کو نقصان پہنچتا۔ وہ جو مکے میں رہنے والے مسلمان تھے' یہ نہیں کہا کہ اُنہیں نقصان پہنچتا۔ کہا کہ اس سے تمہیں نقصان پہنچ جاتا' ان کا نقصان تمہارا نقصان ہے۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہے کہ کسی ایک مردِ مومن کا نقصان پوری جماعت مومنین کا نقصان ہوتا ہے۔ یہ "کم" دیکھیے کہہ رہا ہے کہ اگر تم ایسے حملہ کر دیتے بغیر جانے ہوئے' اگر وہاں انہیں نقصان پہنچتا' ہم یہی کہتے' دنیا کا ہر مورخ' ادیب یہی کہتا' کہ انہیں نقصان پہنچ جاتا۔ یہ الگ بات ہے' پھر تم یہ کہتے کہ تمہیں اس کا بہت افسوس ہوتا۔ قرآن کریم یہ انداز اختیار نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ اگر تم یہ کچھ کرتے تو تمہیں اس سے جو نقصان پہنچتا' اس کا تمہیں بعد میں بڑا افسوس ہوتا۔ آپ نے دیکھا قرآن کریم کیا بات کر جاتا ہے' جبھی میں نے کہا تھا کہ قرآنِ حکیم کے کسی لفظ سے بھی یونہی آگے نہیں گزر جانا چاہیے' کھڑے ہونا چاہیے کہ یہ بات اس نے **فَتُصِيۡبَكُمۡ** کیوں کہا؟ آگے کہا کہ **لِيُدۡخِلَ اللّٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ** (48:25) ہم نے جو تمہیں اس وقت روک دیا تھا کہ حملہ نہیں کرنا' وہ اسی لیے تھا کہ خدا ان مومنین کو' تمہیں بھی اور انہیں بھی اپنے سائبانِ رحمت کے نیچے رکھنا چاہتا ہے تو بچا لیا ہم نے' انہیں بچا لیا ہم نے کہ تمہارے حملے کی وجہ سے نادانستہ ہی جو انہیں تکلیف پہنچتی' اس سے بچا لیا۔ تمہیں اس لیے بچا لیا کہ ان کے اس نقصان کے بعد تم اسے اپنا نقصان

سمجھتے اور اس پر تمہیں حرفِ ندامت ہوتا۔ اس سے اللہ نے تمہیں بچالیا۔ یہ اس کی رحمت ہے۔ کہا کہ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (48:25) ہاں اگر ایسی صورت ہوتی کہ ان کو تم وہاں جو مومنین ہیں، جو تمہارے مخالف نہیں تھے، دشمنوں میں الگ کر دیتے، ایک طرف، تو پھر یہ ٹھیک تھا کہ باقیوں کے ساتھ تم جنگ کرتے، لیکن ایسی صورت تو نہیں پیدا ہوئی تھی، وہ تو انہی کے اندر بکھرے ہوئے تھے اس لیے یہ کیفیت وہاں پیدا ہو جاتی تو یوں ہم نے روکا تھا۔

عزیزانِ من! ایک ہی آیت اور لے لیتا ہوں۔ کہا کہ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمًا (48:26)۔ یہ قریش تو ابھی اپنی جاہلیت کے زمانے میں تھے، اسلام جو نہیں لائے تھے، ان کے دلوں کے اندر جو جذبات ابھرتے تھے، وہی جاہلیت کے زمانے کے جذبات تھے، ان کی دشمنیاں، ان کی جنگیں، ان کی صلح، وہ ساری ان جذبات کے تابع تھی۔ یہاں حـــمیة کہا ہے، حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ (48:26) تمہاری حالت یہ نہیں تھی، تمہارے اندر تو ایک انقلاب آ گیا ہوا تھا۔

ایمان لانے کے بعد تربیت کے مراحل سے گزرنے کی اہمیت

اب یہ بات ہے کہ ان کے اس قسم کے جذبے کا جواب تو یہ ہے کہ یہ بھی تو عرب تھے، یہ بھی تو قریش تھے، جو ان کے مقابل میں تھے جو اسلام لے آئے ہوئے تھے، کہا کہ دیکھا جاہلیت کے اندر رہنے میں اور اسلام لانے کے بعد فرق کتنا ہے! وہ اسی جذبے کے ماتحت یہ سب کچھ کرتے تھے۔ تم ان کا جواب ان کے ہتھیاروں سے نہیں دے سکتے تھے کہ اسلام سے تمہاری تربیت اور طرح کی ہوئی ہے۔ یہ تربیت کہ دشمن کی چھاتی پہ بھی چڑھ کر اس کا گلا کاٹنے کے لیے اگر کہا ہے کہ "رک جاؤ تو رک جانا" جاہلیت میں یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہاری تعلیم و تربیت اس طرح کی ہوئی تھی کہ تم ان کے اس قسم کے رویے کے ردّعمل کے طور پر وہ روش اختیار نہیں کر سکتے تھے جو وہ کر رہے تھے صاحب! تو اس سے تو دل میں ہونا چاہیے تھا کہ صاحب خواہ مخواہ خدا نے ہمارے اوپر یہ پابندی لگا دی، موقع آیا ہوا تھا، ہاتھ میں دشمن تھا، مکہ سامنے تھا، ہم تو دبا کے ان کی ہڈیاں تک توڑ دیتے۔ کہنے لگے کہ تمہارے اسلام کی تعلیم نبوی ﷺ یہ تھی کہ تمہارے دلوں میں یہ بھی خیال نہیں پیدا ہوا کہ صاحب! کیا کر دیا۔ کہا کہ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ (48:26) ان کے اس قسم کے رویے کے ردّعمل میں بھی تمہارے دل میں سکون اور سکینت تھی، اضطراب نہیں تھا، جوش نہیں تھا، حمیة جاہلیہ نہیں تھی، اس لیے کہ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (48:26)۔ یہ جو تقویٰ کا لفظ ہے، یہ بڑا جامع ہے قرآن حمید میں۔ کہا کہ وَاَلْزَمَهُمْ (48:26) چپکا دی تھی بات، لگا دی تھی تمہارے قلب کے ساتھ کہ خدا پہ

تقویٰ کرو جو اس نے فرائض عائد کیے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے۔ یہ بات ہر وقت چپکی ہوئی تھی تمہارے قلوب کے ساتھ اور واقعی تم ہی اس کے زیادہ مستحق تھے جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا ہے باقی رہا یہ کہ جو کچھ ایسے مواقع پہ بھی اس قسم کی بات جو بظاہر نظر آتا ہے کہ ہمارے لیے نقصان کا باعث ہے بالکل نہیں خدا جانتا ہے کہ کون سی بات تمہارے لیے نقصان کا موجب ہے اور کون سی بات فائدے کا موجب ہے۔

سورۃ الفتح کی آیت 26 تک ہم آ گئے وقت بھی ہو گیا ہے اور میں نے یہ درس بھی روک دیا ہے کہ آگے ایک اور بڑی اہم بات آتی ہے۔ یہ حضور ﷺ کا ایک خواب ہے جس کے متعلق قرآنِ حمید نے یہ کہا ہے کہ اس کو سچا کریں گے تو وہ چیز اہمیت سے سمجھنے کی ہے۔ تو 27 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ شکریہ!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھٹا باب: **سورۃ الفتح** (آیت 27 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1982ء کی 14 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الفتح کی آیت 27 سے ہو رہا ہے: (48:27)۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہ سلسلہ کلام جسے عام طور پر صلح حدیبیہ کہتے ہیں سے متعلق ہے۔ نبی اکرم ﷺ صحابہؓ کی ایک جماعت کے ساتھ عمرہ کرنے کے لیے مدینہ سے مکہ تشریف لائے تھے اور قریش نے وہاں روک دیا تھا۔ وہاں یہ خبر بھی اڑی کہ غالباً حضرتِ عثمانؓ ' جو وہاں سفارت کے لیے گئے تھے' کو انہوں نے گرفتار کرلیا ہے۔ نظر آتا تھا کہ قریش کی نیت کچھ خراب ہوگئی ہے' ان کے گھر میں یہ گئے ہوئے تھے' اسلحہ بھی ساتھ نہیں تھا' گئے تو تھے صرف عمرہ کرنے کے لیے۔ یہ بڑا نازک وقت آ گیا تھا۔ اس میں پھر ایک درخت کے نیچے تجدید بیعت کی گئی۔ قرآن کریم میں یہ ساری چیزیں سورۃ الفتح میں آئی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ وہاں ان سے پھر صلح ہوئی۔ یہاں تک میں رکتا ہوں کہ آگے جو بات ہے وہ بڑی کچھ نازک سی آ رہی ہے۔ 27 ویں آیت ہے۔ کہا ہے کہ **لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوۡلَهُ الرُّءۡيَا بِالۡحَقِّ لَتَدۡخُلُنَّ الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيۡنَ مُحَلِّقِيۡنَ رُءُوۡسَكُمۡ وَمُقَصِّرِيۡنَ لَا تَخَافُوۡنَ فَعَلِمَ مَا لَمۡ تَعۡلَمُوۡا فَجَعَلَ مِنۡ دُوۡنِ**

ذٰلِکَ فَتۡحًا قَرِیۡبًا ۔یہ سورہ الفتح کی 27 ویں آیت ہے۔ یہ بات ہی یہاں سے شروع ہوئی کہ خدا تیرے خواب کو حق کے ساتھ سچا کر دکھائیں گے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا صحیح طریق نیز روایات کے مطابق نبی اکرم ﷺ کے خواب کی تفسیری نوعیت

عزیزانِ من! میں پھر عرض کرونگا کہ آپ قرآن کریم کے نسخے ساتھ لایا کریں' الفاظ پہ نگاہ رکھا کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے' یونہی کانوں سے سن لینے سے بات واضح نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ ذہنی دلچسپی کے لیے ہی شاید تشریف لے آتے ہیں۔ مجھے معاف رکھیے گا تلخ نوائی میں' قرآن حکیم کو سمجھنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ الفاظ سامنے ہونے چاہئیں۔ یہ ایک بڑا اہم مقام ہے جس کے متعلق عام طور پہ بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں کہا یہ گیا ہے' جو عام ترجمہ ہے' کہ رسول اللہ ﷺ کو جو خواب آیا تھا' اس خواب کو سچا کر دکھایا۔ یہ بھی معنی ہیں اگر امر کے لحاظ سے اس کے معنی ''سچا کر دکھائے گا'' بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ مسجد حرام میں' کعبہ میں' نہایت امن کے ساتھ داخل ہونگے اور پھر وہ مناسک حج یا عمرہ ادا کریں گے' وہی جو بالوں کو ترشوانا یا سر کا منڈانا' یہ مناسک میں داخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ لَقَدۡ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوۡلَہُ الرُّءۡیَا (48:27) کے اگر یہ عام معنی ہیں کہ یہ جو خواب ہے خدا نے اسے سچ کر دکھایا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ایک خواب کا ذکر ہے۔ کہا ہے کہ وَ مَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ (17:60) یہ خواب جو تجھے دکھایا گیا ہے' وہ لوگوں کے لیے طرح طرح کی آزمائشوں کا باعث بن گیا ہے یا فتنہ پردازیوں کا باعث بن گیا ہے۔ یہاں خواب کا ذکر ہے۔ یہی ایک مقام ہے جہاں حضور ﷺ کے خواب کا ذکر ہے۔ اب یہی اس خواب کے متعلق بھی جو تفاسیر چلی آتی ہیں' وہ مختلف ہیں۔ عام طور پہ کہا گیا ہے کہ وہ جو معراج [1] کا واقعہ تھا' وہ آپ ﷺ نے ذکر کیا تو ان دشمنوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ رات کو یہ پل بھر میں یہاں سے پہلے بیت المقدس گئے' وہاں سے آسمانوں پہ گئے' پھر واپس آئے' پھر مدینے آئے۔ جیسا کہ معراج کے واقعہ کے متعلق عام مشہور ہے کہ اس کا انہوں نے مذاق اڑایا تھا۔ یہ ایک چیز آئی۔ دوسری بات کسی خواب کے متعلق اور ہے' یہ جو عمرہ کے لیے مکے میں حضور ﷺ تشریف لائے ہیں تو یہ سن 6 ہجری کا واقعہ ہے' ذیقعد کا مہینہ تھا۔ حضور ﷺ نے مدینہ میں یہ فرمایا' جیسا کہ یہ روایات میں باتیں آتی ہیں کہ میں نے خواب دیکھا ہے' ہم مکے میں داخل ہو رہے ہیں' عمرہ کر رہے ہیں' اور اس کے بعد حضور ﷺ تیار ہو گئے اور جب آپ ﷺ تیار ہوئے تو صحابہؓ کی ایک جماعت بھی اس سعادت کو حاصل کرنے کے لیے ساتھ تیار ہو گئی کہ حضور ﷺ کی معیت میں عمرہ نصیب ہو جائے گا۔ آپ کو یاد ہے کہ جب سے انہوں نے ہجرت کی تھی' قریش نے ان کے راستے بند کر دیئے تھے' وہاں کعبے تک آنے ہی نہیں دیتے تھے۔ یہ

---

[1] واقعہ معراج کے حقائق کو دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو: پرویزؒ: ''مطالب الفرقان فی دروس القرآن'' (زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق) سورۃ بنی اسرائیل' ادارہ طلوعِ اسلام' 25 بی گلبرگ' لاہور' 2004' ص ص۔ 24 تا 74۔

تو اگلی بات ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو پھر یہ سارے معاملات حل ہو گئے لیکن یہ اس سے پہلے کی بات ہے کہ وہ آنے ہی نہیں دیتے تھے تو انہوں نے غنیمت سمجھا کہ حضور ﷺ کی معیت میں ایک عمرہ کر لیا جائے۔ چنانچہ صحابہؓ کی ایک جماعت ساتھ ہو گئی۔ عام روایات میں ہے کہ قریباً چودہ سو کے قریب صحابہؓ ساتھ تھے۔ عام روایتوں کے مطابق وہاں آئے کہ قریش نے روک دیا اور وہاں یہ سب کچھ ہوا جو میں نے پہلے عرض کیا ہے۔ ایک صلح نامہ لکھا گیا۔ یہ سارا کچھ بخاری شریف کی ایک حدیث میں بھی ہے اور دوسرے مقامات میں بھی ہے کہ وہ صلح نامہ لکھا گیا کہ اس سال تو باہر سے ہی واپس تشریف لے جائیں گے' حضور ﷺ کو مکے میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا' اگلے سال آپ ﷺ آئیں گے' تو اس سال عمرہ کی یا حج کی اجازت دی جائے گی اور اس صلح نامہ کے اندر یہ دوسری شرائط ہیں۔ یہ بڑا تفصیلی صلح نامہ لکھا ہوا ہے۔ اس کے تو معنی یہ ہوئے کہ اس سال یہ جو خواب تھا یہ پورا نہیں ہوا' چنانچہ وہی جو احادیث کی کتابوں میں وہاں تفاصیل لکھی ہیں' ان میں یہ بھی ہے کہ وہاں یہ اعتراض کیا گیا کہ حضور ﷺ نے تو یہ کہا تھا کہ خواب آیا ہے اور اس کی رو سے ہم مکے میں داخل ہونگے' عمرہ کریں گے اور پھر واپس آئیں گے اور یہاں تو وہ عمرہ نہیں کیا گیا' مکے میں بھی ہم داخل نہیں ہوئے' اس سے ایک منزل پہلے ہی روک دیئے گئے ہیں اور اسی طرح سے ہم واپس جا رہے ہیں تو پھر اس خواب کے متعلق کیا ہوا۔

روایت کی رو سے میں یہ عرض کر رہا ہوں' یہ میں نہیں کہہ رہا' نہ میں اس کی تفسیر بیان کر رہا ہوں بلکہ یہ ہے کہ یہ چیزیں آپ کے ہاں جن روایات کی رو سے کہا جاتا ہے' قرآنِ کریم سمجھا جائے گا' اس میں یہ چیز آئی ہوئی ہے' تو وہیں یہ اعتراض ہوا کہ آپ ﷺ کا وہ جو خواب تھا' وہ تو سچا نہیں ہوا' واپس جا رہے ہیں۔ تو اسی میں یہ لکھا ہے' میں بار بار دہرا رہا ہوں کہ میں وہ روایات بیان کر رہا ہوں' یہ نہ کہیے کہ میں کہہ رہا ہوں' اسی میں یہ لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال یہ واقعہ ہو جائے گا۔ میری حمیت تو اجازت نہیں دیتی کہ میں اس کو صحیح مانوں' اسی سال کی بات ہے کہ تیاری ہی نہیں کی' بلکہ اعلان کیا' صحابہؓ ساتھ ہوئے' وہاں سے چل آئے ہیں' یہاں آ کر ایک منزل پہلے قیام فرمایا ہے' قربانی کے جانور یا جو تحفے ہوتے ہیں' وہ ساتھ لائے ہوئے ہیں۔ تو یہ بات جو ہے حضور ﷺ کی شان سے بہت بلند ہے کہ آپ ﷺ یہ فرمائیں کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ وہ اسی سال ہوگا۔ معاذ اللہ! خود روایت یہ بات کہہ رہی ہے کہ حضور ﷺ کبھی یہ بات نہیں کہہ سکتے لیکن اسی بخاری شریف میں' جس میں یہ ساری لمبی تفصیل دی ہوئی ہے کہ انہوں نے کیسے روکا' پھر کیسے آپ ﷺ نے بیعت لی' کس طرح سے پھر صلح نامہ لکھا گیا' کیسے اس پہ دستخط ہوئے' کس طرح یہ اعتراضات ہوئے' کیسے حضور ﷺ نے جواب دیئے' یہ ساری روایات جو بخاری شریف کے اندر ہے اسی روایت کے ساتھ ہی ایک روایت ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ اسی سال قریش کے ساتھ حضور ﷺ مکے میں تشریف لے گئے' تین دن وہاں رہے' عمرہ کیا' سب کچھ ہوا' اور پھر واپس آئے' وہیں اسی کے ساتھ دونوں روایتیں ایک ہی مقام پہ ہیں۔ ایک باب الصلح ہے' دوسرا باب الشرائط ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی روایتیں ہیں'

یہ دور دور بھی نہیں ہیں کہ ڈھونڈنی پڑیں' دونوں متضاد ہیں اتنا تاریخی تضاد ہے' ایک میں یہ ہے کہ انہوں نے اجازت نہیں دی' یہ اس قسم کا صلح نامہ لکھا گیا' اعتراضات ہوئے' آپ ﷺ باہر سے باہر ہی واپس آ گئے۔ اسی میں یہ لکھا ہوا ہے کہ وہاں یہ چیز طے ہوئی' قریش نے اجازت دی' آپ ﷺ صحابہؓ کے ساتھ تشریف لے گئے' عمرہ کیا' تین دن مکے میں رہے' پھر واپس آئے۔ اب اس روایت کی رو سے تو بات یہ ہوگئی کہ جو خدا نے کہا ہے کہ اس نے تیرے خواب کو سچ کر دکھایا' ٹھیک ہے' سچ کر دکھایا۔

عزیزانِ من! اگر دوسری جو روایت ہے' اس کی رو سے یہ ہوگا کہ یہ تیرے خواب کو سچ کر دکھائے گا' آپ کے پاس تاریخ کا Material (مواد) ہے وہ یہی ہے۔ دونوں میں سے کونسی بات مانی جائے' کونسی نہ مانی جائے۔ اب اس کے بعد ہمارا ان آیات کے متعلق اپنا ہی قیاس ہوگا جو ہم اندازہ لگائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سال انہوں نے اجازت نہیں دی اور اللہ تعالیٰ نے کہا کہ کوئی بات نہیں' ہم سچ کر دکھائیں گے اور یہ ٹھیک ہے کہ اگلے ہی سال پھر مکہ فتح ہوا اور فتح مکہ کے بعد تو پھر جس شان و شوکت کے ساتھ آپ وہاں داخل ہوئے' وہاں عمرہ بھی کیا' اس کے بعد تو وہ اس اسلامی مملکت کا مرکز جیسے پہلے تھا' بن بھی گیا' یہ سارا کچھ اگلے سال ہوا۔ اگر یہ کہا جائے تو وہ یہاں یہ ہوگا کہ خدا تیرے اس خواب کو سچ کر دکھائے گا۔ اگلے سال یہ بات ہوئی اور اگر جو پہلی روایت ہے کہ اسی سال یہ ہوا تھا' تو پھر یہ ہوگا کہ خدا نے تیرے خواب کو سچ کر دکھایا۔

ہمارے ہاں ان شاء اللہ کے الفاظ کے استعمال کی نوعیت اور خواب کے لیے تاریخ کا تضاد

یہاں جو ان شاء اللہ آتا ہے' وہ ان شاء اللہ تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کس وقت بولتے ہیں یعنی جب پہلے ہی بات کرتے وقت' وعدہ کرتے وقت' یہ نیت ہو کہ میں نے اس کہے یہ کرنا نہیں ہے کہ (مثلاً) چار بجے آؤ گے' جی! ان شاء اللہ' اگر خدا نے چاہا۔ نہیں آئے بھئی! تم نے چار بجے آنے کے لیے کہا تھا۔ کہا کہ جی! میں نے یہ کہا تھا کہ اگر خدا چاہے گا تو میں آؤں گا' خدا نے نہیں چاہا' میں نہیں آیا' یعنی ہمیں یہ عادت ہوگئی ہے کہ اپنی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر پہ رکھ دی جائے۔ عام حالات میں تو یہ صورت ہے کہ

کارِ بد تو خود کریں لعنت کریں شیطان پر

کہ شیطان نے بہکا دیا جی! چلیے' خود ذمہ دار نہیں ہے۔ سارا دن یہ جتنے بھی کارِ بد کیے جاتے ہیں' اس کے ساتھ ذمہ داری اس کے سر پہ دے دی جاتی ہے۔ وہ جو پتھر وہاں مارے جاتے ہیں' اس کے ذمے ہیں اور اگر کوئی معاملہ ادھر آیا تو خدا کے ذمہ کہ میرا تو آنے کا اپنا پکا ارادہ تھا لیکن اب خدا نے نہیں چاہا' تو میں کیا کروں۔

ان شاء اللہ کے متعلق عربی زبان کے قاعدے کی رو سے' محاورے کی رو سے' یہ چیز ہے کہ وہ یہ الفاظ تاکید کے لیے' تیقن کے لیے

بولتے ہیں' اور اس کے معنی ہوتے ہیں کہ کیونکہ جو کچھ میں نے کہا ہے' یہ خدا کے قانون کے مطابق ہے' اس لیے یہ ضرور ہو کر رہے گا۔ یہ اس کے معنی ہیں۔ تو یہ یقینی چیز ہے کہ یہ جو آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایسا ہوگا' ایسا ہو کر رہے گا' یا ایسا ہو کر رہا ہے' دونوں میں سے جو بات بھی ہے۔ اب یہ بات تاریخ کی آ گئی کہ فی الواقعہ کیا ہوا تھا اور آپ کی تاریخ کے متعلق یہ جو میں نے کہا ہے کہ کہتے ہیں کہ یہ جو احادیث کی کتابوں میں ہے' یہ تاریخ بڑی قابلِ یقین ہے اور عام جو تاریخ ہے اس میں کچھ بات یقینی بھی ہو سکتی ہے اور غیر یقینی بھی۔ تو یہ ایک کتاب جو صحیح ترین مانی جاتی ہے وہ آپ کو پتہ ہے کہ کچھ کتابوں کو صحیح ترین مانتے ہیں۔ اس میں سب سے صحیح اصح الکتب بعد کتاب اللہ' بخاری شریف ہوتی ہے۔ اس میں یہ دو روایتیں ایک دوسرے کے ساتھ لکھی ہیں' جو متضاد ہیں' اور یہ کوئی واقعہ نہیں کہ عقیدے کی بات ہے' قیاس کی بات ہے' تاریخی واقعہ لکھا ہے' ایک واقعہ لکھا ہے کہ اسی سال حضور ﷺ مکے میں رہے' تین دن وہاں رہے' عمرہ کیا اور کامیاب وکامران وہاں سے واپس آئے' ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ انہوں نے روک دیا اور وہاں صلح نامہ ہوا' مکے میں بغیر داخل ہوئے واپس آ گئے' بغیر عمرہ کیے' واپس آ گئے صاحب! یہ ہے جسے آپ کی صحیح ترین تاریخ کہا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں دین کی منزل تک پہنچنے کے لیے تاریخ کی کتب کی تطہیر لازم ہے

میں جو چالیس سال سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں کہ بابا! خدا کے لیے دین کو محکم بنیادوں پہ قائم کرنا ہے تو قرآن حکیم کی روشنی میں پہلے آپ ان روایات اور تاریخ کی کتابوں کی تطہیر کیجیے لیکن یہ جو اختلاف وتضاد پیدا کرنا ہے' گھپلا پیدا کرنا ہے' اس میں تو فائدہ ہوتا ہے' اس طرح سے مختلف دکانیں چلتی ہیں کہ اختلاف ہو۔ اگر ایک ہی چیز' ہر دکان پہ بک رہی ہو' تو پھر تو مختلف دکانیں کھولنے کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہوتا' بہر حال کس کس تلخ نوائی سے میں پھر گزروں۔ یہ ہے وہ چیز کہ اگر یہ اسی سال ہوا ہے تو خدا نے یہ کہہ دیا کہ اس نے تیرے خواب کو سچ کر دکھایا' تُو داخل ہوا' عمرہ کیا۔ یہ حج کے مناسک ہیں۔ حج کے بعد وہ حجامت بنواتے ہیں' بال بھی ترشواتے ہیں۔ کہا کہ یہ سارا کچھ ہوا اور اگر یہ چیز اس سال نہیں ہوئی تو پھر وہ اگلے سال تو فتح مکہ کی بات ہر جگہ' ہر تاریخ میں' ہر روایت میں' موجود ہے کہ ایسا ہوا تھا۔ یہ اس سال کی بات ہو جائے گی۔ بہر حال یہ داخل ہونے کی بات ہے۔

فتح مکہ نے مجاہدین کے لیے کامیابیوں کے پھاٹک کھول دیئے نیز کلمت اللہ اور سنت اللہ کا مفہوم

کہا ہے کہ فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِکَ فَتْحًا قَرِیْبًا (48:27) اور اس کے بعد پھر میں نے جیسا عرض کیا تھا' فتح کے معنی تو ''کامیابیوں کے دروازے کھول دینے'' کے ہیں اور فتح مکہ نے واقعی کامیابیوں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ یہ جو پہلے چھ سال تھے' بلکہ 2 ہجری میں بدر کی جنگ ہوئی ہے اور اس کے بعد یہ 7 ہجری تک مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں' جنگ ہوتی رہی' اور بڑی ہی کٹھن زندگی تھی

جو حضور ﷺ کی، حضور ﷺ کے ساتھیوں کی گزری اور اس فتح مکہ کے فوری بعد تو خیبر کی فتح ہے۔ وہ بڑی عظیم الشان فتح ہے جس کی رو سے یہ مستقل فتنہ، جو یہودیوں کا تھا، اس سے سرزمین کو پاک کر دیا گیا تھا اور پھر حنین کی فتح ہوئی اور یہ سارے علاقے آئے۔ اس فتح مکہ کے بعد یہ جو مملکت اسلامیہ تھی، وہ مستحکم ہوگئی تھی اور یہ کہنے کے بعد کہ یہ بھی ہوا، مکہ بھی فتح ہوا، اور فتح قریب کے کامرانیوں کے دروازے بھی کھل گئے اور وہاں پھر یہ آیت آتی ہے کہ هُوَ الَّذِىٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا (48:28) خدا وہ ہے کہ جس نے ایک ضابطہ زندگی دیئے ہوئے اپنے رسول کو بھیجا۔ وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ اور حق پر مبنی ایک نظام دیا، یہ هُـــدٰی اور دین، دیکھیے، یہ دو چیزیں قرآن کریم نے یہاں دی ہیں۔ وہ جو میں نے اس دن بھی یہ عرض کیا تھا کہ ایک تو ''کلمات اللہ'' ہوتے ہیں اور ایک ''سنت اللہ'' ہوتی ہے، کلمت اللہ جو ہے، یہ ہے Law in Theory، الفاظ کے شکل کے اندر قانون کا ضابطہ، اور سنت اللہ ہے جب اس پہ عمل کرلیا جائے Law in Practise۔ تو خدا تو وہ ہے، قوانین یا راستے دکھانے کی علامات، نشانیاں، ضابطہ، جو راہنمائی کرتا ہے، یہ قرآن کریم ہے۔ جب وہ ضابطہ، علامات راہنمائی عملاً متشکل کی جاتی ہے، قرآن حکیم ایک نظام کی شکل میں قائم کیا جاتا ہے تو اسے دین کہا جاتا ہے۔

کلمات اللہ کے ہوتے ہوئے صدیوں سے ہماری زبوں حالی کا علاج: نظام بطورِ دین نہیں ہے

اب یہ جو ہمارے ہاں ہزار برس سے چلا آ رہا ہے، یہ کلمات اللہ تو چلے آ رہے ہیں، قرآن کریم کی ہدایت تو اس کے اندر محفوظ چلی آ رہی ہے مگر یہ دین نہیں ہے۔ یہی قرآن کریم کی ہدایت یا قوانین جب ایک اسلامی نظام کی شکل میں عملاً متشکل ہونگے، تو اسے دین کہا جائے گا۔ یہ ہم ہزار برس سے مذہب کے پیراؤ چلے آتے ہیں، جو لفظ ہی قرآن کریم میں نہیں ہے۔ یہ دین نہیں ہے۔ قرآن کریم کے ضوابط وقوانین کو، ہدایات کو، ایک نظام کی شکل میں عملاً متشکل کرنا دین ہے، اسے دین الحق کہا ہے اس لیے اس رسول کو، اس ہدایت کے ضابطہ کو نظامِ زندگی دے کر بھیجا ہے۔ کاہے کے لیے بھیجا یا ہے؟ کہ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ (48:28) دنیا کے ہر نظام پر، یہ نظام غالب رہے، غالب آئے۔ یہ دیکھیے! یہ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ میں دین کا لفظ پھر آیا ہے۔ وہ نظام تو ہر قسم کی زندگی کا ہوسکتا ہے، باطل کا نظام بھی ہوسکتا ہے، طاغوتی نظام بھی ہوسکتا ہے، ملوکیت کا بھی ہوسکتا ہے جسے آپ نظامِ زندگی کہتے ہیں، جس طرح سے مختلف قسم کی مملکتیں قائم ہوتی ہیں، وہ زندگی کے نظام ہیں۔ دنیا میں جمہوریت کا بھی نظام ہے، آمریتوں کے بھی نظام ہیں، ملوکیت کا بھی نظام ہے، Capitalism بھی ایک نظام ہے۔ قرآن حمید کے نظام کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا۔

عزیزانِ من! ہم مذاہب سے مناظرے اور مباحثے کرتے آئے۔ یہ آپ کا خادمِ گوشہ نشیں! یہ بھی اس میں برابر کا شامل تھا۔ میں تو

اس شہر کا رہنے والا تھا جو بڑا مذہبی شہر تھا' روز مناظرے ہوتے تھے' اور ہم دھڑلے سے اس میں شریک ہوتے تھے' پھر وہ فاتحانہ جلوس نکلا کرتا تھا صاحب! یہ مناظرے اور مباحثے مذاہب کے ساتھ ہوتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اسلام کی فتح ہو گئی ہے' اسلام کامیاب ہو گیا ہے' ایک مذہب دوسرا مذہب کے اوپر کامیاب ہوا ہے اور پھر وہ مناظرے میں تو ہوتا ہی کچھ نہیں تھا۔ ہر مناظرہ آخر میں سر پھٹول اور فساد میں ختم ہوا کرتا تھا لیکن بہر حال اگر کچھ ہوتا بھی تھا تو وہ مذہب کی بنیاد پہ تھا' دین نہیں تھا۔ دین میں تو مناظرے کا سوال ہی نہیں ہے' وہ تو عملاً ایک نظام کے متعلق دیکھنا ہے کہ وہ دوسرے نظام کے اوپر غالب آتا ہے۔

یہ اس قرآن کریم نے جو ایک نظام دیا ہے' وہ دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا اور ایک طریقہ تو وہ ہے کہ خود اقوامِ عالم اپنے اپنے نظاموں کو آزما کر دیکھ لیں کہ وہ کامیاب نہیں ہوا' پھر اس ایک نظام کو چھوڑیں' پھر دوسرے نظام پہ آجائیں' اسے دیکھیں کہ کامیاب نہیں ہوا۔ یہ عقل کا تجرباتی طریق کہلاتا ہے' اس کو Trial & Error کہتے ہیں کہ ایک چیز کا تجربہ کیا' غلط ثابت ہوا' پھر دوسری چیز لے لی (مثلاً) Capitalism (سرمایہ داری) کا تجربہ کیا' اتنے عرصے تک وہ ناکام ثابت ہوا' اس کے برعکس کمیونزم کا نظام قائم کیا' اس پہ کچھ عرصہ تجربہ کیا' وہ بھی ناکام ثابت ہوا' تو دنیا کسی اور نظام کی تلاش میں ہے۔ ملوکیت اتنے عرصے تک چلتی چلی آئی' اس نظام کو انقلابِ فرانس نے باطل قرار دیا' اس کی جگہ یہ مغرب کا نظامِ جمہوریت آیا' اتنے سے عرصے میں ہی نظر آ گیا کہ یہ بھی نہیں چل سکتا' ناکام رہا ہے۔ اب وہاں کی فکر اور وہاں کی ان قوموں کی عقل ایک اور نظام کی تلاش میں ہے۔ وہ ہو سکتا ہے کہ Trial & Error (سعی وخطا) سے ہی اپنے اپنے نظاموں کو خود ہی باطل ثابت کرتے ہوئے' اپنے بتوں کو خود ہی ڈھاتے ہوئے' وہ اس نظام پر آجائیں اگر یہ قرآن حمید ان کے سامنے آجائے۔ بہر حال دوسرا طریق وہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ جس کی رو سے یہ جو لمبا عرصہ ہے' جو لمبی مسافت ہے وہ سمٹ جائے۔ وہ جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ یہ مسافتیں وحی کی رو سے ایک آن کے اندر طے ہو جاتی ہیں۔ وحی جو نظام دیتا ہے وہ Trial & Error (سعی وخطا) کا مرہون منت نہیں ہوتا' وہ سچائی اور صداقت پر مبنی ایک حقیقی نظام ہوتا ہے' وہی نظام نوعِ انسانی کے لیے کامیابیوں کے راستے کھولنے کا نظام ہے جس نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آنا ہے' یہ بتایا ہے' یہ اس لیے بھیجا ہے۔ یہ دو جگہ آیا ہے' یہی الفاظ اس مقام پہ بھی آئے ہیں' دوسری جگہ سورۃ توبہ میں (9:33) میں یہی الفاظ آئے ہیں اور یہ بڑے عظیم القدر الفاظ ہیں۔ دین کا مقصد بتایا ہے' اس کا مآل بتایا ہے کہ آخر الامر کیا ہونا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے' بتانے والا خدائے علیم ہے۔ یہ اس نے قرآنِ کریم میں محفوظ رکھا ہے۔

قرآنِ حکیم کا یہ دعویٰ ہے دین کا عطا کردہ نظامِ حیات دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہے گا: اس کی مثال

قرآن کریم کے اندر شاعری نہیں ہے' مذہب نہیں ہے' خدا کا دعویٰ ہے کہ اس نظام نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آنا ہے اور میں نے

عرض کیا ہے کہ اس کے دو طریقے ہیں۔ وہ جو طریق وہاں (عہد رسالت مآب میں) ہوا تھا وہ Trial & Error (سعی وخطا) کا نہیں تھا۔ چودہ سو سال پہلے صدرِ اوّل، نبی اکرم ﷺ کے دورِ ہمایوں میں، جس طرح سے یہ قائم ہوا تھا، غالب آیا تھا، اس دور کے بھی ہر نظام پہ غالب آیا تھا، ایران کا نظام، روما کا نظام، ہندوستان کا نظام، چین کا نظام، ان تمام ممالک کے جتنے نظام تھے، ان تمام نظاموں پر اس دور کے اندر یہ نظام غالب آیا تھا۔ یہ کس طرح سے غالب آیا تھا؟ یہ Trial & Error (سعی وخطا) کے ذریعے سے نہیں تھا، وحی نے نبی اکرم ﷺ کو یہ نظام دیا، اور یہاں کہا ہے کہ یہ نظام دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا۔ دور جانے کی بات نہیں ہے، یہ اگلے ہی الفاظ میں بتا دیا کہ یہ کیسے غالب آیا ہے؟ یہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ (48:29) کے ہاتھوں غالب آیا۔ اللہ اکبر! عزیزانِ من! یہ سورۃ الفتح کی آخری آیت ہے اور میری تو کیفیت یہ ہے کہ پچاس برس سے اس کو پڑھ رہا ہوں، جب بھی اس آیت پر آتا ہوں تو وجدِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہوں۔ عجیب انداز سے خدا کے متعلق کہا تو نہیں جا سکتا لیکن یوں نظر آتا ہے کہ اس نے بھی جھوم جھوم کر یہ فقرے اور یہ الفاظ نازل کیے ہیں۔ بڑے ہی عجیب، پُر مسرت اور پُر معنی الفاظ میں سامنے نبی اکرم ﷺ اور جماعتِ صحابہؓ کا ایک عظیم الشان نقشہ دیا ہے محمد الرسول اللہ اکیلے نہیں کہا وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ کہا ہے کہ اور اس کے یہ ساتھی بھی ساتھ ہیں۔

قرآنی معاشرے میں نظامِ خداوندی کی ایک بنیادی خصوصیت

عزیزانِ من! قرآن کریم سامنے ہے تو ان الفاظ کو دیکھیے کہ کس طرح سے کہا گیا ہے! یہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) مخالفین کے مقابلے میں یہ نہیں ہے کہ ان کے اوپر متشدد ہیں، مخالف نہیں کہا۔ کہا ہے کہ ان کے مقابلے میں چٹان کی طرح کھڑے ہیں کہ باطل کے تلاطم کی یہ طوفانی لہریں آئیں، سر ٹکرا کر واپس چلی جائیں، چٹان کی طرح کھڑے ہیں، اور آپس میں بریشم کی طرح نرم ہیں:

گذر جابن کے سیلِ تند رو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ایک ہی سینے کے اندر دو دل نہیں، ایک ہی دل کے دو Reaction (ردِّ عمل) ہیں کہ اگر مخالفین کا مقابلہ ہے تو چٹان کی طرح مستحکم کھڑے ہیں، آپس میں بریشم کی طرح نرم ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ بنیادی خصوصیت بتائی۔ کہا کہ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا (48:29) میں پہلے اس کا یہ جو عام ترجمہ کیا جاتا ہے، وہ بیان کرتا چلا جاؤں گا، پھر عرض کروں گا کہ میں جو ان الفاظ کے مجازی معنی لیا کرتا ہوں وہ بھی قرآنِ

کریم کی رو سے اور عربی زبان کی رو سے ہوتے ہیں' وہ میرا قیاس نہیں ہوتا۔ تو ان کو دیکھے گا اب عام معنی تو لیے جاتے ہیں کہ کبھی وہ رکوع میں ہونگے' کبھی سجدے میں ہوں گے' اور وہ راہبوں کی جماعت نہیں ہے۔ کہا ہے کہ **يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا** (48:29)۔ میں ابھی عرض کروں گا' جب خود اپنے الفاظ میں ان کے معنی بیان کروں گا کہ یہ کتنی عظیم چیز کہی گئی ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ خدا کا فضل' اس کے رضوان اور اس کی رضامندی تلاش کرتے ہیں۔ یہ عام معنی ہیں۔ کہا کہ **سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ**(48:29) سجدوں سے ان کے ماتھے پر یہ جو محراب پڑ جاتا ہے' کہا کہ یہ ان کے ماتھے کے اوپر ہے۔ **ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ** (48:29) یہ ان کی علامات' ان کی نشانیاں' کتبِ سابقہ میں بھی موجود ہیں۔ وہاں بھی ان کے متعلق یہ علامات اور نشانیاں آئی ہوئی ہیں۔

قرآن نظام کے ثمر بار ہونے کی بنیادی شرط

عزیزانِ من! اور آگے جو ہیں کہ **كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ** (48:29) اللہ اکبر! **يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ**(48:29) آہاہا! یہ جماعت کیا ہے؟ ان کا نظام کس طرح پروان چڑھا؟ یہ یہاں تک کس طرح بتدریج پہنچا؟ ایک بیج بویا گیا' اس میں ایک ننھی سی کونپل پھوٹی' فطرت کی طرف سے اس کی حفاظت کی گئی۔ اس تمام عمل میں کسان کی محنت' قوانینِ فطرت سے ہم آہنگی' بارش کا پانی' سورج کی حرارت' ہواؤں کا لہرانا پن اور ساتھ کسان کی محنت تھی۔ کیا بات ہے! یہ ہے فضل اور رضوان کے معنی۔ فضل رزق کے لیے اکتسابی محنت کو کہتے ہیں' رضوان کے معنی ہیں قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا۔ کسان کے لیے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کر کے محنت کرے تو پھر وہ رائیگاں چلی جاتی ہے۔ اگر محنت ساتھ نہ ہو تو یہ سارا کچھ تو برستا ہی رہتا ہے' پانی بھی برستا ہے' سورج بھی چمکتا ہے' ہر جگہ سے تو کھیتی نہیں اگتی ہے۔ یہ دو چیزیں انسان کی محنت اور کوشش اور قوانینِ خداوندی کے ساتھ ہم آہنگی ساتھ ساتھ ہونی چاہئیں پھر یہ فصل پیدا ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ پھر اس طرح سے یہ اپنی پختہ نالوں پہ کھڑی ہوگئی' فصل پک گئی' باغبان کا دل اسے دیکھ کر وجد مسرت سے جھوم اٹھا' اور مخالفین کے سینے پر سانپ لوٹنے لگ گئے اور آگے بڑی بات ہے صاحب! کہا کہ یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں' جو وہاں ہو گیا اور پھر کبھی نہیں ہوگا۔ کہا ہے کہ **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا** (48:29) یہ خدا کا وعدہ ہے۔ خدا کا وعدہ قانون ہوتا ہے جو کبھی ٹلتا نہیں ہے۔ یہ انہی کے ساتھ مختص نہیں ہے' یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں ہے جو ہو گیا۔ خدا کا یہ قانون ہے کہ جو بھی اس طرح سے یقین رکھے' اس عملدرآمد پر اس طریقِ کار پر یقین رکھے' اور پھر اس کے ساتھ اپنی محنت کو شامل کرے' تو اس کا یہ وعدہ ہے' اس کا یہ قانون ہے کہ اسی طرح سے ہر اس

قوم کو یہ چیز میسر آ جائے گی جو اس کے مطابق عمل کرے گی۔ یہ سورۃ الفتح یہاں ختم ہوتی ہے۔

میں اب عرض کروں گا کہ یہ کیا بات ہے؟ ٹھیک ہے کہ **اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ**(48:29) تو قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مومن کی تو شان یہ ہے **اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ**(5:54) مخالفین کے مقابلے کے اندر ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے' اپنوں کے سامنے جھک جانے والے' اور ہمارے ہاں جب پھر مذہب میں یہ ہوتا ہے کہ اپنوں کے سامنے تو ڈٹ کر کھڑے ہو جانے والے اور دوسروں کی جوتیوں تک چومنے والے۔ یہ خصوصیت بتائی ہے مومن کی اور یہ نہیں ہے کہ وہ جو غیر مسلم ہیں' کفار ہیں' تلوار ہاتھ میں لے کر ان کے سر قلم کرتے چلے جائیں۔ یہ بات نہیں۔ اَشِدَّآءُ کے معنیٰ میں نے کہا ہے کہ کسی کی مخالفت کو روکنے کے لیے جو چٹان کی طرح سے کھڑے ہو جانا ہے یہ لفظ اس کے لیے آتے ہیں اَعِـزَّةٍ کے معنی ہوتا ہے ''پوری قوت سے مقابلہ کرنا''۔ استبداد اور چڑھ دوڑنا اور خواہ مخواہ دوسروں کو جا کر قتل کرتے رہنا یہ تو قرآن حمید کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ مخالفت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہے اور یہ ہے ایک چیز اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ بریشم کی نرم' بڑے ہمدردانہ انداز سے آپس میں اَعِزَّةٍ قرآن کریم نے کہا ہے کہ جھک جانے والے ایک دوسرے کے سامنے۔

نبی اکرم ﷺ کے دَور میں قرآن کے نظام کے نفاذ کے تدریجی مراحل کی نوعیت

کہا ہے کہ **تَرٰىھُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا** (48:29)۔ یہ ٹھیک ہے لفظی معنی تو اس کے آئیں گے: رکوع میں اور سجدے میں۔ یہ جو اس نظام کو قائم کرنے کا' تمام Process (عمل) ہوا ہے یہ تدریجی تھا۔ جیسا کہ اس مثال میں کہا گیا ہے۔ وہ کھیتی کے پودے کی مثال ہے' فصل کی مثال ہے کہ بتدریج وہ ایک کونپل سے بڑھتا ہوا آگے جاتا ہے۔ یہ نظام قائم کرنے کے لیے اس کے ابتدائی دور میں جو پروگرام دیا جائے گا' وہ ایسا ہوگا کہ وہ منتہٰی تک پہنچنے کے بعد اس کی کیفیت دور ہوگی جسے آپ ابتدائی ٹریننگ کا زمانہ کہتے ہیں' یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جس میں وہ قوانین اپنی مکمل شکل کے اندر ابھی نافذ نہیں ہوتے' اس کی شکل ایسی ہوتی ہے کہ اس ماحول کے اندر بھی ان کے اوپر عمل ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ کی تیرہ سالہ مکے کی جو زندگی ہے اس میں آپ دیکھیے کہ کوئی اسلامی نظام قائم نہیں ہوا' اسلامی مملکت قائم نہیں ہوئی' لیکن اس میں اس ماحول کے مطابق ایک جماعت تیار کی گئی' جو قرآن حمید کے قوانین تھے' وہ ان پہ نافذ کیے گئے' بتدریج یہ چیز یہاں تک پہنچتی ہے۔ یاد رکھیے! یہ جو ابتدائی دور ہے' جس میں ابھی پورے کے پورے وہ قوانین یا نظام نافذ نہیں ہوتا' وہ ابتدائی دور کے ہوتے ہیں' ان کو نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ ہے حالتِ رکوع جسے قرآن حکیم نے جھکنا کہا ہے' جھکنا رکوع میں بھی ہوتا ہے لیکن جھکاؤ' آپ دیکھیں گے' کہ سجدے کے مقابلے میں آدھا جھکاؤ ہوتا ہے اور جب یہ آگے بڑھتا ہے وَّ اَجْـرًا اور اس کے بعد انتہا پہ پہنچتا ہے' تو سُـجَّدًا کی کیفیت ہوتی ہے' پورے کے پورے اس نظام کے آگے جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے قرآن حکیم نے یہ کہا ہے' پہلی زندگی صدقہ اور خیرات

میں ہے اور اپنے اپنے طور پر لوگوں کی' غریبوں کی مدد کرنا یہ جو سارا دور ہے' اس میں بھی یہ قوانین نافذ تھے' اپنے اپنے طور پر غریبوں کی' محتاجوں کی' بھوکوں کی' مدد کی جاتی تھی۔ یہ نظام ابھی قائم نہیں ہوا ہے اس کے لیے بھی قرآن حمید میں تاکید آئی ہے' احکام آئے ہیں۔ ان احکام کی جو پابندی کی جاتی ہے' ان کی جو تعمیل کی جاتی تھی' یہ حقیقت میں رکوع کی حالت تھی۔ اب جب آگے چل کر نظام قائم ہوتا ہے تو کہا ہے کہ وَ یَسْـئَلُـوْنَکَ مَـاذَا یُـنْفِقُوْنَ قُلِ الْـعَـفْوَ (2:219) پوچھتے ہیں کہ یہ کتنا کچھ ہم دوسروں کے لیے دے دیں' کہا کہ تمہاری ضرورت سے جتنا زائد ہے سب کا سب دے دو' یہ ان قوانین کے انتہائی صورت ہے۔ اب جو انتہائی درجہ ہے' یہ اس میں جھکنے کی کیفیت ہے تو بتدریج جب یہ نظام قائم ہوگا' اس میں رکوع کی حالت بھی ہوگی' اس میں سجدے کی حالت بھی ہوگی تو کہا کہ تَـرٰهُـمْ رُكَّـعًـا سُجَّدًا (48:29)۔

قرآنی لفظ فضل اور رضوان کا حقیقی مفہوم

اب آیا اس جماعت کا یا اس نظام کا پروگرام۔ کہا ہے کہ یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (48:29)۔ کیا بات ہے' دو لفظوں کی! عزیزانِ من! پورے کے پورے نظام کا نچوڑ اور نقشہ قرآن حمید نے دو لفظوں میں سمو کر رکھ دیا ہے: فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ فضل کا لفظ ہے۔ یہ جتنے سامانِ زیست مادی طور پہ جن کی ضرورت ہوتی ہے' زندگی کی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں' انتظامات کے لیے جو سامان مہیا کرنا ہوتا ہے' وہ سارا فضل کے لفظ کے اندر آتا ہے۔ عربی زبان میں ہے کہ یہ بھی خیرات کرتے ہیں' اب یہ جو تلاشِ معاش' حصولِ رزق' کسبِ معاش ہے' یہ تو ہر طریق سے ہوسکتا ہے' جائز بھی ناجائز بھی' دنیا کی ہر قوم جو وحی کے تابع نہیں چلتی' نہ رکوع میں ہے' نہ سجود میں ہے' تو وہ تو ہر طریق سے یہ کرے گی۔ کہا کہ نہیں اس کی خصوصیت یہ رضوان ہے۔ یہ جتنا کسبِ معاش اور تلاشِ رزق بھی کرے گی اس میں ان کی قوانینِ خداوندی سے ہم آہنگی ہوگی۔ رضوان کے یہ معنی میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا' خدا کی رضامندی یا رضا جوئی یا اپنے خدا کو منا لینا جو بات ہے' یہ وہ بات نہیں ہے۔ معاذ اللہ! خدا روٹھا ہوا نہیں ہوتا' جس کے منانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رضوان کے معنی ہوتا ہے ''کسی دوسری چیز کے ساتھ ہم آہنگ ہو جانا' ہم رنگ ہو جانا اس کے ساتھ۔ یہ جو چیز ہے کہ وہ تلاشِ رزق کرتے ہیں' اس کے لیے پوری پوری محنت کرتے ہیں' لیکن حدود فراموش نہیں ہوتے' خدا کے قوانین اس کی مشیت کے تابع چلتے ہیں' اس سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے تلاشِ رزق کرتے ہیں۔ اب یہ باقی دنیا کے تلاشِ رزق میں فرض ہوگیا اور اس جماعت کے تلاشِ رزق کے اندر یہ جائز اور ناجائز کی تفریق کو ہر وقت ملحوظ رکھتے ہیں۔

ماتھے پر محراب کا مفہوم ایک عظیم نشاندہی کا ترجمان ہے

کہا ہے کہ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48:29)۔ عام ترجمہ میں نے عرض کیا تھا کہ سجدوں سے ان کے ماتھے

پر ایک نشان پڑ جاتا ہے' وہ جسے ''محراب کیندے نیں' اصل وچ اومحراب ہوتا ہے پر ساڈے پنجابی اچ اوہنوں مراب کیندے نیں'' (محراب کہتے ہیں اصل میں وہ محراب ہوتا ہے مگر ہمارے ہاں پنجابی میں اسے مراب کہتے ہیں) یہ جو ماتھے پہ نشان پڑتا ہے' قرآن کریم ہے' عزیزانِ من! ایسی بات نہیں کرتا۔ کہا ہے کہ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48:29) قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت سے ہوتا کیا ہے؟ یہاں نفسیاتی دنیا آتی ہے' سائیکولوجی آتی ہے' انسان کے اندرونی خیالات' دل کی حالت' کرب واضطراب یا اطمینان' اس کے اندر کی جو کیفیات ہوتی ہیں' اب تو سائیکولوجی اس کو پوری طرح سے ایک علم کی حیثیت سے آگے لے آئی ہے کہ اس کے اثرات' اس کے علامات' اس کے نشانات' انسان کے چہرے سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔ آپ کو پتہ نہیں اس کا تجربہ ہو یا نہ ہو' یہ درویش تو اپنی بات بتاتا ہے' ایسے ایسے فرقوں سے واسطہ پڑا جن کے دلوں کے اندر بغض اور عداوت اور نفرت کی آگ ہر وقت جلتی رہتی تھی' سینکڑوں ہزاروں میں ایک کھڑا ہو تو پہچانا جاتا تھا کہ یہ وہ ہے ہر وقت نفرت کی آگ جن کے سینے کے اندر ہو' چہروں سے پہچانا جاتا ہے اور چھوڑ دیجیے اس لمبی بات کو' تو غصے میں' خوشی میں' طمانیت میں' عدمِ اطمینان میں' حسد اور رشک کے اندر' یہ تو انفرادی طور پہ بھی آپ دیکھ سکتے ہیں کہ زبان سے وہ کچھ نہ کہے تو چہرے پر اس کے نشانات' اس کی علامات' ایسی ہویدا ہوتی ہیں کہ تحریر وہ کچھ نہیں بتا سکتی' جو وہ علامتیں بتا سکتی ہیں۔ بڑے خوبصورت انداز میں (مرزا اسداللہ خاں) غالب نے کہا ہے کہ

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

بات کرنے کا عجیب انداز ہے کہ ''ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق''۔ یہ کیا چیز ہے؟ دل کے اندر ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے' چہرہ اس کا غماز ہوتا ہے' اسے آپ چھپا ہی نہیں سکتے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (13:28) قوانینِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھنے سے دل کی حالت طمانیت کی ہوتی ہے' سکون کی ہوتی ہے' اطمینان کی ہوتی ہے اور جب قلب کی حالت' دل کی حالت' سکون واطمینان کی ہو اور مستقلاً یہ کیفیت ہو تو چہرہ تو اس کے لیے لکھی ہوئی ایک تقریباً ایک تحریر ہو جائے گا صاحب! سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (48:29) ان قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت سے دل کی جو کیفیت ہے' اس کے لیے ان کے چہرے غماز ہو جاتے ہیں' نظر آ جاتا ہے کہ کس قدر اطمینان بخش قلب کا یہ چہرہ ہے۔ یہ جو چیز ہے تو وہ اس سے پہچانے جانتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر اطمینان اور خود فریبی میں بنیادی فرق ہوتا ہے: انجیل مارکس میں نبی اکرم ﷺ کی علامات

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم سمجھنے کا طریق ہی یہ ہے کہ ایک جگہ جو بات کہی ہے' وہ دوسری جگہ دیکھیے کہ اس کی کہیں اور تفسیر آئی ہے اور قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی ہر بات کی تشریح دوسرے مقام پہ کر دیتا ہے (مثلاً) یہ (83:24) چھوٹی سی ایک آیت ہے

اہلِ جنت کی بات ہو رہی ہے۔ اہلِ جنت کی بنیادی کیفیت یہ ہے کہ اطمینانِ قلب اور سکونت حاصل ہو' فریب نہیں' خود فریبی نہیں۔ اطمینان میں اور خود فریبی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ فطری طور پر انسان کو صحت میں نیند آئے اور افیون کھا کر جو نیند دلائی جائے' یہ دونوں میں فرق ہوتا ہے۔ اہلِ جنت کے متعلق کہا ہے کہ تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ نَضۡرَةَ النَّعِیۡمِ (83:24) کیا بات ہے کہ وہ آسائشیں اور آرام اور مسرتیں اور خوشیاں جو اس زندگی میں انہیں حاصل ہوں گے' ان کے اثرات ان کے چہروں پہ ایسے نمایاں ہوں گے کہ تُو فوراً پہچان لے گا کہ یہ اہلِ جنت ہیں۔ تو قرآن کریم نے' جنت کی ان نعماء کی چہروں کے اوپر پہچان بتا دی فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ (83:24) ان کے چہرے پر جو' ان آسائشوں اور طمانیتوں کے اثرات نمایاں ہوں گے' تو فوراً ان کو پہچان لے گا اور دوسری جگہ ہے کہ یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمٰهُمۡ (55:41) نسخہ ہوتا تو میں انجیل کی وہ آیات بھی آپ کے سامنے رکھتا۔ ان کو بھی وہ آیات ہی کہتے ہیں۔ ویسے انجیل مارکس (Marcus) کے چوتھے باب میں آپ دیکھیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کی وہ علامات دی ہوئی ہیں اور آپ ﷺ کے ساتھ صحابیوںؓ کی جماعت کا انجیل اور تورات میں بھی ذکر ہے۔

قرآنی معاشرے کے قیام کی ابتدائی شکل وصورت اور اس کے ثمرات کی تصویر کشی

عزیزانِ من! اب آئی یہ بات۔ کہا کہ کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔهٗ (48:29) اس کی جو مثال ہے وہ تو انجیل اور تورات میں ان کی علامات ہیں۔ کہا ہے کہ یہ جو ان کے ہاتھوں سے نظام قائم ہوا ہے' اس کی مثال کھیتی کی مثال ہے۔ پہلے جسے وہ کہتے ہیں کہ سوئی نکلی۔ پہلی جو سوئی نکلتی ہے' وہ بڑی نرم و نازک پتلی سی سوئی ہوتی ہے۔ فَاٰزَرَهٗ (48:29) پھر وہ مضبوط ہوتی چلی گئی فَاسۡتَغۡلَظَ (48:29) پھر وہ موٹی ہوتی چلی گئی' فَاسۡتَوٰی عَلٰی سُوۡقِهٖ (48:29) پھر وہ اتنی موٹی ہوگئی کہ وہ اپنے ہی نالوں کے اوپر' خود استادہ ہوگئی' کھڑی ہوگئی' اس میں فصل پڑی' اور دانے پڑے' پھر وہ جو دانے تھے' وہ پکے' پکنے کے بعد وہ فصل بنے۔ یہ فَاسۡتَغۡلَظَ (48:29) کا جو لفظ ہے' میرے لغت [1] میں آپ دیکھے گا' یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے' کھیتی کے خوشوں میں دانے پڑنے سے لے کر اس کی پختگی تک کے سارے مراحل اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ آگے کہا کہ یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ (48:29) کسان کا دل اسے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا ہے' وہ پکی ہوئی کھیتی کے سرہانے کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ ہم شہر والے تو یہاں' بہرحال' اب میں بھی' ہم ہی کہہ رہا ہوں' میں تو گاؤں کا رہنے والا ہوں' مجھے پتہ ہے کہ جب یہ کھیتی پکتی ہے تو اس وقت جب کسان جاتا ہے' اس کی چھ مہینے کی محنت اس طرح آتی ہے۔ اس زمانے میں' جس کا میں ذکر کر رہا ہوں' موسموں کے یہ تغیرات نہیں ہوتے تھے کہ کٹی ہوئی گیہوں کی فصل' کھیتوں کے اندر ہو' بکھیری ہوئی' اور اس پہ بارشیں شروع ہو جائیں اور اس غریب کاشتکار کی

---

[1] پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص ص 1237 تا 1238۔

سال بھر کی محنت تباہ ہوتی نظر آ جائے۔ آج بھی جو بڑے بڑے زمیندار ہیں' سرمایہ دار ہیں' وہ تو ایک دن کے اندر اپنی فصل کاٹ کر' گاہ کر' سارے دانے اپنے گھر لے آتے ہیں' جو غریب کاشتکار ہے' وہ ابھی تک Labour (محنت مزدوری) کرتا ہے' Manual Labour (ہاتھ سے مزدوری) کرتا ہے کہ ہاتھوں سے کٹائی کرتا ہے' ان کی فصلیں اس طرح سے بکھری ہوئی ہیں' جو کہیں باہر گئے ہوں گے' انہوں نے دیکھا ہوگا' پانی کھڑا ہوجاتا ہے' فصل تباہ ہوجاتی ہے لیکن یہ وہ فصل ہے' کیونکہ رضوانا قرآن کریم نے کہا تھا کہ وہ قوانینِ خداوندی سے بھی ہم آہنگی ساتھ کرتے ہیں' اس لیے ان کی فصل ضائع نہیں ہوتی' تباہ نہیں ہوتی' برباد نہیں ہوتی' فصل کے سرہانے کھڑے ہوئے ان کے دل باغ باغ ہوجاتے ہیں اور لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (48:29) وہ دشمن جو مذاق کرتے تھے کہ بچوں کے لیے رکھا ہوا جو اناج تھا' تھوڑا بہت' اس کو بھی لے کر یہ باہر مٹی میں ملا آیا ہے کہ جسے بونا کہتے ہیں' وہ مذاق کرتے ہیں۔ اب ان کے سینے پہ سانپ لوٹ رہا ہے اور وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا (48:29) اور جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ کوئی ہنگامی بات نہیں ہے بلکہ یہ ایک حقیقت ہے' ایک قانونِ خداوندی ہے' جو قوم جس زمانے میں' جس ملک میں بھی ایسا کرے گی یہی نتائج پیدا ہوں گے۔

سورۃ الفتح کی آیت 29 کا وہ مفہوم جو ''مفہوم القرآن'' میں پیش کیا گیا ہے

جی چاہتا ہے کہ میں نے اس آیہ مبارکہ کا جو مفہوم اپنے ''مفہوم القرآن'' میں لکھا ہے' یونہی جی چاہا ہے کہ میں دو چار منٹ ہیں' وہ آپ کے سامنے پیش کروں اور وہ جو نظام قائم ہوگا' جو باقی تمام نظامہائے عالم پر غالب آ کر رہے گا۔ میں نے لکھا یہ ہے' یہ وہی سورۃ الفتح کی آیت 29 ہے اور ''یہ ہوگا محمد الرسول ﷺ اور اس کے رفقائے کار کی جماعت کے ہاتھوں۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہیں' لیکن باہمدگر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد ہیں (5:54)۔ تُو انہیں دیکھتا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اُٹھانے کے لیے جھک جاتے ہیں' اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکر تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ (لیکن یہ ترک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ قوانینِ خداوندی کے مطابق سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت صفاتِ خداوندی سے یکرنگ ہوجائے۔ اس سے انہیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے' اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات سابقہ کتبِ آسمانی' تورات اور انجیل' میں بھی مذکور تھیں۔

''انہوں نے اس نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے' اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے' اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہوجاتی ہے۔ (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں

دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج' پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے)۔ جب کاشتکار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وہ وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز ان کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

''اسی طرح اللہ' ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر' اس کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے' اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی (24:55)۔ (لیکن اس کے لیے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہو گی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے: تخمِ صالح' قوانینِ خداوندی سے مطابقت' مسلسل محنت اور استقلال اور استقامت۔ کھیتی کی برومندی کے لیے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)'' (مفہوم القرآن' ص 1202 تا 1203)۔

اسلامی نظام جو ایک دفعہ کسی طریق سے قائم ہوا تھا' دنیا کی جو قوم بھی چاہے گی وہ اسی طور پہ اسے دوبارہ بھی قائم کر سکتی ہے۔

سورۃ الفتح اس آیت پر ختم ہوتی ہے' عزیزانِ من! ہم آئندہ اگلی سورۃ الحجرات لیں گے۔ شکریہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

سورة الحجرٰت

پہلا باب: **سورۃ الحجرٰت** (آیات 1 تا 8)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عزیزانِ من! آج مئی 1982ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحجرات سے ہوتا ہے۔ یہ 49 ویں سورۃ ہے (41:1)۔

سابقہ سورۃ الفتح تھی اور آپ نے وہاں دیکھا تھا کہ یہ فتح مکہ کے قریب آ پہنچے تھے۔ اس سے اگلے سال مکہ فتح ہوا، خیبر فتح ہوا تو گویا اب اسلامی مملکت اپنی تشکیل کے آخری مرحلہ میں پہنچ رہی تھی۔

دین مذہب نہیں، اس کا قیام ہمیشہ اپنی مملکت کا متقاضی ہوتا ہے

اسے یاد رکھیے کہ اسلام صرف اپنی آزاد مملکت ہی میں بروئے کار آ سکتا ہے۔ یہ مذہب نہیں ہے کہ مملکت اور حکومت کسی قسم کی ہو، اس میں اپنے طور پر خدا کی پوجا پاٹ، پرستش کر لی جائے تو مذہب کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اس میں خدا کے قوانین و احکام کو مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کرنا ہوتا ہے اور یہ صرف قانون کے نافذ کرنے کی بات نہیں بلکہ پورے معاشرے کو بدلنا ہوتا ہے اور اس کی ابتدا خود افراد کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرنے سے ہوتی ہے۔ اسے بھی یاد رکھیے کہ یہ قوانین خداوندی یا نظام خداوندی یا اسلامی مملکت کے اندر قوانین مکینکلی نافذ نہیں ہوتے، مشینی اعتبار سے نافذ نہیں ہوتے۔ مشین کو چلانے کے لیے اس ڈرائیور کا Technically (تکنیکی طور پر) قابل ہونا ضروری ہے، وہ جانتا ہو کہ مشین کیسے چلتی ہے، اس کے کیریکٹر سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ جب بھی ڈرائیونگ کا سرٹیفکیٹ دیتے ہیں تو یہی دیکھتے ہیں کہ وہ موٹر چلانا جانتا ہے یا نہیں، یہ نہیں دیکھتے کہ اس کا کیریکٹر کیسا ہے، اس کی سیرت و کردار کس قسم کی ہے۔

اسلامی مملکت کی بنیاد سیرت و کردار کی محکم بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور یہی نبی اکرم ﷺ نے کیا

سیکولرازم کے اندر بھی یہ جو قوانین نافذ ہوتے ہیں وہ مکینکلی نافذ ہوتے ہیں، ان کے لیے صرف قانون جاننے کی استعداد و قابلیت ہی ضروری ہوتی ہے، سیرت و کردار کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اسلامی نظام یا مملکت اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے، یہاں سب سے پہلے افراد کی سیرت و کردار کی تطہیر ہوتی ہے، اس کی پاکیزگی ہوتی ہے اور اس قسم کے کردار کے لوگ جب اس نظام کو قائم کرتے ہیں تو پھر وہ صحیح معنی میں اسلامی نظام بنتا ہے۔ یہ مرحلہ بڑا لمبا ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت کسی ملک کو فتح کرنے سے قائم نہیں ہو سکتی، بنی بنائی ہوئی نہیں مل سکتی اور یہ وہ تھا پروگرام جو ہم دیکھتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کی مکے کی تیرہ سالہ زندگی، جس میں عام معیاروں کے مطابق نظر آتا ہے کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا، درحقیقت سب کچھ وہی ہو رہا تھا۔ وہاں افراد کی تربیت ہو رہی تھی، تعلیم دی جا رہی تھی، انہیں اتنی بڑی ذمہ داری کو سنبھالنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، پھر مدینے کے اندر آ کر بھی ابتدا تو ہو گئی تھی، مملکت کی چھوٹے سے پیمانے ہی پہ سہی۔ حضور ﷺ نے یہاں آنے کے بعد یہودیوں وغیرہ سے جو پہلا معاہدہ کیا ہے وہ بھی مملکت کی سطح پر تھا۔ یہ ابتدا اس کی ہو تو گئی تھی لیکن بتدریج آہستہ آہستہ یہ اپنے تکمیل تک پہنچتی ہے تو ساتھ ہی ساتھ تعلیم و تربیت کا سلسلہ بھی جاری تھا اور پھر مملکت کے مختلف گوشوں کی تکمیل بھی ساتھ کے ساتھ جاری تھی۔

ظہورِ اسلام سے پہلے اہلِ عرب کی ذہنی تمدنی اور علمی سوچ

عربوں کے ہاں اس سے پہلے کوئی نظامِ حکومت تھا ہی نہیں۔ وہ منظّم حکومت کے تصور سے بھی آشنا نہیں تھے۔ ان کی قبائلی زندگی تھی،

جسے آج آپ پنچائتی زندگی کہہ لیجئے' گاؤں کی زندگی کہہ لیجیے۔ وہ کوئی معاملہ بھی ہو' گاؤں کی پنچائت بیٹھتی تھی' ان میں سے بڑے کچھ فیصلہ دیتے تھے' اس فیصلے پر عمل ہو جاتا تھا۔ منظّم حکومت تو وہ جانتے ہی نہیں تھے تو پہلی چیز تو ان میں جب یہ منظّم حکومت یا مملکت قائم ہوئی تو اس کے جو آداب و قواعد اور قوانین تھے' ان کی بھی تعلیم دینی پڑی' پھر ان کی تہذیب اور تمدن کی سطح ہی یہ تھی۔ آپ دیکھیں اگر صرف قرآن کریم سے ہی دیکھا جائے تو وہ سطح کیا تھی تو کیفیت یہ ہے کہ قرآن حمید ان سے یہ کہتا ہے کہ بابا! کہیں کسی کے گھر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو باہر کھڑے ہو کر آواز دے کر مانگا کرتے ہیں' یونہی شباشب گھر کے اندر نہیں چلے جایا کرتے' ان سے بھی کہا جاتا تھا کہ اگر تمہیں کھانے پہ بلایا جائے تو یہ نہ کیا کرو کہ ہانڈیاں ابھی چولہے پر رکھی ہوئی ہیں اور تم آ کر بیٹھ جاؤ اور وہیں کھانے کے بعد' گپ شپ میں لگ جاؤ۔ تمہیں پتہ ہے کہ اس سے اہلِ خانہ کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ انہیں یہ بھی بتانا پڑتا تھا کہ چلا چلا کر نہیں بولا کرتے' اکڑ اکڑ کر نہیں چلا کرتے یعنی یہ جو چھوٹی چھوٹی جسے ہم آدابِ معاشرت کہتے ہیں' انہیں اس کی بھی تعلیم دینا پڑتی تھی تو گویا معلوم ہوا کہ تعلیم میں تہذیب اور تمدن کی جو کم از کم سطح کوئی ہو سکتی ہے' وہ اس پر تھے۔

فتح مکہ کے بعد شورائیت کا نظام قائم کیا' آداب و قوانین سکھائے اور دنیائے عرب کے علاوہ ایران و روما کی تہذیب و تمدن تک بدل دیا

یہ عرب یہی لوگ تھے جو اسلام لائے اور پھر اس تعلیم اور تربیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ہزار ہا سال پر مشتمل ایران اور روما کی تہذیبیں ان کے ہاتھوں سے نہیں کہ الٹ پلٹ ہو گئیں بلکہ ان کی جگہ ایک ایسا صحیح نظام تہذیب و تمدن قائم کیا کہ جس کی روشنیاں آج تک دنیا کے اندر ضوفشاں ہیں لیکن اس وقت انہی عربوں کی کیفیت یہ تھی۔ اب ہم اس مقام پہ پہنچ رہے ہیں۔ اس سورۃ سے آگے ہم چلیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ گویا اب ایک نیا انقلابی دور شروع ہوتا ہے جس میں مملکت کے آداب و قوانین بھی سکھائے جا رہے ہیں اور افراد کی تہذیب اور تمدن بھی بلند کی جا رہی ہے۔ یہ دونوں قسم کے احکام اب آپ کو ملیں گے اور اس کی ابتدا سورۃ الحجرات سے ہوتی ہے۔ حجرہ تو آپ جانتے ہیں چیمبر یا کمرے کو کہتے ہیں' حجرات اس کی جمع ہے' تو اس اعتبار سے آگے بات آئے گی کہ اس سورۃ کا نام یہی حجرات ایک لفظ سے آئے گا۔

ابتداء ہوتی ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (49:1)۔ پہلی ہی آیت میں ایک منظّم حکومت کا جو بنیادی قاعدہ یا قانون ہے' اسے سامنے لایا گیا۔ اس سے پہلے میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی زندگی بالکل انفرادی زندگی یا زیادہ سے زیادہ قبائلی زندگی' پنچایتی زندگی تھی لیکن اب تو ایک مملکت ہے' ایک منظّم جماعت ہے' اس کا ایک سربراہ ہے' اس کے قاعدے ہیں' قانون ہے' سب سے پہلے شورائیت اس کا بنیادی قاعدہ تھا' مشورہ کیا جاتا تھا' اس مشورے کے بعد

سربراہِ مملکت فیصلہ دیتا تھا' اس فیصلے کو نافذ کیا جاتا تھا' اس کا اتباع ضروری تھا' تو پہلی بات تو ان سے یہ کہی کہ جب تک اس مرکز کی طرف سے کسی معاملہ کے متعلق' یہ فیصلہ نہ ہوجائے یونہی اپنے ہی طور پر فیصلہ کرکے کوئی قدم نہ اُٹھالیا کرو کہ اس میں یہ ہونا چاہیے اور آپ اس پر عملی اقدام بھی شروع کردیں' انتظار کیا کرو' اب یہ معاملات ایک نظم ونسق کے تابع طے ہوں گے اور اس کا یہ طریق ہوگا کہ سربراہِ مملکت امت کے مشورے سے کوئی فیصلہ لے گا اور اس فیصلہ پر کاربند ہوا جائے گا۔

اللہ اور رسول کی قرآنی اصطلاح کے برعکس اب اللہ اور رسول کے متعلق مذہب کی دنیا میں ایک الگ تصور پیش کیا جاتا ہے

یہ جو ہے کہ لاَ تُـقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49:1) ان کے فیصلے سے پہلے ہی کوئی فیصلہ نہ کرلیا کرو اور اس طرح کوئی قدم نہ اُٹھالیا کرو۔ پہلی چیز تو یہ کہی۔ یہاں ایک اصطلاح آئی ہے' میں سوچ رہا ہوں کہ اس مقام پر اس کی تفصیل تو نہیں بیان کی جائے گی۔ یہ بڑی اہم چیز ہے۔ یہاں اللہ اور رسول کا لفظ آیا ہے کہ اللہ اور رسول کے فیصلے سے پہلے ہی تم لوگ کوئی قدم نہ اُٹھالیا کرو۔ یہ ''اللہ اور رسول'' کیا اصطلاح ہے۔ یہ وہ اصطلاح ہے کہ جس کے صحیح مفہوم سے اسلامی نظام کی ساری کنہ وحقیقت سمجھ میں آئے گی اور مذہب میں اس کے غلط مفہوم سے یہ تمام انتشار اور خلفشار اور اختلاف اور افتراق' جو قوم کے اندر ہے' وہ اس کی وجہ سے ہے' وہ چلا آرہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ موجودہ اسلام تو ہمارے ہاں ہزار برس سے مذہب ہی چلا آرہا ہے۔ کہا ہے کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اطاعت کرو اور رسول کی۔ اب ان کے ہاں میں عرض کروں گا کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ جب اسلامی نظام قائم تھا تو اس کا صحیح مفہوم موجود تھا' اس کے بعد جب یہ نہ رہا تو پھر انہوں نے کہا کہ اطیعوا اللہ تو اطاعت اللہ کی کرو۔ یہ قرآن شریف ہے' اس کی کتاب ہے' اس کی اطاعت کرو۔ اب رہا یہ سوال کہ رسول کی اطاعت کیسے کی جائے۔ اس ضرورت کے تحت رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کردہ ارشادات' جنہیں احادیث یا روایات کہا جاتا ہے' ان کو مرتب کرنے کی' جمع کرنے کی ضرورت پیش آئی' اس سے پہلے یہ کسی جگہ جمع ہی نہیں تھیں۔ یہ تیسری صدی میں ہوئیں اس لیے کہ اطیعوا الرسول کا مفہوم سمجھ نہیں آتا کہ کس طرح سے رسول کی اطاعت کریں۔ اب اس کے بعد میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔

حدیثوں کے مختلف مجموعوں میں اختلافات کی انمٹ نوعیت

بار بار یہ چیزیں آچکی ہیں کہ یہ احادیث کے مجموعے کیسے مرتب ومدون ہوئے' کس طرح احادیث جمع ہوئیں؟ پھر انہوں نے ان لاکھوں حدیثوں کو پرکھا' اپنے قیاس کے مطابق لاکھوں مسترد کریں' ان میں سے چند ہزار کو منتخب کرکے اپنے مجموعے میں داخل کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے لیے نہ تو خدا کی کوئی سند تھی' نہ رسول ﷺ کی کوئی سند تھی کہ فی الواقعہ یقینی طور پر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات تھے' پھر حدیث

کی مختلف کتابوں میں ایک دوسرے سے اختلاف تو ایک طرف' خود کسی ایک مجموعے کو بھی اُٹھا کر دیکھیے' اس میں باہمی اختلاف ملے گا۔ آپ کو یاد ہے پچھلے ہی درس میں' میں نے یہ عرض کیا تھا کہ اس قسم کے اختلافات کتنے ہی ہیں۔ اعتقادی یا تصوراتی یا نظریاتی اختلاف کی بات تو اور ہوتی ہے وہ تو Abstract (غیر محسوس) ہوتے ہیں۔ تاریخی واقعات کے متعلق اختلاف بتایا تھا کہ بخاری کے مجموعے میں یہ جو صلح حدیبیہ ہے' اس میں ایک روایت میں تو یہ کہا گیا ہے کہ قریش نے منع کر دیا تھا کہ ہم مکے میں داخل نہیں ہونے دیں گے' مکے سے باہر ہی ان کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا کہ اگلے سال آ یئے تو ہم آپ کو اجازت دیں گے اور صحابہؓ وہیں سے واپس آ گئے تھے اور وہیں دوسری روایت یہ ہے کہ اسی سال قریش نے اجازت دے دی تھی اور حضورﷺ بمعہ جماعت تین دن مکے میں رہے تھے' وہاں یہ سب کچھ کیا تھا اور پھر واپس آئے تھے۔ یہ ایک مجموعے میں ساتھ کے ساتھ دو روایتیں ہیں اور یہ تو تاریخی بات ہے۔ ان میں اتنا تضاد ہے تو احکام میں یا عقائد میں یا نظریات میں جو اختلافات ہیں' ان کا تو پوچھیے نہیں۔ یہ ہیں وہ اختلافات جو مٹ ہی نہیں سکتے۔

اللہ اور رسول کی اصطلاح کا مفہوم اسلامی مرکزِ ملت ہے

مجھے یاد آ گیا' آپ کو شاید ایک ہفتے کا اور انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ جو اگلے ماہ کا طلوعِ اسلام آ رہا ہے' اس میں میرا ایک بڑا مفصل اللہ اور رسول کے صحیح مفہوم پر مضمون آ رہا ہے۔ شاید یہ چالیس سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں میں نے بتایا ہے کہ اللہ اور رسول کی اصطلاح کا قرآن کریم کی رو سے مفہوم کیا ہے۔ میں عمر بھر کے تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ جب تک اس کا صحیح قرآنی مفہوم متعین ہو کر ذہن میں نہیں آئے گا کوئی ایک قدم بھی آپ مسلمانوں کا بالاتفاق' اجتماعی طور پر' متفقہ علیہ' نہیں اُٹھ سکے گا' اختلافات رہیں گے اور اپنے اپنے فرقے کے مذہب یہاں ہوں گے' اسلام نہیں ہوگا' مسلمانوں کا کوئی متفق علیہ نظامِ حکومت تک نہیں بن سکے گا تو اس کے لیے تو آپ انتظار کر لیجیے۔ آپ سوچ لیجیے کہ یہ موضوع کتنا پھیلا ہوا ہے کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اس پہ شاید چالیس پینتالیس صفحے میں وہ مضمون آیا ہے۔

اس وقت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن حکیم کی رو سے اس اصطلاح کا مفہوم ہے ''اللہ تعالیٰ کے احکام اور قوانین پر مشتمل نظام' جسے عملاً رسول اللہﷺ نے قائم کیا تھا''۔ اللہ اور رسولﷺ یوں آتا ہے' اس میں نظامِ خداوندی مراد ہے۔ خدا تو وہ ہے کہ جو قیاس وخیال وگمان ووہم میں بھی نہیں آتا چہ جائیکہ کسی کے سامنے آ کر وہ حکومت قائم کرے اور کسی کو حکم دے۔ اس نے اپنے احکام کتاب کے اندر مندرج کر کے' کتاب کے اندر محفوظ کر کے' امت کو دیئے' رسول کو دیئے۔ خالی کتاب بھی تدریجی ہوتی ہے' محسوس نہیں ہوتی' کتاب حکومت نہیں کر سکتی' کتاب حکومت کرنے کے اصول وقواعد اور قوانین اپنے اندر رکھتی ہے۔ قرآن حمید میں تو یہ ہوا۔ اب ان کو کون نافذ کرے گا؟ کس وقت' کونسا حکم نافذ کیا جائے گا؟ کون فیصلہ کرے گا؟ ظاہر ہے کہ ایک محسوس اتھارٹی کی ضرورت ہے۔ کوئی مملکت قائم

ہی نہیں ہوسکتی خواہ اس میں کتنے ہی اچھے قوانین کے مجموعے کیوں نہ ہوں۔ اگر ایک محسوس اتھارٹی، جسے سربراہ مملکت کہتے ہیں، جسے مرکزِ امت کہا جاتا ہے، وہ موجود نہ ہو۔ یہ فی الحقیقت ہے، یہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت تھی۔ وہ سب سے پہلی اسلامی مملکت کے سربراہ تھے جو خدا کے احکام وقوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ داری لیے ہوئے تھے تو اس وقت تو آپ اجمالاً اس بات کو سمجھ لیجیے کہ یہ جو اللہ اور رسول کی قرآن کریم میں اصطلاح آئے گی، تو یہ نظامِ اسلامی کے لیے آئے گی، اس کے سربراہ کے لیے آئے گی، اس مملکت کے فیصلے کے لیے آئے گی۔ یہ ہے اس کا عملی مفہوم۔ اب بات صاف ہوگئی کہ ان سے کہو کہ اللہ اور رسول کے فیصلے سے پہلے ہی کوئی قدم نہ اُٹھالیا کریں، انتظار کیا کریں کہ اللہ اور رسول کا فیصلہ، اسلامی مملکت کا فیصلہ، اسلامی نظام کا فیصلہ صادر ہوگا۔ اب ان کو یہ ایک نظم وضبط کی مملکت کے تابع رہنے کی تعلیم دی جارہی تھی کہ اب یہ بات نہیں جیسے پہلے تھے کہ جس طرح سے کسی کا جی چاہا اس نے پہلے فیصلہ کرلیا اور جو کام جی چاہے کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ نہیں ہوگا، اب انتظار کرنا ہوگا کہ مرکزِ مملکت کی طرف سے کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس اصطلاح کا کوئی دوسرا ترجمہ نہیں ہوسکتا تھا۔ قرآن کریم کی اپنی اصطلاح ہے۔ اسے یاد رکھیے یعنی آپ حیران ہوں گے کہ مجھ سے بھی آپ گزشتہ پچیس تیس سال سے قرآن کریم کے قوانین سنتے چلے آرہے ہیں اور یہی عام کہا بھی جارہا ہے۔

قرآنِ حکیم میں نہ تو قانون کا لفظ ہے اور نہ ہی حکومت کا: قرآن کریم نے مرکزِ ملت کی اصطلاح استعمال کی ہے کہ فیصلہ اسی کا چلے گا

عزیزانِ من! قانون کا لفظ ہی قرآن حکیم میں نہیں ہے۔ آپ حکومتِ خداوندی، اسلامی حکومت، سنتے چلے آرہے ہیں۔ حکومت کا لفظ بھی قرآن کریم میں نہیں ہے۔ حکم کا لفظ تو ہے۔ اس معنی میں حکومت ہے، نظامِ خداوندی ہے، نظامِ اسلامی ہے۔ نظام کا لفظ بھی قرآن کریم میں نہیں حتیٰ کہ عدالت کا لفظ بھی نہیں ہے۔ یہ ہمارے زمانے کی اصطلاحات ہیں، قرآن کریم کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ ان اصطلاح میں اس نے اللہ اور رسول کہا ہے۔ یہ بڑی ہی جامع اصطلاح ہے۔ اس میں سب سے بنیادی چیز تو اللہ کی حکومت آگئی۔ اللہ کی حکومت انسانوں کے ذریعے سے اس دنیا کے اندر قائم ہوگی اور سب سے پہلے قائم کرنے والے رسول اکرم ﷺ تھے تو اس دور کے لیے قرآن کریم نے اپنی یہ اصطلاح وضع کرکے نافذ کی یعنی اللہ اور رسول کا حکم یعنی نظامِ خداوندی کا حکم، جو سربراہِ مملکت نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے طے ہوتا تھا اور نافذ کیا جاتا تھا۔ اب بات صاف ہوگئی کہ اے جماعتِ مومنین! اب تمہاری زندگی پہلے کی سی تشتت اور افتراق کی زندگی نہیں رہی، اب تم نظم وضبط کے تابع آگئے، ایک نظامِ حکومت قائم ہوگیا، اب جو معاملہ بھی پیش ہو اس میں انتظار کرو کہ مملکت وحکومت کی طرف سے کیا فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ اس سے پہل نہ کرو، اس سے پہلے ہی کوئی فیصلہ نہ کربیٹھو، نہ کوئی عملی قدم اُٹھاؤ، اب

انفرادی زندگی نہیں رہی، اجتماعی زندگی آ گئی تو یہاں بات صاف ہوگئی کہ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49:1) نظامِ اسلامی یا اسلامی مملکت کے فیصلے سے پہلے ہی خود کوئی فیصلہ کر کے قدم نہ اُٹھالیا کرو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ (49:1) اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ دیکھیے! بنیاد وہی قوانینِ خداوندی، احکامِ خداوندی کا نافذ کرنا ہے لیکن اس کی عملی شکل یہ ہے کہ وہ ایک نظامِ حکومت کے تابع نافذ ہوں گے۔ بہرحال وَاتَّقُوا اللّٰهَ (49:1) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (49:1) اب یہ وہ خدا ہے کہ جو سب کچھ سنتا بھی ہے، جانتا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ تم فیصلے کس طرح کرتے ہو۔

عزیزانِ من! اب اسی کے بعد اگلی آیت آ گئی۔ کہا ہے کہ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (49:2)۔ پھر یہ اسی کے ضمن میں دوسری چیز یہ ہے۔ وہاں تو یہ تھا کہ تم کسی معاملے میں پہل نہ کرو، انتظار کرو۔ یہاں یہ ہے کہ کسی فیصلے سے بالا نہ تمہارا فیصلہ ہو جائے، بلند ترین فیصلہ، بلند ترین آواز، نبی کی آواز ہوگی۔ اب یہاں آواز کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی آواز سے اونچی آواز نہ نکالا کرو۔ یہ تو ایک مملکت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔ آواز کے معنی ہی فیصلہ ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ اس فیصلے کے اوپر تمہارا کوئی فیصلہ نہیں ہونا چاہیے، تمہیں اس کے تابع چلنا ہے۔ اب اس لیے یہ جو یہاں سے خدا کا قانون نافذ ہوگا، جو تمہارا رسول ﷺ نافذ کرے گا، اس کی بالادستی کو قبول کرو، اس کی حاکمیت کو قبول کرو، اسی کی اطاعت کرو، اس سے بالا تمہارا اپنا کوئی خیال یا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک مجلس کے آداب اور ان کی اہمیت اور ہمارے ہاں کی تصویر کشی

پھر یہ بھی نہ ہو کہ جب مشورہ کرنا ہے تو ایک دوسرے سے چیخ چاخ کر اور اِدھر اُدھر شور مچا کر اُٹھ کر چلے جاؤ۔ مجلسِ مشاورت کے آداب بھی سکھائے گئے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ تو چودہ سو سال کی بات ہے، قرآن حمید جاہلیت عرب کی بات کر رہا ہے، جس میں نہ تہذیب تھی، نہ تمدن۔ آج کے دور میں آپ آ جائیے اور اپنے مختلف کسی قسم کی مجالس کو ذہن میں رکھیے جہاں کوئی مسئلہ پیش ہو اور مشورہ بھی کرنا ہو۔ دو چار منٹ تک تو یہ سننے والے انتظار کرتے ہیں کہ کسی ایک کی بات سن لی اور اس کے بعد ایک اِدھر سے بول رہا ہے، کچھ کہہ رہا ہے، دوسرا کہتا ہے: ''او چپ کر! اے تینوں کی تکلیف ہیگی اے۔ چپ کر، او ساری مجلس جیہڑی اے چپ کران تے لگ جاندی اے'' (خاموش ہو جاؤ۔ کہتا ہے کہ تجھے کیا تکلیف ہے؟ خاموشی اختیار کرو۔ وہ ساری مجلس اسے خاموش کرانے لگ جاتی ہے)۔ اور اس کے بعد مجلس برخواست ہو جاتی ہے۔ آپ نے بیشتر مجالس دیکھی ہوں گی کہ معاملہ زیرِ بحث کے بعد ایک دوسرے سے شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور کوئی فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا۔ اگر وہ اس قسم کے متشابہات و محکمات تک نہ پہنچیں یعنی وہ فسادت تک نہ بھی پہنچیں تو مجلس تو برخواست

ہو جاتی ہے۔

یہاں کہا ہے کہ **بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ** (49:2) جس طرح سے تم آپس میں باتیں کرتے ہوئے شور مچایا کرتے تھے اور اُٹھ کر چلے جایا کرتے تھے' مجلسِ مشاورت میں وہ انداز نہیں ہوگا۔ آدابِ مجلس یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ وہ جو تمہارے ہاں کا مرکز ہے' نبی ہے' رسول ہے' جو مجلس کو Conduct کر رہا ہے' اس کا فیصلہ کیا ہے۔ تم بولو بھئی! خاموش رہو۔ جی! اب آپ نے کیا فرمایا۔ یہ آدابِ مجلس بھی انہیں سکھانے پڑ رہے تھے کہ یوں شور مچا کر اُٹھ کر نہ چلے جایا کرو کیونکہ **اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ** (49:2) ہے۔ تمہارا کیا کرایا سب کچھ غارت ہو جائے گا۔ ان مجلسوں کا ذہن میں کچھ نقشہ یوں ہوتا ہے کہ جس میں اس قسم کے معاملے پیش ہوتے ہیں۔ میری تو اسی کے اندر زندگی گذر گئی اسی لیے کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو جمہوریت راس ہی نہیں آ سکتی۔ ان کو جو ابتدائی آدابِ جمہوریت ہیں' وہ بھی نہیں آتے' مجلس میں شور مچ جاتا ہے اور اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور پھر چلے جا رہے ہیں' اور دس بیس بھی ہیں' دس بیس اپنی اپنی باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں' اونچی اونچی آواز سے کرتے چلے جا رہے ہیں' ایک دوسرے کو طعن' ایک دوسرے پہ تعریض' ایک دوسرے پہ تنقید کرتے جا رہے ہیں اور کوئی معاملہ طے نہیں ہوتا۔ اِن کی پارلیمان کے اندر آپ کو کچھ یاد ہے' اب جو بنگلہ دیش' مشرقی پاکستان کے اندر اسپیکر کو ہال کے اندر مار ہی دیا تھا' کرسیاں تو روز چلتی ہیں۔ آج بیسویں صدی میں جب باقی دنیا کے آدابِ محافل ان کے سامنے ہیں' ان کی کیفیت یہ ہے۔ چودہ سو سال پہلے کا عرب' جو اس سے آشنا ہی نہیں تھا' اور مختلف قبائل کے لوگ ایک مجلس کے اندر اکٹھے کیے ہوئے تھے' ان کو یہ بھی سکھانا پڑتا تھا کہ مشاورت کے آداب کیا ہیں۔ آپ نے غور کیا کہ رسول کی ذمہ داریاں کتنی عظیم اور کتنی کٹھن منزل تھیں۔ آپ ﷺ کو انہیں یہ کچھ سکھانا پڑتا ہے۔ **وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ** (49:2) یہ ہوگا تمہاری اس روش کا غیر شعوری طور پر نتیجہ۔

ابھی دیکھیے اور آگے بات ہے کہ کیا کچھ ان لوگوں کو سکھانا پڑتا تھا۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى** (49:3) یاد رکھو! بات تمہیں سمجھا دی گئی کہ جو لوگ یہاں بیٹھے ہوئے رسول کی آواز سے اپنی آواز کو نیچے رکھیں گے۔ ترجمہ یہی ہے اور بات آپ نے سمجھ لی کہ آواز کو نیچے رکھنے کے معنی کیا ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا اس مقصد کے لیے خالص کر لے گا۔ یہ ہیں جو اس مقصد کے لیے خالصتاً تیار ہوں گے۔ یہ چیزیں سیکھنی پڑیں گی' تمہیں ان پر عمل پیرا ہونا پڑے گا' یہی ہیں وہ چھوٹی چھوٹی سی بحثیں جن سے یہ پتہ چلے گا کہ تم خلوصِ نیت سے اس مملکت کے اندر آ رہے ہو یا فتنہ اور فساد پیدا کرنے کے لیے آ رہے ہو۔ یہ **اِمْتَحَنَ** (49:3) ہے۔ جسے امتحان کہتے ہیں' یہ محنت سے ہے۔ اس کے معنی ہوتا ہے کسی چیز کو واضح کر دینا' غلط کو صحیح سے الگ کر دینا' کھوٹے کو کھرے سے الگ کر دینا۔

وحی کی روشنی میں معاشرتی آداب کی ایک جھلک اور ہماری زندگی کے معمولات کی ایک کہانی

اس سورۃ میں بھی اور آگے بھی' یہ باتیں آئیں گی۔ یہ بڑی چھوٹی چھوٹی سی باتیں آپ کو نظر آئیں گی یعنی یہ کہنا کہ گھر سے باہر آواز دے کر چیز مانگا کرو' آپ یہ کہیں گے کہ یہ تو بڑی چھوٹی سی بات ہے لیکن اس سے یہ نظر آتا ہے کہ اس دور کے وہ یہی لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ ان کی معاشرتی سطح کیا تھی کہ ان کو یہ بھی بتانا پڑتا تھا کہ کسی کے گھر سے کوئی چیز مانگنی ہو تو باہر کھڑے ہو کر مانگا کرتے ہیں' کھانا کھانے کے لیے آیا کرتے ہیں تو پہلے نہیں آ بیٹھتے۔ اس سے نبی اکرم ﷺ کے اس انقلاب کی اہمیت پتہ چلتی ہے جو حضور ﷺ لائے۔ اس سطح پر وہ لوگ تھے اور ان کو اس سطح پر پہنچا دیا کہ ان کے قائم کیے ہوئے جو سلطنت اور حکومت کے نظریات اور تصورات ہیں' وہ دنیا کے لیے شمع راہ بنتے چلے آرہے ہیں۔ صاحب! ان لوگوں کے قرآن کریم کے احکام یہ تھے اور رسول اللہ ﷺ کی تربیت یہ تھی کہ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِم (2:129) حکمت کی' دلائل کی' تدبر کی' شعور کی' تعلیم دیتا ہے اور ان کی ان صلاحیتوں کو نشو ونما دیتا ہے جو انسان کی صلاحیتیں ہیں اور کہا کہ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ (49:3) یہ ہیں' جن کو نقصانات سے ازالہ بھی ہو جاتا ہے اور پھر اس کا عظیم اجر بھی ساتھ ملتا ہے۔

اب آئی اگلی بات۔ کہا ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (49:4) کہنے لگا کہ ان میں سے یہ جو تمہارے گھر سے باہر ہی کھڑے ہو کر چلانا شروع کر دیتے ہیں' آپ کو آوازیں دینی شروع کر دیتے ہیں' انتظار کرو' وہ باہر آئیں گے تو آپ کی بات سن لیں گے۔ اب یہ باہر کھڑے ہیں' ڈھول بجا رہے ہیں۔ پھر میں بار بار عرض کروں کہ بتایا یہ جا رہا ہے' قرآن کریم کا ان چیزوں کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ان لوگوں کی معاشرتی سطح کیا تھی۔ کہا ہے کہ هُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (49:4) نے بات بتادی کہ یہ کوئی جرم اور گناہ کی بات نہیں بلکہ کہا یہ جا رہا ہے کہ ان کی عقلی سطح بھی ایسی تھی کہ خود یہ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے کہ باہر کھڑے ہو کر چلا چلا کر کسی کو نہیں بلانا چاہیے اور اس طرح سے دستک دینی چاہیے' کھٹکھٹا دینا چاہیے' کسی کے ہاتھوں پیغام پہنچانا چاہیے' ورنہ انتظار کرنا چاہیے۔ یہ بھی انہیں وحی کے ذریعے سمجھانا پڑ رہا تھا کہ کسی کو بلانا ہو تو باہر کھڑے ہو کر چلایا نہیں کرتے۔ میں پھر عرض کروں کہ ان واقعات کو بیان کرنے سے قرآن کریم کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ سطح تھی جن کے ہاتھوں یہ انقلابِ عظیم برپا کرایا گیا اور یہ ہمارے' آپ کے لیے' قیامت تک کے لیے ہے۔ ہم تو اس جاہلیت کی سطح سے بھی پیچھے پہنچے ہوئے ہیں' اس لیے ہمارے لیے یہ ابدی حقائق ہیں۔ قرآن کریم نے جو بیان کیے ہیں یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں نہیں ہیں۔ کہا ہے کہ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (49:5) اس میں ذرا سا انتظار کریں۔ جو بات کرنی ہے' آدابِ محفل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کریں۔ انہیں

باہر آ ناہی ہے اس وقت یہ بات کرو۔ اب تمہیں کیا معلوم ہے کہ وہ اندر کس کام میں مصروف ومشغول ہے فرصت بھی ہے یا نہیں۔

عزیزانِ من! ابھی پھر عرض کر دوں۔ یہ بظاہر حقیقت میں بڑی چھوٹی چھوٹی سی باتیں نظر آئیں گی میں نے کہا کہ دو مقصد ہیں: ایک تو ان لوگوں کی معاشرتی عقلی شعوری سطح یہ تھی اور دوسرے ہم لوگوں کے لیے ابدی طور پر ان احکام کے اندر آداب معاشرت آدابِ حکومت مضمر ہیں۔ ہمارے لیے بھی ان کے اندر تعلیم اور فرحت آمیزی کے سامان موجود ہیں۔ اس کے بعد ایک بڑی اہم بات ہے۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ(49:6) اے رسول! اپنی جماعت سے بھی کہہ دو کہ جب کوئی مفسد پرداز تمہارے پاس کسی معاملہ کی خبر لائے تو فوراً اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو بلکہ اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بلا تحقیق کوئی ایسا قدم اُٹھا لو جس سے کسی پارٹی کو محض تمہاری جہالت کی وجہ سے نقصان پہنچ جائے اور اس کے بعد تمہیں اپنے کیے پر خود ہی پچھتانا پڑے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ یا تو ایک ایسی بات ہے یا اس مفسد پرداز کی بات ہے۔ اس کے لیے تو ہمارے ہاں Classes قائم ہونی چاہئیں۔ کہا یہ ہے کہ اگر کوئی فساد پھیلانے والا شخص کوئی دوسرا پیکر اختیار کیے جائے اس کو فاسق کہتے ہیں اور تم میں سے نہیں ہو اور وہ آ کر کوئی خبر پھیلائے کوئی سرگوشی کی بات کرے تو اس بات کو لے کر اڑ نہ جایا کرو اس کو اڑا نہ دیا جائے پھیلانا نہ شروع کر دیا جائے پہلے اس بات کی تحقیق کرو کہ آیا وہ صحیح ہے۔ تحقیق کے بعد اس نتیجے پہ پہنچو کہ صحیح ہے۔ ابھی میں عرض کرتا ہوں کہ اس ضمن میں باقی احکام کیا ہیں۔ آپ نے احساس کیا کہ یہ کتنی اہم چیز ہے!

ہمارے ہاں یہ جتنی خرابیاں دنگے فساد بربادیاں ہوتی ہیں وہ اس چیز سے پیدا ہوتی ہیں کہ کوئی بات جو ہم سے آ کر کرتا ہے ہم اس کی کبھی تحقیق نہیں کرتے اور پھر یہ تو ہماری ایک عام نفسیاتی کیفیت ہے کہ اگر کسی کی کوئی اچھی بات آ کر کہے کہ صاحب! وہ بڑا منکسر المزاج ہے بڑی اچھی چیز ہے دو تین فقرے تو آپ سنیں گے اور اس کے بعد آپ اس کے حق میں جو کہا جا رہا ہے اس سے تنگ آ ئیں گے: او کہنے لگا: میاں! اسبغول وچوں نہ پھول۔ تینوں کی پتہ ”اندروں کی ہیگا وے“ یعنی ہم کسی کی تعریف کی بات کسی کی نیکی کی بات سن ہی نہیں سکتے۔ (مثلاً یہ کہ) میں نے بڑے بڑے دیکھے ہیں اس کے باپ سے پتہ چلتا ہے آدمی کا کیا ہوتا ہے ایسے ہی نہیں کسی کے حق میں کہہ دیتے“ اور جو کوئی اس کے خلاف کہنے والا آتا ہے تو پھر آہاہا! کان لگا لگا کر کہتے ہیں کہ اچھا! یہ ہمیں تو پہلے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ جو بہت نیک بنتا پھر رہا ہے میاں صاحب کا پتہ نہیں اندر سے کیا بات ہوتی ہے۔ یہ وہ بھی کچھ اس کے متعلق کہتا ہے: اچھا! تو پھر کیا ہوا؟ طلسم ہوشربا کی طرح لگے ہوئے ہیں مزا لے لے کر۔ یہاں سے سنا وہاں جا کر بیٹھ گئے: میاں! کچھ سنا تم نے؟ میں نے سنا نہیں کہ یہ صاحب جو ہیں بہت بنے پھرتے ہیں۔ ان کے متعلق کچھ سنا ہے؟ میں نے نہیں سنا ہے ویسے ہمیں اس سے کیا واسطہ اس کی گور میں ہم نے نہیں جانا ہے اپنی گور میں جانا ہے لیکن اک بات ہے جو آئی ہے جس کے لیے میں نے کہا اور آپ کو بتاتا ہوں کسی سے ذکر نہ کرنا

اس بات کا۔ ہمیں اس سے کیا غرض ہے اور پھر لگے بات کرنے اور شام تک دیکھیے' سارے شہر میں ڈھنڈورا پٹ جائے گا اور متعین طور پر کوئی نہیں بتا سکے گا کہ کہاں سے بات چلی ہے۔ اس قسم کے سیاسی حربے تو سیاسی جماعتیں بھی اختیار کرتی ہیں۔ جسے آپ کہتے ہیں کہ صبح ہوئی' وہاں بیٹھے' اپنے ہاں وہ شادی کے دفتر میں بیٹھے۔ کیوں جی! آج پھر کس کی بات سنائیں گے؟ یہ فلاں کے خلاف ہوگا' بہت اچھا جناب اور یہ چلے باہر اور شام تک پھر دیکھیے کہ اس غریب کا کیا حشر ہوتا ہے۔

معاشرتی روابط کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ یہ جو تعلیم دی جارہی ہے وہ کتنی اہم ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ پہلی بات تو اس نے یہ کہی تھی کہ جب کوئی خبر لائے تو اس کو یوں نہ پھیلایا کرو' پھر وہ بِجَهَالَةٍ۔ یہ سطح بتائی جارہی ہے کہ جہالت سے تم اس قسم کی حرکت کر بیٹھو کہ اس سے تمہاری قوم کو نقصان پہنچ جائے اور پھر تمہیں آخر میں شرمندہ ہونا پڑے' ندامت اُٹھانی پڑے کہ یہ کیا ہو گیا' میں نے یہ کیوں کر دیا صاحب! میرا مقصد تو یہ نہیں تھا۔ اصل میں بڑے بھولے بن کر پھر کہتے ہیں کہ مقصد تو یہ نہیں تھا تو آپ نے تحقیق کیوں نہیں کر لی۔ عزیزانِ من! ایک قرآنِ کریم کا تلقینی حکم تھا جسے کہا جاتا ہے' وہ اگر ہمارے سامنے ہو' اس قوم کے سامنے ہو تو اس قوم کے سینکڑوں فتنے مٹ سکتے ہیں اور وہ یہ حکم ہے کہ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (17:36) جس بات کی خود تحقیق نہ کرو' اس کے پیچھے مت چلا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ اتنے کے ہی اوپر' اگر یہ قوم کاربند ہو جائے تو آپ دیکھیے' اس سے بیسیوں فتنے مٹ سکتے ہیں۔

انسانی ذمہ داریوں کی اہمیت کے معیار کا تعین

کہا ہے کہ وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا (17:36) یاد رکھو! تمہاری نگاہوں سے' تمہارے کانوں سے' تمہارے دل سے' پوچھا جائے گا کہ تم نے اس بات کو آگے پہنچانے سے پہلے خود تحقیق کر لیا تھا کہ یہ صحیح ہے۔ یہ مَسْـُٔوْلًا ہے جو ذمہ دار قرار پائے کہ تمہاری آنکھیں کان زبان قلم ہاتھ عقل شعور اور دل ہر ایک سے' باز پرس ہوگی کہ تم نے اس کے متعلق تحقیق کر لیا تھا۔ یہ ہے قرآن حکیم کا حکم۔ اس حکم کے اوپر ہی اگر ہمارا یہ معاشرہ' ہماری یہ قوم' کاربند ہو جائے' آپ دیکھیے کہ کم از کم پچاس فیصد فتنے تو جبھی ختم ہو سکتے ہیں' اگر ایسی بات آئے' مملکت قائم ہو' منظم طریق ہو۔ یعنی باقی رہا کہ یہ چیز اپنے طور پہ تحقیق کرنا ہے۔ اس کے لیے تو ضرورت نہیں ہے کہ کوئی نظام حکومت ہی ہو اور آپ کو حکم دیا جائے کہ اس کے ماتحت ہی آپ کریں۔ یہ تو انفرادی طور پہ کرنے کی چیز ہے۔

امورِ مملکت کے انتظامی لوازمات نیز رسول اوراُولی الامر کے الفاظ کی تشریح

اب آئی یہ بات کہ نظام حکومت میں کیا کیا جائے۔ کہا کہ وَ اِذَا جَآءَ هُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰۤى اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا (4:83) ان کی کیفیت یہ ہے' ان کی حالت یہ ہے کہ کوئی بات ان تک پہنچ جائے' یہ اسے پھیلانا شروع کردیتے ہیں۔ کہا کہ امورِ مملکت کے متعلق' معاشرے کے متعلق' کرنا یہ چاہیے کہ اس کو رسول اور اولی الامر تک پہنچا دو۔ اب رسول اور اولی الامر دو الفاظ آئے ہیں۔ یہاں میرے اُس مضمون ❶ میں آپ کو رسول اور اس کی تشریح بھی ملے گی' تو Central Governement یا مرکزی حکومت ہوتی ہے اور اولی الامر ہوتے ہیں' اس کے ماتحت حکام' جو آگے یہ نظم ونسق کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔ کہا کہ اگر کسی تک یہ بات آئے تو اگر وہ مرکز قریب ہے تو وہاں تک پہنچادے' سنٹرل گورنمنٹ تک پہنچائے' اس کا بھی حکم ہے' اگر ایسا مقام نہیں ہے' تم کسی دوسری جگہ ہو وہاں حکومت کا کوئی نمائندہ ہوگا' اس تک بات پہنچاؤ کہ فلاں نے یہ بات کہی ہے۔ کہا کہ انہیں اس کا ملکہ ہوتا ہے یا ان کے پاس کوئی اس کا انتظام ہوتا ہے کہ وہ اس کی تحقیق کر کے صحیح نتیجے پہ پہنچ جائیں کہ کہاں تک صحیح ہے' کہاں غلط ہے' اس کو ذاتی طور پر خود نہ پھیلاؤ تو وہ کہا کہ جب تک خود تحقیق نہ کرو' بات آگے نہ کرو۔ اگر اس کا تعلق' امورِ اجتماعیہ سے ہے' آپ کے ہاں کمیونٹی سے کوئی تعلق ہے' آپ کے ہاں مملکت سے' ریاست سے' جماعت سے' تعلق ہے تو اسے مرکزی حکومت تک پہنچاؤ۔ وہ نہیں ہے تو جو ان کے امارِ حکومت ہیں' ان تک پہنچاؤ' ان سے کہو کہ وہ تحقیق کریں۔ ان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تحقیق کریں گے اور پھر کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔

واقعہ افک کی اصلیت' ہماری گمراہیوں کی کیفیت کا نتیجہ اور قرآنِ کریم کا زیرِ سماعت ہونے کا تصور

آپ نے غور فرمایا' یہ ایک دوسرا حکم ہے کہ ایک واقعہ ہوا تھا' قرآن کریم نے اس کا ذکر خاص طور پہ یہی کچھ سمجھانے کے لیے کیا ہے اور اچھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ ہے جسے عام طور پر واقعہ افک کہتے ہیں۔ کسی ایک باعصمت خاتون کے خلاف کوئی تہمت لگی۔ یاد رکھیے! عام طور پہ مشہور یہ ہے کہ یہ بات حضرت عائشہ صدیقہؓ کے خلاف تھی' قرآن کریم میں کہیں یہ نہیں ہے کہ یہ بات ان کے خلاف تھی' قرآن کریم نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی کے خلاف کچھ تہمت لگی' تو اس کے بعد انہوں نے کیا کیا۔ یہ کہ بغیر تحقیق کرنے کے وہ بات پھیلا دی۔ کہا کہ تمہیں پتہ ہے کہ اس سے تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے' اس معصومہ' اس باعصمت خاتون کو' کس قدر تم نے نقصان پہنچایا ہے' اس کے عزیزوں کو یہ چیز ہوئی کہ اس کی آبرو جو ہے' وہ خراب ہوگئی' عزت مٹ گئی۔ سنیے! کہ کیا احکام ہیں۔ اس ضمن کے اندر کہا کہ جب وہ

---

❶ یہ وہی مضمون ہے جس کا ذکر اسی درس میں کیا گیا ہے۔

بات تم تک پہنچی تو تم نے اسے پھیلانا شروع کر دیا۔کیا الفاظ ہیں! کہا کہ تم نے اپنے ذہن میں تو سمجھا کہ یہ تو کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے' اس کو اہمیت ہی کچھ نہیں دی لیکن تمہیں پتہ ہے کہ یہ کتنی اہم بات تھی جو تم نے ایک باعصمت خاتون کے خلاف کر دی۔ اس قسم کی کچھ چیز' تہمت کی بات پھیلا دینا بغیر تحقیق کیے' تم نے تو اس کو معمولی بات سمجھا' Seriously (سنجیدگی سے) لیا ہی نہیں' جسے ہم کہتے ہیں لیکن تمہیں معلوم ہے کہ تم نے اس سے کتنا بڑا جرم کیا ہے۔ کہا کہ کیا ہونا چاہیے تھا ایسے میں؟ پہلی چیز اس میں' عزیزانِ من! یہ کہی کہ جب بھی کسی کے خلاف کوئی بات سنو' تمہارا First Reaction (پہلا ردِعمل) یہ ہونا چاہیے کہ نہیں بھئی! میں تو ایسا نہیں مانتا' جب تک تحقیق نہ ہو جائے' تمہارا ردِعمل اس کے حق میں ہونا چاہیے' وہ محض خیر کا ہونا چاہیے' ردِعمل First Reaction تمہارا یہ ہونا چاہیے' نہ یہ کہ ہاں ہاں ٹھیک ہے' صاحب! بہر حال پوچھو نہیں' ایسا ہی ہوتا ہے' ہم نے بھی بہت کچھ سنا ہے۔

کہا کہ جب تک تحقیق نہ ہو' کہو یہ کہ نہیں صاحب! میں تو ان کو ایسا نہیں سمجھتا۔ سنیے! یہ قرآن کریم کے الفاظ' اور وہ ہیں کہ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24:12) جب کسی کے خلاف ایک تہمت کی یہ بات تم تک پہنچی تھی تو تمہارا پہلا ردِعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ نہیں' یہ کچھ صحیح نظر تو نہیں آتا اور اگلی بات یہ کہ نہیں بھئی! جب تک اس بات کی تحقیق نہیں ہو جائے گی' میں نہیں مانوں گا۔ پہلا ردِعمل خیر کا ہونا چاہیے' شر کا نہیں' اس کے خلاف نہیں' اس کے حق میں ردِعمل ہونا چاہیے اور یہی جو چیز ہے آپ آگے بڑھائیں گے تو یہ جو ان کے ہاں Under Trial (زیرِ سماعت) ہوتے ہیں' جنہیں ملزم کہتے ہیں' وہ مجرم نہیں ہوتا' ابھی الزام لگا ہوا ہوتا ہے' وہاں بھی First Reaction یہ نہیں ہوتا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ مجرم نہ ہو۔ ہمارے ہاں پہلا ری ایکشن یہ ہوتا ہے کہ مجرم ہے اور وہ ثابت کرے کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ یہ بات بڑی لمبی ہے جو قرآن کریم کا نظامِ عدل ہے' وہ ملزم کے ذریعے یہ نہیں ٹھہراتا۔ کہتا ہے کہ اس کے متعلق تو تمہارا ردِعمل یہ ہوگا کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اس کو مجرم نہیں قرار دیا جاسکتا' کوئی کسی قسم کی نہ اس کو اذیت پہنچائی جاسکتی ہے' نہ اس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جاسکتا ہے' نہ اس کی عزت پہ حرف آنا چاہیے' اسے مجرم نہیں بلکہ اس کو معصوم خیال کرو' ابھی صرف الزام ہے' لزما کے معنی ہیں ''اس کے خلاف ایک بات چپکائی گئی ہے''۔ آگے چلو۔

تہمت تراشی کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی راہنمائی

اور یہ جسے آپ پولیس کا تشدد کہتے ہیں' قرآن کریم کی رو سے تو گالی دینے تک کی بھی اجازت نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم انسان کی تذلیل بھی گوارا نہیں کرتا۔ کہا کہ پہلا ردِعمل یہ ہونا چاہیے کہ نہیں' یہ صحیح نہیں نظر آتا ہے' دیکھتے ہیں تحقیق کرنے کے بعد اور پہلی چیز تو یہ ہے کہ وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ (24:12) نظر بظاہر تو یہ کچھ بہت گھناؤنی سی تہمت تراشی نظر آتی ہے' نظر آتا ہے کہ یہ ایسی بات نہیں' اسی

سولھویں آیت میں کہا کہ وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ (24:16) جب یہ بات پہنچی تھی تمہیں کہنا یہ چاہیے تھا کہ صاحب! ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کی تشہیر کریں اور جہاں تک میرے اپنے خیال کا تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ تہمت تراشی ہے، میں نہیں سمجھتا کہ ایسے بھی ہوسکتا ہے، پہلی بات تو یہ کہ مجھے کوئی حق نہیں پہنچا کہ میں اس بات کو آگے بڑھاؤں اور دوسری چیز یہ کہ جہاں تک میرے اپنے خیال کا تعلق ہے، میں نیک ظنّی سے کام لیتا ہوں، سوچیے! یوں نظر آئے گا محض چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں، آدابِ محفل کی لیکن آپ غور کیجیے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی قوم کی زندگی میں کتنی اہمیت ہے۔ نظامِ عدل اس پر برپا ہے، نظامِ شہادت اس پر برپا ہے۔

قرآنِ حکیم نے واقعہ افک کے سلسلہ میں صرف ایک اصول بیان کیا ہے، کسی کا نام نہیں لیا

اب آپ نے سوچا کہ یہ ایک واقعہ ہے۔ قرآن حکیم اس کی Detail (تفصیل) یوں نہیں دیتا ہے کہ وہ فلاں مرد تھا اور فلاں عورت تھی، فلاں جگہ یہ ہوا، وہ تاریخ نہیں بیان کر رہا، اس نے تو ایک عالمگیر اصول بیان کرنا ہے، آنے والوں کے لیے بھی وہ سبق آموز ہوگا اور وہ یہ کہ ایسا ہوا تھا تو اس میں انہوں نے یہ کیا اور اس کا خمیازہ پوری قوم نے بھگتا۔ یاد رکھو! ایسا نہ ہو۔ جب کوئی اس قسم کا واقعہ سننے میں تمہارے ہاں آئے، تمہارا فرسٹ ری ایکشن یہ ہونا چاہیے کہ نہیں بھئی! میں اس کو ایسا نہیں کہوں گا اور اگلی بات یہ ہے کہ جب تک تحقیق نہیں ہوجاتی، میں ایک لفظ اپنی زبان تک لانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوں۔ بتانا ہے اگر وہ اجتماعی امور سے متعلق ہے تو جتنے ذمہ دار آپ کے ہاں اربابِ حکومت، امارحکومت ہیں، ان تک جا کر بات پہنچاؤ کہ ایسی بات فلاں نے آکر کی ہے۔ آپ اس کی تحقیق کر لیجیے، خود آگے پھیلانے کے لیے کوئی ایک لفظ زبان سے نہ نکالو۔

نتائج کے لحاظ سے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کا بنیادی فرق

غور فرمایا کہ انہیں کس قسم کی تربیت دی جارہی تھی، ان کی سطح کیا تھی اور تربیت کیا دی جارہی تھی۔ میں اس لیے یہ عرض کر رہا تھا کہ وہ بڑی اہم بات آگئی ہے۔ کہا یہ ہے کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (49:7-8) اب وہ تمہاری زندگی پہلے سے انفرادیت کی زندگی نہیں رہی، اب ایک نظام کی زندگی آگئی ہے۔ یاد رکھو! تمہارے اندر اللہ کا رسول ﷺ بیٹھا ہے، تو پہلی چیز تو یہ آگئی کہ جھاڑو کا بندھن ہے، اب تم تنکے تنکے نہیں رہے، اب تم ایک جھاڑو بن گئے ہو، ایک اجتماعی زندگی ہے اور اس کا ایک مرکز ہے، اور تمہارے اندر وہ بیٹھا ہوا ہے، اس لیے اب انفرادی طور پہ یہ مت کرو اور

پھر دیکھ لیجیے کہ جو "فیکم" رسول ہے وہ تمہارے درمیان رسول ہے۔

ہاتھ سے دین کے چھوٹ جانے کی بنیادی وجہ: ایک ابہام

اب یہاں سے ذہن یوں جائے گا کہ جب اس دنیا میں ان کے اندر رسول اللہ ﷺ نہ رہیں گے تو قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان کو بھی کل موت آنی ہے، جیسے واقعی وہ موت آئی، تو پھر یہ بات ختم ہوجائے گی۔ اس نے تو کہا تھا کہ یہ رسول تمہارے اندر ہیں، تو اس وقت تک تو یہ بات رہے گی، اور رسول ﷺ فوت ہوجائیں گے تو پھر سارا سلسلہ ہی الٹ پلٹ ہوجائے گا، تو یہاں تو اتنا ہی کہا ہے کہ ان معاملات میں جب یہ رسول موجود ہے، مرکز موجود ہے تو یہ وہاں تک پہنچاؤ اور آگے خود بات نہ کرو۔ ایک دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ اہم کہا ہے اور وہ بڑا ہی اہم مقام ہے صاحب! یہ (3:101) بڑا اہم مقام ہے، عزیزانِ من! اور وہاں سے لوگوں کو بڑی ٹھوکریں لگی ہیں۔ کہا ہے کہ وَ كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلُهٗ (3:101) تم کیسے کافر ہوسکتے ہو، تم کیسے دین کو چھوڑ سکتے ہو۔ دو باتیں تمہارے پاس ہیں۔ ایک تو کتاب اللہ موجود ہے، اس کے احکام تمہارے سامنے پیش کیے جاتے ہیں، کتاب اللہ موجود ہے، پہلی وَفِيۡكُمۡ تمہارے اندر رسول کا رسول بیٹھا ہے تو پھر تم کیسے کافر ہوسکتے ہو، تم کیسے دین کو چھوڑ سکتے ہو تو گویا یہاں سے دو شرطیں ہوگئیں: ایک تو وہ قرآن کریم ہے جو پیش کیا جاتا ہے، اگلی چیز یہ ہے کہ تم میں رسول ﷺ موجود ہے تو اب یہاں سے وہ بات ہوئی جو ہوتی چلی آرہی ہے اور پوچھو نہیں کتنی بحثیں اس پہ ہوتی ہیں کہ یہ تو قرآن حکیم نے مشروط قرار دیا ہے فیکم رسول تمہارے اندر رسول ﷺ ہے اور جب رسول اللہ ﷺ نہ رہیں گے تو پھر تو یہ نظام ہی ختم ہوجائے گا۔ وَ كَيۡفَ تَكۡفُرُوۡنَ (3:101) کہا ہے کہ تم کیسے کافر ہوسکتے ہو جب کہ رسول ﷺ تمہارے اندر موجود ہے، جب نہیں رہے گا تو پھر کہہ دیا کہ پھر اس کا امکان ہے کہ تم کافر ہوجاؤ کیونکہ ایمان تو مشروط ہے دو چیزوں سے۔ قرآن حکیم رہے جزدانوں میں بند، جب فیکم رسول نہیں رہا، تمہارے درمیان رسول نہیں رہا تو پھر تو معاملہ ہی ختم ہوگیا۔

رسول ﷺ کی زندگی کے بعد قرآنی نظام کو قائم و دائم رکھنے کا طریق

غور فرمائیے وہ سطحی مفہوم دینے سے بات کہاں جا پہنچی۔ وہ جی یہ تو قرآن کریم ہے یہی سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 100 تھی اور اسی میں آیت نمبر 143 میں یہ کہہ دیا کہ سن لیجیے جو بار بار ہم کہتے ہیں کہ تمہارے درمیان رسول ہے تو تمہارے ذہن میں یہ بات نہ پیدا ہوجائے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک Person ہے، یہ ایک شخص ہے، یہ ایک انسان ہے جو طبعی زندگی جیتا ہے اور کل کو طبعی موت مر بھی سکتا ہے، جا بھی سکتا ہے تو تم یہ نہ سمجھو لو کہ یہ سارا نظام اس کی ذات سے وابستہ ہے۔ یہ چلا گیا تو یہ سلسلہ درہم برہم ہوجائے گا۔ عزیزانِ من! اسی سورۃ میں چند ہی آیتیں آگے جا کر کہا کہ وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ ۚ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ

انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ (3:144) یادرکھو! محمد ﷺ بھی اسی قسم کا ایک رسول ہے' جیسا کہ اس سے پہلے رسول آتے رہے' اپنا پروگرام پورا کر کے اس دنیا سے چلے جاتے رہے' تو کل کو اگر یہ بھی مر جائے یا قتل کر دیا جائے' تو تم یہ سمجھو گے کہ یہ سارا نظام تو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ تھا۔ جب یہ نہیں رہا وہ نظام بھی نہیں رہا تو تم پھر اپنے اسی پرانے عہدِ جاہلیت کے نظام کی طرف یہ کہہ کر پلٹ جاؤ گے' یہ تو اس کی ذات کے ساتھ تھا۔ کہا کہ یادرکھو! وَ مَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْهِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰهَ شَیْـًٔا (3:144) اگر کوئی یہ سمجھتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ یہ تو اس کی ذات سے وابستہ تھا' وہ نہیں رہا تو نظام بھی نہیں رہا' اور اگر کوئی پلٹ جائے' یا پلٹ جائے گا تو اپنا ہی کچھ نقصان کرے گا' خدا کا کچھ نقصان نہیں کرے گا۔ بتا دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ سلسلہ' یہ شیرازہ بکھر نہیں جائے گا' نظام ختم نہیں ہو جائے گا' اسے آگے چلنا ہے اور اسی لیے قرآن حکیم نے اس نظام کو' صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ساتھ کہا ہے' اللہ کا رسول یہ محمد ﷺ اور اس کے یہ جو رفقاء ساتھی ہیں' یوں یہ نظام جماعت کے ہاتھوں قائم رہتا ہے۔ یہ نظام قائم رہتا ہے' شخصیتوں کے بل بوتے یہ قائم نہیں رہتا' شخصیتیں آتی ہیں' شخصیتیں چلی جاتی ہیں' اگر وہ جماعت ایسی تیار کی ہوئی ہے جو خدا کے رنگ میں رنگی ہوئی اسوۂ رسول اللہ ﷺ کے تابع چلنے والی' قرآن کریم کو سمجھنے والی' ان صلاحیتوں کی مالک ہے تو کسی ایک فرد کا' ان میں نہ رہنا' نظام کے اوپر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

حضورِ اکرم ﷺ کی وفات کے فوری بعد حضرت صدیق اکبرؓ کا بصیرت افروز خطاب

دنیا کے جتنے نظام مسلسل چلتے ہیں' صدیوں تک نظام چلتے ہیں' یہ وہ نظام ہوتے ہیں جو شخصیتوں کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے اور یہ وہ چیز تھی جو نبی اکرم ﷺ کے سب سے پہلے ساتھی یا سب سے قریبی صدیقِ اکبرؓ نے کی۔ جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی ہے' تو ایک قیامت مچ گئی' صحابہؓ کے اندر کہرام مچ گیا' صحابہؓ کے اندر وہ لوگ بھی تھے جن کے ذہن میں یہ آیا کہ یہ کوئی آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ نظام تھا' اب کیا بنے گا' یہ کیفیت پیدا ہوئی تو اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اس انتشار کے عالم میں منبر پر کھڑے ہوئے' یہ تھی صداقتِ عظمیٰ آپ رضی اللہ عنہ کی! انہوں نے کہا کہ یہ کیا مسئلہ مچ رہا ہے' یاد رکھو! جو شخص تم میں سے محمد ﷺ کو اپنا معبود سمجھتا تھا' وہ جان لے کہ اس کا معبود مر گیا اور جو خدا کو اپنا معبود سمجھتا تھا سمجھ لو **ان ھو حی القیوم لایموت** زندہ ہے' پائندہ ہے' کبھی نہیں مر سکتا اس لیے کسی ایک شخص کی موت سے اس نظام کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔

ہر کسی نظام کی بقا کا راز ہمیشہ شخصیات کی بجائے اصولوں سے وابستہ ہوتا ہے

آپ نے غور فرمایا کہ الرفیق رسول اللہ کے معنی کیا ہو گئے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ جب تک یہ طبعی طور پر آپ کے اندر یہ شخصیت موجود

ہے نظام موجود رہے گا' شخصیت نہیں رہے گی' نظام ختم ہوجائے گا اور اس کے بعد تو ختم نبوت ہے یعنی پھر اس کے بعد تو کسی رسول نے آنا ہی نہیں ہے' جس رسول ﷺ کے ساتھ وابستہ تھا' چلا گیا' کسی اور نے آنا ہی نہیں ہے' اللہ اللہ خیر سلا' خواہ مخواہ اسلام کے احیا کے ڈھنڈورے پیٹ رہے ہیں' اس کے یہ معنی ہی نہیں ہیں' عزیزانِ من! **اسلام لا اسلام الا بالجماعۃ** حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ اسلام جماعت کے ساتھ وابستہ ہے' اگر وہ جماعت اس رنگ میں چلی آرہی ہے' قیامت تک یہ نظام قائم رہ سکے گا' اس انداز کی وہ جماعت نہیں رہے گی' تو پھر یہ جو نظام ہے' یہ نہیں رہے گا۔ پھر کیا ہوگا؟ وہ جو کہا کہ تم میں قرآن کریم موجود ہے' وہ تو قیامت تک' موجود رہے گا' اگلی بات کیا کرنے کی ہوگئی؟ جو بھی اس نظام کو قائم کرنے کا داعی یا مدعی یا خواہش مند ہوا سے ایک جماعت تیار کرنا ہوگی جن کے قلوب اور اذہان کی تربیت اور تعلیم و تطہیر قرآن کریم کے انداز میں' قرآن کریم کے رنگ میں' کی جائے گی' اسوۂ حسنہ نبی اکرم ﷺ کا سامنے ہوگا' اس سے ایک جماعت تیار ہوگی' پھر یہ نظام قائم ہوجائے گی' شخصیتوں کے آنے اور جانے سے اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ الحجرات کی آیت 8 تک ہم نے لے لیا' 9 ویں آیت سے ہم پھر آئندہ لیں گے۔ شکریہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورۃ الحجرٰت (آیات 9 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1982ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت 9 سے ہو رہا ہے: (49:9)۔

فتح مکہ کے بعد قلب ونگاہ کی تطہیر کے سلسلہ میں کیریکٹر کی بنیادی خصوصیات کی اہمیت کا ذکر

آپ کو یاد ہوگا سابقہ درس میں، میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ الفتح کے بعد اب قرآنِ کریم میں دوقسم کی ہدایات یا قوانین یا اصول نمایاں طور پہ سامنے آئیں گے۔ کچھ تو وہ ہوں گے جن کا تعلق مملکت کے قیام اور نظامِ استحکام سے ہے اور انہی کے اندر ساتھ ملتے ہوئے چھوٹے چھوٹے معاشرتی احکام یا ہدایات آئیں گی۔ نظر بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک طرف اتنے بڑے بلند اور اہم معاملاتِ مملکت کے متعلق ذکر ہے اور ان کے ساتھ ہی دوسری آیت کے اندر ایک چھوٹی سی معاشرتی ہدایت ہے لیکن آپ غور کریں گے تو نظر آئے گا کہ ان کا بڑا چولی دامن کا تعلق ہے۔ یہ جنہیں ہم چھوٹی چھوٹی معاسرتی خرابیاں کہتے ہیں، انہی سے بڑے بڑے ہنگامے برپا

ہو جاتے ہیں' فسادات ہوتے ہیں' اور یہ بات نہ بھی ہو تو قرآن حمید تو پہلے افراد کے کیریکٹر کو' اس کی سیرت اور کردار کو' اپنے قالب میں ڈھالتا ہے' ان کی تطہیر کرتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور پھر یہ افراد ہیں کہ جو اس نظام کو قائم کرتے ہیں' چلاتے ہیں' مستحکم کرتے ہیں۔ یہ کوئی میکینکل چیز نہیں ہے کہ ایک مشین ہے' وہ سیٹ کر دی' بٹن دبایا' تو اس نے از خود چلنا شروع کر دیا۔ یہ تو افراد نے اس نظام کو آگے چلانا ہے' تو جب تک افراد کی اپنی سیرت' اس نظام کے سانچے میں نہیں ڈھلی ہوگی' وہ اس نظام کو چلا نہیں سکتے' اور یہ جنہیں ہم بظاہر باتیں چھوٹی چھوٹی چیزیں کہتے ہیں' وہ انگریزی میں ایک بات ہے جو ایک بہت بڑے فلاسفر کی ہے' اہم ہے A character is built up of petty things یہ جسے آپ کیریکٹر کہتے ہیں' وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے' بڑے بڑے اہم معاملات کے اندر تو انسان ویسے ہی احتیاط برتتا ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ ہونے پائے جو نمایاں طور پر نظر آ جائے کہ یہ اخلاق سے گھری ہوئی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں صبح سے شام تک' جب آپ کے معاملات دوسرے لوگوں سے پڑیں' تو دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر چھوٹی چھوٹی سی باتوں کا ظہور آپ کی طرف سے کیسے ہوتا ہے' اس کا ردِعمل کس قسم کا ہوتا ہے۔ یہ ہے اصل معیار کسی کے کیریکٹر کو پرکھنے کا اور یہ وجہ ہے کہ قرآن حمید نے اتنے اہم امورِ مملکت کے متعلق اصول و ہدایات کے ساتھ ساتھ' چھوٹی چھوٹی جزوی سی چیزیں معاشرتی زندگی کے متعلق بھی دی ہیں اور ساتھ ساتھ بتاتا چلا جاتا ہے۔

پچھلی آیت میں' پچھلے درس میں' جیسے وہ آیا تھا کہ اگر تم تک کوئی بات پہنچے تو اس کو یونہی نہ لے اڑا کرو۔ جب تک تحقیق کے بعد تمہیں خود علم نہ ہو کہ وہ واقعی صحیح ہے' اس وقت تک اسے Believe نہ کرو اور اگر اس کا تعلق اجتماعی امور سے ہے' تو جو ذمہ دار مملکت کے عمال' کارکن ہیں' جو بھی ذمہ دار حضرات ہیں' وہ ان تک پہنچاؤ' وہ تحقیق کریں گے' اس کے بعد وہ بات جس طرح سے چاہیں گے آگے پھیلائیں گے' تم اپنے طور پر اس چیز کو آگے نہ پھیلاؤ۔ یہ چھوٹی سی چیز نظر آتی ہے لیکن بہت بڑی بات ہے۔ اب آپ دیکھیں گے کہ قرآن حمید چھوٹی چھوٹی باتیں ساتھ لاتا جا رہا ہے اور اگر معاشرے میں ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں پہ عمل شروع کیا جائے تو آپ دیکھیے گا کہ کم از کم پچاس فیصد معاشرے کے فسادات کی باتیں تو اسی سے حل ہو جاتی ہیں۔

نظامِ مملکت کے خدوخال کی ہدایات کے سلسلہ میں ایک جان کی اہمیت اور صلح میں ایک تیسری پارٹی کا ذکر

ایک اہم بات' جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے' وہ اجتماعی قومی ملی اور مملکتی نظام سے تعلق رکھتی ہے۔ کہا ہے کہ وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰى تَفِیۡٓءَ اِلٰۤى اَمۡرِ اللّٰهِ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (49:9)۔ قرآنِ کریم نے ایک امت کی تشکیل کی جو

مومنین پر مشتمل ہوتی ہے۔ مومن افراد کے ایک اجتماعی تشکیل کا نام امت ہے' جماعتِ مومنین ہے۔ ان کے متعلق قرآنِ کریم نے مومنوں کی باہمی زندگی کے متعلق کہا ہے۔ ایک تو یہ یاد رکھیے کہ قرآنِ کریم میں قتلِ ناحق' وہ کسی کا بھی کیوں نہ ہو' ضروری نہیں ہے کہ وہ مومن کے متعلق ہی ہو' کہا کہ جان کی قیمت اور حرمت اتنی زیادہ ہے کہ جس کسی نے کسی ایک جان کو ناحق ہلاک کر دیا' یوں کہیے گویا اس نے پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا اور اگر کسی نے ایک جان بچالی تو یوں سمجھیے کہ اس نے نوعِ انسانی کی جان بچالی تو گویا ایک جان کی قیمت' اہمیت اور حرمت قرآن کریم کے نزدیک اتنی بڑی ہے کہ ایک جان کو ضائع کر دینا یا ہلاک کر دینا اس کے نزدیک پوری نوعِ انسانی کو ہلاک کر دینے کے مرادف ہے۔ اس کی اہمیت اتنی بڑی ہے۔ اب بالخصوص جب وہ جماعتِ مومنین کی طرف آتا ہے تو یہ اہمیت دہری ہو جاتی ہے کیونکہ ان کے آپس کے باہمی تعلقات ہیں' اخوت کے تعلقات ہیں' برادرانہ تعلقات ہیں' باہمی ہمدردی کے تعلقات ہیں۔

سورۃ النسآء میں قتل کے متعلق دو آیتیں ہیں۔ ایک تو ہے قتلِ خطا' سہواً کسی کا قتل ہو جانا۔ یہ سہو ہے' یہ ارادتاً جرم نہیں ہے۔ سہواً جو قتل ہے اس کے لیے قرآن کریم نے خون بہا مقرر کیا ہے۔ جسے دیت کہتے ہیں یعنی خون کی قیمت ادا کر دینا۔ اس سے زیادہ سزا نہیں ہے کچھ سہواً قتل ہوا ہے اور دوسرا ہے وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (4:93)۔ یہ قتلِ مومن بالارادہ ہے۔ یہ تین چار پانچ الفاظ اکٹھے قرآن حکیم لے آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس نے کچھ چھوڑا ہی نہیں ہے جو کسی کے خلاف جرم کی سزا کے لیے کہا جا سکے' کوئی چیز ہی نہیں چھوڑی ہے۔ فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا (4:93) قتلِ مومن بالعمد تو آپ اندازہ لگا لیجیے کہ اس کی کتنی اہمیت ہوئی۔ یہ جو اس نے ایک قانون دیا' ایک اصول دیا لیکن اس کے باوجود وہ انسانی کمزوریوں کو سمجھتا ہے۔ اب اس آیت میں ہے کہ اگر جماعتِ مومنین کے کوئی دو گروہ کسی طرح آپس میں قتل پہ' جنگ پہ' لڑائی پہ اتر آئیں یعنی یہ تو بہت بڑا جرم ہے ایک مومن کا بالارادہ قتل بھی' تو قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ کتنی بڑی سزا کا مستعجب ہوتا ہے لیکن بہرحال ایک انسانی شکل ہے کہ اگر کہیں ایسا ہو جائے تو مومنین کے دو گروہ آپس میں الجھ پڑیں' تو کہا کہ تمہیں چاہیے کہ ان میں صلح کرادو۔ یوں نہ آگے گذر جایئے۔ یہ ایک بہت بڑی اہم چیز ہے جو بتائی گئی ہے۔ یہ تو دو گروہ ہیں جو الجھ پڑے ہیں۔ یہ جو اگلا حکم ہے' کہا ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا (49:9)۔ ویسے تو ترجمہ ہوگا کہ تم ان میں صلاح کرادو۔ یہ کون ہیں جن سے کہا جا رہا ہے کہ صلح کرادو۔ کوئی تیسری پارٹی موجود ہے وہ دو تو آپس میں الجھ پڑی ہیں' ایک تیسری پارٹی ہے جس سے کہا جا رہا ہے کہ تم ان میں صلاح کرادو۔ یہ تیسری پارٹی ہے' جسے آپ مملکت کہتے ہیں۔

مروجہ اصطلاحات کو قرآنی اصطلاحات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے نیز کسی قسم کے الجھاؤ کی شکل میں مملکت کا کردار

عزیزانِ من! پچھلی دفعہ بھی میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے دور میں جو اصطلاحات عام مروج ہیں' یہ الفاظ قرآن حکیم میں نہیں آئے۔ پھر میں دہرادوں کہ قرآن حکیم میں قانون کا لفظ بھی نہیں آیا' دستور یا Constitution کا لفظ بھی نہیں آیا' اس میں عدالت کا لفظ ان معنوں کے اندر نہیں آیا جس کو آپ کورٹ کے معنی میں کہتے ہیں۔ یہ چیز اس کے اندر نہیں آئی۔ جسے آپ Bye-Laws (جزئیات) کہتے ہیں' ان معنوں میں یہ نہیں آیا لیکن اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ آپ چاہیں تو ان ہی اصطلاحات کو رائج کیجیے' آپ چاہیں تو مروجہ اصطلاحات کو یہ معنی دیدیجیے' یہ مفہوم دیدیجیے۔ بہر حال اس نے جو کہا ہے کہ اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں الجھ پڑیں تو تم ان میں صلح کرادیا کرو۔ یہ تم کون ہیں؟ تیسرا گروہ ہے' تیسری جماعت ہے' تیسری پارٹی ہے اور یہ مملکت ہے جس سے کہا جارہا ہے' اس لیے کہ وہ تم ہے جس کے متعلق کہا کہ صلح تو تم نہایت عدل اور انصاف کے ساتھ کراؤ۔ اس صلح کرانے کے بعد بھی اگر ان دونوں میں سے کوئی پارٹی پھر سرکشی کرے تو اس کے خلاف تم جنگ کا اعلان کردو۔ یہ اس درمیان میں تم آرہا ہے تو نظر آیا کہ یہ جو تم ہے' یہ اس کی موجودگی کا نام ہے۔ یہ صحیح معنی میں ملتِ اسلامیہ کا نظام ہے۔ یہ ''تم'' اگر درمیان میں نہ رہے تو انتشار ہی انتشار ہو جائے۔ آج یہی کچھ تو ہو رہا ہے۔

ایران اور عراق کی باہمی جنگ کا ماجرا کہ صلح کرانے کے لیے یہ ''تم'' نہیں ہو

آج کی تاریخ میں یہ بات سمجھ میں آجائے گی' ایران اور عراق کی لڑائی قریب دو سال ہو گئے ہیں' آپس میں دو مومنوں کی مملکتیں لڑ رہی ہیں۔ کوئی دو گروہ نہیں یعنی وہ تو چھوٹے چھوٹے سے کوئی دو ہوتے ہیں جن میں آپس میں جھڑپ ہو جاتی ہے' یہ دو مسلمانوں کی مملکتیں' دو سال سے لڑ رہی ہیں۔ یہاں کہا یہ ہے کہ تم ان میں صلح کراؤ اور اس صلح کے بعد اگر کوئی سرکشی پہ اتر آئے' تو تم اس کے خلاف اعلانِ جنگ کردو۔ یہ جو ''تم'' ہے وہ موجود نہیں۔ یہ بار بار جاتے ہیں' سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ وعظ کرکے چلے آتے ہیں۔ یہ تو بابا! بڑی بات ہے۔ آپس میں لڑ رہے ہو' یہ کوئی ''شریک'' آدمی کا کام ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی! گھر جاؤ' ہم اپنے معاملات خوب سمجھتے ہیں' وہ گھر آجاتے ہیں۔ صاحب! یہ کیا چیز ہے' جس کی وجہ سے یہ سارے بگاڑ پیدا ہوئے؟ یہ اس کے اندر ''تم'' باقی نہیں رہا' نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے' یہ ''تم'' باقی نہیں رہے۔ یہ ''تم'' اس پوزیشن میں ہونے چاہئیں کہ کہیں بھی اگر آپس میں یہ دو جماعتیں مومنین کی الجھ پڑتی ہیں تو وہ ان کے اندر اُٹھ کر صلح کرائیں اور ان کے پاس اتنی قوت ہونی چاہیے کہ پھر جو سرکشی برتے تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرے تا آنکہ وہ اس صلح کی Term پر واپس نہ لوٹ آئے۔ اگر وہ ایسا کرے تو کہا پھر انصاف کے ساتھ تم ان میں صلح کرادو۔ صاحب!

یہ تیسری پارٹی موجود ہے جس کو قرآن ''تم'' کہتا ہے۔ سارے قرآن کریم میں آپ دیکھیے جہاں جہاں سزاؤں کا ذکر ہے مثلاً زانی کی سزا ہے کہ سو درے مارو (24:3)؟ 'یہ چور کی سزا ہے کہ ہاتھ کاٹ دو۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ وہ عدالت یہ فیصلہ کرے اور پھر ایک Executive (انتظامیہ) ہو' انتظامیہ ہو' وہ ان کے فیصلے پر عملدرآمد کرے' پھر وہ اس جیل خانے کے اندر کوئی ہو' جوان کو یہ سزا دے' پھر کوئی ایسا ہو' کچھ نہیں' قرآن کریم میں یہ طریق' یہ عدالت' یہ الفاظ وغیرہ بھی نہیں ہیں۔ کہا صرف یہ ہے کہ ''تم'' یہ کرو۔

امتِ اسلامیہ کے کردار کے بغیر باقی صرف وعظ رہ جاتا ہے: ایران اور عراق کی مثال

یہ ''تم'' کون ہیں؟ یہ امتِ اسلامیہ ہے جس کی حیثیت ایک مملکت کی ہے۔ امت کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی' اس سے اسلام باقی نہیں رہتا۔ پھر وعظ و نصیحت رہ جاتی ہے۔ علماء حضرات' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں کہ یہ ہمارا فریضہ ہے۔ یہ کیسے ادا ہوتا ہے؟ مسجدوں میں' منبروں سے وعظ کہتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ دیکھو بھئی! اللہ میاں کہتا ہے کہ خدا کے لیے باز آ جایا کرو' یہ اسلام نہیں ہے' یہ ایک اس پارٹی کا وجود ہے جو خدا کے قوانین کو نافذ کرنے کی قوت رکھتی ہو اور جو اس سے سرکشی برتے' اس کو سلا دینے کی قوت رکھتی ہو' جو جھک جائے' اس کے ساتھ عدل اور انصاف کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ یہ جو قوت رکھنے والی ایک جماعت ہے' وہ الگ جماعت نہیں ہے۔ الگ تو یہ لڑنے والے دو گروہ تھے جو آپس میں الجھ پڑے ہیں۔ یہ پوری امت ہے' یہ آپ کے ہاں کا نظام ہے' یہ اسلامی مملکت ہے' اس کا فریضہ یہ ہے۔ یہ موجود ہو تو دین ہے' اسلام ہے۔ اگر یہ قوت کسی میں موجود نہیں ہے' نہ وہ اسلامی مملکت ہے' نہ وہاں یہ دین ہے۔ کہا یہ ہے کہ تم ان میں صلاح کراؤ اور اگر وہ اس کے خلاف سرکشی برتیں تو تم ان کے ساتھ یہ کرو۔ یہ ''تم'' وہ ہونا چاہیے جس کے پاس یہ اختیارات موجود ہوں کہ وہ یہ کچھ کر سکے' پھر دیکھیے کس طرح سے امت کے اندر خلفشار یا یہ جو قتل کی بات ہے' جھگڑا تک نہیں ہو سکتا صاحب! یہ اس کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے ہوا ہے۔ تم صلح کراؤ۔ یہ موجود نہیں ہے تو ایران اور عراق دو سال سے آپ کہہ رہے ہیں کہ لڑائی بند کرو۔ پتہ نہیں قیامت تک آپس میں لڑتے چلے جائیں گے۔

مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ لفظ ''تُو'' کی افادیت سے محروم ہے اور یہ کُشتوں کے پشتے!!

ہماری یہ جو ساری ہزار سالہ تاریخ ہے' اُس میں مسلمانوں کی آپس میں مسلسل جنگیں ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اب اس کے لیے کھٹکا پیدا ہوا کہ صاحب! قتل مومن تو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی سزا ابدی جہنم ہے' خدا کا غضب ہے' اس کی لعنت ہے' وہ عذابِ عظیم تو یہ ہے اور یہ دو ایران اور عراق مسلمانوں کی مملکتیں ہیں' یہ آپس میں لڑ رہی ہیں صاحب! روزانہ سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں قتل ہو رہا ہے تو یہ تو پھر وہ مومن ہی نہیں رہتے۔ کیا کیا جائے؟ بڑی آسان بات یہ ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا جائے' آپ کے ہاں وضع

روایتیں داخل کی جائیں' یہ کس قسم کی وضعی روایات داخل کی جائیں؟ یہ ایک قتلِ مومن کا ذکر ہے (4:93) قرآن کریم میں تھا کہ ایک مومن کے عمداً قتل کی یہ سزا قرآن کریم نے تجویز کی۔ میدانِ جنگ کے اندر تو پوری کی پوری جماعت ایک طرف ہوتی ہے دوسری طرف دوسری مملکت ہوتی ہے اور عمداً قتل ہوتا ہے۔ اب وہ ''تُو'' والی جماعت نہیں۔ وہ جو ''تم'' صلح کرادو یا ان سے جنگ کرو' والی جماعت ہے' وہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! جنگ کے اندر سہواً تو ہوتا ہی نہیں ہے' اس میں تو تاک تاک کر نشانہ لگایا جاتا ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ وہاں جا کر پکڑو جہاں سے یہ بھاگ نہ سکے۔ اب یہ پوری کی پوری صحابہؓ کی جماعت ہے' پورے سارے صحابہؓ کرام ہیں' جو کر رہے ہیں' یہ دیر کی بات نہیں ہے' یہ حضرت عثمانؓ کے زمانے کے بعد حضرت علیؓ کے زمانے (656-661ء) کا ذکر ہے۔ جنگِ جمل ❶ سے روایات کی کتابیں بھری پڑی ہیں' تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں کہ کس بات پہ آدھے صحابہؓ ایک طرف آدھے صحابہؓ دوسری طرف' میدانِ جنگ میں یہ دونوں اترے ہوئے ہیں' ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جنگِ جمل میں دس ہزار صحابہؓ شام تک میدان میں قتل ہو چکے تھے۔ یہ ایک دوسرے کا قتل عمد ہو رہا تھا۔ یہ عام مومنین کا ذکر نہیں ہے' یہ صحابہ کبارؓ کے متعلق کہا جا رہا ہے جن کے مومنِ حقہ ہونے کی شہادت قرآن کریم (8:4;8:74) میں خدا دے رہا ہے۔ ان کے لیے کہا ہے کہ ہم نے جنت تیار کر رکھی ہے' ہم تو ان کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں' یہ مومن حقہ ہیں۔ ان کے لیے قرآن کریم نے رضی اللہ عنہم ورضوعنہ کہا ہے: (5:119;9:100;58:22;98:8) ان سے خدا راضی ہو گیا' وہ خدا سے راضی ہو گئے۔ یہ ہے وہ پوری جماعت۔

اس پوری جماعت کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ کسی تلوار سے دوسرا قتل ہو گیا تو الگ' جو کسی طرح سے بچ گیا تو وہ اپنی قسمت سے بچ گیا' اس نے تو اپنی طرف سے کسر نہیں چھوڑی تھی' بعضوں کو اس نے قتل کر دیا ہے اور بعضوں کو عمداً قتل کرنے کے لیے آگے بڑھا' وہ کسی طرح سے بچ گئے تو بات تو ایک ہی ہے اور سارے صحابہؓ میں سے تو ایک بھی نہیں بچتا' عزیزانِ من! یہاں تو قتل ہونے والوں کی تعداد دس ہزار تک ہی تھی۔ آگے بڑھیے' جنگِ صفین ❷ اور جنگ نہروان ❸ میں حضرت علیؓ اور باقی صحابہؓ کے اندر جنگ تھی' یہ جتنے اور صحابہ بھی باقی تھے' ان کو وہاں کھڑا کر دیا اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ ستر ہزار صحابہؓ وہاں میدانِ جنگ میں قتل ہو گئے۔ قرآن کریم ایک مومن کے عمداً قتل کی یہ سزا بتا رہا ہے' عزیزانِ من! پوچھیے! آپ کی تاریخ میں آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ ان میں

---

❶ بقول تاریخ اور روایات یہ جنگ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان قریباً 656ء کو بصرہ کے قریب لڑی گئی۔ یہ تاریخ کا بیان ہے۔ اس جنگ کے بعد حضرت علیؓ کے مدینہ منورہ کے بجائے کوفہ کو دارالخلافہ بنالیا۔

❷ بقول تاریخ اور روایات یہ جنگ صفین حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین دریائے فرات کے کنارے لڑی گئی۔

❸ تاریخ اور روایات کے مطابق یہ جنگ نہراوان (Nahrawan) حضرت علیؓ اور خارجیوں کے مابین ہوئی۔

سے ایک بھی نہیں بچتا' کچھ عمداً قتل ہوگئے' دوسرے کو قتل کرنے کے لیے بیٹھے بٹھائے نہیں' بلکہ میدانِ جنگ میں قتل ہوئے ہیں' بعضوں کو قتل کر دیا گیا' کچھ ان کے قتل کر دینے کی کوشش میں بچ گئے تو انہوں نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اب سوچیے تو سہی آپ کے ہاں پھر باقی کون بچتا ہے پھر آگے اسلام کیا کرے گا' جان کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے۔

تاریخ کی ان روایات کی رو سے صحابہؓ میں سے کوئی ایک بچتا ہی نہیں ہے کہ جس نے قتل عمد کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ کچھ ارتکاب کرتے کرتے وہاں قتل ہوگئے۔ قرآن کریم کی رو سے کہاں گئے (معاذ اللہ) میں تو جرأت نہیں کر سکتا کہ زبان پہ لاؤں لیکن جرأت کریں یا نہ کریں' ہم کیا کریں' ان تاریخ کی کتابوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہزار برس سے پھر رہے ہیں۔ ساری دنیا کو یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہ جماعت تیار کر کے گئے تھے کہ ابھی کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ میدانِ جنگ میں ایک دن میں سات ہزار' ایک دن میں ستر ہزار صحابہؓ' پورے کے پورے شہید ہوگئے۔ آپ کے رسول ﷺ (معاذ اللہ معاذ اللہ) یہ جماعت تیار کر کے گئے تھے!!! جب کہ قرآن حکیم میں اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) کی شہادت خدا دے رہا ہے۔ یہ ہیں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) اس کے ماننے والے؟ پوچھیں گے خدا سے کہ حضور! آپ نے یہ شہادت کن کے متعلق دی تھی؟ آپ تو کہتے ہیں کہ ہم قیامت تک کے لیے علیم ہیں' مستقبل تک جانتے ہیں۔ یہ جو کچھ کرنے والا ہے ان کے متعلق آپ کو علم ہی نہیں تھا کہ یہ سارے کے سارے میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہوں گے اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! یہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) ہیں' مومنِ حق ہیں' رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ہیں تو آپ کو علم ہی نہیں تھا' معاذ اللہ اور علم تھا' تو پھر یہ شہادت کس طرح سے دی؟ عزیزانِ من! کیوں یہ تاریخ مسخ کی گئی؟ اس لیے کہ آج نہ کوئی عراق کو کہہ سکے' نہ کوئی ایران کو یہ کہہ سکے کہ کیا کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہیں' یہ سنتِ صحابہؓ ادا کر رہے ہیں۔ جی!

ایران اور عراق کی باہمی جنگ کے سلسلہ میں ہماری بہانہ سازی

عزیزانِ من! اس کے بعد ایک دوسرے کو قتل کرنے کا ساری تاریخ میں آپ کے ہاں یہ جواز مل گیا۔ یہ تاریخ میں اتنا سا مسخ کر لینے سے ہوا۔ میں کہہ رہا تھا کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ وہ جماعت مملکت ہونی چاہیے جو ان کے اندر صلح کرائے اور اگر کوئی نہیں مانتا تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرے۔ یہاں وہ جو ساری جماعت ہے' وہ ایک دوسرے کے خلاف جنگ میں الجھی پڑی ہے' ایک دوسرے کو قتل کر رہی ہے' تیسری کا ذکر ہی کوئی نہیں ہے۔ وہ تیسری کا تو نام ونشان بھی نہ رہا' جو سارے کے سارے وہ میدانِ جنگ میں آ گئے۔ یہ ہے آپ کی ان صحابہؓ کی تاریخ (معاذ اللہ)' عزیزانِ من! یہ تاریخ نہیں ہوسکتی۔ میں کسی عقیدے کی بناء پر نہیں کہتا' میں تو خدا کی شہادت' جو

قرآن کریم میں محفوظ ہے' کی بناء پہ کہتا ہوں۔ اگر میں یہ کچھ مانتا پھروں تو اس شہادتِ خداوندی کو کہاں لے جاؤں! کہتے ہیں کہ جو خدا کی شہادتیں ہیں انہیں برطرف رکھو۔ یہ جو لوگ تھے' کچھ طبری' کچھ بخاری' ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دو تاکہ کسی مؤرخ اور کسی محدث وغیرہ کے جتنے الفاظ ہیں' ان کی بات جھوٹی نہ پڑ جائے' سارے صحابہؓ (معاذ اللہ معاذ اللہ) جہنم میں جاتے ہیں تو چلے جائیں!! یا للعجب!

صحابہ کرامؓ کے متعلق قرآنِ حکیم کی شہادت ہمارے سب کے لیے مقدم ہے مگر فوقیت تاریخ کو

میں نے عرض کیا ہے کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ روایتیں کیوں گھڑی گئیں؟ جب ملوکیت آ گئی تو پھر پڑھیے۔ امیہ کے بعد عباسیوں کا ہی دور ہے' جو بات وہاں سے شروع ہوئی تھی' پھر جو مسلمانوں کی مسلسل آپس میں جنگیں چلی ہیں' وہ جو کہتے ہیں کہ وہ ''تم'' والی جماعت آپس میں ہی نہ رہی۔ وہ اس لیے نہ رہی کہ ان کے سامنے تو اسوۂ صحابہؓ آ گیا تھا۔ اب ہم میں سے تو ابھی کچھ بچے ہوئے ہیں۔ ان میں سے تو سارے کے سارے میدان میں آ گئے تھے۔ اپنے اس قتال کا Justification جواز ہے جو باہمی ایک دوسرے کی گردن مارنے کا ہے۔ یہ تاریخ کا ایک واقعہ ہے' قرآن کریم کی شہادتیں ہوا کریں کہ جی! وہ قرآن کریم کی شہادتیں کسی اور کے متعلق ہوں گی' تاریخ تو یہ بتا رہی ہے کہ یہ سارے کے سارے ایسے تھے۔ اب ایمان تاریخ کے اوپر ہے۔ کہیں سے' کسی محراب و منبر سے' اسٹیج سے آپ سن لیجیے کہ ان جنگوں کے متعلق سب یہی واقعات بیان کریں گے۔ صاحب! قرآن کریم کی شہادت ہی کوئی نہیں بیان کرتا۔ تو یہ چیز ہوئی کہ وہ تیسری قوت' جسے قرآن حکیم نے کہا تھا' وہ صلاح کرانے والی قوت' وہ انہوں نے ختم کر دی۔ ان صحابہؓ کی جنگ میں بھی تاریخ کے بیان کے مطابق تو یہ موجود نہیں رہی' اگر یہ دو کسی طرح سے الجھ پڑے تھے تو وہ اگر موجود ہوتی تو یہ نہ کرتی جو کچھ ہوا تھا اور اگر موجود تھی' اس نے یہ نہیں کیا' تو وہ قصہ بھی ختم ہوا' بیٹھے دیکھتے رہے۔ قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ یہ کچھ کرو۔ یا اگر پڑی تھی تو اس نے یہ بھی نہیں کیا اور وہ تھی کہاں؟ میں نے کہا کہ وہ تو سارے کے سارے میدانِ جنگ میں تھے' قصہ ختم ہوا' آپ کی ساری تاریخ بدل گئی۔ اب اس میں مسلسل جنگ ہیں اور فساد اور لڑائیاں ہیں اور آپس میں مسلمانوں کا قتال ہو اور سند صحابہؓ کا اسوہ (اللہ اکبر معاذ اللہ) ٹھہرا۔

تمام مومنین کے باہمی تعلقات ''اخویکم'' کی محکم بنیاد پر استوار ہوتے ہیں

یہ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (48:29) کے بعد سورۃ الحجرات میں ہی ایک آیت میں ہے کہ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ (49:10) ان کا تعلق آپس میں تو بھائیوں والا تعلق ہے' یہ تو بھائی ہیں' کیا بھائی بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹا کرتے ہیں صاحب؟ نہیں بلکہ یوں ہے کہ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ (49:10) یہ دیکھیے وہ پھر ''کُم'' آ گیا۔ یہ تو ہیں بھائی بھائی۔ یہ جو صلح کرانے والی جماعت ہے' ان سے کہا گیا ہے کہ یہ تمہارے بھائی ہیں' ان بھائیوں میں جا کر صلح کراؤ' وہ آپس میں تمہارے بھائی ہیں۔ ان سے کہا کہ تم کیوں الجھ پڑے

ہو تم تو بھائی بھائی ہو۔ ان سے کہا کہ او! تمہارے بھائی یہ کر رہے ہیں! یہاں اَخَوَیْکُمْ آیا ہے۔ دیکھیے! آپس میں یہ اس تیسری پارٹی سے کہا جا رہا ہے کہ یہ دونوں بھائی ہیں۔ کس انداز سے بات کہی ہے کہ اومڑ دانئیں ہیگا' بھرا بھرا لڑن ڈئے ہیگے نیں۔ توں کیوں تکنا پیا؟ کیا او تیرے بھرانئیں لگدے ہیگے (اللہ اکبر) وہ لڑائی سے باز نہیں آ رہا۔ بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ تم کیوں خاموش تماشائی بنے کھڑے ہو؟ کیا وہ تمہارے بھائی نہیں لگتے؟ یہاں رشتہ اَخَوَیْکُمْ کا ہے' جب تک وہ مومن ہیں۔ یہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (49:10) عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو "انما" ہے' یہ کتنا حتمی ہوتا ہے' اس کے اندر یقینی بات ہوتی ہے۔ یہ حقیقی بات خدا کہہ رہا ہے کہ مومنوں کا باہمی تعلق ہے' وہ تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' اور کہا جا رہا ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (49:10) تمہارے بھائی لڑ رہے ہیں' اٹھو! اور ان میں صلح کرا دو' کیوں کہ وَاتَّقُوا اللّٰہَ (49:10) یہ تعلیمِ خداوندی ہے۔ اس کی نگہداشت کرو لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (49:10) تمہارے اوپر رحمت کے دروازے اسی صورت میں کھلیں گے۔

عربی میں مومنوں کے صیغے میں مؤنث اور مذکر دونوں کا ایک ہی صیغہ ہوتا ہے

اس دفعہ آپ کے پاس طلوعِ اسلام کا پرچہ [1] آئے گا تو اس میں عورت کے متعلق ایک مضمون ہے۔ اس میں ایک مایوسی کی بات ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ (49:10) قرآن کریم کا بھی انداز یہ ہے اور Laws (قوانین) جو مروج ہوتے ہیں' ان میں بھی یہ ہے کہ جب Masculine (مذکر کا) صیغہ استعمال کیا جائے' وہ اجتماعی ہو تو اس میں مؤنث کا صیغہ خود آ جاتا ہے۔ یہ قانون ہے۔ قرآن کریم میں بھی جہاں مومنوں کہا ہے' وہاں مذکر کے صیغے استعمال کیے ہیں' ان کے اندر مؤنث کے صیغے خود آ جاتے ہیں' عورتیں خود مومنوں کے اندر شامل ہوتی ہیں۔ مرد ہی مومن نہیں ہوتے اگرچہ گرامر کے اعتبار سے تو یہ چیز ہے لیکن میں نے عرض کیا ہے کہ قانون میں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ جو Verb (فعل) یا ضمائر ہیں جو Pronouns ہیں' وہ Masculine بھی کیوں نہ ہوں' مذکر کیوں نہ ہوں' اگر کوئی اجتماعی چیز ہے تو اس میں خود بخود عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

قرآنِ حکیم کے ہاں جنسیاتی مسئلے کا حل ایک لفظ میں

قرآن حکیم نے تو اخــــــــــ کا لفظ مردوں اور عورتوں کے لیے خاص طور پہ دوسرے مقام پہ بھی بولا ہے۔ یہ صرف مرد ہی آپس میں بھائی بھائی نہیں' میری بیٹیاں' میری بہنیں غور سے سنیں' یہ نئی چیز آئے گی۔ کہا ہے کہ یہ سب تمہارے بھائی ہیں' ان سے کہا گیا کہ یہ سب تمہاری بہنیں ہیں۔ دنیا میں جنسیات کا سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ ان کو چھوڑ کر' جو کہیں Perversion (بدنہادی) کا ہی کوئی کیس ہو' کروڑوں

---

[1] اس کے لیے دیکھیے مجلّہ طلوعِ اسلام جون 1982ء

میں ایک آدھ کیس اس قسم کا جنسی Perversion (بدنہادی) کا ہوتا ہے کہ وہ بیٹی بہن میں تمیز نہیں کرتا ورنہ میں نے اس مضمون میں جیسا لکھا بھی ہے' میں کہا بھی کرتا ہوں کہ بدمعاش سے بدمعاش' آوارہ سے آوارہ لڑکا' سارا دن دوسری لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والا' رات کو گھر آئے' گھر میں اکیلی جوان خوبصورت بہن موجود ہو' دونوں اپنے ہی کمرے کے اندر ساری عمر سوئے ہوئے ہیں' وہ اس کی طرف نظرِ بد اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ کیوں کیا تبدیلی ہے؟ یہ کہ بہن ہے۔ اس نے کیا مسئلہ حل کر دیا؟ ان سے کہا کہ او! بہنیں ہیں' ان سے کہا کہ وہ بھائی ہیں (اللہ اکبر) تاوقتیکہ قانون کی رو سے وہ ازدواجی رشتہ میں منسلک نہ ہو جائے: تمام عورتیں بہنیں ہیں' تمام مردان کے بھائی ہیں۔ بہن اور بھائی کے تعلق کے بعد کوئی بدمعاش ترین لڑکا بھی اس کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتا۔ یہ سارے بدمعاش تو نہیں۔ مسئلے حل ہو گئے مگر انہوں نے کہا کہ ان کو گھروں میں بند کرو' ان کو چادریں اڑاؤ' یہ سب کچھ کرو۔ بھائی اور بہنوں کے درمیان تو اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ ضرورت تو اس لیے پڑے گی کہ نہ ہم نے ان کو بہنیں سمجھا ہے' نہ ہم ان کے بھائی بنے' مسائل کھڑے ہو گئے' اس کے لیے اصلاح کی صورتیں یہ کہی جا رہی ہیں' یہ چیز کہ وہ سارا کچھ ہے مگر ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔ سرا یہ ہے کہ اگر یہ بھائی اور بہن کا تعلق قائم کر لیتے ہیں تو مسئلہ ہی اس کے بعد پیدا نہیں ہوتا۔ قرآنِ حکیم نے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49:10) ایک لفظ میں یہ ساری بات کہہ دی۔

ملتِ اسلامیہ یا اُمتِ مسلمہ کی بنیادی خصوصیت اور لفظ تمسخر اور مزاح کے درمیان استعمال کی لطافت

آپ دیکھیے کہ بات تو کچھ مملکت کی' قانون کی' ہو رہی ہے۔ آپس میں یہ ساری بات کہاں چلی گئی۔ وہ پوری ایک امت' ایک ملت تیار کرتا ہے' ایک معاشرہ تیار کرتا ہے جس میں ہر مرد اور عورت کے بھائی اور بہن کے تعلق ہوں (اللہ اکبر)۔ اب اس کے بعد اتنی بڑی اہم چیز ہے' اور پھر اس کے بعد چھوٹی سی بات ہے' وہ چھوٹی سی میں نے عرض کیا ہے۔ اب آیئے معاشرتی چھوٹی چھوٹی باتیں' جو میں نے کہا تھا کہ چھوٹی چھوٹی نہیں ہیں' بہت بڑی بڑی باتیں ہیں۔ کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ (49:11)۔ یہاں لفظ یسخر جس کا عام ترجمہ تمسخر کیا جاتا ہے۔ انگریزی زبان میں ایک چیز Humour ہوتی ہے' ایک چیز وہ مزاح ہوتا ہے کہ ایک بڑی شگفتہ سی چیز کے اندر تھوڑی سی لطافت ہوتی ہے' اس سے مقصد کسی کا ذلیل کرنا نہیں ہوتا۔ یہ مزاح کرنا ہوتا ہے۔

عربی زبان میں قرآنِ مجید کے اندر استہزا آیا ہے۔۔ یہ جو یسخر کا لفظ ہے' یہ ''س خ ر'' سے ہے۔ سخر کے معنی ہوتا ہے دوسرے کو اس طرح سے اپنے نیچے دبانا کہ وہ ذلیل ہو جائے۔ جو تمسخر ہے' اس میں Intention (نیت) ہوتی ہے' یہ اس قسم کا تمسخر ہے کہ اس سے دوسرے کو ذلیل کیا جائے' تھپڑ مار کر نہیں' ڈنڈا مار کر نہیں' الفاظ کے ذریعے سے ذلیل کیا جائے۔ یہ سخر کا لفظ ہی اس کے لیے ہے۔ تسخیر کا

لفظ یہاں سے آتا ہے یعنی یہ مسخر کرنا۔ اسی سے آتا ہے لیکن یہ مسخر کرنا ہے۔ استہزا کا یہ اس قسم کا تمسخر نہ کرو کہ دوسرا اس میں ذلت محسوس کرنے لگ جائے۔ ہمارے ہاں جو تمسخر ہے اس کی Intention (نیت) یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کو ذلیل کیا جائے۔ کہا کہ یہ تو تمہارے بھائی ہیں تو بھائیوں کو بھی کوئی ذلیل کیا کرتا ہے بھائی کی ذلت تو تمہاری اپنی ذلت ہے۔ کسی سے کہا جائے کہ اس کا باپ تو اس قسم کا تھا اور وہ جو تمہارا بھائی تھا، وہ تو خود تمہارا باپ اس قسم کا ہوگیا، تمسخر نہ کرو، ہوسکتا ہے کہ دوسری جماعت تم سے بہتر ہو، مرد بھی یہ کچھ نہ کریں، عورت بھی یہ کچھ نہ کریں۔ تمسخریوں کیا جائے۔ آپ نے یہ دیکھا کہ تمسخر کا لفظ کس معنی میں یہاں آیا ہے۔ ایک چیز تو یہ ہوتی۔ اس قسم کا تمسخر نہیں جس میں Intention (نیت) یہ ہو یا جس میں دوسرا اپنی ذلت محسوس کرے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اگر ہمارے ہاں اتنی سی ہی اصلاح ہو جائے تو کتنے دنگا فساد مٹ جاتے ہیں۔ اخباروں میں روز آتے ہیں کہ آپس میں مذاق کرتے تھے، مذاق مذاق میں چھری ماردی، ایک دوسرے کو قتل کر کے رکھ دیا۔ یہ اس قسم کا مذاق ہے۔ یہ مزاح نہیں ہے۔ یہ تو مذاق ہوتا ہے، یہ تمسخر ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرا اس میں اپنی توہین محسوس کرتا ہے، تذلیل محسوس کرتا ہے، اس لیے قتل تک کی نوبت آجاتی ہے۔ کہا ہے کہ وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ (49:11) تم تو آپس میں سارے بھائی بھائی ہو۔ یہ کیا الفاظ ہیں قرآن کریم کے! ان کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔ تم آپس میں تَلۡمِزُوۡۤا (49:11) یونہی کسی کے ذمے کوئی بات نہ چپکا دینا۔ ''لمزہ'' یہ ہوتا ہے کہ ایسے نہ چپکا دیا کرو۔

ایک دوسرے کے الٹے پلٹے نام رکھنے کا انداز، اس کے عواقب اور کسی بات پہنچنے پر پہلا ردِّ عمل

روز ہمارے معاشرے میں یہ ہوتا ہے کہ یونہی کسی کے ذمے ایک بات چپکا دی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ صاحب! قطعاً ایسا نہ کر وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ (49:11) الٹے پلٹے نام نہ رکھا کرو۔ یہ الٹے پلٹے کہنے سے تو کچھ بات بنتی نہیں ہے۔ اب بات وہی پنجابی کی آتی ہے کہ ناواں دے پناں نہ رکھیا کرو (الٹے پلٹے نام نہ رکھو) یہ بات ہے وہ پناں رکھنے جیہڑے ہیگے نیں (جسے الٹے پلٹے نام رکھنا کہتے ہیں) یہ عام ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کی یہ چیز ہے کہ الٹا پلٹا نام رکھ لیا جاتا ہے۔ اس نام میں یہ نہیں ہوتا کہ اس کی عزت افزائی کے لیے کوئی بڑا نام رکھ دیا جائے، اس کے اندر جذبہ یہی ہوتا ہے کہ دوسرے کو کسی طرح سے ذلیل کیا جائے، اس کی تذلیل کی جائے، اس کو کمتر دکھایا جائے۔ کہا ہے کہ اس قسم کے نام نہ رکھا کرو۔ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ (49:11) جب مومن ہوگیا، جب ایمان لانے کے بعد وہ تمہارا بھائی ہوگیا تو پھر تم اس قسم کے نام رکھتے ہو تو تم خود اس کے اندر آجاتے ہو، تم خود ذلیل ہو جاتے ہو، اگر تمہارا بھائی اس قسم کا ہے تو تم کیسے بچ سکتے ہو؟ یہ انفسکم دیکھو یہاں کیا معنی دیتا ہے، کیا بات ہے! کہا ہے کہ وَمَنۡ لَّمۡ يَتُبۡ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (49:11) پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس کو چھوڑنا ہوگا اور جو کچھ کیا ہے، تمہیں اس کا ازالہ کرنا ہوگا، اور یہ نہیں کرو گے تو سب سے بڑا جرم قرآن کریم کے نزدیک ظلم ہے۔ یہاں کہا ہے کہ فَاُولٰۤـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (49:11) یہ باتیں چھوٹی چھوٹی نظر آرہی ہیں لیکن اس

کے جتنے عواقب ہیں وہ دیکھیے! اتنا بڑے ہیں کہ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ(49:11) وہ قانونِ خداوندی کی نگاہ میں مجرم قرار پائیں گے اور آگے بڑھیے۔ کہا کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (49:12)۔ میں نے پچھلے درس میں کہا تھا کہ پہلے قرآن کریم نے یہ کہا تھا کہ جب کسی کے متعلق کوئی بات تم تک پہنچے تو تمہارا First Reaction (پہلا ردِعمل) یہ ہونا چاہیے کہ نہیں، یہ بات غلط نظر آتی ہے' یہ ایسا تو نہیں ہے۔

بدظنی کی شکل میں پیدا ہونے والے غلط تصورات کا نتیجہ

عزیزانِ من! اگر اتنی سی بھی ہم اپنے اندر تبدیلی پیدا کر لیں تو جب تک تحقیق نہیں ہوئی اس وقت تک جو ظن ہے اس کے متعلق ری ایکشن' اس کے متعلق ہمارا ردِعمل' نیک ہونا چاہیے کہ نہیں' وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ جو آپ کے ہاں ساری تحقیقات ہوتی ہیں' وہ پولیس کے Through (ذریعہ) ہوتی ہیں' وہ مجرم نہیں ثابت ہوا ہوتا۔ جس کے ساتھ یہ کچھ ہوتا ہے کہ وہاں اخبارات میں روز آتا ہے کہ پولیس کے تشدد سے وہ ہلاک ہی ہو گیا۔ یہ کس کے ساتھ ہو رہا ہے؟ اس کے متعلق کہ ابھی وہ صرف ملزم ہے۔ مجرم کو تو شاید سزا ملے بھی نہیں اور اگر عدالت کی طرف سے ملے بھی تو شاید دو تین مہینے کی ہو یا شاید اس سے بھی کم۔ لیکن اس سے پہلے یہ الزام کی شکل میں ہے' جسے ملزم کہتے ہیں۔ تو یہ اس ملزم کے ساتھ ہمارے ہاں جو کچھ ہوتا ہے اور پھر انفرادی طور پر وہ کسی کے متعلق جو ظن ہے' وہ ہمارے ہاں نیک ہوتا ہی نہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ کسی کے متعلق کوئی آ کر تعریفی کلمات کہے کہ صاحب! وہ بہت اچھا آدمی ہے' ایک ایماندار' دیانتدار افسر آیا ہے اور دو چار الفاظ تو زیادہ سے زیادہ وہ برداشت کر سکے گا اور اس کے بعد پھر ہو گا کہ او میاں! چھوڑو بیچ میں اسبغول وچوں نہ پھول کئی ایہو جئے آئے دیکھے اوئے مگروں پتہ لگدا ہیگا او وچوں ایہوں نئے ہیگے نیں یعنی دوسرے کے متعلق نیک بات سن نہیں سکتا اور اگر وہ خرابی کی بات آئے تو صاحب! وہ یہ کچھ تھا' ہاں ہاں ٹھیک ہے جی' میں نے یہ باتیں بہت سنی ہیں؟ ہاں جی! پھر ''اور کیا چیز آپ نے سُنی'' چلتا ہے' پھر وہ لذت لیتا ہے کہ اس کے اندر یہ ہے۔ یہ ہمارا معاشرہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا پہلا ظن نیک ہونا چاہیے کہ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا اور کئی ظن ہیں وہ تو جب آگے چلتے ہیں تو اثم تک بات جا پہنچتی ہے صاحب! حالانکہ وہ ہوتی بدظنی کی بات ہی ہے۔ ساری حقیقت نہیں ہوتی' تم نے اس کو تحقیق نہیں کیا ہوتا' ابھی وہ ملزم ہی ہے' الزام ہی ہے۔ اس کے متعلق جو ظن ہے' وہ نیک نہیں ہے۔ دیکھا' عزیزانِ من! جس کو قرآن کریم چھوٹی چھوٹی سی باتیں کہتا ہے' اگر معاشرے میں ان چھوٹی چھوٹی سی باتوں کی اصلاح ہو جائے تو آپ دیکھیے کہ کتنے بڑے بڑے فسادات سے ہم بچ سکتے ہیں۔

کسی کے معاملے میں ٹوہ میں مبتلا رہنا مناسب نہیں ہوتا

آگے کہا ہے کہ وَّلَا تَجَسَّسُوْا (49:12) جو تمہارا معاملہ نہ ہو' دوسرے کے معاملے ہوں تو ان میں ٹوہ نہ لگاتے پھرا کرو' کن سوئیاں لیتے ہوئے نہ رہو: اچھا! یونہی نظر بظاہر سب کچھ ٹھیک نہیں آ رہا ہے۔ تجسس' ٹوہ لگانا ہوتا ہے کہ کسی قسم کا کچھ پتہ چل جائے' ذرا اسی بات بھی یوں نظر آ جائے۔ یہ بعض میں عادت ہوتی ہے اور معاشرہ جب اس قسم کا بگڑے' جیسا ہمارا ہے' پھر تو ہر ایک اس میں لذت لیتا ہے۔ دوسروں کے معاملے میں اس طرح سے دخل دینا جس کا تم سے کچھ بھی تعلق نہیں اور پھر ٹوہ لگاتے پھرنا کہ اس کے اندر کیا ہے' پتہ کرنا چاہیے جناب! مجھے بھی اس کے متعلق بڑی ضروری چیز ہے جناب! یہ پتہ کرنا چاہیے۔ غلط معاشرے میں یہ کچھ ہوتا ہے۔

بدخواہی یا غیبت انسان کو بزدل اور منافق بنا دیتی ہے' قرآن کریم نے اصول دیئے اور چھوٹی چھوٹی معاشرتی باتیں بھی کیں

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے کہا ہے کہ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا (49:12) کسی کی غیبت نہ کرو۔ کیریکٹر پیدا کرو' کسی کے خلاف اگر کوئی چیز ہے تو اس کے منہ پہ کہو' برملا کہو' بے باکانہ کہو' یہ انتہائی بزدلی اور منافقت ہے کہ اس کے سامنے تو آپ ایک لفظ نہ کہیں بلکہ اس کی تعریف کریں' جب وہ منہ موڑے' وہ وہاں نہیں ہے تو اس کے خلاف آپ نے پھر غیبت کی بات شروع کر دی۔ اس کا تو شاید اس سے کچھ زیادہ نہ بگڑے' تمہاری منافقت میں تو کوئی شبہ نہیں باقی رہ سکتا۔ اسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ (49:12) کسی کے پیٹھ پیچھے اس کے خلاف یہ کچھ کرنا' یوں سمجھو جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا ہے۔ بھائی کا گوشت' انسان کا گوشت' پھر مردے کا گوشت کیا ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی سی معاشرتی خرابیاں ہیں اور ان کی اصلاح کی شکل قرآن کریم دے رہا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں اہم ملی' قومی' دینی' مملکتی معاملات کے متعلق اصول ہیں اور جو چھوٹی چھوٹی سی معاشرتی خرابیاں ہیں ان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تا کہ معاشرہ ان خرابیوں سے پاک ہو۔ جب وہ اجتماعی امور کی طرف آئے تو پھر اس کے لیے یہ اہم اصول ہے۔

تحریکِ پاکستان کی بنیاد

اور اگلی آیت وہ آتی ہے جس کے دانستہ غلط مفہوم سے بڑے بڑے اہم فسادات کھڑے کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک اصول پر تھی کہ ہندو کہتا تھا اور ہندو کے ہمنوا جو نیشنلسٹ مسلمان تھے' وہ بھی کہتے تھے کہ قومیت وطن کے اشتراک سے بنتی ہے' ایک وطن کے اندر رہنے والے افراد کا مذہب کچھ بھی کیوں نہ ہو' وہ ایک قوم بن جاتے ہیں اور قرآن کریم کی رو سے یہ ادھر جسے

ہم مسلم لیگ والے کہتے ہیں، یہ آج کی مسلم لیگ والے نہ کہیے۔ وہ کہتے تھے کہ علامہ اقبالؒ نے قرآن کریم کی رو سے قومیت کا یہ تصور دیا تھا کہ اسلام میں ایمان کے اشتراک سے، قومیت کی تشکیل ہوتی ہے، اسلام کے رشتے میں جو سارے پروئے جائیں وہ کہیں بھی ہوں، وہ الگ قوم کے افراد ہوتے ہیں۔ یہ دوقومی نظریہ کہلاتا تھا۔ وہ (ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان) اسے وطن کے اشتراک یہ کہتے تھے۔ یہ تھی وجہ نزاع۔

پاکستان کے وجود میں آجانے کے بعد اس کی بنیاد کو روندا جارہا ہے

عزیزانِ من! میں آگے جو بات کہوں گا اس سے نظر آئے گا کہ میں نے یہ بات کیوں پیش کردی۔ وطن کے اشتراک کے اوپر تو پھر بھی یہ کیفیت تھی کہ ایک شخص اس وطن سے نکل کر دوسرے وطن میں چلا جائے تو قومیت بدل جاتی تھی۔ یہ قومیت کا نسل کی بناء پر ایک تصور ہے۔ وہ جواب اس پاکستان میں، جسے حاصل کیا گیا تھا، قومیت کے اس تصور کی بناء پہ، کہ یہ وطن کے اشتراک سے نہیں، اسلام اور دین کے اشتراک سے ہوتا ہے، اس پاکستان کے اندر تحریکیں اُٹھ رہی ہیں کہ یہاں چار قومیں بستی ہیں۔ کس طرح صاحب؟ کیا Criterion (کسوٹی) ہے؟ نسل کی بناء پر بستی ہیں؟ میں نے کہا جغرافیہ کی بناء پہ؟ ہم اس بنیاد کی مخالفت کررہے تھے۔ وہ تو بات ختم ہو جاتی ہے۔ جب وطن چھوڑ دیا جائے، آدمی کے اختیار میں ہے کہ وطن چھوڑ دے، اور نسل کو تو چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ آپ اٹھتے بیٹھتے سوچ رہے ہیں کہ صاحب! پاکستان اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا اور اسلام کی جو یہ بنیاد تھی اس کو کس طرح سے یہاں توڑا اور روندا جارہا ہے۔

انسانیت کو ہندو دھرم کی طرح نسلی بنیاد پر رکھنا سب سے بڑا جرم ہے یہی نسل پرستی اب پاکستان میں ہے

میں نے کہا کہ جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والوں کی، وطن کی بناء، پھر بھی ہنگامی چیز ہے، یہ بدلی جاسکتی ہے۔ نسل کی بناء پہ اگر آپ قومیت کو رکھتے ہیں تو یہ تو بدلی ہی نہیں جاسکتی۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ ہندوؤں کا ورن ہے، وہ پیدائش کے اعتبار سے، نسلی طور پر انسان کو چار ورنوں میں تقسیم کرتے ہیں، جن کو ذاتیں کہتے ہیں۔ ورن بڑی ذات ہوتے ہیں اور اس کے نیچے ان کی گوتیں ہوتی ہیں۔ پوچھا جاتا ہے کہ ''کون ہونا ہیگا؟ جی! مسلمان۔ اومینوں گل دس وی کہ توں کون ہونا ہیگا ایں؟ اونیں کیا کہ جی راجپوت۔ او کیہڑا راجپوت ہونا ایں؟ کہا کہ جی تارڑ ہونے آں۔ پچھیا کہ کیہڑے تارڑ ہوندے ہیگے ''جی''؟ ❶ چل بھئی، یہ گوتیں آگے چلتی ہیں صاحب! یہ بھی ان کے ہاں چلتا ہے۔ یہ ہیں شودر، ویش، کھشتری، برہمن۔ عقیدہ یہ ہے کہ برہمن کی نسل میں پیدا ہونے والا پیدائشی برہمن اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو برہمنوں کو حاصل ہیں، پیدائش کے اعتبار سے ساری عمر وہ اسی سے متعلق رہتا ہے، بدل نہیں سکتا۔ برہمن کو تو بدلنے کی ضرورت ہی

---

❶ کون ہوتے ہو؟ جی! مسلمان۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کون ہوتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی! راجپوت، کونسے راجپوت؟ کہا کہ جی! ہم تارڑ ہیں۔ پوچھا کہ کون سے تارڑ ہیں جی؟

نہیں ہوتی۔ کھشتری کو بھی کیا ضرورت ہے' وہ بھی بڑے احترام کے مقام پر ہوتا ہے' ویش بھی ہوتا ہے بہر حال کاروباری ہوتا ہے۔ شودر بیچارہ جو وہاں انڈیا میں Majority ہے' وہ شودروں کے گھر میں پیدا ہوتے ہیں' انہیں ذلیل ترین انسان ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ قیامت یہ ہے کہ وہ اپنی شودریت کو بدل ہی نہیں سکتا' وہ نسل بدل نہیں جاتی تو گویا انسانیت کی تاریخ میں نسل کے اعتبار سے قومیت کی تشکیل بدترین جرم ہے' جسے انسان بدل ہی نہیں سکتا۔ یہ آپ کے ہاں کا جسے پاکستان کہتے ہیں' اسلام کی بناء پہ لیا گیا تھا۔ اب اس میں نسل کی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل ہوتی ہے۔ یاللعجب!

قرآنِ حکیم نے تو نسل پرستی کی بجائے ہمیشہ الناس کو مخاطب کیا ہے

کیا بات ہے قرآن حکیم کی! کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی (49:13) پہلی چیز تو یہ ہے کہ الناس کو قرآن کریم مخاطب کر رہا ہے' تو پہلی چیز تو یہی ہوگئی کہ وہ انسانیت کو مخاطب کر رہا ہے۔ قرآن کریم کا مطمع نگاہ' ماٰخذ' مآل' انسانیت کو ایک قوم ایک برادری بنانا ہے۔ کہا ہے کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً (2:213) پوری انسانیت امتِ واحدہ ہے۔ اس میں جغرافیائی امتیازات تو ایک طرف' نسلی امتیازات تو کوئی ہوتے ہی نہیں ہیں۔ یہاں الناس کو مخاطب کیا گیا ہے۔

دین کے برعکس مذہب پرستی کے اندر عورت کا مقام

تمہاری جو تخلیق ہوئی ہے اس میں عورت اور مرد کی یہ پہلی تفریق ختم کی۔ کہا ہے کہ ایک بچہ جو پیدا ہوتا ہے' وہ نہ تنہا مرد کا بچہ ہوتا ہے' نہ تنہا عورت کا بچہ ہوتا ہے' اس لیے کہ خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی ہو' اس میں دونوں شریک ہوتے ہیں' خاوند اور بیوی دونوں شریک ہوتے ہیں' مرد اور عورت دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے' جو بچہ ہوتا ہے۔ اس میں لڑکی اور لڑکے کی مساوات تو یہیں سے آ گئی۔ آتی رہے' مولوی صاحب تو کہتے ہیں کہ لڑکے کے عقیقے میں دو بکرے' لڑکی کے عقیقے میں ایک بکرا۔ لوایتھوں گل شروع ہو جاندی اے۔ اوس غریب دے حصے اچ بکرا ای اکو آنداا ے۔ اے کڑی دو اک دناں دی وی نئیں وچاری تو تقسیمیں شروع ہو گئیں۔ ایہدا ادھا حصہ۔ تے جیویں ادھا حصہ ٹریا او دہا' فیر اخیر تکر۔ قتل کے بعد جو دیت ہوتی ہے خون بہا' ان کی فقہ کا مسئلہ ہے کہ عورت کا خون بہا یا دیت مرد سے آدھا آتا ہے۔ اینوں تے اگر اے جنت اچ پہلے پہنچن ای نئیں دینا اوناں نیں کہ ساڈا ایمان خراب ہوندا۔ ایناں دے ایمان وی ٹھیکیدار دے نیں۔ اگر کہیں گئیں بھی تو انہوں نے کہنا ہے اللہ میاں سے کہ ایناں نوں ادھا کوٹھا دیو آدھا[1]۔ یہ پہلی چیز تو قرآن حکیم نے یوں کاٹی۔

---

[1] جی! یہ یہاں سے بات شروع ہو جاتی ہے۔ اس غریب لڑکی کے حصے میں ایک ہی بکرا آتا ہے۔ یہ بیچاری دو ایک دن کی بھی نہیں ہوئی کہ تفریق شروع ہوگئی: آدھا حصہ ہے۔ جیسے ہی یہ آدھا حصہ چلا تو پھر وہ حصہ آخر تک چلا۔ یہاں تک کہ قتل کے بعد جو دیت، خون بہا ہے' ان کی فقہ کا مسئلہ ہے کہ عورت کا خون بہا' دیت مرد سے آدھا ہے۔ اسے تو پہلے انہوں نے جنت میں داخل ہی نہیں ہونے دینا کہ ان کا ایمان خراب ہو جاتا ہے۔ ان کے ایمان بھی ٹھیکیدار کے ہیں۔ اگر کسی طرح سے یہ جنت میں چلی بھی گئیں تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہنا ہے کہ انہیں مکان بھی آدھا ہی دو۔

قبائلی تصوّر کے متعلق قرآنِ حکیم کی وضاحت

اب اگلی بات ہے جہاں سے سند دیتے ہیں کہ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ (49:13) یہ شعوب جنہیں آپ برادریاں کہتے ہیں' یہ قبائل' گوتیں ہیں جن کے آپ نے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ جَعَلْنٰكُمْ کا ایک لفظ ان کے ہاتھ میں آ گیا کہ خدا کہتا ہے کہ ہم نے تمہیں مختلف قبائل اور مختلف گروپ بنائے' مختلف قبیلے' مختلف ذاتیں' مختلف گوتیں تو خدا نے بنائے ہوئے ہیں' کون ان کو مٹا سکتا ہے۔ جی! یہ ہندو بھی یہی کہتا ہے کہ شودر تو برہما نے بنائے ہوئے ہیں' کون ان کو مٹا سکتا ہے' ان کے خلاف تو تم روز مناظرے کرتے ہو' اپنے Constitution (آئین) میں یہ رکھا ہوا ہے کہ یہاں یہ چیز قطعاً نہیں ہوگی' یہ اسلام کے خلاف ہے تو اسلام کے خلاف ذاتیں اور برادریاں عین اسلام ہیں۔ یہ شعوب اور قبائل کاہے کے لیے ہیں؟ قرآن حکیم نے بات بتا دی کہ اس کی ضرورت کیوں پڑ رہی ہے۔ اسلام سے پہلے' عربی معاشرہ صحرا نورد اعراب بدوؤں پر مشتمل تھا۔ ایک چھوٹا سا گروہ ہے' وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ' بھیڑ بکریوں کے ساتھ ہے' کہیں پانی ہوا' نخلستان ہوا' وہاں چار دن بسر کر لیے' وہاں پانی ختم ہوا' وہ خانہ بدوش اپنے مونڈھے پر گھر کو لادا اور پھر چل نکلے کسی دوسری جگہ' وہاں جا کر انہوں نے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی۔ ان کے ہاں کی ساری معاشرت ہی اس قبائلی زندگی کی تھی' آج تو پھر بھی پہچان کے کئی طریقے نکل آئے ہیں' آپ سوچیے کہ صحرا' جس میں نہ کوئی شہر' نہ کوئی بستی' نہ کوئی قریہ' ورنہ اور کچھ نہیں تو اتنا ہی سہی کہ صاحب!'' وہ کیہڑا گاما پہلوانی؟ لاہور یہ؟ وہ کونسا گاماں پہلوان؟ کیا وہ لاہور کا ہے؟ کم از کم لاہور کی نسبت سے ہی تعارف ہو گیا۔ وہاں تو شہر بھی کوئی نہیں تھا' گاؤں کوئی نہیں تھا جس سے تعارف کرایا جائے' صحرا میں بسنے والے آج یہاں کل وہاں' وہاں جو کوئی آدمی کسی کو قتل کر دے اور قاتل کے متعلق تمہیں کہنا ہو کہ وہ کون تھا تو کیسے تعارف کرایا جائے؟ ان کے ہاں طریقہ ہی یہ تھا کہ فلاں قبیلے کا فرد تھا' پہچان کا دوسرا طریقہ ہی اس دور میں نہیں تھا' ہو نہیں سکتا تھا' کوئی اور طریقہ سوائے اس کے کہ قبیلے کی نسبت پر ہو۔ وہ نسبت بدلی نہیں جاتی تھی اور اسی لیے ہر فرد کو اپنے نام کے ساتھ قبیلے کی نسبت بتانی پڑتی تھی' خواہ وہ باپ کے نام سے بتائے یا قبیلے کے نام سے بتائے' وہ تعارف کی وجہ سے تھا' وجہ تعارف ہی ان کے لیے یہ بات تھی۔ وہاں اس زمانے کی معاشرت یہ تھی' دوسرا کوئی طریقہ ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ شعوب اور قبائل موجود ہیں۔ قرآن حکیم کا انداز یہ تھا کہ جو باتیں اس زمانے میں ایسی چلی آتی تھیں' جو جیسی تھیں وہ ان میں مداخلت نہیں کرتا تھا' وہ ان کو قائم رکھتا تھا' تاوقتیکہ ان کے اندر دین کی رو سے تبدیلی نہ ہو جائے۔ وہ تبدیلی کیا تھی؟ جب یہی قبائل اسلام لانے کے بعد ایک الگ کمیونٹی بنتے تھے' الگ امت بنتے تھے' مسلم امت بنتے تھے' تو پھر قبائلی نسبت نہیں رہتی تھی' وہ قطرے یا دریا سمندر میں مل کر سمندر بن جاتے تھے' وہاں راوی بیاج اور ستلج باقی نہیں رہتا' اس وقت تک ان کے ہاں یہ صورت تھی۔

ذات برادری کے تصوّر پر قرآنِ حکیم کی قدغن

قرآن حکیم نے یہاں بھی ایک قدغن لگا دیا کہ یہ جو اس وقت تمہاری حالت ہے، یہ تمہاری مجبوری ہے کہ تم شعوب اور قبائل ہو لیکن یاد رکھو! یہ صرف تعارف کے لیے ہے' اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے اور آگے پھر وہ بات کاٹ کر رکھ دی' جو اونچی ذات اور نیچی ذات ہوتی ہے' وہ جو سیّد ہوتا ہے اور نیچے یہ دوسری ذاتیں ہوتی ہیں۔ اس پرچے [1] میں ہی آپ دیکھیں گے کہ عدالت نے اس میں فیصلہ دیا ہے وہ غالباً زنا کا کیس ہے اور اس میں وہ جولڑکی ہے' وہ سیدزادی ہے اور وہ جو مجرم ہے' بدقسمتی سے اس میں لکھا ہے کہ وہ موچی ہے تو وہ ٹھیک ہے وہ جرم ہے' گناہ ہے' اس کی سزا دینی چاہیے لیکن اس کے ساتھ انہوں نے اور رگڑا دیا ہے۔ دیکھو! یہ جرم اس نیچ ذات کے اس آدمی نے اتنی اونچی ذات کی عورت سے کیا اور اس کے ساتھ یہ ہے کہ وہ سیدہ ہے (اللہ اکبر) ٹھیک ہے جی! تمیں کوڑے اگر اس جرم کے ہیں تو پچاس اس کے بھی دینے چاہئیں صاحب! اس کے ساتھ ہوا ہے۔ یہ کیفیت ہے۔ قرآن حکیم نے کہا تھا کہ لِتَعَارَفُوْا (49:13) یہ صرف تعارف کے لیے اور کہا کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ (49:13) ذات اور برادری کی نسبت سے اگر تم کہو کہ یہ اونچی ذات ہے' یہ نیچی ذات ہے' اس سے صاحب! دین کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ خدا کے نزدیک اونچے اور نیچے ہونے کا معیار ایک ہی ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو۔

ایک اعتراض کا جواب: لفظ ''جَعَلۡنٰکُمۡ'' کا مفہوم

قرآن کریم کے نزدیک معیار تقویٰ ہے' پیدائش نہیں' نسل نہیں' قبیلہ نہیں' شعوب نہیں ہے' برادری نہیں ہے اور اگر تعارف کے اور ذرائع نکل آئیں تو پھر یہ تعارف کا ذریعہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ یہ قرآن کریم میں' میرے ساتھ تو یہ ہوتا چلا آ رہا ہے اس لیے مجھے اعتراضات کا پتہ ہے کہ جی وہ جَعَلۡنٰکُمۡ قرآن کریم نے کہہ دیا: ''ہم نے بنائے تمہارے''، چلیے صاحب! وہ تو پھر وہی ہندوؤں کے برہما والی بات ہوگئی کہ اس نے شودر بنائے اور برہمن بنائے' تمہارے ہاں والا جو ہے' اس نے نیچ ذات کے قریش بنائے' اس نے سیّد بنائے۔ ان کے خدا میں اور ان کے برہما میں اور تمہارے خدا میں فرق کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ ''جَعَلۡنٰکُمۡ'' کے یہ معنی نہیں ہیں۔ میرا ایک مضمون طلوعِ اسلام میں شائع ہوا ہے۔ غالباً جولائی میں ہے: تقدیر کی گرہیں۔ اس میں' میں نے یہ بتایا ہے کہ ایسے امور جن کی نسبت خدا اپنی طرف کرتا ہے' وہ درحقیقت انسانوں کے ہاتھوں سے سرانجام پاتے ہیں۔ میں دو ایک مثالیں اس وقت بھی دوں گا۔ یہ بڑی ضروری چیز ہے' جس میں جَعَلۡنٰکُمۡ کے معنی آئیں گے کہ ہم نے بنائے' خدا نے نہیں بنائے۔ وہ

---

[1] اس کے لیے دیکھیے مجلّہ طلوعِ اسلام جون 1982ء

(16:80-81) بڑی اہم چیز ہے یہ **جَعَلَکُمْ** ہے' یہ جو صحرانشین ہیں ان کے گھر خیمے ہوتے تھے' کھالوں کے بھی ہوتے تھے' کپڑے کے بھی ہوتے تھے' تو کھالوں کے وہ عام طور پر خیمے بناتے تھے' وہ خود کھالوں کے خیمے بناتے تھے' اب بھی جو آپ کے ہاں Tents وغیرہ بناتے ہیں' یہ ہمارے بنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ **وَ اللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ بُیُوْتِکُمْ سَکَنًا وَّ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا** (16:80) یہ ''جعل'' ہے کہ خدا نے تمہارے لیے' یہ دیکھیے کیسے اچھے اچھے گھر بنا دیئے ہیں' جس میں تم سکون سے رہتے ہو اور دیکھو! اس نے تمہارے لیے جانوروں کی' مویشیوں کی کھالوں سے کیسے کیسے وہ خیمے بنا دیئے ہیں تو خدا خود تو آ کر نہیں بناتا' نہ تمہارے لیے وہ گھر بناتا ہے' نہ تمہارے لیے وہ یہ کھالوں کے خیمے بناتا ہے۔ یہاں یہ ''جعل لکم'' آیا ہے' یہ اپنی طرف نسبت کر رہا ہے' اس لیے کہ بنیادی طور پہ یہ جو Material (مواد) ہے یہ جو مسالہ ہوتا ہے' یہ اس کا دیا ہوا ہوتا ہے' وہاں تک وہ بات ٹھیک چلتی ہے۔ آگے جو کچھ کرنا ہوتا ہے' وہ انسان نے بنایا ہوا ہوتا ہے لیکن وہ اس کے اوپر نسبت اپنی ہی رکھتا ہے۔ اس سے اگلی آیت میں ہے کہ **وَّ جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ** (16:81) یہ ذرہ بکتر' جو جنگ میں پہنتے تھے' ہم نے تمہارے لیے بنائی۔ او تے نتھولوہار بناونا ہیگا سی (وہ تو نتھو لوہار بناتا تھا) یعنی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ یہ قرآنِ حمید کو لاتے ہیں۔ ایک جگہ سے لیا **وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ** (49:13) اب آپ کو معلوم نہیں کتنی بحثیں اس ''**جَعَلْنٰکُمْ**'' سے یہ لاتے ہیں۔ یہ قرآن حمید تو کہتا ہے کہ خدا کہتا ہے: ہم نے شعوب وقبائل بنائے ہیں تم مٹا سکنے والے کون ہو۔ واقعی تم مٹا نہیں سکتے اس کے اوپر قومیتیں بنیں گی۔ خدا نے بتایا ہے' جی وہ خدا تو کہتا ہے' ہم نے تمہاری ذرہ بکتر بھی بنائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم نے تمہارے Tents بھی بنائے ہیں' تمہارے خیمے بھی اس نے بنائے ہیں۔ کیا کہتے ہو اس قسم کی بیسیوں چیزیں ہیں۔ (43:12) میں کیا چیز آ گئی!

خدا کی طرف سے رشتے بنانے کی ایک مثال

کہا کہ **جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ** (43:12) تمہارے لیے کشتیاں بنائیں۔ خدا نے وہی ''جعل'' کہا ہے اور پھر ایک جگہ تو ایسا آیا' میں سمجھتا ہوں اس کے بعد یہاں ضرورت ہی نہیں تو اس نے شعوب اور قبائل کہا ہے کہ تمہارے لیے ہم نے شعوب بنائے' یہ ان کا جو ترجمہ ہے کہ اس نے بنائے اور یہاں وہ (25:54) میں کہتا ہے' یہ دیکھیے **جعل** یہاں آیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَہٗ نَسَبًا وَّ صِھْرًا** (25:54) ہم نے انسان کے رشتے بنائے۔ ایک تو نسبی رشتے باپ دادا کے اور ایک سسرالی رشتے۔ کدی کتے سسرالی رشتہ اللہ دا بنایا ہو یا دیکھیا ہیگا جو آ کے کہے نکاح کر لے ایہدے نال (کیا کبھی اللہ کا بنایا ہوا سسرالی رشتہ دیکھا ہے کہ وہ آ کر کہے کہ اس سے نکاح کر لو)۔ ''جعل'' پر غور کیجیے۔ میں ایک لفظ پر لا رہا ہوں کہ یہ جو لوگ ہیں' کس طرح سے اپنے مفیدِ مطلب چیزوں

میں قرآن حمید کے اندر بھی اس کو مسخ کرتے ہیں۔ یہاں ''جعل'' کا لفظ آیا' میں پوچھتا ہوں کہ اس ''جعل'' کے یہاں کیا معنی ہیں کہ ہم نے نسبی رشتے بھی تو جس کا جی چاہے وہ بناتے ہیں' جس گھر میں پیدا ہوا اور سسرالی رشتے خدا نے بنائے' تو ''جعل'' کے یہ معنی نہیں ہوتے۔ جہاں اس نے یہ بتایا ہوا ہوتا ہے جو چیزیں جس طرح سے مروج ہوتی ہے ان کو قرآن حمید اس طرح سے بیان کرتا ہے کہ جو اس کی بنیاد ہے خدا کی طرف ہوتی ہے ورنہ یہ سارا کچھ خدا نہیں کرتا تو یہ جو شعوب اور قبائل ہیں یہ ''جعلنا'' کی وجہ سے یہ نہیں ہیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے ہیں' یہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں اور بنائے ہوئے بھی اس وقت تک یہ رہ سکتے ہیں جب تک صرف تعارف کا ذریعہ ہوں گے' اس سے زیادہ نہیں۔ جونہی آپ نے اونچ اور نیچ ذاتوں کی تقسیم کی' وہ آپ چلے گئے ہندوؤں کے برہما کے اوپر' شودر اور برہمن کے اوپر' جونہی آپ نے سید مغل پٹھان قریش نیچ ذاتیں' میں تو نام بھی نہیں لینا چاہتا' کیوں میں انسان کو نیچ کہوں قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ(17:70) ہم نے ہر انسانی بچے کو یکساں واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم نے یہ بات کاٹ دی۔ یہ شعوب اور قبائل کی برادری اور ذات کی اونچی اور نیچی کا سوال نہیں ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ(49:13) ایک ہی معیار رہ گیا تکریم کا کہ اَتۡقٰکُمۡ اور اگر شعوب وقبائل تعارف نہیں ہیں تو ختم ہے' اگر تو صرف تعارف کی حد تک ہے تو درست ہے۔ اگر اونچ اور نیچ کی یہ وجہ بنتی ہے تو اس سے دین کی جڑ کٹ جاتی ہے' عزیزانِ من! یہ خدا کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔

سورۃ الحجرات کی آیت 13 تک ہم آ گئے' 14 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ(2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: **سورۃ الحجرٰت** (آیات 14 تا 15)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1982ء کی 4 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الحجرات کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (49:14)۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اپنے اس قرآنی نصاب میں جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے ہیں' اہم سے اہم تر حقائق' ہدایات' احکام' قوانین تاکیدات سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔

ایمان کی پہلی شرط جان اور مال بیچنے کی بیعت ہے' صرف مملکت کے سامنے جھکنا نہیں ہے

آج کی جس آیت سے یہ درس شروع ہو رہا ہے وہ بڑی بنیادی آیت ہے۔ کہا ہے کہ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا (49:14) اعراب' یہ جنہیں بدوی عرب' کہا کرتے تھے' کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ یہاں شہری تو بہت تھوڑے سے تھے' ان میں بہت تھوڑی آبادیاں شہری تھیں اور باقی ساری آبادی جتنی بھی تھی' اور وہ بھی بڑی مختصر آبادی ہوتی تھی لیکن وہ بہرحال صحرا نورد' خانہ بدوش' بدوہی پہ مشتمل تھی۔ عام طور پہ انہیں اعراب کہا جاتا تھا تو یہ بھی اسلام کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ ابھی یونہی کہیں گے۔ کہا ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا (49:14) ان سے کہو کہ نہیں' تم ایمان نہیں لائے۔ یہ اتنی اہم تفریق ہے' تمیز ہے' جو دونوں میں کی گئی۔ ہمارے ہاں والی بات ہوتی تو وہ تو یہ ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم آتا ہے' مسجد میں بیٹھتا ہے' مولوی صاحب اس کو کلمہ پڑھا دیتے ہیں' چھ کلمے پڑھا دیں' ایمان کی صفت پڑھا دیں یا ایک آدھ کلمہ ہی سہی تو اس کے بعد اس کا نام بدل دیتے ہیں تو وہ مسلمان ہو جاتا

ہے۔ایمان لے آتا ہے۔ یہاں وہ کہتے ہیں کہ ہم تو ایمان لے آئے اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز جو اگر ہوگی تو ہوتی ہوگی لیکن وہ تو ایمان ہی کچھ اور ہوتا تھا' وہاں تو جان اور مال بیچنے کے لیے بیعت کی جاتی تھی لیکن جو کچھ بھی تھا' کہا کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ان سے کہو کہ نہیں' تم ایمان نہیں لائے وَلٰـكِنۡ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا (49:14) تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں' تمہیں کہنا یہ چاہیے کہ ہم نے اس مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے' ہم Surrender کر گئے ہیں' ہم اس کے سامنے جھک گئے ہیں' ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی ہے۔

عملی طور پر دل ودماغ کی ہم آہنگی کے بغیر ایمان لانا کچھ معنی نہیں رکھتا

یہاں اَسۡلَمۡنَا کہا ہے۔اب اگر اس اَسۡلَمۡنَا سے ہی ہم مسلمان کا لفظ لے لیں تو یوں کہا جائے گا کہ یہ نہ کہو کہ ہم مومن ہو گئے ہیں' یہ کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہ ایمان ایمان کیوں نہیں؟ اس ایمان کو کیوں نہیں تسلیم کیا جا رہا؟ کیوں کہا جا رہا ہے کہ ایسا مت کہو' تم ایمان نہیں لائے؟ وہ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ (49:14) ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔اب یہ فرق سامنے آ گیا کہ ایک ایمان ہے جو زبان سے اقرار کر لیا جاتا ہے' میں ذرا آگے چل کر بتاؤں گا' یونہی لفظوں کو دہرانا ہی نہیں بلکہ اگر سمجھ سوچ کر بھی یہ الفاظ دہرا لیے جائیں تو اگلی شرط ایمان کا دل کی گہرائیوں میں اترنا پوری نہیں ہوتی۔اسے قرآن کریم ایمان تسلیم نہیں کرتا۔

انسان کا ہر عمل اس کے ایمان کا زندہ ثبوت ہوتا ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ایمان کا دل میں اترنا کیا معنی رکھتا ہے' یہ کیسے اترتا ہے' کیسے معلوم ہو کہ یہ دل میں اترا ہے یا نہیں' دوسروں کو کیسے معلوم ہو' خود اس مدعی کو اس کا کیسے علم ہو کہ اس کا ایمان اس کے دل میں اترا ہے یا نہیں؟ اگلے ہی دو الفاظ میں بات واضح کی۔قرآن کریم تو اپنے ہر دعوے کو خود Explain کر دیتا ہے' اس کی وضاحت کر دیتا ہے اور وہ اس طرح سے کہ وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـئًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (49:14) اب اگر یہ اس کے بعد احکامِ خداوندی کی اطاعت کریں گے تو ان کے اعمال میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی' تو یہ ہوگا ثبوت اس چیز کا کہ ایمان دل میں اتر چکا ہے۔جب وہ ایمان جس کا اقرار کیا ہے' ان کے اعمال سے ظاہر ہو' ان کے اعمال اس بات کا ثبوت دیں کہ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے پھر وہ دل کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر وہ دل میں نہیں اترا اور اسے ایمان کہا ہی نہیں جا سکتا' تو اب بات یوں ہوگئی کہ ایمان کسی بات کے اس اقرار کا نام ہے جس کا ثبوت اس انسان کے اعمال اور کردار اور سیرت دیں۔اگر اس کی تصدیق اس کے اعمال سے نہیں ہوتی تو ''اسلمنا'' والی بات تک تو وہ ٹھیک ہوگا' وہ مسلمان قوم کا ایک فرد بن جائے گا۔وہ مومن نہیں ہوگا۔اسے صاحبِ ایمان تسلیم نہیں کیا جا سکے گا۔

قومیت کے لحاظ سے مسلمان ہونے اور ایک مومن ہونے میں بنیادی فرق ہے

یہاں ہمارے سامنے بڑی اہم بات آتی ہے بلکہ اگلی آیت بھی آ جائے تو اور وضاحت ہو جائے گی۔ کہا ہے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ (49:15) حقیقت یہ ہے جو بات سمجھنا چاہو کہ فی الحقیقت مومن کسے کہتے ہیں تو مومن وہ ہیں: اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49:15) یہ بات تو ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کر دی' تسلیم کر لیا' اسے حقیقت جان لیا' اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا' ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا (49:15) اور ایسے تسلیم کیا کہ ان کے دل میں کسی قسم کا شک اور شبہ باقی نہ رہا' یہ اقرار دل کے یقین کی حد تک پہنچ گیا' کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہا اور اتنی ہی بات نہیں ہے' ابھی ایمان کی بات آگے آتی ہے۔ کہا ہے کہ وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (49:15) اور پھر وہ بغیر کسی قسم کے اپنے ذاتی مفاد یا اغراض کو سامنے رکھ کر' مسلسل جدوجہد کرتے رہے۔ وہ صرف اس مقصد کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہے جو اس کے لیے خدا نے متعین کیا ہے۔ یہی ہیں جنہیں ہم اعمال کہتے ہیں۔ وہ یہ کرتے رہے۔ کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (49:15) یہ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں۔ یہاں بڑی اہم بات سامنے آئی۔ آبادی کے لحاظ سے آج ساری دنیا میں شاید ایک عرب کے قریب مسلمان نام رکھانے والی قوم ہے' ذرا سوچیے تو سہی کہ ان میں کتنے ہیں جو قرآن حکیم کے اس معیار کے مطابق ایمان والے کہلا سکتے ہیں۔ ''اسلمنا'' والی بات تو اور ہوگی۔ یہاں تو ''اسلمنا'' والی بات بھی نہیں ہے۔ ہم نے بھی کسی اسلامی مملکت کے سامنے اپنے آپ کو جھکایا نہیں ہے' Surrender نہیں کیا' اس کی Sovereignty' اس کی حاکمیت اعلیٰ' تسلیم نہیں کی۔ آج کوئی اسلامی مملکت ہی نہیں تو ہم تسلیم کیا کریں تو پھر ہم کیسے یہ بن گئے جو کچھ بھی ہیں۔ مسلمان قوم کے مسلمان کے گھر میں پیدا ہوئے تو ہم مسلمان ہو گئے۔

کسی غیر مسلم کا مسلمان ہونے اور مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے مسلمان میں فرق

عزیزانِ من! ہم نے اتنا بھی نہیں کیا جتنا کہ ان اعراب نے کیا تھا' جن کا ذکر یہاں آ رہا ہے کہ وہ تو پھر بھی بہرحال ایک اسلامی نظام یا مملکت کے سامنے جھک گئے تھے' سر تسلیم خم کر لیا تھا' ہم نے تو وہ بھی نہیں کیا۔ یہ جو غیر مسلم' اسلام لانے والا ہوتا ہے' جو کچھ وہ کرتا ہے یعنی کچھ کلمے ہی سہی' ان کو دہراتا تو ہے' سمجھدار ہے' اس کو سمجھایا جاتا ہے' تو بہرحال اس کو تسلیم کرتا ہے' ہم میں سے کتنے پیدائشی مسلمان ہیں جو زندگی کے کسی شعبے میں اتنا بھی کرتے ہیں جو ایک عیسائی غیر مسلم' ایمان لانے والا مسجد میں جا کر کرتا ہے' کیا ہم نے اتنا بھی کیا ہے؟ ہم نے تو اتنا بھی نہیں کیا' نہ تو اعراب کی طرح ہم نے اسلامی مملکت کے آگے سر جھکایا' نہ ہی ہم غیر مسلموں کی طرح' جیسے رسمی اسلام لانا سہی' ایمان لائے ہیں۔ اسے مومن بھی بننا پڑتا ہے' اسے کافر بھی بننا پڑتا ہے' اسی لیے قرآن کریم کے اندر Verb کے صیغے' فعل کے

صیغے آئے ہوئے ہیں۔ **ان الــذیــن امــنــوا ان الــذیــن** جو ایمان اختیار کرتے ہیں' جو کفر اختیار کرتے ہیں' یہ تو اختیار کرنے کی چیز ہے' یہ از خود ہی نہیں ہوتا۔

قرآنِ حکیم تو ہم مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی دعوت دیتا ہے

اب یہیں سے بات ہمارے سامنے آگئی کہ قرآنِ کریم مسلمانوں کو بھی کہتا ہے کہ ایمان لاؤ۔ اب غالباً آپ کو یہ کچھ نئی نئی سی باتیں نظر آئیں گی لیکن جس قسم کے اسلام اور ماحول اور معاشرے میں ہم رہتے ہیں اور صدیوں سے رہتے چلے آ رہے ہیں' اس میں قرآن حکیم کی باتیں تو نئی نئی نظر آئیں گی۔ (4:136) دیکھیے۔ اگر قرآن حکیم کے نسخے ہیں تو سامنے نکال لیجیے ورنہ غور سے سنیے۔ الفاظ ہی سے تو بات چلے گی۔ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136)۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) خطاب کیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) تو گویا یہ کسی ہندو کو' سکھ کو' عیسائی کو' مخاطب نہیں کیا گیا' مخاطب کیا گیا ہے انہیں جن کا دعویٰ یہ ہے۔ یوں کہہ لیجیے ہم مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یوں بات سمجھ میں آ جائے گی۔ مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136) اے ایمان والو! یوں کہو' اے مسلمانو! یوں کہو کہ ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے رسول اور اس کتاب پر جو تمہارے لیے ہے۔ یہ ہم سے کہا جا رہا ہے۔ یہ کچھ پڑھنے کے بعد کبھی ہم نے کھڑے ہو کر سوچا کہ کیا ہمیں کچھ کہہ رہا ہے کہ ایسا کرو تو کیا اس کے بعد ہم نے کچھ کیا۔ اس کی بھی تلاوت کر لی ہم نے' عزیزانِ من! وہ تو کانپ اُٹھنے والی بات ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا کہہ کر کہتا ہے کہ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (4:136)۔ ایک اور حوالہ لے لیجیے کیوں کہ یہ بڑے اہم مقامات ہیں' جتنی زیادہ قرآن حکیم کی سند اور تائید ملتی چلی جائے' دیتے چلے جانا چاہیے۔ کہا ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ (57:28)۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پھر مخاطب ہے۔ پھر ہم لوگ ہی ہیں یا وہی جن کو اس نے کہا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ بہر حال ہم جب کہا جائے گا تو ہم مسلمان تو اپنے آپ کو کہیں گے۔ کہا کیا ہے؟ کہ اتَّقُوا اللّٰهَ (57:28) ان قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو وَ اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ (57:28) ایمان لاؤ اس کے رسول پہ۔ پھر ہم سے کہا گیا کہ ایمان لاؤ' ہمیں الگ ہی نہیں کہا گیا' دوسروں کے ساتھ' غیر مسلموں کے ساتھ' ملا کر کہا گیا ہے۔

یہود و نصاریٰ اور ستارہ پرستوں کے علاوہ ایمان لانے والے مسلمانوں کو ایمان لانے کی دعوت

اگر یہ بات یوں کہی جائے کہ اے عیسائیو! اے یہودیو! اے مسلمانو! ایمان لاؤ تو پھر تو ذہن میں بات بیٹھے گی کہ ہمیں کس Category (زمرے) کے اندر (Bracket (شمار) کیا گیا ہے' کن کے زمرے میں شمار کیا جا رہا ہے اور یہ دعوت دی جا رہی ہے' جیسا

انہیں دعوت دی جارہی ہے' ویسی ہمیں دعوت دی جارہی ہے' کم ازکم ایک اور ریفرنس لے لیجیے اور وہ ہے (2:162)۔ یہ دو تین مقام پہ آیا ہوا ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیۡنَ (2:62) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تو پہلے وہی آیا ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ان کا ترجمہ کر کے کیا بتائیں: وہ لوگ جو ایمان لائے یعنی ہمیں کہا جارہا ہے کہ مسلمان' یہودی' نصرانی' ستارہ پرست صابئین ایمان لائیں۔ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (2:62) ان میں سے جو بھی ایمان لائے گا اور عملِ صالح کرے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ یہاں اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کہا ہے اور وَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا ' کہا' وَ الصّٰبِئِیۡنَ کہا' یہی تین ہی گروہ تھے۔ اس زمانے میں یہودی' نصرانی' اور یہ صابئین' جنہیں ستارہ پرست کہتے تھے' یہ غیر مسلم تھے۔ قریش کو تو قرآن کریم نے مشرکین میں شامل کیا۔ وہ تو الگ ایک گروہ تھا۔ یہی یہودی اور نصرانی اہلِ کتاب تھے جو اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کی کتاب پہ ایمان لائے ہوئے ہیں' انہیں مخاطب کیا اور ساتھ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بھی کہا ہے اور کہا کہ مَنۡ اٰمَنَ (2:62) جو بھی ان میں سے ایمان لائے گا' اس کی کیفیت یہ ہوگی۔ عزیزانِ من! ہمارے ایمان کو تو وہ ایمان تسلیم نہیں کرتا۔ ٹھیک ہے یہ مسلمان قوم ہے۔ ایک ایمان کس وقت تسلیم کرتا ہے؟ ابھی جو میں نے عرض کیا ہے جو اس نے کہا ہے' اگر یہ ان قوانین کی اطاعت کریں گے تو پھر بات سمجھی جائے گی کہ ان کے دل کی گہرائیوں میں ایمان اترا ہے۔

قرآن مجید موت کے وقت لائے جانے والے ایمان کو قبول ہی نہیں کرتا

میں نے ابھی کچھ اور فرق بھی کرنا ہے یعنی یہ جسے ہم زبانی اقرار کہتے ہیں' میں نے کہا کہ قرآن حمید تو اس کو ایمان تسلیم ہی نہیں کرتا' وہ تو جس اقرار کا مظاہرہ' ثبوت' صداقت اس اقرار کے مطابق عمل کرنا' نہ ہو وہ اسے ایمان تسلیم نہیں کرتا (2:159)۔ میں کہتا ہے کہ جب موت آ جائے گی تو اس وقت کسی شخص کا ایمان کام نہیں دے گا۔ جو اس سے پہلے ایمان نہ لایا ہو' موت کو دیکھ کر جب ایمان لائے کیونکہ موت آنے کے بعد تو عمل کرنے کے لیے پھر وقت نہیں رہتا تو اصل چیز تو وہ ایمان کی تھی کہ جس کے مظاہرے کے لیے اس نے عمل کر کے ثبوت دینا تھا تو جب عمل کے لیے موقع ہی نہیں رہے گا تو وہ جو اس میں ایمان کے چند الفاظ زبان سے دہرا بھی لیے تو وہ کہتا ہے یہ ایمان اس کو کچھ نفع نہیں دیتا: لَا یَنۡفَعُ نَفۡسًا اِیۡمَانُهَا لَمۡ تَکُنۡ اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ (6:158) اگلے الفاظ ہیں کہ اَوۡ کَسَبَتۡ فِیۡۤ اِیۡمَانِهَا خَیۡرًا (6:158) اور جس نے اپنے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ نہیں کیے ہوں گے اس کا ایمان اسے کچھ نفع نہیں دے گا۔ غور فرمایا آپ نے ایمان کا جو دل کے اندر اترنا ہے یہ کیوں کہا گیا؟ میں نے کہا تھا کہ ایک تو بات یہ ہے کہ ایمان لانا' ان صداقتوں کی تصدیق کرنا' انہیں تسلیم کرنا' یہ کہنا کہ یہ حق ہیں' برحق ہیں' میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ ایک تو یہ بات ہے۔ اس کی اگلی چیز جو ہے کہ وہ اس کے اعمال و کردار سے ان

کا ثبوت ملے، جن چیزوں کا اس نے اقرار کیا ہے، پھر یہ ایمان ہے۔

سنکھیے یا سیگریٹ کے متعلق یہ جان لینا کہ یہ مہلک ہے کافی نہیں ہوتا: TV کے اشتہارات کی مثال

میں نے کہا تھا کہ یہاں مجھے اور بھی فرق کرنا ہے اور فرق یہ کرنا ہے کہ ایک تو یہ ہے کہ آپ نے سنکھیے کے متعلق پوری تحقیق کی، تجزیہ کیا، کیمسٹری پڑھی، حکیموں سے پوچھا، ڈاکٹر سے پوچھا کہ وہ مہلک ہوتا ہے۔ آپ کو اس بات کا علم ہو گیا کہ سنکھیا مہلک ہے اور اس کے بعد آپ نے سنکھیا پھانک بھی لیا۔ یہ جو آپ کا سنکھیے کے مہلک ہونے کے متعلق علم ہونا ہے، آپ کو اس خالی علم ہونے نے تو کوئی کام نہ دیا۔ وہ تو اس کے مطابق کام کریں تو پھر وہ فائدہ دے گا۔ علم ہونا ضروری ہے، اگر آپ کو معلوم ہی نہ ہو کہ یہ جو پسی ہوئی سفید سفید سی چیز اس شیشی میں رکھی ہے، وہ ہے کیا، اس کی خصوصیات کیا ہے؟ وہ مہلک ہے یا معیّدِ حیات ہے۔ اگر آپ کو علم ہی نہ ہو تو آپ لاعلمی میں سنکھیا پھانک جائیں گے۔ وہ اور بات ہوگی کہ علم نہ ہو اور اگر آپ کو علم ہو اور اس علم کے باوجود آپ سنکھیا پھانکتے ہیں تو یہ علم ہونا، اس کا اقرار کرنا کہ سنکھیا مہلک ہے، ثابت کرنا، تقریریں کر کر کے اور لکھ لکھ کے اور دلائل دے کے اور مناظرے کر کے کہ سنکھیا مہلک ہے، اور اس کے بعد سنکھیا پھانک بھی لینا، تو یہ اقرار کرنا، یہ تسلیم کرنا آپ کو کچھ فائدہ نہ دے گا اگر آپ نے سنکھیا پھانک لیا۔ یہ ہے وہ چیز جسے دل کے اندر اترنے کی چیز کہا اور نظر آیا کہ خالی دماغ سے یہ جو چیزیں ہیں، ان کی تصدیق کر دینا، دلائل سے اس کے متعلق قائل ہو جانا، یہ چیز ضروری ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے۔

اگلی بات ہے کہ اس کے مطابق عمل بھی کیا جا رہا ہے۔ شاید آپ کے دل میں یہ خیال گزرے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان ایک چیز کو بدلائل و براہین جانتا بوجھتا دیکھتا بھالتا کہ وہ مہلک ہے نقصان رساں ہے وہ اس کو پھانک لے، کھا لے، اس کے مطابق کوئی نقصان رساں کام کر لے تو عام طور پہ یہی کہا جاتا ہے کہ کوئی پاگل ہی ہوگا کیونکہ پاگل کے متعلق کہتے ہیں کہ پاگل اپنا نفع نقصان بھی نہیں جانتا لیکن یہ آپ کے ہاں سارے ہی پاگل نہیں بس رہے ہیں، یہ سب پگلا پن نہیں ہو رہا، کون نہیں جانتا کہ جو ناجائز کمائی ہے وہ نقصان دہ اور ہلاکت انگیز ہے۔ بتایئے کون نہیں جانتا۔ یہ جاننا اسے کچھ فائدہ دے رہا ہے؟ نہیں، یہ بات نہیں سمجھ میں آئے گی، بات محسوسات سے سمجھ میں آتی ہے۔ ہمارے ہاں جائز اور ناجائز کی تو بات ہی اب سمجھ میں نہیں آتی۔ ٹی وی پہ سگریٹ نوشی کے متعلق اشتہار آتا ہے کہ سرطان ہو جاتا ہے، روز وہ سامنے آتا ہے کہ بڑی مہلک چیز ہے، پھر بھی لوگ دھڑا دھڑ سیگریٹ پیے چلے جا رہے ہیں، وہ ٹی وی بھی دیکھتے چلے جا رہے ہیں، اس کے ساتھ سامنے بیٹھے ہوئے کش پہ کش بھی لگاتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے: ابو جان! کیا لکھا ہے۔ کہا کہ لکھا یہ ہے کہ جو سگریٹ ہے اس سے تپ دق پیدا ہوتی ہے، سرطان بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور خود سیگریٹ پیے جا رہا ہے۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔

کسی بات کو جاننا اور پھر اس کا دل کی گہرائیوں میں اترنا دو علیحدہ علیحدہ کیفیات ہیں

ذرا سی بات آگے چل کر کہوں گا بلکہ نہیں، وہ پہلے ہی کہہ دینی چاہیے۔ یہ تو یہ صاحب ہیں کہ جو یہ پڑھ بھی رہے ہیں، جان بھی رہے ہیں، شاید اس کے بعد ضرورت پڑے تو ثابت بھی کر دیں کہ اس کے اندر یہ زہر ہوتا ہے، یہ زہر ہوتا ہے، بڑا لمبا چوڑا لیکچر بھی دیں اور کش پہ کش بھی لگ رہا ہو۔ کیا ہو رہا ہے؟ جان رہا ہے، اقرار کر رہا ہے، اگلی بات یہی ہے کہ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ کیا بات ہے کہ کیا نہیں اترا۔ وہی جو میں کہا کرتا ہوں، (اسد اللہ خاں) غالب بڑا بے باک تھا:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یہ کچھ جاننا ہی کافی نہیں ہو گیا۔ یہ دل میں اترنا بھی ضروری ہے۔

حیوان کے لیے کسی بات کا مضر جاننا اس کے لیے قدم قدم پر زندگی بھر عملی طور پر جاننا ہوتا ہے

آپ نے دیکھا کہ دماغ میں اترنے اور دل میں اترنے میں کتنا فرق ہے۔ ایمان دل میں اترا ہوا ہوتا ہے۔ فطرت کی طرف سے حیوانات کے دل میں اترا ہوا ہوتا ہے۔ (مثلاً) کوئی گائے پھر رہی ہو، کتنی بھوکی ہو، کسی ایسے پودے کے پاس جائے جو اس کے لیے مضر ہے، کہہ دوں کہ حرام ہے، وہ اس کو سونگھ کر پیچھے چلی آتی ہے، منہ نہیں مارتی، بھوکی ہے، بھوک برداشت کر لے گی لیکن اسے نہیں کھائے گی۔ اگر کوئی ایسا پانی ہے کہ جو اس کے لیے مضر ہے، پیاس لگ رہی ہے، پانی کی طرف، پانی کے کنارے دوڑتی ہوئی جا رہی ہے، آپ نے شاید دیکھا ہو، ہم تو گاؤں والے لوگ ہیں، ہمیں تو پتہ ہے جو ہڑ کے کنارے کھڑے ہو کے پانی کے قریب جا کے سونگھ کے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ حضرتِ انسان بھی ساتھ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اس نے جان لیا ہے کہ وہ مضر ہے، مہلک ہے، اور جاننے کے بعد وہ گائے یا بیل پیچھے ہٹ گیا۔ یہ کچھ اس کے دل میں اترا ہوا ہے۔

سگریٹ کے سرطان سے بچنے کے لیے اختیار کردہ تدبیریں: بس قانون کی شرط پوری کرنا ہے

قرآن کریم نے اس کے متعلق کہا تھا کہ اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ (7:179) پہلے تو یہ کہا کہ یہ تو بالکل حیوانات کی طرح ہے اور آگے کہا کہ بَلۡ ھُمۡ اَضَلُّ (7:179) اس سے بھی گیا گذرا۔ دیکھ رہا ہے کہ جو سگریٹ ہے، یہ مہلک ہے، سرطان پیدا ہوتا ہے، اور سرطان کا علاج ہی کوئی نہیں ہے۔ یہ کش پہ کش لگائے چلا جا رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں اب دیکھیے کہ قوم کو اس ہلاکت سے بچانے کی جو تدبیریں کی جاتی ہیں تو پہلے تو یہی تدبیر ہوتی ہے کہ وہ Advertisement ایک یا آدھ منٹ کا ہوتا ہے، جس میں وہ سرطان اور تپ دق ہوتی ہے اور اس کے

فوری بعد علی التواتر دو دو تین تین، چار چار پانچ پانچ قسم کے ولز کے اور نمبر 6 کے اور مجھے تو یاد نہیں کہ سگریٹ نہیں پتا کہ کس کس کے اتنے اعلیٰ پیمانے کے وہ Advertisement ہوتے ہیں، وہ سارے کے سارے اتنے جاذب ہوتے ہیں، وہ اتنے وقت کے دکھائے جاتے ہیں اور سرطان اور ٹی بی ذرا سا دکھایا جاتا ہے یعنی ایک مذہبی فریضہ ہوتا ہے جو ادا کیا جاتا ہے۔ کہا کہ نہیں صاحب! اتنی بات کافی نہیں ہے، ہمارا فریضہ ہے، Health محکمہ ہے، صحت کی Ministry (وزارت) ہے اور وہ تو UNO میں بھی انٹرنیشنل ہیلتھ کی ایک Organization ہے۔ لیکن اسے چھوڑ دیجیے، اپنے ہی ملک کو لے لیجیے کہ یہاں کی وہ ہیلتھ کی منسٹری ہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ کہا کہ اتنے سے کام نہیں چلتا کیا؟ کیسے کام چلے گا؟ کہا کہ سگریٹ کی ڈبیہ کے اوپر Poison (زہر) لکھ دینا چاہیے۔ کیا بات ہے! یہ ٹی وی نہیں کہتا تو شاید میرا خیال ہے، ہر سگریٹ کے اوپر لکھا ہوتا لیکن وہ بہر حال ڈبیہ کے اوپر قانوناً یہ ضروری قرار پا گیا کہ سگریٹ کی ڈبیہ کے اوپر یہ لکھا جائے۔ قانون کی شرط پوری ہو گئی، ہر پڑھنے والے نے پڑھ لیا کہ سگریٹ Poison (زہر) ہے اور Poison (زہر) کے بعد ڈبیہ کھولی اور کش لگانے شروع کر دیئے۔

ہمارے ہاں ملکی سطح پر اسلامائزیشن کا طریق اور قرآنی اسلامی مملکت کا فریضہ

ڈبیہ پہ Poison (زہر) بھی لکھا جا رہا ہے اور ادھر سگریٹ بنانے کے دھڑا دھڑ کارخانے بھی کھل رہے ہیں۔ ہیلتھ کے محکمے والوں کا فریضہ اتنا ہی ہے کہ وہ ڈبیہ کے اوپر لکھ دیں یا اتنا سا Advertisement کر دیں کہ یہ نقصان رساں ہے۔ انہوں نے اپنا وہ فریضہ ادا کر دیا۔ وہ ہو گیا تو شاید سال کے بعد رپورٹ بھی دیتے ہوں گے کہ اتنی ڈبیوں کے اوپر لکھا گیا تو وہ تو بڑی خوش آئند رپورٹ ہو گی کہ صاحب! اتنا بڑا کام کیا کہ ہر سگریٹ پینے والے نے ڈبیہ کو دیکھ لیا، اس پہ Poison (زہر) لکھا ہوا ہے اور سگریٹ بنانے والے کارخانے چلے جا رہے ہیں، مشینیں چل رہی ہیں، دھڑا دھڑ بن رہے ہیں، بس اتنا ہی ہوا کہ اس کے اوپر اتنا سا لکھا۔

غور فرمائیے! اگر آج کی اصطلاح میں کہوں کہ اس کی وہ ذرا اسلامائزیشن ہو گئی۔ وہ جو ڈبیہ کے اوپر اتنا لکھ دیا تو اب فریضہ پورا ہو گیا۔ اس قوم کی صحت کی طرف سے جو فریضہ عاید ہوتا تھا وہ پورا ہو گیا کہ اس کے اوپر اتنا لکھ دیا گیا۔ اب بات سمجھ میں آئی کہ وہ ہم سے کیوں کہہ رہا ہے کہ ایمان لاؤ اور ایمان کے متعلق کہا ہے کہ ایمان وہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتر جائے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جس چیز سے روکا گیا ہے اس سے رک جاؤ، جو کرنے کو کہا گیا ہے اسے کرو۔ ڈبیہ پہ زہر لکھنا فریضہ نہیں ہے، یہ اس سے رکنا ہے۔ وہ جسے صحیح اسلامی مملکت کہتا ہے، وہ جنہیں عطا ہوتی ہے تو پھر کہا ہے کہ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:114) وہ ہر منکر کو حکماً روکتے ہیں۔ ہر معروف کی حکماً تعمیل کراتے ہیں۔ ہر منکر سے روکنا اور معروف کی تعمیل کرانا ان کا

فریضہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! مذہب اور دین میں فرق ہی یہ ہے۔ مذہب میں یہ جو ہدایات ہیں' وہ وعظ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں' ڈبیوں پہ لکھا جاتا ہے' پڑھ لیا جاتا ہے' دین میں انہیں عملاً روکا جاتا ہے۔ یہ جو روکنے والی ایک قوت ہے' اتھارٹی ہے' وہ موجود ہو تو دین موجود ہے' اسلام موجود ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو مذہب ہے اور اس کے بعد جو کہا جائے گا' وہ وعظ ہے۔ یہ تمکن فی الارض کا نتیجہ نہیں ہے۔ شاید یاد دہانی کرا دوں تو بات واضح ہو جائے کہ کس چیز کے گم ہو جانے سے دین یا اسلام نہ رہا اور وہ آج بھی یہی ہے اس لیے آج بھی آپ کے ہاں نوے کروڑ یا ایک عرب کی آبادی میں کہیں بھی اسلامی نظام ہے' نہ مملکت ہے۔ کیا قرآن کریم نے یہ کہا تھا؟ ذرا چار آیتیں پیچھے چلے جائیے۔ اسی سورۃ الحجرات میں آیت 9 میں ہے۔ کہا ہے کہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا (49:9)۔ آپ کو یاد ہو گا پچھلے درس میں تو غالباً یہ آیا ہے کہ اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ آپس میں الجھ پڑیں' جنگ پہ بھی اتر آئیں' یعنی ایک تو اس نے کہا ہے کہ کسی ایک مومن کا جو عمداً قتل بھی ہے' انسان کو جہنم میں لے جاتا ہے' وہ تو قرآن حکیم نے بتایا ہے اس کو روکنے کے لیے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی دو گروہ اگر الجھ پڑیں' آپس میں جنگ پہ آمادہ ہو جائیں تو پھر فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا (49:9)۔ اب یہ دیکھو یہ قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ تم پھر ان کے درمیان صلح کراؤ اور آگے یہ ہے کہ اگر اس کے بعد ان میں سے کوئی جماعت پھر سرکشی پہ اتر آئے' جن Terms کے اوپر تم نے صلح کرائی ہے' اس کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف تم جنگ کرو تا آنکہ وہ خدا کے حکم کے اوپر جھک نہ جائیں۔

اسلامی مملکت کے انتظامی امور کی خاطر لفظ ''فَاَصْلِحُوْا'' کی ترغیب کی افادیت

یہ کون ہیں جن سے کہا گیا ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا (49:9)۔ عزیزانِ من! یہ مقام غور طلب ہیں۔ یہ کس سے کہا گیا ہے؟ وہ دو جماعتیں تو ہو گئیں۔ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا (49:9) مومنوں کی' مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں الجھ پڑیں' لڑ پڑیں' یہ جو فَاَصْلِحُوْا (49:9) ہے' یہاں دیکھیے متعین طور پہ کسی کو نہیں کہا گیا' وہ اس لیے نہیں کہا گیا کہ یہ تو ساری امت کا فریضہ تھا' امت کو اس پوزیشن میں ہونا چاہیے تھا کہ Authoritatively مرکز ان کا' مملکت ان کی' حکومت ان کی' اس پوزیشن میں ہونی چاہیے کہ اگر کہیں ایسی بات ہو گئی ہے تو فوراً ان کو روک دے' ان میں صلح کرائے اور پھر اتنی اتھارٹی اور اتنی قوت ہونی چاہیے کہ اگر ان میں سے کوئی اس کے بعد اس سے کوئی کسی قسم کی سرتابی کرتا ہے' تو اس کے پاس یہ قوت ہونی چاہیے کہ اس کی گردن مروڑ کر رکھ دے۔ یہ کیا چیز تھی جس کو یہ حکم دیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم کے زمانے میں یہ جو مملکت اور حکومت اور فوج کی اصطلاحات تھیں کہ یہ قرآن حکیم نے استعمال نہیں کیں اور یہ نہیں ہے کہ یہ تھیں نہیں' میں یہ کہوں گا کہ اگر وہ چاہتا تو اپنی اور اصطلاحات اور وضع کرتا' ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ

اس نے پوری امت کی مملکت یا سلطنت قرار دیا ہے۔ اس لیے جب اس نے فَاَصْلِحُوْا کہا ہے تو پوری امت سے یہ کہا ہے۔ یہ استثنائی بات ہے کہ آپس میں دو گروہ لڑ پڑے ہیں۔

قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کے ختم ہو جانے کا نتیجہ

پوری امت کا ایک نظام ہے جسے آپ اسلامی مملکت کہیں گے' جسے ایک مرکز کہیں گے' یہ جو اس کا فیصلہ کرے گا کہ یہ لڑ پڑے ہیں ان میں جا کر صلح کراؤ' ان Terms پر صلح کراؤ اور پھر وہ دیکھے گا کہ یہ اس کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں اور جو پابندی نہیں کرے گا اس کے پاس اتنی قوت ہوگی کہ اُس کی گردن مروڑ دے۔ جب تک آپ کے اندر یہ اتھارٹی رہی دین رہا' اسلام رہا اور جب یہ اتھارٹی ختم ہوگئی' نہ دین رہا نہ اسلام رہا۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا کہ دو سال سے' یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا' دو گروہوں میں لڑائی نہیں ہو رہی ہے' دو مملکتوں میں لڑائی ہو رہی ہے' مسلمانوں کی کمیٹیاں بن رہی ہیں' وفد بن رہے ہیں' کمیشن بن رہے ہیں' بار بار جا رہے ہیں' سمجھا رہے ہیں۔ یہ کیا کر رہے ہیں؟ یہ ہم وعظ کہہ رہے ہیں۔ فَاَصْلِحُوْا ان کا فریضہ تھا' یہ باقی امت کا فریضہ تھا' یہ اس مرکز کا' اس مملکت کا فریضہ تھا کہ وہ یہ کرائیں اور فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ (49:9) یہ فریضہ تھا کہ پھر اگر ان میں سے کوئی سرتابی کرتا ہے تو اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرو۔

اسلامی نظام کے فیصلے کی خلاف ورزی امر اللہ کی خلاف ورزی ہوگی

کہا ہے کہ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (49:9) یہاں ایک اور بڑا گہرا پوائنٹ (نکتہ) آ گیا ہے۔ میں کیا کیا عرض کروں یہ امت کا' اس اسلامی مملکت کا' اس اسلامی نظام کا' فیصلہ ہے' جو اس فیصلے کی خلاف ورزی کرنے والے ہیں' ان کے خلاف کہا کہ جنگ کرو تا آنکہ وہ امر اللہ پر آ جائیں یعنی اس کا جو فیصلہ اسلامی مملکت کا ہے اسے خدا نے امر اللہ کہا ہے اس لیے کہ وہ اس خدا کے ہی قوانین کو نافذ کرنے کا تو ذریعہ تھا' وہ جو صلح کرائے گی تو وہ خدا کی کتاب کے مطابق کرائے گی' اس لیے اس کی صلح کرانے کو امر اللہ کہا' خدا کا امر کہا گیا۔ میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم تو درمیان میں وہ نکات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں سے پتہ چل گیا کہ اسلامی مملکت کیا ہوتی ہے اور کیوں اس کے احکام کی اطاعت اس طرح سے کرنی پڑتی ہے کیونکہ وہ جو حکم دیتا ہے خدا کی کتاب کے مطابق دیتا ہے' وہ امر اللہ ہو جاتا ہے۔ یہ اتھارٹی جب تک آپ کے اندر موجود تھی اس وقت تک نقشہ آپ کے ہاں صحیح اسلامی نظام کا' اسلامی مملکت کا' امتِ مسلمہ امت کا تھا۔

مرکز کے نہ ہونے کی وجہ سے آج دنیا بھر میں دین کی بجائے مذہب کا احیا ہو رہا ہے

قرآن کریم نے کہا ہے کہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)۔ تھا ان کا فریضہ۔ جس دن سے یہ اتھارٹی نہیں رہی' اسی دن سے

مذہب انفرادی ہوگیا۔ انفرادی یہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایک Individual (فرد) کا بھی الگ الگ ہوگیا' مختلف ملکوں میں بسنے والے مسلمان مختلف قوم بن گئے' ان کی الگ الگ سلطنتیں ہوگئیں' الگ الگ مملکتیں ہوگئیں' یہ بھی تو انفرادیت ہوگئی۔ اسلام تو ایک مرکز کا نام ہے' ساری دنیا کے مسلمان امتِ واحدہ ہیں' ان کا ایک مرکز ہے' مرکز کا ایک سربراہ ہے' ایک نظام ہے' ایک قانون ہے اور یہ تھا وہ مرکز جس کا فریضہ تھا کہ اگر کہیں مسلمانوں کے دو گروہ الجھ پڑیں تو یہ فریضہ ادا کریں۔ وہ فریضہ اب کیسے ادا ہو؟ وہ مرکز تو موجود ہی نہیں: ٹانگ کا ذکر کیا' یہاں تو سر ہی غائب ہے گریباں سے اور یہ احیائے اسلام کی کوششیں ہورہی ہیں' ساری دنیا کے مسلمانوں میں مذہب کا احیا تو ٹھیک ہے' یہ کرتے چلے جائیں گے' اس طرح دین کا احیا تو نہیں ہوسکتا' وہ تو اسی صورت میں ہوگا کہ ایک مرکز ہو اور وہ مرکز اس اصول کے اوپر بنے کہ وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5:44) خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کی جائے گی تو ان کو کافر کہا جائے گا۔

خلفشار کے محرکات: دماغ اور دل میں عمل کا محرک کون ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں تو یہاں صدیوں سے انتشار ہے' خلفشار ہے' تفرقہ ہے' اختلافات ہیں' امت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی ہے۔ وقت لگے گا لیکن متمع نگاہ مقصود بالذات منزلِ آخر وہی ہوگی کہ پوری امت ہوگی' اس کی ایک مملکت ہوگی' ایک ضابطہ قانون ہوگا' وہ خدا کی کتاب ہوگی' ایک اتھارٹی ہوگی جو ان میں آپس میں صلح بھی کرائے گی' ان کے معاملات کو بھی طے کرے گی پھر اسلام کا احیا ہوگا' ہر فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہوگا۔ جی! کہا ہے کہ لَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (49:14)۔ غور فرمالیا کہ پہلے تو زبان سے اقرار کرنا ہے' ہم نے تو وہ بھی کبھی نہیں کیا' میں کہا کرتا ہوں کہ کبھی کوئی ہمارے پرانے زمانے میں تو کم از کم شادی نکاح کے وقت تو وہ چار کلمے پڑھالیا کرتے تھے تو وہ اس قدر مہذب ہوئے کہ وہ بھی گیا۔ اب آیا وہ فارم' اُس پہ دستخط کر دیئے' معاملہ ختم یعنی اس مصیبت سے بھی بچ جاتا ہے کہ دولہا بیچارے کو عربی الفاظ کے تلفظ ہی نہیں آتے تھے۔ اس لیے وہ بھی چپکے چپکے کچھ کہتے تھے' وہ مولوی صاحب بھی چپکے چپکے سن لیتے تھے کہ اب کیا کریں۔ بھری مجلس میں اس کے متعلق سوچے کیا! کہ ہم نے کبھی زبان سے اقرار بھی یہ کیا ہے اس ایمان کا یعنی کم از کم جو پہلی شرط ہوئی جسے قرآن کریم نے ان آیات کی شکل میں کہا کہ یہ ایمان نہیں ہے کیونکہ یہ دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ میں نے کہا کہ اگر ہم نے کہیں کیا بھی ہے تو ہم میں سے جو ذرا دانشور Intellectual' جو اس قسم کے لوگ ہیں' وہ کہتے ہیں کہ ہم نے علم و بصیرت کی بناپر دیکھا ہے' قرآن کریم کے دعاوی کو اور اسلام کے احکام کو' ہم اس سے بڑے مطمئن ہوئے' یہ دماغ ہوگیا' یہاں مطمئن قلوب کہا ہے۔ یاد رکھیے! قرآن حمید کے مطابق خالی دماغ اعمال کے لیے متحرک نہیں کرتا' یہ انسان کا قلب ہے' جسے آپ جذبات

کہتے ہیں' وہ محرک بنتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ہے وہ دل کے اندر جب بیٹھ جائے۔ گائے کے دل میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے کہ یہ پودا میرے لیے مضر ہے' ماردو اس کی جان نکال دو' وہ اس کو کبھی نہیں کھائے گی' یہ ایمان ہے۔ دماغی طور پر وعظ کہنے والے' لیکچر دینے والے' جانتے ہیں کہ رشوت اتنی بری چیز ہے' ناجائز کمائی کے یہ نقصانات ہیں' قوم تباہ ہوگئی' سب کچھ تباہ ہوگیا اور پھر بھی یہ سب کچھ سیلاب کی طرح ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے؟ دماغ کہہ رہا ہے' دل نہیں کہہ رہا۔ گائے کا بکری کا تو دل بھی کہتا ہے۔ یہ جو اشرف المخلوقات اپنے آپ کو کہہ رہا ہے' دماغ تو اس کا کہتا ہے' دل نہیں کہتا۔ یہی وجہ ہے کہ سگریٹ کی ڈبیہ پہ پڑھ تو لیتا ہے کہ یہ Poison (زہر) ہے' سمجھتا بھی ہے' وہ تجزیہ بھی کرتے نیکوٹین اتنا ہوتا ہے اور اتنا یہ ہوتا ہے اور اس کے باوجود کش پہ کش لگاتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ دل میں نہیں اترا' ایمان یہ ہے جو قرآن کریم نے کہا ہے۔

رسول جس پر وحی نازل ہوتی ہے سب سے پہلے اسی کو اس وحی پر ایمان لانا پڑتا ہے

ایک اور اہم بات عزیزانِ من! درس کا وقت جلدی سے ختم ہو جاتا ہے۔ یہ تو قرآن کریم نے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا کہا ہے کہ ایمان لاؤ۔ بعض مقامات ایسے ہیں' جہاں بڑی گہرائی میں کھڑے ہونا پڑتا ہے' سوچنا پڑتا ہے کہ یہ کیا چیز آ گئی۔ نبی اکرم ﷺ پر وحی نازل ہوئی' حضور ﷺ نے یہ وحی باقی انسانوں کو دی' سب سے پہلے آپ ﷺ پہ وہ وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ نے آگے امت کو دی۔ رسول ﷺ کے متعلق کبھی ہمارے' آپ کے ذہن میں' یہ بات بھی آ سکے گی جو خدا کہہ رہا ہے؟ کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے کہ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (2:285) رسول بھی ایمان لاتا ہے اپنی وحی کے اوپر۔ اللہ اکبر! آدمی اس مقام پر کانپ اُٹھتا ہے؟ یہی کہا نہیں گیا' ویسے تو خدا کی یہ شہادت بہت بڑی شہادت تھی۔ اس پہ کسی قسم کا شبہ نہیں کہ رسول بھی اپنی وحی پر ایمان لاتا ہے اور دوسرے مقام پہ یہ کہا کہ قُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (42:15) اے رسول! اعلان کر کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب پر۔ اب رسول سے اعلان کروا رہے ہیں۔ پہلے وہاں حکم دیا جا رہا ہے' تو ایک چیز بیانیہ ہے کہ رسول بھی ایمان لایا ہے اس کتاب کے اوپر اور یہاں کہا جا رہا ہے کہ یہ بات کچھ مخفی رکھنے کی نہیں ہے۔ اے رسول! اعلان کر کہ میں ایمان لایا ہوں اس کتاب کے اوپر: بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ (42:15)۔ رسول ایمان لا رہا ہے۔ ذرا توجہ سے سننے کا موڈ ہو تو میں عرض کروں کیونکہ یہ بات تو بڑی اہم ہے۔ رسول ساری دنیا کو جو وحی دے رہا ہے اس کے متعلق پہلے کہا کہ وہ ایمان لاتا ہے اور کہا کہ اعلان کرو کہ میں اس کے اوپر ایمان لایا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا

رسول ایمان لاتا ہے؟

نبوت اور رسالت: میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے قرآن کریم میں فرمان رسول

عزیزانِ من! رسول پہ وحی نازل ہوئی' اس وحی کو رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیدیا۔ یہ تو رسول اللہ کی نبوت کی حیثیت ہوگئی۔ جب وحی ملی تو رسالت کی حیثیت سے' دوسروں کو دیدی اور بار بار رسول اللہ ﷺ قرآن کریم میں کہہ رہے ہیں' خدا ان سے کہلوا رہا ہے کہ اَنَــا بَشَـرٌ مِّثۡـلُـكُمۡ يُوۡحٰۤى اِلَـىَّ (18:110) وحی کا معاملہ جب الگ ہوجائے تو میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں۔ یہاں سے ہمیں وحی میں اور انسان کے اپنے فیصلوں کے اندر ایک بیّن فرق بتایا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے۔ یہ کہنے کی میں کیسے جرأت کرسکتا ہوں کہ واقعی یہ چیز ہوگی۔

قرآن حکیم نے بتایا کہ جسے بھی آپ بشر کہتے ہیں' وہ اپنی طرف سے کوئی فیصلہ بھی اگر کرے گا' تو ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر اپنی خواہشات کا' اپنی تمناؤں کا' اپنے خیالات کا' کچھ شائبہ آجائے۔ بڑے سے بڑا مفکر' بڑے سے بڑا مصلح' بڑے سے بڑا دانشور' بڑے سے بڑا Intellectual' کسے باشد' اگر وہ بشر ہے تو یہ امکان ہے کہ جو چیز اس کے دل میں سے ہوکر گزرے' دل کی رنگینی کا کوئی شائبہ اس کے اندر امکان ہے کہ اس میں آجائے' صرف ایک وحی خداوندی ہے کہ جس میں انسانی جذبات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔

وحی ہمیشہ ہر قسم کے انسانی جذبات سے ماوراہوتی ہے اور نبی کو بھی حکم ہے کہ اس نے اس کے مطابق کرنا ہے

انگریزی میں نزول کو Objectively کہتے ہیں۔ جسے Objectivity کہتے ہیں' وہ خارج کی چیز ہے جس میں انسان کے اپنے داخلی جذبات وخیالات اور خواہشات کا کوئی کسی قسم کا عمل دخل' رنگ آمیزی نہیں ہوتی' نہیں ہوسکتی تھی۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ انسانوں کے لیے اتباع اور اطاعت کے قابل وہی چیز ہے جس میں کسی انسان کے اپنے خیالات کا دخل نہ ہو۔ رسول ﷺ کے متعلق جب کہا کہ مَــا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى (53:3) اپنے خیالات کا اس میں ذرا سا شائبہ بھی نہیں ہوتا اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى (53:4) یہ وحی ہے جو یہ دے رہا ہے اور وحی کی Definition کر دی' جس میں اس کے اپنے رسول کے خیالات کا بھی کوئی شائبہ نہیں ہے۔ وحی تو ہے جس میں Objectivity ہوتی ہے۔ وحی کے سوا کوئی بھی انسانی Hinderance (رکاوٹ) کیوں نہ ہو' اس میں اس کا شائبہ ہوسکتا ہے' اسے Subjectivity کہتے ہیں۔ یہ انسان سے ہوسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ دانستہ ہی ایسا کیا جائے۔ اب تو علم النفس کتنا آگے جا رہا ہے' غیر شعوری طور پر جو چیزیں ہوتی ہیں' انسان کے شعور کو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی' اس لیے رسول سے بھی کہا کہ وحی جو تم پہ آگئی ہے اس کے بعد

سوال یہ ہے کہ تم فیصلے کس کے مطابق کرو گے‘ تم عمل کس کے مطابق کرو گے؟ وحی آ گئی تو تم نے اسے انسانوں تک پہنچا دیا۔ بس کام ہو گیا۔ کہا کہ ایسا بالکل نہیں‘ تم نے بھی اسی وحی کے مطابق کرنا ہے وَ الْمُؤْمِنُوْنَ (2:285) جس کے مطابق مومنین نے کرنا ہے۔ اللہ اکبر!

وحی کا مقصود یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے تو وہ انسان کو حیوانی سطح سے اونچا لے جاتی ہے

وحی کی Objectivity کی اہمیت کو قرآن حمید نے اس انداز سے بیان کیا کہ صاحبِ وحی سے بھی کہا کہ تمہیں بھی اپنی وحی پہ ایمان لانا ہوگا۔ یہ ایمان کیا؟ یہ جو میں نے ابھی کہا ہے‘ قرآن حمید کی رو سے ایمان کے معنی ہیں کہ جس بات کو حق سمجھے اس کے مطابق پھر عمل کرے۔ رسول سے بھی یہ کہا گیا کہ اب آگے تم نے جو فیصلہ کرنا ہے یا تم نے خود عمل کرنا ہے تو وہ اس وحی کے مطابق کیا جائے گا اور پھر جو قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کا فریضہ بتایا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (2:129) اور آگے ہے وَ يُزَكِّيْهِمْ (2:129) یہ ہے اصل چیز۔ تعلیم کتاب و حکمت تو وہ ہے اور میں نے کہا کہ علم و بصیرت کی رو سے یہ سمجھا جائے کہ یہ واقعی نقصان دہ ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو دماغی طور پہ ٹھیک سمجھا ہوا ہو‘ اس کے مطابق عمل بھی کرے‘ عمل تو آگے ہوتا ہے جسے کہا کہ وہ دل کے اندر اترنے والی بات ہے۔ وہ یہ تھی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (2:129)۔ اس کا اب وقت نہیں ہے ورنہ میں عرض کرتا کہ حکمت میں‘ Intellect میں اور Reason میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تو ہمارے زبان میں لفظ نہیں ہیں‘ یہ میں کہہ رہا ہوں جس کی ساری عمر انہی الفاظ سے کھیلتے ہوئے گزری ہے۔ الفاظ ہیں نہیں‘ ان میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ہے تعلیم کتاب و حکمت‘ یہ تعلیم تک کی بات ہے اور اگلی بات ہے کہ صرف تعلیم سے‘ کسی چیز کے جاننے سے کہ یہ چیز بری ہے‘ نقصان دہ ہے‘ ضروری نہیں کہ انسان اس کے مطابق پھر عمل بھی کرے۔ اگلی بات یہ ہے کہ وہ دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہو اور اس کے لیے کہا کہ وَ يُزَكِّيْهِمْ (2:129) یہ تمہاری انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کرتا ہے۔ صاحب! حیوان کی سطح سے یہ اونچا لے جاتا ہے۔

انسانی جذبات و خواہشات کو کنٹرول کرنے کے لیے وحی کا کردار اور حیوانوں میں جبلت

حیوان کی سطح جس میں اس کے جو تقاضے اور خواہشات ہیں اس کے اپنے Instinct یا اندر کی جو جبلت ہوتی ہے‘ اس کا کنٹرول ہوتا ہے۔ اس پہ یہ گائے اس لیے وہ پودا نہیں کھا رہی کہ اس کے اندر ایک کنٹرولر بیٹھا ہوا ہے۔ انسان کے بھی اس طرح خواہشات و جذبات ہوتے ہیں۔ اس نے وحی کی رو سے دی ہوئی ہدایات اور اقدار کے مطابق خود کنٹرول کرنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کا درجہ ہے اور اگر نہ تو یہ جبلت اس کو اندر روکے اور نہ یہ اقدارِ خداوندی کی رو سے خود‘ رُکے‘ تو یہ تو اس طرح کا فرین میں چلا گیا۔ یہ حیوانات سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (7:179) پتہ ہی نہیں اس کا نام کیا رکھیں۔ تو یہ اہم چیزیں ہمارے سامنے آ گئیں۔

عزیزانِ من! ایک تو یہ ہے کہ محض اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر مطمئن ہو جانا کہ ہم بھی مسلمان ہو گئے۔ قرآن حکیم اسے تسلیم ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ ان سے کہو کہ یہ کہیں بھی نہیں کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں، کہو کہ کسی نہ کسی اعتراف کے ذریعے سے ہم جھک گئے۔ ٹھیک ہے ایمان اس وقت ہوگا جب وہ دل میں اترے گا اور اس کی نشانی، اس کا ثبوت، یہ ہوگا کہ یہ ان قوانین کی اطاعت کریں گے، تو قوانین کی جو اطاعت ہے وہ ہے ایمان کی صداقت کا ثبوت۔ کہا کہ **اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ** (49:15) یہ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان کے اندر صادق ہیں۔

ابھی اس سورۃ کی تین آیتیں باقی ہیں لیکن درس کا وقت ختم ہو گیا۔ اتنی جلدی بھی کیوں کی جائے، اسے ہم آئندہ لے لیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

ہم سورۃ الحجرات کی دو ہی آیات لے سکے ہیں، سولھویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔ شکریہ!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چوتھا باب: **سورۃ الحجرٰت** (آیات 16 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج مئی 1982ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحجرٰت کی آیت 16 سے ہو رہا ہے۔ آج اس کی آخری تین آیات ہمارے زیرِ درس ہوں گی۔

ایمان کے سچا ہونے کا ثبوت انسان کے ذاتی عمل سے وابستہ ہوتا ہے

سابق درس کی آیات میں تو یہ چیز آئی تھی کہ یہ اعراب دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان سے کہیے کہ یہ نہ کہیں' ان سے یہی کہیے کہ ہم نے اسلامی نظام یا حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابھی ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا اور اس کی نشانی' علامت یا ثبوت یہ ہوتا ہے کہ یہ کس حد تک قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں' تو اگر یہ اس کی اطاعت کرتے رہے تو پھر اس کی یہ دلیل مان لی جائے گی کہ ایمان ان کے دل میں اتر گیا تھا تو میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان کو کہا ہی اس وقت جائے گا جب کہ اس کا مظاہرہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہوگا' محض چند الفاظ دہرا دینے کو ایمان نہیں کہا جا سکتا۔ اب اگلی آیت یہ ہے کہ **قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ** (49:16) وہ تو کائنات کے ذرے ذرے کا علم رکھتا ہے اس لیے یہ سوال ہی نہیں ہے کہ تم چند الفاظ دہرا کر خدا کو یہ اطلاع دیدو کہ یہ دیکھ لیجیے صاحب! ہم صاحبِ ایمان ہو گئے' ہم ایمان لے آئے۔ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو یہ کیا ہے۔

قرآنِ حکیم کا خطاب ہر دَور کے تمام انسانوں کے لیے باعثِ منفعت ہے

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم آیتیں ہیں۔ قرآن حکیم تو قیامت تک کے لیے ہے۔ یہ بات اس زمانے کے اعراب کی نہیں کر رہا۔ اُس

زمانے میں وہ مخاطب تھے اُن کے بعد آج یہ ہم سے مخاطب ہے۔ قرآن حکیم یہ بات کہہ رہا ہے کہ کس طرح سے تم دعوائے ایمان کر سکتے ہو اور پھر یہ کہ چند الفاظ دہرا کر اور دہرا کر ہی نہیں' ہم کوٹھے پہ چڑھ کر جناب! جسے ہم دہائی دے دے کر' کہتے ہیں اور اب تو لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے اس تک خبریں پہنچاتے ہیں تو کہا کہ یہ چیزیں ان الفاظ کے دہرا دینے سے تم ہمیں اس طرح مطلع کر رہے ہو کہ ہم ایماندار ہو گئے' ہم دیانتدار ہو گئے' ہم صاحبِ ایمان ہو گئے' ہم ایمان لے آئے' ہمیں علم ہے کہ یہ کیا ہے تو وہ ہم سے جانتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ ان اعراب کے متعلق اگلی بات کہی کہ یَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (49:17) وہ کہا تھا کہ ایمان تو خیر یہ لائے نہیں' ایمان اس کو ابھی کہا نہیں جائے گا' وہ تو اس وقت کہا جائے گا جب ان کے اعمال و کردار و سیرت اس کا ثبوت دیں جو یہ ایمان لائے ہیں کہ خدا کے قوانین کی اطاعت بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ یہ کہا کہ ان سے کہیے کہ ہم نے صرف سرِ تسلیم خم کیا ہے یا اسلام لائے ہیں' جسے ہم اپنے الفاظ میں کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اتنے سے ہی تم پر کچھ احسان دھر رہے ہیں کہ انہوں نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ جناب! آپ کی جماعت میں شامل ہو گئے' اسلام لے آئے' ایمان لے آئے' بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کہا کہ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ (49:17) تم تو ان سے یہ کہہ دو کہ جو کچھ تم یہ اسلام لائے بھی ہو تو اپنے اسلام کا احسان میرے سر پہ نہ دھرو کہ تم نے دنیا میں مجھ پہ کوئی احسان کیا ہے تو یہ چیز ہے۔ یہ ہمارے ہاں پارٹیاں بنتی ہیں' پارٹیوں میں ممبروں کی تعداد بہت بڑا اثر رکھتی ہے۔ انہوں نے ووٹ لینے ہوتے ہیں۔ انہوں نے پھر الیکشن لڑنے ہوتے ہیں۔ ان الیکشنوں میں وہ ووٹ ڈالتے ہیں تو کبھی کبھی تو ایک ووٹ بھی اتنا وزنی ہوتا ہے کہ وہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کئی کئی دن ایک ایک ووٹ کو' ایک ایک فرد کو' اپنے ساتھ شامل کرنے کے لیے اور وہ ساتھ شامل ہو جائیں تو اس کا جو ووٹ ہے کئی دفعہ Decisive ہوتا ہے' فیصلہ کن ہوتا ہے تو وہاں تو یہ صورت ہے کہ کوئی اس پارٹی کے اندر اگر آ گیا ہے تو وہ پارٹی والوں پہ احسان دھرے گا کہ میں آیا ہوں تو تمہاری جیت ہوئی ہے۔ کہا کہ ان سے کہو کہ وہ تم پر یہ احسان نہ دھریں کہ تم اسلام کی پارٹی میں داخل ہو گئے ہو۔ یہ کوئی بھی پارٹی نہیں ہے اس میں اس کا تو اپنا فائدہ ہی کوئی نہیں ہے' نہ ہی اس کثرت سے کچھ اس پارٹی کا فائدہ ہے۔ یہ تو خود تمہارا فائدہ ہے۔

انسان کا خدا پر ایمان لانا خدا پر کوئی احسان نہیں ہوتا

اس میں اور اگلی بات ہے جو میں سمجھتا ہوں کہ یہ آج کے درس کا مرکز ہوگا۔ کہا کہ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (49:17) اگر تم اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو تو یہ سمجھو کہ یہ تو بلکہ ہمارے لیے' عزیزانِ من! یہ مَن اور یہ منون کا ترجمہ کرنے کے لیے ایک ہی لفظ ''احسان ہے'' اور احسان کا ہمارے ہاں کچھ تاثر اچھا نہیں ہوتا۔ یہ دوسرے کے سر پر احسان دھرنا' احسان

جتانا ہوتا ہے' یہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اب اس کے لیے دوسرا لفظ ہے نہیں تو بہر حال میں یہ عرض کروں گا کہ یہ بات ہے کیا جو خدا کہتا ہے کہ یہ تو بلکہ خدا کا میں لفظ احسان ہی کہونگا کہ دوسرا لفظ ہے نہیں' لیکن میں عرض کروں گا کہ وہ اس کا مفہوم اس عام مفہوم سے الگ ہے۔ جو ہمارے ہاں احسان سے لیا جاتا ہے بلکہ یہ تو تمہارے اوپر خدا کا یہ احسان ہے۔ یوں کہیے کہ اس نے تمہیں ایمان کی طرف یہ راہنمائی کر دی۔ اگلی آیت وہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ(49:18)۔ وہی جو پہلے کہا گیا ہے کہ وہ تو کائنات کے ہر راز کو' ہر ذرے کو' جانتا ہے اس لیے اسے جتانے کی' بتانے کی' اطلاع بھیجنے کی' ضرورت نہیں ہے اور یہ جو تم اسلام کے حلقے میں داخل ہو کر پہلے اس رسول ﷺ پر احسان جتاتے ہو' پھر خدا پہ بھی احسان جتاتے ہو کہ صاحب! ہم اس پارٹی میں داخل ہو گئے' بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا' ان پر بہت بڑا احسان کیا تو کہا کہ احسان یہ نہیں ہے۔

لفظ من کا لغوی اور قرآنی مفہوم

من کے معنی ہوتے ہیں ''کسی ایسی چیز کا عطیہ کے طور پہ عطا کرنا جس میں کسی محنت مشقت کا بھی تقاضا نہ ہو' بلا محنت مشقت کسی چیز کو بطور عطیہ کے دیدینا' احسان جتا دینا نہیں' بلکہ عطیۃً دینا اور وہ بھی ایسا کہ جس میں کوئی محنت مشقت نہ ہو'' قرآن کریم نے وحی کے لیے' رسالت کے لیے' نبوت کے لیے' یہ لفظ استعمال کیا ہے' کسی خاص قوم یا قبیلے یا اس زمانے کے ان اعراب کے متعلق ہی نہیں ہے کہ تم پہ احسان کیا یا تمہیں یہ عطیہ دیا۔ اب یوں لفظ آجائے گا یہ کہ تمہیں یہ عطیہ دیا ہے' یہ پوری نوعِ انسان کے لیے ہے' قیامت تک کے انسانوں کے لیے ہے جو کچھ دیا ہے۔

انسانی زندگی کو وحی جیسے عظیم عطیہ کا بغیر کسی مزدومعاوضہ کے ملنا قدرت کا احسانِ عظیم ہے

سورۃ آل عمران میں ہے کہ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ(3:164) یہ ہے وہ من' یہ ہے وہ عطیہ' جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ رسالت یا نبوت کی شکل میں یعنی وحی کی شکل میں ہے۔ جو خدا نے وحی عطا کی ہے اور وہ وحی نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے عطا ہوئی تھی تو یہ ایک بہت بڑا عطیہ خداوندی ہے جو انسانوں کو دیا گیا ہے کہ وہ انہیں صحیح راستے کی طرف رہنمائی کر سکے۔ یہ کیا چیز ہے؟ وحی کو یہ کہہ کر کیوں متعارف کرایا گیا ہے؟ یہ کیا چیز ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے؟ یہ نہ دی جاتی تو انسانوں کی کیا کیفیت ہوتی؟ تو یہ سمجھنے کی بڑی اہم چیز ہے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وحی کی اہمیت کیا ہے اور یہ جو خدا نے انسانوں کو وحی دی ہے' واقعی یہ اس کی طرف سے کتنا بڑا انعام ہے۔ یوں کہہ دیجیے کہ یہ اس کی طرف اتنا بڑا عطیہ ہے' جس کی کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جاسکتی اور یہ انسانوں کو

بلامزدومعاوضہ بلامشقت ملا ہے تو اس لیے بلامزدومعاوضہ بلامحنت ملا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو وحی آئی حضور ﷺ پہ فریضہ عائد کیا گیا کہ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (5:67) پہنچاؤ ان تک کہ جن تک یہ پہنچایا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ لَآ اَسْـئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا (11:51) میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا تو نوعِ انسانی کو تو بلامزدور معاوضہ ملا۔

انسان اور حیوان میں قدر مشترک

یہ عطیہ کیسے بہت بڑا عطیہ ہے' کیوں یہ اتنا بڑا انعام ہے؟ یہ بڑی اہم چیز ہے جو سوچنے کی ہے۔انسان ہے کیا؟ زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔اس کی آخری کڑی حیوانات کی تھی۔یہ حیوانات سے آگے بڑھی تو انسان کے پیکر میں نمودار ہوئی۔ انسانی زندگی' جو اس کی طبعی زندگی ہے' فزیکل لائف ہے' اس میں بہت سا عنصر حیوانی زندگی کا ہے۔وہ ایسا ہے کہ دونوں میں امتیاز ہی نہیں ہے۔جس انداز سے حیوان زندہ رہتا ہے' اسی انداز سے' کھانے سے' پینے سے' سانس لینے سے' سونے سے' انسان زندہ رہتا ہے۔یہی چیزیں ہیں انہی سے انسان زندہ رہتا ہے' انہی سے حیوان زندہ رہتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ وہ کھانے کی نوعیت کیا ہے؟ وہ تو دوسری چیز ہے لیکن اصولاً جو زندہ رہنے کے لیے اسباب ہیں' وہ تو یہی ہیں: کھانا پینا' سانس لینا' سورج کی روشنی سے فائدہ اُٹھانا' حرارت سے فائدہ اٹھانا' سوجانا۔یہ ہے اور یہ انسان اور حیوان میں مشترک ہے۔عام طور پہ یہ جو ان علوم کے محققین ہیں' انہوں نے کہا کہ بنیادی طور پر تین چیزیں ایسی ہیں جو حیوان اور انسان میں مشترک ہیں یا انسان جو آگے بڑھا ہے تو یہ حیوانی زندگی جو اس کی پچھلی تھی' اس سے یہ تین چیزیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہے۔یہ ہیں Self Preservation (تحفظِ خویش) اپنے آپ کو محفوظ رکھنا' اپنی زندگی کو' جان کو محفوظ رکھنا۔یہ پہلی چیز ہے۔پھر Self Aggression ہے۔یہ دوسری چیز تغلب خویش ہے یعنی دوسرے پہ غالب رہنا' اتنی قوت اپنے اندر رکھنا جس کے لیے دوسرے کے مقابلے میں اپنی حفاظت کر سکے' دوسرے پہ غالب رہے اور تیسری چیز ہے Self Procreation اپنی نسل کو آگے بڑھانا۔یہ تین چیزیں حیوانات کے ساتھ لے کر آیا۔

حیوانی زندگی پر فطرت کا کنٹرول

ان چیزوں کے سلسلہ میں حیوانات پر فطرت کی طرف سے کنٹرول ہے کہ وہ حیوان انہیں اسی حد تک استعمال کرے جس حد تک وہ اس کے لیے مفید ہے۔فطرت انہیں آگے نہیں بڑھنے دیتی۔خواہ کتنا ہی زیادہ چارہ کیوں نہ رکھا ہو' جب بیل کا پیٹ بھر جاتا ہے تو فطرت خود کنٹرول کر لیتی ہے' باقی چارہ وہ چھوڑ دیتا ہے' آرام سے بیٹھ جاتا ہے۔یہ اس کا بھی جو Aggression (تغلب) ہے' وہ اس حد تک ہی ہوتا ہے کہ شیر کو ضرورت ہوتی ہے کہ ہرن کو چیر پھاڑ کھائے۔ایک ہی ہرن سے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو باقی دس ہرن چلتے ہیں'

پھرتے ہیں، وہ ان تک نہیں جاتا۔ فطرت نے اس پر نسل کشی کا کنٹرول رکھا ہے۔ جہاں تک تعلق ہے وہ فطرت کا کنٹرول ہے، سارا سال بیل ایسی گائیوں کے غلے کے اندر چرتا پھرتا رہتا ہے، کبھی نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، نہ گائیوں کو اس کی تمیز ہوتی ہے کہ یہ کوئی نر یا مذکر ہے اور ہم تانیث میں ہیں۔ یہ سوال ہی نہیں صاحب! لیکن جب اُدھر کا اشارہ ہوتا ہے، میں یہ اُدھر کا اشارہ (اسداللہ خان) غالب سے لیا کرتا ہوں۔

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے

بڑے خوبصورت انداز میں بات کہی ہے تو حیوانات کو اُدھر کا اشارہ از خود ہو جاتا ہے۔ اس اشارے کو بھی خداوحی کہتا ہے جو ان کی طرف ہوتی ہے لیکن جب ان کا سیزن آتا ہے، وہی بیل، وہی گائے، آپ غور کیجیے کہ وہ پاگل ہو جاتی ہے اور جب تحفظ نسل کا وہ فریضہ سرانجام پا جاتا ہے تو پھر وہی سکوت اور وہی فطرت کی طرف سے کنٹرول لیکن کنٹرول جب فطرت کی طرف سے ہو تو وہ تو مجبور ہو جاتے ہیں۔ بکری اگر گوشت نہیں کھاتی تو یہ اس کی کوئی کاریگری نہیں ہے، یہ ہنرمندی نہیں ہے، کوئی تقویٰ اور پرہیزگاری نہیں ہے، وہ فطرت سے مجبور ہے کہ وہ صرف سبزی کھائے، گوشت نہ کھائے، شیر اگر گوشت کھاتا ہے، سبزی کی طرف نہیں آتا، تو وہ درندہ نہیں کہلاتا، اس کو پھانسی نہیں دی دی جاتی، وہ مجبور ہے، اس پر فطرت نے اپنا کنٹرول رکھا تو مجبور کر دیا۔

حیوانیت کے مقام سے انسانیت کی منزل کی طرف انسانی اختیار وارادہ

جب حیوانات کو انسان کے پیکر میں زندگی آئی تو اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسے صاحبِ اختیار بنا دیا۔ جی چاہے تو یہ کرے، جی چاہے تو وہ کرے، فطرت نے کنٹرول اٹھا لیا۔ اب غور کیجیے کہ وہ تقاضے تو حیوانات کے ہوں، کنٹرول فطرت کی طرف سے اُٹھ چکا ہو اور یہ ہوں صاحبِ اختیار وارادہ تو پھر یہ کوئی ایک ایک غار میں یا پہاڑ کی چوٹی پہ بیٹھا ہوا نہ ہو۔ رہیں یہ آپس میں مل جل کر اور ہر فرد صاحبِ اختیار ہو، ہر فرد اپنے لیے Self Preservation کے لیے سامان اور ذرائع اور بیل کی طرح نہیں کہ پیٹ بھر دیا تو ختم کیا۔ یہ انسان ہے کہ کہا ہے کہ اَلْھٰكُمُ التَّكَاثُرُ o حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) اس کی ہوس کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ چلا ہوا ہے، اب ہر فرد کروڑوں کے چکر میں ہے۔ ہر فرد کے اندر کا تقاضا یہ ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ حاصل کروں، صاحبِ اختیار ہے، اب یہ جسے آپ کہتے ہیں Device کرتا ہے عجیب عجیب طریقے اختیار کرتا ہے، پھر وہ حیوان تو کوئی طریقہ ہی نہیں اختیار کر سکتا، وہ کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو، بندر ہو اور درخت کے اوپر ٹنگا ہوا ایک پھل ہو، وہ نیچے بیٹھے دیکھے گا، ہاتھ اٹھائے گا، نہیں پہنچ سکتا تو بے بس ہے، اتنا بھی نہیں آتا کہ کہیں سے ڈنڈا لا کر اس کو جھاڑ لے اور اس انسان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ چاند کے ذخائر بھی ڈھونڈ کر لے آتا ہے، اتنی بے پناہ قوتیں دی ہوئیں ہیں، فطرت کا کنٹرول اس پر نہ ہو، یہ صاحبِ اختیار رہو اور انہوں نے اکٹھا رہنا ہو تو کیا چیز ہے جو اس نسلِ انسانی کو بچا کر رکھے گی اگر اتنا ہی کچھ انسان کو

دیا ہوا ہوتا اس سے زیادہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔

تنہا عقلِ انسانی کی پیدا کردہ کشمکش کے باعث مغرب کے پیدا کردہ جہنمی نظام کا نتیجہ

مغرب میں بہت کاوش کی تو ان سے کہا کہ یہ ٹھیک ہے انسان کو عقل دی گئی ہے' عقل کے ہاتھوں ہی تو وہ سارے نالاں ہیں' سارا مغرب جہنم بن رہا ہے۔ مغرب کے ساتھ کم بختوں نے مشرق کو بھی یہ کچھ بنا دیا ہے۔ یہ Battle of Wits (عقول کی جنگ) ہے۔ اس طرح افراد میں چلتی ہے' یہاں جو زیادہ کاریگر ہوتا ہے' جو زیادہ عیار ہوتا ہے' جس کی عقل دوسرے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے' وہ فریب دیجا تا ہے' وہ اس کو لے جاتا ہے پھر بعد میں بات سمجھ میں آتی ہے کہ صاحب! میری سمجھ میں بات ہی اس وقت نہیں آئی جو وہ کہہ رہا تھا' فریب میں آ گیا' میں اس کے دھوکے میں آ گیا۔ یہ روز فریب اور دھوکے میں آنا کیا ہے؟ یہ جو تیز عقل والا ہے' وہ کم عقل والے کو ہمیشہ اس طرح سے جھل دے جاتا ہے۔ فرد اسی طرح سے دیتا ہے' قومیں اسی طرح سے دیتی ہیں یعنی وہ جو انسان کو ایک خصوصیت عطا ہوئی تھی' جسے عقل کہا جاتا ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عقل ہی کی تو لڑائی ہے جو انسانوں کے اندر ہو رہی ہے۔ اب یہ کیا ہوا؟ یہ کہ تقاضے ہوئے حیوانیت کے اور وہ ہوئے بے حد و نہایت' اس پہ کوئی حد نہیں' ان کو حاصل کرنے کے لیے اسے عقل دی گئی' اس نے اس کے لیے چاند تک جانے کے ذرائع اور اسباب مہیا کیے' آپس میں مل جل کر رہنا ہے ایکدوسرے کے ساتھ عقول (Wits) کی جنگ ہوئی جو زیادہ عیار ہے' وہ زیادہ کامیاب ہے۔ اس سے پس گئی انانیت' لٹ گئے غریب۔

قوموں کے ہاتھوں قوموں کی پٹائی اور پھر اجتماعی چیخ و پکار کی کیفیت

عزیزانِ من! آپ اگر آج کل کہیں یورپ کا لٹریچر پڑھ رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہو۔ ہم لوگ تو چھوٹے پیمانے پر اس جبر' جور' بھوک اور پیاس کے ہاتھوں کچھ روتے ہیں' آپ ان کی چیخیں سنیں تو انسان سن نہیں سکتا' آدھے آسمان تک جا رہی ہیں۔ وہ اس لیے کہ وہ اجتماعی اور قومی چیخیں ہیں۔ ان کی قوموں پر جو قوموں کے ہاتھوں بیت رہا ہے' کوئی ان میں سے رات کو اطمینان سے سو ہی نہیں سکتا کہ وہ سپر پاورز جناب! کھا جائیں گی۔ یہ ساری عقول کی جنگ ہے۔ آپ روز صبح اخبار اٹھا کر پڑھیے۔ آپس کی یہ ساری جنگ کا حصول ہی یہ عقل ہے کہ اس نے اس پہ حملہ کر دیا' وہ اس کو کھا گیا' یہ عجیب قیامت ہے کہ انسان نوعِ انساں کا شکار ہے۔

عقلِ انسانی کا جوہر بذاتِ خود نہ نیک ہے' نہ بد

ایک چیز ہے جسے اس نے کہا تھا کہ وہ بہت بڑی چیز تھی جو ہمیں حاصل ہوئی۔ وہ تھی عقلِ انسانی۔ عقل (Intellect) ایک صلاحیت ہے' عقل ایک تلوار ہے' جس کے ہاتھ میں ہے کہ جس طرح وہ استعمال کرے' وہ ایک بندوق ہے' ڈاکو کے ہاتھ میں بھی ہے'

چوکیدار کے ہاتھ میں بھی ہے‘ بجائے خویش وہ عقل نہ نیک ہے نہ بد ہے۔ یہ اس بندوق کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ طے کرے کہ مجھے ظالم کے سینے میں گولی پیوست کرنی ہے۔ بندوق یہ نہیں کرسکتی‘ وہ تو جو بندوق چلانے والا ہے اس کا فیصلہ ہے۔ ڈاکو ہے تو جہاں سے اس نے کچھ چھیننا ہے وہ اس کے سینے میں گولی پیوست کردے گا‘ وہ کتنا ہی مظلوم کیوں نہ ہو۔ اگر مظلوموں کا ہمدرد ہے‘ میں نے کہا ہے کہ یہاں تو نظر ہی کوئی نہیں آتا تو بہرحال اس کی بندوق تو اسے یہ کہے گی کہ نہیں کہ ظالم کے سینے میں مار‘ مظلوم کے سینے میں نہ مار۔ یہ بات کون کہے؟ یہ انسان کی عقل تھی اور عقل کا تقاضا اس فرد یا اس قوم کے مفاد کا تحفظ ہے جس کی وہ عقل ہے۔ جوڑ (Joad) کے الفاظ میں ’’انسانی عقل تو اسی طرح اپنے مفاد کے پیچھے چلتی ہے جیسے کتے کے پاؤں اس کے ناک کے پیچھے چلتے ہیں[1]۔‘‘ یہ بڑی عمدہ تشبیہہ ہے۔ اس کی ناک راہنمائی کرتی ہے کہ وہاں وہ گوشت پڑا ہوا ہے۔ یہ ٹانگیں نہیں فیصلہ کرتیں وہ چلتی چلی جاتی ہیں‘ جدھر اس کی ناک چلاتی ہے۔ کہا کہ یہ انسانی عقل تو کتے کی ناک ہے جہاں یہ اپنے شکار کی بو سونگھتی ہے اس کی ٹانگیں اس کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کردیتی ہیں۔ عقل ایک قیمتی صلاحیت ہے۔ بات یہ ہے کہ اس سے کام کس طرح لیا جائے؟

علامہ اقبالؒ کے نزدیک عقل کی کیفیت: ہر انسانی عقل اپنا ہی فائدہ پیشِ نظر رکھتی ہے

اقبالؒ نے اس عقل کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔

آدمی اندر جہانِ خیر و شر
کم شناسد نفعِ خود را از ضرر

کہا کہ دوسرے کا تو ایک طرف رہا‘ انسان خود اپنے نفع ونقصان کے متعلق بھی کچھ صحیح فیصلہ نہیں کرسکتا۔ یہ نفع اور نقصان کو بہت کم پہچانتا ہے اور پھر

کس نداند زشت و خوبِ کار چیست
جادۂ ہموار و ناہموار چیست

اسے معلوم ہی نہیں ہوتا۔ ہم یہ پوری عقل وفکر اور مشورے اور ترکیب کے بعد ہزاروں فیصلے کرتے ہیں‘ ہم سینکڑوں فیصلے کرتے ہیں‘ کہ یہ ہمارے حق میں صحیح ہے۔ معارف رکھیے‘ مجھے تکلیف ہے‘ نہایت غور وتدبر کے مشوروں کے بعد بھی‘ ایک فیصلہ کرتے ہیں‘ تھوڑی دیر چلنے کے بعد یہ ہوتا ہے کہ صاحب! یہ فیصلہ بڑا ہی نقصان رساں تھا‘ بڑا غلط فیصلہ ہوگیا‘ پھر ایک فیصلہ یہ ہے کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے

---

[1] A Man's thought follows his desire much as the feet of a hungry dog follow his nose (Joad:Decadence.p.36)

وہ بڑا اسمجھ سوچ کر کیا ہے۔ وہ میرے لیے تو فائدہ مند ہوا' میرے ساتھ جانے والا جو ہے اس کے لیے نقصان کا باعث ہو گیا۔ اس فیصلے کو کیا کہیں گے؟ آپ زیادہ سے زیادہ اگر عقل صحیح کام بھی کرے تو جس کی یہ عقل ہے اس کے فائدے کی بات کرے گی۔ اقبالؒ اسے عقلِ خود بیں کہتا ہے:

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

ہر شخص اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ جو یہ نہیں سوچتا اسے پاگل کہتے ہیں: پاگل ہو گیا ہے اسے اپنے نفع و نقصان کی بھی پرواہ نہیں رہی یعنی پاگل وہ ہوتا ہے جسے اپنے نفع نقصان کی پرواہ نہ ہو۔ عقل نے زیادہ سے زیادہ کام دیا تو وہ یہ ہے کہ اپنا ایک فرد کا یا پھر ایک قوم کا جو نفع ہے اس کے لیے یہ کرے' اس کو دوسروں کی فکر نہیں ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے ہاں ابھی زبان کی کوتاہ دامنی ہے' الفاظ نہیں ہیں' تنگ آ کر انہوں نے تجربے کرنے کے بعد' مختلف الفاظ قائم کیے' اپنے ہاں عقل کے لیے ایک تو ان کے ہاں Intelligence ہے اور اس کا نتیجہ جو ہوتا ہے وہ Cleverness ہے' وہ عیاری ہوتا ہے' اقبالؒ نے بھی تو یہ کہا ہے کہ

عشق بیچارہ نہ صوفی ہے نہ مُلّا نہ حکیم
عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے

ان کے ہاں Intelligence ہے' اس کا نتیجہ Cleverness (عیاری) ہوتا ہے اور دوسری چیز ان کے ہاں ہوتی ہے جسے Reason (عقل) کہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ ان کے ہاں Wisdom ہوتا ہے۔ یہ عجیب الفاظ ہیں اور آپ وجد میں آ جایئے تو پھر آئیں گے قرآن کریم کی طرف تو Reason (عقل) کے متعلق ان کے ہاں Definition (تعریف) یہ ہے کہ To see things as they are یعنی معاملات کو' حقائق کو' چیزوں کو' اپنے رنگین چشمے سے نہ دیکھنا بلکہ وہ فی الحقیقت میں جیسے ہیں' ان کو اس طرح سے دیکھنا۔ اسے وہ Reason (عقل) کہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں عقلِ خود بیں کی بجائے عقلِ جہاں بیں کا معیار قائم کرتا ہے

عزیزانِ من! یہ بڑی عجیب چیزیں ہیں۔ اب یہ چیز کہ کوئی بات جو کرنی ہے' اس میں یہ چیز دیکھنا کہ فی الحقیقت یہ نفع بخش ہے یا نقصان دہ ہے' اور پھر نفع بخش کس کے لیے ہے' فرد کے لیے ہے' قوم کے لیے ہے' نہیں پوری انسانیت کے لیے ہے؟ قرآن حکیم نے کہا کہ یاد رکھو مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (13:17) بقا صرف اس عمل کے لیے ہے جو پوری نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش

ہے۔اب یہ بھی تو طے کرنا ہے کہ وہ چیز نفع بخش ہے۔یہی چیز تھی جو اصل میں طے کرنی تھی کہ نفع بخش ہے تو کس کے لیے نفع بخش ہے۔ کہتا ہے جس کی وہ عقل ہے' اس کے لیے نفع بخش تو وہ یوں فیصلہ کردے گی۔یہی تو اس کی Cleverness (عیاری) ہے' فیصلہ یہ کرے کہ نوعِ انسانی کے لیے نفع بخش کون سی چیز ہے اور اس نے یہ کہا کہ اس کے لیے عقلِ انسانی' خواہ وہ سب جمع بھی ہو جائیں' تو بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتے' کہ نوعِ انسانی کے لیے کون سی چیز نفع بخش ہے۔وہ جو Reason کی Definition ہے وہ ہے To see things as they are جیسی وہ چیز ہے ویسا دیکھنا' اس میں کسی کے جذبات کو دخل نہ ہو' عقلِ حیلہ جو کو دخل نہ ہو' انسان کے جذباتِ مفاد پرست کو دخل نہ ہو' ان چیزوں کو دخل نہ ہو' تو یہ تو کسی انسان سے بھی ممکن نہیں' ساری انسانیت بھی مل جائے تو اس سے ممکن نہیں۔

وحی کی طرف سے میسر آنے والی روشنی انسانی جذبات کی رنگینیوں سے بہت بلند ہوتی ہے

انسانوں کے فیصلے میں تو کہیں نہ کہیں کوئی شائبہ ایسا آ جائے گا جہاں انسانیت کی سطح سے ہٹ کر' اس کا اپنا مفاد مضمر ہوگا۔یہ فیصلہ اس قسم کے جذبات' اس قسم کے تاثرات' ان رنگینوں سے بلند' خارج میں (Objectively) وحی خداوندی کر سکتا ہے' کوئی اور نہیں کر سکتا۔ خدا جذبات سے بلند ہے۔کوئی اور جذبات سے بلند نہیں ہے۔وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) اس میں اس وحی دینے والے کے اپنے جذبات کا بھی خالصتاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔اسی لیے اس کے لیے نزول کا لفظ آیا ہے۔میں بار بار عرض کر چکا ہوں یہ Objectively انگریزی کا ہی لفظ ہے جو خارجی کے لیے ہے۔اس میں یہ کہیں گے کہ خارجیت ہے۔کہنے سے تو بات کچھ اور ہو جاتی ہے' جسے آپ Objectivity کہتے ہیں' اس میں انسان کے کسی قسم کے بھی جذبات اور عقل اور فکر اور دلائل کا کوئی دخل نہ ہو۔ خارج میں ایک حقیقت ہے۔جیسے وہ ہے ویسے وہ آئے۔یہ ہے وحی۔یہ پوری نوعِ انسانی کے مفاد کو سامنے رکھ کر ہدایت یا راہنمائی یا اصول یا اقدار یا قوانین دینے کا منبع ہے۔کیا یہ نوعِ انسانیت پر احسانِ عظیم ہے یا نہیں؟ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (3:163)۔ مجھے لفظ احسان بولنا پڑا۔ہم اس کے ممنونِ کرم ہیں پھر اقبالؒ نے یہ بات کہی تھی کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر
وحی حق بینندۂ سُودِ ہمہ

یہ فرق ہے عزیزانِ من!

در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ

پوری نوعِ انسانی کی جو منفعت ہے اس کے سامنے وہ ہے لہٰذا وحیِ خداوندی کے علاوہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی پوری انسانیت کے نفع اور نقصان کے لیے فیصلہ کرلے۔اس کا نام ہے وحیِ خداوندی۔

وحی کے عمل سے ہٹ کر انسان کی ہیئت کا ذکر

سوچیے کہ انسان جس ہیئت کے اندر پیدا کیا گیا' اس کے اندر حیوانی جذبات' Instincts (جبلتیں) داخل ہیں۔اس نے زندہ رہنا ہے' اس نے اپنے آپ کو محکم بھی رکھنا ہے' اس نے افزائش نسل بھی کرنی ہے' اس نے اکٹھا بھی رہنا ہے اور ان تمام کے لیے اُس پر کوئی کنٹرول فطرت کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ صاحبِ اختیار ہے' اس میں یہ حیوانی جذبات ہیں مگر یہ صاحبِ اختیار ہے' اسے مل جل کر رہنا ہے اور پھر جو اپنی عقلی قوتیں ہیں' وہ بے پناہ ہیں' اس کی اتنی وسعت ہے صاحب! وہ کہتے ہیں کہ ایسی میزائلیں ہیں کہ نیویارک میں بیٹھے ہوئے ماسکو پر مار کردیں۔ ابھی اب تو وہ یہ کہتے ہیں ہم چاند پہ مار کردیں گے۔اس کی صلاحیتوں کی ایسی وسعتیں ہیں اور کنٹرول کوئی نہیں۔ لے دے کر ایک عقل دی تھی اور عقل کا فریضہ فرد کا تحفظ ہو' گروہ کا فرد کا تحفظ ہو یا قوم کا تحفظ ہو' اس کے سامنے مفاد کی حفاظت ہے اور جب مختلف گروہ ہوں' مختلف قومیں ہوں' مختلف افراد ہوں' ہر ایک اپنا اپنا مفاد دیکھے' صلاحیتیں بے پناہ ہوں' تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر ایک جہنم ہمارے ہاں موجود ہے اور بڑے پیمانے پر پوری عالمگیر دنیا کے اندر موجود ہے۔

ذاتِ خداوندی انسان کو اس کے اختیار وارادہ کی نعمت سے محروم نہیں کرتی

عزیزانِ من! تو یہ بات ذہن میں آ گئی کہ یہ وحی کا ملنا انسانیت کے لیے کتنی بڑی نعمت' کتنا بڑا انعام ہے لیکن اس کا کام تو وحی کا دیدینا ہے' صرف وحی کے مطابق اگر زبردستی چلانا ہوتو وہ تو حیوانی سطح پر آ گیا پھر وہ تو مجبور ہوگیا۔ وہاں فطرت کا کنٹرول تھا۔ یہاں بھی وہ فطرت ہی کا کہہ لیجیے اور اس کا کیا نام رکھیں گے آپ؟ یہی تو شرفِ انسانیت ہے کہ وہ اس کے اختیار کو چھینتا نہیں ہے۔ یہ بڑی چیز ہے اور خدا ہونا تو جچتا ہی اسی کو ہے کہ اتنی بے پناہ قوتوں کا مالک سامنے دیکھ رہا ہے کہ یہ سارا کچھ کر رہا ہے' کیا مشکل ہے اس کے لیے ایک فرد تو ایک طرف رہا' پوری کی پوری قوم کا ایک سیکنڈ کے اندر گلا گھونٹ دے' لیکن بالکل نہیں گھونٹتا' معاف رکھیے گا میں Inverted Comma میں کہدوں کہ بڑا ہی وسیع الظرف ہے اس لیے کہ اس کے اندر اپنا مفاد کوئی نہیں تو وحی ہے جو نوعِ انسانی کے مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اس جہنم کو جنت میں بدل سکتی ہے جس میں انسانیت محفوظ چلی آ رہی ہے۔ یہ کنٹرول جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس نے راہنمائی دی ہے' اس میں بھی یہ شرف انسانیت ہے کہ اُس نے انسان پر خود کنٹرول نہیں کیا وہ اس لیے کہ یہ صاحبِ اختیار ہے' مجبور ہوجائے گا۔ لہٰذا خدا انسان کو حیوان نہیں بناتا البتہ انسان ہی دوسرے انسان کو حیوان بناتا ہے۔ یعنی دوسرے انسان ہی اپنے فائدے کے

لیے اس کے اختیارات کو چھینتا اور سلب کرتا ہے اور اس طرح یہ اسے حیوان بناتا ہے' خدا خود نہیں بناتا' کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ وحی پہ ہی چلے۔ نبی اکرم ﷺ سے کہہ دیا جن کے دل میں ان کی اتنی ہمدردی تھی کہ یہ غلط راستے پہ چل کر تباہ ہو جائیں گے' ان سے کہا کہ اے رسول! کیوں اس طرح سے دلبر داشتہ ہوتے ہو' تمہارا فریضہ راستہ دکھا دینا ہے' راستے پر جبراً چلا دینا نہیں ہے' جبراً چلانا ہوتا تو ہم پوری نوعِ انسانی کو حیوانوں کی طرح مجبور پیدا کر دیتے۔ ہمارے لیے مشکل کیا تھا!

صحیح راستے کا تعین وحی کی راہنمائی ہی کر سکتی ہے جو نوع انسانی کو محیط کرتی ہے مگر ہے یہ اس کے اپنے اوپر

شرفِ انسانیت کیا ہے؟ یہ ہے اپنے اختیار و ارادے کو صحیح طریق پر استعمال کرنا۔ صحیح طریق کے معنی کیا ہو گئے؟ اب یہ بھی اگر ہر ایک پر چھوڑ دیا جائے اور ہر ایک اپنے اپنے فائدے کے لیے جو کچھ کرے اسے صحیح طریق قرار دیدیگا' نہیں' وحی کی راہنمائی میں اپنے اختیار اور ارادے کو استعمال کرنا ہے۔ اب اختیار و ارادہ بھی اس کا برقرار رہا' وہ جو انفرادی طور پر عقل کا اپنے فیصلے کر کے جہنم Create (پیدا) کرنا تھا اس جہنم سے بھی یہ بچ گیا' جنت بھی اس کے حصے میں آ گئی' مجبور بھی نہ ہوا۔ یہ بات انسان کو صرف ایک وحی کے مل جانے سے ہو گئی۔

عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے اگر یہ انسانی عقل و فکر سے بالاتر سرچشمے سے وحی نہ ملتی' عقلِ انسانی کے بس کی بات ہی نہیں تھی کہ کوئی ایسا راستہ تلاش کر سکتی جس میں انسانیت محفوظ رہتی۔ جتنا زیادہ آگے بڑھتا چلا جاتا عقل تیز ہوتی چلی جاتی' عقل کی رو سے یہ اسباب اور ذرائع اور وسائل پیدا کرتا چلا جاتا' اتنا ہی جہنم کے یہ شعلے اور بھڑکتے چلے جاتے' اس سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی اس کے پاس نہیں تھا۔ اس انسانیت کو یہ راستہ بتا دینا پھر میں عرض کروں گا کہ کتنا بڑا احسان ہے۔ ہم تو قدم قدم پر اس کے رہین منت ہیں کہ یہ چیز عطا کر دی اور پھر وہ منصب اضافی نہیں' اضافی کہتے ہیں صرف میرا فائدہ ہو' فائدہ تو اس میں بھی ہے۔ ایک Absolute (مطلق) چیز ہوتی ہے' کلی فائدہ ہوتا ہے۔ ایک اضافی ہوتا ہے کہ اس کے اندر صرف میرا فائدہ ہو' انسانیت کے فائدے میں تو میں بھی آ جاؤں گا اگر فائدہ صرف تنہا میرا ہو گا تو دوسرا انسان بھی نہیں آئے گا چہ جائیکہ انسانیت اس کے اندر آ جائے۔ یہ صرف وحی کی رو سے ممکن ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' صرف وحی دیدی گئی اس پہ چلنے کے لیے خدا نے انسان کو مجبور نہیں کیا ہے۔ اب اس کے سامنے راستہ کھلا ہوا ہے۔ جی چاہے تو یہ جہنم کی طرف چلا جائے' جی چاہے یہ جنت کی طرف چلا جائے۔

ملتِ اسلامیہ کی سوختہ بختی

باقی قوموں کو تو چھوڑ دیجیے' اس سوختہ بخت قوم کو لیجیے' اسے قرآن کریم نے وارثِ کتاب کہا تھا۔ وہ جو اعراب تھے وہ کیا کرتے

تھے؟ میں وہیں پہ آ گیا۔ انہوں نے وہ چند الفاظ دہرا لیے تھے۔ اور کہہ دیا تھا کہ ہم ایمان لے آئے۔ ان کو ڈانٹ دیا تھا کہ ایسی بات مت کہو۔ یہ الفاظ دہرا دینے سے نہیں ہوتا۔ ہم کیا کر رہے ہیں؟ وہی وحی کے الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اتنے دہرا رہے ہیں کہ دنیا میں کم دہرائے گئے ہوں گے' مسلسل صبح شام' شام وسحر' ہر مہینے میں' ہر سال میں' سال کے ہر دور میں' راتوں میں' دن میں' شبانہ میں' شبینے میں' دہرا رہے ہیں۔ وہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے کچھ الفاظ دہرائے تھے اور کہہ دیا تھا کہ ہم ایمان لائے اور کہا تھا کہ مت کہو کہ ہم ایمان لائے۔ ہم بھی الفاظ دہرا رہے ہیں۔ اگلی بات جو ان سے کہی تھی کہ اس کا ثبوت یہ ہے وَاِنۡ تُطِيۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ لَا يَلِتۡكُمۡ مِّنۡ اَعۡمَالِكُمۡ شَيۡـًٔا (49:14) اطاعتِ قوانینِ خداوندی کا تمہارے ایمان کا یہ ثبوت ہے۔ سوچیے تو سہی کہ ہم کس مقام پہ ہیں' پھر سوچیے تو سہی کہ وحی کے الفاظ دہرا لینے سے اگر کچھ فائدہ ہوتا تو ان اعراب کو کچھ تو رعایت دی جاتی % 5 مارکس ہی سہی' خوشخطی دے نمبرای دے دتے جاندے (خوشخطی کے نمبر ہی دے دیئے جاتے)۔ نمبر نہیں دیئے گئے تو نمبر اعمال کے ملتے ہیں' الفاظ دہرانے کے نہیں ملتے۔ یہ وحی ہمارے کس کام آئی؟ اتنی بڑی جو نعمت اس نے دی ہے' وہ قومیں تو بہرحال جہنم میں ہی سہی' اپنی عقلوں سے تو کچھ کام لیتی ہیں' ہم تو اس سے بھی گئے گذرے ہیں' اپنی عقل بھی استعمال نہیں ہو رہی' ہمارا یہ مقام ہے کہ اُولٰٓـئِكَ كَالۡاَنۡعَامِ (7:179) جو لوگ اپنی عقل و فکر سے کام نہیں لیتے وہ حیوانی سطح پہ ہوتے ہیں اور اس کے بعد کہا کہ نہیں بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ (7:179) ان سے بھی بدتر حالت میں ہوتے ہیں کہ حیوانات پر فطرت کا کنٹرول تو تھا' اس بیل کے سامنے کتنا ہی زیادہ چارہ کیوں نہ ہو' جب اس کا پیٹ بھرتا ہے تو باقی کو دوسرے کے لیے وہ چھوڑ دیتا ہے' آرام سے الگ ہٹ جاتا ہے' فطرت کا کنٹرول تھا۔ اس کمبخت پہ وہ کنٹرول ہے نہیں اور کوئی کنٹرول اپنے اوپر اس نے رکھا ہوا نہیں ہے' اس لیے اس کا بس چلے تو کسی دوسرے کو کھانے کو نہیں دیتا' سمیٹتا چلا جاتا ہے' لوٹتا چلا جاتا ہے۔

ہم مسلمان دوہرے جرم کے مجرم ہیں

اس کو صرف وحی روک سکتی ہے' عزیزانِ من! اور ہم تو دوہرے جرم کے مجرم ہیں۔ ہم نے خود اس وحی کو چھوڑا۔ اپنے آپ کو اعراب کے مقام پہ لے گئے کہ چند الفاظ دہرا کر کہا کہ ہم ایمان لے آئے۔ کیا الفاظ ہیں دہرا دوں کہ قَالَتِ الۡاَعۡرَابُ اٰمَنَّا (49:14)۔ یہی کیا تھا انہوں نے کہ کلمہ شہادت وغیرہ پڑھا ہوگا۔ اسی وقت کہا کہ قُلۡ لَّمۡ تُؤۡمِنُوۡا (49:14) بالکل نہیں' تم ایمان نہیں لائے اور کہا کہ یہ کہو بھی نہیں بلکہ کہو کہ قُوۡلُوۡۤا اَسۡلَمۡنَا وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ (49:14)۔ یہاں سے بات چلی اور میں نے آج یہ عرض کیا تھا کہ خدا نے جو کہا ہے کہ یہ اتنی بڑی جو نعمت ہم نے پوری انسانیت کو دی تھی اور اس قوم سے کہا کہ تمہیں ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ہے اور اس کا یہ فریضہ قرار دیا کہ شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2:143)۔ اس قوم کو کہا کہ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا (2:143) خود اپنے

آپ پہ وحی کا کنٹرول رکھنا اور پھر انسانیت پر وحی کا کنٹرول رکھنا۔ بات ہی اتنی سی ہے کیونکہ وہ کنٹرول ہمارا اپنا عائد کردہ ہوتا ہے اس لیے اس میں جبر نہیں ہوتا۔ جبر اس کنٹرول میں ہوتا ہے جو دوسروں کا عائد کردہ ہو۔ اگر ہم اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرتے ہیں' جیسے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ صبح اُٹھ کر ہم تین میل کی سیر کیا کریں گے اور پابندی سے جاتے ہیں تو وہ جبر نہیں ہے۔ جبر وہی ہے کہ تھانیدار اگر ہمیں یہ کہے کہ ہر صبح آ کر یہاں حاضری دیا کرو۔ یہ جبر ہوتا ہے تو یہ ہے' عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی روشنی میں ہمارا مقام۔

قانونِ مکافاتِ عمل کا ترازو ہر آن انسانی عمل کو ساتھ ساتھ تولتا رہتا ہے مگر یہ ہے عقول کی جنگ انسانوں میں

عزیزانِ من! یہ سورۃ الحجرات کی آخری آیت تھی۔ کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (49:18) خارجی کائنات کے تو ذرے ذرے سے وہ واقف ہے ہی۔ یہ انسان کہہ سکتا تھا کہ ہوا کرے' ہمارے ساتھ تو یہ تعلق نہیں ہے۔ فوراً ہی اس نے وہاں کہا کہ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ (49:18) اور یہاں کہا بَصِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (49:18) ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہیں۔ خالی علم نہیں ہے' دیکھ رہے ہیں کہ تم کیا کر رہے ہو اور پھر جو کچھ ہم کرتے ہیں اس کا قانونِ مکافاتِ عمل تو اس کے ساتھ ساتھ قریب الحساب ہے' وہ اس کے ساتھ کے ساتھ اس کا نتیجہ مرتب کیے چلا جاتا ہے صاحب! وحی سے بے اعتنائی حیوانی سطح زندگی میں نہیں ہے۔ انسانی زندگی میں آپس میں Battle of Wits (عقول کی جنگ) ہے' اکٹھے مل کر رہنا ہے مگر ایک سے ایک ملا ہوا نہیں ہے۔ وہ خواہ نام کی ایک بات سے ہے وہ جو ''اسلمنا'' والی بات ہے' مسلمان نام رکھا لیں' غیر مسلم نام رکھ لیں' سب ایک جیسے ہیں' یہ پوری ایک امت تو ایسے واحدہ ہوئی ایک طرف رہی وہاں تو یہ تھا کہ وہ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:28) ہم میں سے اب انسانوں میں شاید دو بھی ایسے نہ ملیں کہ واقعی قلبی اعتماد سے جو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدرد اور مخلص ہوں یہ تو صرف حیوانی سطح ہے۔ آج ہر سُو باہم حصولِ مفادات کی جنگ ہے جو ہو رہی ہے۔ افراد میں ہو رہی ہے' قبیلوں میں ہو رہی ہے' خاندانوں میں' ملکوں میں' برادریوں میں' پوری عالمگیر انسانیت کے اندر ہو رہی ہے۔

انسانیت کا آخری سہارا

عزیزانِ من! ان حالات میں صرف وحی بچا سکتی ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یورپ کے اربابِ دانش اس نتیجہ پہ پہنچ رہے ہیں کہ عقلِ انسانی ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی جن میں ہم آج مبتلا ہیں۔ انہیں ذرا یہ بتانا مشکل ہے کہ عقلِ انسانی سے ماورا ایک سرچشمہ علم بھی تھا کہ جس نے یہ راہنمائی دی تھی اور وہ پرانی نہیں ہوگئی' وہ ابدی ہے' آج بھی زندہ ہے' آج بھی وہ اپنے نتائج اسی طرح پیدا

کر سکتی ہے جیسے کبھی اس نے کیے تھے۔ وہ تلاش میں ہیں۔ ہم اپنے ہاں بیٹھے ہوئے مطمئن ہیں۔ ہمیں تو تلاش بھی نہیں ہے تو بہر حال یہ تو انسان کے لیے وحی ملی تھی۔ یہ ''اسلمنا'' کہنے والوں کے لیے تو صرف نہیں تھی۔ وحی کا کیا بگڑے گا' اگر ہم اسے قبول نہ کریں گے' اس کے مطابق نہ چلیں گے۔ اس کا کیا بگڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ قومیں جو اپنے ناکام تجارب کے بعد اس نتیجے پہ پہنچ رہی ہیں کہ عقلِ انسانی اس کا حل دریافت نہیں کر سکتی ان تک کوئی اسباب وذرائع ایسے ہوں کہ ان تک یہ وحی کی چیز پہنچ جائے' وہ غور کرنے کے لیے تیار ہوں گے اور وہ قومیں میں سمجھتا ہوں کہ اس کو اپنائیں گی بھی' اپنائیں گی وہ قومیں' جو غور وفکر کے بعد اس نتیجے پہ پہنچیں گی اور جن کے ہاں غور وفکر اور عقل سے کام لینا ہی ناجائز قرار پا جائے تو وہ قوم کس طرح اس صحیفے پہ آ سکتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحجرات آج ہم نے ختم کی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ(2:127)

❀......❀......❀

سورة قٓ

پہلا باب: سورۃ قٓ (آیات 1 تا 8)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1982ء کی 18 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ قٓ سے ہو رہا ہے۔ یہ 50 ویں سورۃ ہے۔

حروفِ مقطعات کے تحت لفظ قٓ کے مفہوم کی وضاحت

ابتدائی لفظ ہی قٓ ہے۔ آپ کو اب یہ تو معلوم ہی ہے کہ یہ مقطعات جو بعض سورتوں کے ابتدا میں آتے ہیں، وہ حروف ہوتے ہیں اور میں ان کے متعلق کئی دفعہ تشریح کر چکا ہوں۔ میں عام طور پر انہیں صفاتِ خداوندی کے حروف سمجھا کرتا ہوں اور اسی اعتبار سے اس کے معانی بھی اب کرتا ہوں۔ اب قٓ کو اگر صفت خداوندی لیا جائے تو وہ تو پھر قادر اور قدیر ہے اور یہ ساری صفات قٓ میں آتی ہیں لیکن ساری عربی کے اندر میں نے یہ دیکھا کہ عام طور پہ وہ اسے اس وقت استعمال کرتے ہیں جب محبوب کو کہنا ہوتا ہے کہ ''رک جا''۔ قِت ان کے ہاں ''رک جانے کے لیے ہوتا ہے۔'' تو اس کا بھی مخفف وہ خالی قٓ ہی کرتے ہیں۔ تو اس کے معنی ہوتا ہے ''ذرا رک جایئے' ذرا ٹھہر جایئے' ذرا غور کیجیے''۔ تو یہ رکنے کے معنی میں اگر آپ اس قٓ کو لیں تو پھر اس کے معنی یہی ہونگے۔ اگر وہ صفتِ خداوندی کا ایک حرف لیں' خدائے قدیر کہیں تو پھر یہ ہوگا کہ خدائے قدیر کا ارشاد ہے جو آگے بات آتی ہے۔ اور اگر اس کو یہ قٓ لیں جو عام طور پہ اس زمانے میں وہ شعرا استعمال کیا کرتے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ذرا رکیے' ذرا تھمیے' ٹھہریئے' غور کیجیے' جو بات کہی جا رہی ہے بڑی اہم ہے۔

قرآنِ حکیم کی عظمت قرآنِ حکیم کے آئینہ میں

آپ کو معلوم ہے کہ قرآنِ کریم میں اور مقامات پہ یہ ہے کہ ان سے کہیے کہ یہ ذرا رک جائیں' ٹھہر جائیں' ایک بات ان سے میں کہنا

چاہتا ہوں وہ میری بات سن لیں۔ تو یہ رکنے اور ٹھہرنے کے معنی میں بھی آ سکتا ہے' غور کرنے کے معنی میں بھی آ سکتا ہے۔ اور غور طلب بات یہ ہے کہ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (50:1) یہ 'وَ' ہے' ان کے ہاں شہادت کی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو عام طور پہ اس کا ترجمہ ''قسم'' کرتے ہیں ''قسم ہے قرآن کی'' لیکن یہ تو معنی جچتے نہیں ہیں۔ گویا خود قرآن حکیم آپ اس بات کی شہادت ہے اس کے لیے کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس سے شرف و مجد حاصل ہوتا ہے۔ یہ خود بھی بڑا اشرف' عظمت' فضیلت کا حامل ہے اور اس کے اتباع سے شرف اور مجد حاصل ہوتا ہے۔ قرآن حکیم خود اس پر شاہد ہے۔ اور بہت بڑی چیز ہے یہ جو کہا گیا کہ قرآن حکیم کے اس طرح سے موجود ہونے کے لیے کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں۔ جیسے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ سورج روشن ہوتا ہے' کسی خارجی شہادت کی ضرورت نہیں ہوتی' سورج خود اپنی شہادت آپ ہوتا ہے کہ وہ روشن بھی ہے اور اس میں حرارت بھی ہے۔ اسی طرح سے قرآنِ کریم کے متعلق یہ کہا کہ یہ اپنی آپ شہادت ہے کہ یہ بہت بڑے مجد اور بزرگی کا حامل ہے۔ قرآن کریم تو ایسا ہے لیکن ان لوگوں کو کہا بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ (50:2) انہیں تعجب اس بات پہ ہو رہا ہے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ قرآن خود اس امر کی شہادت ہے کہ یہ صاحب مجد ہے۔ قرآن کریم کو دیکھو' اس پہ غور کرو۔ قٓ کہنے کے تو معنی ہی یہ تھے کہ ذرا رکو' تھمو' غور کرو جو ہم کہہ رہے ہیں۔ تو قرآن کریم کو دیکھو کہ اس کی تعلیم کیا کہتی ہے۔ قرآن کریم کو نہیں دیکھیں گے' تعجب اس بات پہ آ رہا ہے کہ قرآن کریم کا پیش کرنے والا' لانے والا' یہ نبی یا رسول ہے' وہ انہی میں سے ایک آدمی ہے' انہی جیسا ایک آدمی ہے' انہیں تعجب اس پہ آ رہا ہے۔

قرآنِ کریم کا بہت بڑا اعجاز توہم پرستی اور شخصیت پرستی کے تصور کر مٹا دینا ہے

قرآنِ کریم نے جہاں ذہنِ انسانی کی اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا' وہاں سب سے بڑی چیز توہم پرستی تھی جس کو اس نے دور کیا بلکہ اس سے بھی زیادہ شخصیت پرستی ہے کہ اسے بھی قرآن کریم نے دور کیا۔ یہ حقائق کو منواتا ہے' شخصیتوں کو نہیں۔ اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ یہ جو قرآن کریم ہے' اگر اسے کسی انسان کے ذریعے سے بھیجنا ہے تو انسان کو فوق البشر حیثیت سے پیش کر دیتا' قرآن کریم ہی کو کہیں آسمان سے لکھی لکھائی ہوئی کتاب ہی اتار دیتا۔ قرآن کریم کو نازل کیا' وحی عطا کی' ایک انسان کو جو انہی میں رہتا تھا' انہی کے اندر اس نے اپنی عمر بسر کی تھی' انہی جیسا تھا۔

دنیا بھر کی عظیم تر شخصیتِ انسانیت کے امام نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ قبل از نبوت بھی

عزیزانِ من! بار بار قرآن حکیم میں یہ آیا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مجھے یہ وحی خدا کی طرف سے ملتی ہے' وہ وحی جو مجھے ملتی ہے میں بعینہٖ اسی طرح سے' تم لوگوں تک منتقل کر دیتا ہوں' اسے پہنچا

دیتا ہوں۔تو وحی مجھے ابتدا میں ملی تھی' میں نے آپ تک پہنچا دی' تو وحی آپ کے پاس بھی آ گئی۔اس اعتبار سے بھی ہم دونوں برابر ہو گئے۔ وحی آپ کے پاس بھی ہے اور میرے پاس بھی ہے۔اب اس کے بعد باقی جو حیثیت ہے' وہ ساری بشری حیثیت ہے۔میں ایک انسان ہوں' ایک بشر ہوں' میں نے اپنی زندگی تم میں بسر کی ہے۔اور اس زندگی کو آپ ﷺ نے شہادت کے طور پہ پیش کیا کہ میں نے چالیس سال نبوت کے دعوے سے پہلے بھی تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے۔تم سوچو کہ ایسی زندگی ایک جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی ہوتی ہے۔ اور انہی کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ کی قبل از نبوت زندگی کے متعلق بھی کہتے تھے کہ حضور ﷺ بڑے ہی امین تھے' صادق تھے' دیانتدار تھے' قابلِ بھروسہ تھے' آپ ﷺ کا کردار بڑا ابلند تھا لیکن بہرحال ایک انسان تھے۔یعنی یہ بار بار رسول کو انسان کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ قرآن حکیم شخصیت پرستیوں کو دور کرنا چاہتا تھا' تو ہم پرستیوں کو دور کرنا چاہتا تھا۔اس کے اندر کوئی چیز فوق البشر نہیں' کوئی چیز فوق الفطرت نہیں' کوئی چیز Supra-Natural نہیں۔اتنی چیز تو ہے کہ جسے واقعی ہم اپنے شعور سے نہیں سمجھ سکتے کہ وحی کس طرح سے خدا کی طرف سے آتی تھی۔اس آنے تک کی جو بات ہے وہ تو ہے ایسی کہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔

نبی کی ذات کے علاوہ وحی کو آن میرٹ لو

وحی آچکنے کے بعد' جو وحی ہے' اس کے متعلق بار بار کہا گیا کہ غور اور فکر اور علم و بصیرت کی رو سے وحی کی وہ بات سمجھ میں آئے گی۔تو گویا یہاں آنے کے بعد پھر وہ سمجھنے والا ایک انسان ہے اور وہ اپنے فہم و شعور کو' علم و بصیرت کو کام میں لاتا ہے اور اس سے یہ وحی سمجھ میں آ جاتی ہے۔اب یہ بات کہ یہ وحی کیسے ملی تھی' یہ ایک نظری سی بات رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تعلق اس سے نہیں رہتا کہ یہ آن میرٹ وحی کس قسم کی ہے۔قرآن مجید اپنے آپ کو آن میرٹ پیش کرتا ہے' وہ کوئی فوق الفطرت بات (Super-Natural) اپنے ساتھ ملوث نہیں کرتا۔خدا کی طرف سے وحی تو مل گئی۔اب وحی کے بعد رسول بھی ایک بشر ہیں' یہ قرآن حکیم بھی ایک کتاب ہے۔کہتا ہے کہ اسے ایک کتاب کی حیثیت سے لو۔تو جیسے کتاب کو سمجھتے ہو' اسی طرح سے اس کو بھی سمجھو' اس سمجھنے کے بعد تم خود سوچو کہ کس نتیجے پہ پہنچتے ہو کہ اس کی تعلیم واقعی تمہیں دنیا میں شرف اور مجد عطا کرنے والی ہے یا نہیں۔اس کو آن میرٹ لو۔

نبی اکرم ﷺ نبوت کے عظیم ترین مقام پر فائز اور ہم صاحب کرامات!

پہلی چیز جو قرآن حمید نے بتائی وہ یہ ہے کہ انہیں تعجب یہ ہو رہا ہے کہ یہ رسول جو قرآن حمید کو وحی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے' یہ ہم میں سے ہمارے ہی جیسا ایک انسان کیوں ہے۔اسے کچھ ان سے الگ تھلگ ہونا چاہیے۔قرآن مجید نے رسول کے متعلق یہ کہا اور اس کے بعد پھر آپ دیکھیے کہ مسلمانوں نے کیا کیا۔اگر یہ سچ مچ ذرا سی چیز کسی کے اندر ہے یا اس کی طرف منسوب کی گئی کہ کوئی بات ایسی کرتا

ہے' کیا کرتا ہے وہ؟ یہاں کھڑا ہوا ہے پاگل سا وہ انسان ہے' کہ جی! بالوں کو نچوڑتا ہے تو اس میں سے دودھ کے قطرے نکلتے ہیں۔ ایک دنیا اس کے پیچھے آجاتی ہے' عقیدت لے کے' ارادت لے کے' زندگی بھر وہ حضرت صاحب ہو جاتے ہیں' صاحبِ کرامات ہو جاتے ہیں۔ اور مرنے کے بعد اس کی قبروں کو پوجتے ہیں وہ پتھروں کی قبروں کو پوجتے ہیں۔ چلا ہوا ہے یہ سارا سلسلہ۔ اسی چیز کو وہ ختم کرنے کے لیے آیا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کی طرف سے پیش کردہ خدا کی کتاب ہی معجزہ ہے مگر ہم ہیں صاحبِ کرامات یا مداری کے پیچھے

وہ بار بار رسول اللہ ﷺ سے معجزات طلب کرتے تھے کہ کوئی معجزہ ہی دکھایئے کہ ہمیں معلوم ہو کہ واقعی آپ ہم میں سے نہیں' ہم میں سے کوئی الگ شخصیت ہیں' خدا کے ساتھ آپ کا تعلق ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہوگی جب آپ کوئی معجزہ دکھائیں گے۔ بار بار کہا گیا کہ بابا! معجزہ جو ہے ایک تو میری اپنی زندگی تمہارے سامنے ہے' اس سے تم دیکھو کہ میں جھوٹا ہوں یا سچا ہوں۔ اور ایک یہ کتاب ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کتاب کو آن میرٹ سمجھو اور پرکھو کہ وہ کیسی ہے۔ بار بار قرآن حمید نے اس کے متعلق تردید کی ہے اور وہ بڑی ضروری چیز تھی جو کہی گئی۔ خدا کی طرف سے معجزہ دکھا بھی دیا جا سکتا تھا تو وہ ان لوگوں کے لیے ہی کچھ ہوتا جن لوگوں نے وہ معجزہ دیکھا تھا' بعد میں آنے والوں کے لیے اور حضور ﷺ کی رسالت تو تمام نوعِ انسان کے لیے قیامت تک کے لیے ہے' وہ معجزہ ہمارے کس کام آ سکتا تھا۔ معجزہ تو وہی ہے جو قرآن حکیم ہے' محفوظ ہے' ہمارے سامنے ہے۔ قیامت تک ہر انسان کے سامنے رہے گا۔ یہ ہے معجزہ لیکن وہ معجزہ مانگتے تھے۔ میں نے کہا کہ آج بھی ہمارے ہاں' جہاں ابھی علم و دانش اتنا عام ہو رہا ہے' کیفیت یہ ہے کہ اگر کسی انسان سے ذرا سی بھی کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے اور یہ سرزد کیسے ہوا کرتی ہیں وہ تو میں نے اب اپنی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' میں بے نقاب کر دیا ہے کہ یہ کیسے سرزد ہوا کرتی ہیں' لیکن کسی سے اگر کوئی ایسی ذرا سی چیز سرزد ہو جائے یا کوئی مشہور کر دے کہ جی! وہ حضرت صاحب نے ہمارے بیٹھے ہوئے وہاں سے یوں کیا اور وہ افغانستان کا انار ان کے سامنے آ گیا۔ اس کو دین سے کیا تعلق' اس کو روحانیت سے کیا واسطہ۔ مداری تمہارے سامنے روپے کے دو بناتا چلا جاتا ہے۔ فرق یہی ہوتا ہے کہ آخر میں وہ یہ کہتا ہے کہ بابا! اگر میں واقعی دو بنالوں تو مجھے مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ اتنی بات کہہ دیتا ہے۔ یہ اتنی بات کہتے نہیں ہیں۔ وہ پھر بھی دیانتدار ہوتا ہے۔

نزولِ قرآن کریم کا مرکزی پروگرام عقلِ انسانی کی نشو و نما کے پیشِ نظر اس کی بصیرت کو پروان چڑھانا ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم عقل و بصیرت کو اپیل کرنے کے لیے نہیں آیا' نشو و نما دینے کے لیے آیا ہے' Develop کرنے کے لیے

آیا ہے۔یعنی قرآن کریم کے نزول کا مقصد بتایا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (43:3) تا کہ تمہاری عقل وبصیرت پروان چڑھے۔یعنی وہ تو عقل وبصیرت کو پروان چڑھاتا ہے۔اوراگر واقعی قرآن کریم کو اس نگاہ سے دیکھا جائے تو آپ غور نہیں کر سکتے کہ یہ انسان کے عقل وفہم کو علم وبصیرت کو کہاں لے جاتا ہے۔عزیزانِ من! یہی روحانیت ہے: قرآن کریم تو بصائر ہے اوراس کے حقائق ہیں اوراس کی تعلیم اوراس کی رہنمائی ہے۔یہی ہے اس کا ایجاز یہی ہے اس کی روحانیت اورکوئی چیز نہیں ہے۔جب رسول اللہ ﷺ سے معجزات کے مطالبے کیے گئے تو قرآن کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ یہ چیزان سے کہو کہ نہیں بھئی! یہ معجزے کی بات نہیں معجزہ یہ قرآن کریم ہے جو میں پیش کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں عقل وبصیرت سے ہٹ کر معجزوں اورکراماتوں پرلکھی جانے والی ہزاروں کتب کے ڈھیر

وہاں تو یہ معجزہ نہیں ہے لیکن ہم نے کتابوں پہ کتابیں لکھیں سینکڑوں ہزاروں معجزات حضور ﷺ کی طرف منسوب کر دیئے۔جب وہاں منسوب کیے تو اس کے بعد کرامات کا سلسلہ چلا یعنی لفظ بدل دیا اور بات وہی اب چلی ہوئی ہے۔اب جتنے حضرت صاحب ہیں اور حضرت صاحب کی جو ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں وہ صرف کرامات کے بل بوتے پہ ہیں۔اگر کسی حضرت صاحب کے متعلق یہ ہو کہ انہوں نے کوئی کرامت نہیں دکھائی ہے تو وہ حضرت صاحب نہیں بن سکتے۔یعنی حضرت صاحب بننے کے لیے کچھ فوق البشر ہونا پڑے گا اورکوئی بات ان کے اندر نہیں دیکھیں گے کہ علم کیسا ہے فہم کیسا ہے شعور کیا ہے اور یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ ان کی زندگی کیسی ہے۔

ملامتیہ فرقے کی بنیاد کی وجہ اور حضور اکرم ﷺ کا منشور

آپ حیران ہونگے کہ یہ ایسی زندگی ہے کہ جس میں وہ ہر قسم کے جتنے عیوب ہیں گناہ ہیں وہ سارے جرائم ہیں جو وہ کرتے ہیں اعلانیہ شرابیں پیتے ہیں زنا کرتے ہیں۔اس کے باوجود اسی طرح سے ان کی پرستش ہوتی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا ہوا ہے؟ انہوں نے ملامتیہ ایک فرقہ بنالیا کہ ہر قابلِ ملامت جو چیز ہے وہ کرتے ہیں۔کرتے کیوں ہیں؟ تا کہ خلقت ان کا پیچھا نہ کرے۔اندازہ لگایئے۔اوروہ ہیں اسی طرح سے حضرت صاحب۔عزیزانِ من! ان سب چیزوں کو مٹانے کے لیے قرآن کریم آیا۔کہا کہ اُدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108) حضور ﷺ کا فرمان قرآن کریم کے اندر حضور ﷺ سے کہا گیا کہ ان سے کہو کہ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں علم وبرہان کی بنا پہ دعوت دیتا ہوں Rationally دعوت دیتا ہوں Reason کی بنا پہ دعوت دیتا ہوں دلائل کی بنا پہ دعوت دیتا ہوں۔اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ (12:108) میں بھی ایسا کرتا ہوں اور جو میری سنت کی پیروی کرنے والا ہوگا وہ بھی ایسا ہی کرے گا۔اب جو ہمارے ہاں یہ سنت کی پیروی کرنے کے مدعی ہیں کبھی ان کا وعظ سن

لیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ معجزات کی کتنی لڑیاں پرو کر اپنے ایک ایک وعظ کے اندر دیتے ہیں۔ وہ تو حضور ﷺ کی ہی نہیں، وہ اگر حضرت صاحب کی آگے چلتی ہیں تو اسی نسبت سے ہیں کہ انہوں نے تو یہ لکھ دیا ہے۔ میں نے ان کرامات کے بارے میں یہ کچھ لکھا ہے یہ میری کتاب ''تصوف کی حقیقت'' میں موجود ہے۔

قرآنِ حکیم کی تعلیم، جو عقل کو جلا بخشتی ہے، کو ماؤف کرنے کی سازش

کرامت اور معجزے میں بس صرف لفظ کا فرق ہے ورنہ دونوں کی حیثیت ایک ہی ہے۔ یہ سلسلہ چلا ہوا ہے۔ عقل ماؤف ہوتی ہے جب کوئی فوق الفطرت چیز آپ کے سامنے آتی ہے۔ وہ ساری چیزیں سازش تھیں کہ اس قوم کی عقل و فکر کو ماؤف کر دیا جائے، یہ سوچے نہیں۔ اس دور میں کسی حیثیت سے علم کی روشنی عام ہوگئی تھی، یہ چیزیں کم ہو رہی تھیں لیکن یہ مغرب کی قوتیں ہیں، انہوں نے دیکھا کہ اگر مسلمان نے سوچنا شروع کر دیا، علم و بصیرت سے اس قوم نے کام لینا شروع کر دیا تو ایک ارب کے قریب قوم مراکش سے انڈونیشیا تک ٹھاٹھے مارتا ہوا ایک سمندر ہے، تو یہ قوم تو بلا ہو جائے گی، کسی کے قابو میں نہیں آئے گی۔ اس کو سنبھالو۔ سنبھالنے کے لیے طریقہ کیا اختیار کیا؟ یہ کہ

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے

ان میں یہ اسلام پھر سے رائج کرو جوان کو عہدِ توہم پرستی کی طرف لے جائے۔

اقبالؒ کے الفاظ میں مروجہ اسلام وہی اسلام ہے جس کا حرکاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے

یہ سارا اسلام جو آج پھیلایا جا رہا ہے، یہ سارا وہی اسلام ہے جو ان طاقتوں نے دیا ہے اور ان کی وساطت سے پھیلایا جا رہا ہے۔ اتنا روپیہ وہ طاقتیں صرف کر رہی ہیں۔ اُن کے ہاں اس کو Fundamentalism کہتے ہیں۔ ان کے رسالوں میں کبھی آپ پڑھیے تو معلوم ہو کہ یہ کتنی بڑی سازش آپ کے ہاں چلی آ رہی ہے۔ ہر وہ چیز جو علم اور روشنی کے خلاف ہو، اس کو آپ نے مذہب کا نام دیا، شریعتِ حقہ کا نام دیا، اور اس کو منسوب کر دیا کبھی کسی کی طرف، کبھی کسی کی طرف۔ اور اب اس کو عام کیا جا رہا ہے، کروڑوں روپیہ اس کے اوپر صرف کیے جا رہے ہیں۔ ان سے پوچھیے کہ ان کے پاس یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ ان کے پاس تو کھانے کے لیے روٹی نہیں ہوتی تھی، جمعرات کو محلے کی روٹیاں جاتی تھیں تو ان کو کھانے کو ملتا تھا۔ اب جناب! یہ ساری دنیا میں ہوائی جہازوں پہ سفر ہو رہا ہے، فائیو اسٹار ہوٹلوں کے اندر یہ ٹھہر رہے ہیں۔ یہ کس مقصد کے لیے ہے؟ یہ اسلام پھیلایا جا رہا ہے کہ سنگسار کرنا بھی اسلام ہے۔ پھیلاؤ، کسی طرح سے اس قوم کی علم

وبصیرت کو مفلوج کر دو' کسی طرح سے یہ جاگنے نہ پائیں۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مذہب کے نام پر عجمی اسلام کی جادوگری کی سعی وکاوش

وہ حکمراں کی ساحری ہے' مذہب کے نقاب میں جو پھیلائی چلی جارہی ہے۔ سلاؤ اس قوم کو' جاگنے نہ دو اس قوم کو' یہ قوم جاگ اٹھی تو پھر دنیا میں کوئی قوم باقی نہیں رہے گی۔ قرآن کریم کا فیصلہ ہے کہ مسلم اگر مومن ہو جاتا ہے تو دنیا کی کوئی غیر مسلم قوم اس پر غالب نہیں آسکتی۔ انہیں پتہ ہے' آپ کو نہیں ہے۔ یہ بہت گہری Study (مطالعہ) کرتے ہیں۔ میرے پاس جو آتے ہیں' میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ کس گہرائی تک وہ اس معاملے کے اندر پہنچے ہوئے ہوتے ہیں۔ آپ حیران ہونگے جو Fundamentalism انہوں نے دیا ہے تو اس کی ہسٹری انہوں نے کہاں سے پیش کی ہے۔ وہ سارا جو تصوف ہے' وہ اس ہسٹری کے اندر لے آئے ہوئے ہیں' یہ سارے قدامت پرستی کے فقہی قوانین وہ لے آئے ہوئے ہیں کہ جن میں عقل وفکر نہ ہو۔

عورت کا آدھا ووٹ' آدھی گواہی' اور آدھے خون بہا کے لیے دنیا بھر میں اس کی تبلیغ اور حضرت صاحب!

سوچیے تو سہی! کہا جا رہا ہے کہ عورت کا آدھا ووٹ ہوگا۔ پہلے تو یہ ہوگا ہی نہیں' پھر یہ ہے کہ کسی طرح سے' اُسے برقعہ ورقعہ پہنا کر لے جایا جائے گا تو آدھا ووٹ ہوگا۔ یعنی کوئی تُک ہے کسی قسم کی! کبھی دنیا میں آدھا ووٹ بھی آپ نے سنا ہے۔ آپ اعتراض کیجیے تو کہیں گے کہ شریعتِ حقہ کے خلاف اعتراض کرتا ہے' مرتد ہے۔ تو اس طرح شریعتِ حقہ ساتھ چپکا دی۔ آپ سوچ نہیں سکتے۔ آپ سوچیے کہ اگر عورت قتل کر دی جائے اور اس کی دیت' جو خوں بہا ہوتا ہے' وہ مقرر ہو' تو مرد کا جو خوں بہا ہے اس سے آدھا خوں بہا عورت کا ہوگا۔ یہ ہے آپ کی شریعتِ حقہ' جو آج پھیلائی جارہی ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیا چیز پھیلائی جارہی ہے۔ ہزار سال پہلے کی یہ چیزیں دبی ہوئی تھیں' علم وبصیرت نے خود ہی ان کو ختم کر دیا تھا' وہ قریباً قریباً ختم ہو رہی تھیں۔ نئے سرے سے ان کا احیا ہو رہا ہے' ساری دنیا میں یہ چیز پھیلائی جارہی ہے۔ آپ اس قسم کی روز نئی نئی باتیں سنیں گے' جس پہ عقل ہنسے اور علم ماتم کرے۔ نام ہوگا شریعتِ حقہ کا۔ اعتراض آپ کر نہیں سکتے۔ پھیلائی چلی جارہی ہیں۔ اس وقت اسلام کے اور مسلمانوں کے خلاف بڑی سازش ہو رہی ہے۔

وہی چیز تھی جو ان کو تعجب آرہا تھا جو قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ کہتے ہیں کہ ہم میں سے ہمارے ہی جیسا ایک انسان رسول' کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ کتنے ہیں جن کی یہ پتھروں کی اور اینٹوں کی پرستش ہو رہی ہے خواہ وہ زندہ ہیں یا مر گئے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن میں نہیں آتا کہ

ہمارے جیسے انسان ہیں۔نہیں جی! وہ تو حضرت صاحب ہیں۔

کچھ ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص سوچنے نہ پائے

یہ جو صاحب! یہاں بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں' یہ عصر کی نماز مکے میں جا کر پڑھتے ہیں۔انہوں نے کہا کہ جا کر کہاں پڑتے ہیں' ہم نے تو یہاں دیکھا ہے' یہیں بیٹھے ہوتے ہیں۔کہنے لگے کہ کعبہ یہیں آ جاتا ہے۔عزیزانِ من! آپ ہنس رہے ہیں۔یہ آپ کا اسلام بن رہا ہے۔ایک سازش ہے کہ قوم کو سوچنے نہ دو۔

حضور ﷺ کی ایک بات' صرف ایک لفظ کی ایک بات اور وہ یہ کہ "سوچا کرو"

ایک ہی چیز ہے جو حضور ﷺ نے فرمائی تھی کہ او! میں تمہیں ایک بات کہتا ہوں' لمبی چوڑی کوئی بات نہیں کہتا اور وہ یہ ہے کہ کھڑے ہو جاؤ' کھڑے ہو جاؤ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی ثُمَّ تَتَفَکَّرُوْا (34:46) خدا کے لیے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔انہوں نے کہا کہ او! ایک ہی تو بات ہے' سن تو لو کہ کیا کہتے ہیں۔آپ کو پتہ ہے قرآن کریم میں ہے کہ حضور ﷺ نے کہا تَتَفَکَّرُوْا سوچا کرو۔کہنے لگے اور؟ آپ ﷺ کہنے لگے کہ بس۔یہ ایک ہی بات ہے کہ اگر تم نے سوچنا شروع کر دیا تو میرا کام بن گیا۔ساری دنیا کی سازشیں یہ ہیں کہ یہ مسلمان قوم سوچے نہیں۔روایات کی سازشیں بھی یہ ہیں' تاریخ کی سازش یہی ہے' فقہ کی سازش یہی ہے' تصوف کی سازش یہی ہے' آج Fundamentalism کی سازش یہی ہے۔یہ جتنا کچھ اسلام پھیلانے کے نام پر آپ کے ہاں ہو رہا ہے' یہ سارا ان Powers (قوتوں) کے زور پر ہو رہا ہے۔

مذہب کی دنیا میں اپنے لیے الگ لباس اور الگ تمدنی زندگی کیوں؟ دیکھیے مِّنۡهُمۡ کا قرآنی مفہوم

کہا ہے کہ بَلْ عَجِبُوْۤا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ (50:2) تعجب آ رہا ہے انہیں کہ یہ قرآن پیش کرنے والا ہم میں سے ہی ایک شخص ہے۔انہیں جب کچھ بننا ہوتا ہے تو پھر ان میں سے وہ الگ اپنی شکل وصورت بناتے ہیں۔یہ اچھے بھلے شیو کرنے والے ہوتے ہیں بلکہ بعض تو کلین شیو کرتے ہیں' اچھے بھلے سوٹڈ بوٹڈ ہوتے ہیں' ڈاکٹر وغیرہ ہوتے ہیں۔جونہی ذہن کے اندر یہ آتا ہے کہ نہیں' اس لائن کے اندر کچھ بنتا نہیں' اِدھر آنا چاہیے۔جونہی مذہب کا نام لیا' تو ایک اور ہی شکل ان کی پیدا ہو جاتی ہے' ان کے لباس الگ ہوتے ہیں' ان کی شکلیں ہی الگ ہوتی ہیں۔آپ نے کبھی اس پہ غور فرمایا کہ یہ الگ کیوں ہوتی ہیں۔مولانا (عبیداللہ) سندھیؒ مولانا محمود الحسنؒ کے شاگرد تھے' بہت بڑے فاضل عالم تھے لیکن وہ ایک عرصے تک رشیا میں رہے تھے۔عمر کے آخری حصے میں جب یہاں واپس آئے ہیں' تو ذرا انقلابی ذہن لے کر آئے تھے۔بات ہو رہی تھی' یہ دلی کی بات تھی' اس دور کے' ان کے ہاں کے' مفتی کفایت اللہ' بہت بڑے مفتی تھے۔ان

سے انہوں نے کہا کہ مولانا! یہ آپ لوگوں سے الگ تھلگ لباس کیوں پہنتے ہیں۔ جیسے یہ ہم لوگ لباس پہنتے ہیں، یہ کرتہ پاجامہ، یہ اسی قسم کا آپ پہنو۔ یہ لمبے چغے اور قبائیں ہیں اور یہ الگ ہی کیوں ہیں؟ ایسے ہی ہے لباس میں کیا رکھا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں مولانا صاحب! کہا کہ اگر نہیں رکھا تو اگلی دفعہ جب جمعہ پڑھانے آئیں تو ذرا آپ مہربانی کر کے پتلون اور شرٹ پہن کر آیئے۔ اگر لباس میں کچھ نہیں رکھا ہے تو پھر تو ٹھیک ہے، آیئے پتلون شرٹ پہن کے۔ یہ بڑے عجیب شخص تھے۔ دکھتی ہوئی رگ پہ ہاتھ رکھا کہ ٹھیک ہے، لباس میں کچھ نہیں رکھا، ہم بھی سمجھتے ہیں جو آپ کہتے ہیں، وہ یہی بات ہے تو چلیے! اگلے جمعہ کو آیئے اور پڑھایئے نماز شاہی مسجد میں۔ ''وہ تو کبھی نہیں پہنیں گے۔ اپنا ایک الگ لباس، الگ وضع قطع، یہ سارا کچھ رکھیں گے۔ تاکہ مُّنۡذِرٌ مِّنۡهُمۡ (50:2) یہ ہم میں سے نہیں ہوتے، کوئی ان میں سے صاحب آئیں، یہ الگ پہچانے جاتے ہیں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں، الگ ہیں۔ یہ کون صاحب ہیں؟ جی! یہ مولانا صاحب ہیں، یہ حضرت صاحب ہیں۔ تو ہم میں سے تو نہیں ہوتے۔ آپ غور فرماتے ہیں کہ قرآن کریم ایک لفظ میں کتنی بڑی بات کہہ جاتا ہے۔ مِّنۡهُمۡ جو ہے، جو اس طرح سے قرآن کریم کی بات کرتا ہے کہ وہ مِّنۡهُمۡ ہے، باقیوں میں سے ایک ہے تو وہ تو قرآن کریم کی بات کرے گا۔ اور جو ان میں سے الگ تھلگ نظر آئے گا وہ اس کے اندر آ جائے گا جو ان کے شاعر نے کہا تھا کہ اسے الگ تھلگ ہونا چاہیے۔ اب ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ یہ مِّنۡهُمۡ نہ ہوں، منکم نہ ہوں، تم میں سے نہ نظر آئیں، الگ تھلگ نظر آئیں: ٹولہ الگ، جماعت الگ، وضع قطع الگ، القاب الگ، نام الگ۔ ہم میں سے نہیں ہیں۔ فَقَالَ الۡكٰفِرُوۡنَ هٰذَا شَىۡءٌ عَجِيۡبٌ (50:2) بہت عجیب بات ہے کہ ہم میں سے ہی آپ ہیں، ہمارے ہی جیسا ایک آدمی نظر آتے ہو اور وہ خدا کی باتیں کر رہا ہے۔ ایک تو یہ بات تھی جو ان کو عجیب نظر آتی تھی اور دوسری اہم بات جہاں سے یہ دین کی لم ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو ہر عمل کا بلکہ خیال اور ارادے تک کا بھی نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ اور یہ اعتراض ہوتا تھا کہ اس دنیا میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قسم کا ظلم اور استبداد ہوتا ہے اور یہ تو بڑی عیاشی کی زندگی بسر کرتے ہیں، کوئی بھی نہیں بھگتتا تو پھر؟ قرآن حکیم کی رو سے تو اس نے بتایا کہ زندگی یہی زندگی نہیں ہے، زندگی آگے چلتی ہے، مرنے کے بعد بھی زندگی چلتی ہے۔ یہ چھوڑ دیجیے کہ یہ اس کا اس قسم کا جو پیکر نظر آ رہا ہے، یہ نہ ہو لیکن یہ ''شے'' ہے کہ جس سے عمل سرزد ہوتا ہے، یہ آگے چلے گی۔

انسانی جسم کے اندر ''میں'' اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے اور اُسی سے مواخذہ ہے

عزیزانِ من! بات لمبی چلی جائے گی۔ یہ جسے آپ اپنا ''جسم'' کہتے ہیں، میں نے یہ گھڑی اٹھائی ہے تو ''میں'' یہ نہیں کہتا کہ میرے ہاتھ نے گھڑی اٹھائی ہے، میں کہتا ہوں ''میں'' نے گھڑی اٹھائی ہے حالانکہ ہاتھ ہی نے اٹھائی ہوتی ہے۔ ''میں'' وہاں گیا تھا حالانکہ پاؤں چل کر گئے تھے'' ''میں'' نے یہ کہا تھا حالانکہ زبان نے یہ کہا تھا۔ یہ سب کچھ کرنے والی یہ 'میں' کون ہے؟ بس یہی تو ذمہ دار ہے۔ تم نے یہ

مال چرایا تھا یا نہیں چرایا تھا؟ یہ نہیں پوچھا جاتا کہ تمہارے ہاتھوں نے یہ چرایا تھا یا نہیں۔ عمل کرانے والی چیز انسان کے اندر ایک اور ہے۔ وہ نہ اس کا ہاتھ ہے' نہ پاؤں ہے' نہ آنکھیں ہے' نہ زبان ہے۔ آپ اطمینان سے گیٹ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں' نظر آتا ہے کہ ان کے ہاں گھڑی ایک طرف رکھی ہے' ذرا ادھر ہو جائیں تو اسے اچک لیا جائے' آپ ہاتھ بڑھاتے ہیں اور اسے پاکٹ میں ڈالتے ہیں۔ یہ آپ کے ہاتھ کا کام نہیں ہے' وہ جو اندر ہے جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ اٹھا لینی چاہیے' یہ اس کا کام ہے۔ اور قرآن کریم اسی سے مواخذہ کرتا ہے اور اسی کو اس نتیجے کا حامل قرار دیتا ہے۔

دین کی بنیاد انسانی عمل اور اس کے اختیار وارادے کی راہنمائی پر موقوف ہے مگر اس پر یقین نہیں ہے

یہ ہے اسلام کی بنیاد' یہ ہے دین کی بنیاد کہ انسان کا کوئی عمل بلکہ خیال اور ارادے تک کا بھی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آپ بیٹھے ہوئے خیال تو کریں کہ ذرا یہ اٹھ کر جائے اور میں گھڑی اٹھالوں اور وہ اٹھ کر نہ جائے تو آپ نے گھڑی اٹھائی تو نہیں۔ یہ ٹھیک ہے تعزیراتِ پاکستان کی رو سے تو جرم سرزد نہیں ہوا لیکن یہ اتنا وقت جو آپ نے یہ خیال کیا' یہ ارادہ کیا' اصل جرم تو یہ تھا' یہ تو اس جرم کو بروئے کار لانے کے لیے فیصلہ نہیں ہوا' اس میں آپ کا ارادہ ناکام رہ گیا۔ جرم یہ ہے اور وہ آپ کے ہاتھ نے نہیں کیا۔ کس نے کیا ہے؟ آج کا علم جو اس کی تہ میں چلا جا رہا ہے' اور یہی ایک شے ہے جسے قرآن کریم کہتا ہے اور یہی ہے وہ چیز جو اندر فیصلہ کرتی ہے۔ اسی سے مواخذہ ہوگا' یہی آگے چلے گی۔ دوسری چیز قرآن کریم کہتا ہے کہ ان کو یہ تعجب آ رہا ہے کہ ءَ اِذَا مِتۡنَا وَ کُنَّا تُرَابًا ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ (50:3)۔ دین اسی چیز کا نام ہے' اسلام یہی یقین ہے' کہ میں اپنے ہر عمل بلکہ اپنے ہر ارادے کا ذمہ دار ہوں' اور اس کا مواخذہ مجھ سے ہوگا' یہاں کا نظامِ عدل ایسا نہیں ہے' اگر یہاں نہیں ہو سکتا تو کوئی بات نہیں' زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی ہے' زندگی آگے چلتی ہے' اور جس نے یہاں فیصلہ کیا تھا یہ چرالو' یہ کچھ کرو' وہ جو ہے وہ مرتا نہیں یا وہ مرتی نہیں وہ شے جسے آپ کچھ کہہ لیجیے' اس کا نام کچھ رکھ لیجیے' وہ آگے چلتی ہے' اسی نے فیصلہ کیا تھا' اسی سے مواخذہ ہوگا۔ یہ یقین ہے جسے ایمان بالآخرت کہتے ہیں' یہ لم ہے سارے دین کی۔ اور آپ غور کریں گے کہ یہی آج کہیں نظر نہیں آتی۔ ہم تو اس چوراہے کے اوپر جہاں Keep to the left (بائیں ہاتھ چلو) ہوتا ہے' سائیکل پہ جاتے ہوئے دور سے دیکھتے ہیں' اگر تو وہ لال پگڑی والا ہے تو Keep to the left (بائیں طرف) جاتے ہیں' قانون پسند شہری بنتے ہیں' اور اگر دیکھتے ہیں کہ وہ نہیں ہیں تو پاؤں زور سے مارنے کا فاصلہ سارا ہوتا ہے' سیٹی بجاتے ہوئے Right (دائیں جانب) کی طرف نکل جاتے ہیں۔ یعنی دیکھنے والا کوئی نہیں ہے یہی چیز ہوتی ہے' پکڑنے والا کوئی نہیں ہے' سزا دینے والا کوئی نہیں ہے۔ اگر اس کا اطمینان ہو جائے تو پھر سب کچھ جائز ہے۔

عزیزانِ من! قرآن کریم نے کہا ہے کہ دین اس ایمان کا نام ہے۔ کہا کہ یہ لوگ اسی غلط فہمی کے اندر تھے‘ اور وہ قریش تھے۔ یہ تو بڑے دبدبہ کے مالک تھے‘ استبداد کے مالک تھے۔ ان کو پوچھ کون سکتا تھا۔ اتنی بڑی مذہبی پیشوائیت ان کے ہاتھ میں تھی کہ وہ کعبے کے متولی تھے۔ نسل کے اعتبار سے قریش کا جو قبیلہ تھا‘ وہ تمام قبائل کے اوپر تھا‘ انہیں پوچھ کون سکتا تھا۔ ان سے یہ کہنا کہ نہیں! تمہارے بھی ہر عمل کا مواخذہ ہوگا‘ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ بھی جو چیز ہے بڑی عجیب سی ہے۔ یہ جو کہتا ہے کہ ذٰلِکَ رَجۡعٌۢ بَعِیۡدٌ (50:3) یہ تو بہت دور کی کوئی بات نظر آتی ہے‘ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ انسان مرتا ہے‘ اسے جا کر دفن کر دیتے ہیں اور اس کے بعد کئی دفعہ ایسا ہوا ہے‘ قبریں کھودی گئیں‘ ویسے ہی اس میں سے مردے نکلے تو دیکھا کہ مٹی ان کو کھا گئی۔ مٹی ہر چیز کھا جاتی ہے تو اس میں تو باقی ہی کچھ نہیں ہوتا۔ آگے کیا چلے گا اور جواب دہی کس کے ذمے ہوگی؟

انسانی جسم کے اندر ''میں'' کی شکل میں پایا جانے والا جوہرِ حقیقی موت کے ذائقے سے ناآشنا رہتا ہے

عزیزانِ من! کیا عرض کروں میں‘ چودہ سو سال پہلے قرآن کریم یہ بات کہہ سکتا تھا جو آج تحقیق تو یہ ہو رہی ہے‘ ابھی چلے جا رہے ہیں اس تحقیق کے اوپر‘ سائیکولوجی والے یہ شے ثابت کرنے کے لیے زیادہ آگے چل رہے ہیں کہ انسان کے اندر ایک چیز اور ہے جو اس کا جسم نہیں ہے۔ عزیزانِ من! دین کی بات ساری اتنی ہے‘ یہ تسلیم کرنا ہے کہ انسان صرف اس اپنے Physical پیکر کا نام نہیں‘ اسی مادی جسم کا نام نہیں‘ ایک اور شے بھی ہے‘ یہ ہے وہ چیز کہ جو نہ اس جسم کی پیدا کردہ ہے‘ نہ اس کے تابع رہتی ہے‘ نہ اس جسم کے فنا ہونے سے فنا ہوتی ہے۔ جو جسم ہے وہ واقعی گل سڑ جاتا ہے‘ اسے کچھ نہیں ہوتا‘ وہ آگے چلتی ہے۔ یہ تھی دین کی ساری چیز۔ اب علم کی روشنی آ رہی ہے اس طرف۔ مغرب کے علمانے‘ ان کے دانش مندوں نے‘ ان کے فلاسفرز نے‘ ان کے نفسیات کے ماہرین نے‘ اس کے وجود کو تو تسلیم کر لیا ہے۔ یہاں تک بھی آ گئے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی یہ چیز زندہ رہتی ہے۔ ان کے ہاں کا وہ بہت بڑا سائیکولوجسٹ‘ جونز[1] Survival تک تو وہ بھی پہنچ گیا ہوا ہے‘ وہ کہتا ہے کہ Immortality[2] تک ابھی مجھے سند نہیں ملی۔

مردہ جسم کے بعد انسانی ''میں'' کے متعلق چودہ سو سال پیشتر وحی کا بیان اور آج سیکولرازم کی تعریف

کیا بات ہے ان لوگوں کی! چودہ سو سال پہلے جب یہی نظر آتا تھا کہ مردوں کو دفن کیا تو مٹی انہیں کھا جاتی ہے۔ عزیزانِ من! دیکھیے! ایک لفظ میں قرآن کریم کیا کچھ کہہ گیا ہے۔ کہا ہے کہ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡہُمۡ (50:4) ان کے جسم میں سے زمین کیا کھا

---

[1] جونز‘ اے۔ ای (1879-1958) کی طرف اشارہ ہے۔

[2] اس کے لیے دیکھیے برگسان کی کتاب:. The Two Sources of Religion and Morality: p. 251

جاتی ہے اس کا ہمیں علم ہے۔ مِنۡهُمۡ ''اس کے جسم میں زمین کیا کھا جاتی ہے'' تو اس کے معنی ہیں کہ سارا کچھ نہیں کھا جاتی' جو کچھ کھا جاتی ہے اور جو تم کہتے ہو کہ ہمارے سامنے گل سڑ جاتا ہے' تو کچھ زمین کھا جاتی ہے اسے ہم جانتے ہیں۔ یہ چیز کہہ جانا کہ مِنۡهُمۡ ''ان کے جسم میں سے جو چیز زمین کھا جاتی ہے اس کا ہمیں علم ہے'' اس کے معنی ہیں کہ کوئی چیز اس میں ایسی ہے کہ جسے زمین نہیں کھا جاتی۔ چودہ سو سال پہلے یہ اعلان کیا جا رہا ہے۔ اسے موت سے کوئی گزند نہیں پہنچتا' اس تک موت کی دسترس ہی نہیں ہوتی۔ موت کی دسترس تو اس Physical Body (طبعی جسم) پر ہوتی ہے' یہ طبعی جسم طبعی قوانین کے تابع چلتا ہے۔ یہ موت ہے ہی کیا؟ یعنی گردش خون بند ہو جائے تو موت اسی کا نام ہے اور حرکتِ قلب بند ہو جائے تو موت ہے۔ یہ طبعی جسم خالصتاً ایک Material (مواد) ہے' یہ ایک Mechanical (میکانکی) چیز ہے۔ سیکولرازم اسے ہی کہتے ہیں جیسے وہ ایک مشین کا فعل ہوتا ہے۔ اور وہ ابھی ابھی دیکھ لیجیے کہ ساری بجلی کے اوپر موت واقع ہوگئی کہ نہیں۔ یہ خالصتاً مادی چیز ہے' یہاں کوئی مادی Defect (نقص) ہوا ہے۔ اس Material Defect (مواد کے نقص) کا اثر جہاں تک اس کے ساتھ کنکشن ہے' وہاں تک اس کا اثر ہے۔ وہ جسمانی مشین ختم ہوگئی۔ یہی سمجھا گیا ہے کہ انسانی جسم بھی ایک مشین ہے' اس کے پرزے ہیں' Physical Laws یا طبعی قوانین کے تابع یہ زندہ یا گردش میں رہتے ہیں' انہی Laws (قوانین) کے تابع ایک دن ان کی گردش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا نام Clinical Death (طبعی موت) ہوتا ہے کہ موت واقع ہوگئی۔

موت کے بعد مردہ انسانی جسم کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی وضاحت اور لفظ تَنۡقُصُ کا مفہوم اور نتائج اعمال

عزیزانِ من! اس انسانی جسم کو دفن کیا جاتا ہے' واقعی اس کو کیڑے کھا جاتے ہیں' مٹی کھا جاتی ہے' یہ سب کچھ ہو جاتا ہے لیکن قرآن حکیم کا یہ کہنا ہے کہ قَدۡ عَلِمۡنَا مَا تَنۡقُصُ الۡاَرۡضُ مِنۡهُمۡ (50:4)۔ یہ تَنۡقُصُ ہے۔ یہ کھا جاتی نہیں بلکہ کم کر دیتی ہے۔ یہ بہت اچھا لفظ ہے۔ انسان میں سے کیا چیز زمین کم کر دیتی ہے' یہ ہم جانتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ کچھ ایسا ہے جسے زمین کم نہیں کر سکتی۔ یہ اعلان عرب کی سرزمین سے چودہ سو سال پہلے ہو رہا ہے کہ کچھ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ان کے جسم میں سے کون سی چیزیں ہیں جو زمین کم کر دیتی ہے اور کون سی ہیں جو وہ کم نہیں کرتی۔ وَعِنۡدَنَا كِتٰبٌ حَفِيۡظٌ (50:4) اور باقی رہے یہ جو کہتے ہیں اعمال والی بات' تو ہمارے پاس تو خود ایسا ریکارڈ ہے' جو چیز باقی رہتی ہے' وہی ریکارڈ ہوتا ہے۔ اس میں انسان کے تمام اعمال محفوظ ہوتے ہیں۔ وہ کتابِ حفیظ ہے' کتابِ محفوظ ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ جسے عام الفاظ میں تم اعمال نامہ کہتے ہو' وہ تو ہر شخص کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ آج وہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور جب وہ اس کی جزا کا' اعمال کے نتائج کا' وقت آئے گا' وہ لپٹا ہوا اعمال نامہ کھول دیا جائے گا۔ اور اسے کہا جائے گا کہ تو خود ہی اس کو پڑھ اور اس کے بعد کہا کہ خود ہی حساب کر لے کہ پھر تمہیں سزا کتنی ملنی چاہیے۔ یہ تو وہی شے ہے جو یہاں اتنے فیصلے کرتی ہے۔

اسے کہا کہ اس وقت اپنے متعلق بھی وہی فیصلے کرے گی۔ یہ ریکارڈ کِتٰبٌ حَفِیۡظٌ (50:4) ہے۔ کہا کہ بَلۡ کَذَّبُوۡا بِالۡحَقِّ لَمَّا جَآءَ هُمۡ فَهُمۡ فِیۡۤ اَمۡرٍ مَّرِیۡجٍ (50:5) یہ ہے اصل نکتہ جس کی وجہ سے یہ بڑے اضطراب میں ہیں' بڑے گرداب میں ہیں کہ یہ بات ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم جو جی میں آئے کرلیں' صاحبِ قوت ہیں' ہمیں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ شخص کہہ رہا ہے کہ نہیں صاحب! بات یہ نہیں ہے' یہ تو مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے تمہارا' وہاں بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ کہا کہ اس چیز نے ان کو اضطراب میں رکھا ہوا ہے کہ اگر اس کو صحیح مان لیں تو پھر تو ہم کہیں کے نہ رہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں مانتے۔

ایمان بالآخرت کی نوعیت اور اس پر ایمان لانے کا نتیجہ

یہ بڑی اہم چیز ہے جسے قرآن حمید نے ایمان بالآخرت کہا ہے۔ یہ اس وجہ سے نہیں مانتے۔ ہم نے تو کبھی اس پہ غور ہی نہیں کیا۔ وہ تو پھر بھی کسی اضطراب میں تھے' ان کے دل میں کوئی تو خلش تھی' تو وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر یہ مان لیا تو مشکل ہو جائے گی' تو ہم نے اس کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں۔ سوچا ہوتا تو ہمارے معاشرے اس قسم کے نہیں ہوتے۔ پھر تو معاشرہ کسی اور قسم کا ہوتا۔ وہ خیمے کے اندر بڑھیا نے بچی سے کہا کہ دودھ کی ہنڈیا چولہے پہ چڑھا رہی ہو تو اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دینا۔ ہمارے ہاں عام طور پہ دودھ چڑھاتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیتے ہیں کہ وہ پانی جل جائے' دودھ نہ جلے۔ اس بڑھیا نے کہا کہ تھوڑا سا پانی ڈال دینا۔ وہ بچی کہنے لگی کہ امی! نہیں' میں پانی نہیں ڈال سکتی۔ اس بڑھیا نے کہا کہ کیوں نہیں ڈالتی؟ وہ بچی کہنے لگی: آج ہی خلیفہ نے وعظ میں یا حکم میں یہ کہا تھا کہ دودھ میں پانی نہیں ڈالنا چاہیے' یہ بری بات ہے۔ اس بڑھیا نے کہا کہ وہ خلیفہ کون سا دیکھ رہا ہے؟ اس نوجوان بچی نے کہا کہ خلیفہ نے کہا تھا' یہ خدا کا حکم ہے اور خدا دیکھ رہا ہے' امی! میں نہیں پانی ڈال سکتی۔ ❶

قلب ونگاہ کی تبدیلی اپنی ذات پر ایمان لانے سے پیدا ہوتی ہے: اُس خیمے کی بچی کی مثال

عزیزانِ من! جسے آپ اسلامائزیشن یا اسلام کہتے ہیں' وہ یہ ہوتا ہے۔ قلب ونگاہ میں ایک تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر چوراہے پہ آپ جتنے جی چاہے چوکیدار اور پولیس والے کھڑے کر دیجیے' یہ دودھ میں پانی ڈالنے سے باز نہیں آئیں گے۔ وہ ایک قلب ونگاہ کی تبدیلی جو بچی کے اندر پیدا ہوئی ہے' وہ یہ ہے۔ جس ٹینٹ میں کوئی نہیں دیکھ رہا' وہ کہتی ہے کہ امی! یہاں خدا دیکھ رہا ہے' خلیفہ نے کہا تھا: خدا کا حکم ہے اور خدا تو یہاں بھی دیکھ رہا ہے' امی! میں پانی نہیں ڈال سکتی۔ یہ ہے احیائے اسلام۔ یہی قلب ونگاہ رکھنا ہے جو آج

---

❶ یہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بڑھیا کی اپنی نوجوان بیٹی سے کہے جانے والے واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی بیگم سے کہا تھا کہ اگر اس لڑکی کی شادی نہیں ہوئی تو اسے اپنے بیٹے عاصم کے لیے مانگ لاؤ۔ جس گھر میں یہ بیٹی آجائے گی وہ گھر نور علی نور ہو جائے گا۔

ہمارے ہاں نہیں ہے۔اس کے بعد یہ چیز جو پھر آگے کرتے ہیں کہ اسلام کا احیا ہوگا' یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ قلب ونگاہ کی تبدیلی ہے۔قرآن حکیم یہ چیز کہتا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی تو وہ قوم تو ایک طرف' ہم اس کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتے' ہم بھی نہیں کرتے۔اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔اللہ اکبر! اور پھر ان کے ساتھ ہے کہ یہ یقینی چیز ہے' اس میں استثنا ہی نہیں ہوسکتی' یہ No Exception (بلا استثنا) ہے۔تو ہم بھی تبدیلی نہیں کرتے اس قوم کی حالت کے اندر' جس قوم میں قلب ونگاہ کی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی۔بات تو یہاں سے ابتدا کرنے کی ہے۔کسی نے اسلام لانا ہے' کسی نے اسلام زندہ کرنا ہے' تو پہلے قلب ونگاہ کی تبدیلی پیدا کیجیے' پھر وہ خیمے کے اندر چھوٹی سی بچی بھی پانی نہیں ڈالے گی۔لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ (50:5) ان کے دل میں تو کچھ کھٹک پیدا ہوگئی' کچھ خلش پیدا ہوگئی کہ یار! اگر یہ واقعی سچ کہتا ہے تو پھر تو بچنے کی کوئی صورت ہے نہیں' پھر تو سوچنا ہی پڑے گا۔

تعمیری سوچ کے لیے خلش کا پیدا ہونا اوّلین قدم ہوتا ہے اور مکے میں تعلیمی کیفیت

ایک لفظ قرآن کریم نے عجیب استعمال کیا ہے کہ وہ اس کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔سمجھنے سوچنے والے تھے' مبتلا ہوگئے۔ہم کشمکش میں مبتلا نہیں ہوتے۔یہ سارا کچھ' جو کچھ ہے' دن رات سنتے ہیں' ایک پروفیشن کے طریقے پہ' کہنے والے کہتے ہیں' ہم سننے والے ثواب حاصل کرنے کے لیے سنتے ہیں: نہ اُن کی حالت میں کوئی تبدیلی' نہ ہمارے قلب ونگاہ میں کوئی تبدیلی۔ان کے ہاں خلش پیدا ہوگئی تھی' ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوتی۔اب یہ بات ہے کہ یہ نظام ہوسکتا ہے کہ تمہارے یہ اعمال' تمہارے یہ افعال' تمہارے یہ خیالات بھی نتیجہ خیز ہوکر رہیں۔اب سوچیے چودہ سو سال پیشتر کی بات ہے۔پہلے تو دنیا ہی اس زمانے کی یہ تھی کہ علم کی روشنی اتنی کم تھی' پھر عرب کا ملک تھا' اسے تو آج بھی دیکھو تو لے دے کر تین چار شہر ہیں۔باقی سارا ملک ویران پڑا ہوا ہے' ریگستان ہے' یا کہیں کہیں یہ صحرا نشین جو بدو ہیں' ان کی بستیاں ہیں۔جو سب سے بڑا شہر مکہ تھا' ان کے ہاں کا مرکز تھا' تاریخ کے مطابق مکے میں صرف سترہ آدمی نوشت وخواند جانتے تھے یعنی یہ Education (تعلیم) تو بہت بڑی چیز ہے' جسے آپ Literacy کہتے ہیں' اس ملک کی یہ کیفیت تھی۔اور اس ملک میں بھی ایک شخص جسے اُمی کہہ کر پکارا گیا ہے کہ نبوت سے پیشتر وہ اتنا بھی نہیں جانتا تھا' جتنے یہ سترہ جانتے تھے۔

کائنات کے محیر العقول سلسلہ کو قانون کی زنجیروں میں جکڑنے والی ہستی انسان کو قدم قدم پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے مگر نظر نہیں آتی

اب ان لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ تم دیکھو تو سہی کہ نظام کائنات' جو چل رہا ہے' اس میں کہیں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو اسے اس طرح

چلا رہی ہو کہ سورج تمہارے سامنے عین اپنے وقت پر روز نکلتا ہے' روشنی دیتا ہے' حرارت دیتا ہے۔ تمہیں کچھ نظر آتا ہے کہ اس کے پیچھے ایسے جنات ہیں کہ وہ اس کو لیے لیے چلے آ رہے ہیں' وہ اس کو بھگاتے ہیں اور لیے جا رہے ہیں۔ تم دیکھو تو سہی بغیر کسی سہارے کے' بغیر کسی آسرے کے' بغیر کسی مرئی کشش کے' یہ کس طرح رواں دواں چلا آ رہا ہے' اپنے راستے پہ جاتا ہے' اپنے راستے پہ مڑ جاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی چیز نظر آتی ہے؟ بتانا یہ تھا کہ کوئی چیز تمہارے اندر بھی ہے۔ اب ان لوگوں کو کیسے سمجھایا جائے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ انسانی ذات یا Personality کے متعلق آج بیسویں صدی میں کچھ لوگ صرف سائیکولوجسٹ ایسے ہیں' جو اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آج بھی یہ کیفیت ہے۔ چودہ سو سال پیشتر عرب کے اندر' مکے میں بدوؤں کو یہ سمجھانا کہ ایسی چیز ہے۔ انہیں یہی سمجھایا جا سکتا تھا کہ ذرا یہ چیز جو تم دیکھ رہے ہو' اس پہ تم غور کرو کہ کوئی مرئی' Concrete, Visible' قوت تمہیں ایسی نظر آتی ہے' جو یہ کچھ تمہیں کر رہی ہے۔ بات یہی کہنی تھی کہ اس جسم کی جو مشینری ہے' اس کے اندر چلانے والی چیز تمہیں نظر نہیں آتی لیکن یاد رکھو! اس کے بغیر یہ چل نہیں سکتا۔ یہ بات تھی جو نہیں سمجھائی جا سکتی تھی۔ قرآن حکیم کا عجیب انداز ہے! یہاں بات کی اور ان سے کہا کہ اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ (50:6) ان سب کے سامنے آسمان تھا اور پھر صحرا نشینوں کے سامنے تو پوچھو نہیں کہ آسمان کس طرح کھلا ہوا ہوتا ہے۔ اور واقعی یہ صحیح ہے کہ صحرا میں جو کچھ یہ آسمان نظر آتا ہے' ہمیں تو یہ نظر ہی نہیں آتا۔ ہمارے ہاں تو یہ سارا موٹر کا دھواں ہوتا ہے جو آسمان بن جاتا ہے۔ اُنہیں آسمان نظر آتا ہے۔

نظامِ شمسی میں یہ کائناتی کرّے دیکھنے میں کچھ ہیں لیکن حقیقت میں کچھ

کہا کہ یہ آسمان تو ذرا دیکھو' یہاں کتنے عظیم الشان کرّے ہیں' اور پھر یہ چیز کتنی خوبصورت ہے۔ میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ہماری یہ جو Aesthetic Sense (جمالیاتی حس) ہے اس کا کتنا بڑا لحاظ رکھا ہے! یہ جو کرّے ہیں اگر یہ اسی شکل میں ہوں' ہمیں ایک ہی کرّہ نظر آیا ہے' ہمیں' اپنی زمین تو کرّہ نظر ہی نہیں آتا' وہ تو اپنے گھر کا صحن نظر آتا ہے' یہ چاند کا کرّہ ہے' یعنی آج تک شاعری میں مہ جبیں اور قمر اور یہ حسنِ مجسم اس کو کہتے تھے' میرا چاند ہے۔ وہ ذرا اس کا پردہ اٹھا تو نظر آیا کہ وہ کتنا بھیانک ہے' اس کو دیکھ کر ڈر آتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جتنے ستارے آپ کو رات کو اتنے خوبصورت' اتنے حسین' نظر آتے ہیں یوں آپ لپٹے ہوئے ہیں۔ وہ ستارے اگر رات کو چاند کی طرح بے نقاب ہوتے اور یہ بھیانک آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوتے' ایک دن کی نہیں' ساری عمر کی نیند اڑ جاتی۔ کیا بات ہے اس کے انتظام کی! یہ سارے اسی قسم کے کرّے ہیں جیسا کہ یہ چاند کا کرّہ ہے لیکن انتظام یہ ہے کہ ان کی نیندوں میں خلل نہ آئے۔ یہ لیٹیں اور آسمان کی طرف دیکھیں تو نہایت خوبصورت چمکتے دمکتے ہوئے ستارے' دیئے نظر آئیں' قیمتی لعل و جوہر نظر آئیں' زَيَّنّٰهَا زینت نظر آئیں۔ وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ (50:6) اور پھر ان سے کہا کہ دیکھو کہ کیا کہیں تمہیں کوئی چیز ایسی شگاف کی نظر آتی ہے جو ان کے اندر خلافِ قانون کسی طرح

بھی کارفرما ہو۔ وَالۡاَرۡضَ مَدَدۡنٰهَا وَاَلۡقَیۡنَا فِیۡهَا رَوَاسِیَ وَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِیۡجٍ (50:7) اور زمین کو تو دیکھو! گول ہونے کے باوجود ایسی چپٹی ہے کہ تمہیں کبھی احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول ہے۔ یعنی یہ کتنا بڑا انتظام ہے کہ ایک گول چیز ہے' ساری عمر ہم اس کو دیکھتے رہتے ہیں' یہ کبھی پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ گول ہے اور پھر جس تیزی سے وہ گردش کرتی ہے' چکر کاٹتی ہے صاحب! اس کے تصور سے انسان کا سر چکرا جائے۔ اس کو کبھی پتہ ہی نہیں چلتا کہ چکر کاٹ رہی ہے۔ ہمارا جی چاہے' ادھر کو چلے جائیں' ہمارا جی چاہے اُدھر کو چلے جائیں' اس کے چکر کوئی فرق ہی نہیں پیدا کرتے۔ یہ کیا نظام ہے! کہا کہ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ یہ زمین کس طرح سے تمہیں چپٹی نظر آ رہی ہے۔ اور پھر اس کے اندر تم پہاڑ دیکھو۔ بظاہر تو نظر آتے ہیں کہ یونہی بڑے بڑے ٹیلے کھڑے ہیں۔ تمہیں پتہ ہے زندگی کا مدار ان پر ہے' سارا پانی ان کی نہج سے برستا ہے' ان کے اوپر برف جمتی ہے' ندیوں نالوں میں وہ پگھل کر آتا ہے' دریا بنتے ہیں' تمہارے ہاں یہ کھیتیاں ہوتی ہیں' ان میں طرح طرح کی سبزیاں اور پھل بھی اگتے ہیں۔ سوچو تو سہی کہ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ یونہی ٹیلے سے کھڑے ہیں۔ ان ٹیلوں کے انتظام پر تمہاری ساری زندگی کا دارومدار ہے۔ یہ کیا ہے؟ کہا کہ تَبۡصِرَةً وَّذِكۡرٰی لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ (50:8) جو شخص بھی پلٹ کر ان کی طرف دیکھتا ہے۔ کیا لفظ ہے صاحب! جو رواں دواں چلا جا رہا ہے' اسے تو نہیں کچھ نظر آتا ہے' ذرا پلٹ کے جو دیکھنے والا ہے' میں کہتا ہوں ادبی اعتبار سے بھی قرآن حمید کا انداز اگر دیکھیں اور عربی زبان میں تو پوچھو نہیں' اسی لیے وہ عرب وجد میں آ جاتے تھے' پلٹ کے جو دیکھنے والا ہے اسے نظر آئے گا تَبۡصِرَةً یہ اس کی آنکھیں کھول دے گا۔ وَّذِكۡرٰی اور جنہیں یہ یونہی اینٹ اور پتھر دکھائی دے رہے ہیں' وہ دیکھے گا کہ اس میں تو بڑی بڑی حقیقتوں کی یاد دہانیاں ہیں۔

یہ وہ کائناتی قوتیں (ملائکہ) ہیں جو نظر نہیں آسکتیں

کس انداز سے وہ اس طرف لا رہا ہے کہ انسان' یہ Physical Body (طبعی جسم) ہی نہیں ہے' بلکہ اس کے اندر ایک چیز اور بھی ہے اور وہ قوت ہے اور قوت کبھی نظر نہیں آیا کرتی۔ یہ سارے قوت کے مظاہرے ان کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اور بتا یہ رہا ہے کہ اس کے یہ سارے فوائد تو تمہیں نظر آتے ہیں' وہ قوت تمہیں نظر نہیں آتی' جو ان کے پیچھے کارفرما ہے اور جن کی بنا پہ یہ مصروفِ گردش ہیں۔ یہی کیفیت انسان کے جسم کی ہے۔ تم اس کے اس پیکر کو دیکھتے ہو' یہ جو Physical Body (طبعی جسم) ہے' محسوس پیکر نظر آتا ہے' اس کے اندر یہ جو قوت ہے وہ نظر نہیں آتی۔ تمہیں تو باہر کی قوت نظر نہیں آتی' اپنے اندر کی قوت کیا نظر آئے گی!!

عزیزانِ من! درس کا وقت پورا ہو گیا۔ ہم سورۃ قٓ کی آیت 8 تک آ گئے' 9 ویں سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

دوسرا باب: سورۃ قٓ (آیات 9 تا 25)

عزیزانِ من! آج جون 1982ء کی 25 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ قٓ کی آیت 9 سے شروع ہو رہا ہے: (50:9)۔ سابقہ درس میں دو باتیں سامنے آئی تھیں اور دونوں ہی بڑی انقلاب آفریں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے چونکہ قرآن کریم پہ غور وتدبر تو چھوڑ دیا ہے اس لیے ہمیں معلوم ہی نہیں، ہم اس کا احساس ہی نہیں کرتے کہ اس نے دنیائے انسانیت میں کتنے انقلاب آفریں اقدامات کیے ہیں، کیسے کیسے نظریات دیئے ہیں جو واقعی ایک انقلاب برپا کرنے والی چیز ہے۔ پہلی چیز ان کی طرف سے اعتراض ہوا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ شخص جو نبوت کا یا رسالت کا دعویٰ کرتا ہے یہ ہمارے ہی جیسا ایک انسان ہے۔ کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا انسان ہوں اور بار بار اس کو کہا گیا، کبھی ہم نے غور نہیں کیا کہ یہ بہت بڑی انقلابی چیز ہے۔

اس سے پہلے اور آج بھی، جہاں بھی، مذہب کا اثر ہے، انبیائے کرام کا سلسلہ تو خیر ختم ہوگیا، ان کے بعد بھی جن لوگوں کو ہم سمجھتے ہیں کہ روحانیت میں ان کے کچھ مقامات ہیں، انہیں اپنے جیسا انسان نہیں سمجھتے، وہ بھی کچھ الگ تھلگ سے ہوتے ہیں۔ ان سے ایسی چیزیں سرزد ہوتی ہیں جو انہی سے مختص ہوتی ہیں۔ کرامات ہوتی ہیں، ان کے ایسے خصائص ہوتے ہیں جو عام دوسرے انسانوں کے نہیں ہوتے۔ یہ شخصیت پرستی ہے، یہ چلی آرہی تھی۔ انسان کا شروع، ابھی عہدِ جاہلیت میں تھا، تو اس زمانے میں اس میں شخصیت پرست کی رائے تھی، اس لیے وہ چلی آرہی تھی اور قرآن کریم نے آکر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو بار بار یہ کہا کہ یہ ٹھیک ہے، وحی تو خدا کی طرف سے آتی ہے جس میں اس کے اپنے کسب و ہنر کا کوئی دخل نہیں ہے، وہ ایک وہبی چیز ہے، خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے، یہ مہبط وحی ہے اور اس کے بعد یہ تمہارے جیسا ایک انسان ہے۔

کسی شخص کو فوق البشر تسلیم کرنا شخصیت پرستی سے کم نہیں اور حیاتِ آخرت پر ایمان ایک انقلاب

یہ حضور ﷺ کے متعلق بہت عظیم اعلان ہے اور یہ چیز کہ اس کے بعد نبوت کا، نبی ہونے کا، تو خاتمہ ہوگیا، اس کے بعد نبی ہو نہیں سکتا اور جو آخری نبی ہے اس کے متعلق بار بار یہ بات کہی ہے کہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہے، اپنے جیسے انسان کی پرستش نہیں ہوتی۔ یہ شخصیت پرستی ہوتی ہے۔ جہاں کسی انسان کو، دوسرے انسانوں سے مختص الگ تھلگ فوق البشر تسلیم کیا جائے، وہاں شخصیت پرستی ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بہت بڑا انقلاب ہے۔ ساری دنیا اس میں جکڑے چلی آرہی تھی، آج بھی جکڑی ہوئی ہے، ہم خود باقیوں سے آگے آگے ہیں جن کے ہاں یہ انقلاب برپا ہوا تھا۔ پہلی چیز تو یہ تھی۔ دوسری چیز یہ تھی جس پہ ان کے تعجب والی بات ہو رہی تھی کہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی، مرنے کے بعد بھی زندگی ہے، جسے ہم حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ دین کا سارا ماحصل جسے "پنجابی وچ تت کڈیا ہویا کیندے نیں" (جسے پنجابی زبان میں ملخص کہتے ہیں) وہ حیاتِ آخرت پہ ایمان ہے۔ یہ یونہی ایک نظری چیز نہیں ہے۔

ایمان کی قوت تو انسان میں ایک اندرونی انقلاب برپا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! معاف رکھیے ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ ایمان ہوتا کیا ہے اور وہ کرتا کیا ہے۔ انقلاب کیا برپا کرتا ہے؟ انسان کے اندر کی زندگی کو کس طرح بدل دیتا ہے؟ اس لیے ہمیں یہ معلوم نہیں کہ حیاتِ آخرت کا مفہوم کیا ہے، یہ کرتا کیا ہے؟ انسان کے اندر حیاتِ آخرت کی ایک چیز تو یہ ہے کہ فلسفیانہ طور پر یا آج کل کے دور میں، جو زیادہ سے زیادہ سائیکلوجی آگے بڑھی ہے، Psychological یا Physical بھی سہی، دلائل اس قسم کے آجائیں کہ مرنے کے بعد واقعی زندگی مل سکتی ہے تو یہ اس کے محض فلسفیانہ یا طبیعانہ دلائل ہونگے

کہ یہ زندگی اس کو مل جاتی ہے۔ اس کا یہی اتنا ہی فائدہ ہوگا کہ ایک مسلمہ جو ہمارا ہے' اس کے حق میں تو ہمیں علمی دنیا سے' غیر مسلموں کی طرف سے بھی' دلائل مل جائیں گے' ہم ان دلائل کے محتاج نہیں ہیں' ہمارا تو اس کے بغیر بھی ایمان ہے' البتہ اس سے ایمان کو تقویت پہنچ جاتی ہے' دوسروں سے بات کرنے کے لیے ہمیں گنجائش نکل آتی ہے کہ یہ دلائل میسر آ جائیں۔

موجودہ زندگی میں ایمان کی بنیاد پر پیدا ہونے والے انقلاب کی نوعیت اور ہمارے ہاں کا قانون

قرآن کریم کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ تمہیں یہ دلائل میسر آ جائیں اور فلسفیانہ سطح پر تم دوسروں کے ساتھ بحث کر سکو کہ ہاں صاحب! دیکھ لیجیے ہم نے ثابت کر دیا کہ مرنے کے بعد زندگی ہے۔ بات یہ نہیں ہے۔ وہ حیاتِ آخرت کو ایک بڑا انقلابی اقدام کہتا ہے۔ اس کے نزدیک تو یہ ہے کہ انسان کا کوئی کام' جو وہ اس دنیا میں کرتا ہے' حتیٰ کہ اس کا ارادہ' اس کی خواہشات' اس کے تصورات' تک بھی اپنا نتیجہ پیدا کرتے ہیں' اچھا نتیجہ یا برا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ نتیجہ اسے بھگتنا پڑتا ہے' اس سے مفر نہیں ہے' وہ بھاگ نہیں سکتا۔ اب بھاگنے کے لیے تو یہاں بڑا آسان تھا کہ موت آئی اور انہوں نے کہا کہ مرنے کے بعد تو کسی پہ کوئی قانون ہی لاگو نہیں ہوتا۔ یہ قانون جو ہمارے ہاں ہے' اس میں ایک یہ شق ہوتی ہے کہ موت کے بعد کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ انہوں نے کہا کہ انسان مر گیا اس کا معاملہ ختم ہو گیا لیکن جسے کہا گیا کہ انسان کا کوئی عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والا خیال بھی' نتیجہ مرتب کیے بغیر نہیں رہ سکتا' اس کا مواخذہ ہوگا اور اس کو بھگتنا پڑے گا' تو یہ سوال یہاں سے ہوا کہ موت سے نتائج بھگتنے کا چھٹکارا نہیں ہو جائے گا' مرنے کے بعد زندگی مسلسل چلے گی' اور یہ جو تمام اعمالِ انسانی ہیں' یہ جو انسان کے اندر ایک شے ہے' جسے وہ انسانی نفس یا ذات کہتا ہے' وہ جسم کے مرنے سے مر نہیں جاتی۔ وہی ہے جو حقیقت میں تمام اعمالِ انسانی کی محرک ہوتی ہے' وہی فیصلے کرتی ہے' اسی سے مواخذہ ہوتا ہے' جسے میں کہتے ہیں۔ وہ ''میں''❶ بھگتنا ہے۔ ہاتھ میرا چوری کرتا ہے تو ہاتھ کو سزا نہیں ملتی' مجھے ملتی ہے کیونکہ ''میں'' نے وہ چوری کی تھی۔ بہرحال یہ بات تو میں نے عرض کیا تھا کہ لمبی ہے' ہوتی رہے گی۔ انسانی ذات پہ جب بات آئے گی' تو یہ آگے چلتی ہے اور انسان کے ہر عمل کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ جسے آپ حیات بالآخرت کہتے ہیں' قرآن حمید نے اس کا تقاضا ہر غیر مسلم سے کیا ہے حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ تک سے بھی کیا ہے اور وہ تو حیات بالآخرت مانتے ہیں اور اصل یہ ہے کہ دنیا میں بدھ مت جیسے مذہب کے سوا جن کے ہاں فنا ہی ہے' ان کے ہاں یعنی زندگی کا خاتمہ فنا پہ ہے' ان کے ہاں معراجِ انسانیت فنا ہو جانا ہے۔

---

❶ I- am- ness

خدا تعالیٰ کی ذات کے علاوہ اُخروی زندگی پر قرآنِ حکیم کی راہنمائی

بدھ مت کے علاوہ باقی تمام مذاہب کسی نہ کسی شکل میں مرنے کے بعد کی زندگی کو مانتے ہیں۔ وہ جب مانتے ہیں تو پھر قرآن حکیم نے ان سے تقاضا کیوں کیا؟ وہ بات دوسری طرف چلی جائے گی' وہ تو ان سے خدا پر ایمان لانے کا بھی مطالبہ کرتا ہے حالانکہ یہ جو اہل مذاہب ہیں وہ خدا کو تو جانتے ہیں لیکن ماننا اور ماننا فرق ہے۔ میں پھر اپنے متعلق یہ عرض کر دوں کہ ہم اس فرق کو بھی نہیں پہچان سکتے۔ ہم نے کبھی سمجھا ہی نہیں ہے کہ ہم جو کہتے ہیں' اللہ پر ایمان ہے تو اس کے معنی کیا ہیں' کبھی کھڑے ہو کر سوچا ہی نہیں لیکن بہر حال قرآنِ کریم ان سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور کئی دفعہ میں یہ عرض کر چکا ہوں۔ قرآنِ کریم مسلمانوں سے بھی اللہ پر' اس کی کتاب پر' اس کے رسول' اور آخرت پر' ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ لوگ حیاتِ آخرت کو مانتے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک ہی اس کے لیے معیار مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا (2:137) ایمان لاؤ جس طرح سے تم ایمان لائے ہو۔

قرآنِ حکیم کا عملی زندگی میں خدا پر یا قیامت پر ایمان لانے کا تقاضا کیوں؟

قرآن حکیم کی رو سے جب تک وہ اس طرح سے ایمان نہیں لائیں گے' ان کو صاحبِ ایمان نہیں سمجھا جائے گا' تو گویا خود ایمان کا بھی ایک معیار مقرر کر دیا۔ یہ نہیں ہے کہ میں اپنی مرضی کے مطابق جیسے جی چاہے' ایمان لے آؤں' دوسرا کوئی اور اپنی مرضی کے مطابق' کوئی اہلِ مذہب اپنے مذہب کے عقیدے کے مطابق' دوسرا اپنے مطابق۔ اس نے کہا کہ اب خدا کی طرف سے آخری اتھارٹی آ گئی' اب صرف ایک ہی باقی ہے۔ وہ قرآن حکیم ہے' جس طرح سے یہ کہتا ہے اس طرح سے اگر ایمان لایا جائے گا تو وہ ایمان کہلائے گا ورنہ کسی کا زبانی دعویٰ کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں' قابلِ قبول نہیں ہوگا حتیٰ کہ مسلمانوں سے جب کہا گیا ہے کہ تم بھی ایمان لاؤ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کھڑے ہو کر یہ سوچو کہ قرآن حکیم ایمان کہتا کس کو ہے؟ کیا ہمارا یہ زبانی دعویٰ جو ہم چار الفاظ دہرا دیتے ہیں کہ ہمارا بھی ایمان ہے' کیا یہ اس کے مطابق ہے؟ وہ یہ کہتا ہے کہ دنیا کے اہلِ مذاہب آخرت کی زندگی کو مانتے ہیں۔ وہ یوں کہیے کہ مرنے کے بعد کی ایک زندگی کو مانتے ہیں کہ پھر زندگی ہوتی ہے۔ صاحب! کاہے کے لیے مانتے ہیں؟ دو دو فقروں کے اندر فرق نظر آ جائے گا کہ وہ کیوں ان سے تقاضا کرتا ہے کہ تم بھی ایمان لاؤ جیسا قرآن حکیم کہتا ہے ویسے ایمان لاؤ۔

یہودیوں کا آخرت میں جنت کا حصول صرف بنی اسرائیل کے لیے ہی مختص ہے

یہودی مرنے کے بعد کی زندگی پر یہ کہنے کے لیے ایمان لاتے ہیں کہ جنت میں صرف بنی اسرائیل کے لوگ جا سکیں گے' کوئی اور نہیں جا سکے گا تو ان کے آخرت پر ایمان کے معنی ہیں کہ بنی اسرائیل کا جنت میں جانا اور غیرِ بنی اسرائیل کا جہنم میں جھونک دیا جانا' یہ ہے

ان کا مقصد۔قرآن حکیم اس کی نفی کرتا ہے کہ یہاں نسل کا سوال نہیں' قوم کا سوال نہیں' تو گویا ان کا آخرت پہ ایمان صرف اس مقصد کے لیے ہے کہ بنی اسرائیل جنت میں اور غیر بنی اسرائیل جہنم میں ہونگے۔

جنت کے حصول کے لیے نصاریٰ کا حضرت مسیحؑ کے خوں بہا پر ایمان لانا ضروری ہوگا: عیسائیت کا قول

نصاریٰ کا بھی مرنے کے بعد کی زندگی پر ایمان ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟ اس لیے کہ جو شخص حضرت مسیحؑ کے صلیب دیئے جانے اور ان کے کفارہ پر ایمان رکھے گا وہ جنت میں جائے گا' جو اس پہ ایمان نہیں رکھے گا وہ جہنم میں جائے گا تو وہ حیاتِ آخرت کو مانتے ہیں اس لیے کہ وہاں جو عیسائی کفارے پر ایمان رکھتے ہیں' وہ جنت میں جائیں اور غیر عیسائی جتنے بھی ہیں وہ جہنم میں چلے جائیں۔ وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

آواگون کا عقیدہ تو ہندو دھرم کا بنیادی تصور ہے: بتیس کروڑ چکر ہیں

عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم کیوں ان سے بھی مطالبہ کر رہا ہے؟ یہ ہمارے قریبی ہندو دھرم والے ہیں' ان کا تو پوچھیے ہی نہیں' ان کا سارا دھرم ہی توہم پرستی ہے۔ ان کے ہاں یہ تناسخ یا آواگون یا جُون کا مسئلہ ہے۔ وہ مانتے یہ ہیں کہ ہر مرنے والا انسان مرنے کے بعد پھر پلٹ کر اسی دنیا کے اندر آتا ہے لیکن معلوم نہیں کہ وہ کس شکل میں آتا ہے' کچھ چوہے کی شکل میں' گدھے کی شکل میں' شیر کی شکل میں' انسانوں میں سے شودر کی شکل میں' وہ دنیا میں پھر آتا ہے اور یہ چکر ہے' پھر وہ مر جاتا ہے' پھر آتا ہے' پھر مر جاتا ہے' پھر آتا ہے تو بتیس کروڑ دفعہ ان کو ایک چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی طرح سے وہ آتا رہتا ہے اور یہاں سے جاتا رہتا ہے۔ آواگون کے یہی معنی ہیں' آتا ہے اور جاتا ہے لیکن اس آنے والے کو نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے میری زندگی کیا تھی اور میں کیا تھا' نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھے جواب چوہے یا کتے کی شکل میں دنیا میں بھیجا گیا ہے' تو کون سے میں نے جرائم کیے تھے جن کی پاداش میں یہ کیا گیا ہے' اس کا بھی علم نہیں ہوتا۔ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا اپنی پچھلی زندگی کا' پچھلی زندگی کے اعمال کا' نہ اس کا کہ مجھے کیوں یہ شکل دیدی گئی۔ بس یہ اتنی سی چیز ہے۔ وہ بھی جو حیوانات ہیں' ان کو تو یہ بھی نہیں کہ وہ سمجھ بھی لیں کہ ہمیں کیوں ایسا کیا گیا ہے۔ انسانوں کے متعلق البتہ انہوں نے یہ کہا کہ شودروں کو' ویشوں کو' یہ سمجھ لینا چاہیے کہ شودر کو اگر بدترین انسان پیدا کیا گیا ہے' وہ اس لیے کہ انہوں نے اپنے پہلے جنم میں اس قسم کے برے کام کیے تھے۔ اس کی پاداش میں ان کو یہ کچھ بنایا گیا ہے' انہیں کچھ پتہ نہیں ہے کہ ہم پہلے جنم میں کیا تھے' ہم نے کیا کام ایسے کیے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ بس تمہیں اس پر ایمان رکھنا چاہیے' یقین رکھنا چاہیے کہ تم نے جو کیا تھا' ان کے ہاں یہ صورت ہے' کچھ اس کی تک بھی بنتی ہے!!!

قرآنِ حکیم میں ایمان بالآخرت کے معنی اور منافقت کی ایک جیتی جاگتی عملی زندگی کا نقشہ

قرآن حکیم میں ایمان بالآخرت کے کیا معنی تھے؟ وہ کہتا یہ ہے کہ یہ زندگی مسلسل چلتی ہے اور انسان اس زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اور اس کے ان کاموں کا نتیجہ اس دنیا کے اندر ایسے مواقع نہیں آتے کہ وہ بھگتے۔ وہ نتائج رہ جاتے ہیں' تو ان کا مواخذہ وہاں ہوگا۔ ایسے نہیں ہوگا کہ اس کو کچھ علم ہی نہ ہو' اس کو خود معلوم ہوگا کہ میری پہلی زندگی کیا تھی' میں اس میں کیا تھا' میں نے کیا کیا تھا' جس کے خلاف کیا تھا وہ بھی موجود ہوگا' اس کا بھی اسے علم ہوگا' وہ ماحول موجود ہوگا' وہ اس کے گواہ ہونگے وہ جو میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ اس سے بڑا جہنم' عزیزانِ من! اور کیا ہوگا کہ مثلاً میں آپ کے سامنے بڑا معتبر بنا بیٹھا ہوں' قرآن حکیم کا درس دیتا ہوں' ویسے بھی یہ عام ایک بناوٹ کے لحاظ سے ہی سہی' منافقت کے لحاظ سے بڑا نیک بنا ہوا ہوں' متقی پرہیزگار بنا ہوا ہوں' اندر بھی میری زندگی بالکل اس کے خلاف منافقت کی زندگی ہے' اس دوست سے کہتا ہوں کہ میں تو تمہارا ہمیشہ کے لیے بہی خواہ ہوں' دل میں کہتا ہوں کہ میرا بس چلے تو اس کو خنجر گھونپ دوں۔ یہ وہاں ہونگے اور یہ جو میرے دل میں ان کے متعلق خیالات گزر رہے ہونگے' وہ ان کے سامنے آئیں گے۔ ان کے سامنے میرا کیا حشر ہوگا؟

آپ سوچیے تو سہی' اس سے بڑا جہنم اور کیا ہوسکتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک کہے گا کہ او ساری زندگی تم نے ہمارے ساتھ اس منافقت میں بسر کی' بدترین دشمن! ہمارے منہ پر ہمارے ساتھ' اس قدر ہمدردانہ اور دوستانہ تعلقات رکھنے والے! امانتوں میں خیانتیں ہوں جن کا کسی کو علم نہیں ہے' وعدے جھٹلائے ہوئے ہیں جن کا کسی کو علم نہیں ہے' ہم اطمینان سے سمجھتے ہیں کہ کسی کو علم تو ہے ہی نہیں' بس ٹھیک ہے یہ سب کچھ۔ یہ ساری چیزیں سامنے آئیں گی' مکر نہیں سکے گا' خود اعتراف کرے گا کہ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے دل میں اس کے خلاف یہی سوچا تھا' میں نے یہی تدبیریں کی تھیں' اور وہ کامیاب نہیں ہوئی تھیں' وہ ساری تدبیروں کا خود اعتراف کرے گا' وہاں وہ موجود ہونگے۔ یہ ہے وہ فرق۔ اس کے بعد اس کے مطابق نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ یہ ہے حیاتِ آخرت۔ آپ کہیے کہ فلسفیانہ طور پہ دلائل میسر آجانا تو کسی کام کی بات ہی نہیں۔

دنیا کے کسی مذہب میں بھی آخرت کا یہ تصور نہیں ہے جو قرآن حکیم دیتا ہے اور اسی لیے وہ دنیا کے ہر اہلِ مذہب اور غیرِ مذہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ اگر اس طرح سے اس بات پر' مرنے کے بعد کی زندگی میں تم ایمان لاؤ کہ جو باتیں میرے دل میں بھی گزری تھیں' نگاہ کی خیانتیں اور دل میں گزرنے والے خیالات تک بھی' جنہیں میں نے ساری دنیا سے چھپا کر رکھا ہوا تھا اور میں ان کی نگاہوں میں معتبر بنا ہوا تھا' وہ سارے کے سارے سامنے آئیں گے اور ہر ایک کے سامنے آئیں اور وہ موجود ہونگے جن کے ساتھ میں نے دنیا میں یہ کچھ کیا ہوا ہوگا اور مجھے ان کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ یہ ہے حیاتِ آخرت۔

حیاتِ آخرت کا قرآنی مفہوم جنتی معاشرے کی نوید ہے اور دین کا استحکام بھی

عزیزانِ من! کتنے ہیں ہم میں سے جن کا آخرت پر یہ ایمان ہے جو مطالبہ کرتا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ...... (4:136) اے وہ جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو! او ایمان لاؤ قرآن کے مطابق۔ وہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو ایمان والے کہتے ہو ان سے کہتا ہے کہ او ایمان لاؤ۔ یہ ایمان لاؤ' ہے اس قسم کا جو ایمان ہو تو یہی معاشرہ جنت بن جائے عزیزانِ من! اگر ہر شخص کو معلوم ہو کہ جو میں زبان سے کہتا ہوں' وہ تو ایک طرف رہا' میرا دل اور زبان ہم آہنگ ہونے چاہئیں' اس کے خلاف جو میرے دل میں خیال گذر رہا ہے اس کا بھی مجھ سے مواخذہ ہوگا اور اس کے سامنے آ جائے گا کہ تمہارے خلاف میں نے دل میں یہ خیال قائم کیا تھا یعنی یہی چیز کچھ چھوٹی بات نہیں' عزیزانِ من! کسی کے منہ پہ سامنے جھوٹا پڑ جانا' یہاں اس کی زندگی میں بھی دیکھ لیجیے اس پر کس قدر ندامت ہوتی ہے اور یہ چیز علی النشر سامنے آئے گی' کوئی مکر نہیں سکے گا' خود اعتراف کیا جائے گا۔ اس وقت اعمال نامہ تمہاری گردن میں لپٹا ہوا ہے' اُس وقت کھل جائے گا' تم سے کہا جائے گا کہ اس کو خود پڑھو' پڑھنے کے بعد کہا جائے گا کہ خود حساب کرو کہ اب تمہارے ساتھ کیا کیا جائے۔ یہ ہے ایمان بالآخرت تو اب آپ یہ سمجھے کہ یہ قرآنِ کریم میں یوں ہے۔ اللہ اور آخرت حقیقت میں ایمان کے دو ستون گنائے ہیں' اور بار بار دنیا کے تمام انسانوں سے تاکید کی ہے خواہ وہ اہلِ مذہب ہوں یا نہ ماننے والے ہوں کہ جو ایمان بالآخرت ہے' وہ ہے دین کا استحکام۔

دنیا بھر کی تعزیرات ایک طرف اور حیاتِ آخرت پر ایمان دوسری طرف' پلڑا دوسری طرف ہی جھکے گا

حقیقت میں یہ اسلامائزیشن' اسلامی قوانین' اسلامی تعزیرات' یہ جتنی ساری چیزیں ہم کر رہے ہیں' عزیزانِ من! یہ کوئی نتیجہ نہیں برآمد کر سکتیں تاوقتیکہ یہ ایمان بالآخرت دلوں کے اندر نہ پہلے پیدا کیا جائے اس کے بعد تو پھر ضرورت ہی نہیں رہتی' نہ کسی ہتھکڑی والے کی اور نہ کسی پھانسی والے کی' وہ تو انسان خود اپنے اندر ایسی پھانسی محسوس کرتا ہے کہ پوچھو نہیں' اس کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ وہ جو میں نے کہا تھا کہ وہ بچی خیمے کے اندر رات کی تنہائیوں میں بھی ماں کے کہنے پہ دودھ میں پانی نہیں ڈالتی تھی کہ نہیں' اماں! خلیفہ نے کہا تھا کہ یہ خدا کا حکم ہے اور کہا تھا کہ خدا دیکھتا ہے' اس وقت اگر خلیفہ نہیں بھی دیکھ رہا' کوئی بات نہیں' خدا دیکھتا ہے۔ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ اس صدرِ اوّل کے اندر صاحب! ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے حضرت عمرؓ کو مجسٹریٹ مقرر کر دیا' سال کے بعد انہوں نے کہا کہ کاہے کو مقرر کر دیا ہے' سال بھر میں کوئی مقدمہ ہی نہیں آیا' تو میں کاہے کو بیٹھا ہوا ہوں یہاں؟ کیوں مقدمہ آئے گا؟ ان کا اس چیز پر ایمان تھا' عزیزانِ من! پھر ان عدالتوں میں مقدمے کاہے کے لیے جائیں گے' کون جرم کرے گا' اس کے بعد کوئی پاگل ہی ہوگا کہ کچھ ایسی صورت ہو۔

معاشرے کی تبدیلی کا دارومدار قلب ونگاہ کی تبدیلی کا رہینِ منت ہوتا ہے اور ہم ڈور کو سلجھا رہے ہیں' سرا ملتا نہیں

یہ ہے وہ انقلاب جو قرآن حمید ذہنی اور قلبی طور پر پیدا کرنا چاہتا ہے' یہ ہیں وہ لوگ جو اسلامی معاشرہ قائم کرتے ہیں' یہ افراد ہی معاشرہ ہوتے ہیں' معاشرہ خود ان کے ہاتھوں قائم ہوجاتا ہے جو کسی دوسرے کے خلاف دل میں بھی نہیں کچھ سوچے گا' اسلامی معاشرہ تو اس کی بنا پر خود قائم ہوجائے گا' جو شخص ہر ملنے والے سے کہتا ہے کہ السلام علیکم' میں تمہارے لیے سلامتی چاہتا ہوں اور صرف زبان سے نہیں کہتا' دل سے کہتا ہے کہ میں تمہارے لیے ہر طرح کی سلامتی چاہتا ہوں' ہر ملنے والے سے واقف ناواقف' کس نا شد' اس معاشرے کا جو ہر فرد ہے وہ یہ کہتا ہے اور وہ بھی جواب میں کہتا ہے وعلیکم السلام' میں بھی تمہارے لیے سلامتی چاہتا ہوں' صاحب! تو اندازہ لگایئے کہ جس معاشرے میں ہر ملنے والا دوسرے ملنے والے سے یہ ایسی چیزیں زبانی نہیں کہہ رہا' دل کی گہرائیوں سے' ایمان کے درجے پہ' کہہ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے کہ اس کا مواخذہ مجھ سے ہوگا جو میں کہہ رہا ہوں' سوچیے تو سہی معاشرہ اسلامی بن جاتا ہے یا نہیں۔ جسے آپ کہتے ہیں وہ یہ ایمان پیدا کرتا ہے۔

ایمان قلب اور نگاہ میں ایک تبدیلی کا نام ہے۔ قرآن حکیم نے جو کہا ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا نہیں کرتی ہم بھی اس کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے' جو جی میں آئے کرکے دیکھ لیجیے' تو یہ تو خدا کے خلاف چیلنج ہے کہ ہم قلب ونگاہ میں تبدیلی پیدا کیے بغیر معاشرے میں کیسے تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ خدا کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11) ارے تم تو ایک طرف' خدا بھی نہیں کرتا۔ کہتا ہے ٹھیک ہے' خدا نہیں کرسکتا' نہ کرے ہم کرکے بتا دیں گے' ٹھیک ہے جی' بات چل رہی تھی حیاتِ آخرت کی' قرآن کریم سمجھا رہا تھا عرب کے بدووں کو اتنا سا مسئلہ۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پلیٹو کے زمانے سے اس پہ گفتگو ہونی شروع ہوگئی قریب قریب ہر فلاسفر نے اس کے اوپر گفتگو کی ہے۔ مسئلہ ہی ایسا ہے یہ اس وقت سے لے کر آج تک اس پہ گفتگو ہوتی چلی آرہی ہے اور اب بھی ڈور کر سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں۔

مومنانہ فراست اور ایمان کی پختگی نظامِ کائنات پر غور وفکر کے بغیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی

چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین کے اندر' جو تاریک ترین خطہ تھا' وہاں کے بدووں کو سمجھایا جارہا ہے' تو پہلی چیز تو یہ سمجھائی' بات کہنی تو یہ تھی کہ یہ ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم آنکھوں سے دیکھو' صرف اسی پہ ایمان لاؤ' علامات پر ہی ایمان لایا جاتا ہے۔ پہلی چیز یہ کہی کہ

یہ جو اتنے عظیم الشان کرّے ہیں' آفتاب کو تو دیکھو تم اس کی روشنی کو دیکھتے ہو' تم اس کی حرارت کو سمجھتے ہو' تم اس کی رفتار کو دیکھتے ہو' طلوع و غروب کو دیکھتے ہو' اس کے راستے کو تو دیکھتے ہو' کیا وہ قوت بھی تمہیں نظر آتی ہے جو اس سورج سے یہ سب کچھ کرا رہی ہے؟ کیا بات ہے' یہ بدو تو ایک طرف یہ تو آج کا جو اٹامک انرجی کا Scientist ہے' وہ بھی اس قوت کو دیکھ نہیں سکتا' اس کی جتنی علامات ہیں ان سے ہی وہ پہچان کر آگے چل رہا ہے' دیکھنے کی بات آج بھی نہیں ہے۔ کہا کہ تم یہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں دکھاؤ تو سہی ذرا کہ ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں' وہ کیسے اٹھتے ہیں؟ کہا کہ یہ تم اتنی سی بات تو بتاؤ ذرا' آپ اندازہ لگائیے چودہ سو سال پہلے کے بدو کو بھی دلیل دی گئی' آج کے اٹامک انرجی کے Scientist کو بھی دی گئی کہ دیکھنا ہی اگر تم کہتے ہو' تو تم ذرا بتاؤ دیکھتے ہو اس انرجی کو' یہ انرجی جو ہے' وہ تو نظر ہی نہیں آتی' محسوس ہی نہیں ہوتی' انرجی تو بڑی آگے کی چیز ہے' یہ الیکٹرک کرنٹ جو ہے جب تک کسی شے کے اندر یوں نہ ہو' اس وقت تک آپ کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کرنٹ ہے۔ کسی کنکریٹ محسوس شے کے اندر وہ کرنٹ آتی ہے تو پھر وہ محسوس ہوتی ہے' اس سے الگ ہٹ کر کرنٹ محسوس نہیں ہوتی' دکھائی نہیں دیتی۔ قرآن کریم نے کہا کہ تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم آنکھوں سے دیکھیں گے' تو پھر مانیں گے' ان چیزوں کو تو ذرا دیکھ کر۔ بتاؤ اگلی بات یہ تھی کہ واقعی زندگی پیدا ہوتی ہے' اس کے بعد جب ایک چیز جو ہم دیکھتے ہیں' انہوں نے کہا کہ زمین میں وہ گل سڑ جاتی ہے۔ اب اگلی اہم بات آ گئی۔

موت کا فرشتہ جسمِ انسانی کو چھوتا ہے مگر اس کے مرکز سے ہمیشہ دُور رہتا ہے: بیج کی ایک مثال اور اس کے تحفظ کی نوعیت

کہا ہے کہ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَکًا (50:9) کیا بات ہے! مُّبٰرَکًا کہ ''اور ہم بادلوں سے مینہ برساتے ہیں جو ہزار برکات اپنے آغوش میں رکھتا ہے۔ اس سے باغات میں پھل پیدا ہوتے ہیں اور کھیتوں میں فصلیں۔'' یہ ہیں مُّبٰرَکًا ہزار برکات اپنے آغوش میں لیے ہوئے اور آگے کہا کہ فَاَنۡۢبَتۡنَا بِہٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِیۡدِ ۝ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّہَا طَلۡعٌ نَّضِیۡدٌ ۝ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ (50:9-10-11) اور بڑے بڑے اونچے کھجوروں کے درخت جن کے خوشے تہ بہ تہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہم نے انسانوں کے لیے بطور سامانِ زیست پیدا کیا ہے اور یہ اگلے دو چار الفاظ ہیں جن میں بات کہی کہ وَاَحۡیَیۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ؕ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ [1] (50:11)۔ آہاہاہا! بات تو خروج کی ہو رہی تھی کہ وہ زندگی کہا' یہ دانہ' یہ جسے بیج کہتے ہو' تم زمین میں دبا دیتے ہو' چند ہی دنوں کے بعد دیکھو تو وہ گم ہو گیا

---

[1] خدا کے جس قانون کی رو سے' بارش کے ذریعے' زمین مردہ میں زندگی کی نمود ہو جاتی ہے' اُسی قسم کے قانون کے مطابق' مردوں کو زندگی عطا ہو جائے گی۔ (خدا کے لیے اس میں مشکل کیا ہے؟)۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن، ص ۔ 1213)۔

ہوتا ہے' اس کو مٹی کھا گئی ہوتی ہے وہ کہیں نظر نہیں آتا۔ کہا کہ اس میں سے پھر ایک نئی زندگی' کونپل کی شکل میں پھوٹی ہے۔ کیا ہے وہ چیز؟ اس دانے کے اندر ایک چیز رکھی گئی تھی جس میں دوبارہ زندہ ہونے کی' کونپل بننے کی' فصل بننے کی' صلاحیت موجود تھی' جس دانے میں وہ محفوظ رکھی گئی تھی' وہ دانہ تو زمین کھا گئی' وہ شے جس میں یہ چیز محفوظ رکھی گئی تھی دوبارہ اگنے گئی تھی' دوبارہ زندہ ہو گئی تھی' دوبارہ وہی کچھ بننے کی وہ شے کونپل بن کر اوپر ابھری۔ آپ سوچ رہے ہو کہ اس رائی کے برابر دانے سے پھر اتنا بڑا کھجور کا درخت اگ آیا۔ کبھی ذہن میں بھی آتا ہے؟ اور اصل یہ ہے کہ فطرت کا سارا نظام ہی یہ ہے جو حیات یا زندگی ہے' اس کو مسلسل برقرار رکھنا ہے' مقصد اس کا یہ ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ہم نے ذرا سا ایک بیج بویا' اس کے اندر سے ایک درخت اگا' اس کے اندر پھل لگے' پھل کے اندر یہ سارا کچھ ہوا۔ وہ پھل ہمارے لیے کھانے کے لیے بڑا لذیذ ہوا۔ کہا کہ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ (50:11)۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ہمارے بندوں کے لیے وہ رزق ہوتا ہے' وہ بڑا شیریں لذت دار ہوتا ہے۔ عجیب عجیب قسم کا یہ سارا' جتنا کچھ ہے' یہ فطرت ہمیں فریب❶ دیتی ہے' اور ہمیں ان کو اگانے کے لیے' ان کو پرورش کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے' اس کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ ہمیں مزے دار سے پھل ملیں۔ وہ پھل کے اندر ایک بیج پیدا کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ بیج سے اس جیسا درخت پھر اگ آئے۔ اس کا پروگرام تو اتنا ہی ہے۔ اس نے یہ تسلسل جاری رکھنا ہے اور اس کے لیے اگر ان درختوں میں یہ کچھ نہ ہو' ہمارے لیے یہ رزق نہ ہو' سامانِ زیست نہ ہو' لذت نہ ہو' پھلوں میں رس نہ ہو' جو کچھ بھی ہے تنوع میں ہو' ہم اس زمین میں درختوں کے بونے میں' پالنے میں' پرورش کرنے میں' سب کچھ کرنے میں کبھی بھی محنت نہ کریں۔ ہم سب کچھ کرتے ہیں کہ ان سے ہمیں یہ حاصل ہوتا ہے اور فطرت ہمیں مہیا کرتی چلی جاتی ہے کہ ٹھیک ہے: لگے رہو تم اس کے اندر' میرا مقصد صرف اس پھل کے اندر ایک جو بیج ہے ننھا سا' اسے پیدا کر رکھنا ہے' اس سے حیات کا وہ پھر تسلسل قائم رہے گا۔ اگر ان پھلوں کے اندر وہ بیج نہ ہو تو پھر سے وہی درخت پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے عرض کیا ہے کہ اس بیج کو بھی ہم نے تو کبھی دیکھا نہیں کہ جو چیز اندر سے پھوٹتی ہے۔ یہی گیہوں یا یہ دالیں یا یہ دانے' جتنے بھی ہوتے ہیں' ان کے اندر ایک بالکل رائی کے برابر' ایک ذرے کے برابر' ایک چیز ہوتی ہے۔ یہ وہ ہے جو پھوٹتی ہے۔ اصل میں خود جو پھل ہے وہ بھی اس کی حفاظت کا قلعہ ہوتا ہے۔ وہ جو دانہ ہوتا ہے' جسے ہم بیج کہتے ہیں' جو اوپر کے جسم میں کوئی چنا ہے' وہ جتنا کچھ اس کے اوپر ہوتا ہے' وہ بھی ایک قلعہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے اندر ایک ذرا سا رائی کے دانے کے برابر ذرا سی جو چیز ہوتی ہیں' بس وہ ہے بیج۔ اسے بو دیجیے۔ وہ چنا تک' وہ دانہ تک' وہ بیج تک' زمین کھا جاتی ہے۔ یہ جو کہا تھا کہ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ (50:4) ہم جانتے

---

❶ جو سمجھے نہ کچھ تو فہم کا اپنے قصور تھا۔

ہیں کہ انسان کی کونسی چیز ہے جسے زمین کم کر دیتی ہے اور کونسی ہے جس تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ ہم جانتے ہیں کہ دانے کو تو وہ چاٹ لیتی ہے، دانے کے اندر وہ شے جس میں اگنے کی صلاحیت ہے، اسے وہ کچھ نہیں کہہ سکتی، وہ اسی طرح سے محفوظ رہتی ہے اور پھر اسی طرح سے اگتی ہے۔ اگنے کے بعد پھر پہلے وہ کونپل بنتی ہے، پھر فصل بنتی ہے۔ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ (50:10) یہ بڑے بڑے اونچے کھجوروں کے درخت ان کے ساتھ اتنے اتنے بڑے لٹکے ہوئے خوشے، وہ کہتا ہے کہ یہ کس چیز کی کارفرمائی ہے؟ وہ جو کھجور کی گٹھلی کے اندر وہ ذرا سا ایک دانہ سا تھا، کہنے لگے کہ بس یوں کچھ سمجھ لو یعنی سمجھایا جا رہا ہے تو یہ چیزیں تو تم دیکھتے ہو کہ کس طرح سے مردہ گٹھلی ہوتی ہے۔ اس کو میز پہ رکھ چھوڑیئے، ساری عمر رکھ چھوڑیئے اس میں سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کو تو جب اس کا مساعد ماحول دیا جاتا ہے، وہ مٹی وہ پانی، وہ حرارت، وہ روشنی، تو یہ گٹھلی تو زمین کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اُسے زمین کھا جاتی ہے جیسے کہا جائے گا اور وہ شے جس میں آگے اگنے کی صلاحیت ہوتی ہے، پھر اس کے بعد وہ اگتی ہے یعنی آپ اندازہ لگایئے کہ ان مثالوں سے چودہ سو سال پہلے کے بدو کو سمجھایا جاتا ہے کہ اس جسم انسانی میں جو تمہیں بالکل طبعی پیکر نظر آتا ہے، جو واقعی جس وقت تم دفن کرتے ہو تو کچھ دنوں کے بعد دیکھتے ہو کہ اسے زمین کھا جاتی ہے۔ اس کے اندر ایک شے ہے جس طرح دانے کے اندر ایک چیز تمہیں نظر آتی ہے کہ وہ پھر سے بہت طویل القامت کھجور کا درخت بنتا ہے اور فصلیں بنتی ہیں اور پھل بنتے ہیں۔ کہا ہے کہ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (50:11) زمین مردہ کو، پھر اس سے تم دیکھتے ہو کہ کیسے زندگی ملتی ہے۔ اس زمین کے اندر اس انداز کا اگر یہ کچھ نہ کیا جائے تو وہ زمین بھی مردہ ہوتی ہے، اس میں زندگی کے آثار نہیں ہوتے۔ یہ سب کچھ کیجیے اور اس کے بعد دیکھیے کہ لہلہاتی مسکراتی ہوئی زندگی کیسے اوپر ابھرتی ہے۔

انسان کے ساتھ اس کی اپنی ذات کے باہمی تعلق کی نوعیت کے علاوہ ذات کی قدر و قیمت کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی تاریخی محسوس مثال

عزیزانِ من! قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ یہ ساری مثالیں دینے کے بعد کہا کہ یہ ایک زمینِ مردہ کو ہم اس طرح سے زندہ کرتے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (50:11) ارے بابا! اسی طرح سے انسان زندہ ہو جائے گا۔ یہ اس كَذٰلِكَ پہ آپ غور کیجیے۔ کیا بات ہے! کیا انداز ہے قرآن حکیم کا! پہلی مثالوں کے بعد یہ کہنا ہے کہ دیکھو! زمینِ مردہ کو کیسے حیاتِ تازہ ملتی ہے۔ ایسی چیز کا جسے وہ دیکھتے ہیں، انکار نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے ٹھیک ہے مطمئن ہو؟ یہ ہم کہہ رہے ہیں کہ جی بالکل ٹھیک ہے۔ کہا کہ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ (50:11)۔ ظاہر ہے یہ صرف خدا کا کلام ہو سکتا ہے، عزیزانِ من! اما تو چیزے دیگری۔ بہت کچھ پڑھا، عزیزانِ من! اس کے اندر ساری عمر گزر گئی، یونانی فلاسفر دیمقریطس (470ق م) سے لے کر آج کے آئن سٹائن تک، کسی کو نہیں چھوڑا۔ میں عقیدے کی بنا پہ نہیں کہتا، علیٰ

وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ یقیناً یہ جو چیز ہے' یہ کسی انسان کا قول نہیں۔ آپ بھی ذرا تھوڑی سی عربی پڑھ لیجیے تو قرآن حکیم سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ کوئی مشکل زبان نہیں ہے' اس کی بڑی آسان زبان ہے اور پھر آپ کو لذت ملے گی۔

یہ کہتے ہوئے آ رہا ہے کہ اَحۡیَیۡنَا بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا (50:11) خدا کے قانون کی رو سے' بارش کے ذریعے' زمین مردہ میں زندگی کی نمود ہو جاتی ہے۔ یہ محسوس سی مثال ہی چلی آ رہی ہے۔ پھر کہا کہ کَذٰلِکَ الۡخُرُوۡجُ (50:11) تم یہی بات پوچھتے تھے۔ کہا کہ یہ اتنی بیّن چیز ہے لیکن انسان کی مفاد پرستیاں اس طرح سے اُسے آنے نہیں دیتیں کہ وہ چیز کہ جو دل میں بھی خیانت کا خیال گزرے گا اس کا بھی مواخذہ ہوگا اور وہ پھر سامنے ہوگا جس کے خلاف میں نے یہ قیامت تک خیال کیا تھا۔ کہا کہ یہ بات ادھر نہیں آنے دیتی۔ تمہاری ہی بات نہیں ہے' اس سے پہلے بھی رسول آئے' ان کی قوموں نے انکار کیا' ان کی تکذیب کی: کَذَّبَتۡ قَبۡلَہُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ وَّ اَصۡحٰبُ الرَّسِّ وَ ثَمُوۡدُ ۙ وَ عَادٌ وَّ فِرۡعَوۡنُ وَ اِخۡوَانُ لُوۡطٍ ۙ وَّ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ وَ قَوۡمُ تُبَّعٍ ؕ کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِیۡدِ o (50:12-13-14) اسی مسئلے کے اوپر تمام اقوامِ سابقہ (قوم نوح' اصحاب الرّس (25:38)' قوم ثمود' قوم عاد' قوم فرعون' قوم لوط' اصحاب الایکہ اور قوم تبع) نے تکذیب کی تھی۔ بات کہنے کی یہ تھی کہ تمہارے ہر عمل کا نتیجہ آئے گا' تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ انسان اسے ماننے کو تیار نہیں ہوتا' خود فریبی میں مبتلا رہنا چاہتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ ماننے کے لیے جی نہیں چاہتا کہ پکڑا جاؤں گا۔ کہا کہ یہ سارا کچھ انہوں نے کیا' تمام رسولوں کے ساتھ یہ ہوا اور پھر اس دنیا کے اندر بھی جو ان کا حشر ہوا' یہ جو ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹیں ہیں' ان پہ جا کر پڑھو۔ ان کی داستانیں تمہیں کیا کہہ رہی ہیں۔ بڑی بڑی قوت و شوکت کی مالک قومیں تھیں۔ آج دیکھو تو سہی کہ ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئیں' ان کی کہانیاں باقی رہ گئی ہوئی ہیں' ان کا کچھ باقی نہیں رہا اس لیے کہ نظام غلط تھا اور غلط نظام کی بنیاد یہ تھی کہ یہ جو قرآن کریم آخرت کا تصور دے رہا ہے اس پہ ایمان نہیں تھا صاحب!

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی مخالفت کی نوعیت کا تذکرہ

اب یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا مردہ کو پھر دوبارہ زندہ کر دے گا تو اس سلسلہ میں ایک اور دلیل آ رہی ہے۔ کہا ہے کہ اَفَعَیِیۡنَا بِالۡخَلۡقِ الۡاَوَّلِ ؕ بَلۡ ہُمۡ فِیۡ لَبۡسٍ مِّنۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ (50:15)۔ تورات میں یہ ہے کہ خدا نے اس کائنات کو پیدا کیا' تو چھ دن تو وہ پیدا کرتا رہا' اور چھٹے دن کے بعد وہ تھک گیا' تو ساتویں دن آرام کرنے کے لیے وہ سو گیا' تھک گیا تھا۔ یہ سبت کا دن جو' ان کے ہاں ہوتا ہے' یہ Seventh ہے' یہ Saturday ہے یہ Holiday کا دن ہے۔ اس کو اس لیے Holiday کہتے ہیں کہ ان کے ہاں مقدس دن ہوتا ہے کہ خدا بھی آرام کر رہا تھا' تم بھی آرام کرو۔ یہودیوں نے اپنے ہاں ہفتے کو یہ رکھا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی تو کھٹ پٹ پہلے دن

سے چلی آ رہی ہے۔ یہ تو ان کی سیاست ہے جو امریکہ اور اسرائیل کا گٹھ یوں ہو رہا ہے ورنہ یہودی اور عیسائی تو ایک دوسرے کو پوچھو نہیں ''جنوں اِٹ وٹّے دا ویر کیند نیں''۔ (جسے انتہا کی دشمنی کہتے ہیں) ان کی ساری تاریخ ایسی تھی صاحب! جو کچھ بھی یہودی کرتے تھے عیسائی ان کے خلاف کرتے تھے۔ وہ ختنہ کرتے تھے انہوں نے کہا ہم ختنہ نہیں کریں گے' وہ خنزیر کو حرام سمجھتے تھے' یہ کہتے تھے ہم حلال سمجھیں گے یعنی محض یہ ان کے خلاف تھے۔ وہ Saturday (سنیچر) کو چھٹی مناتے تھے' انہوں نے کہا کہ ہم Sunday (اتوار) کو چھٹی منائیں گے۔ ٹھیک ہے ادھر وہ یہ تھا کہ چھ دن کی تحریک کے بعد خدا تھک گئے اور کہہ رہے ہیں کہ پھر وہ آرام کرنے لگے۔

خدا تعالیٰ کا تعارف خود خدا تعالیٰ کے ہاں سے

عزیزانِ من! تمہارا کیا خیال ہے کہ خدا اس خلقِ اوّل کے بعد پھر تھک گیا ہے' جو پھر وہ اس جیسی خلق پیدا نہیں کر سکتا۔ یہ پھر وہی بات قرآن حمید کا ایجاز ہے۔ پہلے کہا ہے کہ بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (50:15) کوئی بھی لکھتا تو اس کے بعد' جو دوسری تھی اس کو خلق الثانیہ کہتا کہ یہ جسے دوسری Second creation کہتے ہیں۔ The First Creation, then second یعنی اس کو یہی Second Creation کہتا' اب اسے دوسری یا سیکنڈ نہیں کہا' خَلْقٍ جَدِيْدٍ (50:15) کہا ہے۔ یہ اسی قسم کی دوسری تخلیق نہیں بلکہ ایک اور ہی قسم کی تخلیق پیدا کر دینا کہا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! اس تخلیق کو جو پہلی سے بالکل الگ مختص کرنا' اسے خلق جدید کہنا' بالکل نئی Creation کہنا اور واقعی اس کے مرنے کے بعد کی اس تجدید کا تو ہم تصور کر ہی نہیں سکتے لیکن بہر حال موجودہ' جو کچھ یہ محسوس شے ہے' اس سے تو وہ ایک خلقِ جدید ہی ہے۔ وہ تو خلقِ جدید کہا ہے۔ وہ خلقِ جدید ہوگی۔ کہا کہ تم کہتے ہو ہم پہلی تخلیق سے تھک گئے تھے کہ وہ ایک خلقِ جدید جو ہے ہمارے لیے وہ ہم نہیں کر سکتے' تم شک میں پڑے ہوئے ہو کہ پتہ نہیں خدا میں اتنی طاقت باقی رہ گئی ہے یا نہیں کہ اُٹھ کر اتنا کام کر سکے۔ کہا کہ تم خدا کے متعلق یہ سوچ رہے ہو' یہ تم نے بہت غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ تھکتا نہیں وہ اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (2:255) نیند تو ایک طرف' اسے تو اونگھ بھی نہیں آتی۔ وہ زندہ ہے اور ہر ایک کو زندگی بخشتا ہے۔ وہ قیوم ہے بغیر سہارے کے ہر ایک کو قائم ہونے کا سہارا دینے والا ہے' ارے انسان! بات یہی ہے جو ہم کہہ رہے ہیں کہ خیال تک کا بھی مواخذہ ہوگا' اس کے لیے مشکل کیا ہے۔ کہا کہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ (50:16) کوئی مشینری بگڑ جائے تو وہ مکینک جس نے اس کا بعد میں کچھ علم حاصل کیا ہوگا' وہ ادھر ادھر اسے کچھ ٹوہ کر' تجسس کر کے' اندازہ کر کے' کچھ دیکھے گا کہ بھئی! شاید یہ ہو' شاید یہ ہو۔ جس ماسٹر نے اس مشینری کو بنایا ہے' اس کے سامنے اگر اس میں کوئی اس قسم کی چیز پیدا ہو تو وہ فوراً کہے گا کہ فلاں جگہ نقص ہو گیا ہے اس لیے کہ وہ کہے گا کہ میں نے تو اسے بنایا ہے۔ یہ بظاہر کیسی پیش پا افتادہ سی مثال ہے۔ کہا کہ یہ سوچو جس خدا نے انسان کو بنایا ہے' وہی اس سے واقف نہیں

ہے' کیا بات ہے صاحب! کوئی تردید نہیں کر سکتا' جی! اس دلیل کی کہ جو کسی چیز کا Creatcor ہو وہ اس سے واقف نہیں ہے۔ دلیل ہی یہ ہوگی اور تو کوئی ہوسکتا ہے کہ جانتا ہو کہ اس کے اندر کیا ہوا ہے' Creator (خالق) تو فوراً درست کر لیتا ہے کہ اس کے اندر کیا بات ہوئی ہے صاحب! کہا کہ ہم تو Creator (خالق) ہیں' ہم نے انسان کو پیدا کیا۔ کیا ہم نہیں جانتے؟ ہم تو اس کے دل میں گزرنے والے وساوس اور خیالات سے بھی واقف ہیں' ہمیں تو ان کا بھی علم ہے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (50:16) اور پھر یہ Creator (خالق) کہیں دور نہیں گیا ہوا کہ موٹر کے اندر کہیں گوجرانوالے کے قریب نقص واقع ہو' اور Creator (خالق) کراچی میں بیٹھا ہو' تو وہاں سے بلائیے' اس کو پتہ نہیں کتنا وقت لگے۔ کہنے لگے کہ ہم تو اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ اور مسئلہ ہے یہ دوسری طرف چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ رگِ جاں سے بھی قریب ہونا انسان کے زندگی کی شہ رگ جو ہے' وہ اس کے قریب کہا ہے۔ وہی زندگی عطا کرنے والا ہے۔

انسان کا تو ہر عمل اس کے نفس پر ایک نشان کندہ کرتا ہے: یہ ہے نفس کے اندر محفوظ ریکارڈ

بہر حال ہمیں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ دیکھتے جاتے ہیں، اور پھر اس کے بعد انتظام ایسا ہم نے کر رکھا ہے' یہ ہمارے سمجھانے کے لیے ہے۔ سچ یہ نہیں ہے کہ دائیں بائیں کچھ اس طرح سے شارٹ ہینڈ رائٹنگ بٹھا رکھے ہیں کہ وہ لکھتے رہیں پھر جا کے پکا کرتے ہیں۔ کہا ہے کہ اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ (50:17) اس کے دائیں بائیں نگہبان' پاسبان' رجسٹر لکھنے والے' بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اس کے دل میں کوئی بات گزرے اور ہم نوٹ کریں۔ وہ اس انتظار میں ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے اس کی بھی! مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (50:18) کوئی لفظ بھی اس کی زبان سے نہیں نکلتا کہ اس کے پاس نگہبان بیٹھا ہوا ہوتا ہے' وہ اس کو سارا ریکارڈ کر دیتا ہے اور یہ ریکارڈ سارا محفوظ ہوتا ہے۔ کہاں محفوظ ہوتا ہے؟ یہ باہر کے کسی کاغذ پہ نہیں ہوتا کہ یہ تو تلف بھی ہوسکتا ہے' گم بھی ہوسکتا ہے' پھٹ بھی سکتا ہے۔ یہ تو خود اس کے نفس کے اندر محفوظ ہوتا ہے۔ وہ ہے ریکارڈ اس کا۔

خدا تعالیٰ کے حضور انسان کی حاضری دراصل نفس انسانی کی حاضری ہوگی: سکراتِ موت کے بالحق ہونے کی تشریح

اب وہ ریکارڈ ہمارے سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا کہ وہ تنہا آتا[1] ہے' اور وہ پورے کا پورا یوں یوں سمجھیے کہ وہ ہوتا ہی اس

---

[1] یہ قرآن کریم کی (6:94) کی طرف اشارہ ہے۔

کے اعمال کا' اس کے خیالات کا ایک ریکارڈ' ایک مجموعہ' ایک محفوظ شے ہے۔ اسی کا نام انسانی ذات یا انسانی نفس لیا ہے' جو مرنے سے مرتی نہیں ہے اور خدا کے ہاں جاتی ہے اور وہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔ وہ تو ہمارے سمجھانے کے لیے یہ کہا گیا ہے جیسے ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اس طرح سے کیا جاتا ہے' کوئی لفظ بولتا ہے تو وہ ریکارڈ نوٹ لینے والا نوٹ لے لیتا ہے' شارٹ ہینڈ والا لکھ لیتا ہے' پھر وہ ریکارڈ میں جاتا ہے' پھر محفوظ کیا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارے یہ سارے انتظامات موجود ہیں اور دوسری جگہ کہا کہ یہ سارا کچھ' جتنا بھی ہے' وہ خود تمہاری اپنی ذات کے اندر محفوظ رکھا ہوتا ہے اور وہ ہمارے پاس آتی ہے وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (50:19) کہنے لگے بہر حال وہ موت کی بے ہوشی بالحق ہے۔ قرآنِ کریم میں بالحق اس چیز کو کہتے ہیں جو ایک تصور محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے' تو اسے حق کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں اس کے معنی یہ ہیں۔ کبھی اس پہ غور کیجیے تو پتہ چلے۔ قرآن کریم نے دین الحق کہا ہے تو پھر وہ دین کس شکل میں حق بنتا ہے؟ جب وہ محفوظ شکل میں ایک معاشرہ میں نظام کی شکل میں سامنے آتا ہے' پھر وہ دین حق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کسی نظری چیز کو یا ذہنی چیز کو یا عقیدے کی چیز کو' حق یا حقیقت نہیں کہتا۔ حقیقت کا لفظ تو ہمارے ہاں بھی اسی کے لیے بولا جاتا ہے جب وہ چیز محسوس شکل میں سامنے آجائے تو الحق ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ موت کی غشی میں یہ چیز تو الحق ہے جو تمہارے سامنے آتی ہے ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (50:19) حالانکہ تُو اس موت سے بچنے کے لیے ساری عمر کوشش کرتا رہا ہے تو پہلا مرحلہ جو ہے وہ تمہاری نظروں کے سامنے گزرتا ہے' کہ یہ کیا کچھ اس کے لیے ہوتا ہے' کیا کچھ تم اسے بچانے کے لیے کرتے ہو تو یہ نہیں ہوتا۔

قرآنِ حکیم کے آخری دو پاروں میں نفخ فی الصور کی قرآنی وضاحت: پیکروں میں از سرِ نو توانائی کا بھرنا

میں نے کئی دفعہ یہ عرض کیا ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی کے متعلق قرآن کریم نے جن تفاصیل کو بیان کیا ہے' وہ اس کے آخری پاروں میں پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ آئے ہوئے ہیں اور میں اس کو ملتوی کیے جاتا ہوں جہاں جہاں یہ چیزیں ضمناً آرہی ہیں کہ جب ہم اس مقام پہ پہنچیں گے تو چونکہ اس کا موضوع ہی یہ ہوگا اس لیے اس وقت ہم اس کی تشریح میں جائیں گے۔ اس سے پہلے سکراتِ موت کے طریقے پر اگر ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کو سمجھیں گے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ بات وہ ایسی ہے جو عام زندگی سے بالکل ایک مختلف طور طریق پر ہے اور یہ ساری چیز مثالوں کے ذریعے سے قرآن کریم نے بیان کی ہوئی ہے۔ قرآن کریم وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (50:20) کہتا ہے۔ یہ موت کی غشی میں پڑتے تم نے دیکھ لیا' اس کے بعد مر گیا اور تم نے سمجھا کہ معاملہ ختم ہوگیا۔ یہ بات نہیں

ہے۔اب یہی جو ہے میں نے عرض کیا ہے کہ اس وقت میں پھر یہ عرض کرونگا: نُفِخَ فِی الصُّورِ (50:20) صور پھونکا جائے گا تو ہمارے ہاں ذہن میں وہ تصور آتا ہے۔صور یہ شہنائی یا یہ ''جو توتی جنوں کیندے نیں ساڈے وجاندے ہیگے نا'' (یہ جسے ہمارے ہاں تُوتی بجانا کہتے ہیں) اسے اس طرح سے یا آج کی اصطلاح میں بگل سمجھ لیجئے' یہ عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ یہ بگل پھونکا جائے گا تو اس وقت پھر یہ سارے مردے اٹھیں گے۔ یہ سب کچھ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ میں اس وقت عرض کرونگا' اس وقت اتنا ہی عرض کردوں کہ یہ جو صور ہے یہ ٹھیک ہے' وہ ایک بگل کو بھی کہتے ہیں' اس سے آواز نکلتی ہے' یہ لفظ صورت کی ہی جمع ہے' جس کو ہم صور کہتے ہیں' جسے ہم پیکر کہتے ہیں' جن کو ہم Form کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صاحبانِ علم اس بات کو سمجھیں گے' جب تک کوئی چیز Form (شکل) نہیں اختیار کر لیتی' اس وقت تک وہ Existence میں ہی نہیں آتی' وجود میں وہ شے وہی آتی ہے جو ایک Form (شکل) اختیار کرتی ہے۔ یہ بڑا بنیادی مسلمہ ہے۔ یہ صور جو ہے' جسے ہم نے صور کہا ہے یہ Forms (پیکر' اشکال) ہیں' پیکر ہیں۔ نفخ کے معنی ہوتا ہے اس میں توانائی بھر دینا۔ کہا ہے کہ موت تک تو تم جانتے ہو' پھر دیکھتے ہو' یہ مردہ ہوتا ہے' ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کہ ہم پھر ان پیکروں میں ازسرِ نو توانائی بھر دیں گے۔

قرآنی حقائق کو بیان کرنے کا انداز بڑا ابلیغ ہوتا ہے' دھاندلی نہیں ہوتا

عزیزانِ من! کیا بات ہے! قرآن حکیم کس انداز میں بات کر جاتا ہے۔ کہا ہے کہ ذٰلِکَ یَوۡمُ الۡوَعِیۡدِ (50:20) وہ ہے وہ دن جس کا ہم تم سے وعدہ کر رہے ہیں۔ مرنے تک تو تم جانتے ہو' مگر وہ تم نہیں جانتے کہ پھر ان پیکروں میں توانائی کیسے بھری جائے گی۔ وہ ہیں فِی الصُّورِ اور پھر اس کے بعد قرآن حکیم کا انداز سمجھانے کا یہ ہے' وہ ایسے سمجھاتا ہے جیسے ایک عدالت ہو' وہاں جج بیٹھا ہوا ہو' یعنی اللہ تعالیٰ بارگاہِ عدالت میں جیسے ایک میز کرسی ہوتی ہے' جج بیٹھا ہوا ہوتا ہے ملزم لائے جاتے ہیں' اس کے ساتھ ایک سپاہی ہوتا ہے' اس نے ہتھکڑی میں جکڑا ہوا ہوتا ہے' ان پہ ایک نگران ہوتا ہے' دو چار اس کے ساتھ گواہ ہوتے ہیں۔ یہ سمجھانے کے لیے قرآن حمید یہ نقشہ پیش کرتا ہے' یہ بتانے کے لیے پیش کرتا ہے کہ ہم دھاندلی نہیں کرتے کہ کوئی سامنے آیا اور جس کو جی چاہا ہم نے کہا: بھیج دو جہنم میں۔ کہا: اس کو جنت میں بھیج دو۔

میدانِ حشر میں عدالت خداوندی کی تصویر کشی کا ایک محاکاتی انداز مگر اس کی داد سائیکالوجسٹ دیں گے

عزیزانِ من! یہ محض سمجھانے کے لیے ہے کہ ہمارے ہاں عدل کا پورا طریقہ برتا جاتا ہے' یہ باتیں کہی گئی ہیں ورنہ بات تو اس نے یہ کہی ہے کہ تم خود اس کا اقرار کرو گے کہ ہاں صاحب! میں نے یہ جرم کیا ہے تو اس میں تو ضرورت ہی نہیں رہتی' نہ کسی شاہد کی' نہ گواہ کی لیکن یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ ہمارے ہاں ایسی ڈکٹیٹر شپ نہیں ہے کہ ہم جس کو جی چاہے کہہ دیں کہ بھیج دو جہنم کے اندر اور بھیج دو ان کو جنت

کے اندر۔ یہ نہیں ہے۔ یہ عدالتی کارروائی ہے جیسی تمہارے ہاں ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ پوری پوری چھان پھٹک ہوگی' تمہارے گواہ ہونگے' ان سے بیان لیا جائے گا یعنی یہ سمجھانا ہے۔ یاد رکھیے! وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ (50:21) ایک ایک فرد ہمارے عدالت میں آئے گا اس کے ساتھ ایک تو اس کو چلانے والا ہوگا' ہتھکڑی پہنا کر وہ آگے آگے جا رہا ہے' اور وہ اس کے پیچھے چلا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ پیچھے ایک نگران ہے کہ کہیں یہ شخص بھاگ نہ جائے۔

عزیزانِ من! دو منٹ باقی ہیں' دو ہی منٹ میں دو ہی باتیں میں کرلوں۔ وہاں کیا بات ہوگی؟ یہ بڑے غور سے سننے کی بات ہے۔ کہا ہے کہ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا (50:22) بات کچھ نہیں تھی جو کچھ تم یہ کر رہے تھے کہ اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا' نتائج بھگتنے پڑیں گے' سزا ملے گی۔ یہ بات تو تھی لیکن تم اپنے آپ کو اس سے بے خبر رکھنا چاہتے ہو' اپنی اس بات کو یاد میں نہیں لینا چاہتے تھے کہ یہ تمہارے ہاں کی بڑی تلخ چیز تھی' تم اپنے آپ کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ آج ہم نے صرف اتنا کیا ہے کہ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (50:22) ہم نے کچھ نہیں کیا' وہ جو تم نے خود اپنی آنکھوں پہ غفلت کے پردے ڈال رکھے تھے تاکہ تمہیں نظر نہ آئے کہ اس کے نتائج کیا ہیں' بس وہ صرف پردے اٹھا دیئے ہیں۔ آہاہا! عزیزانِ من! کوئی سائیکولوجسٹ اس کی داد دے گا کہ تحت الشعور (Unconscious Mind) کے اندر جو چیزیں چھپی ہوئی ہوتی ہیں' ان کو وہ باہر لانے کے لیے جتنی تگ و دو کرتا ہے' ان کے ہاں وہ بات ہے جس کو وہ Discover (بے نقاب کرنا) کہتے ہیں' ان کے ہاں لفظ ہی یہی Discover ہے' وہ شے Cover (نقاب) میں ہوتی ہے اور اس سے وہ Cover (نقاب) اٹھا دیا جاتا ہے' یہ وہ سائیکوٹرسٹ (نفسیاتی امراض کے ماہر) کراتے ہیں جو اس طرح علاج کرتے ہیں۔ وہ کرتا اتنا ہی ہے' وہ ڈھونڈتا یہ ہے کہ وہ پردہ کونسا ہے جو اس نے ڈال رکھا ہے اور وہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا' وہ ساری تحقیق' تفتیش' تجسس اس پردہ معلوم کرنے کی ہوتی ہے' اور وہ کہتے ہیں We only discover it ہم اس پردے کو اٹھا دیتے ہیں' کہ جب یہ معلوم ہو جاتا ہے تو حقیقت سامنے آجاتی ہے' علاج ہو جاتا ہے۔

قرین کا کردار جحیم اور دولت کو اپنے لیے ہی سمیٹنے کا انجام

عزیزانِ من! کہا ہے کہ كَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ (50:22) ہم صرف اس وقت اس پردے کو اٹھا دیں گے جو تم نے خود اپنی آنکھوں پہ ڈال دیا تھا اور نگاہوں کی بات یہ نہیں ہوگی کہ صرف سامنے پڑی ہوئی پیش پا افتادہ چیز ہی نظر آئے بلکہ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (50:22) پھر تیری آنکھ اس وقت ایسی ہوگی کہ بڑی سے بڑی' موٹی سے موٹی' لوہے کی دیوار بھی بنی ہوئی ہوگی' اس پہ بھی چیر کے دوسرے طرف کی چیز کو دیکھ لیں گی۔ نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی' پردہ اٹھا دیں گے' نگاہیں اتنی تیز ہو جائیں گی' ہر چیز کو تم خود دیکھو گے'

دیکھنے کے بعد تو انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' بات تو آگے بھی چلتی ہے۔یہی وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ (50:23)۔ویسے قرین کا لفظ تو قرآن کریم میں ساتھی کے لیے بھی آیا ہے۔وہ جو یہاں بہکانے والے دوست ہوتے ہیں' ان کے لیے عام طور پہ یہ لفظ آیا ہے۔قرآن کریم میں یہ بھی چیز آئی ہے' انہی کو وہ شیاطین بھی کہتا ہے' ان سے بڑا شیطان اور کون ہوتا ہے۔یہ بہکانے والے ہیں لیکن یہاں جو بھی پاس بیٹھا ہوا ہو' ساتھ ہو' اس کے لیے قرین کا لفظ آتا ہے۔کہا ہے کہ یہ سارا کچھ تو اسکو یوں دکھا دیا جائے گا اور وہ جو اس کے ساتھ ہوگا' وہی اس کا نقش' جو وہ اس کا ریکارڈ ہے' وہ یہ کہے گا کہ یہ جو سارا کچھ ہے' اس سے کہا جائے گا کہ یہ کچھ میرا نہیں ہے' یہ سارا ہی میرے پاس تمہارے خلاف تیار رکھا ہے۔کیا بات ہے! اور اس کے بعد پھر یہ عدالت سے فیصلہ ہوگا کہ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ (50:24) یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دیدہ دانستہ انکار کیا' حقائق سے سرکشی برتی اور پھر دشمنی تک' عناد تک' اس کے خلاف اتر آئے۔یہ کیفیت ہوگی۔اب اس کے سوا کہ یہ اپنے ان اعمال کا خمیازہ بھگتیں' اس کی سزا بھگتیں' اور ہو کیا سکتا ہے۔ٹھیک ہے اس کا نام جہنم ہے۔میں عرض کرونگا کہ جہنم کے کیا معنی ہیں اور قرآن کریم نے جحیم کا لفظ استعمال کیا ہے۔وہ کیوں استعمال کیا ہے؟ اور پھر سب سے بڑی کونسی چیز تھی کہ جس سے اس کے اوپر جہنم وارد ہوگئی؟

عزیزانِ من! ایک ہی منٹ کے اندر میں عرض کر دونگا۔مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (50:25) دولت کو سمیٹ کر اپنے لیے رکھتے تھے اور روک ان کی طرف سے کر رکھتے تھے جن کو اس کی ضرورت ہے۔یہ ہیں جن کو کہا جائے گا کہ یہ نظام خداوندی سے سرکشی برتتے تھے۔مزید تفصیل آئندہ سہی' عزیزانِ من! سب سے بڑا جرم قرآن حکیم نے یہ يَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) قرار دیا ہے' وہ رزق کہ جسے بہتے پانی کی طرح' ہر غریب کے گھر کے آگے گزرنا چاہیے' آوازیں دیتا ہوا کہ او پیاسو! بھر لو اپنے اپنے ڈول' یہ اپنی اپنی جگہ اس کو روک رکھتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس سے پینے نہ پائے۔کہا کہ اس سے بڑا جہنم کا مستحق اور کون ہو سکتا ہے صاحب! یہ ہیں' عزیزانِ من! وہ قرآن کی یہ چیزیں! کیوں سنیں گے یہ؟

سورۃ قٓ کی آیت 25 تک ہم آگئے' 26ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورة قٓ (آیات 26 تا 35)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1982ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ قٓ کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (50:26)۔

گزشتہ سے پیوستہ نفسِ مضمون

سابقہ آیت (50:24) میں یہ کہا گیا تھا کہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرنے والے، سرکشی برتنے والے، جہنم کا ایندھن ہونے والے داخل جہنم کیے جائیں گے اور اگلی ہی آیت کے پہلے ہی دو لفظوں میں بتایا کہ ان کا سب سے بڑا جرم کیا ہوگا، سب سے بڑا جرم جو ان کے فردِ جرم کے سرِ فہرست، سب سے اونچا، سب سے اوپر جس کو رکھا گیا ہے وہ کیا ہوگا؟ اس کے لیے کہا کہ یہ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (50:25) تھا یعنی وہ دولت کو اپنے لیے روک لیتے تھے، دوسروں تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ دولت کے معنی اسبابِ رزق ہی ہیں، زندگی کا سامان ہی ہیں، یہ روٹی ہے۔ یوں تو یہ عجیب سی بات نظر آئے گی کہ قرآنِ کریم کو عام تصور کے مطابق کچھ مذہب اور روحانیت کی باتیں کرنا چاہئیں، وہ یہ

روٹی کا مسئلہ لے کر بیٹھا ہے اور روٹی کا مسئلہ تو بنیادی مسئلہ ہے۔ یہ نہ ہو تو بات آگے چلتی نہیں ہے، زندگی ختم ہو جاتی ہے، ہے تو ہمارے ہاں پنجابی زبان کا ایک محاورہ لیکن ہے بڑا اہم۔ کہتے ہیں جیہدے ٹڈھ اچ نئیں روٹیاں، اوہدیاں ساریاں گلاں کھوٹیاں، تے جیہدی کوٹھی اچ دانے، اوہدے کملے وی سیانے (جس کے پیٹ میں روٹی نہیں، اس کی سب باتیں فضول ہیں، جس کے گھر اناج سے بھرے ہوں، ان کے کم عقل بھی عقلمند ہوتے ہیں)۔ قرآن کریم حقائق کو نظر انداز نہیں کرتا، وہ تصوراتی مذہب نہیں ہے کہ آپ کو آسمان، پر بلندیوں پر، لیے جائے اور زمین پہ پاؤں نہ ٹکنے دے۔ اس نے روٹی کے مسئلے کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس نے پہلا مسئلہ یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ جو اپنی ضرورت سے زیادہ اکٹھا کر کے روک لیتے ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ کسی دوسرے کا حصہ تھا، اسے محروم کرو تو یہ تمہارے پاس آ سکتا ہے ورنہ اگر یہ سب کے لیے مساواتی طور پہ دیدیا جائے، ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دے دیا جائے تو سوال ہی نہیں ہے کہ تم اتنا اکٹھا کر سکو، تو یہ انسانیت کے اوپر ظلم ہے۔

زمین زیست کا ذریعہ پیدائش ہے اور اسلامی مملکت کا قرآنی تصور

اور یہ جتنے بھی کائنات کے ذرائع ہیں ان میں زمین ہی سب سے بڑا ذریعہ پیدائش ہے، یہیں سے سامان زیست پیدا ہوتا ہے، اسی سے باقی معدنیات وغیرہ نکلتی ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ سارے انسانوں کے لیے بلکہ تمام جانداروں کے لیے ذریعہ رزق ہے۔ اس میں سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق پہنچنا چاہیے۔ جو سمیٹ کر اپنے لیے رکھتے ہیں وہ دوسروں کو ان کے حصے سے محروم کر دیتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ یہی چیز ہے کہ جسے اسلامی نظام کہا جاتا ہے، اسلامی مملکت کہی جاتی ہے۔ اس کی پہلی پہچان حضور نبی اکرم ﷺ کی حدیث کے مطابق یہ ہے کہ اس میں رات کو کوئی فرد بھوکا نہیں سوتا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق لیا جائے تو وہ انسانوں کو ہی نہیں لیتے، وہ کہتے ہیں کہ اس مملکت کے اندر ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہے۔ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کا مواخذہ قیامت کے دن عمر رضی اللہ عنہ سے ہوگا۔ یہ چند قوانین نافذ کرنے کی بات نہیں۔ پہلی بنیادی چیز یہ ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان کی عزت، انسان ہونے کی جہت سے ہے۔ جہاں کسی انسان کی تذلیل ہو، وہاں اس کے اسلامی نظام ہونے کا سوال ہی نہیں تو ایک طرف انسان کی تذلیل کا سایہ تک بھی نہیں آ سکتا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حق حکومت حاصل نہیں ہے اور اگلی چیز یہ ہے کہ اس معاشرے میں کوئی فرد بھوکا نہیں سوتا ہے۔ اس کے لیے تفصیل میں جا نہیں سکتا۔ وقت تھوڑا ہوتا ہے، آپ دیکھنا چاہیں تو میری کتاب ''نظامِ ربوبیت'' دیکھیے جس میں میں نے بتایا ہے کہ قرآنِ کریم میں اس بنیادی مسئلہ پہ کس قدر زور دیا ہے کہ ہر فرد کو سامانِ زیست ملنا چاہیے اور اس میں اس کی تذلیل نہیں ہونی چاہیے۔ وہاں ذلت کے ساتھ نہیں بلکہ

رزقاً کریم ملنا چاہیے' ہر فرد کو عزت کی روٹی ملنی چاہیے اور اسی لیے اس نے جو سب سے بڑا جرم گنایا ہے وہ ہے مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (50:25) روک لینے والے اس چیز کو کہ دوسروں تک نہ پہنچے۔ یہ اتنی ہی چیز نہیں ہے' پہلے بھی جب کبھی یہ موضوع آیا ہے تو میں نے پیش کیا ہے' دو چار حوالے کم از کم ہر بار دہرانے پڑتے ہیں کہ اہمیت کا تقاضا یہ ہے۔ اسلام اسلام کہے جانے والوں کا' آپ دیکھیں گے' کہ اس طرف کسی کا دھیان ہی نہیں ہے۔ قرآن حکیم جو بنیادی مسئلہ ہے' اس کو بنیادی حقیقت تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ہے بنیاد اور یہ ہے اصل اس کی۔

سورۃ الماعون کا قرآنی مفہوم اور صلوٰۃ کا ذکر

سورۃ الماعون کی پوری کی پوری سورۃ اس موضوع پر ہے۔ کہا ہے کہ اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) کیا تُو نے اس کو بھی دیکھا ہے' اس کی حالت پہ بھی غور کیا ہے' جو دین کو جھٹلاتا ہے' انکار نہیں کرتا' وہ تو کافر ہو جاتا ہے' وہ مانتا ہی نہیں ہے' ٹھیک ہے بھئی! یہاں جبر تو کسی پہ نہیں ہے اس کا دل نہیں جھکتا' وہ مانتا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ نہیں ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے تو اس کا اقرار کرتے ہیں لیکن اپنے عمل سے اس کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں کیونکہ اس نے تو دعویٰ یہ کیا تھا کہ سطح ارض کے اوپر کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اس نے نہیں اٹھا رکھی' تو اگر کوئی بھوکا سوتا ہے تو یہ اس دعوے کو جھوٹا ثابت کرتے ہیں۔ کہا کہ تم نے اس کی حالت پہ بھی غور کیا ہے کہ یہ دین کو جھٹلاتا ہے' جھوٹا ثابت کرتا ہے۔

عزیزانِ من! یہ دین کی بڑی چیز ہے' یہ کفر سے بہت آگے کی بات ہے۔ کہا ہے کہ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) کون ہے؟ یہ ہمارے ہاں کے سطحی مذہب پرست حلقے کا تصور ہے۔ یہ تصور تو عام طور پر نماز روزے کی طرف جائے گا۔ وہ کہتا ہے کہ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ o وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (107:2,3) یہ وہ ہے کہ یہ اس شخص کو جو معاشرے میں تمہارہ جاتا ہے' دھکے دیتا ہے اور جس کا کاروبار رک جاتا ہے' اس کی روٹی کا انتظام نہیں کرتا۔ یہ تکذیبِ دین کرتا ہے' دین کو جھٹلاتا ہے۔ دین کا دعویٰ یہ تھا کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔ یہ رزق کو روک لیتا ہے اور ان کا انتظام نہیں کرتا۔ دعویٰ یہ کرتا ہے کہ ہم دین پرست واقع ہوئے ہیں۔ یہ اپنے دین کو جھٹلا رہا ہے اور دوسروں کو نمازیں پڑھ کر فریب دیتا ہے۔ کس بات پہ دیتا ہے؟ یہ قرآن کریم ہے' عزیزانِ من! کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ o الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:4,5) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے کہ جو نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ یہاں ایک ایک لفظ غور طلب ہے' عزیزانِ من! کہتا ہے کہ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (107:5) تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے' وہ نماز سے بے خبر ہیں۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ کہا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) وہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو اٹھنا بیٹھنا رکوع سجود قیام ہے' یہ

نقل وحرکت کی چیز جو دیکھی جاسکتی ہے' وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا نام نماز ہے' ہاتھ یہاں تک اٹھاؤ' یہاں باندھو' رکوع جاتے وقت یوں کرو' سجدے میں پانچوں چیزیں زمین پہ ٹک جائیں' اتنا زاویہ بنے' ایسے اٹھ کر بیٹھو' یہ سارا کچھ کرو' تو آواز آتی ہے! نماز ہوگئی اور اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی' کسی نے نیچے ہاتھ باندھ لیا' اوئے تیری نماز نئیں ہوئی ہیگی' مڑ کے پڑھ (اب! تمہاری نماز نہیں ہوئی' دوبار پڑھو)۔ نہیں ہوئی' کیا ہوا؟ هُمْ يُرَآءُوْنَ (107:6) وہ سمجھتے ہیں کہ نماز یہ ہے اور وہ نماز کی اصل اور بنیاد سے' حقیقت سے' غافل رہتے ہیں۔ کرتے کیا ہیں؟ یہ کچھ کر کے اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتے ہیں کہ ہم نے فریضہ خداوندی تو پورا کیا اور اس کے بعد کرتے کیا ہیں؟ عزیزانِ من! وہی ہے جو یہاں کہا ہے کہ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ (50:25) رزق کو روک دینے والے کہ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (107:7) اس رزقِ خداوندی کو جو بہتے پانی کی طرح رہنا چاہیے تھا کہ ہر ایک کے دروازے کے آگے سے گزرے' سلسبیل اس کا نام رکھا' گزرتا چلا جائے' آواز دیتا چلا جائے کہ کس کس کو ضرورت ہے' لیتے جاؤ' اس رزق کو۔ جسے اس طرح رہنا چاہیے تھا یہ بند لگا کر روک لیتا ہے اور نماز پڑھ کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں نے اس طرح فریضہ خداوندی ادا کر دیا أَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (107:1) دین کی تکذیب کرتا ہے۔

کبھی آپ نے ان مسجدوں کے اندر یہ وعظ بھی سنے ہیں کہ دین کی تکذیب کون کرتا ہے' ان نمازیوں پر قرآن حکیم کہتا ہے کہ ان کے لیے تباہی ہے۔ سارے قرآن حکیم میں آپ دیکھیے' مال کا جمع کرنا اس نے سب سے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ تو بہتے پانی کی طرح رہنا ہی چاہیے۔ اگر کسی جگہ کوئی اس کو روک لیتا ہے' اپنے لیے روک لیتا ہے کہ آگے جن کو اس پانی کی ضرورت ہے انہیں محروم کر دیتا ہے تو یہی تو سب سے بڑا جرم ہے۔ کہا ہے کہ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (104:2)۔ حوالے لکھ لیجیے۔ جمع کرتا ہے اور پھر ننانوے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے کہ اتنا ہو گیا۔ عدہ گنتا ہے' وہاں سے بینک بیلنس کی شیٹ لیتا ہے کہ اب بیلنس کیا ہے: وَّعَدَّدَهٗ (104:2) اس چکر میں ہی پڑا رہتا ہے' جمع کرتا رہتا ہے اور پھر اس کے بعد یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کتنا ہو گیا' اب کتنا ہو گیا' مقصدِ زندگی یہ سمجھ رہا ہے۔ یہ پتہ نہیں کہ ہر ایک روپیہ جو تمہارے بنک کے اندر جمع ہوتا ہے' کسی کو محروم کر رہا ہے کہ اس کی ضرورت رک گئی ہے' یہ اسے محروم کر رہا ہے: جَمَعَ فَاَوْعٰى (70:18) وہ اس زمانے میں جمع کرتا ہے تو اس طرح یہ بنک یا جمع کرنے کی چیزیں نہیں ہوتی تھیں' تجوریوں میں یہ جو تھیلیاں ہوتی ہیں' ان میں روپیہ جمع کیا کرتے تھے۔ ہمارے بچپن میں بھی ابھی یہ ایسے نوٹ نہیں چلے تھے تو وہ روپے ہی ہوتے تھے تو وہ جو روپے تھے وہ ایک تھیلی کے اندر ڈالتے تھے اور وہ کمر کے ساتھ باندھی ہوئی ہوتی تھی اور زیادہ ہوتا تھا تو وہ بڑی بڑی تھیلیاں ہوتی تھیں جن میں یہ ڈالتے تھے۔ کہتا ہے کہ ان تھیلیوں کے اندر ڈالتا ہے اور اوپر سے انکا منہ کس کر بند کر دیتا ہے' تاکہ وہاں سے نہ نکلے' اُس نے اس کے لیے انفاق کا لفظ استعمال کیا تھا' جس کے معنی تھے اس قسم کی تھیلی یا اس قسم کی نیف کہ جس کے دونوں منہ کھلے ہوئے ہوں۔ یہ اسلام تھا' ادھر سے آتا

جائے' اُدھر سے ضرورت مندوں کے لیے نکلتا چلا جائے مگر یہ جمع کرتا ہے' تجوری کا نیچے کا حصہ تو پہلے سے بند ہوتا ہے' اوپر کے حصے کو خود کس کے باندھ لیتا ہے' یہ جمع کرنا ہے۔

مال جمع کرنے کی وعید اور جہنم میں اس کا ورود

قرآنِ کریم میں سب سے زیادہ وعید جہنم کے عذاب کی آئی ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے آئی ہے جو مال جمع کر کے رکھتے ہیں۔ یہ جو غیر قرآنی معاشرہ ہے' میں اس کی بات نہیں کر رہا' یہاں تو یہ کہا جائے گا کہ صاحب! اگر نہ رکھا جائے تو کل کو جو ضرورت پڑے گی تو کوئی مدد ہی نہیں کرے گا' بھوکے مر جائیں گے صاحب! بات قرآن کریم کے نظام کی' اسلامی نظام کی' ہو رہی ہے جو قرآن کریم کو تسلیم کرتے ہیں' یہ ان کی بات ہو رہی ہے کہ ان کے معاشرے میں کوئی شخص رات کو بھوکا سوئے گا ہی نہیں' تو جب انتظام یہ ہوگا کہ کسی کے رزق کی ضرورت رکی نہ رہے تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ صاحب! جمع کریں۔ کاہے کے لیے یہ سر دردی لیں؟ پھر جب تمہاری ضرورت تمہارے بال بچوں کی بھی ہوگی تو یہ ہوگا کہ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ (17:31) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں' تمہارے بال بچوں کے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ اسلامی مملکت اعلان کرتی ہے تو جب یہ اعلان کرے اور اس کی ضمانت دیدے تو پھر یہ جسے کہتے ہیں: مت ماری ہوئی ہے کہ جو خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لے اور اس کو جمع کر کے رکھتا چلا جائے۔ ہر قسم کا ڈر کا ہے کے لیے ہے کہ جمع کرے۔ یہ ہے اسلامی نظام کہ ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا مملکت یا نظام کی ذمہ داری ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اس کو جتنی استعداد یا صلاحیت حاصل ہے اس کے مطابق کام کرتا چلا جائے اور مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری وہ لے لے۔ پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوگا کہ وہ یوں جمع کرتا چلا جائے گا' کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی' وہ مملکت اس کی اور اس کے بچوں کے رزق کی کفالت کی ضامن ہوتی ہے۔ اس کا کام تو صرف کام کرنا ہوتا ہے' جو کام کرنے کے قابل نہیں رہتے' معذور ہو جاتے ہیں یا اتنا کام نہیں کر سکتے' جن سے ان کی ضروریات پوری ہوں' ان کی ضروریات کو بھی وہ پورا کرتی ہے۔ وہ اس نظام یا مملکت کی طرف سے کام کرنے والوں سے حسبِ استعداد کام لیا جاتا ہے اور وہ کام کرتے ہیں اور وہ ان کی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتی ہے۔ یہ ہے جسے نظام اسلامی کہتے ہیں یہ ہے اسلامی مملکت کہ جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ ایک فرد بھی اگر رات کو اس بستی میں بھوکا سو گیا تو اس بستی کی حفاظت کی ذمہ داری خدا اٹھا لیتا ہے' اسے تباہ ہونے دیتا ہے۔ یہ ہے نظام۔ اب سمجھ میں آئے گا کہ جو مَّنَّاعٍ لِّلۡخَيۡرِ (50:25) کہا گیا ہے کہ یہ اس اسبابِ زندگی کو روک لینے والا' زندگی کے خیر کو روک لینے والا ہے' اسے جہنم میں جانے والوں کے سرِ فہرست مجرموں میں کیوں رکھا۔

یہ بادشاہوں کی فقہ ہے

اب آپ سوچ لیجیے کہ یہ جو ہمارے ہاں کے بادشاہوں کے زمانے کی' سرمایہ داری کے دور کی بنی ہوئی فقہیں ہیں ان میں یہ صورت ہے کہ جتنا جی چاہے جمع کرتے چلے جاؤ اور سال کے بعد اس میں سے کچھ فیصد جسے عام طور پہ اڑھائی فیصد کہتے ہیں بطور خیرات کے کاٹ دو' باقی جتنا کروڑوں عربوں تک روپیہ ہے' سب جائز' شیرِ مادر کی طرح حلال ہے۔ قرآن کریم جمع کرنے کے متعلق یہ کہتا ہے۔ یہ مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ (50:25) کون تھا؟ مُعۡتَدٍ (50:25) یہ سرکشی اختیار کرنے والا تھا۔ ہم وہ نظام چاہتے تھے یہ اس نظام کے خلاف سرکشی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پھر یہ جیسے وہ صلٰوۃ کے متعلق قرآن کریم نے کہا کہ یہ اسی کا نام صلٰوۃ سمجھتے ہیں' یہ جو محسوس مرئی دیکھنے والی فزیکل حرکات ہوتی ہیں' اسی طرح سے انہوں نے ایک چیز زکوٰۃ نکال لی' جتنا جی چاہے جمع کرتے چلے جاؤ' اور اس میں سے اتنا سا سال کے بعد آپ دے دیجیے' اور اب تو اس میں بھی بڑی موج ہوئی ہے۔ بنک میں سے دس فیصد Interest لیجیے اور ڈھائی فیصد اس میں سے زکوٰۃ دے دیجیے' ساڑھے سات فیروی بچ جاندا ہیگا (ساڑھے سات فی صد پھر بھی بچ جاتا ہے)۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے بینا نہ گئی۔ دین دا تقاضا وی پورا ہو گیا تے موج وی ہو گئی نال (دین کا تقاضا بھی پورا ہوا اور ساتھ موج بھی ہو گئی)۔ اس مذہب کو کون چھوڑے گا! مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ مُعۡتَدٍ (50:25) ہمارے نظام سے سرکشی اختیار کرتا ہے' کیوں؟ اس لیے کہ مُّرِیۡبِۙ (50:25) اسے اس بات میں شک ہے جو کہا جاتا ہے کہ ہمارے نظام میں یہ ہو گا۔ یہ کہتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوا تو پھر ہم بھی اور ہمارے بچے بھی مر گئے اور اگر نظام وہی ہے جو اُسے یقین نہیں دلا سکتا' ضمانت نہیں دلا سکتا' تو وہ اسلامی نظام نہیں کہلا سکتا۔ کہا ہے کہ الَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ (50:26)۔ آہاہا!

''یہ وہ ہیں کہ جنہوں نے خدا کے ساتھ اور خدا بھی تجویز کر رکھے ہیں۔''

تثلیث' مولویت اور تراشیدہ خدا

یہ پھر ایک اور موضوع آ گیا کہ کس قسم کے اور خدا تراشے ہیں؟ قرآن کریم کہتا ہے کہ انہوں نے اور خدا تجویز کر رکھے ہیں یعنی یہ جو خدا کا تصور ہے' وہ جو خدائے عرش ہے' اس کے ساتھ تو اور خدا تجویز کر رکھتے ہیں۔ یہ عیسائی کہتے ہیں' جسے وہ تثلیث کہتے ہیں یعنی باپ بیٹا روح القدس۔ ان سے بھی بات ہوتی ہے' یہ میرے پاس آتے ہیں' ان کے ہاں کے اچھے پڑھے لکھے ہوئے پادری بھی آتے ہیں' یہ عام ایم اے کرنے کے بعد دو سال مزید پڑھتے ہیں تو پھر جا کر یہ پادری بنتے ہیں' یہ مولوی صاحب نہیں ہیں' اب تو مولوی صاحب بننے کے لیے اتنا بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں جو عام مولیوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ داڑھی رکھ لیجیے تو انہیں مولوی صاحب' ممتاز عالم دین' لکھا جاتا ہے پھر ان سے بھی کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ ان سے بھی جب بات ہوتی ہے تو وہ بھی اب یہ نہیں کہتے کہ ہم واقعی سچ مچ ان کو خدا مانتے ہیں لیکن

یہ جو قرآن حکیم نے بار بار کہا ہے کہ الَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ (50:26) جو چیز صرف خدا کے لیے مختص ہونی چاہیے اس میں کسی انسان کو شریک کرنا' اسے خدائی درجہ دیدینا ہے اور ایک اس موضوع کے لحاظ سے میں اس کی ایک ہی مثال پیش کرونگا ورنہ یہ الٰہ جو قرآن کریم نے کہا ہے کہ انسان کس کس قسم کے اور الٰہ تجویز کرتا ہے وہ تو پوچھو نہیں' وہ تو کہتا ہے کہ خود اپنی خواہشات کو بھی یہ خدا بنالیتا ہے' میری نہیں مانتا' اپنی خواہش کی مانتا ہے تو جس کی مانی جائے وہ خدا ہے۔ الٰہ کے تو معنی ہی صاحبِ اقتدار کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ نہیں ہوتا جس کی پرستش کی جائے' جس کا اقتدار مانا جائے' جس کی بات مانی جائے' وہ تو کسی انسان کو حق نہیں دیتا کہ اپنی بات کسی دوسرے انسان سے منوائے۔ یہ تو تذلیلِ انسانیت ہے۔ سارے انسان مساوات کے درجے پہ ہیں' حقِ حکومت قرآن حمید کی رو سے کسی انسان کو حاصل نہیں ہے' صرف خدا کو حاصل ہے جو خدا کی کتاب کی رو سے عمل میں آتا ہے۔

الٰہ' انسان' ملکیت ارض اور معاش کا مسئلہ

الٰہ پھر میں ایک الٰہ کہہ رہا تھا تو اس وقت معاش کا مسئلہ تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ بنیادی چیز ارض یا زمین ہے' جہاں سے یہ سارا رزق پیدا ہوتا ہے' Raw Material (خام مال) بھی وہاں سے نکلتا ہے۔ آگے چل کر پھر وہ اور شکلیں اختیار کر لیتا ہے۔ بنیاد' پیدائش کی اصل تو وہی ہوتی ہے جو ارض ہے۔ ارض کو خدا نے بڑا ضروری قرار دیا ہے۔ ارض کے متعلق اس نے یہ کہا ہے کہ وَضَعَهَا لِلۡاَنَامِ (55:10) ہم نے تمام مخلوق کے لیے اس کو پیدا کیا ہے۔ یہ کسی فرد کے لیے پیدا نہیں کیا ہے' وہ ارض کے اوپر کسی کی ملکیت کو جائز ہی قرار نہیں دیتا کیونکہ یہ ذریعۂ رزق ہے' اس سے رزق پیدا ہوتا ہے اگر سرچشمہ رزق پر افراد کی ملکیت تسلیم کر لی جائے تو پھر باقی افراد جس طرح سے بھوکے مر سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں ملکیتیں کی ہوئی ہیں۔ انہوں نے ہزار ہزار' دو دو ہزار' دس دس ہزار ایکڑ ایک ایک فرد کی ذاتی ملکیت قائم کی ہوئی ہے اور وہ ملکیت کسی کاشتکار کو بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ تو وہ سارا سال محنت کرتا مر جاتا ہے اور وہ گھر بیٹھے ہوئے اس میں سے کم از کم آدھا لے جاتا ہے۔ یہ کس بات کا لے جاتا ہے؟ کہ زمین کی ملکیت میری ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ الارض للّٰہ زمین کی ملکیت صرف خدا کی ہے کسی انسان کی نہیں ہے اور کہتا ہے کہ اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ (19:40) زمین کا وارث خدا ہی ہے' زمین پر ذاتی ملکیت خدا کی ہے مگر انسان کہتا ہے کہ یہ میری ملکیت ہے اور کاشتکار سے کہتا ہے کہ آدھا مجھے دے اور آپ کی فقہ اس کو جائز قرار دیتی ہے۔ یہ فقہ بنی ہی آپ کے ملوکیت اور سرمایہ داری کے زمانے کی ہے۔ کس چیز کا معاہدہ لیا جاتا ہے؟ اس کا کہ ارض خدا کی' محنت کاشتکار کی مگر فقہ میں یہ کچھ ہے۔ اور یہ شرعاً بھی جائز ہے اور پھر قانون تو آپ کے ہاں اسے جائز ہی قرار دیتا ہے۔ یہ ہے جس کو مزارعت کہتے ہیں صاحب سنیے! سورۃ بقرۃ میں ابتدائی آیات میں ہی یہ چیز آ گئی ہے۔

عزیزانِ من! زمین کے متعلق میں عرض کر رہا تھا۔ ابتدا تو ہوتی ہے کہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (2:21) نوعِ انسانی کو پکار کر کہا گیا ہے کہ صرف محکومیت خدا کی اختیار کرو جس نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے تمہاری پہلی نسلوں کو بھی پیدا کیا ہے تاکہ تم محفوظ رہو خرابیوں سے تباہیوں سے بچ جاؤ۔ تَتَّقُوْنَ (2:21) ''بچاؤ'' کو کہتے ہیں۔ یہ کونسا خدا ہے؟ کہا ہے کہ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) جس نے زمین پیدا کی، تمام انسانوں کے لیے زمین میں سے رزق پیدا کرنے کے لیے پھر آسمان سے بارش برسائی، بالوں سے مینہ برسایا، مختلف قسم کی اس میں فصلیں پیدا ہوئیں، پھل پیدا ہوئے۔ کہا کہ یہ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) ہے۔ الناس پہلے کہا ہے، عزیزانِ من! پوری نوعِ انسانی کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) تم سب کے لیے یہ رزق ہے، سامانِ زیست ہے، تخصیص ہی نہیں ہے کہ کوئی روک لے۔ اس نے خدا کی زمین کہا، یہ انتظام کیا، اس نے یہ پیدا کیا، الناس کو وہ کہہ رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) یہ تم سب کے لیے سامانِ زیست ہے، کوئی اس کو روک نہیں سکتا اور وہ بات جو میں کہنا چاہتا تھا، اگلے ہی الفاظ میں آتی ہے کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (2:22) خدا کے ساتھ اور خدا نہ بناؤ کہ تم یہ زمین کی ملکیت ان کے حق میں دیدو۔ تم جانتے ہو کہ وہ اس کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ جو زمین کی ملکیت کا دعویٰ کرتا ہے، اس سے پوچھو کہ صاحب! کس طرح سے یہ ملکیت ہوئی؟ کہ جی! میں نے تو فلاں سے خریدی تھی۔ چوری کا مال خریدنے والا جو ہوتا ہے، وہ تو خود چور ہوتا ہے، اس کی ملکیت کیسے تھی؟ کہ جی! وہ کسی سے خریدی تھی۔ غلط نظام کے اندر یہی طریقے ہوتے ہیں۔ یہ فریبی ہے یا میں نے اپنے ماں باپ سے یا اپنے بڑوں سے ورثہ میں پائی تھی یا جن سے ورثہ میں پائی تھی، انہوں نے یہ کہاں سے لی تھی یعنی آپ ملکیت کا حق کہیں ثابت کرو سب سے پہلا انسان بھی جس نے وہ زمین کے اوپر لکیر کھینچ کر کہا کہ یہ میری ہے، اس کا حق بتاؤ کہ کیا تھا ملکیت کا زمین کے اوپر؟ عزیزانِ من! کسی قانون و دلیل کی رو سے آپ اس کا حق نہیں ثابت کر سکتے۔ جس چیز کو خدا نے بنایا اور مفت دیا ہے اور دیا اس لیے کہ رِزْقًا لَّكُمْ (2:22) اے نوعِ انسانی! تم سب کے لیے یہ ذریعہ رزق ہے تو کہا کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا (2:22) کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہاں لایا ہے اس چیز کو! یہ ہے شرک: خدا کے ساتھ اور خدا نہ قائم کر لو کہ جو اس کی ملکیت کی چیز ہے اس میں اوروں کی ملکیت شامل کر لو، یہ اور خدا بن گئے۔ انہوں نے، تو تثلیث والوں نے، وہ تین ہی بنائے تھے اور یہاں تو قدم قدم پر ایک ایک خدا ہے:

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خدا وندے دگر[1] (اقبال: پیامِ مشرق)

---

[1] اے حرم کے پیر (اے پیشوائے دین)! اقبال کو کعبے میں داخل نہ ہونے دے۔ وہ تو ہر گھڑی اپنی آستیں میں ایک نیا بت رکھتا ہے۔

اُسے کعبے میں نہ جانے دے' یہ توحید پرست نہیں ہے' یہ وہاں جا کر یوں خدا کا نام تو لے گا' اس کی آستیں میں ہر آن نیا خدا ہوتا ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

رست از یک بند تا افتاد در بندے ❶ دگر

دیکھیے! یہ جو ذہن کی شرک کی عادت ہے وہ ہر آن اپنے لیے ایک نیا خدا تراشتی ہے' کسی نہ کسی طرح سے ایک خدا کے پھندے سے چھوٹتا ہے تو ایک اور خدا تراش لیتا ہے۔

کہا ہے کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا (2:22)۔ وہاں کہا کہ تکذیبِ دین وہ کرتا ہے جو رزق کو اور خیر کو روک لیتا ہے یہاں کہا کہ یہ انسانوں کو خدا بنا دینا ہے اگر اس چیز میں ان کا حقِ ملکیت تسلیم کر لیا جائے جو کہ صرف خدا کی ملکیت ہے۔ عزیزانِ من! روز مقدمے ہوتے ہیں کہ جی! یہ تو میری زمین ہے صاحب! یا میرا مال ہے اور یہ اس میں دعویدار بنا ہوا ہے۔ کوئی نہیں تسلیم کرتا کسی دوسرے کو۔ یہ تو صرف خدا کی خدائی کا حق ہے جس کے متعلق جس کا جی چاہے اٹھ کر اس کے اندر شریک ہو جائے' دعویدار ہو جائے اور اس کے بعد پھر میں نے عرض کیا ہے کہ آپ کے ہاں کی فقہ کی جو شریعت ہے' وہ اسے تسلیم کرتی ہے' وہ مزارعت کو تسلیم کرتی ہے اور قرآنِ کریم کہتا ہے کہ خدا بنانے والے کو فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ (50:26) سخت عذاب میں پھینک دیں گے۔ وہ دین کی تکذیب کرتے تھے اور خدا کے ساتھ مزید خداؤں کو شامل کرتے تھے۔

جنت اور جہنم صرف اگلی دنیا میں' جنت و جہنم میں مکالمے اور قصہ آدم' ذمہ داری کا احساس

عزیزانِ من! میں وہ بار بار کہا کرتا ہوں کہ ہم نے یہ جہنم بھی' یہ جنت بھی' اگلی دنیا پہ ہی اٹھا رکھا ہے۔ اگلی دنیا کا جنت اور جہنم برحق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تو یہاں سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہ جو غلط نظام ہے' جس میں دین کی تکذیب ہو رہی ہے' جس میں ہر تنہا رہ جانے والے کو دھکے ملتے ہیں' پارٹی اور جتھہ ہے' جس کی عزت ہے' جس کے ہاتھ میں طاقت ہے' جس میں ہر محروم کو روٹی سے محروم کر دیا جاتا ہے' جس میں خدا کی ملکیتوں کو انسانوں کی ملکیتیں بنا لیا جاتا ہے' یہ جو نظامِ باطل ہے' غیر قرآنی نظام ہے' یہ اس کا جہنم نہیں جس کے اندر ہم ماخوذ ہیں کیا ہم جنت کی زندگی بسر کر رہے ہیں' کیا یہ جہنم کی زندگی نہیں ہے؟ جس کے ہاں کھانے کو ہے وہ بھی جہنم کی زندگی کے اندر ہے' جو بھوکا ہے وہ بھی جہنم کی زندگی کے اندر ہے۔ آگ کی مختلف قسمیں ہیں' وہ بھی تو آگ ہے جسے خدا نے کہا ہے کہ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُo الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ (104:6,7) وہ آگ ہے کہ جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ سوچیے تو جن کے ہاں اتنا کچھ فراوانی

---

❶ ہماری فکر ہر لحظہ ایک نیا آقا (یا نیابت) تراشتی ہے۔ جب وہ ایک بند (قید) سے نکلتی ہے تو کسی اور بند میں گرفتار ہو جاتی ہے یعنی ہماری ہوس نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔

سے کھانے پینے کو ہے' کیا ان کے دلوں کو ان شعلوں نے لپیٹا ہوا نہیں ہے؟ بھوک کی آگ تو صرف پیٹ تک ہوتی ہے' ان کی آگ تو سارے جسم کو جلا رہی ہوتی ہے۔ یہ ہے عذابِ شدید جس کے اندر وہ قوم مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ دین کی تکذیب کرتی ہے' خدا کے ساتھ اور خدا ملا دیتی ہے۔ کہا ہے کہ وہاں اور مقامات میں بھی قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہاں مجرم یہ کہے گا کہ میں تو مجرم نہیں' میں نے تو یہ کچھ نہیں کیا' یہ میرے ساتھی تھے' یہ دوست تھے' میرے حوالی موالی تھے' انہوں نے مجھے تباہ کیا ہے' انہوں نے مجھے گمراہ کیا' میں غلط راستے پہ اس لیے پڑ گیا' میں ایسا نہیں تھا۔ کئی مقامات پہ یہ چیز ہے حتیٰ کہ قرآن کریم نے تو بیشتر مقامات میں لیڈروں اور ان کے Followers (متبعین) کے مکالمے درج کیے ہیں۔ یہ Followers (متبعین) کہیں گے کہ یا اللہ! یہ ہیں جنہوں نے ہمیں تباہ کیا۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ ہمارے پاس کونسی طاقت تھی' تمہاری طاقت تھی جس کی بنا پر ہم سب کچھ کرتے تھے' تم ہم سے بھی زیادہ مجرم ہو۔ یہ بڑے دلچسپ مکالمے ہیں اور کئی دفعہ سامنے آچکے ہیں پھر بھی جب موضوع آئے گا تو میں عرض کرونگا کہ وہ دوسروں کو الزام دیں گے' یہاں صرف یہ کہا ہے کہ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍۭ بَعِيْدٍ (50:27) وہ ساتھی جس کو یہ ملزم قرار دے رہا ہوگا کہ اس نے مجھے تباہ کیا' وہ کہے گا کہ بارِالٰہی! بات بالکل غلط کہہ رہا ہے' جھوٹ بوّل رہا ہے' یہ خود ہی غلط راستہ پہ چلنے کے لیے آمادہ تھا' میرا اگر کوئی واقعی قصور ہے تو یہ قصور ہے کہ میرے ساتھ وہ بھی ایسا ہی ہے ورنہ میں نے اسے مجبور تو نہیں کیا تھا کہ یہ کچھ میرے ساتھ چل کر کرے۔ کہا ہے کہ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (50:28) یہاں جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے' ہم ہر بات سے واقف ہیں اور اتنی سی بات کا تو تم بھی اقرار کرو گے کہ تم دونوں کے پاس ہمارا وہ حق تھا جو صحیح راستے کی راہنمائی تھی' دونوں کے پاس پہنچ چکی ہوئی تھی تو پھر یہ کہنا کہ اس نے مجھے گمراہ کیا' نہیں جی! اس نے نہیں اس نے گمراہ کیا' اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ دونوں کو ہم نے آنکھیں دیں' وہ سورج کی روشنی دونوں کے لیے کھلی ہوئی تھیں۔ اب دوسرے کو الزام کیوں دیتے ہو' ذمہ داری خود کیوں نہیں لیتے۔

عزیزانِ من! پھر بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ ساری بات ذمہ داری لینے کی ہے جو غلطی کی ذمہ داری قبول کرتا ہے اس کی اصلاح کی گنجائش' امکان ہوتا ہے' جو دوسرے کے سر دھرتا ہے' اس کی اصلاح بھی نہیں ہوتی۔ قصہ ابلیس و آدم ہے ہی اتنا۔ آدم سے بھی ایک لغزش ہوئی' ابلیس سے بھی ایک لغزش ہوئی کہ اس نے سجدہ نہ کیا۔ اس نے جو جیسا کہا گیا ہے کہ وہ معصیت تھی' وہ شجر کی طرف چلا گیا۔ دونوں سے لغزش ہوئی۔ آدم سے کہا کہ آدم! یہ تم نے کیوں کیا؟ کہا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) میرے بارِ خدایا! غلطی ہوگئی مجھ سے' بھول ہوگئی مجھ سے' بھول اور غلطی تو معاف کر دیں تو آئندہ کے لیے ہم صحیح رہیں گے۔ کہا کہ جب تم نے اپنی ذمہ داری کو قبول کر لیا ہے کہ واقعی تمہاری غلطی تھی تو اس لیے اصلاح کی گنجائش ہے' تمہاری طرف ہماری راہنمائی آئے گی تو جو اسے قبول کرے گا' اسے فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) کوئی بات نہیں' کسی قسم کا خوف و ہراس نہیں ہوگا۔ ابلیس سے کہا کہ تُو نے سجدہ کیوں نہ

کیا' سرکشی برتی' معصیت کی ہمارے ہاں سے۔ کہا کہ بارِالٰہا! کیا کہہ رہے ہیں آپ' میں کون ہوتا ہوں معصیت کرنے والا' تیرے حکم کے بغیر تو پتہ نہیں ہل سکتا' تیرے حکم اجازت کے بغیر میں بھلا معصیت کرسکتا تھا' میں قصوروار تو نہیں ہوں۔ کہا کہ جب تمہاری یہ ذہنیت ہے کہ اپنی غلطی کو قبول کرتے ہو' نہ ذمہ داری کو تسلیم کرتے ہو' قیامت تک تمہاری اصلاح نہیں ہوسکتی۔ یہ ہے سارا قصہ۔ اصلاح اس کی ہوتی ہے جو اپنی غلطی کو تسلیم کرلے گا اور ہمارے جیسے گنہگار بیچارے جو ہیں' وہ تو پھر بھی تسلیم کرلیتے ہیں۔ جو اس فریب میں رہتے ہیں کہ ہم نے اتنی نمازیں پڑھ لیں' اتنی نیکیاں کرلیں' اتنی زکوٰۃ دے کر حج بھی ادا کرلیا' یہ سب کچھ وہ ایک طرف' انہوں نے بنک کے سائیڈ میں Credit رکھا ہوا ہوتا ہے' ایک طرف Debit رکھا ہوا ہوتا ہے' تو ادھر وہ ایک ایک نیکی کے عوض دس دس ہزار جواب گن کر وہاں جمع کرتے رہتے ہیں اور ادھر کا بہرحال گناہ تو ایک ہی ہوتا ہے کہ اس میں سے دو چار منفی بھی ہوگئے' بیلنس تو پھر بھی پڑا رہتا ہے اس کا' آپ دیکھیں گے کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتا ہے وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا۔ بڑا ضدی ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو ہمیشہ حق پہ کہتا ہے' دوسرے کو کہتا ہے کہ تُو گمراہ ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہی تو ساری بات ہے۔ اس کی اصلاح ہی نہیں ہوسکتی جو اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرتا' اپنی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا' اسی لیے کہ ہم نے تم دونوں کے سامنے راستہ واضح کر کے رکھ دیا تھا آنکھیں بھی دی دی تھیں تو اب یہ کہنا کہ صاحب! میں گمراہ نہیں ہوا تھا' اس نے گمراہ کیا تھا' یہ تو ابلیسیت ہے۔ سوال ہی نہیں ہے' ہر فرد اپنے فیصلے اور اپنے عمل کا ذمہ دار ہے' دوسرے کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاتا۔ وہاں وہ چیز اور ہے کہ جبر سے کوئی مار مار کر کسی کو بت کے سامنے جھکا دے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ از خود کیا وہ اب تسلیم کرتا ہے' ذمہ داری کو قبول کرتا ہے یا نہیں؟

غیر متبدل قانون خداوندی اور قانون اور حکم کی تعریف اور تکمیلِ دین

کہا کہ وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ (50:28) جب راستہ واضح طور پر سامنے آگیا تھا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم خود غلط راستے پہ چلے یا کسی اور نے تمہیں بہکا دیا اور اب آگے بڑی عجیب بات آرہی ہے۔ کہا ہے کہ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (50:29)۔ عزیزانِ من! یہ چار الفاظ آئے ہیں۔ ان میں قرآن حکیم کتنی عظیم حقیقت بیان کر گیا ہے۔ اگر نظام یہ ہو کہ مملکت کے قوانین کو واضح طور پر بیان کر دیا جائے' پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' کسی کے لیے تبدیلی نہیں ہوگی' کسی وقت بھی تبدیلی نہیں ہوگی' یہ ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گے اور ہر ایک پر یکساں طور پر لاگو ہونگے' یہ ان پر چلنے کا انعام ہوگا اور اس کے بعد یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں' وہ ایسا ہی ہوگا اور اس پہ چھوڑ دیا جائے کہ اب تم ان قوانین کو' ان احکام کو اور اس شرط کو دیکھ لو جو ہم نے ساتھ واضح کی ہے۔ جی! ہاں تمہارا دل اس پر ہے تو قبول کر لیجیے' اس پہ بھی راضی نہیں ہوتے تو انکار کردو لیکن جب آپ

قبول کرلیں گے تو پھر تو تم پر ان کی اطاعت لازم آجائے گی۔ یہ شخص جسے یہ یقین ہو کہ یہ قانون ہے' یہ کبھی نہیں بدلیں گے' کسی کی خاطر اس میں تبدیلی نہیں ہوگی' اسے کتنا اطمینان حاصل ہوگا۔ قانون کی حکمرانی سے اطمینان ہی یہ ہوتا ہے۔

عزیزانِ من! اگر جو قانون ہے' وہ غیر متبدل ہو اور یہ یقین ہو کہ یہ کسی کے لیے بھی ایسا نہیں ہوگا کہ مجھ پہ لاگو ہو' اس پہ لاگو نہ ہو' وہ یہ دے کر چھوٹ جائے' اس کے حق میں قانون یوں لچک پیدا کردے' اس طرح سے استثنیٰ پیدا ہوجائے' بدلتا چلا جائے' یا یہ بھی بات ہو کہ آج ایک قانون ہے' جی پتہ نہیں کل قانون ہی بدل جائے' پھر ہم کیا کرلیں گے یعنی کسی کو اپنے مستقبل کے متعلق یقین ہی کچھ نہیں ہوتا' ہر وقت دھڑ کو دھڑ کو کرتے رہتے ہیں جسے کہا کہ جب کہیں یہ صورت پیدا ہو' یہ درحقیقت لاقانونیت ہوتی ہے۔ ویسے تو اعلان کرنے کو ایک قانون ہوتا ہے' آج ہوتا ہے' یقین نہیں ہے کہ یہ کل یہی قانون رہے گا' پتہ نہیں اس میں کیا تبدیلی ہوجائے۔ آپ کو یاد ہے کہ ان لوگوں نے Law (قانون) کی جو Definition (تعریف) کی ہوئی ہے وہ یہی ہے جو قرآن کریم کہتا ہے۔ ابھی میں قرآن کریم کے الفاظ کی طرف آؤں گا' اس Scientific دنیا میں' جس کو Law (قانون) کہا جاتا ہے' اس کی Difinition (تعریف) یہ ہے کہ If-Then اگر یہ کیا جائے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا اور آگے ہے Always ہمیشہ ایسا ہوگا۔ یہ جو تین شرطیں ہوتی ہیں' وہ پوری ہوتی ہیں تو Law (قانون) کہلاتا ہے۔ اگر یہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلے گا مثلاً انگلی آگ میں ڈالی جائے تو وہ جلا دے گی' اس سے درد ہوگا اگر یہ کرو گے تو یہ ہوگا' اور پھر Always (ہمیشہ) ایسا ہوگا۔ یاد رکھو! یہ جو ہمیشہ ایسا ہونا ہے' یہ اس کو Law (قانون) بناتا ہے۔ اگر یہ ہمیشہ کی بات نہ ہو' یہ ایک ہی دفعہ کی بات کرو' وہ ہوگا تو وہ حکم ہوتا ہے۔ حکم بدلتا رہتا ہے' Law (قانون) وہ ہے جو بدلتا نہیں ہے۔ کہا ہے کہ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) اعلان کردو کہ تکمیل ہوگئی قوانین و احکامِ خداوندی کی۔ پہلی چیز تو یہی ہے کہ دین مکمل ہوگیا' اب اس میں کچھ اور اضافے کی بات نہیں ہوگی: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) اور کوئی اس میں تبدیلی نہیں کرسکے گا' عزیزانِ من! کتنا بڑا اطمینان حاصل ہوتا ہے اس نظام میں جس میں یہ یقین دہانی ہو کہ یہ Law (قانون)' یہ ہے ضابطہ قوانین' یہ ہے مکمل' اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی صاحب! اور جیسا میں نے عرض کیا ہے اگر ہر وقت یہ کیفیت ہو کہ آج پتہ نہیں یہ قانون ہے' کل کو کیا ہوجائے' میرے لیے یہ قانون ہے' اس کے لیے کیا قانون ہوجائے یعنی یہ قانون بدلتا رہے۔ تمہید میں نے عرض کی ہے' قرآنِ کریم کے الفاظ اب آرہے ہیں عزیزانِ من! انسان وجد میں آجاتا ہے۔ ان سے کہا کہ مَا يُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَىَّ (50:29) یاد رکھو! ہماری بات بدلا نہیں کرتی اور اس کا نتیجہ کیا ہے کہ بات بدلا نہیں کرتی؟

ہم بندوں پہ ظلم نہیں کرتے مگر اعمال کا بدلہ ٹھیک دیتے ہیں

کہا کہ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ (50:29) ہم اپنے بندوں پہ ظلم نہیں کیا کرتے۔تو نظر آ گیا کہ قانون کی طرف سے جو بے یقینی ہے' یہ بھی ظلم ہے۔قانون کے متعلق یہ بے یقینی کہ پتہ نہیں کل کیا ہو جائے' عذاب ہے۔عزیزانِ من! ان دو ٹکڑوں کو جوڑ کر دیکھیے کہ قرآن کریم کہہ گیا ہے ہم اپنے بندوں پہ ظلم نہیں کیا کرتے۔ظلم کیا ہے؟ یہ کہ آج کچھ قانون' کل کچھ قانون' یقین ہی نہ ہو' ضمانت ہی نہ ہو کہ کل کو کیا ہو جائے گا۔کہا کہ یہ بات ہمارے ہاں سے نہیں ہوتی۔یہ تو بندوں پہ ظلم ہے۔ہمارے ہاں سے بندوں پہ ظلم نہیں ہے۔ہم ظلم نہیں کیا کرتے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ہمارا قانون بدلا نہیں کرتا۔دیکھا' عزیزانِ من! بات تو چھوٹی سی تھی' نتیجہ کتنا عظیم ہے جو قرآن حکیم بیان کر گیا ہے۔قرآن حکیم کرتا ہی یہ ہے۔آپ یوں نکل جایئے کہ ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی' ہم بندوں پہ ظلم نہیں کرتے۔اب آگے بڑھ جایئے۔کہا ہے کہ يَوۡمَ نَقُوۡلُ لِجَهَنَّمَ ❶ (50:30)۔کچھ نہیں ذہن میں آتا' کھڑے ہو کر سوچیے قرآن حکیم کہتا ہے کہ ہمارے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے۔یہ تو اتنا محکم ہے جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں کہ پہاڑ پہ نازل کرتے تو جو قلب کوہ ہے' وہ شق ہو کر رہ جاتا ہے۔یہ وہ ہے قرآن کریم' اللہ اکبر! لیکن اس کے ساتھ ہی کہا ہے کہ انسانوں میں سے وہ بھی ہیں جن کے دلوں میں سے تو ایک قطرہ بھی چشمے کا نہیں پھوٹتا۔وہ ہم لوگ ہیں۔

قانون کی محکمیت

یہ کتنی اسلامی مملکت' اسلامی نظام' قرآنی نظام' قرآن حمید کے اصول کی' ایک عظیم بنیادی حقیقت واضح کر دی کہ قانون کے متعلق اگر بے یقینی پیدا ہو جائے تو وہ انسان پر ظلم ہے حالانکہ وہ دوسرا فیصلہ بھی بدلے ہوئے' قانون ہی کے مطابق ہوگا' عدالت اس کو بھی Justice (انصاف) کہے گی۔قرآن حمید تو عدالت کے فیصلے کو Justice (انصاف) نہیں کہتا۔کہتا ہے کہ وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ (7:181) عدل وہ عدل ہے جو قرآن کریم کے مطابق کیا جائے۔یہ نہیں کہ جو قانون تم بنا لو' اس کے مطابق جو فیصلہ کیا جائے۔ہمارے دنیا میں جتنے نظام ہیں ان میں تو یہی ہوتا ہے کہ ایک مقنّنہ ہوتی ہے' وہ قانون بناتی ہے' جس قسم کا بھی وہ قانون بنائے' وہ عدلیہ کو دیدیتی ہے' عدلیہ اس قانون کے مطابق فیصلہ کرتی ہے' تو اسے انصاف کہا جاتا ہے۔وہ خود قانون کس قسم کا ہے' اس سے عدلیہ کو واسطہ نہیں ہوتا۔کسی کو منظور نہیں ہے تو مقنّنہ سے جا کر کہے کہ تمہارا یہ قانون اس قسم کا ہے' اس میں کچھ تبدیلی کرو' جب تک تبدیلی نہیں ہوتی' اس وقت تک عدالت مجبور ہے کہ اس کے مطابق فیصلہ کیے جائے۔اس کو انصاف کہتے ہیں۔قرآن حمید کہتا ہے کہ اس کا سوال ہی نہیں ہے وَ بِهٖ يَعۡدِلُوۡنَ (7:181) جو عدالت قرآن کریم کے مطابق فیصلہ کرے گی' اس کے فیصلے کو انصاف کہا جائے گا۔اس کے لیے مقنّنہ یہ ہے اور اس کے فیصلے لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115)

---

❶ اس سے پوچھا جائے گا کہ کیا تُو مجرموں سے بھر گئی؟

ہیں کہ جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔اس سے بڑا اطمینان اور سکون ہوتا ہے' عزیزانِ من! اگر جس کو ہم خود ذہن میں کہتے ہیں کہ یہ ہو جائے' معلوم نہیں کہ کہاں ہوگا اور کب ہوگا لیکن آپ سوچ لیجیے جو قرآن کریم کہہ رہا ہے' نظری طور پہ بھی' عملاً بھی اگر کہیں یہ نقشہ مسلط ہو جائے تو انسانوں کو کس قدر سکون اور کس قدر اطمینان نصیب ہوجائے۔کہا ہے کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (6:115) وہ خدا جس کے اختیار میں ہر وقت یہ چیز ہے کہ ساری کائنات کو بدل کر رکھ دے' وہ اتنا بڑا اطمینان' اتنی بڑی ذمہ داری لے رہا ہے' اتنا بڑا اطمینان دلا رہا ہے کہ ہم بھی نہیں بدلیں گے۔کیا بات ہے اس خدا کی! کہا یوں ہے کہ جن کا فیصلہ ہو رہا ہے یہ اہلِ جہنم ہیں اور وہاں جائیں گے۔

جہنم کیا ہے؟

کہا ہے کہ يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (50:30) یہ جہنم کی وسعتیں ہیں کہ اس میں اتنا کچھ ڈال دیا جائے گا اس کے باوجود اسے کہا جائے گا کہ کیوں بس ٹھیک ہے' پیٹ بھر گیا' وہ کہیں گے کہ نہیں اور لے آئیے۔جہنم کسی جگہ کا نام نہیں ہے' عزیزانِ من! جو بھر جانے والی بات ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ہر فرد اپنا اپنا جہنم یہاں سے ساتھ لے کر جاتا ہے۔شاید آپ کو اقبالؒ کی وہ نظم یاد آ گئی ہو گی جو میں عام طور پہ پیش کیا کرتا ہوں۔یہ بڑی دلچسپ ہے۔اس نے کہا کہ میں گیا' وہاں ملائکہ نے مجھے جنت دکھائی' مختلف مناظر تھے' بہت خوش ہوا' واپس آنے لگا تو میں نے کہا کہ یار! وہ جہنم کا بھی ایک سنا ہوا ہے' ذرا اس کی بھی ایک جھلک دکھا دیجئے' دیکھوں تو سہی۔اس نے کہا کہ جی چلیے اور دیکھیے۔ذہن میں یہ تھا کہ اس کے شعلے لپک لپک کر آسمان تک جا رہے ہوں گے' گڑگڑاہٹ ہوگی' اتنی حرارت ہوگی۔وہاں جا کر دیکھا کہ وہ تو ایک بالکل یخ بستہ ٹھنڈا سنسان سا ایریا ہے۔میں نے پوچھا: کیا یہ جہنم ہے؟ کہنے لگے جی! میں نے کہا کہ وہ جو آگ اور اس کے شعلے اور ایندھن ہے' وہ کیا چیز ہے۔اس نے کہا کہ حضرت!

اہل دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

کیا بات ہے جی! وہ جہنم بھر کیسے جائے گی؟ وہ تو ہر فرد اپنا جہنم ساتھ لے کر جاتا ہے۔

جنت کیا ہے؟ ایمان بالغیب کیا ہے؟ اس میں کیا ملے گا؟

اب بات دوسری طرف چلی جائے گی۔کہا ہے کہ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ (50:31) اس جنت کو بھی ذرا قریب کر دیا جائے گا۔کہا ہے کہ ویسے تو اب بھی وہ دور نہیں ہے۔کیا بات ہے! وہ دیکھنے والی آنکھیں ہونی چاہئیں۔اب بھی تم سے وہ کچھ بعید نہیں ہے اگر دل میں قرآن کریم کے احکام کا سکون اور اس کی حکایت اور اسکی عمرانیت موجود ہے تو وہ تو جنت تمہارے اندر آباد ہوتی ہے:

جنت تیری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

وہ جنت ہے اب بھی وہ بعید نہیں' دور نہیں ہے' بس یہ ہے کہ ابھی تمہاری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں رہیں' کوئی بات نہیں' ہم ذرا اور قریب کر دیں گے' جنت دیکھ لو گے۔ کہا ہے کہ هٰذَا مَا تُوعَدُونَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيظٍ (50:32) یہ تھا وہ جو ہم نے ہر اس کے لیے وعدہ کیا ہوا تھا جو خدا کے قانون کی طرف آنے والا ہے' اور حفاظت کرنے والا ہے۔ وہ اس حقیقت کو ہر وقت اپنے سامنے رکھے کہ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ (50:33) جو خدا کے نظام رحمت و ربوبیت کی صداقت پر یقین رکھے اور اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے ڈرے اور دل کے پورے جھکاؤ کے ساتھ اس کی طرف آ جائے' جسے خُشِیَ کہتے ہیں' یہ ڈرنے والی بات اور ڈر والی بات نہیں ہوتی۔ یہ کسی آنے والے خطرے سے' جو احتیاط کا احساس ہوتا ہے' اسے کہتے ہیں۔ خشی بالغیب کے معنی عام طور پر یہی کیے جاتے ہیں کہ جی! غیب کا علم تو ہمیں نہیں ہے' ہمیں غیب پہ ایمان لے آنا چاہیے اور غیب سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ یہ بات غیب کی نہیں ہے۔ قرآن حکیم یہ کہتا ہے کہ اس دانے کو' اس زمین کے اندر بو دو گے اور اس طرح سے اگر اس قانون کے مطابق اس کی نگہداشت کرو گے' پرورش کرو گے' تو یہ ایک دن تمہیں سات سات سو دانے دیدیگا۔ اس دانے کو جب زمین میں بویا جاتا ہے تو اس وقت یہ سات سات سو دانے سامنے نہیں ہوتے۔ یہ خدا کا ارشاد ہوتا ہے' اس کا کہنا ہوتا ہے' اس کی ایک ضمانت ہوتی ہے' کسان اس پہ یقین کرے تو پھر تو وہ دانہ بونے کی محنت کرے گا' اور اگر اس پہ یقین نہیں کرے گا تو وہ مشقت ہی نہیں کرے گا۔ یہ جو خدا کے اس وعدے پر یقین ہے کہ اگر یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا' اس وقت تو تمہارے سامنے وہ سات سو دانے والی بات نہیں ہے' لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ اس سے سات سو دانے ہوں گے۔ اسے کہتے ہیں بن دیکھے نتائج پر یقین رکھنا۔ کسان محنت ہی اس طرح سے کرتا ہے کہ وہ بن دیکھے' ان دیکھے نتائج پر یقین رکھتا ہے۔ یہ ہوتا ہے جسے بالغیب ایمان کہتے ہیں ورنہ عام معنی ہوتے ہیں تو اس میں دلیل اور برہان علم و بصیرت اور عقل و فکر کی تو بات ہی نہیں ہوتی۔ ایمان بالغیب والی بات ہوتی ہے صاحب! غیب پہ ایمان رکھنا ہوتا ہے صاحب!

ان سے پوچھو تو سہی کہ یہ بات کیا ہے جو کہہ رہا ہے۔ یہ ہے وہ غیب' جو اس وقت نگاہوں سے پوشیدہ ہے لیکن کسی وقت اس نے باہر آنا ہے' مشہود ہونا ہے۔ بہرحال کہا ہے کہ جَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ (50:33) وہ ایسا دل ساتھ لے کر آتا ہے' جو رجوع کرتا ہے ہمارے اس کہنے کے اوپر' جو ہم نے کہا ہے کہ ایک دانہ بوؤ گے' تو اس میں سے سات سو دانے اگیں گے۔ ہم ان سے کہیں گے اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ (50:34) داخل ہو جایئے۔ یہ " بسلم" بڑا جامع لفظ ہے۔ یہ جسے سلامتی کہتے ہیں' اس کے معنی Peace (امن) ہی نہیں ہوتا' تکمیل بھی اس کے معنی ہوتا ہے' جو پورے کا پورا ہونا ہے انسان کی جو تکمیل ذات ہے' یہ چیز بھی اس میں شامل ہوتی ہے۔ مرغ مسلّم تو آپ نے سنا ہوگا۔ وہ اسی سلامتی سے تو ہے کہ پورے کا پورا ہو' تو جب ہے۔ اگر ایک ٹانگ ہو تو وہ مسلم نہیں ہوتا۔ بِسَلٰمٍ

(50:34) کہا ہے کہ تکمیلِ ذات کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ ان لفظوں کے لیے میں نے شیخ ❶ صاحب سے وقت مانگا تھا کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (50:35)۔ آہاہا! بھئی! بات کچھ لمبی ہو جائے گی' جی صاحب! یہ عظیم بات ہے۔

جنت کے متعلق بتایا' اُس کی یہ خصوصیت بتائی کہ اس میں جو تم چاہو گے ہوگا اللہ اکبر! جو چاہو گے ہوگا' بہت بڑی بات ہے صاحب! راوی عیش لکھتا ہے اور آگے یہ ہے کہ اتنی بات نہیں کہ جو تم چاہو گے' وہ ہوگا بلکہ ہمارے پاس اس سے بھی زیادہ ہوگا یعنی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کہا ''جو چاہو گے'' ہوگا' تو اس سے زیادہ کیا کہا ہوگا' یہ بچے آپ کے ساتھ مارکیٹ میں کچھ لینے کے لیے جاتے ہیں۔ کیا لیتے ہیں؟ یہ موٹر' یہ موٹر سائیکل' وہ کھلونا ہی ہوتا ہے' ہم ساتھ ہی کہتے ہو کہ بیٹا! بڑے ہو گے تو پھر ہم تمہیں کچھ اور بھی لے کر دیں گے۔ وہ جو اصلی موٹر ہوتی ہے تو کہا کہ زندگی کی جس سطح پہ تم ہو' یہ تو تمہارا بچپن ہے' تم کھلونوں سے بہل جاتے ہو' ہمارے پاس تو حقیقی موٹریں ہیں' جو ہم تمہیں دیں گے۔ جو تم چاہتے ہو' یہاں ہمارے پاس اس سے کہیں اور زیادہ رکھا ہے۔ تمہارا ظرف ابھی اتنا سا ہی ہے۔ ظرف کے پیمانے وسیع ہو جائیں گے اور اس کے مطابق ہم تمہیں دیں گے صاحب! جو چاہو گے ملے گا' اس سے زیادہ ہم تمہیں دیں گے۔ یہ ہے جنت اور اسی پہ میں نے کہا تھا کہ ایک لفظ یاد آ گیا۔ یہ تو وہ ہے جو جنت کی زندگی ہے اور یہ جو ہماری جہنم کی زندگی ہے' جس میں یہ کہا تو اس کے لیے میں کہا کرتا ہوں کہ

بے نیاز سے تری ناز اٹھائے کیا کیا
جو نہ چاہا وہ ہوا' اور جو چاہا نہ ہوا

اور آگے ہے کہ

مبدائے فیض سے بس اتنا گلا ہے مجھ کو
کہ جو نہ مانگا وہ ملا اور جو مانگا نہ ملا

عزیزانِ من! یہ جہنم ہے اور ایک وہ ہے کہ جو چاہو گے ملے گا' جو مانگو گے ملے گا' اس سے زیادہ یہ ہوگا۔ اس پہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ یہ جی جو چاہو گے' ہوگا اور اگر کوئی چیز انسان کی ناجائز خواہش ہوگی تو کیا وہ بھی ساتھ دے دی جائے گی؟ یہ قرآن کریم ہے' عزیزانِ من! کہتا ہے کہ ہم یہ بات مومنین کی کر رہے ہیں' اہلِ جنت کی کر رہے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30) وہ چاہیں گے ہی وہ' جو ہمارا قانون چاہے گا' وہ تو اس کے خلاف کریں گے ہی نہیں۔ کیا بات ہے صاحب!

ہم سورۃ قٓ کی آیت 35 تک آ گئے' عزیزانِ من! 36 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

---

❶ ناظم ادارہ طلوع اسلام جو دروس کی ریکارڈنگ کا بھی نام کرتے تھے۔

چوتھا باب: سورۃ قٓ (آیات 36 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1982ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ قٓ کی آیت 36 سے ہو رہا ہے: (50:36)۔

مقامِ مومن کے سلسلہ میں لفظ مَّا یَشَآءُ کی اہمیت

سابقہ درس میں، جسے مقطع کا بند کہا جاتا ہے، آخری آیت ایسے وقت میں آئی تھی کہ وقت بہت تھوڑا تھا اور وہ آیت بڑی کشاد کی متقاضی تھی۔ اس کی وضاحت کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس کے متعلق چند الفاظ عرض کر دوں۔ وہ آیت ایسی نہیں ہے کہ اس سے انسان یونہی گزر جائے۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے اور اس میں مقامِ مومن بتایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مشیتِ ایزدی یا مشیتِ خداوندی کیا ہے یا یہ کہ جسے مَّا یَشَآءُ کہتے ہیں جو یفعلوا ما یشآء ہے ''خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے'' اسے اس کی مشیت کہتے ہیں۔ یہ چیز اس نے اپنے لیے مختص رکھی ہے، یہ چیز خدا ہی کے لیے ہے لیکن یہاں مقامِ مومن یہ بتایا گیا ہے اور مومنین کے متعلق یہ کہا ہے کہ **لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ فِیْھَا** (50:35) جنتی زندگی تو مومن کی ہوتی ہے تو مومنین کے متعلق مَّا یَشَآءُوْنَ ہے، جو مَّا یَشَآءُ خدا نے اپنے لیے رکھا تھا، وہ مومنین کے متعلق ہے کہ اس میں جو یہ چاہیں گے، ہوگا تو آپ سوچیے کوئی یہ چھوٹا مقام نہیں ہے۔ یہ اتنا ارفع مقام ہے، اتنا عظیم مقام ہے جو مومنین کو دیا

جاراہ ہے کہ مَّا یَشَآءُ جو خدا کی صفتِ مخصوصہ تھی، وہ شریک کیا جارہا ہے لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ ۔اب جیسا میں نے عرض کیا تھا وہ اس لیے ہے کہ یہ جو دوسرے مقامات پہ کہا ہے کہ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ (76:30) یہ ان مومنین نے اپنے آپ کو خدا کی مشیت میں ایسے ڈھال لیا ہوگا کہ وہ چاہیں گے ہی وہی جو خدا چاہتا ہے۔کیا بات ہے صاحب! یوں دونوں میں ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا ہوگئی کہ وہ مشیت جو خاصہ خداوندی تھا، اس میں انہیں شریک کیا جارہا ہے، اس لیے کہ یہ ان کی مشیت مشیتِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو چکی ہوئی ہے۔یہ جو رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہا جاتا ہے، اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں یہ قوانینِ خداوندی سے، مشیتِ خداوندی سے، ان کے دل کا تقاضا، ان کا چاہنا، ان کی خواہشات، ان کی آرزوئیں، ان کے مطلوب، ان کے مقصود، سارے وہ ہوتے ہیں جو خدا چاہتا ہے کہ ہوں۔جب یہ کیفیت ہوجاتی ہے تو اس وقت ان کے لیے کہا گیا کہ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ (50:35) ان کی اپنی مشیت بتادی گئی، وہ خدا کی مشیت ہے۔

انسانی خواہشات کے مقابلے میں مشیتِ خداوندی

جیسا میں نے عرض کیا ہے یہ کوئی چھوٹا مقام نہیں ہے، بڑی عظیم کیفیت ہے جو بتائی گئی ہے اور پھر اس میں جو اگلی بات تھی وہ تو اس سے بھی بہت آگے لے جاتی ہے۔کہا ہے کہ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ (50:35) وہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اپنے لیے چاہیں گے جو ان کی آرزوئیں ہونگی، جو ان کی خواہشات مطالبات ہونگے، تقاضے ہونگے، وہ پورے کیے جائیں گے مگر وَلَدَیْنَا مَزِیْدٌ (50:35) ہمارے ہاں تو اس سے بھی زیادہ ہے۔میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بات وہ خدا ہی کہہ سکتا تھا ورنہ کوئی دوسرا یہ کہہ ہی نہیں سکتا کہ بھئی! جو تم چاہو گے وہ تمہیں یہاں ہوگا، جو مانگو گے وہ ملے گا۔اس سے آگے تو نہ کہنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، کسی زبان میں گنجائش نہیں ہوتی، تو اس کے بعد جو تم مانگو گے وہ ملے گا، اس کے بعد ہم اس سے بھی زیادہ دیں گے۔یہ اس سے بھی زیادہ بڑی اہم چیز ہے۔کہا ہے کہ مَّا یَشَآءُوْنَ (50:35) میں تو ان کی ساری آرزوئیں آگئیں۔کہا کہ ان کی جو موجود سطحِ زندگی ہے، ان کی آرزوؤں کے پیمانے ہی بڑے محدود سے ہیں، وہ انہی کے مطابق کچھ چاہیں گے اور مانگیں گے۔ان کے مطابق تو مل جائے گا۔جیسا میں نے کہا تھا کہ بچے کو بازار لے جایئے، وہ کھلونا مانگتا ہے، مٹی کا گھوڑا مانگتا ہے، ٹین کی موٹر مانگتا ہے، اس کا مطالبہ پورا ہوجاتا ہے: مَّا یَشَآءُوْنَ (50:35) میں تو پوری بات ہوگئی لیکن ہم جانتے ہیں کہ بیٹا! ذرا بڑے ہوجاؤ گے تو لَدَیْنَا مَزِیْدٌ (50:35) ہمارے پاس اسٹیل کی موٹر سے بلند بھی کوئی شے ہے، تمہیں وہ لے کر دیں گے۔ہم تو اس وقت اس کی مانگ کے، اس کی آرزوؤں کے جو پیمانے ہیں، یہ پیمانے وسیع تر ہوجائیں گے اور یہ جو ان پیمانوں کے مطابق انہوں نے خود مانگا ہوگا، وہ خود ان پیمانوں سے کم رہ جائے گا تو کہا کہ یہ بات نہیں کہ پھر ہم کہیں کہ جو تم نے مانگا تھا وہ کچھ تو ہم نے تمہیں دیدیا، تو اب

اگر وہ اس وقت کے پیمانوں کے مطابق پورا نہیں اترتا' تو ہمیں تم کیا دوش دیتے ہو' تم نے تو مانگا ہی یہی تھا' تم نے چاہا یہی تھا۔ کہا کہ نہیں' کوئی بات نہیں ہے' ہم جانتے ہیں کہ ان کا اس سطح زندگی پر چاہنا کتنا محدود ہے اور جب ارتقائی منزل طے کرتی ہوئی زندگی آگے پہنچے گی' جسے کہ ہم جنت کی زندگی کہتے ہیں' اس وقت ان کے پیمانے اور بڑھ جائیں گے' موجودہ جو مطالبات پورے ہوئے ہیں' وہ ان پیمانوں پہ ممکن ہے آدھے تک بھی نہ رہیں' پونے تک ہی رہیں' کوئی بات نہیں صاحب! ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ پیمانے وسیع کرتے چلے جاؤ اور ہم ان میں وسعتیں پیدا کرتے چلے جائیں گے۔ مقامِ مومن' عزیزانِ من! ہمیں کیا پتہ ہے' کچھ الفاظ ہیں' جن کو ہم دہرا لیتے ہیں' خود مومن ہونا تو ایک طرف' زندگی میں تو مومن کوئی نظر بھی نہ آیا۔ کہا ہے کہ وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (50:35) اللہ اکبر! ''او میں کینا ہوناں کہ خدا بننا تے۔ بچہ ااِی اینوں ہیگا سی'' (میں یہ کہا کرتا ہوں کہ خدا بننا تو بچہ ہی اسے ہے)۔ جناب! یہی خدا ہو سکتا تھا۔

قرآنِ حکیم کے علاوہ دنیا بھر کے لٹریچر میں مومن کی خدا کے قالب میں ڈھلنے کی یہ بیان کردہ صفات کہیں نہیں ملتیں

میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! مذاہب کے علاوہ بھی دنیا بھر کا جتنا بھی لٹریچر میسر آسکتا تھا' دیکھا۔ مجھے یہ بات کہیں نظر نہیں آئی کہ انسان کی مشیت کو یہ کہا جائے کہ مشیتِ خداوندی سے الگ مومن کی اپنی مشیت ہے اور اس کے بعد یہ کہ ہمارے ہاں تو اس سے بھی زیادہ ہے جو کچھ یہ چاہیں گے' جو کچھ یہ مانگیں' مجھے کہیں اور نظر نہیں آیا: لا ریب یہ خدا ہی کہہ سکتا تھا' کسی انسان کے ذہن میں ہی یہ بات نہیں آسکتی تھی۔ وہ انتہا یہی ہو سکتا تھا کہ ٹھیک ہے' بھئی! جو مانگو گے مل جائے گا' جو چاہو گے ہو جائے گا اور وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ (50:35)۔ اب پیچھے سے یہ ٹکراؤ چلا آرہا تھا' ایک طرف وہ تھے جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے تھے' ان کے متعلق بتایا گیا تھا کہ ان کی کیفیت کیا ہے' دوسرے یہ تھے جو اس سے ہم آہنگی اختیار کیے ہوئے تھے' جنہوں نے اپنے آپ کو اس قالب کے اندر ڈھال لیا تھا' ان کی کیفیت یہ تھی۔

قرآنِ حکیم نے افراد کے بجائے ہمیشہ اقوام اور معاشرے کی بات کی ہے

قرآن حکیم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے دعاوی کے ثبوت میں پہلے فطرت کے قوانین سے دلائل لاتا ہے' یہ اس سورۃ کے شروع میں بھی آگیا ہے کہ وہ کس طرح سے بادلوں اور ہواؤں سے مینہ برساتا ہے (50:9) اور زمین اور ان سے وہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے یہ خدا کے مقرر کردہ قوانین کے تابع چلتے ہیں (50:6) اور کس طرح پھر زندگی میں نئی نئی نمود ہوتی چلی جاتی ہے (50:9)۔ اس کے خلاف جانے والوں کے متعلق قرآن کریم کا دوسرا انداز یہ ہے کہ وہ تاریخ سے شہادتیں پیش کرتا ہے کہ تم دیکھو' جن اقوام نے ہمارے قوانین کی خلاف

ورزی کی' ان کا انجام کیا ہوا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ معاشرہ یا قوم افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہیں' وہ افراد سے بہت کم بات کرتا ہے' وہ نظام سے بات کرتا ہے' معاشرے سے بات کرتا ہے' اس قوم سے متعلق بات کرتا ہے۔ یہ افراد قوم کے مجموعے کا نام ہوتے ہیں' افراد بگڑتے ہیں تو قوم بگڑتی ہے' قوم یا نظام بگڑا ہوا ہو تو افراد بگڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کا ایک Cyclic Order ہے جسے کہتے ہیں کہ ایک چکر ہوتا ہے۔ وہ قوموں کا ذکر کرتا ہے کہ پہلی قوموں کو دیکھو کہ ان کا حشر کیا ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ اہمیت نظام کو دیتا ہے۔ اچھے نظام میں برے انسان بھی اچھے بن جاتے ہیں اور غلط نظام ہو تو اس میں تو مجبوراً اچھوں کو بھی برا بننا پڑ جاتا ہے۔ نظام اور معاشرہ کا انداز بڑی چیز ہے اور قرآن حکیم اسی پہ زور دیتا ہے۔

انسانی معاشرے کی اہمیت کے پیشِ نظر قوموں کی تباہی کو بیان کرنے کا مقصد

کہا ہے کہ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ (50:36) آہاہا! عزیزانِ من! ادبی اعتبار سے بھی قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ جس انداز سے بات کرتا ہے اس میں دو دو الفاظ ہوتے ہیں مگر اس کے اندر ایک دنیا سموئی ہوتی ہے۔ کہا کہ ان سے پیشتر بھی بڑی بڑی قومیں تھیں وہ' اے رسول! ان سے کہیں زیادہ قوت وثروت و دولت وحشمت و اقتدار میں بڑھی ہوئی تھیں' وہ ان سے کہتا ہے کہ تم صبح وشام ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پر سے گزرتے ہو' ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں پہ پڑھو کہ ان کا انجام کیا ہوا' اور کیوں ہو۔ ان کی داستانیں ان ٹھیکریوں پہ لکھی ہوئی ہیں۔ یہ قرآن کریم کا بڑا عملی انداز ہے۔ کہتا ہے کہ وہ ان سے کہیں زیادہ قوت وحشمت میں بڑی ہوئی قومیں تھیں۔ یہ ان کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ہم پہ بھی وہ مصیبت آئے گی۔ کہا کہ جب ان کے اس غلط نظام کے انجام کا وقت آیا اور وہ تباہی آئی تو اندازہ لگایئے' عزیزانِ من! وہ کن الفاظ میں بات کر رہا ہے۔ لفظاً اُسے ہم شاعری تو کہہ نہیں سکتے کہ یہ ہے نہیں لیکن بلیغ تریں بھی جو شاعری ہو سکتی ہے' یہ اس سے بھی اونچی بات ہے۔ کہا کہ جب یہ تباہی والی بات آئی تو انہوں نے دنیا کی بستیوں کو چھان مارا کہ کہیں پناہ ملے۔ انہیں کہیں پناہ نہ ملی۔ کیا بات ہے! انہوں نے چھان مارا۔ یہ اپنے ہی ہاں والی بات نہیں' انہوں نے ساری دنیا کی بستیوں کو چھان مارا کہ کہیں پناہ مل جائے مگر کہیں پناہ نہ مل سکی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پھر یہ ہلاکت کس انداز کی ہے۔ یہ وہیں کی بات نہیں ہے۔ بڑی بڑی دوسری دولتوں سے' دوسری سلطنتوں سے بھی' ان کے معاہدے ہونگے' ان کے تعلقات ہونگے' اور قبائل ہونگے' برادریاں بھی ہونگی' اور بستیاں بھی ہونگی۔ عزیزانِ من! ہوتی ہیں اور جب یہ دولت وحشمت میں اتنے اونچے تھے تو ان کے تعلقات بھی اتنے ہی ہونگے لیکن جب تباہی آتی ہے تو اس وقت کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے دنیا

کی بستیوں کو چھان مارا کہ کہیں تو پناہ مل جائے مگر انہیں کہیں پناہ نہیں ملی۔

غلط نظام کا انجام تباہی ہے خواہ وہ قوم سپر ہو یا لوئر' اعلیٰ ہو یا پست

عزیزانِ من! ہمیں تو کہیں دُور' ان اجڑے ہوئے کھنڈار کی ٹھیکریوں کی طرف جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے دور میں تو تاریخ اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ پہلے جو واقعات کہیں ہزار سال میں برپا ہوتے تھے' آج تو چند سالوں میں ہو جاتے ہیں' جو صدیوں میں برپا ہوتے تھے' وہ چند مہینوں میں ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ نے پہلی جنگِ عظیم (1918-1914ء) کے زمانے کے اثرات کو دیکھنا ہو تو آپ کو تو پتہ ہے کہ اس وقت سے لے کر اس کے بعد آج تک کیا ہوا تو آپ دیکھیے کہ قریباً ساٹھ سال کا عرصہ ہو گیا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا عرصہ ہو گیا❶ ۔ اس میں آپ دیکھیے قوموں میں جو تبدیلیاں آئی ہیں' کتنی کتنی عظیم قومیں تھیں' ان کا کیا انجام ہوا' کیا حشر ہوا۔ آج دیکھ لیجیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ مظالم کی داستانیں پڑھتے ہیں' ساری دنیا میں ان کی جو آہ و پکار ہے' وہ زمین ہلا رہی ہے' آسمان تک پہنچ رہی ہے' انہیں کہیں کوئی پناہ دینے والا نہیں نظر آ رہا' جیسے قرآن کریم نے کہا ہے کہ انہوں نے مختلف بستیوں کو چھان مارا لیکن انہیں کہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ملا۔ ہمارے سامنے تو تاریخ یہ کچھ بتا رہی ہے صاحب! یہ ساری چیزیں غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ ہیں اور اسمیں جن کو آج یہ سپر پاور یا ہائی پاورز کہہ رہے ہیں' یہ بھی بچ نہیں سکتیں۔ ان پہ تو چھوٹی طاقتوں کے مقابلے میں ہلاکت اور تباہی آئے گی' تو وہ ان سے بھی کہیں زیادہ شدید حالت کے اندر ہو گی۔ یہ قرآن کریم نے یہاں کہا ہے کہ مِنْهُمْ بَطْشًا (50:36) وہ سپر پاورز تھیں' ان کا یہ انجام ہو گیا۔ تو یہاں سوال Super (اعلیٰ) اور Lower (پست) کا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں غلط نظام خواہ چھوٹے پیمانے پہ ہو یا بڑے پیمانے پہ ہو' وہ تو اپنا نتیجہ اسی طرح سے لاتا ہے اور اس کا نتیجہ اس قسم کی تباہی ہوتی ہے کہ پھر دنیا میں پناہ کی کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔

تاریخی حقائق کو بیان کرنے کا مقصد دراصل عقلِ انسانی کو غور و فکر کی دعوت دینا ہے

کہا کہ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے' یہ ہم کچھ تاریخ کا نصاب نہیں مرتب کر رہے کہ طالب علموں کو پڑھا دیا جائے۔ ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (50:37) جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں' اسے تاریخی داستانیں سمجھ کر آگے نہ بڑھ جائیے کہ یہ کہانیاں تھیں جو ہم نے بیان کر دیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ ان بیانات میں' ان کہانیوں میں' تمہارے لیے عبرت اور موعظت کی ہزار داستانیں چھپی ہوئی ہیں۔ تمہیں ان سے عبرت حاصل کرنا ہے لیکن عبرت کون حاصل کرے گا؟

---

❶ یاد رہے کہ یہ بات جولائی 1982ء کی 9 تاریخ کو کہی گئی تھی۔

یہاں تین چیزیں کہی ہیں۔ پہلی یہ کہ مَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (50:37) وہ سینے میں دل رکھتا ہو جو سوچنے سمجھنے کا کام دے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا (7:179) تم ان لوگوں کو دیکھو کہ سینے میں ان کے دھڑکتے ہوئے دل تو ہیں لیکن ان سے یہ سوچنے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ تو کہا کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان سے وہ عبرت حاصل کریں گے جن کے سینے میں سوچنے سمجھنے والا دل ہے اور وہ ازخود ان چیزوں پہ غور کر کے ایک نتیجے پہ پہنچیں گے کہ واقعی ان کے غلط نظام کا جو انجام ہے وہ ایسی تباہی ہے۔ وہ اپنے طور پہ غور و فکر سے خود اپنی سوچ سمجھ سے بھی اس نتیجے پہ پہنچیں گے کہ جو قرآن کریم نے کہا ہے وہ حقیقت ہے۔ اگر ایسی صورت نہیں ہے تو دوسرے انداز سے کہا ہے کہ اَلْقَى السَّمْعَ (50:37) کوئی دوسرا بتانے والا ہو تو اس کو ہی غور سے سن لیں۔ یہ دوسری چیز ہے۔ کیا بات ہے صاحب! قرآن کریم نے کیسے دو گروہ گنائے ہیں: خود غور و فکر کرنے والے اور وہ لوگ جو خود تو اس قابل نہیں لیکن ان کے لیے پھر یہ بات کہتا ہے کہ اس کی بات کو سنے اور سن کر یہ نہ ہو کہ ایک کان سے سنے دوسرے کان سے نکال دے بلکہ وَهُوَ شَهِيْدٌ (50:37) اس کی پاسبانی کریں اس بات کی نگرانی کریں جو کچھ وہ کہہ رہا ہے۔ اس سے وہی لوگ عبرت حاصل کر سکیں گے۔ یہ تیسری چیز ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے کائنات کی پیدا کردہ وسعتوں کی کیفیت اور انسانی غلط سوچ کا ذکر

انہوں نے اس اعتراض سے بات شروع کی تھی جو وہ کہتے تھے کہ جب ہم مر مرا جائیں گے تو کیا اس کے بعد پھر زندگی ہوگی؟ کیا وہ خدا پھر خود پیدا کر دے گا؟ کہا کہ ان کو اس پہ بڑا تعجب آ رہا تھا۔ وہاں بھی اور دیگر مقامات پر بھی قرآن کریم نے یہ دلیل دی ہے کہ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (50:38)۔ پہلے تو یہ بات کہی کہ اس عظیم سلسلہ کائنات کو پیدا کیا۔ یہ تو ایک انسان کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کو کس طرح پیدا کر دیا ہے انہوں نے کبھی سوچا نہیں کہ یہ محیر العقول سلسلہ کائنات کتنا عظیم اور وسیع ہے۔ اس کی وسعتوں کا تو آج سائنس بھی ابھی اندازہ نہیں لگا سکی یہ کروڑوں درکروڑوں کائناتیں تو اس کہکشاں کے اندر آباد ہیں جن کو ہماری شاعری نے کہکشاں کہا کہ جیسے گھاس کا ایک گٹھا گھسیٹ کر لے جائیں تو پیچھے راستے پہ جو نشان پڑتا ہے اور اس کے بعد اب تو علم الافلاک اس پہ پہنچا ہے کہ یہ کائنات وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ The Expanding Universe ایک کتاب کا نام ہے۔ یہ جیمز جینز نے لکھی کہ یہ کائنات اور وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

کہا ہے کہ ہم نے یہ جو کائنات بنائی تو بنانے کے بعد اب یہ کہا ہے کہ چھ مراحل کے اندر اس کو کس درجے پر پہنچایا یہ تمہارے سامنے ہے۔ ستہ ایام کے معنی ہفتے کے دن نہیں ہیں کہ Week Days (ہفتے کے دنوں) میں سے چھ دنوں میں ہم نے اسے پیدا کیا اور ساتویں دن پھر ہم آرام کرنے لگ گئے کیونکہ ہم تھک گئے تھے۔ یہ محرف تورات میں آیا ہے۔ قرآن حکیم ساتھ کے ساتھ اس قسم کے غلط عقائد کی تردید بھی کیے چلا جاتا ہے۔ محرف تورات میں یہ ہے کہ خدا نے ہفتے کے چھ دنوں میں کائنات کو پیدا کیا اور پھر وہ تھک گیا تو وہ

ساتواں دن آرام کا دن تھا اور یہ جو ان کے ہاں سبت ہیں Saturday ہے' یہ سینچر ہوتا ہے۔ یہ یہودیوں کے ہاں کا ہے کہ ساتویں دن پھر کام کاج بند کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ خدا بھی ساتویں دن سو گیا تھا تو ہمیں بھی کاروبار بند کر دینا چاہیے۔ میں نے بتایا تھا کہ عیسائی اور یہودیوں کا آپس میں تو پوچھو نہیں کتنا بیر تھا' ہر چیز جو یہودیت کی ہوتی تھی عیسائیت اس کی مخالفت کرتی تھی۔ انہوں نے Saturday کو سبت رکھا تو عیسائیوں نے Sunday رکھ دیا۔ عجیب بات ہے کہ یہ جسے انجیل کہتے ہیں' یہ عیسائیوں کی بھی ہے۔ اس میں جو پہلا حصہ ہے' وہ ہے جسے عہد عتیق کہتے ہیں' وہ تورات ہی ہے' اس میں یہودیوں والی ساری کتابیں ہیں اور جو اگلا حصہ ہے' وہ عہدِ جدید ہے جس کو انجیل کہتے ہیں۔ اُن دونوں کو عیسائی مانتے ہیں لیکن مخالفت کی یہ کیفیت ہے کہ اگر انہوں (یہودیوں) نے ہفتے کے دن کو اپنے ہاں کا چھٹی کا دن Holiday (مقدس دن) بنایا' انہوں نے کہا ہم اتوار کا دن (Sunday) ایسا رکھیں گے' یہ نہیں رکھیں گے صاحب! بہر حال تورات نے یہ کہا تھا کہ ساتویں دن خدا تھک گیا تو اس نے چھٹی کی اور وہ ستانے کے لیے ذرا سو گیا اور قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (50:38) ہم یہ پیدا کرنے کے بعد تھکے نہیں تھے اس لیے یہ بات نہیں کہ ہم تمہیں پیدا نہیں کر سکیں۔

کائنات کی تخلیق اور گردشِ افلاک کا انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی کا باہمی ربط

اور عزیزانِ من! دوسری چیز جو قرآن حمید نے متعدد مقامات پہ کہی ہے' وہ میں پہلے بھی کئی دفعہ سامنے لایا ہوں اور ابھی تک تو سائنس وہاں تک پہنچی بھی نہیں ہے۔ اس سلسلہ کائنات کو ہمارے ہاں کے شاعروں نے گردشِ افلاک کہہ کر اس معنی میں کچھ لیا تھا' یہ ذرا سا ان کے ذہن میں تھا۔ یہ (مرزا اسداللہ خاں) غالب کا شعر ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

اس گردشِ افلاک کو یہ لوگ اس معنی میں لیتے تھے لیکن قرآن کریم تو خیر آگے لے جاتا ہے۔ کہا ہے کہ وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (45:22) سلسلہ کائنات اس لیے ہم نے پیدا کیا اور وہ سرگرمِ گردش ہے کہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا نتیجہ مل جائے اور کسی پہ کوئی ظلم نہ ہو۔ انسان کے اعمال کا نتیجہ مرتب کرنے میں اس خارجی کائنات کا کیا دخل ہے اور کیا حصہ ہے' یہ میں نے عرض کیا ہے کہ ابھی تک ہماری سائنس یہاں تک نہیں پہنچی' البتہ سائیکولوجی (علم نفسیات) یہ دیکھنے کے لیے کوشش کر رہی ہے کہ انسان کے کیریکٹر کو مرتب کرنے میں خارجی عناصر اور معمولات کا کتنا بڑا اثر ہے۔ وہ ابھی اس طرف ہی چلی ہے لیکن یہ تو قدمِ اوّل ہے' آگے چل کر جب یہ انکشافات ہونگے تو پھر پتہ چلے گا قرآن حکیم کیا کہہ گیا ہے کہ خارجی کائنات کا ہی سلسلہ اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ ہر فرد کو اس کے اعمال کا نتیجہ مل جائے اور کسی پہ کوئی ظلم نہ ہو۔ قرآن حکیم نے اس خارجی کائنات کی تخلیق کا مقصد یہ

بتایا ہے تو چونکہ پیچھے سے بات کشمکش کی آرہی تھی اور نتائج کی آرہی تھی' اس ضمن میں یہ آیت بھی لی جا سکتی ہے کہ خارجی کائنات کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ ہر فرد کو اس کے کیے کا بدلا مل جائے اور کسی پہ کوئی ظلم نہ ہو۔

کائنات کی وسعت میں ہر آن اضافہ

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کچھ پیدا کرنے سے ہم تھک نہیں گئے کہ ہم اور کچھ پیدا نہیں کریں گے' ہم تو پتہ نہیں کہ ہر روز کتنی نئی نئی دنیائیں وجود میں لاتے چلے جا رہے ہیں۔ خدا کے متعلق آگے آئے گا کہ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (51:47) وہ وسعت پیدا کرنے والا ہے خدا Extension پیدا کرنے والا ہے۔ یہ اصطلاح تو آج انہوں نے دی' آج Extended Universe کی اصطلاح ایجاد کی ہے۔ ان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ یہ پھیل رہی ہے۔ قرآن حکیم نے چودہ سو سال پہلے خدا کے متعلق کہا تھا کہ وہ خدا ہے جو کائناتوں کا پھیلانے والا ہے Extension کا ہے' تو قرآن کریم کے اندر خود یہ تصور موجود ہے۔ کہا کہ یہ ہے کشمکش۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کو استقامت کی تلقین اور تسکین

اب ہم آخری آیتوں پر آ جائیں گے اور قرآن کریم کا جیسا انداز ہے کہ وہ ہمیشہ آخری آیتوں میں Sum up (خلاصہ مطالب) کرتا ہے جو کچھ پہلے کہا ہے۔ رسول اللہؐ سے کہا گیا ہے کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (50:39) یہ جو کچھ کہتے ہیں وہ واقعی ایسا ہے کہ اس سے انسان کا دل جل اٹھتا ہے' جگر تباہ ہو جاتا ہے' یہ بڑی تلخ چیزیں کہتے ہیں' طنز و تشنیع' الزامات' بہتانات اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی کے لیے برداشت کرنا بڑا مشکل ہے لیکن اے رسول! تمہیں استقامت سے کام لینا ہوگا' ان چیزوں سے ہمت نہیں ہارنی ہوگی۔ آپ دیکھیے یہ منصبِ رسالت ہے اس میں شبہ نہیں کہ خدا اور اس کے رسول اور خدا اور اس کے ملائکہ درود تو بھیجتے ہیں لیکن جس پہ بھیجتے ہیں' اندازہ لگایئے کہ اسے کن مراحل اور منازل میں سے گزرنا پڑ رہا ہے کہ خدا خود تسلیاں دے رہا ہے۔ اگرچہ وہ شاعر جگر (مرادآبادی) تو ہمت ہار بیٹھا تھا جس نے یہ کہا تھا کہ

وہ خود تسکین خاطر کر رہے ہیں
مگر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

تسکینِ خاطر خود خدا کر رہا ہے' رسول کا دل بیٹھا نہیں جا رہا' بڑی ہمت والا دل ہوتا ہے' جس کو اس منصب کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ خدا خود تسلیاں دے رہا ہے کہ فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (50:39) جو کچھ تمہارے خلاف کہتے ہیں' اس سے تم دل برداشتہ نہ ہو بلکہ نہایت استقامت سے اپنے پروگرام پر جمے رہو۔ آگے اس کے کچھ آیتیں آتی ہیں وہ میرا خیال ہے آج ان کی وضاحت ضروری ہو جائے گی۔

سَبِّحْ بِحَمْدِ کا مفہوم' نماز کے اوقات کے تعین کا معاملہ' قرآن کریم اور فرقہ بندی

کہا ہے کہ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (40 -50:39)۔ عام ترجمہ اس کا جو کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ تسبیح کرو' حمد کے ساتھ' اپنے رب کی' سورج نکلنے سے پہلے' سورج کے غروب ہونے سے پہلے' اور رات کے وقت بھی تسبیح کرو اس کی' اور اگلے الفاظ اَدْبَارَ السُّجُوْدِ (50:40) کے معنی و تفسیر میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان سے مراد لی جاتی ہے نماز کے اوقات' جو ہمارے ہاں ہیں۔ میں یہ عرض کردوں کہ متعین طور پر قرآن کریم نے نماز کے اوقات کا خود ذکر نہیں کیا جیسے ہم نے لیا ہے کہ وہ صبح کی نماز فلاں وقت پہ' ظہر کی' عصر کی' مغرب کی' عشاء کی اس وقت پہ۔ اس انداز سے کم از کم مجھے قرآنِ کریم سے متعین طور پر ان اوقات کے متعلق نہیں ملا۔ یہ اس قسم کی جو سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قرآن کریم کی آیتیں آتی ہیں' ان سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ ان سے مراد یہاں نماز کے اوقات ہیں۔ مزید آیتوں سے یہ لے کر' وہ پانچ اور سات جسے استنباطاً کہتے ہیں By Juxtaposition کہتے ہیں کہ کس طرح سے ان کو متعین کیا جاتا ہے' میں اس بحث میں ہی نہیں پڑتا۔ میرا انداز ہی اور ہے۔ ٹھیک ہے' قرآن کریم نے یہ متعین کیے ہیں یا یہ استنباطاً متعین کیے ہیں' حضورِ نبی اکرمؐ نے یہ متعین فرمائے ہیں۔ میرا انداز تو یہ ہے کہ جو چیزیں قرآن کریم میں تفصیل سے نہیں آئیں اور ان کا حکم امت میں آیا ہوا ہے' جس طرح ان کو امت کر رہی ہے' جیسے وہ مروج چلے آرہے ہیں' بشرطیکہ اس میں کوئی بات شرک کی نہ ہو' قرآن کریم کے خلاف نہ ہو' ان کو اسی طرح سے قائم رکھنا چاہیئے' ان میں کوئی اختلاف نہیں کرنا چاہیئے' نہ کوئی نیا طریقہ ایجاد کرنا چاہیئے' نہ ان میں کوئی تبدیلی کرنی چاہیے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ایک فرد کو یا افراد کے دو چار مجموعے کو یا ہمیں حق نہیں پہنچتا ہے کہ امت ایک چیز کو جو کرتی آرہی ہے اس میں اختلاف پیدا کرتے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس میں شرک یا قرآن کریم کے خلاف کوئی بات نہ ہو' امت جس طرح سے ان طریقوں پہ چلی آرہی ہے' ایک فرد کو یا دو چار افراد کے مجموعے کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ان میں اپنے خیال کے مطابق اختلاف پیدا کرے' پہلے تو اس کو یہ حق ہی حاصل نہیں ہے اور دوسری چیز یہ تھی اور ہے کہ اس کا نتیجہ سوائے اس کے کہ امت میں اور بڑا افتراق ہو' ایک اور فرقہ پیدا ہو جائے' اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ ساری امت کو تو آپ بدلنے سے رہے' آپ ان میں سے کوئی ''اوجنوں کیندے ہیگے نیں فرقہ'' (جسے فرقہ کہتے ہیں) لے کر الگ ایک فرقہ اور پیدا کرلیں گے اور فرقہ بندی کو تو قرآن کریم شرک کہتا ہے تو آپ تو شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

نمازوں کے سلسلہ میں فرقہ اہلِ قرآن کا فتویٰ اور پرویزؒ صاحب کی طرف سے جاری کردہ پمفلٹ

یہ جو میں ذکر کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں وہ ایک فرقہ بن گیا یہ جن کو اہلِ قرآن کہتے ہیں' انہوں نے یہ کچھ کہا کہ نہیں' یہ جو چیزیں امت میں چلی آ رہی ہیں' جو پانچ نمازیں ہیں وہ یہ نہیں ہیں' ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ قرآنِ کریم سے تین وقت کی نمازیں ہیں۔ آپ نے بار بار' جگہ جگہ' محراب و منبر سے سنا ہوگا کہ پرویزی فرقہ ہے' ایک پرویز صاحب ہیں' وہ کہتے ہیں کہ تین نمازیں ہیں' اور نو دن کے روزے سنا ہوگا۔ سب سے پہلے' جس نے اہلِ قرآن کی ان تین نمازوں کی مخالفت کی تھی وہ پرویز تھا۔ میں تیس سال سے' یہاں مسلسل مخالفت کر رہا ہوں۔ یہ ان اہلِ قرآن کی پھیلائی ہوئی گمراہیاں ہیں۔ یہ مذموم ہیں' میرا پمفلٹ ہے' ہزاروں کی تعداد میں اس ملک کے اندر تقسیم ہوا ہے' جس میں کہا ہوا ہے کہ ان لوگوں کو یہ کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ امت کے ایک متواتر مسلک کے خلاف اٹھ کر یہ کہیں کہ نہیں صاحب! یہ پانچ نہیں' تین نمازیں ہیں۔ میں نے ان تین کی مخالفت اس طرح سے کی ہوئی ہے اور کہا یہ ہے کہ اس سے ایک نیا فرقہ پیدا کر لو گے چنانچہ وہ فرقہ پیدا ہو گیا۔ وہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی' وہ کہیں ثمن آباد لاہور میں تھی۔ وہ وہاں چند آدمی بیٹھے ہوئے ہیں' وہ اس بات کو لیے ہوئے ہیں کہ ہاں صاحب! تین نمازیں ہم نے قرآن کریم سے معلوم کر لی ہیں اور زکوٰۃ کا بھی کر کیا ہے۔ اسی طرح سے وہ کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں ہم نے قرآن کریم سے معلوم کر لی ہیں۔ مجھ کو تو معلوم نہیں' وہ چند آدمی جو تین نمازیں پڑھنے والے ہیں' وہ ایک الگ فرقہ بنا کر بیٹھ گئے۔ فرقے تو پہلے ہی کم نہیں تھے' ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ اب ان میں بھی جو اہلِ قرآن ہیں' جو کہتے ہیں ہم نے قرآن کریم سے یہ ثابت کیا' سب سے پہلے اہلِ قرآن مولانا عبداللہ چکڑالوی تھے' جو اس تصور کے بانی تھے کہ یہ چیزیں قرآن کریم میں ہیں' انہوں نے قرآن کریم سے پانچ نمازیں ثابت کیں' یہ دوسرے اٹھے یہ تین والے ہو گئے۔ انہی اہلِ قرآن میں سے ایک مولوی گوجرانوالہ والے تھے انہوں نے کہا کہ نہیں' دو نمازیں ہیں' ایک اور ان میں سے اٹھے' غالباً وہ سیالکوٹ کے تھے' انہوں نے کہا کہ ایک ہی نماز ہے۔ میں نے کہا کہ شکر ہے کہ اور کوئی نہیں اٹھا' نہیں تو وہ کہتا نماز ہے ہی کوئی نہیں یعنی ''اک تو اگے ایہوای ہوناسی'' (ایک نماز کے بعد تو یہی ہونا تھا)۔

قرآنِ حکیم میں شروع سے آخر تک کوئی ایک بھی اختلافی بات نہیں پھر اہل قرآن کا یہ دعویٰ کیوں؟

عزیزانِ من! ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم سے نماز کے اوقات ثابت کر رہے ہیں۔ پانچ' تین' دو' ایک' یہ کچھ بقول ان کے قرآن حکیم سے ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے اس کو تو موجود رہنے دو' اپنا خیال جو ہو کہ میرے خیال میں یہ ہے تو وہ تمہارا خیال ہے اور اگر تم یہ کہو کہ صاحب! قرآن حکیم سے پانچ بھی ثابت ہیں' قرآن سے تین بھی ثابت ہیں' قرآن کریم سے دو بھی ثابت ہیں' قرآن پاک سے ایک بھی ثابت ہے' تو اچھا قرآن حمید ہے۔ قرآن حکیم تو یہ کہتا ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے

کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے اور بقول ان کے اختلاف بھی اتنے بڑے اہم معاملے میں، نماز کے اوقات میں ہیں، اور ان میں اتنا اختلاف ایک ہی دور کے اندر اہلِ قرآن دعویٰ کرنے والے ہیں کہ ہم قرآن کریم سے یہ ثابت کر رہے ہیں اور قرآن کریم سے تو وہ وقت ہی ثابت نہیں کر سکتے کہ کتنے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا کے لیے اس کو تو معاف کر دو، بخش دو، اپنے آپ پہ رکھو کہ ہمارا خیال یہ ہے اور اہلِ قرآن کہتے ہیں کہ قرآن حکیم سے یہ ثابت ہے صاحب!

نمازوں کے سلسلہ میں اپنے متعلق علامہ پرویزؒ کی وضاحت اور سَبِّح کا مفہوم

میں نے، عزیزانِ من! ان کی مخالفت کی جبکہ ان مولوی صاحبان میں سے ان کی کوئی مخالفت کبھی نہیں ہوئی۔ جب بھی یہ تین نمازیں کہیں گے تو کہیں گے کہ پرویز صاحب تین نمازیں کہتا تھا۔ اس دور کے اندر صاحب! دیانت ہی اٹھ گئی اور تو اور پرویز بیٹھا ہوا ہے، اس کی تحریریں موجود ہیں، وہ تین سال سے ان تین نمازیں کہنے والوں کی مخالفت کر رہا ہے کبھی نہیں کہتے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ثمن آباد، لاہور میں بیٹھے ہوئے اہلِ قرآن ہیں جو تین نمازیں کہتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرویزی فرقہ ہے۔ وہ تین نمازیں کہتے ہیں صاحب! علم اور دیانت کی تو یہ کیفیت ہوگئی۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ میرا مسلک یہ ہے، میں قرآنِ کریم کے ان مقامات کے اندر بحث میں نہیں پڑتا کہ ''امت میں یہ پانچ چلی آ رہی ہیں، قرآن حکیم میں ثابت ہیں'' یہ حضور ﷺ نے ان کو قائم کیا، امت نے ان کو اپنے ہاں تواتر سے ثابت کیا، یا یہ چلی آ رہی ہے، مجھے اس مسلک پر کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ میں ان میں اختلاف کروں کیونکہ یہ قرآن حکیم کے خلاف بات نہیں ہے، جو پانچ ہیں میں اسی کا قابل ہوں، توفیق خدا دیتا ہے، تو وہ یہ پانچ ہی ہیں جو میں پڑھتا ہوں، اپنے ہاں کے لوگوں کو اسی کی تاکید کرتا ہوں کہ اس میں کوئی اختلاف نہ کرنا۔ تیس سال سے لکھتا چلا آ رہا ہوں، تین نمازیں کہنے والوں کی مخالفت کیے چلا آ رہا ہوں لیکن وہ اہلِ قرآن کے متعلق ان تین نمازوں کا کوئی نہیں کہتے، ہر مولوی محراب و منبر سے اٹھ کر کہتا ہے کہ یہ پرویز کہتا ہے تین نماز پڑھو، جو سب سے زیادہ مخالفت کرتا ہے۔ بددیانتی کی کوئی انتہا ہونی چاہیے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان آیات سے بہر حال یہ حضرات استنباطاً یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ جو سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ تسبیح کر اپنے رب کی حمد کی ان اوقات میں۔ وہ کہتے ہیں اس سے نماز مراد ہے صاحب! یہ ان کا استنباط ہے۔ میں تو آپ کو معلوم ہے کہ سَبِّحْ کے معنی جو تسبیح کرنا ہے، یہ لیتا ہی نہیں ہوں۔ قرآن کریم کی رو سے سبح کے تو معنی ہوتا ہے ''کسی مقصد کے حصول میں سرگرداں رہنا، سر توڑ کوشش کرنا، ریس کورس کے گھوڑے کی طرح دوڑتے ہوئے چلے جانا، وہ تیراک جو پورے ہاتھوں سے تیرتا ہے اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے''۔ اس کے معنی ہوتا ہے ''پوری پوری قوت صرف کر کے کوئی مقصد حاصل کرنا'' یہ ہوتا ہے سبح کے معنی۔ تو میرے مفہوم کے اعتبار سے تو یہ

ہے کہ خدا کے نظامِ ربوبیت کو وجہ حمد وستائش بنانے کے لیے ہر وقت صبح شام رات کو مصروفِ کار رہو' صبح شام رات کو لیکن اگر ان سے نماز کے اوقات کا استنباط ہوتا ہے تو بسم اللہ مجھے بحث میں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو پانچ نمازیں مانتا ہوں اور ان کا قائل ہوں اور ان پہ قائم ہوں لیکن یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں اس سے مراد نماز نہیں ہے' بلکہ یہ ہے کہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے لگا تار سر توڑ کوشش کیے جاؤ اور فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ (50:39) استقامت سے کام لو' ہمت سے کام لو' برداشت سے کام لو۔ تو پہلے تاکید کی گئی ہے' پھر یہ کہا ہے کہ ہر دم کوشش کرتے چلے جاؤ' سرگرمِ عمل رہو' اس نظامِ خداوندی کو وجہ حمد وستائش بنانے کے لیے سر توڑ کوشش کرو۔

کفار کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کی مخالفت کی بنیادی وجہ قرآنی نظام کا نفاذ ہی تھا

عزیزانِ من! آگے پھر یہ ہے کہ اس کی بڑی مخالفت ہوگی صاحب! اور مخالفت تو ہوئی۔ تیرہ سال مکے کی زندگی کے بعد حضورؐ مدینے تشریف لے آئے۔ اب ان قریش کو کوئی وجہ مخالفت ہونی نہیں چاہیے تھی' وہ تو چلے گئے' وہ آج کا مکہ اور مدینہ نہیں ہے کہ دو گھنٹے میں یا تین گھنٹے میں آپ وہاں پہنچ جائیں اور اگر ہوائی جہاز میں جانا ہو تو شاید آدھے گھنٹے میں پہنچ جائیں۔ اس زمانے میں مکہ اور مدینے کے درمیان کے تین تین سو میل کے فاصلے اونٹوں کے اوپر سفر کرنے کے تھے۔ صحراؤں کے اندر آنے کا کوئی مخالف نہیں' یہ مخالفت قریش کی طرف سے ہو رہی ہے' کسی قسم کا ان کو ڈر نہیں ہے لیکن وہاں سے بار بار اٹھ کر چلے آرہے ہیں' مختلف غزوات کے اندر سات سال تک آئے' سوچیے کہ کیا معاملہ تھا؟ زبردستی ان کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جا رہا تھا۔ وہ کہتے کہ جی! ہمارے بتوں کو گالیاں دیتے ہیں' یہ تو وہاں سے چلے ہی آرہے تھے تو گالی کہاں دینی تھی یعنی ان کے ساتھ معاملہ ہی کوئی نہیں رہا لیکن اس کے باوجود مخالفت تھی اور وہ نظامِ ربوبیت کے لیے تھی اور وہ سب کچھ تھا اور اسی لیے تھا۔

سپر پاورز کی طرف سے آج دنیا بھر میں مسلمانوں کی مخالفت کی اصل وجہ اور وجہ جنگ بدر

آج بھی یہ ہو رہا ہے' دنیا کی سپر پاورز بھی یہی کچھ کر رہی ہیں کہ

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں [1]

ان کو پتہ ہے کہ شرع پیغمبر اگر دنیا میں آشکارا ہو جائے گی' نہ نظامِ ملوکیت باقی رہے گا' نہ نظامِ سرمایہ داری' نہ نظامِ پیشوائیت باقی رہے گا۔

---

[1] عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
[اقبالؒ: ارمغانِ حجاز (اردو)]

اس وقت بھی دنیا بھر کی یہ ساری قوتیں کوشش کر رہی ہیں کہ دین کے لیے مسلمانوں کا کہیں شعور بیدار نہ ہو جائے' انہیں مذہب میں گم کر رکھو۔ ٹھیک ہے جتنی جی چاہے نمازیں پڑھیں' روزے رکھیں' یہ زکوٰۃ دیں' یہ حج کرتے رہیں' کچھ نہیں بگڑتا لیکن جو دینِ پیغمبر ہے' اس کا وہ شعور کہیں ان کے اندر نہ بیدار ہو جائے پھر کسی قوت کا کچھ باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ تھی جو قریش کے لیے وجہ مخاصمت تھی اور یہی آج وجہ مخاصمت ہے۔ مسلمان قوتیں مملکتیں بچاری اس قابل ہیں ہی نہیں کہ وہ ان کا مقابلہ کریں لیکن ان کو ہر وقت یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ ان کے اندر کہیں یہ شعور بیدار نہ ہو جائے۔ یہ ہے چیز جس کے لیے وہ قریشِ مکہ' سات سال تک' تا آنکہ خود مکے میں ان کو شکست نہیں ہو گئی' ان کے پیچھے لگے رہے' انہیں ایک دن بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا اسی لیے کہا کہ یاد رکھو! وقت وہ آ گیا ہے جب ان مخالفین سے ٹکراؤ ہوگا۔ غالباً یہ پہلی جنگ (جنگِ بدر) کے زمانے کی یہ آیات ہونگی۔ کہا ہے کہ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ (50:41) جس دن جنگ کے لیے آواز دینے والا' بہت قریب سے آواز دے گا۔ کہا کہ یہ ہیں کہ اس آواز کو کان لگا کر سنو' جو قریب مقام سے ہی تمہارے کانوں میں آ جائے گی۔ وہ آواز جو کانوں میں آئی وہ جنگ کا اعلان تھا۔ یہ پہلی لڑائی بدر کے مقام پر آئی۔ یہ تو مدینے سے باہر نکل کر انہوں نے مدافعت کر لی ورنہ وہ تو بڑھ کر مدینے میں آ گئے ہوئے تھے۔

ظہورِ نتائج کا وقت صرف آخرت پر ہی کیوں؟ یہ ہمارا قانون فیصلہ کرتا ہے

عزیزانِ من! جنگ کی آوازیں تو کانوں کے اندر آ رہی تھیں۔ کہا کہ سنو! قریب کے مقام سے ہی اب تو یہ آوازیں آنی شروع ہو جائیں گی۔ آگے کہا کہ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (50:42) جس دن وہ جنگ کے لیے چیخ و پکار ہوگی' وہ بڑے زور شور سے اٹھے گی اور پھر وہ دن ہوگا جس دن پھر تمہیں اپنی حفاظت کے لیے نکلنا پڑے گا' عام طور پہ ان آیات کے لیے وہ جو مرنے کے بعد کی زندگی ہے' اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔ میں نے بار بار کہا ہے کہ وہ تو ہمارے لیے ایمان ہے' جزوِ ایمان نہیں بلکہ ایمان کی بنیاد ہے آخرت پر ایمان ہے' وہ بھی صحیح ہے لیکن قرآن حکیم کی ہر چیز آخرت کے متعلق ہی نہیں ہے' اس دنیا کے متعلق بھی ہے۔ یہ تو تاریخ بیان کی جا رہی ہے۔ کہا ہے کہ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ (50:39) ہمت سے' استقامت سے' برداشت سے' کام لو' اے نبی! اور برداشت کے یہ مقامات تھے۔ تو یہ ایک مختصر سی پناہ گزینوں کی جماعت ہے۔ مدینے میں آ کر وہ کسی طرح سے اطمینان سے چار دن بیٹھے اور وہاں بھی انہوں نے چین نہیں لینے دیا' یورش کر کے چلے آ رہے ہیں صاحب! کہا کہ کوئی بات نہیں یہ تو ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُرُوْجِ (50:42) تمہیں اس کے لیے وہاں میدانِ جنگ میں تو نکلنا پڑے گا۔ کہا کہ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ (50:43) فتح اور شکست' زندگی اور موت جو قوم کی ہے' اس کا فیصلہ ہمارے قانون کے مطابق ہوگا۔ خوف نہ کھاؤ' تمام معاملات ہماری طرف لوٹتے ہیں' ہمارا

قانون فیصلہ کرتا ہے۔

جنگِ بدر کی شکست کے بعد کفار کی کیفیت اور خدا کی تسلیاں

عزیزانِ من! یہ خدا کا قانون ہی تھا کہ یہ جو حق پر جماعت تھی' بے سروسامان تھی' تعداد کے اعتبار سے اتنی کم تھی' جیسا میں نے عرض کیا ہے' یہ بالکل پناہ گزینوں کی' مہاجرین کی ایک جماعت تھی' ان کے پاس تو تلواریں بھی پوری نہیں تھیں جو لڑنے کے لیے لے جائیں۔ اس کے باوجود جو شکست قریش کو ہوئی ہے تو اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے' انہوں نے مکے میں آ کر یہ اعلان کر دیا تھا کہ کوئی اپنے مرنے والوں کے اوپر روئے نہیں کہ اس سے ہمارے دل بیٹھ جائیں گے۔ انہوں نے رونے تک کے لیے ممانعت کر دی تھی' یہ اتنی بڑی شکست تھی۔ کہا کہ یَوۡمَ تَشَقَّقُ الۡاَرۡضُ عَنۡهُمۡ سِرَاعًا (50:44) وہ دن' جب تم دیکھو گے کہ زمین ان کے آگے سے پھسلتی چلی جائے گی' وہ بڑھ نہیں سکیں گے۔ یہ بڑے حسین الفاظ ہیں صاحب! بڑی تیزی سے زمین پھسلتی جائے گی' آگے ایک قدم نہیں بڑھ سکیں گے۔ یہ بدر کے میدان سے' پہلی ہی جنگ میں' آگے نہیں بڑھ سکے اور کسی جنگ میں بھی نہیں بڑھ سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میدانِ جنگ میں دو ایک ایسے غزوات بھی تھے جن میں وقتی طور پر کچھ شکست بھی ہوئی' کچھ انتشار بھی پیدا ہوا لیکن وہ تھوڑے سے وقت کے لیے تھا پھر سنبھل گئے' یہ سنبھلنے کے بعد پھر کھڑے ہو گئے اور اس تمام دوران ان کے ہاتھوں کسی ایک جنگ میں بھی انہیں شکست نہیں ہوئی۔ یہ عجیب بات ہے حالانکہ اگر دونوں فوجوں کا مقابلہ کیا جاتا تو یہ مقابلہ نہیں تھا' یہ تو ان کے مقابلے میں کوئی شے ہی نہیں تھے اور پھر وہ جو جنگِ احزاب تھی' جس کو قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس میں تو مخالفت کے لیے یہ سارے قبیلے اکٹھے ہو گئے تھے' وہ جتنے مخالفین تھے' ایک ہجوم کر کے' محاذ بنا کر' ان کے مقابلے کے لیے آ گئے تھے۔ وہ بھی جنگ تھی۔ وہ جسے جنگِ خندق کہتے ہیں وہ اتنی جنگ تھی کہ مدینے کے گرد خندق کھودنی پڑی۔ وہاں بھی اس فوج کو شکست نہیں ہوئی۔ خدا نے جو وعدہ کیا تھا کہ یہ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اور ہمارے رسول غالب رہیں گے' مومنوں پر غیر مسلم کبھی فتح نہیں حاصل کر سکیں گے' کامیابی نہیں حاصل کر سکیں گے' غلبہ نہیں حاصل کر سکیں گے۔ یہ خدا کے وعدے تھے اور یہ ہر جنگ میں پورے ہوئے۔ کہا کہ جس دن زمین ان کے سامنے سے خود بخود پھسلتی چلی جائے گی اور یہ آگے نہیں بڑھیں گے' پیچھے ہٹتے جائیں گے پھر کہا کہ ذٰلِكَ حَشۡرٌ عَلَيۡنَا يَسِيۡرٌ (50:44) یہ جو اس طرح ان فوجوں کو جمع کرنا ہے' ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں' ایک دوسرے کے سامنے یہ فوجیں آ جائیں گی اور ڈرنے کی بات نہیں ہے' ہمت سے کام لو' کامیابی تمہارے ہی لیے ہے۔ کہا کہ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا يَقُوۡلُوۡنَ (50:45) ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ تمہارے متعلق ان حالات میں کیا کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہونگے ایک تو یہی بات ہوگی کہ ہم تو ان کو نیست و نابود کر دیں گے (معاذ اللہ) یہ شے ہی کیا ہیں۔ مٹھی بھر جماعت ہے' یہ جا کر وہاں بیٹھی ہوئی ہے' اس دفعہ ایسا حملہ

کریں گے کہ ان کو یاد آ جائے گا اور پتہ نہیں کس کس قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ کہا کہ ہم جانتے ہیں' آپ دلبرداشتہ نہ ہو جایئے۔ کیا بات ہے! خدا کی طرف سے تسلیاں دی جا رہی ہیں۔

جہاد کا مقصد قرآنی نظریات کو دوسروں پر مسلط کرنا نہیں ہوتا بلکہ قرآنی نظام کا تحفظ ہوتا ہے

اگلی بات میں یہ کہا ہے کہ وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (50:45) اور یہ سارا جنگوں کا فلسفہ اسلام بیان کر دیا۔ کہا ہے کہ یہ تمہارے خلاف یہ کچھ کہہ رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تم جبراً ان کو مسلمان نہیں بنا رہے' کسی قسم کا جبر ان پہ نہیں کر رہے' تم ان سے جنگ بھی نہیں لڑ رہے سوائے اس کے جہاں فتح مکہ کے لیے جانا پڑا تھا تو انہوں نے ان کو اس طرح سے واپس بھیج دیا تھا۔ یہ ساری جنگیں اسی قریش کے اطراف میں آ کر ہوئی ہیں' وہی حملہ آور ہوتے رہے ہیں' اور پھر تلوار کے زور سے اسلام کا پھیلانا تو اسلام کے خلاف بہت بڑا الزام ہے۔ لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ (2:256) دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ قرآن کریم تو جیسا میں نے آپ کو بتایا ہے وہ تو ان اعراب کو' بدوؤں کو' کہتا ہے جو مسلمان ہو چکے تھے کہ یہ مت کہو کہ ہم مومن ہو گئے ہیں' ابھی ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ مومن نہ کہو' کہو کہ ہم نے اپنے آپ کو اس مملکت کے سامنے' جھکا دیا ہے۔ وہ تو انہیں مومن نہیں مانتا' وہ تو ہم پیدائشی مسلمانوں سے کہتا ہے کہ يٰۤـاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا (4:136) تم بھی ایمان لاؤ' ایمان کے معاملے میں جبر' دو متضاد چیزیں ہیں' ایمان تو امن ہے۔ یہ جبر میں امن کہاں ہوتا ہے۔ اس کا تو مادہ ہی امن ہے۔ یہ تو وہ کہتا ہے کہ مومنوں کی نشانی' علامت' خصوصیت یہ ہے کہ اور تو اور آیاتِ خداوندی بھی ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو یہ ان پہ بھی اندھے اور بہرے بن کر نہیں جھکتے' آیاتِ خداوندی کو سمجھ سوچ کے بعد تسلیم کرتے ہیں (اللہ اکبر) تو کیا یہ جبر و اکراہ شمشیر کے زور پر مسلمان کرتے چلے گئے تھے صاحب؟ اس کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

قرآنِ حکیم کا سب سے بڑا معجزہ عقلِ انسانی کو جلا بخشنا ہے' اِسے ماؤف کرنا نہیں ہے

قرآنِ حکیم کے مطابق تو جہاں وہ آپ سے معجزہ طلب کرتے تھے کہ کوئی معجزہ دکھایئے تو ہم ایمان لے آئیں' قرآن حکیم نے رسول سے کہا ہے کہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہے جو یہ کہتے ہیں وہ ہم کر دکھائیں' یہ تو ساری کائنات ہمارا معجزہ ہے' دکھا سکتے ہیں لیکن اس سے تو گویا کسی کو جبراً مسلمان بنانا ہو جائے گا کیونکہ عقل و فکر تو ماؤف ہو جائے گا اگر اس قسم کی کوئی چیز دکھائی دی گئی۔ قرآن حمید رسول اللہؐ سے کہتا ہے کہ کیا تُو چاہتا ہے کہ ان کو پھر اس طرح سے جبراً مسلمان بنا لیا ہے' ان کو تو ہم مسلمان ہی تسلیم نہیں کریں گے (اللہ اکبر)۔ جنگ کے معاملے میں یہ کہا کہ وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (50:45)۔ ایک آیت میں ایک لفظ میں قرآن کریم یہ طے کر گیا کہ حضورؐ نے جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں' جتنے غزوات ہوئے ہیں حضور ﷺ کی زندگی میں یا صحابہ کبارؓ کی زندگی میں' وہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کے لیے نہیں تھے۔ اسے مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جسے اکراہاً ایمان پہ مجبور کر دیا جائے۔

دوسروں کو مسلمان بنانے کے سلسلہ میں سنتِ رسول ﷺ

یہاں جنگ کے میدان میں کہا ہے کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو گی لیکن تم ان پہ اسلام کے معاملے میں جبر نہیں کر سکو گے صاحب! قرآن کریم میں یہ ہے کہ دشمن کا بھی کوئی ایک شخص اگر جنگ کے زمانے میں تمہارے پاس امن ڈھونڈنے کے لیے آئے تو اس کو پناہ دو‘ پناہ دینے کے بعد اسے پھر قرآن کریم سناؤ‘ اس سے خود پوچھ لو‘ اس کے بعد اگر وہ کہے کہ نہیں صاحب! میں تو جانا چاہتا ہوں تو کہا کہ اپنی حفاظت میں اسے اس سرحد تک پہنچا آؤ جہاں پھر اس کے بعد اس کے اپنے ہوتے ہیں (اللہ اکبر)۔ دشمن پناہ کے لیے آیا ہے‘ صرف قرآن کریم سنانا ہے پھر اس پہ چھوڑ دو۔ اگر وہ نہیں مانتا‘ جانا چاہتا ہے‘ تو پھر اس کو وہاں تک خود اپنی حفاظت میں چھوڑ آؤ۔ عزیزانِ من! دنیا میں اس قسم کے دین کی مثال آپ کو کہیں نہیں ملتی: وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (50:45) جبر نہیں ہے۔ فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (50:45) بس یہ بات ہے کہ قرآن کریم کی باتیں ان کے سامنے پیش کرتے چلے جاؤ‘ پھر ان پہ چھوڑ دو کہ اپنی عقل و فکر سے یہ فیصلہ کریں کہ ہم اسے مانتے ہیں یا نہیں مانتے۔ جو مانے گا اس کا بھلا‘ جو نہ مانے گا‘ نقصان اس کا ہو گا۔ اس میں تمہارا تو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ (معاذ اللہ) یہ کوئی کاروبار یا بزنس نہیں ہے کہ گاہک کم ہو جائیں گے‘ نہ ہی تم نے اس مغربی جمہوریت سے ووٹ لینے ہیں کہ کسی طرح سے ان کے ساتھ بنا کر رکھو کہ کل کو اس کا ووٹ ملے گا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی سب سے بڑی سنت کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا صرف ہدیت دیتا ہوں

پیغمبر تو پہلی سانس میں جب دعوت کے لیے اٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ اَعۡبُدُ اللّٰهَ (10:104) میری ایک ہی پکار ہے کہ محکومیت صرف خدا کی جائز ہے کسی انسان کی جائز نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے۔ کہا ہے کہ يٰقَوۡمِ لَاۤ اَسۡـَٔلُكُمۡ عَلَيۡهِ اَجۡرًا (11:51) اور اسی سانس میں کہتا ہے کہ میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ جب اس نے ان سے معاوضہ ہی کوئی نہیں مانگنا یا لینا تو وہ جبر کیوں کرے گا۔ کیا وہ اپنی پارٹی بڑھائے گا؟ ووٹس بڑھائے گا؟ گاہک زیادہ اضافہ کرے گا؟ (معاذ اللہ) پھر کرے کیا؟ کہا کہ فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (50:45) تو تُو یہ کیے جا۔ اب سوال یہ ہے کہ پھر اس قرآن کریم سنانے کے بعد بھی تو کون مانے گا۔ اس کو کہا کہ مَنۡ يَّخَافُ وَعِيۡدِ (50:45) جو اپنے غلط اعمال کے انجام سے ڈرتا ہے وہ اس کی طرف آئے گا‘ تیرا کام تو سنائے چلے جانا ہے‘ پیش کیے چلے جانا ہے‘ تم یہ کرو۔ دوسرے مقام پہ بڑے خوبصورت انداز میں بات سمجھائی ہے کہ تُو ان مسافروں کو راستہ بتا سکتا ہے کہ یہ فلاں طرف جاتا ہے۔ تیرا کام یہ ہدایت ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ صحیح راستہ کی طرف تُو راہنمائی کر سکتا ہے کہ یہ راستہ ادھر جاتا ہے تُو زبردستی اس راستے پہ کسی کو چلا نہیں سکتا۔ ایک تو یہ ہے کہ

کوئی کرنا ہی نہیں چاہتا' گھر میں بیٹھا ہوا ہے' نہیں صاحب! مجھے کہیں جانے کی ضرورت ہی نہیں' یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں جا کر چار سپاہی بھیج کر' ان کی مشکیں باندھ کر' ساتھ لے آؤ' اس کو جیپ کے اندر ڈالدو اور لے جاؤ' انہیں لے جاؤ' جہاں ہم نے لے جانا ہے۔ سوال ہی نہیں ہے' وہ جانا ہی نہیں چاہتا۔ جانے والا بھی اگر باہر نکل کر چورا ہے پہ پہنچنے کے بعد' اگر صحیح راستہ اس کے سامنے نہیں ہے تو یہ کہا کہ تمہارا فریضہ یہ ہے کہ تم اس کو بتا دو کہ جدھر تم جانا چاہتے ہو' صحیح راستہ یہ ہے' اس طرف جاؤ تو جاؤ۔ کہا کہ تمہارا اتنا ہی فریضہ ہے۔ اگر اس کے باوجود وہ اس راستے پہ نہیں جاتا' دوسرے پہ چلا جاتا ہے' تو کہنے لگا کہ یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔

ہمارے ہاں دوسروں کو صحیح راستے پر لانے کا طریق جبر ہے جو قرآن کریم کا نہیں ہے

ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ہر وہ جو لمبا چغا پہن لے' وہ خدائی فوجدار بن کر اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ میں یہ کرا کر چھوڑونگا صاحب! کیسے نہیں کرتے۔ یہاں قینچیاں لیے پھرا کرتے تھے۔ اب تو پتہ نہیں کوئی ہیں یا نہیں' بڑے بوڑھوں کو معلوم ہوگا کہ انارکلی (لاہور) کے اندر تو یوں تھا کہ وہ قینچی لیے آتے تھے۔ اب یہ بیچاری بچیاں تھیں' وہ اسکول یا کالج کو ہی جاتی تھیں' اوناں دیا گتاں کٹدے پھردے ہیگے سن (وہ ان کی چوٹیاں کاٹتے پھرتے تھے) اور یہ سب بقول ان کے شریعتِ اسلامی کی رو سے ہوا کرتا تھا۔ یہ تو دوسروں کا معاملہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ دل اور نگاہ' قلب و دماغ کی پوری رضامندی سے قرآن کریم کے صحیح ہونے پر قائم ہو جائیں' اس کی صداقت پر ایمان لے آئیں' یقین ہو جائے' اسے اپنے لیے نظامِ زندگی تسلیم کر لیں' پھر اس نظام کے احکام کی اطاعت تمہارے اوپر لازم آجائے گی۔ یہ بھی جبر نہیں ہے کیونکہ آپ نے تو پہلے اصولاً تسلیم کر لیا ہے یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص جو بھی پاکستان کا شہری بننے پر آمادہ ہو جاتا ہے' پھر اس پر لازم آجاتا ہے کہ مملکت کے قوانین کی اطاعت کرے' نہ کرے تو اطاعت جبراً کرائی جاتی ہے یہ جبراً نہیں ہے۔ اس نے پہلے بطیّب خاطر اپنی رضامندی سے اطاعت قبول کر لی ہے' اگر وہ اس کے بعد نہیں چاہتا تو ملک کو چھوڑ جائے اسلامی نظام کے اندر تو یوں ہے کہ وہ اس نظام کے اندر آنا چاہتا ہے تو اس کی اطاعت کرنا ہوگی' کسی بھی وقت اگر وہ یہ دیکھے کہ نہیں صاحب! میں اس میں نہیں رہنا چاہتا ''مینوں نئیں پگدا اے'' (مجھے یہ قبول نہیں ہے) تو چھوڑ دے۔

ہمارے ہاں مرتد کی سزا قتل تجویز کی جاتی ہے

اب اس مملکت میں اقلیتیں' غیر مسلم بھی بسیں گے وہ ان میں چلا جائے' ان کے قوانین اس پر لاگو ہو جائیں گے۔ یہ کوئی زبردستی نہیں لیکن یہاں تو صاحب! پوچھو نہیں' زبردستی کی یہ کیفیت ہے کہ رضامندی سے اسلام لایا تو جا سکتا ہے مسلمان ہوا تو جا سکتا ہے مسلمان

ہونے کے بعد اسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ چھوڑو گے تو مرتد ہوگے مرتد کی سزا موت ہے۔ اب اس سے زیادہ جبر اور کیا ہوسکتا ہے۔ اس کا دل نہیں ٹھکتا' جس کا دل نہیں مانتا اس کے لیے ٹھیک ہے۔ بدبخت ہے' اپنا نقصان کررہا ہے لیکن یہ کہتے ہیں کہ نہیں' صاحب! تمہارا دل مانے یا نہ مانے' تمہیں تو رہنا پڑے گا۔ اگر تم نے اسے چھوڑا' تو قتل کردیئے جاؤ گے۔

دل کی رضامندی کے بغیر مسلمان رہنا تو منافق کہلاتا ہے' جنگ کے قیدیوں کی مثال

پھر موت کے ڈر سے' قتل کیے جانے کے ڈر سے اگر ہو' مسلمان کی شکل میں رہے گا تو اس سے بڑا منافق کون ہوگا! آپ تو اپنے اندر منافقوں کی ایک قوم تیار کررہے ہیں کہ دل مانتا نہیں ہے' موت کے ڈر سے وہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں' تو جو اس قسم کے ساتھ رہنے والے ہونگے' پھر سوچیے وہ کیا کچھ نہیں کریں گے۔ اس لیے قرآن کریم نے جو بار بار یہ کہا ہے کہ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (50:45) تُو ان پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا گیا' تُو جابر نہیں ہے' اسلام میں اکراہ نہیں ہے۔ میدانِ جنگ میں کہا جارہا ہے کہ جبر نہیں ہے۔ یہاں تو قیدی آنے ہیں' گرفتار ہونگے' جنگ کے قیدیوں میں سے کسی ایک کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا۔ یہ اصول بھی نظامِ سیاست میں یا جنگ کے نظام میں' قرآن کریم ہی کے ہاں سے آپ کو ملے گا کہ جب جنگ کے قیدی تمہارے پاس آئیں تو انہیں اپنے قیدیوں کے بدلے میں رہا کردو یا ان کا کوئی فدیہ لے کر ان کو رہا کردو اور اگر ایسی صورت نہ ہو' ادھر تمہارے قیدی بھی نہ ہوں اور ان کا وہ فدیہ بھی نہ ہو فَاِمَّا مَنًّا (47:4) پھر احساناً ان کو رہا کردو۔

جنگ کے قیدیوں کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کی فقہ کا خلافِ قرآن کریم قانون

آپ کے ہاں کی فقہ کا جو مذہب ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ ان سب کو گرفتار کرو' مردوں کو غلام بناؤ' عورتوں کو اپنے ہاں لونڈیاں بناؤ' پورے سپاہیوں میں تقسیم کرو' بلا نکاح کے' بلا تعداد کے جتنی بھی ہوں' وہ ان سے جنسی تمتع کریں' پھر وہ بیچ سکتے ہیں' انہیں دوستوں کو تحائف میں دے سکتے ہیں۔ یہ جنگ کے قیدی ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ وہ تم میں سے کس کس قسم کے ہونگے۔ کوئی شریف انسان ہوگا' کوئی شرافت مآب عورتیں ہونگی' جو بھی ہیں' یہ تو ایک شہر ہے' اس پہ غلبہ پا گئے' تو آپ کے ہاں کی سارے شہر کی آبادی گرفتار ہوگئی' قیدی ہوگئے ہو' یا جنگ کے قیدی ہوگئے' تو کہا یہ ہے کہ ان کے ہاں کے مردوں کو غلام بناؤ' عورتوں کو لونڈیاں بناؤ اور پھر لونڈیوں کے ساتھ یہ کچھ کرو۔ آج آپ کے ہاں کی تفسیروں میں یہ لکھا ہوا ہے۔ یہ جو UNO ہے' اس کے چارٹر میں' جن میں اکثریت غیر مسلم ممالک کی ہے' انہوں نے تو اپنے چارٹر میں Slavery (غلامی) ممنوع قرار دیا' بعد میں تو ان کو بھی مجبوراً کرنا پڑا' ورنہ وہ جو ان کا چارٹر تھا' اس کے اوپر حجاز کی مملکت نے

دستخط نہیں کیے تھے کہ یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے' ہمارے ہاں غلامی جائز ہے۔ اب جو ساری دنیا نے اس پر عمل کیا ہے تو کچھ عرصہ ہوا' انہوں نے بھی دستخط کر دیئے لیکن ان کے ہاں ابھی تک فقہ کا مسلک وہی ہے کہ جنگ کے قیدیوں کو غلام بناؤ' ان کی عورتوں کو لونڈیاں بناؤ' اور قرآن کریم کہہ رہا ہے کہ وَمَآ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِجَبَّارٍ (50:45) تم اس پر کسی قسم کا جبر کر ہی نہیں سکتے۔ کرنا کیا ہے' عزیزانِ من! بات تو ساری یہ ہے کہ فَذَكِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (50:45) انہیں قرآن کریم کی بات سمجھاؤ اور کتنی خود اعتمادی ہے قرآن کریم والے خدا کی' کہ اگر قرآن کریم کی بات سمجھائی جائے اور واقعی اس نے دل کے کانوں سے سن لیا اور یہ چیز اس کی سمجھ میں آ گئی کہ غلط راستے پر چلنے کا نتیجہ کیا ہوگا' پھر وہ قرآن کریم کو چھوڑ کر کہیں اور جا نہیں سکتا۔

عزیزانِ من! درس کا وقت پورا ہو گیا' سورۃ قٓ آج اختتام تک پہنچ گئی۔ آئندہ درس میں ہم اگلی سورۃ الذّریٰت لیں گے۔ یہ 51 ویں سورۃ ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

سورة الذّٰریٰت

پہلا باب: **سورۃ الذّٰرِیٰت** (آیات 1 تا 19 نامکمل)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1982ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الذّٰریٰت کی پہلی آیت سے ہی سے ہوتا ہے۔ یہ 51 ویں سورۃ کا نمبر ہے: (51:1)

قرآنِ حکیم کے دل کش انداز میں بمعہ سیاق وسباق کے کائنات کے چاروں گوشوں کی وضاحت

اس سے پہلے آیت کے پہلے لفظ کی بنا پر ہی سورۃ کا نام الذّٰریٰت رکھا گیا ہے۔ یہ دو دو الفاظ کی چار آیتیں ہیں۔ پہلے یہ ہے کہ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا o فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا o فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا o فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (51:1-2-3-4)، قرآن حکیم کا کیا انداز ہے! عرب، حالانکہ زبان پہ اتنے نازاں تھے اور ان کی زبان کا مقابلہ تو دنیا کی کوئی زبان نہیں کر سکی، وہ بھی یہ متعین کرنے سے قاصر تھے کہ اس قرآن حکیم کے اسلوب کو کہا کیا جائے۔ یہ نثر بھی نہیں ہے، یہ شاعری بھی نہیں ہے، اور پھر یہ ہے کیا؟ یہی چیز تھی کہ جس کے لیے وہ کہتے تھے کہ معنوی لحاظ سے تو الگ رہا، اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی یہ بے مثل کتاب ہے۔ یہ دو دو لفظوں کی چار آیتیں ہیں اور کائنات کے چاروں گوشے اس میں سمٹ آئے ہیں۔ پہلے تو ان لفظوں کے معنی یونہی دیکھیے، پھر میں عرض کروں گا کہ عام طور پر اس سے مفہوم کیا لیا جاتا ہے اور پھر یہ کہ میں سیاق وسباق کے اعتبار سے مفہوم کیا لیتا ہے۔ کہا ہے کہ وَالذّٰارِیٰتِ ذَرْوًا (51:1) ذٰریٰت کہتے ہیں کہ غبار اڑانے

والی کسی چیز کو اُڑا کر پھیلانا❶ ۔فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (51:2) کے معنی ہیں ''بوجھ کو اُٹھانا''۔پھر ہے کہ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا (51:3)۔اس کے معنی ہیں ''سبک خرامی سے' آہستہ آہستہ چلتے چلے جانا'' اور اگلی آیت ہے فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (51:4)۔اس کے معنی ہیں ''امرِ الٰہی کو تقسیم کرنے والی''۔ یہ ہیں چار ٹکڑے' جن میں کائنات کے چاروں گوشے سمٹ آئے ہیں۔عام طور پر ان سے مراد لی جاتی ہے ''وہ ہوائیں جو غبار کو اٹھاتی ہیں' بادلوں کے مشکیزوں کو اپنے کندھوں پر لیے اِدھر اُدھر پھرتی ہیں اور اس کے بعد پھر بارش یا امرِ خداوندی کو مختلف جگہ تقسیم کرتی ہیں''۔ یہ ٹھیک ہے' قرآنِ کریم نے' جیسا کہ آپ کو معلوم ہے' کائناتی نظام کے شواہد کو بھی اپنے دعاوی کی تائید میں یہ بتانے کے لیے پیش کیا ہے کہ جس طرح یہ سارا سلسلۂ نظامِ کائنات' اٹل قوانین کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے' اسی طرح انسانی زندگی کے لیے بھی قوانین ہیں۔ یہ چیزیں فطرت کے مظاہر کے متعلق بھی ہوسکتی ہیں جیسا کہ عام طور پر لیا جاتا ہے لیکن ایک تو پچھلی آیت میں آپ دیکھیے گا کہ اس انقلابِ عظیم کا ذکر تھا جو برپا ہونے والا تھا اور جس کا آغاز جو شاید بدر کی پہلی جنگ میں بڑے زور وشور سے ہوگیا۔ یہ چیز پیچھے سورۃ قٓ میں کہی گئی تھی: یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّکَانٍ قَرِیْبٍ ۙ یَّوْمَ یَسْمَعُوْنَ الصَّیْحَۃَ بِالْحَقِّ ذٰلِکَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ o یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ (50:41-42-43-44)۔

قرآنی انقلاب کے برپا ہونے پر ظہورِ نتائج کے محسوس خدوخال

عزیزانِ من! یہ تمام چیزیں ایسی تھیں جن میں نظر آتا تھا کہ ایک عظیم انقلاب برپا ہونے والا تھا' جس کے متعلق پہلے ہی سے یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اب ایسا ہونے والا ہے اور یہ ہو کر رہے گا۔ اصل چیز وہ ہے جو ہماری تاریخ میں ہے اور وہ ہے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کہ انہیں اس دین کو متمکن کرنے کے راستے میں' جس قدر کشمکش پیش آئی' جس قدر انہیں صعوبات اٹھانی پڑیں' جس قدر مشکلات کا سامنا ہوا' اور جس انداز سے انہوں نے قابو پایا' فتح حاصل کی' غالب آئے۔ یہ ساری تاریخ وہ ہے۔ میں اسی اعتبار سے' اس قسم کے جو الفاظ آتے ہیں' اسی سیاق وسباق میں لیتا ہوں۔

پہلے میں نے کہا کہ سابق سورۃ (سورۃ قٓ) کی آخری آیات میں اس انقلابِ عظیم کی طرف اشارہ تھا اور اس میں یہ چاروں چیزیں کہنے کے بعد اب سورۃ الذّٰریٰت میں یہ کہا کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ (51:5) یہ چیزیں اس پر شہادت دیتی ہیں کہ جو کچھ ان

---

❶ اس کا مادہ ''ذرو'' ہے۔ذَرَتِ الرِّیْحُ الشَّیْءَ ذَرْوًا ہوا اس چیز کو اُڑا کر لے گئی۔ذَرَا الْحِنْطَۃَ یَذْرُوْھَا ذَرْوًا اس نے گیہوں کو بھوسے سے صاف کرنے کے لیے ہوا میں اڑایا۔فَتَذَرَّتْ پس گیہوں بھوسے سے الگ ہو کر صاف ہوگیا۔ذَرْوٌ پھیلا دینا' بکھیر دینا۔ذَرِا (اَلذَّرِیُ) بکھیر دینے والا' پھیلا دینے والا (نشرو اشاعت (Broadcast) کرنے والا)' وہ قوتیں (Forces) جو کسی پیغام (یا نظام) کی نشرو اشاعت کا ذریعہ بنتی ہیں' جن سے وہ آواز دنیا میں پھیلتی ہے۔ذرائع رسل ورسائل ومواصلات ونشرو اشاعت (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔697)۔

سے کہا گیا ہے، وہ سچ ہو کر رہے گا۔ کہا تو ان سے یہی جا رہا تھا کہ تمہارا غلط نظام تمہاری تباہی کا باعث ہے اور اب اس میں زیادہ وقت نہیں لگے گا، یہ وقت بہت قریب آ رہا ہے۔ اب بھی اگر تم سنبھل جاؤ تو اس تباہی سے بچ سکتے ہو۔ ان سے یہ کہا جا رہا تھا۔ سابق سورۃ کی آخری آیات میں ان سے کہا گیا کہ اب تو بالکل یوں سمجھو جیسے ایک آواز دینے والا بلا کر آواز دیتا ہے کہ دیکھو! وہ انقلاب آ رہا ہے اور یہاں ان چیزوں کو سامنے لا کر کہا کہ یہ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یقیناً جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے، وہ سچ ہو کر رہے گا۔ وہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (51:6) وہ انقلاب واقع ہو کر رہے گا، جو ہم بیان کر رہے ہیں۔

لفظ ذٰریٰت کا مفہوم: Broadcasting (نشر و اشاعت)

عزیزانِ من! اس جہت سے ان الفاظ کا مفہوم بھی، جو عربی زبان کے اعتبار سے ہے، جس مفہوم کی یہ زبان متحمل ہوتی ہے، میں نے وہ مفہوم لیا ہے اور جو سیاق و سباق میں اور اس پوری تاریخ میں جو ہمارے سامنے آتی ہے، Fit in کرتا ہے۔ یہ کہا ہے کہ وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا (51:1) ''یہ کسی چیز کو ابھار کر پھیلانا'' ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بعض انگریزی تراجم میں بھی اس کے متعلق Broadcast کا لفظ آیا ہے اور یہ بڑی صحیح بات ہے۔ ذٰریٰت اُمتِ مسلمہ کی جماعتوں کا نام ہے، یہ جماعتیں ہیں، یہ جو امت مسلمہ تھی، یہ اس کے گروہ ہیں، اس کی جماعتیں ہیں، ان کے فرائض ہیں، ان کے یہ پروگرام ہیں جو کچھ وہ کرتے تھے۔ پہلی چیز تو اس پیغام کی نشر و اشاعت تھی یعنی اس کو بلند کرنا اور پھر اس کو پھیلانا۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ جنہوں نے اس کا ترجمہ Broadcast کیا ہے وہ بڑی صحیح بات پہ پہنچے ہیں۔ اس لفظ میں بلند کرنا اور پھیلانا دونوں چیزیں آ جاتی ہیں۔ اس لفظ ''ذرؤا'' کے اندر دونوں باتیں ہوتی ہیں: کسی چیز کو بلند کرنا اور پھر اس کو پھیلا دینا۔ یہ اس پیغام کی نشر و اشاعت کرنے والی جماعتیں ہیں۔ یہ جو ''وٗ'' ہے، آپ کو معلوم ہے اس کے معنی ہیں ''شہادت میں پیش کرنا''، اور یہ آخر میں آئیں گے۔ کہا یہ ہے کہ یہ سب اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ جو کہا جا رہا ہے، یہ واقع ہو کر رہے گا، یہ ان کے ہاتھوں سے واقع ہونا ہے۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ نورانی انقلاب کا پہلا مرحلہ نرم روی سے نشر و اشاعت پر منحصر ہوتا ہے

یہ جماعتیں ہیں جن کے یہ فرائض بتائے گئے ہیں، جن کے یہ پروگرام بتائے گئے ہیں، تو اس پروگرام کا پہلا حصہ تو یہ ہے۔ یہ انقلاب ان کے ہاتھوں واقع ہونا ہے۔ یہ کوئی دھاندلی کا چنگیز خانی کا اور ہلاکو خانی کا انقلاب نہیں ہے کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہو اور شباشب آ کر حملہ کر دیا جائے اور تہ تیغ کر دیا جائے۔ یہ تو قلب و نگاہ کے انقلاب کا ایک پروگرام تھا۔ اس میں پہلی چیز قرآن حکیم کے قوانین اور تعلیم کا عام کرنا ہے، اس کی نشر و اشاعت کرنی ہے، اس کو بلند کرنا ہے، اس کو بکھیرنا ہے، اس کو پھیلانا ہے، تو یہ جماعتیں ہیں جو اس پیغامِ خداوندی

کی نشر واشاعت میں مصروف ہیں۔

آگے کہا ہے کہ فَالْحٰمِلٰتِ❶ وِقْرًا ❷ اور جو ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ اپنے کندھوں پہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ بڑی بڑی ذمہ داریاں ہیں' ابھی ابھی میں یہ ذمہ داری عرض کروں گا کہ یہ کیا ہیں۔ آگے کہا کہ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا (51:3) اور وہ جو آگے بڑھ رہی ہیں لیکن طوفان کی طرح نہیں' سیلاب کی طرح نہیں' فسادی کی طرح نہیں' جھکڑ کی طرح نہیں بلکہ نسیم سحر گاہی کی طرح' آہستہ آہستہ نرم روی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ کیا ہی انقلاب ہے! جس انقلاب نے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنی ہو' وہ جھکڑ نہیں ہوا کرتا' وہ تو بڑا Unconsciously (غیر شعوری طور پر) تاثرات دینے والا ایک پروگرام ہوتا ہے کہ وہ خود بخود چپکتا چلا جائے' اس کے اندر نرم خرامی بڑی ضروری چیز ہے۔ اس میں اشتعال ہوتا ہی نہیں۔ اسلام کی بات کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو آپ اس طرح جھکڑ کی طرح چلائیں اور پھیلا دیں۔ یہ انقلاب نہیں ہوتا' یہ فساد ہوتا ہے۔ انقلاب تو قلب سے ہے۔ یہ قلبی تبدیلی سب سے پہلے ہوتی ہے۔

آگے کہا ہے کہ فَالْجٰرِیٰتِ❸ یُسْرًا (51:3) کیا دو دو الفاظ ہیں! کہا ہے کہ یہ جامد نہیں ہیں' ساکت نہیں ہیں کہ رک کر کھڑے ہو جائیں۔ یہ کسی مقام پر کھڑے ہو جانا تو موت ہے:

مگر کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

اسلام کی تحریک' نمودِ سحر کی طرح' معاشرے میں سورج کی شعاعوں کی مانند الدین کو لیے ہوئے جلوہ بار ہوتی ہے

اسلام تو ایک تحریک کا نام ہے' حرکت کا نام ہے' جمود تو اس میں ہو نہیں سکتا۔ کہا ہے کہ فَالْجٰرِیٰتِ (51:3) یہ چلنا ہے اور اس کے ساتھ ایک لفظ یسراً آیا ہے یعنی نسیمِ صبح گاہی کی طرح' آہستہ آہستہ' غنچوں کا' پھولوں کا' منہ چومتی ہوئی' آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ عزیزانِ من! آپ اس انداز سے یہ پروگرام دیکھیے کہ کیا دیا گیا ہے! انہوں نے پھیلانا ہے' انہوں نے نشر واشاعت کرنا ہے' یہ بڑی ذمہ داری ہے جس کا بوجھ یہ سر پہ لیے ہوئے ہیں لیکن اس میں فساد نہیں برپا کرنا' جھکڑ نہیں چلانے' طوفان نہیں برپا کرنا' اسے تو نہایت آہستہ روی سے' دل و دماغ کے اندر تبدیلیاں پیدا کرتے ہوئے چلے جانا ہے۔ آگے کہا ہے کہ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا (51:4) امر خداوندی کو

---

❶ اس کا مادہ "ح م ل" ہے۔ کسی کے ذمہ کام لگا دینا مثلاً مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ (63:5) جن لوگوں پر احکام تورات کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی' (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص 552)۔

❷ اَلْوِقْرُ بھاری بوجھ اور جَنَانٌ وَاقِرٌ باہمت دل کو کہتے ہیں جو گھبرانہ اٹھے' (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص 1730)۔

❸ اس کا مادہ "ج ر ی" ہے۔ جَرْيٌ وَ جَرَيَانٌ کے معنی ہیں "پانی وغیرہ کا چلنا' بلا روک ٹوک بہنا"۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اَلْجَرْیُ تیزی سے چلنے کو کہتے ہیں' (ماخوذ پرویزؒ: لغات القرآن ص۔ 427)۔

تسلیم کرتی چلی جاتی ہیں، پھیلاتی چلی جاتی ہیں۔ یہ ہیں جماعتیں جن کے ذمہ یہ پروگرام دیا گیا ہے۔ ان جماعتوں کی Activities (سرگرمیاں)، ان کی نقل وحرکت، ان کے پروگرام، یہ سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ (51:5) جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا، وہ سچ پر مبنی ہے اور اس کی شہادت، ان جماعتوں کی موجودگی، ان کے پروگرام، ان کا نظم ونسق دے رہا ہے کہ یہ ہو کر رہے گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح سے پچھلی سورۃ قٓ کی آخری آیات اور اس آنے والی سورۃ میں ربط ہے۔ اسی کو سیاق وسباق کہتے ہیں۔ اس کے اندر رکھ کر آپ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم ایک مربوط کتاب ہے، اس میں ربط ہے، آیتوں میں بھی ربط ہے، اس کی سورتوں میں بھی ربط ہے۔ یہ ایک پروگرام ہے جو دیا گیا ہے کہ یہ چیز اس پہ شاہد ہیں کہ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (51:6)۔ الدین کے معنی مکافاتِ عمل ہوتا ہے، انقلابِ عظیم ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ واقع ہو کر رہے گا اور چونکہ یہ واقع ہوتا ہے، یہ غلط نظامِ زندگی پر چلنے والی قوموں کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے یہ مکافاتِ عمل ہے اور الدین اس لیے مکافاتِ عمل بھی ہے۔ مکافاتِ عمل کی رو سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، اس کے لیے بھی یہی لفظ ہے، اس نظام کے لیے بھی یہی لفظ ہے جو خدا کے قوانین کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کے جو نتائج ہیں، وہ بھی الدین ہیں۔ وہ جو انقلاب برپا کرتا ہے وہ بھی الدین ہے۔ مکافاتِ عمل بھی الدین ہے۔ یہ عربی زبان کا بڑا جامع لفظ ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ واقع ہو کر رہے گا۔ یہاں تو یہی کہا ہے کہ وہ انقلاب جس کے متعلق تم سے بار بار کہا جا رہا ہے، وہ واقع ہو کر رہے گا۔

حضور ﷺ کی زندگی میں برپا ہونے والے انقلاب کی تفصیل

عزیزانِ من! ذرا ساری دنیا کی تاریخ دیکھیے۔ حضور ﷺ کی مدنی زندگی دس سال کی ہے، اس میں سات یا آٹھ سال کے مختصر ترین عرصے میں یہ پورا نظام قائم ہو گیا تھا، یہ پورا انقلاب واقع ہو گیا تھا۔ 10 لاکھ مربع زمین پر تو ان عربوں میں حضور ﷺ کی زندگی میں ایک مملکت قائم ہو گئی تھی، جنہوں نے اس سے پیشتر حکومت کا لفظ بھی نہیں سنا تھا۔ وہ اس کے تصور سے ناآشنا تھے، ان میں یہ چیز قائم ہو گئی تھی۔ یہ کتنا بڑا عظیم انقلاب! ان سات سال کے اندر، یہ جنہیں وہ چھاپہ مارنا اور جن کو بڑے بڑے جنگ، غزوات کہتے ہیں، ان کو ملا کر اسی بیاسی کے قریب یہ گنائے گئے ہیں ان تمام میں دونوں طرف سے ایک ہزار کے قریب جانیں گئی ہیں اور یہ انقلاب آ گیا۔ یہ اتنا بڑا انقلاب ہے! یہ دائیں بائیں ایران جیسی سلطنت [1] تھی، بازنطینی [2] روما جیسی سلطنتیں تھیں وہ دائیں بائیں اتنی عظیم سلطنتیں ان کی مخالفت کے لیے کھڑی تھیں۔ انہوں نے سرحدوں پر ایسے ایسے غسانی حکمران مقرر کر دیئے تھے جو ہر وقت ان کے لیے خطرے کا موجب بن رہے تھے۔

---

[1] ظہورِ اسلام کے وقت، خلیج فارس کے اُس پار مجوسیوں کی قدیم اور عظیم سلطنت (ایران) تھی۔

[2] جزیرۃ العرب کے شمال میں عیسائیوں کی وسیع مملکت (بازنطین) تھی۔ رومن ایمپائر (مملکتِ روم) قدیم دنیا کی وسیع وعریض اور نہایت متمدن مملکت تھی۔

بدوؤں کے ملک کے اندر یہودی اور منافق موجود تھے؛ ان میں خاص طور پہ یہودی تھے جن کا شروع سے ہی یہ قاعدہ رہا ہے کہ وہ بدترین دشمن تھے۔ یہ اسلام کے اندر موجود ہیں۔ مدینے کے اندرونی حالات ایسے ہیں' بیرونی خطرات ایسے ہیں' تصور وہ ہے جو عربوں کے ذہن میں بھی نہیں تھا' یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ ایک منظّم حکومت کسے کہتے ہیں۔ یہ حالات تھے اور پورے جزیرۃ العرب [1] پہ اتنے عرصے میں ساتھ اتنی لڑائیاں بھی لڑی جا رہی ہیں۔ آپ دیکھیے کہ اس نقلاب کی مثال دنیا کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔ مغرب کے مورخین بھی' اگرچہ بڑے تعصب سے کام لیتے ہیں' لیکن یہاں آ کر یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ اتنا Peaceful (پرامن) انقلاب اور اتنا عظیم انقلاب دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتا۔

عربی زبان کی جامعیت کے سلسلہ میں علامہ غلام احمد پرویزؒ کا ارشاد

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (51:5) جو کچھ مخالفین سے کہا جا رہا ہے' وہ بالکل سچ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیسے ہوا؟ اب آئی اگلی بات۔ فطرت کے قانون یا فطرت کے شواہد میں ایک بات عظیم چیز ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ٥ اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (51:7-8)۔ عام ترجموں سے یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں نے عرض کیا ہے اور میں یہ بار بار عرض کرتا ہوں کہ آپ ایک تو اس عربی زبان کی جو جامعیت اور وسعت ہے' اسے سامنے رکھیے۔ ذہن یہ باور ہی نہیں کر رہا اور ہم تو ایک طرف' جو مستشرکین ہیں' جنہوں نے اس علم اللسان پہ اتنی تحقیق کی ہے' وہ بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں' جب عربی زبان کی اس وسعت پر غور کرتے ہیں کہ یہ کیا زبان ہے! دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ ہی نہیں کرسکتی۔ انہوں نے اس زمانے کی زبانوں میں' جب مقابلہ کر کے دیکھا ہے تو پھر انہیں معلوم ہوا ہے کہ اس زبان کے اندر الفاظ نہیں ہیں' Consepts ہیں' تصورات ہیں۔ یہ کہا ہے کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ (51:7)۔ اب یہاں یہ "حبک" آیا ہے۔ اس کا پھر کیا ترجمہ کیا جائے گا؟ میں پھر عرض کروں' عزیزانِ من! پتہ نہیں زندگی کب تک ساتھ دیتی ہے۔ قرآنِ کریم کو سمجھنا ہے تو قرآنِ کریم کے یہ جو الفاظ ہیں' جن کو مفردات کہتے ہیں' ان کے بنیادی معنی کو سمجھیے۔ میں خود اپنی زبان سے نہیں کہا کرتا کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ صاحب! میں اپنی کتاب کے متعلق کچھ کہہ رہا ہوں لیکن جب وہ واقعی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بخل ہوگا اگر میں اس کو چھپاؤں۔ یہ ہر ایک کے لیے بنیادی معنی آپ کو مشکل ملیں گے۔ ہر ایک

---

[1] محل وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس' جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ عربوں جیسی آب نادیدہ اور عطش گزیدہ قوم کے نزدیک دریا بھی سمندر سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے ہاں جس جگہ بھی کچھ پانی جمع ہو' وہ بحر کہلاتا ہے۔ وہ دریا کو بھی کبھی بحر اور کبھی یم کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے ملک کو جزیرہ نما نہیں بلکہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں' (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' 1987' ص ص۔ 164-163)۔

کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ اس پر صرف کرے۔ میں نے اس پر پچاس سال اس طرح سے صرف کر کے یہ بنیادی معنی خود متعین کیے۔ اگر کوئی کر سکتا ہے تو بسم اللہ کرے یہ بڑی بات ہے۔ میں نے ان کے لیے یہ آسانی پیدا کر دی ہے۔ یہ میرا لغات القرآن ہے۔ اگر آپ میرا یہ لغت دیکھ لیں تو آپ کو ان الفاظ کے بنیادی معانی اور ان کی وسعتیں نظر آ سکیں گی جن میں عرب انہیں استعمال کرتے تھے اور پھر قرآن کریم میں جہاں یہ الفاظ آئے ہیں' وہاں بتایا جائے گا کہ دیکھیے! یہاں اس کے کیا معنی ہیں۔

قرآنی لفظ ''حبک'' کا لغوی مفہوم

یہ یہاں (51:7) میں ذَاتِ الْحُبُکِ کہا ہے۔ وہ تو چودہ سو سال کی بات ہے' شاید ابھی دو سو سال پہلے بھی علم الافلاک (Astronomy) کے مغرب کے جو اتنے بڑے ماہرین ہیں' ان کے ذہنوں میں یہ بات نہیں آئی ہو گی جو اس ایک لفظ ''حبک'' کے اندر آ گئی ہے۔ عزیزانِ من! انسان وجد میں آ جاتا ہے کہ یہ قوم ہے' انہوں نے یہ زبان کیسے بنائی تھی؟ حبک کہتے ہیں کہ ''کوئی شے' جو پہلے تو اکٹھی ہو پھر بکھر جائے' الگ الگ ہو جائے اور ان میں سے ہر ٹکڑا ایک الگ منزل کی طرف رواں دواں رہے۔'' اس لفظ کے اندر یہ دونوں چیزیں تھیں۔ سمآء آسمانی کرّے کو کہتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہا۔ آپ کی علم الافلاک کی جو Latest (جدید ترین) تحقیق ہے' وہ یہی ہے کہ یہ ساری کائنات' اور جتنے بھی ستارے' سیارے اور یہ کرّے نظر آتے ہیں' یہ شروع میں ایک Nabula (ہیولیٰ) کے Form (فارم) میں اکٹھے تھے' یہ سارے ایک ہی ماس (Mass) تھا' یہ الگ الگ نہیں تھے' پھر اس میں یہ ہوا کہ جیسے چھینٹے اڑتے ہیں' میں اس میں تفصیل میں نہیں جا سکتا' بات تو بڑی ہے' آپ جیمز جینز کی کتابیں ہی دیکھ لیجیے' بس یوں کہیے کہ جس طرح چھینٹے اڑتے ہیں' اس طرح سے یہ چھینٹے اڑے اور یہ بڑے بڑے کرّے' جو آپ کو سورج چاند ستارے اور کہکشاں نظر آتے ہیں' یہ اس Nabula (ہیولیٰ) سے اُڑ کر الگ الگ ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کرّہ اپنے اپنے فلک یا مدار (Orbit) کے اندر محوِ گردش ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ (21:33) ہر ٹکڑا جو الگ ہوا ہے' وہ اپنے مدار میں محوِ گردش ہے۔ لفظ حبک کے اندر یہ دونوں چیزیں تھیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ حبک میں پہلے کسی چیز کا ایک ہونا' اکٹھا ہونا' مجتمع ہونا ہے' پھر اس میں سے ٹکڑوں کا اڑنا' اڑنے کے بعد ہر ٹکڑے کا ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں رہنا ہے۔ یہ سارے مفہوم ان کے ہاں ایک لفظ حبک کے اندر تھے۔ سوچیے تو سہی' تیرہ سو سال پہلے کون یہ زبان بنا سکتا تھا' کس زبان میں اتنی وسعت ہے کہ ایک لفظ میں یہ بات کہے جو چودہ سو سال بعد کی تحقیق' اس کے مفہوم میں' ایک ایک لفظ کی تائید کر رہی ہے کہ یہ واقعی وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُکِ (51:7) ہے۔ اس میں مختلف اجرام' اپنے اولین ہیولیٰ سے ٹوٹ کر' کس طرح اپنے اپنے راستوں میں نہایت محکم طور پر مصروفِ گردش ہیں۔ یہ سب قانون کی زنجیروں میں بندھے ہوئے' ایک

منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

14 سو سال پیشتر قرآنِ حکیم کی طرف سے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں پر غور وفکر کرنے کی دعوت

عزیزانِ من! یہ جیسے آپ کو معلوم ہے تصریفِ آیات سے میں دو لفظوں میں عرض کروں۔ دوسری جگہ کہا ہے کہ اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا (21:30) کیا ان لوگوں نے جو قوانینِ خداوندی سے انکار کر رہے ہیں کبھی اس چیز پہ غور کیا اس بات کو دیکھا؟ یہ کیا چیز ہے جس پہ غور کرا رہے ہیں؟ یہ چودہ سو سال پہلے کہا جا رہا ہے کہ ارض اور سما یعنی یہ پستیوں کے کرّے اور یہ بلندیوں کے کرّے یعنی پوری کائنات کے جتنے بھی یہ کرّے ہیں ان کی کیا کیفیت تھی؟ کہا کہ کَانَتَا رَتۡقًا (21:30) وہ سب کے سب اکٹھے یکجا تھے۔ اس لفظ کے یہ معنی ہیں۔ پھر کیا کیا؟ کہا کہ فَفَتَقۡنٰہُمَا (21:30) پھر اس کے بعد ہم نے ان کو بکھیر دیا الگ الگ کر دیا تو وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الۡحُبُکِ (51:7) ہو گئے۔ یعنی کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا (21:30) تخلیق کائنات کے ابتدائی دور میں یہ سب ایک ہی ہیولیٰ تھے۔ پھر ہم نے انہیں الگ الگ کر دیا۔ اور پھر اگلی بات تو پوچھو نہیں! وہ Biologist کے لیے ہے جو زندگی سے متعلق ہے۔ وہ انکشافات کر رہے ہیں کہ وَ جَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ (21:30) یہ Matter یہ مادہ غیر جاندار غیر ذی حیات ہے اس میں پانی کے چھینٹے سے زندگی پیدا کر دی۔ یہ سائنس کے انکشاف کا آخری نکتہ ہے۔ وہ تو بہرحال اور بات آ گئی۔ میں عرض کر رہا تھا جو قرآن حکیم نے ایک لفظ ذَاتِ الۡحُبُکِ کہا ہے اسے دوسری جگہ رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا (21:30) کہہ کر اس کی تفصیل کر دی ہے کہ پہلے یہ ایک ہی جامد ہیولیٰ (Nabula) تھا اور اس کے بعد ان کے چھینٹے اڑے اور وہ الگ الگ ہوئے۔

خدائے علیم کی طرف سے کائناتی کنٹرول کی کیفیت مگر تمہارے خیالات بھی الگ الگ اور منزلیں بھی الگ الگ

قرآن کریم میں یہ ہے کہ کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ (21:33) ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے Planet سے اپنے اپنے مدار کے اندر محو گردش ہے سرگرداں ہے تیر رہا ہے اور ان سب کا رخ ایک منزل کی طرف ہے۔ ان میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں کسی قسم کا کوئی انتشار نہیں۔ کہا کہ تم دیکھتے ہو کہ کائنات کے اتنے عظیم الجثہ نظام کے اندر اتنے اتنے عظیم کرّوں کے اندر جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار میں بھی گردش کرتا ہے اور وہ جو اس کی دوسری گردش ہوتی ہے اس دوران وہ بھی کر رہا ہے۔ منزل ایک ہے ان کے قدم یکساں اٹھتے ہیں کوئی اختلاف نہیں۔ اگر سورج کی رفتار میں سیکنڈ کے کروڑویں حصے جتنا بھی کہیں فرق پیدا ہو جائے تو ساری کائنات ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ کہا ہے کہ دیکھتے ہو نظام کائنات کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے! کیوں چل رہا ہے؟ اس میں

اختلاف نہیں' ان کی یہ کیفیت ہے لیکن اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (51:8) تمہاری یہ کیفیت ہے کہ آج کچھ کہتے ہو' کل کچھ کہتے ہو' یہاں کچھ کہتے ہو' وہاں کچھ کہتے ہو' تمہاری ہر بات میں اختلاف ہے۔' تمہارے خیالات بھی الگ الگ ہیں اور منزلیں بھی جدا جدا۔

آج کرۂ ارض پر ملتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کی کیفیت اور اس کی وجہ جواز

آپ دیکھتے ہیں کہ نظامِ کائنات کی کیا مثال دے کر اور اس پر کیا نتیجہ قرآن حکیم مرتب کرتا ہے کہ وہاں کائنات کے نظام کی یہ کیفیت ہے اور تمہاری یہ حالت ہے اور پھر اس نے بتایا کہ اختلاف کا نتیجہ تو تباہی اور روسیاہی ہوتا ہے۔اس نے تو چودہ سو سال پہلے جو بتایا تھا' اسے تو چھوڑ یئے' آج تو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ایک ارب آبادی ہے' مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کا بحرِ ذخار ہے اور ان کے اندر ایک گھاس کے تنکے جتنی پچیس چھبیس لاکھ کی ساری آبادی کی مملکت ہے۔اس کے بعد معاف رکھیے گا کیا الفاظ استعمال کروں کہ یہ کیا کر رہی ہیں اور ان کے ہاں اب تک بھی غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ(1:7) کی تفسیر منبر سے بیان ہو رہی ہے کہ اس سے یہ یہودی مراد ہے' یہ مغضوب علیہ قوم ہے' یہ وہ قوم ہے جس پر خدا کا غضب نازل ہوا ہے یعنی ہماری ذلت اور رسوائیاں' قتل اور غارت گری' بربادی اور تباہی بھی اس قوم کے ہاتھوں آ رہی ہے' جس کے متعلق ہم اعلان کرتے ہیں کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہے' مغضوب علیہ قوم کے ہاتھوں ہماری یہ ذلت رسوائی ہو رہی ہے۔عزیزانِ من! یہ کیوں ہو رہی ہے؟ یہ اس لیے ہو رہی ہے کہ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ(51:8) تم میں بہت اختلاف ہے۔یہ ہے اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ(51:8)۔

اب یہاں پھر وہی پرانی بات ہے کہ ٹھیک ہے جی! یہ تو خدا کے اختیار میں جو باتیں ہیں' یہ تو وہی کرتا ہے' کسی کے بس میں کوئی بات نہیں۔ٹھیک ہے' یہ کہا ہے کیوں کہ تم اس قسم کی کٹ حجتی کرتے ہو۔مگر یہ بات نہیں ہے۔یہ عجیب چیزیں ہیں' عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے قرآنِ کریم نے بار بار یہ کہا ہے کہ انسان کو صاحبِ اختیار بنا دیا گیا اور وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) دونوں راستے اس کو دکھا دیئے' باہر روشنی دیدی' اور اسے کہدیا کہ اب تم جونسا راستہ جی چاہے چن لو اور اسی بنا پہ غلط راستہ اگر چنتا ہے تو پھر اس کے جتنے عواقب ہوتے ہیں' اس کی ذمہ داری بھی اسی پہ عائد ہوتی ہے کہ اس نے اپنے لیے یہ راستہ خود چنا تھا' خدا کی طرف سے انسان پہ کوئی جبر نہیں ہے۔ کہا ہے کہ يُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ(51:9) یہ چیز ہے کہ جو تم میں سے صحیح راستہ چھوڑ کر' حق اور صداقت کا راستہ چھوڑ کر' غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے' اسے وہ راستہ اختیار کرنے دیا جاتا ہے۔نہ کسی کو زبردستی صحیح راستے پر چلایا جاتا ہے اور نہ ہی اسے زبردستی غلط راستے پر ڈالا جاتا ہے۔جو خود یہ راستہ اختیار کرتا ہے' اسی کے لیے ہمارا قانون یہ نتائج مرتب کرتا ہے۔

خدا کا قانون انسان کے ہر عمل کے نتائج کو ساتھ کے ساتھ مرتب کرتا چلا جاتا ہے مگر یہ جھگڑتے ہیں

میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں تو جسے Initiative کہتے ہیں' جسے ابتداء کہتے ہیں' جو پہلا قدم اُٹھانا ہے' وہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے' خدا کا قانون تو اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ اسی کو عاقبت اور عواقب کہتے ہیں۔ یہ ہے کسی کے پیچھے پیچھے جانا۔ انسان صحیح راستے پہ چلتا ہے' خدا کے قانون کی خوشگواریاں اس کا ساتھ دیتی ہیں' غلط راستہ اختیار کرتا ہے' تباہیاں اور بربادیاں اس کا ساتھ دے رہی ہوتی ہیں۔ جونسا راستہ اختیار کرے گا' اسی قسم کی منزل پر پہنچے گا۔ یہ ہے یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (51:9)۔ دوسری جگہ کئی مقامات پر قرآن کریم نے کہا ہے کہ جب تم یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ مثلاً یہ کہ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (61:5) ان بنی اسرائیل کے ہی متعلق تھا۔ وہاں یہ ہے کہ جب خود انہوں نے اپنے لیے غلط راہ اختیار کی تو پھر غلط راہوں کے اختیار کرنے کے نتائج تو ان کو بھگتنے پڑے۔ اللہ کی طرف سے تو اتنا ہی ہوتا ہے کہ جو روش کوئی اختیار کرتا ہے' اس کے نتائج اس کے قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے۔ بس خدا یہی کرتا ہے کہ جیسا کوئی بنتا ہے' اس قسم کے ہی نتائج اس کو بھگتنے پڑتے ہیں۔ ہم ان سے کہتے ہیں کہ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ (2:111) اگر تم اپنے قول میں' اپنے دعوے میں' سچے ہو تو اس کے ثبوت میں دلائل لاؤ' قرآن کریم دلیل مانگتا ہے' خود بھی دلائل سے بات کرتا ہے لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جھگڑتے رہتے ہیں۔

آج کے اخبارات مناظروں کی شکل اختیار کیے ہوئے ہیں: کوئی سند نہیں' کوئی دلیل نہیں

آپ دیکھتے ہیں کہ آج بھی ہمارے ہاں یہ جتنے مذہبی مناظرے ہوتے ہیں' ان کی شکلیں بدل گئی ہیں۔ یہ اخبارات اتنی تعداد میں نکلتے ہیں' یہ ان سب مناظروں کے اکھاڑے ہیں۔ آج اس کی طرف سے' کل اس کی طرف سے' مخالفت ہو رہی ہے' پھر اس کا جواب دیا جا رہا ہے' جھگڑ رہے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ قرآن حکیم کے ماننے والی قوم اور اس کے اندر جھگڑا کیوں' یہ جھگڑتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں' اٹکلیں دوڑاتے ہیں' کوئی دلیل نہیں پیش کرتے' کوئی علمی سند نہیں پیش کرتے' کوئی اتھارٹی پیش نہیں کرتے۔ اتنی سی چیز ہے صاحب! کہ اسلام نے یہ کہا ہے۔ ارے جناب! کوئی بتاؤ تو سہی' کہ اس کی سند کیا ہے۔ کوئی صاحب ہیں' جن کا نام محمد اسلام ہے۔ انہوں نے یہ کہا ہے۔ ارے! کچھ کہو تو سہی کہ اس کی اتھارٹی کیا ہے۔ بس یہ کہ جو آپ نے کہہ دیا' وہ اسلام نے کہا ہے۔ مثلاً یہ کہتے ہیں کہ اسلام اس کو نجات کہتا ہے' اسلام اس کو جائز کہتا ہے' اسلام یہ کہتا ہے' اسلام وہ کہتا ہے۔ بس کہتے چلے جا رہے ہیں۔ کوئی سند نہیں' کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ اٹکلیں دوڑانا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ (51:11) یہ وہ لوگ ہیں جو جہالت کی بنا پر اصلِ مقصد سے بے خبر رہتے ہیں۔ یہ ساھون ہوتے ہیں۔

لفظ ''ساھون' فی اورعن'' کے مفاہیم کی وضاحت

عزیزانِ من! یہاں پھر ابہام کی بات آ جائے گی۔ یہ ساھون عجیب لفظ ہے۔ ساھون ہے جسے سہواً کہتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ جو حروف ہوتے ہیں' یہ بھی معنی میں بڑا اثر پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ''فی'' کے ساتھ ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کا علم نہ ہونا اور پھر اس وجہ سے اسے ترک کر دینا''❶ اور اگر یہ ''عن'' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''علم ہوتے ہوئے' اس کے مقصد کو چھوڑ دینا''۔ اس لیے قرآن کریم نے هُـمْ عَـنْ صَلاتِهِـمْ سَـاهُـوْنَ (107:5) کہا ہے۔ جب ہم سورۃ الماعون 107 میں يُـكَـذِّبُ بِـالـدِّيْنِ (107:1) پہ آئیں گے تو دیکھیں گے کہ وہاں عن کے ساتھ ہے۔ تو وہاں عن کے معنی سے کہا ہے کہ یہ جانتے بوجھتے کہ صلوٰۃ کا مفہوم و مقصود کچھ اور ہے' اس کے نتائج کچھ اور نکلنے چاہئیں' ان مقاصد کو چھوڑ کر اور دوسری طرف یہی جو مرئی اور محسوس حرکات ہیں' ان کا نام صلوٰۃ رکھ دیا ہے۔ وہ وہاں ''عن'' آیا ہے' یعنی کہا ہے کہ هُـمْ عَـنْ صَلاتِهِـمْ سَـاهُـوْنَ (107:5)۔ یہ بات دوسری طرف چلی گئی ہے۔ وہاں (51:11) میں کہا' کہ یہ لوگ اپنے آپ کو جہالت میں رکھ کر' اصلِ حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ بات ان سے کی جاتی ہے کہ جس راستے پہ تم چل رہے ہو' اس کا نتیجہ تباہی ہے' آگے کنواں ہے' اس میں گر جاؤ گے' تباہی آئے گی تو بجائے اس کے کہ کھڑے ہو کر اس پہ غور کر لیں' اس کے متعلق پوچھ لیں کہ کیا کیا بات غلط ہے جو ہم کر رہے ہیں اور یہ کیوں غلط ہے' اس کیوں کا نتیجہ نکلے گا مگر نہیں' وہاں یہ بات نہیں۔ ان کے پاس ذرائع ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی سنجیدگی سے اس طرف آتے ہی نہیں۔

انسانوں کے خودساختہ نظام کے سوختہ جگر نتائج ہمیشہ ظہور پذیر ہو کر رہتے ہیں

عزیزانِ من! اب آگے کہا ہے کہ يَسْـئَـلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ (51:12) یہ کہتے ہیں کہ تم بار بار کہتے جاتے ہو کہ ایک دن تم نے تباہ ہو جانا ہے' وہ انقلاب آنا ہے' تو اس پہ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! وہ کس دن ہوگا۔ یہ ان لوگوں کی اسی ذہنیت اور روش کا نتیجہ ہے کہ جب تُو ان سے مکافاتِ عمل کی بات کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ یہ اس اصول اور قانون کی صداقت کو تسلیم کریں' یہ طنزاً کہتے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ وہ کس دن ہوگا جس دن کے متعلق تم کہہ رہے ہو' وہ انقلاب ابھی آیا تو ہے نہیں' آخر یہ کب واقع ہوگا۔ لہٰذا ارشاد ہے کہ وہ جو آئے گا تو وہ انتیس کا چاند نہیں ہے کہ جس کی تمہیں خوشی ہوگی۔ جب وہ انقلاب آئے گا تو وہ تباہیاں آیا کرتی ہیں' ان کے اعمال کی سزا ملا کرتی ہے۔ کہا کہ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ (51:13)۔ نار قرآن کریم کی اصطلاح ہے۔ یہ نار وہی ہے جس کو جہنم کے شعلے یا آگ کہا جاتا ہے' یہ

---

❶ ابن الاثیر نے کہا ہے کہ سَهَا فِي الشَّيْء کے معنے ہیں ''لاعلمی کی وجہ سے کسی چیز کو چھوڑ دینا'' (تاج العروس اور سَهَا عَنْهُ کے معنے ہیں ''جان بوجھ کر کسی چیز کو چھوڑ دینا'' (تاج العروس' محیط المحیط)۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن' ص۔ 913)

سب سے زیادہ تباہی لانے والی نار اور آگ ہی ہے اور عربی زبان میں جنگ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے ان تباہیوں کے اندر جو انسان بھنتا ہے' اسے ہم جگر سوختہ کہتے ہیں۔ یہ ان معنوں میں آتا ہے۔ اس دن تو یہ کیفیت ہوگی اور تم اس کے لیے جلدی مچا رہے ہو کہ وہ آتا کیوں نہیں ہے۔ اور کہتے ہو کہ وہ کب آئے گا جلدی بتاؤ۔ جس دن آئے گا' تو اس دن کہا جائے گا کہ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ (51:14)! کیا بات ہے! وہاں (51:12) میں يَسْئَلُوْنَ تھا' وہاں بھی لفظ ''فتنة'' ہے۔ کہا جائے گا کہ لو! وہ جو تم نے خود اپنے لیے آگ بھڑکائی تھی' اس کا مزا چکھو۔ فِتْنَتَكُمْ (51:14) یہ تمہارا اپنا برپا کیا ہوا فتنہ ہے۔ فتنہ بھٹی کو کہتے ہیں۔ کہا ہے کہ آگ بھڑکائی ہوئی ہے۔ اب اس کا مزہ چکھو۔ اس وقت کہا جائے گا کہ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (51:14) یہ ہے وہ انقلاب کا دن' جس کے لیے تم بڑی جلدی مچایا کرتے تھے کہ یہ آتا کیوں نہیں ہے' لاتے کیوں نہیں ہو۔ دیکھ لیا تم نے' جب یہ آیا پھر تمہارے واسطے کتنی خوشگواریوں کا پیغام لایا۔ یہی کہتے تھے کہ نہ مانگو اس کے لیے دعائیں' نہ مچاؤ اس کے لیے جلدی' یہ تمہارا اپنا فتنہ ہے' تمہاری وہ تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ یہ اقبالؒ [1] نے کہا تھا۔ یہاں کہا ہے کہ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (51:14) جو فتنے تم برپا کیا کرتے تھے ان کے نتائج بھگتو۔ اور یہ ہے جس کے لیے تم جلدی مچایا کرتے تھے صاحب! میں کہا ہے کہ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ (51:15)۔

حقائق پر مبنی نظام کے خوش گوار ثمرات کی نوید

اس کے برعکس' اس کے مقابلے یہ دوسری جماعتیں ہیں' جو حق کا نظام لے کر اُٹھی ہیں' انہیں کتنی ہی مصیبتیں برباد کر رہی ہیں اور کتنی ہی مشقتیں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ انجامِ کار جب وہ صحیح نظام قائم ہوگا' اُنہیں خوش گوار ثمرات ملیں گے۔ ان ثمرات کے سلسلے میں تو وہ ان کے ہاں کتنی ہی اصطلاحات تھیں مثلاً گھنے سائے والے باغ' صاف ستھرا شیریں پانی' اس کے چشمے۔ عرب کی سرزمین میں آپ آج بھی جائیے تو پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ چیزیں ان کو کہنے کی تھیں' ان چیزوں سے وہ سمجھ سکتے تھے کہ کیا ثمرات ملیں گے۔ ان کے ہاں صاف شفاف میٹھے شیریں پانی کا ایک کٹورہ پوچھو نہیں کیا معنی رکھتا تھا! آپ کو معلوم ہے کہ وہ بدو ہارون الرشید کے پاس تحفہ لے کر گیا تھا وہ مٹی کا کٹورہ تھا' اس میں کچھ تھا۔ کہنے لگے کہ اس میں کیا ہے؟ اس بدو نے بتایا کہ وہ پانی ہے اور کہا کہ اے خلیفہ! ایسا چشمے کا پانی' ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا' جی نہ چاہا کہ ہم خود پی جائیں اور آپ کو محروم رکھیں۔ میں اسے دو سو میل سے لے کر آیا ہوں۔ ان کے لیے صاف چشمے کے پانی کی یہ کیفیت تھی۔ قرآن حکیم اسی قسم کی مثالیں دے کر ان کو سمجھاتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں' وہ باغ و بہار کی

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائدار ہوگا (اقبالؒ: بانگِ درا)

زندگی بسر کریں گے۔آ گے کہا کہ اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰھُمْ رَبُّھُمْ (51:16)ان کے خدا کی طرف سے جو کچھ بھی عطا ہوگا' وہ اس کو جھولیاں بھر بھر کر لیں گے اس لیے کہ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَبْلَ ذٰلِکَ مُحْسِنِیْنَ(51:16)اس سے پیشتر انہوں نے بڑی حسن کارانہ زندگی بسر کی تھی' یہ اُسی کا پھل ہوگا۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ محسن کا لفظ یہ نہیں ہے کہ وہ احسان کرنے والے تھے۔ ہمارے مفہوم میں تو وہ جو احسان والی بات ہے' وہ تو پوچھو ہی نہیں' ایک دفعہ اس پہ احسان کر کے ساری عمر وہ سر پہ چڑھا رہتا ہے۔اس کے معنی ہوتا ہے''کسی کی کمی دور کر کے' اس کا توازن برقرار کر دینا''۔ یہ ہے مومن! انفرادی طور پہ یا اجتماعی طور پہ' ان کے نظام کا مقصد یہ ہے کہ کسی کی کمی جو واقع ہوگئی ہے' اس کو پورا کر کے اس کو پاؤں پہ کھڑا کر دیا جائے' اس کا توازن برقرار کر دیا جائے۔اسے کہتے ہیں احسان' اور ایسا کرنے والوں کو محسنین کہتے ہیں۔ یہ وہ تھے جن کی اپنی زندگی میں' اپنی ذات میں بھی اعتدال تھا' وہ ذات توازن بردوش تھی اور یہ ان کا فریضہ بھی تھا کہ جس کا توازن بگڑ رہا ہو' اس کے توازن کو صحیح کر دیا جائے۔اس کی وجہ سے ان کو یہ نظام ملا ہے' جس میں یہ جنت اور یہ ثمرات ملے ہیں۔ان کی کیفیت یہ تھی۔

مومنین کی جماعت کی تشکیل اور نبی اکرم ﷺ کے ذمے پروگرام

عزیزانِ من! اس میں دو ایک چیزیں کہی گئی ہیں۔ویسے تو ان مومنین کی خصوصیات سے قرآن حمید بھرا پڑا ہے۔یہاں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ایک یہ کہ کَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَھْجَعُوْنَ (51:17) یہ راتوں کو بہت کم سوتے ہیں۔ یہ شب بیدار ہیں۔متقی پرہیز گار تو اب بھی ہمارے ذہن میں ہے۔اب وہ جو راتوں کو نہیں سوتے' وہ کیا کرتے ہیں؟ ایک لفظ ہمارے ہاں ہے کہ وہ عبادت کرتے ہیں۔ عبادت کی تفصیل ہے کہ عشاء کی نماز تو پڑھ چکے ہیں باقی ساری رات وہ نفل پڑھتے رہتے ہیں یا تسبیح پھیرتے رہتے ہیں' اس لیے جاگتے ہیں۔یہاں یہ نہیں کہا۔ یہ بڑی اہم چیز ہے جو کہی گئی ہے۔نبی اکرم ﷺ کے متعلق' سورۃ مزمل میں ہے' جس کا عام ترجمہ آپ کو کملی والے کر کے بتایا جاتا ہے' یہ بات ہی کچھ اور ہے صاحب! اس کے معنی ہوتے ہیں''ایک بڑے لمبے چوڑے سفر کے لیے' نہایت ہم آہنگ افراد کی جماعت تیار کرنے والا''۔ یہ معنی ہیں مزمل کے۔کتنا عظیم پروگرام ہے حضور ﷺ کے ذمے! پہلی چیز جماعت کی تشکیل ہے' اور یہی جماعت ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اے رسول! تیرے لیے خدا اور یہ جماعتِ مومنین مل کر کافی ہیں' یہ اکیلا خدا ہی نہیں' یہ جماعت بھی ہے۔ یہ جماعت یونہی زمین سے اُگ نہیں آئی تھی' تیار کی گئی تھی۔ پہلا کام ہی یہ اس کی تکمیل کا تھا' اس قسم کی جماعت تیار کرنے کا تھا۔حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (73:2) راتوں کو جاگ تو سہی لیکن تھوڑا حصہ جاگو: نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا (73:3) آدھی سے بھی کم رات جاگو' اس لیے کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا(73:5) بہت بھاری پروگرام ہے جو

تیرے ذمے عائد کیا جا رہا ہے۔ یہ بہت بڑا پروگرام ہے اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) دن میں تیرے لیے کشمکش کا بہت بڑا لمبا چوڑا پروگرام ہے' اس میں سارا دن لگ جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آپ کی جماعت کی رفاقت کی اہمیت اور پروگرام کی ذمہ داریاں

یہ اکیلے ہی حضور ﷺ نہیں ہیں۔ یہ ہے جی (7-73:1) اور اسی کی آیت 20 میں بھی ہے کہ وَطَآئِفَۃٌ مِّنَ الَّذِیۡنَ مَعَکَ (73:20) تم اکیلے ہی نہیں ہو' ساتھ تمہاری جماعت کے لوگ بھی ہیں' وہ بھی اسی طرح سے جاگتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی کہا کہ ان میں کمزور بھی ہیں' کچھ بیمار بھی ہیں' کاروبار کرنے والے لوگ بھی ہیں' تو تم اتنا زیادہ بوجھ اپنے اوپر نہ لادو۔ حضور ﷺ سے کہا' جماعتِ مومنین سے کہا کہ تمہارے سامنے تو دن میں کتنا لمبا چھوڑا پروگرام ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی' ٹھیک ہے اس کی رات کو بھی ضرورت ہے لیکن اس شدتِ شوق میں جسم کے تقاضوں کو نہ بھول جاؤ' صحت کا خیال رکھو' بڑا لمبا چوڑا پروگرام تمہارے ذمہ ہے۔ یہ نہیں ہے کہ رات کو جاگ کر نفل پڑھو اور دن بھر سوتے رہو اس لیے کہ یہ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) تمہارے لیے بہت بڑا لمبا پروگرام ہے۔

ہمارے ہاں کی کتبِ تفاسیر میں بیان کردہ روایات کی نوعیت اور عبادت کا مفہوم

یہ کیا تھیں چیزیں' عزیزانِ من! جس کے لیے جاگتے تھے۔ آج تو بہت آسان ہے' جہاں بھی آپ کسی سیرت کی کتاب میں پڑھیے یا ان واعظوں کے ہاں سے یہ وعظ سنیے' وہ یہی ہے کہ حضور ﷺ رات نوافل پڑھتے تھے اور اتنا اتنا عرصہ کھڑے رہتے تھے کہ حضور ﷺ کے پاؤں مبارک سوج جاتے تھے یا ان کے ذہن میں یہی ہے رات کو جاگنا' پھر اس میں نفل پڑھتے رہتے تھے۔ اب بھی ہمارے ہاں عبادت گذار جس کو کہتے ہیں' ذرا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ وہ عبادت ہوتی کیا ہے' جس کو وہ عبادت گذار کہتے ہیں' یہ نفل پڑھنا یا تسبیح پڑھنا یہی چیز ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کے متعلق بھی یہی چیز انہوں نے ذہن میں قائم کی ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے' مذہب میں اس سے زیادہ کوئی تصور آ ہی نہیں سکتا' اس میں تو صاف بات ایک ثواب حاصل کرنے کی ہے جو رات بھر قائم کر لیا ہے۔ وہاں عبادت کے معنی پرستش ہیں' پرستش کی یہ چیزیں ہیں' یہ تو متعین اوقات کی نماز ہو گئی' وہ تو تھوڑے سے وقت کے لیے ہے۔ باقی وقت کے لیے کیا کیا جائے گا پھر اسی قسم کی وہ نماز ہے۔ اس کا نوافل نام رکھ دیا جائے گا' وہ پڑھ لی جائیں گی' تسبیح ہے' تسبیح پھیر لی جائے گی اور کچھ ذہن میں آ ہی نہیں سکتا کہ کیا کیا جائے گا۔ خدا کی عبادت کرتا ہے اور کیا تصور ہو گا۔ کسی کے متعلق پوچھ لیجیے کہ وہ کیا کرتے تھے تو یہی چیز بتایا جاتا تھا کہ ایک رات میں ہزار نفل پڑھا کرتے تھے جناب! اتنا بھی نہیں سوچتے کہ ذرا وقت متعین کر کے تو دیکھ لیں کہ رات میں ہزار نفل پڑھے بھی جا سکتے

ہیں لیکن تصور یہی ہے۔

مذہب کے پیش کردہ تصورات کے برعکس دین کو عملی طور پر مستحکم کرنے میں بنیادی فرق اور مخالف سلطنتیں

عزیزانِ من! جب دین سامنے آئے گا تو یہ سارے تصورات بدل جائیں گے۔ سوچیے کہ ایک ذاتِ گرامی جس کے ذمے دین کا تمکن ہے، عرب کی سرزمین، مکے سے نکلے ہوئے پناہ گزینوں کی حیثیت سے، مدینے میں دوسروں کے ہاں آ کر بیٹھے ہوئے ہیں، وہاں قبائل در قبائل بھی ہیں، یہود وغیرہ منافق بھی ہیں، قریش کی کیفیت یہ ہے کہ حضور ﷺ کو مدینے کے سات سال میں ایک دن بھی امن سے نہیں بیٹھنے دیا۔ ان ؐ کی جماعت آج کی اصطلاح میں وہ ہے جسے بے سروسامان پناہ گزیں کہتے ہیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور پروگرام یا ذمہ داری خدا کے نظام کو متمکن کرنا ہے۔ تمکنِ دین ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ (22:41) یہ ہے دین کا تمکن۔ اب دین کا تمکن مذہب کا تمکن نہیں ہے۔ قرآن کریم تو کہتا ہے کہ یہ استخلاف فی الارض ہے۔ زمین پہ مملکت قائم کرنا ہے تاکہ اس مملکت میں دین کا تمکن ہو جائے۔ یہ صرف مملکت ہی حاصل نہیں کرنا ہے، اس میں دین کا نظام بھی قائم کرنا ہے۔ یہ پروگرام حضور ﷺ کے ذمے ہے۔ اس میں اتنی بے سروسامانی ہے، اتنا تھوڑا سا وقت ہے مگر یہ اتنا لمبا چوڑا پروگرام ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے ایک طرف اندرونی خطرات ہیں، دوسری طرف بیرونی خطرات میں دو بڑی بڑی سلطنتیں ہیں جن کا مقابلہ اس زمانے میں دنیا کی کوئی مملکت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ The most super powers in the world تھیں۔ یہ سلطنتیں ایرانی اور بازنطینیہ رومنز تھیں۔ وہ دونوں مخالف تھیں۔ ان میں حضور ﷺ بیٹھے تھے۔ سات سال کے عرصے میں اتنی جنگیں بھی لڑی جا رہی ہیں، نئی مملکت بھی قائم کی جا رہی ہے، اس کا انتظام بھی ایسا ہے کہ کہیں کوئی Agitation (بلوہ) نہیں ہوئی، کوئی فساد برپا نہیں ہوا۔ وہاں نہایت امن اور سلامتی ہے۔

وحی کی روشنی میں اسلامی مملکت کے محسوس نتائج کے سلسلہ میں ارشادِ نبوی ﷺ

امن اور سلامتی کی کیفیت کی جو مثال حضور ﷺ نے بیان فرمائی، اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔ کہا کہ تم کہتے ہو کہ اس مملکت میں کیا ہوگا؟ بے خوفی کا کیا ہوگا؟ کہا کہ سنو! وہ یہ ہوگا کہ ایک عورت زیورات میں لدی ہوئی یمن سے تنہا اس صحرا میں سے گزرتی ہوئی شام تک پہنچ جائے گی، کبھی اس کو کسی قسم کے خطرے کا خوف نہیں ہوگا۔ وہ پروگرام دیکھ رہے ہیں کہ کیا ہے۔ معاف رکھیے گا، میں نوافل یا ان چیزوں کی تنقید تو نہیں کرتا لیکن میں کہتا یہ ہوں کہ جس کے سامنے یہ پروگرام ہو، اس کو دن بھر اس میں مصروف رہنا ہوگا، راتوں کو بیٹھ کر اگلے دن کے لیے پھر اس پروگرام کی تفصیلات طے کرنا ہوں گی۔ اسے فرصت ہی اس وقت کب مل سکتی تھی۔ یہ جو تمہارے ساتھی ہیں، وہ بھی جاگ رہے ہیں۔ وہ ساتھی بھی نفل پڑھنے کے لیے نہیں جاگ رہے تھے۔ ہر معاملے میں مشاورت تھی۔ جتنے معاملات سامنے آئے تھے، جتنے آنے والے تھے، ان کے لیے فرصت کا وقت ہی نہیں تھا کہ یہ بیٹھ کر وہاں طے کریں کہ اب کیا کرنا ہے۔ کس کے لیے جاگتے تھے؟ لفظ

عبادت کے معنی ہیں ''قوانین خداوندی کی تابعداری' خدا کے احکام وقوانین کے لیے محکومیت ونگہداشت''۔ کہا کہ ٹھیک ہے' یہ ضروری ہے' تمہارے لیے دن کا پروگرام بڑا لمبا چوڑا اور بھاری ہے' اس کے لیے تم نے یہ مصائب طے کرنے ہیں لیکن اتنا سوچ لو کہ بہت لمبا سفر ہے' راستے بڑے پُر مشقت ہیں' اپنی تندرستیوں کا بھی خیال رکھو' طبعی ضروریات کا بھی خیال رکھو۔

لفظ اعتکاف کا لغوی مفہوم اور ہمارا طرزِ فکر

پھر بات دوسری طرف چلی جائے گی۔ یہ جو آپ کے ہاں رمضان شریف میں اعتکاف میں بیٹھ جاتے ہیں' جیسے پہلے تو رمضان میں ہی بہرحال عام طور پر کام کرنے کے لیے ہمت بھی کم ہو جاتی ہے' مشقت طلب چیز ہے' اس میں سے پھر ایک گروہ جو بالکل دنیا کو ترک کر کے مسجد میں ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے' یہ جو اتنا وقت ہے یہ زندگی کا اتنا قیمتی وقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس میں کیا کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اس لفظ اعتکاف کے ہی معنی سمجھ لیتے۔ عاکف کے معنی سمجھ لیتے تو بات ان کی سمجھ میں آ جاتی۔ عربی زبان کی رو سے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جو الگ بیٹھنا ہے' یہ کاہے کے لیے تھا' یہ بھی جو حضورﷺ راتوں کو جاگتے تھے' اور صحابہؓ ساتھ ہوتے تھے' یہ بھی اعتکاف تھا۔ یہ کاہے کے لیے تھا؟ اعتکاف کے معنی ہوگا ہے ''الجھے ہوئے معاملات کو سنوارنا' بکھرے ہوئے بالوں میں کنگھی کرنا' منتشر موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دینا''۔ یہ ہیں اعتکاف کے معنی۔ تو الجھے ہوئے معاملات کو سنوارنے کے لیے دن میں تو عملی پروگرام تھا' پتہ نہیں کیا کچھ کرنا پڑتا تھا' تو راتوں کو بیٹھ کر سوچنا پڑتا تھا' سلجھانا پڑتا تھا' الجھے ہوئے معاملات کو' War Basis (جنگی بنیاد) پر جو قومیں کام کرتی ہیں' جنگ کے زمانے میں دیکھو' ان کے ہاں دن اور رات کیا پروگرام ہوتا ہے' یہ پوری کی پوری زندگی War Basis (جنگی بنیاد) پر چلی آ رہی تھی۔ مومن کی تو ساری زندگی War Basis (جنگی اساس) پر ہوتی ہے۔

یہ ساری دنیا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے تو کیا وہ اپنے اتنے قیمتی وقت کو' جو اس پروگرام کی تکمیل کے لیے صرف ہونا چاہیے' وہ صرف نفل پڑھ کر یا مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر' اس کا نام رکھ لیتے ہوں گے کہ یہ خدا کا پروگرام ہے۔ انہوں نے تو بہت بڑا پروگرام دیکھا ہے۔ دین یہ تھا۔ اس میں بڑی آسانی سے سازش ہوئی۔ یوں ذرا سا انہوں نے کلک (Click) کیا اور دین کو مذہب میں بدل دیا۔ اب ہر بات کا نتیجہ ثواب حاصل کرنا ہوگا' جس کے متعلق کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ یہ سارا کچھ عبادت تھا اور ہے۔ اب عبادت کے معنی پرستش ہو گیا۔ جو پرستش کی شکل ہے' وہ نماز کے بعد نوافل ہو گئی' تسبیح پھیرنی ہو گئی' صاحب! جتنا کوئی اس میں زیادہ وقت دیتا جائے' وہ دنیا کے معاملات کو اتنا ہی ترک کرتا چلا جائے۔ دنیا کے معاملات سے مذہب کو واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو سیکولرازم یا میٹریل ازم ہو جاتی ہے جو کہے کہ دنیاوی معاملات بھی ہوتے ہیں۔ اس تصور کے ماتحت جب قرآن حکیم میں یہ آتا ہے کہ وہ راتوں کو بہت تھوڑا سوتے تھے' تو مذہب کے تصور کے ماتحت پھر یہ ہوتا ہے کہ ہاں صاحب! ہزار ہزار نفل پڑھتے ہوں گے' دین کے تصور کے ماتحت تو پھر سمجھ میں بات آتی

ہے کہ دن بھر کے پروگرام کے لیے رات کو بیٹھ کر پروگرام چاک آؤٹ کرتے تھے' مشورے کرتے تھے' معاملات کو طے کرتے تھے' جتنی الجھنیں ہوتی تھیں' ان کو صاف کرتے تھے۔ یہ تھارات کا پروگرام۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد کہا کہ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (51:18)۔اب مذہب کی دنیا کے اندر آ جایئے' رات کو تو وہ جاگتے تھے' نفل پڑھتے تھے اور صبح کے وقت استغفار کی تسبیح کرتے تھے۔ وہ استغفر الله من کل ذنبهم واتوبوا علیه یعنی رات ساری یہ کچھ کرتے تھے۔ حالانکہ یہ تھا وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (51:18) راتوں کو باہمی مشاورت سے طے کرتے تھے کہ کل پروگرام کیا ہے' کیسے کرنا ہے۔''اسحار سحر'' کے معنی ہوتا ہے ''کسی کام کا آغاز یا ابتدا' اس پروگرام کی ابتدا کے لیۓ' يَسْتَغْفِرُوْنَ کے معنی ہوتا ہے'' حفاظت کے جو سامان ہیں' ان کے لیے طے کرنا ہے کہ کیا کرنا چاہیے یعنی جب صبح کو اپنے پروگرام کی ابتدا کرتے تھے تو اس آرزو کے ساتھ کہ وہ ہر تخریبی قوت کی شرانگیزی سے محفوظ رہیں۔

قرآنی مفہوم کے برعکس ہمارے ہاں لفظ استغفر اللہ کا استعمال

عزیزانِ من! وہ پروگرام کی ابتدا کرنے سے پیشتر سوچتے تھے کہ ہاں بھئی! یہ کچھ تو ہم نے خود کرنا ہے لیکن یہ بھی دیکھ لو کہ جو خطرات آنے ہیں ان سے حفاظت کے لیے صبح اُٹھ کر کیا کرنا ہے' ابتدائے پروگرام سے پہلے وہ سامانِ حفاظت کی طرف توجہ دیتے تھے۔ یہ پھر استغفر اللہ کی تسبیحاں پھیرنے کے اندر آ گیا۔ یہ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ(51:18) مذہب کا پیدا کردہ تصور ہے اور پھر اتنی سی بات ہی نہیں ہے کہ وہ تارکِ دنیا تھے' کہا ہے کہ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) کمائی کرتے تھے' محنت کرتے تھے' کماتے تھے' کما کر بینکوں میں روپیہ جمع نہیں کرتے تھے کہ اڑھائی فیصد دیدیں گے تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔ ان کے مال میں ہر اس شخص کے لیے جس کی ضروریات میں کمی رہ جائے یا خود کچھ کمانے سے معذور ہو جائے' ان کے مال میں ان کا حق ہوتا تھا' خیرات نہیں۔ خیرات تو انسان کو ذلیل کر دیتی ہے۔ دینے والے کے دل میں تکبر پیدا کر دیتی ہے' جو لینے والا ہے اس کے دل کے اندر تذلیل کا جذبہ پیدا کر دیتی ہے۔ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ (51:19) As of right (بطورِ حق) وہ ان سے لے سکتے تھے۔ یہ کیفیت تھی۔ یہ تھے وہ جو جنت کے باغات کی بات آئی ہے۔ عزیزانِ من! آگے بھی اور خصوصیات آئی ہوئی ہیں لیکن چونکہ وقت ہو گیا ہے اس لیے میں یہیں تک رہتا ہوں۔ سورۃ الذٰریٰت کی آیت 19 تک ہم آ گئے۔

جشنِ نزولِ قرآن کریم کا تہوار جس کو منانے کا حکم خدا نے دے رکھا ہے

عزیزانِ من! ایک بڑا اہم اعلان ہے۔ آپ کو معلوم ہے' یہ جو عید مبارک آنے والی ہے' یہ کیا ہے؟ چھوٹی عید سویّوں کی عید اور وہ بھی میٹھی عید ہے۔ یہ ہے کیا؟ یہ ایک ہی تہوار ہے جس کے منانے کا حکم خدا نے دیا ہے اور یہ ہے نزولِ قرآن کا جشن' قرآن کریم کے

نزول کی ابتدا' یہ اس مہینے' رمضان' میں ہوئی تھی تو یہ اس کے لیے تیاریوں کا مہینہ تھا اور اس کے آخر میں جشنِ نزولِ قرآن کریم ہے۔ یہ ہے عید جسے آپ کہتے ہیں۔ عید کے تو معنی ہی ہیں ''بار بار آنے والی چیز' جو ہر سال آجاتی ہے۔'' عید کا لفظ ہی نہیں' اس کے لیے یہ جشن ہے' ایک ہی تہوار ہے' جس کا حکم خدا نے دیا ہے کہ مناؤ اس کو بڑی خوشیوں سے مناؤ' قرآن کریم جیسی چیز تمہیں مل گئی ہے' کیا انتظار کرتے ہو' جشن منانے کے لیے کسی اور بات کا! اس سے بڑا جشن اور کیا ہو سکتا ہے صاحب! یہ تھی' عزیزانِ من! دین میں عید۔

بہر حال ہم بھی تو اسی معاشرے کے افراد ہیں۔ کم از کم اس تقریب پر میں ایک خصوصی درس پیش کیا کرتا تھا' اور کرتا چلا آ رہا ہوں جس میں قرآنِ کریم کی عظمت' بیان کی جاتی ہے۔ ویسے تو ہمارا ہر درس ہی قرآن کریم کا ہوتا ہے۔ اس میں ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ اس دفعہ وہ 23 تاریخ کو' اگلا جمعہ آ رہا ہے' اور درس ہم جمعے کو ہی دے سکتے ہیں اور وہ عید کے ساتھ ہی ہے' غالباً عید تو اس دن نہیں لیکن عید کی چھٹیاں ساتھ ہوتی ہیں' تو اس لیے وہ جو درس ہے' وہ تو نہیں ہوگا' 23 تاریخ کا جو درس ہے' اس میں ہم بھی ناغہ کریں گے یا کہہ لیجیے چھٹی کریں گے تو اس کے بعد کا درس تو 30 جولائی کو ہی ہو سکتا ہے تو کوئی بات نہیں اس میں بات تو اس جشن کی' اس تقریب کی یاد میں' قرآن کریم کے متعلق کچھ کہنا ہے تو 30 جولائی کا جو آٹھ بجے ہوگا' وہ میرا خصوصی درس ہوگا' اس کے لیے یہ کارڈ چھپوا دیئے گئے ہیں۔

آج کل ایک مسئلہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اسلام میں یا دین میں سائنس کی کیا اہمیت ہے۔ میں نے عنوان ہی اس دفعہ رکھا ہے ''قرآن اور سائنس''، جس کے نہ ہونے سے آج آپ کے ہاں جو نوے کروڑ آبادی ہے اس طرح سے پس رہی ہے کہ Scientific Knowledge & Technology آپ کے پاس نہیں ہے تو میں نے موضوع ہی یہ رکھا ہے ''قرآن اور سائنس''۔ تیس جولائی جمعۃ المبارک کے دن یہی صبح آٹھ بجے' اسی مقام پر ہوگا۔ اب احباب نے کارڈ چھپوا دیئے ہیں۔ یہ آج اپنے ساتھ لے جایئے کیونکہ تیئس کو تو آپ تشریف نہیں لائیں گے' یہ جو کارڈ ہے' وہ تیس تاریخ کے قریب اپنے دوستوں میں بانٹیے گا' کیونکہ بہت قبل از وقت بانٹنے سے بات یاد نہیں رہتی تو تیس کے قریب اپنے حلقے میں' جو اس سے دلچسپی رکھتے ہوں' یہ کارڈ بانٹ دیجیے گا اور بتا دیجیے گا یہ ہے اہم موضوع' جس پر یہ خصوصی درس ہوگا' 30 جولائی 1982ء صبح آٹھ بجے' اسی مقام پر جشنِ نزولِ قرآن کریم اور چونکہ اس کے بعد اگلی عید کے قریب ہم جمع نہیں ہوں گے' میری طرف سے آپ تمام احباب اور آپ کے اہل و عیال کو عید مبارک کی خوشیاں نصیب ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورة الذّٰرِیٰت (آیات 19 مسلسل تا 23)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام میں عبوری دور کے احکام

عزیزانِ من! آج اگست 1982ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورة الذّٰرِیٰت کی آیت 19 سے ہو رہا ہے:(51:19)

سابقہ آیات میں مومنین کی صفات یا خصوصیات یا ان کے پروگرام کا ذکر ہو رہا تھا کہ قرآنی نظام کے قیام کے سلسلے میں ان کی صورت یہ ہے کہ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا (73:7) ان کے لیے دن بھر بڑا مصروف پروگرام ہوتا ہے اور راتوں کو پھر یہ مشورے کے لیے بیٹھتے ہیں تو آنے والے پروگرام کے لیے تجاویز ہوتی ہیں' راتوں کو جاگتے ہیں۔ وفورِ شوق کی یہ کیفیت تھی کہ خود خدا کو رسول ﷺ! اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے سلسلہ میں بھی یہ کہنا پڑا کہ تھوڑا جاگا کرو' تم نے دن میں بڑا کام کرنا ہوتا ہے' یہ کیفیت تھی کہ اس کے لیے لمبے عرصے تک صحت اجازت نہیں دے گی' ڈھیر ہو کر رہ جاؤ گے۔ ان کی اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے یہ کیفیت تھی کہ یہ تو وفورِ آرزو کی تکمیل کے لیے تھا۔ پچھلی آیتوں میں یہ چیز آ رہی تھی۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام کے خدوخال کی غلط توضیح وتشریح

عزیزانِ من! اب اگلا ٹکڑا ہے' جو اس وقت زیرِ نظر ہے' جو یونہی میں پچھلے درس میں چھوڑ کر آگے نکل رہا تھا۔ کہا کہ وَفِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (51:19) اور ان کے مال و دولت میں' ان کے پیسے میں' محتاجوں اور حاجت مندوں کا حق ہوتا ہے۔ یہ بڑی عام فہم سی آیت ہے اور نظر آتا ہے کہ ٹھیک ہے' دولت مندوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ان محتاجوں' غریبوں' مفلسوں' ناداروں کی مدد کیا کریں لیکن یہ اتنی اہم آیت ہے اور اس سے قرآن حکیم کی اتنی تحریف کی گئی کہ نظام الٹ کر رکھ دیا گیا کہ ہم اسی منجدھار میں اب تک پھنسے

ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر آپ دیکھیں گے کہ اس آیت میں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ یہی تو مقامات ہیں یہاں انسان کو غور کرنا پڑتا ہے۔قرآنِ کریم میں یہاں ہی نہیں' بیسیوں مقامات میں یہ کہا گیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرو' مسکینوں کی ضروریات پوری کرو' حاجت مندوں کی حاجت روائی کرو' ناداروں کی امداد کرو' تو یہ امداد ہے' یہ صدقہ خیرات زکوٰۃ اس قسم کی چیزوں سے ان کی ناداری کو دور کرنا ہے۔ یہ ہے جسے انصاف کہا جاتا ہے تو گویا اس سے یہ نظر آیا کہ قرآنِ کریم ایک ایسا نظام سامنے رکھنا چاہتا ہے' جس میں مستقل طور پر غریبوں' ناداروں' مفلسوں' بے کسوں' بھوکوں کا وجود رہے تا کہ یہ جو صدقہ اور خیرات کے اور بھوکوں کی مدد کرنے کے احکام ہیں ان پر عمل ہو سکے۔

کبھی آپ نے ان چیزوں کو سوچا ہے' ہم یہ دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ قرآن حکیم نے اس پر بڑا زور دیا ہے۔ یہ غریبوں کی مدد کرنے کا' یتیموں کی مدد کرنے کا' بھوکوں کو روٹی کھلانے کا' ننگوں کو کپڑے دینے کا' ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کا' بہت اچھا نظام ہے' اس کی بڑی تاکید ہوئی ہے' اس پہ بڑا زور دیا ہے۔اس کی کیا بات ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔اگر قرآن حکیم کے ان احکام کو مستقل مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن کریم مستقل' دائمی طور پر' انسانیت کا ایسا نظام چاہتا ہے جس میں بھوکوں کا' ننگوں کا' ناداروں کا' مفلسوں کا' محتاجوں کا وجود' مستقل طور پر باقی رہے اور دوسری طرف ان لوگوں کا وجود باقی رہے جو پھر ان کی مدد کریں' ان کو صدقہ دیں' خیرات دیں' انہیں ثواب ہو' صدقہ وخیرات سے ان کو جنت ملتی جائے۔ ایک مستقل نظام کی شکل میں گویا یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ نظام ایسا چاہتا ہے' جس میں مستقلاً ان کا وجود باقی رہے' قائم رہے۔ اگر یہ طبقہ نہ رہے تو پھر یہ سارے احکام بقول ان کے صدقہ اور زکوٰۃ کے اور خیرات کے معطل ہو گئے' ان پہ عمل کیسے ہوگا اور اگر ایسے نظام ہو جس میں کسی کے پاس زائد از ضرورت ہو ہی نہ' تو وہ کہاں سے صدقہ خیرات کرے گا۔لہٰذا اس سے مستنبط ہوا کہ قرآن حکیم کے پیشِ نظر انسانیت کا نظام یہ ہے کہ اس میں مستقل طور پر محتاجوں' محروموں' ناداروں اور بھوکوں کا وجود قائم رہے اور دوسری طرف دولت مندوں کا وجود قائم رہے جو صدقے اور خیرات سے ان کی مدد کرے۔

کیا خیال ہے آپ کا کہ آپ دنیا کے سامنے اس نظام کو فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں جس میں انسانیت کی تذلیل ہو؟ اس میں تو انسانیت کی نگاہیں جھک جاتی ہیں۔ اگر یہ تصور کیا جائے کہ خدا کا دیا ہوا ایک ایسا دین ہے جس میں انسانیت کا نظام یہ پیش کیا گیا ہے تو انسانیت کی نگاہیں جھک گئیں۔ ہندوؤں پہ تو ہم اعتراض کرتے تھے کہ انہوں نے کہا کہ صاحب! خدا نے ہی خود یہ ورن یا طبقات پیدا کر دیئے ہیں۔طبقات کا لفظ میں خاص طور پہ لایا ہوں کہ آج کے دور میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ برہمن ہیں' کھشتری ہیں' شودر ہیں' ویش ہیں' اور شودر ایک مستقل طبقہ ہے اور جو ان تمام طبقوں کی خدمت کرنے کے لیے ہے محتاج ہیں' بھوکے ہیں' مسکین ہیں' پن دان سے ان کی مدد کی جائے گی' بھیک کے ٹکڑے ان کے بچوں کی جھولی میں ڈالے جائیں گے جیسے کتوں کو دیئے جاتے ہیں اور یہ طبقہ مستقل رہے گا' یہ نظام پیدائشی ہے' برہما کا نظام ہے۔اس پہ تو ہم ہمیشہ اعتراض کرتے رہتے ہیں اور اپنے ہاں ہم کبھی غور نہیں کرتے۔ جس نظام کو پیش کر

رہے ہیں وہ نظام تو بعینہٖ وہی ہے کہ مستقل طور پہ آپ کے ہاں یہ ایک طبقہ موجود ہونا چاہیے تو ان کے کہنے کے مطابق موجود کس طرح سے ہو؟ کہ جی! رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے' وہ جن کو غریب پیدا کرتا ہے ان کو تو غریب ہی رہنا ہے اور اس کا نظام یہ ہے کہ وہ غریب پیدا کرتا چلے جائے گا محتاج پیدا کرتا چلا جائے گا اور دوسری طرف دولت مند پیدا کرتا چلا جائے گا اور پھر ان سے کہے گا کہ تم کچھ دو چار روٹی کے ٹکڑے ان کی جھولی میں ڈال دیا کرو۔ یہ خدا کا تصور آیا ہے۔ کیا یہ تصور اس قابل ہے کہ آپ فخر سے دنیا کے سامنے پیش کریں؟ ہے یہ نظام اس قابل؟ آج اگر چہ دنیا میں کیپٹل ازم کا بھی بڑا زور ہے' پھر بھی ویلفیئر اسٹیٹ تک تو وہ پہنچ چکے ہوئے ہیں۔ وہ ایسی اسٹیٹس ہیں جہاں کوئی بھوکا نہیں ہے۔ آپ کے ہاں یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ تو خدا کا نظام ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں۔

قدرت ذرائع رزق تو پیدا کرتی ہے لیکن انسانوں میں انہیں خود تقسیم نہیں کرتی

عزیزانِ من! یہ جو میں نے کہا تھا کہ ان مقامات پر سے یوں نہ گزر جایا کیجیے' پھر یہ بات کیا ہوئی؟ قرآن حکیم میں احکام تو یہ ہیں کہ بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو' غریبوں کی مدد کرو' مفلسوں ناداروں کی امداد کرو۔ خیرات کا تو اس میں لفظ نہیں آیا' صدقہ آیا ہے اور زکوٰۃ کا ہے۔ آپ کہتے ہیں' اسی مقصد کے لیے ہے۔ انفاق کا جو لفظ ہے کہ ان کے لیے یہ خیرات کیا کرو' اس سے تو وہی بات نظر آ رہی ہے جو میں پہلے کہہ رہا ہوں اور وہ نظام تو آج بھی دنیا میں ہے' سرمایہ دارانہ نظام کے اندر بھی جو مملکتیں ہیں' وہ بھی اس حد تک نہیں پہنچیں کہ مستقل طور پر اپنے ہاں وہ کہیں کہ ایک طبقہ موجود رہنا چاہیے' مستقل ابدی غیر متبدل خدائی نظام یہ بتایا جا رہا ہے' آپ اس کو بدل نہیں سکتے' کیا یہی اسلام کا نظام ہے؟ (معاذ اللہ)۔ اگر نہیں تو پھر نظام کیا ہے' پہلی چیز تو یہی ہے کہ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ غریب ہے' یہ مفلس ہے' وہ امیر ہے' وہ دولت مند ہے' یہ خدا کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ دولت کی غلط تقسیم سے طبقات وجود میں آتے ہیں اور وہ تقسیم انسانوں نے اپنی پیدا کی ہوئی ہے۔ خدا نے سامانِ وسائلِ رزق دیئے' ذرائع پیداوار دیئے' انسانوں کی زیست کے لیے سب کچھ سامان دیا ہے۔ اس نے اس کا سامان دیا ہوا ہے' تقسیم اس نے نہیں کی' تقسیم انسان کرتا ہے اور یہ انسانوں کی غلط تقسیم کا نتیجہ ہے۔ جس شخص کے پاس اپنا پیٹ بھرنے کے بعد ایک روٹی فالتو ہے' یہ روٹی اس بھوکے کے منہ سے چھینی ہوئی ہے جس کو دو کی ضرورت تھی اور ایک مل رہی ہے۔ یہ زیادہ روٹی آسمان سے نہیں ملتی' یہ اس سے چھینی ہوئی ہوتی ہے۔ نظام ایسا ہے کہ اسے ایک ہی ملے گی' اسے تین ملیں گی۔ یہ انسانوں کا اپنا قائم کیا ہوا نظام ہے۔

قرآنی نظامِ حیات میں زرائع رزق ضروریات زیست کے لیے مملکتِ اسلامیہ کی تحویل میں بطورِ امانت ہوتے ہیں

پھر آگے سوال پیدا ہوا کہ پھر یہ جو احکام ہیں' ان کے معنی کیا ہیں؟ اسلام کا نظام یہ ہے کہ کوئی فرد رات کو بھوکا نہیں سو سکتا' کسی

ضرورت مند کی ضرورت رکی نہیں رہ سکتی' کوئی اس میں نادار نہیں ہوتا' محتاج نہیں ہوتا۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ ذرائع رزق یا دولت کی تقسیم اسلامی نظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور اس کی تقسیم اس طرح سے کرتا ہے کہ نہ کسی بھوک والے کے پاس' ایک زائد ہو نہ دو کی بھوک والے کو ایک کم ملے' اسے بھی دو ملیں' اسے بھی دو ملیں۔ یہ تقسیم جب وہ حسبِ ضرورت کرتا ہے تو طبقات ختم ہو جاتے ہیں۔ طبقات تو زائد از ضرورت دولت کے پیدا کردہ ہیں جو کسی کی جائز ضرورت سے کم کر کے' اس کی زائد دوسرے کی ہو جاتی ہے۔ یہ کچھ بھی کہیں باہر سے نہیں آتا۔ یہ جو زمیندار یا جسے جاگیردار کہتے ہیں' زمین کا مالک ہوتا ہے' وہ جو کاشتکار کی آدھی فصل لے جاتا ہے' وہ اپنے گھر میں امریکہ سے نہیں منگواتا' یہ جو اس کے بچوں کو اس کی محنت کی کمائی پوری ملنی چاہیے تھی وہ ان کے منہ سے چھین کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔ یہ کارخانے دار جو مزدور کو مزدوری پہ لگاتا ہے' اور اس کی Wages (اجرت) مقرر کرتا ہے' اس کی دہاڑی مقرر کرتا ہے' وہ اپنے مفاد کو سامنے رکھ کر مقرر کرتا ہے کہ اسے کتنا دوں کہ مجھے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے' منفعت پہنچے۔ اس کی محنت سے جو کچھ پیدا ہوتا ہے' وہ سارا اس میں سے اس کو نہیں دیتا۔ پتہ نہیں کتنا اس کا خود چھین کر لے جاتا ہے' اس کو کم از کم دیتا ہے۔ یہ طبقات کیسے پیدا ہوئے؟ یہ اس غلط تقسیم سے پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم ایسا معاشی نظام قائم کرنا چاہتا ہے کہ جس میں دولت کی یہ ناہموار' یا رزق کی ناہموار' یا دولت کی غلط تقسیم نہ ہو۔ مقصد صرف تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا ہو اور اس کے لیے یہی صورت ہے کہ ذرائع رزق اور پیداوار کی چیزیں اور دولت' افراد کے کنٹرول میں نہ رہیں' اس نظام کے کنٹرول میں رہیں جو اسے تمام افراد کی ضروریات پورا کرنے کے لیے تقسیم کرے۔ یہ ہے قرآن حکیم کا نظام: کسی کے پاس زائد از ضرورت ایک پیسہ نہیں' جسے آپ فاضلہ دولت (Surplus Money) کہتے ہیں' وہاں رہتی ہی نہیں ہے۔

علامہ پرویزؒ کی زندگی بھر کا مشن اور ایک اہم سوال کی طرف اشارہ

اگر یہ کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہے تو پھر جو یہ ہزاروں قسم کے معائب وضائم اور جرائم ہیں' وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ فالتو دولت کا ہی کرشمہ ہے جو کچھ دنیا کے اندر فساد مچا ہوا ہے۔ تو قرآن حکیم کا نظام یہ ہے۔ یہ چیز متعدد بار سامنے آئی اور میری تو زندگی کا مشن ہی قرآن حکیم کے اس معاشی نظام کا' پیش کیے جانا ہے۔ یہ ہے قرآن کا معاشی نظام۔ اب پھر سوال پیدا ہوا کہ جب یہ نظام ہے کہ کوئی بھوکا ہی نہیں رہے گا' کوئی ننگا نہیں ہوگا' کوئی محتاج نہیں ہوگا' کوئی غریب نہیں ہوگا تو یہ جو قرآن حکیم میں احکام دیئے ہیں' تاکیدیں کی ہیں کہ بھوکوں کو روٹی کھلاؤ' ضرورت مند کی ضرورت پوری کرو' تو پھر یہ کیا بات ہے؟ یہ بات سمجھ لیں۔

نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے ابتدائی دور میں عرب کی معاشرتی زندگی کے خدوخال

نبی اکرم ﷺ نے جب اس انقلاب کی آواز بلند کی' تو جیسے کہتے ہیں کہ وہاں کوئی سیکنڈ کرنے والا بھی نہیں تھا' تنہا ایک آواز تھی جو

اس معاشرے میں تھی، جس میں یہ طبقاتی تقسیم تھی۔ یہ ان کے ہاں بھی ہندوؤں کی طرح مستقل غیر متبدل طور پر موجود تھی۔ وہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں چاہتے تھے۔ یہاں شودر کہا جاتا تھا وہاں غلام کہا جاتا تھا۔ مدینے میں 75٪ آبادی غلاموں کی تھی۔ سارے کام وہی کرتے تھے اور ان بیچاروں کو بمشکل روٹی ملتی تھی، مار مار کے کھال ادھیڑ دیتے تھے، انہیں روٹی بھی پوری نہیں ملتی تھی اور یہ جو باقی بڑے بڑے تھے ان کے ہاں بڑے بڑے مہمان تھے، ان کے ہاں کعبے کے مجاور تھے، ان کے ہاں پوچھو نہیں، قریش کا یہ طبقہ کتنا تھا اور وہاں کی اتنی آبادی تھی، ان کی کیفیت یہ تھی۔ یہ تھا اس زمانے کا رائج نظام۔ اس کے اندر ایک شخص یہ آواز لے کر اُٹھتا ہے، یہ نظام پیش کرتا ہے، آپ سوچیے کہ یہاں سے جو شخص تنہا اُٹھتا ہے اس نظام قائم کرنے تک، اس کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ آواز دی اور اس پر اکٹھے ہوئے۔ اب ظاہر ہے کہ ان اکٹھے ہونے والوں میں بہت کم ایسے تھے جن کو آپ متمول یا دولت مند کہہ سکتے ہیں۔ وہ اس کی اس آواز کے خلاف تھے۔ زیادہ طبقہ ناداروں کا اور غریبوں کا ستایا ہوا تھا۔ ان مفلس اور نادار لوگوں کا یہی طبقہ تھا، انہوں نے اس آواز پر لبیک کہا ہے۔ بلالؓ آئے، صہیب رومیؓ آئے۔ ٹھیک ہے، ان میں سے یہ لوگ بھی آئے۔

قرآنی معاشرے کی تشکیل کے لیے نبی اکرم ﷺ کے تدریجی عمل کا طریق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ تکمیل

اب یہاں سے حضور ﷺ نے اس نظام کی ابتدا کی۔ پہلے تو ان کی ذہنیت بدلنے کے لیے کہا کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ (2:129) ذہنیت بدلنے کے لیے تعلیم کتاب وحکمت کی دیتے چلے جاؤ۔ اس کے بعد جن کے پاس اس زمانے میں ابھی اپنی ضرورتوں سے زیادہ تھا، انہیں یہ احکام دیئے کہ بھئی! ان غریبوں کی روٹی کا بھی کچھ انتظام کیا کرو، ان کی ضرورتوں کو بھی پورا کیا کرو۔ یہ اس طرح سے نادار تھے، نادار نہ رہ جائیں۔ ابھی وہ نظام نہیں آیا کہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت نہ رہے۔ جو زائد از ضرورت ہے وہ نظام لے لے اور پھر وہ نظام اسے تقسیم کرے۔ نظام تو ابھی قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ نظام کے قائم کرنے کے یہ مراحل تھے جن میں یہ انقلابی گزر رہا تھا، تو اس زمانے میں تو یہی ممکن العمل یا Practicable (قابلِ عمل) ہوسکتا تھا کہ جن کے پاس کچھ زائد ہے، ان سے یہ کہا جائے کہ آہستہ آہستہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرتے چلے جاؤ، وہ اس طرف ان کی توجہ مبتلا کرتا تھا اور اس نظام کو ایسے کرتا تھا کہ چلیے! پورا نہیں تو کوئی ایک آدھ روٹی تو ان کو ملے۔ یہ قرآن کریم کے احکام تھے، جو اس دور کے اندر نازل ہوئے، اور یہی ممکن العمل تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس نظام کو آہستہ آہستہ اس طرف لے گئے۔ تیرہ سالہ مکی زندگی میں اس نظام کا سوال نہیں تھا۔ مدینے کی زندگی کے اندر بھی قریباً سات سال تک تو لڑائیوں میں گزرا۔ یہ جو نظام ہے، وہ آہستہ آہستہ قائم ہونا تھا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ نظام نبی اکرم ﷺ کی زندگی میں بھی شروع ہو گیا تھا۔ یہ نظام عمل کی تکمیل تک ابھی نہیں پہنچا تھا۔ تکمیل تک حضرت عمرؓ کے زمانے میں جا کر پہنچا تھا، جنہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ آدمی یا

انسان کا بچہ تو ایک طرف اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا' تو اس کی ذمہ داری عمرؓ پر عائد ہوگی۔ یہ تکمیل تک پہنچا ہوا نظام تھا کہ کتا بھی بھوک سے نہیں مر سکتا تھا۔ حضورﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ جس بستی میں رات کو ایک فرد بھی بھوکا سو جائے' اس بستی سے خدا کی حفاظت کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے لیکن کتے کے بھوک سے مرنے کا مواخذہ مملکت کا ہو' نظام کا ہو' سربراہِ مملکت کا ہو' یہ اعلان تھا جو اس دور میں جا کر ہوا' یہاں آ کر وہ نظام تکمیل تک پہنچا۔ اب اس نظام کے اندر نہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت تھی' نہ کوئی محتاج تھا اور نہ کوئی نادار رہ گیا۔

تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے ❶

قرآنی معاشرے کے ابتدائی احکام منسوخ نہیں ہوتے صرف معطل ہوتے ہیں جیسے وضو میں پانی اور مسح کی مثال ہے

اب یہاں وہ تکمیل تک پہنچا تو وہ جو احکام تھے کہ کسی کے پاس زائد از ضرورت دولت نہ رہے' کوئی بھوکا نہ رہے' تو گویا وہ دولت کی ایسی تقسیم تھی۔ اس وقت وہ احکام جو قرآن حکیم کے ہیں' وہ عمل میں آئے اور یہ جتنے احکام انفرادی طور پر' صدقہ اور زکوٰۃ خیرات وغیرہ کے تھے منسوخ ہونے کی بات نہیں بلکہ وقتی طور پر اس دور میں ان کی ضرورت ہی نہ رہی جیسے قرآن حکیم نے کہا ہے کہ نماز سے پہلے وضو کیا کرو' پانی سے یوں ہاتھ منہ دھویا کرو اور اس کے ساتھ ہی ہے کہ پانی نہ ملے تو پھر مٹی سے مسح کر لیا کرو' تو وہ مسح اس وقت تک کے لیے ہے جب تک پانی نہ ملے۔ جب پانی مل جائے تو پھر مسح کا حکم پیچھے چلا جاتا ہے' پانی والا حکم آگے آ جاتا ہے۔ یہ جتنے احکام انفرادی اور ذاتی طور پہ صدقہ خیرات زکوٰۃ کے تھے یہ پھر جب نظام قائم ہو گیا تو کوئی بھوکا ہی نہ رہا تو یہ حکم کہ بھوکے کی روٹی کا انتظام کرو' وہ تو معطل ہو ہی جانا تھا' کوئی نادار ہی نہیں رہا۔ اس بات کا کہ نادار کی مدد کیا کرو' سوال ہی باقی نہ رہا۔ یہ طبقاتی تقسیم ہی ختم ہو گئی تو یہ جو احکام تھے' جنہیں میں نے اپنے ہاں جب قرآن کریم کا نظام پیش کیا ہے' انہیں عبوری دور کے احکام کہا ہے' ہمیشہ Transitional Period ہوتا ہے' ہر نظام میں ابتدا ہوتی ہے' اس کے انتہا تک پہنچنے کے درمیان مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ نظام جب ان مراحل میں سے گزرتا ہے تو اس میں یہ جو احکام ہیں وہ عبوری دور کے ہوتے ہیں' جوں جوں اس کی ضرورت ختم ہوتی چلی جاتی ہے' یہ پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں' اور اس کی جگہ اس نظام کے احکام آتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ان میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں رہتی' نظام قائم ہو جاتا ہے۔

---

❶ بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے
[اقبالؒ: بانگ درا (شکوہ)]

قرآنِ حکیم کے معاشی نظام کی انتہائی منزل ''قل العفو'' ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے عبوری دور کے احکام

اب اس کے بعد آپ دیکھیے' یہ سارے احکام یعنی یہ صدقہ اور اڑھائی فیصد مروجہ زکوٰۃ اور خیرات اور اس قسم کے ذاتی طور پہ بھوکوں کی روٹی کے انتظام کرنے کے جو احکام ہیں' اس نظام کی تکمیل کے بعد تو وہ احکام موجود ہی نہیں رہتے لیکن قرآن کریم نے اس لیے رہنے دیا کہ جب پھر اس قسم کا کوئی وقت تم پہ آ پڑے کہ پھر تم سرمایہ دار بنو اور سرمایہ داری کے نظام سے تم نے یہ نظامِ ربوبیت قائم کرنا ہو' تو اس دور میں پھر یہی احکام آپ کے ہاں جو قرآن حکیم نے دیئے ہیں' آ جائیں۔ جب یہ حکم آ گیا کہ وَ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی محنت سے' جو کچھ ہم نے کمایا ہے' اس میں سے ہم کتنے کے حق دار ہیں' اور کتنا دوسروں کی ضرورت کے لیے دیدیا جائے' کہا کہ ان سے کہو کہ جتنی تمہیں ضرورت ہے' صرف تم اپنی ضرورت کے مطابق لے سکتے ہو۔ اگر زائد ہے تو وہ دوسرے کے لیے ہے جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی۔ جب یہ حکم آ جائے تو اس کے بعد پھر یہ دولت کی غلط تقسیم ہے۔ کسی کے پاس زائد از ضرورت نہ رہے' کوئی محتاج نہ رہے۔ یہ غلط تقسیم ختم ہو جائے گی لیکن جب تک وہ نظام قائم نہیں ہو گا' اس دوران میں عبوری دور کے' یہ Transitional احکام رہیں گے۔ یہ اس طرح سے دیئے گئے۔

قرآنِ حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام میں سرمایہ داری نظام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

یہ تھا جی وہ نظام! اس کے بعد آپ کے ہاں ملوکیت آئی اور ملوکیت کے ساتھ ہی نظامِ سرمایہ داری آ گیا۔ یہ جو قرآن حکیم کا نظام تھا' اس میں تو نظامِ سرمایہ داری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ کسی ایک کے پاس اتنی دولت ہو کہ رکھنے کو جگہ نہ ہو اور باقی جو 75٪ آبادی ہے وہ رات کو بھوکی سوئے۔ اس ملوکیت کے نظام میں تو یہ چیز ہوئی۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس کا جواب کس طرح سے نکالا گیا؟ جواب نکالا گیا کہ یہ جو قرآن حکیم میں صدقے' زکوٰۃ' خیرات' غریبوں کی مدد کرنے' بھوکوں کی مدد کرنے کے احکام ہیں۔ یہ تو قرآن حکیم میں حکم ہے تو اس لیے ان احکام پہ تو عمل ہی اسی صورت میں ہو سکے گا کہ یہاں بھوکے ننگے رہیں اور کچھ لوگ امیر ہوں۔ انہی احکام سے آپ دیکھیے کہ اسی قرآن حکیم سے جس تعلیم یا جس نظام کو مٹانے کے لیے آیا تھا' اس نظام کو قائم کرنے یا ازسرِ نو زندہ کرنے کے لیے اسی کو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ کیسے تاویلیں کی گئیں' کیسی کیسی پھر حدیثیں وضع کی گئیں' یہ اس قسم کے قرآن حکیم کے احکام کے سامنے بن نہیں پڑتی تھیں کہ بات کیا کریں' اس ایک ہی آیت میں دیکھ لیجیے۔ سورۃ التوبۃ کی آیت (9:34) کا اگلا حصہ پڑھتا ہوں۔ پہلا تو یہ ہے کہ یہ جو مذہبی پیشوا ہیں' وہ لوگوں کا مال ناجائز کھاتے ہیں اور خدا کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ان کے متعلق ہے۔ اگلا حصہ ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۙ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (9:34-35) جولوگ مال اور دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کے لیے اس کو کھلا نہیں رکھتے' ان کو' اے رسول! اعلان کر دو' ان کو وارننگ دیدو کہ یاد رکھو! اس کا نتیجہ ایک دردناک الم انگیز تباہی ہوگا۔ اسے محسوس مثال میں سمجھایا' اس زمانے میں نوٹ نہیں ہوتا تھا کہ آگ پہ رکھیں تو جل جائے' سکے ہوتے تھے۔ کہا کہ جب تمہارے ان سکوں کو' جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ مرئی مثال سے بات سمجھائی اور کہا کہ پھر اس سے تمہارے ماتھوں کو' تمہارے پہلوؤں کو' تمہاری پشت کو' داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ وہ دولت ہے جو تم نے غریبوں' محتاجوں کے لیے کھلی نہیں رکھی' اپنی ذات کے لیے تم نے اس کو اپنے ساتھ جمع کر رکھا ہے' سو آج اس کا مزہ چکھو جو تم نے اس طرح سے جمع کر رکھا تھا۔ عزیزانِ من! دولت کے جمع کرنے میں کوئی اس کی تاویل ہی نہیں بن پڑتی تھی' میں ایک آیت کہہ رہا ہوں۔ قرآن حکیم میں دولت کے جمع کرنے کے خلاف بیسیوں آیات ہیں کہ جب دولت جمع نہیں ہو سکے گی تو سوال ہی نہیں پیدا ہوگا کہ ایک طبقہ امیر ہو جائے۔ امیر تو ہوتا ہی وہ ہے جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہو۔ قرآن کریم نے بیسیوں مقامات پہ اس چیز کے متعلق اور اسی شدت سے کہا کہ جہنم کی آگ ہوگی' وہ آگ جو تمہارے دلوں کو جلا کر رکھ دے گی۔

سرمایہ داری نظام کو قائم رکھنے کے لیے وضعی روایات کا سہارا نیز حضرت عمرؓ کی نبی اکرم ﷺ کے حضور درخواست کا ذکر

عزیزانِ من! ان آیات کی موجودگی وہ نظام کس طرح سے ہو کہ اس میں غریب بھی رہیں' بھوکے بھی رہیں' ان کے پاس زائد از ضرورت دولت بھی رہے۔ یہ تصور میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے لیے ان کے پاس بڑا عجیب حربہ تھا۔ ایک حدیث یا روایت وضع کی' اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا۔ آپ کو پتہ ہے اس آیت کے لیے حدیث کیا آئی ہوئی ہے۔ وہ روایت یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ میں اس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ وہ وہاں مدینے کے بائیس خاندان ہوں گے۔ صحابہؓ میں بڑا اضطراب ہوا گویا یہ سارے سرمایہ دار تھے جنہوں نے کہا کہ صاحب! یہ کیا ہوا' ہم تو لٹ گئے' ہم تو پٹ گئے' دولت ہی نہیں جمع ہو سکتی' مشورہ کیا کہ کیا کریں۔ اب غور کیجیے کہ وہ کسے اپنا نمائندہ بناتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کو اپنا نمائندہ بنایا کہ رسول اللہ ﷺ سے جا کر کہو کہ یہ کیا قیامت ہے' یہ جو حکم آپ ﷺ نے دیدیا۔ آپ اندازہ لگایئے ذرا سوچیے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ یہ ہیں اس روایت کے الفاظ۔ کس کو چنا؟ حضرت عمرؓ کو جس عمرؓ کی کیفیت یہ تھی کہ اس نے اُس گورنر ❶ کے پیغام پر سے کہا تھا جب اس نے آپؓ سے کہا تھا کہ یہ جو کی روٹی کیوں کھا رہے ہیں' اب تو میں

---

❶ یہ ہے حضرت ساریہؓ کا پیغام بر ''ابن فرقد'' اس پوری تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت (1987ء)' ص ص-372 تا 373)

(یعنی حضرت ساریہؓ) مصر سے خاص طور پر آپ کے لیے گیہوں بھیج رہا ہوں' تو آپؓ نے کہا تھا کہ عمرؓ گیہوں کی روٹی اس دن کھا سکتا ہے جب اسے یقین ہو کہ مملکت کے ہر فرد کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ انہوں نے آپؓ کو حضورﷺ کے پاس نمائندہ بنا کر بھیجا ان کے بقول آپؓ نے جا کر کہا کہ (معاذ اللہ) صاحب! یہ آپﷺ نے کیا قیامت کر دی۔ خدا کا حکم آ رہا ہے' آیت نازل ہو رہی ہے اور رسول اللہ ﷺ سے جا کر کہہ رہے ہیں کہ آپﷺ نے یہ کیا کر دیا۔ آپﷺ کو معلوم ہے آپﷺ کے صحابہ کا ردِ عمل اس پر کیا ہوا ہے؟ کہا کہ اس پر بڑا اضطراب پھیل گیا ہے۔ آپﷺ مسکرائے' کہنے لگے کہ تمہیں پتہ نہیں' اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ کا جو حکم آ گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جتنا جی چاہے جمع کرو' اس میں سے اڑھائی فیصد خیرات کے طور پر دیدو' سارا مال پاک ہو جائے گا۔ کہا کہ وہاں جب یہ حکم سنایا گیا تو نعرہ تکبیر بلند ہوا' اللہ اکبر! بچ گئے۔ اب آپ کو معلوم ہے کہ خیرات کا اور دولت کا بے محابہ جمع کرنے کا یہ کیا حربہ استعمال کیا۔ ایک حدیث ہے اور پھر وہ خیرات کی' صدقہ کی' حدیثیں اس کے حق میں وضع ہوئیں' اس کی اہمیت اور اس کی عظمت بڑھی اور اس کے لیے خدا کی طرف سے ثواب حاصل کرنے کا آیا اور یہ اور وہ سب ہوا۔ تو پہلی چیز یہ ہوئی۔

زکوٰۃ کا مروجہ خود ساختہ تصور اور اس پر عمل پیرائی کا نتیجہ

اب آپ سوچ لیجیے یہ جسے اڑھائی فیصد زکوٰۃ کہتے ہیں وہ کیسے واجب ہوئی۔ آپ جتنا جی چاہے جمع کر لیجیے' آپ نے دیکھا کہ اس نے سارے نظام کو الٹا کر رکھ دیا۔ جتنا جی چاہے جمع کرو ایک طرف' دوسری چیز یہ جو خیرات اڑھائی فیصد نکالو' یہ کن کو دو کہ وہی جو غریب اور محتاج اور نادار ہیں' گویا دونوں طبقے موجود ہو گئے زائد از ضرورت دولت مند بھی اور نادار اور محتاج بھی اور خدا کا یہ حکم آ گیا' رسول اللہﷺ نے اس کی تشریح فرما دی' اب اس سے کون روک سکتا تھا' اب وہ تصور کہ وہ اس عبوری دور کے احکام تھے' جب نظام قائم نہیں ہوا تھا' وہ تصور ہی ذہن سے غائب کر دیا گیا۔ کہا کہ یہی قرآن حکیم کے احکام ہیں' مستقل نظامِ معیشت قرآن حکیم کا ہے ہی یہ کہ بے حد و نہایت دولت جمع کرو' اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ خیرات نکال دو' وہ غریبوں کو' بھوکوں کو' بھیک کے ٹکڑے کی طرح پھینک دو۔ یہ دولت مندوں کا طبقہ بھی رہنا چاہیے اور وہ طبقہ بھی جو بھوکا ہو' رہنا چاہیے۔ مستقل طور پر اسلام کا یہ نظام بتایا گیا اور اس کے لیے یہ احادیث اور روایات وضع کی گئیں۔ صاحب! وہی نظام آج تک آپ کے ہاں قائم ہے۔ یہ خالص نظامِ سرمایہ داری ہے' ہر Capitalist Country کے اندر آپ دیکھیے گا کہ وہاں کے جو امیر دولت مند لوگ ہیں' وہ اپنے سرمایہ میں سے' خیراتی کاموں میں' کتنا صرف کرتے ہیں۔ تو وہی چیز تو یہ ہے' جو آپ کے ہاں ہوئی' اس نظام نے بالکل الٹ دیا' ان تمام قرآن حکیم کی آیات جو عبوری دور سے متعلق تھیں' اب بجائے اس کے کہ یہ ہوتا کہ صاحب! وہ نظام قائم کیا جائے جس میں یہ چیزیں باقی نہیں رہتیں' کہا کہ نہیں' اسلام کا یہی مستقل نظام ہے۔

---

❶ ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ عتبہ بن فرقد کے ساتھ پیش آیا تھا جو کوفہ کے عامل تھے (حوالہ پرویزؒ: شاہکارِ رسالت: 1978' ص 372)

قرآن حکیم نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا مگر ملوکیت میں پھر اس کا رواج ہوا

نزولِ قرآن حکیم کے وقت اس کی دوسری مثال غلام اور لونڈیوں کے وجود کی ہے۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں سے عربی معاشرہ بھرا پڑا تھا‘ وہاں لاتعداد لونڈیاں تھیں‘ ان سے نکاح کی بھی ضرورت نہیں ہوتی تھی‘ جو غلام تھے‘ وہ سارا جتنا بھی مزدوروں کا کام تھا‘ کرتے تھے‘ پیٹ بھر کر ان کو روٹی بھی نہیں مل سکتی تھی‘ وہ کہیں بھاگ کر بھی نہیں جا سکتے تھے‘ وہ پکڑے جاتے تھے جہاں بھی جائیں اور ان کو واپس کیا جاتا تھا۔ یہ تھا اس زمانے کا غلاموں اور لونڈیوں کا نظام۔ قرآن حکیم نے آ کر یہ نظام دیا کہ ہر انسان یکساں طور پہ واجب التکریم ہے‘ اس میں آقا اور غلام کی کوئی تفریق ہی نہیں۔ یہ نظام دینا تھا لیکن اگر اس نظام کو‘ جو اس وقت تھا شبا شب الٹ دیتے تو 75% آبادی کیا کرتی۔ اس وقت کے معاشرے کا نظام الٹ جاتا۔ یہی چیز ہے کہ اس قسم کا جو انقلاب ہوتا ہے‘ وہ یکا یک نہیں لایا جاتا۔ آپ لاہور کی سڑکوں کا نام ایک رات کو بدل دیجیے‘ صبح اٹھیے تو آپ دیکھیے گا کہ کتنے ٹکراؤ ہوتے ہیں۔ اسے آہستہ آہستہ وہاں تک لے جانا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں لونڈیوں اور غلاموں کے جتنے بھی احکام آئے ہوئے ہیں وہ اس دور سے متعلق ہیں جس میں ان کو آہستہ آہستہ جو موجود تھے‘ ان کو جزو معاشرہ بنایا گیا اور آئندہ کے لیے غلاموں اور لونڈیوں کا دروازہ بند کر دیا‘ غلامی کو ختم کر دیا‘ وہ ذریعہ بند کر دیا جس سے غلام آتے تھے۔ مثلاً جنگ کے قیدی کہا گیا کہ جنگ کے قیدیوں کو یا تو فدیہ اور کفارہ دے کر یا اپنے قیدیوں کے عوض میں یا ان سے پیسے لے کر رہا کرو اور اگر کہیں ایسی صورت نہ ہو تو انہیں احساناً رہا کرو۔ انسان انسان کو اس طرح سے اپنی قید میں نہیں رکھ سکتا لہٰذا قرآن حکیم نے غلامی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا اور ان کو آہستہ آہستہ جزو معاشرہ بنا دیا۔ اس کے بعد یہ موجود ہی نہیں تھے لیکن آپ کے ہاں جب یہ ملوکیت آئی تو اسی طرح سے غلامی کا بھی رواج ہوا‘ پھر غلام بننے شروع ہوئے‘ پھر لونڈیاں آنی شروع ہوئیں۔

عباسیوں کے دور میں محلات کے اندر تین تین ہزار لونڈیوں کا وجود اور آج بھی یہی احکام لا رہے ہیں

آپ کے ہاں یہ جو عباسیوں کے ہارون الرشید اور مامون الرشید ذہن میں ایسے آتے ہیں کہ الرشید کے نام سے پتہ نہیں صاحب! کتنے متقی پرہیز گار قسم کے یہ سلاطین تھے۔ ان ایک ایک کے محل میں تین تین ہزار لونڈیاں تھیں۔ کیا انسان تھے یہ؟ پھر آپ کہیں گے کہ یہ کیسے ہوا؟ وہی غلام لونڈیوں کے متعلق احکام جو قرآن کریم میں عبوری دور کے دیئے گئے تھے‘ کہا گیا کہ یہ مستقل احکام ہیں‘ لونڈیوں کا وجود اسلام کے اندر مستقل طور پر خدا کی منشا کے مطابق ہے۔ ارے! وہ تو قرآن کریم کی آیت میں یہ تھا۔ میں نے ابھی کہا ہے کہ قرآن کریم نے جو دولت جمع کرنے کے خلاف کہا تھا‘ روایات یا احادیث کی رو سے اس کی کس طرح سے تکذیب کی گئی‘ تاویل کی گئی‘ جنگ کے ان غلام اور لونڈیوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ کہا گیا کہ سربراہِ مملکت کو یا نظام کو اس کی اجازت ہے کہ ان کو فدیہ دے کر چھوڑ دے

احساناً چھوڑ دے مگر ان کے ہاں یہ ہے کہ قتل کر دے یا ان عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دے' ان سے نکاح کی ضرورت نہیں' تعداد کی ضرورت نہیں' ان کو بیچا جا سکتا ہے' فروخت کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ سارے احکام موجود ہیں۔ یہ پرانے زمانے کی بات نہیں' آج آپ کے ہاں کے جو مجتہد ہیں' وہ بھی یہی احکام لا رہے ہیں۔

غلام اور لونڈیوں کے سلسلہ میں مودودیؒ کا فتویٰ' پاکستان کی پارلیمان میں ایک مولانا کا مطالبہ اور عورت کا مقام

آپ کو یاد ہوگا' (مولانا ابوالاعلیٰ) مودودیؒ صاحب کے ساتھ جو میرا مباحثہ ہوا تھا۔ ان کی کتاب ''غلام اور لونڈیاں'' موجود ہے۔ یہ سارا کچھ اس میں موجود ہے کہ لونڈیاں بیچی جا سکتی ہیں' خریدی جا سکتی ہیں' تحفۃً دی جا سکتی ہیں' کوئی تعداد نہیں' نکاح کی ضرورت نہیں۔ ان کی کتاب میں یہ سارا کچھ موجود ہے۔ آج اس دور میں اور اس کے لیے وہ ساری چیزیں' روایات فقہ کے یہ سارے مسائل' آپ کے ہاں موجود ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ عائلی قوانین کے خلاف جب یہ بات ہوئی تھی کہ ایک سے زائد بیوی کرنا ہو تو اس کے لیے اجازت لینی پڑے گی تو آپ کی پارلیمان میں ایک بہت بڑے مولانا صاحب نے یہ کہا تھا کہ اگر یہ قانون تم نے جبراً پاس کرنا ہی ہے تو کم از کم ہمیں ایک ایک لونڈی رکھنے کی تو اجازت دیدو۔ آپ کے' پاکستان کے' پارلیمان میں آج بھی یہ چیز ریکارڈ پر ہے۔ ان کے ہاں یہ احکام ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ بات کیا ہوئی؟ وہ احکام جو اس عبوری دور سے متعلق تھے' جس نے بتدریج آہستہ آہستہ (Gradually) ممکن العمل طریق پر' نہایت عمدہ طریق پر' انتہا تک پہنچنا تھا' اور جس سے وہ معاشرہ کوئی Upset نہیں ہوا' اس سے وہ آہستہ آہستہ جزوِ خاندان بھی بنتے چلے گئے' آزاد ہوتے چلے گئے' اور آئندہ کے لیے وہ راستہ بند کر دیا' ختم ہو گیا۔ اب جو راستے میں اس کے لیے پھاٹک کھولنے تھے تو اس کے لیے کیا کیا گیا؟ اس کے ہاں یہ جو چیز تھی' یہ جو یہاں لونڈیوں وغیرہ کے متعلق احکام تھے' ان کے لیے کہا کہ یہ مستقل احکام ہیں۔ لہٰذا اس کے بعد کہا کہ ان کا وجود ہونا چاہیے۔ ان کے وجود کے لیے تو قرآن کریم نے وہ راستہ ہی بند کر دیا تھا' قرآن کریم کے اندر اضافہ کیا گیا۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ یا فدیہ' کفارہ دے کر چھوڑ دو یا' احساناً چھوڑ دو۔ انہوں نے کہا کہ ان کو قتل کر دو' ان کی عورتوں کو سپاہیوں میں تقسیم کر دو۔ اس میں یہ دو اضافے اپنی طرف سے کیے اور اس کا مدار اسی قسم کی روایات پر رکھا۔ یہ آپ کے ہاں فقہ کے آج مسائل ہیں۔ فقہ کی کتابوں میں آپ دیکھیے' وہاں صفحات کا اتنا Percentage لونڈیوں ہی کے احکام کے متعلق ہے۔ جنسیات کی ماری ہوئی یہ قوم ہے' جس میں لاتعداد شکل میں لونڈیاں فروخت کی جا سکتی ہیں' تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ ان کے ہاں عورت کا یہ مقام ہے' عزیزانِ من! لونڈی بھی تو عورت ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم کے عبوری دور کے احکام ہی آخر کار رائج العمل سمجھے جاتے ہیں پھر پانی کی موجودگی میں مسح کیوں نہیں کیا جاتا

عزیزانِ من! بات میں کیا کہہ رہا ہوں؟ یہ کہ قرآن حکیم کے جو احکام عبوری دور کے لیے تھے کہ یہاں سے یہ نظام Start (شروع) کرو' آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچا جاؤ اور جب انتہائی طور پہ وہ نظام قائم ہوگا تو یہ احکام باقی نہیں رہیں گے' رائج العمل نہیں رہیں گے مگر یہ اس کے بعد ان احکام کو مستقل احکام تصور کر کے ان کے اوپر چلے گئے۔ اب ہزار سال سے آپ کے ہاں یہ اسلام چلا آ رہا ہے اور اسی اسلام کے احیاء کی' زندہ کرنے کی' اب کوشش کی جارہی ہے۔ سنیے! عزیزانِ من! زمانے کے تقاضوں کے ہاتھوں UNO نے Slavery یا غلامی کے خلاف اپنے چارٹر میں یہ لکھا تھا کہ غلامی نہیں رہ سکتی۔ ان میں یو این او کے ممبروں کی Majority (اکثریت) تھی' ان کی سیکولر حکومتیں تھیں' اسلامی نہیں تھیں۔ انہوں نے تو مل کر یہ چارٹر پاس کر دیا۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ کے ہاں کے اس زمانے کے سعودی عربیہ شہنشاہ نے اس پہ دستخط نہیں کیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے' ہم تو شریعت والی حکومت ہیں۔ یہ تو اس کے بعد' میرا خیال ہے غالباً شاہ فیصل نے' میں یقینی طور پہ نہیں کہہ سکتا' بہت عرصہ کے بعد' زمانے کے تقاضوں سے تنگ آ کر' دستخط کیے تھے اور آج بھی آپ کے ہاں یہ احکام موجود ہیں۔ یہ آپ کے جو فقہا اب یہ قوانین وغیرہ بنا رہے ہیں' میں نے عرض کیا ہے کہ (مولانا ابوالاعلیٰ) مودودیؒ صاحب کی تو آج کتاب موجود ہے' یہاں ان کی تفسیر کی پہلی جلد کے اندر اس کی پوری کی پوری تفصیل موجود ہے کہ یہ لونڈیاں بیچی جا سکتی ہیں' بلا تعداد کے' بلا نکاح کے' ان سے تمتع کیا جا سکتا ہے۔ یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔ اب آپ کے لیے یہ احباب نئے قوانین مرتب کر رہے ہیں۔

بات کیا تھی؟ میں نے یوں کہا ہے کہ قرآن حکیم کی تحریف کی جاتی ہے۔ یہ کیسے فائدہ اٹھاتے ہیں؟ یہ Exploit (استحصال) کرنے والے' انہی کو Exploit کر کے' اسے پیش کر دیتے ہیں' عام لوگوں کو تو معلوم نہیں ہوتا۔ جب کہا جائے کہ قرآن کریم کے اندر تو لونڈیوں کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے' جب لکھا ہوا ہے تو لونڈیاں تو ہوں گی۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ یہ عبوری دور کے احکام ہیں' آپ کے ہاں کی کوئی تفسیر یہ نہیں بتاتی۔ آپ کے ہاں کی یہ سب تفسیریں ملوکیت کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں۔ آپ کے ہاں کی ساری تاریخ ملوکیت کے زمانے کی ہے' ساری روایات ملوکیت کے زمانے کی ہیں' ان میں نظامِ سرمایہ داری کے متعلق بھی یہ احکام ہیں' غلام لونڈیوں کے متعلق بھی یہ احکام ہیں۔ یہ تو میں نے دوسری مثال دی ہے کہ عبوری دور کے احکام سے کس طرح سے ناجائز فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ نظام جو آپ کے ہاں دنیا میں پیش کیا جاتا ہے' اسے فخر سے اسلام کا نظام کہتے ہیں۔ بات اتنی سی تھی کہ قرآن کریم نے یہ جو احکام دیئے تھے' وہ

اس دور کے لیے تھے' ان کو مستقل احکام نہیں سمجھ لیا گیا' بلکہ کہہ دیا گیا' یہ جانتے تھے کہ یہ عبوری دور کے احکام ہیں۔ انہوں نے اس سے یہ ناجائز فائدہ اُٹھایا' اس چیز کو Exploit کیا' آج بھی وہ لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! عبوری دور کے احکام قرآن کریم کے احکام ہیں ہر وقت قرآن کریم کے احکام تو زندہ رہتے ہیں۔ ٹھیک ہے' ان سے کہیے کہ پانی کی موجودگی میں ذرا کہیں مسح کریں کہ یہ مسح کا حکم قرآن کریم میں ہے۔

خیرات انسان میں احساسِ کمتری کے مرض کو جنم دیتی ہے' وہ کمائی سے بطورِ حق مانگتے ہی

عزیزانِ من! قرآن کریم نے ایک بات کی ہے۔ جولائی 1982ء کے طلوع اسلام میں' میں نے ایک چٹھی کا جواب دیا ہے۔ اس کا عنوان ''نوادرات'' ہے۔ اس میں عبوری چیز بھی آئی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کا اعجاز دیکھیے کہ اس عبوری دور میں بھی وہ ان چیزوں کے متعلق تو تلقین کرتا ہے کہ ان ضرورت مندوں کے کھانے کا' روٹی کا' انتظام کرو' لیکن اس میں ساتھ کے ساتھ اصلاح بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ خیرات ایک ایسی چیز ہے کہ جس سے جو دینے والا ہے' اس کے دل میں ایک تکبر پیدا ہوتا ہے' اوپر کا ہاتھ ہوتا ہے' لینے والے میں Inferiority Complex (احساس کمتری) پیدا ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں انسان کو تباہ کرنے والی ہیں' اسی لیے ایک حدیث میں ہے' اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی صحیح ہو سکتی ہے: حضورﷺ نے فرمایا کہ خیرات سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران قرآن کریم نے کیا کیا؟ یہ کہ انفرادی مدد کرنے کا یہ نظام تو قائم رکھا' دینے والوں کے متعلق کہا کہ دیتے ہو تو یہ کہو کہ لَا نُرِیۡدُ مِنۡکُمۡ جَزَآءً وَّلَا شُکُوۡرًا (76:9) اس کے معاوضے میں ہم تم سے کچھ بدلہ تو ایک طرف رہا' ہم شکریئے کے بھی متمنی نہیں۔ (اللہ اکبر)! دینے والے کے اندر کتنا بڑا ذہنی تغیر پیدا کرتا ہے۔ اب وہ چیز تھی کہ اس سے انسان کے اندر تکبر کا' نخوت کا' اونچے ہونے کا' ایک Superiority Complex (احساس برتری) پیدا ہوتا ہے۔ وہ جذبہ ہی نہیں رہا اور ان سے کہا کہ تم کوئی چیز بھیک منگوں کی طرح' خیرات کے طور پر' نہیں لیتے فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ (51:19) تمہارا حق ہے ان کی زائد دولت کے اندر۔ تم ان سے As of right (بطورِ حق) ڈیمانڈ کر سکتے ہو۔ اسے کہتے ہیں کہ یہ خداوندی طریق اور قابلِ عمل طریقہ ناگزیر تھا' یہ کچھ وقت کے لیے عبوری دور کا سلسلہ تھا۔ یہ اس لیے تھا کہ غریبوں ناداروں کی مدد کرنے والے ہوتے' یہ ان سے لیتے لیکن ان دونوں کے اندر' جو اس پہلے جذبہ کے ماتحت خلافِ انسانیت چیز پیدا ہوتی تھی اس کا اس دور میں بھی تدارک کر دیا صاحب! یہ ہے جس کو اصلاح کہتے ہیں۔

اگر نظام کو اس حد تک باقی بھی رکھنا ہے تو اس کے اندر جو اس کے عبوری احکام ہوتے ہیں' جو اس کے ہاں کی برائیاں ہوتی ہیں' ان سے کسی کی ذہنیت پر' کیریکٹر پر جو اثر پڑتا ہے' اس کو اندر سے نکال کر چلے جاؤ۔ اس لیے یہ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ (70:24) آیا ہے۔ اور یہاں

تو دوسری طرف حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) آیا ہے۔ یہ حق چوری چھپے والی بات نہیں ہے'اس کا ہر ایک کو علم ہونا چاہیے کہ ان کا حق ہے' جو یہ لے رہے ہیں' خیرات نہیں لے رہے۔ اس ایک لفظ نے اتنا فرق پیدا کر دیا اور انہیں کہا کہ ہم تو اس کے بدلے میں تم سے شکریہ کے بھی متمنی نہیں ہیں اور یوں اس نظام کو آخر تک لے گئے اور کہا کہ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) ان کی عملی زندگی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی محنت کی کمائی کو صرف اپنی ذات کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے بلکہ اس میں ہر اس شخص کا حق ہوتا ہے جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم ہو یا جو بالکل کما سکنے کے قابل نہ ہو۔ یہ دیکھو! یہ ہے ہمارا نظام۔

زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں' اجر محنت کا ہوتا ہے' طبقاتی تقسیم کا نہیں

دو آیتیں ہیں' عزیزانِ من! قرآن حمید نے بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ کہا کہ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (51:20) یہ جو رزق کی پیداوار ہے' وہ کہاں سے ہے؟ وہ زمین سے ہوتی ہے۔ کہا کہ جو ہمارے نظام کی صداقت پر یقین رکھتا ہے' وہ یہ سمجھ لے کہ اس نظام کے صحیح ہونے کی ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ رزق کا ابتدائی ذریعہ ارض کو بتایا ہے لہٰذا زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں' یہ کسی کارخانے میں تیار ہو کر باہر نہیں آتی' خدا کی دی ہوئی ہے اور خالقِ کائنات نے تمام مخلوق کے لیے اسے پیدا کیا ہے کہ اس کے لیے ذریعہ رزق بنے اور اس میں پھر جو کچھ اگتا ہے' یہ نہیں ہوتا کہ جو جاگیردار کی زمین ہے' اس کی فصل اتنی زیادہ ہوتی ہے' کاشتکار کی اتنی کم ہوتی ہے کیونکہ یہ بیچارہ غریب ہے' وہ امیر ہے۔ امیر کی' غریب کی جو زمین ہے خدا کے بتائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق جو اس میں محنت کرتا ہے' اس میں سے اس کے مطابق اس کا فصل پیدا ہوتا ہے صاحب! محنت کا اجر ملتا ہے' زمین کی جو Base یا ذریعہ ہے' وہ خدا کی طرف سے مفت ملا' صرف محنت باقی رہ گئی اور محنت کا معاوضہ ملتا ہے اور اس نے کہا کہ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) جو خود زمین پہ محنت نہیں کرتا ہے اس کا اس کی پیداوار میں کوئی حق نہیں ہے اور یہ عبوری دور کے احکام ہیں۔

عزیزانِ من! قرآنِ حکیم نے یہی کہہ کر مزارعت ختم کر دی' بٹائیاں ختم کر دیں' جاگیرداریاں ختم کر دیں کہ زمین سے تو پیدا ہوگا جو محنت کی جائے گی اور جو زمین پہ محنت نہیں کرتا اس کا اس میں کوئی حق نہیں' جی۔ آگے کہا کہ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (51:22) اسی طرح سے بادلوں کو دیکھیے! یہ کسی کے زرخرید نہیں ہیں' کسی کے پیدا کردہ نہیں ہیں' کسی فیکٹری میں ڈھل کر نہیں اتر آئے' آتے ہیں جہاں ضرورت ہوتی ہے' غریب کی زمین پہ بھی برستے ہیں' امیر کی زمین پہ بھی یکساں برستے ہیں۔ ان کا وہاں یکساں اثر ہوتا ہے اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ کہا کہ دیکھتے ہو کہ ہمارے ہاں اس قسم کی کوئی طبقاتی تقسیم نہیں ہے اور پھر آگے ایک مثال دی۔ وقت تھوڑا سا ہی ہے لیکن بات بڑی عجیب ہے۔

انسانی جسم کی مشینری نظامِ ربوبیت کی بڑی ٹھوس مثال ہے

عزیزانِ من! کہا کہ کیا اس نظام کو دیکھنا چاہتے ہو؟ میں بالخصوص ڈاکٹر صاحب ❶ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔ کہا ہے کہ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ (51:21) اپنے نظامِ جسمانی کو ذرا دیکھو تو سہی۔ جو کچھ تم کھاتے ہو' وہ معدے میں جاتا ہے۔ کہا کہ کیا کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو سنبھال کر بیٹھ جائے کہ صاحب! یہ تو میری ملکیت ہے' میں تو کسی کو نہیں دیتا؟ یہ اس کے قبضے میں ہوتا ہے جو کچھ تم کھا رہے ہو' تمہاری زندگی کا دارومدار اس پہ ہے جو تم کھا رہے ہو اور وہ سب سے پہلے اس کے پاس جاتا ہے اور وہ ہوتا بھی اس گتھلی کی طرح ہے جس کے اوپر سے گانٹھ دے دو' دوسری طرف سے اوہدے وچوں (اس میں سے) نکل ہی نہ سکے۔ کہنے لگا کہ کیا اس میں کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے لے کر بیٹھ جائے؟ اس کا تو Function (فعل) یہ ہے کہ جسم کی نشوونما کے لیے اس کو تیار کر دے۔ وہ اتنی محنت کرتا ہے اور سارے کا سارا آگے پاس کر دیتا ہے کہ میرے حصے میں اس وقت آئے گا' جب یہ تقسیم ہوگا' براہِ راست اس میں سے کچھ بھی اپنے پاس نہیں رکھتا بلکہ آگے پہنچا دیتا ہے اور جس جس عضو میں سے وہ گزرتا ہے وہ اپنا فنکشن (فعل) ادا کیے چلا جاتا ہے اور اس کو آگے بھیجتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ (اگر میں نظام میں غلطی نہیں کرتا) انتڑیوں میں جاتا ہے' خون کے اندر اس کے وہ سارے جز مل جاتے ہیں' خوراک میں جتنی Nutrition (غذائیت) ہوتی ہے' جو نشوونما کا زندگی کا ذریعہ ہوتا ہے' خون کے اندر ہوتا ہے' خون بھی یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ اب اس کے پاس آ گیا ہے' اور اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔ وہ سارے کا سارا دل کی طرف منتقل کر دیتا ہے صاحب! وہ وہاں سے Pump کرتا ہے۔ غور کیجیے! نہ جگر اپنے طور پہ کچھ رکھتا ہے جو خون کو بناتا ہے' نہ دل اپنے لیے سمیٹ کر بیٹھ جاتا ہے کہ یہ تو ساری میری ملکیت ہے۔ کوئی اس کو اپنی ملکیت نہیں' بناتا' جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے تقسیم اس طرح سے ہوتی ہے۔ اندران اجزاء کو یہ کچھ ملتا چلا جاتا ہے' بلا مزدو معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے' اپنا اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں' جہاں کہیں ایسی کوئی بیماری آتی ہے کہ وہ سعی یا محنت کرنے کے قابل نہیں ہوتا' وہاں مشکل آ جاتی ہے پھر اس کے لیے علاج کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس کو تندرستی کہتے ہیں' پھر جو اپنا کام کرنے کے قابل نہ رہے' اس کو تندرست کرنا پڑتا ہے' شفا دینی پڑتی ہے۔ یہ ہے جسمانی نظام!

خدا اپنا ہر وعدہ اپنے دیئے گئے نظام کے تحت پورا کرتا ہے

عزیزانِ من! آپ نظامِ جسمانی دیکھیے کہ قرآن حکیم کہاں لایا ہے۔ ارض کی مثال دی ہے' بادلوں کی مثال دی ہے اور کہا کہ اس سے بھی زیادہ ذرا توجہ طلب معاملہ ہے۔ اپنے جسم کے نظام کی طرف تو ذرا دیکھو' اگر زائد از ضرورت کوئی اپنے پاس رکھ لے تو جناب! اپھارہ

---

❶ یہ اشارہ مرحوم ڈاکٹر سید عبدالودود کی طرف ہے۔

ہو جاتا ہے' پیٹ میں مصیبت پڑ جاتی ہے۔ کہا کہ نہیں' یہ ہے جس نظام کے اندر طبقات نہیں ہیں' نظام میں اُس ضرورت کے مطابق ہر ایک کی تقسیم ہوتی چلی جاتی ہے۔ کہا ہے کہ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ o وَفِی السَّمَآءِ رِزۡقُکُمۡ (22-51:21) اس نظام کے بعد کہا کہ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ (51:22) یہاں کوئی بھوکا نہیں رہے گا' کوئی ننگا نہیں رہے گا' اس کے ماتحت ہمارا یہ وعدہ پورا ہوگا جو ہم کہہ رہے ہیں' اور آگے کہا کہ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ (51:22) جو تمہیں کہا جاتا ہے کہ یہاں کوئی بھوکا نہیں رہے گا' کوئی ننگا نہیں رہے گا' اس کے ماتحت ہمارا یہ وعدہ پورا ہوگا جو ہم کر رہے ہیں' تب وعدہ پورا کرے گا اور آگے کہا کہ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ (51:23) او تیرا خدا زمین اور آسمان کا' ارض اور بادلوں کا خدا' آہاہا! وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ جو ہم کہہ رہے ہیں' یہ ایسا ہی سچا ہے' ایسا ہی واقعتاً ہے' یہ سچی بات ہے جیسے گویا تم آپس میں ایک دوسرے سے بات کر رہے ہو: بڑی سچّی گل اے جیہڑی اسی کرنے آں (یہ بات جو ہم کرتے ہیں اس میں بڑی صداقت ہے)۔ یہ ایسا نظام تم قائم کرلو اور پھر دیکھو کہ جو وعدہ ہم نے کیا ہے کہ کوئی رات کو بھوکا نہیں سوئے گا' پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ کہا کہ اللہ دی سوں میں اے جیہڑا کچھ کیناں ہیگاں اے ہوکے رہے گا (خدا کی قسم! میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ ہو کر رہے گا۔)

کائنات کا ذرّہ ذرّہ نظامِ ربوبیت کی ایک زندہ شہادت ہے

کہا ہے کہ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ اِنَّہٗ لَحَقٌّ مِّثۡلَ مَاۤ اَنَّکُمۡ تَنۡطِقُوۡنَ (51:23) ارض وسماوات کا رب ہے۔ آپ ایک لفظ رب دیکھیے کہاں آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ''نشوونما دینے والا''۔ کہا ہے کہ نشوونما دینے والا شہادت میں ذرائع رزق کو پیش کر رہا ہے۔ ارض وسما کو نشوونما دینے والا' اس کا مالک' اس کا کنٹرول کرنے والا' گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں کہ رات کو کوئی بھوکا نہیں سوئے گا' یہ ہو کر رہے گا' یہ ایسی سچی بات ہے' ایک ایسی محسوس چیز ہے' جیسے تم ایک دوسرے سے بات کرتے ہو تو تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے' میں کیا کہہ رہا ہوں۔ کہا ہے کہ اس کو یوں سمجھو' یہ اس طرح سے سچی بات ہے اور اسے یوں کہو کہ ''وہ کائناتی نظام میں خدا کی ربوبیتِ کبریٰ کے مشاہدہ کے بعد پورے حتم ویقین سے پکار اُٹھتا ہے کہ زبانِ وحی سے جو کچھ بیان ہو رہا ہے' وہ ایک حقیقت ہے۔ ایسی حقیقت جیسے اس کے متعلق ہم خود بات کر رہے ہوں۔'' اور اس کے بعد پھر آگے اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن کریم تاریخی شہادتیں پیش کرتا ہے۔

یہ قرآن کریم کا انداز ہے۔ آگے وہ بات آتی ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الذٰریٰت کی آیت 23 تک ہم آئے ہیں۔ آئندہ ہم 24ویں آیت لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ[1]

---

[1] اے ہمارے نشوونما دینے والے! تُو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما' کہ تُو دل میں مچلنے والی آرزوؤں کو جانتا اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے، اس لیے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت کوشاں ہیں۔

تیسرا باب: سورة الذّٰرِیٰت (آیات 24 تا 47)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1982ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الذٰریٰت کی آیت 24 سے ہو رہا ہے: (51:24)۔ کبھی ہمارے شاعر کہا کرتے تھے کہ انسانوں کی قسمت افلاک کے تابع چلتی ہے:

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء ❶

ہمارے ہاں کوئی بھی انقلاب آیا ہے تو نظر آتا ہے کہ یہ آسمان ہم انسانوں کی روش کے تابع نہیں چلتا' جیسے اسے ہمارا کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔ یہ افلاک اب کیا ہیں اور کھڑی پل کے بعد کیا ہو جائیں گے' ان کا پتہ نہیں چلتا' مثلاً اب آسمان کا بھی پتہ نہیں' گھنٹہ بھر پہلے جس زور سے یہاں بارش ہو رہی تھی' ہمارا خیال تھا کہ آج شاید درس کا ناغہ کرنا پڑے' اور اب دھوپ کی وجہ سے شامیانے لگانے پڑ رہے ہیں' تو ہمارا مزاج بہت طاقتور ہے۔ یہ آسمان تک کو متاثر کیے جا رہا ہے۔ عزیزانِ من! درس کا جیسے میں نے عرض کیا ہے' آغاز آیت 24 سے ہو رہا ہے۔ یہ سورۃ 51 ویں ہے۔

قرآنِ حکیم مکافاتِ عمل کے قانون کی متعین طور پر بار بار وضاحت پیش کرتا ہے اور جنسی بدنہادی کی بھی

سابقہ آیات میں قرآن حکیم کا جو انداز ہے' وہ ساری بات قرآنی تعلیم میں نکتے کی ہے۔ وہ قانونِ مکافاتِ عمل ہے: انسان کے ہر عمل کا ایک متعین نتیجہ ہوتا ہے اور اسے ہی وہ بہ دلائل وشواہد سمجھاتا چلا جاتا ہے۔ سابقہ آیات میں اس نے خارجی کائنات کے مختلف شواہد پیش کیے کہ تم دیکھو کہ کس طرح ایک خاص عمل اسی قسم کا متعین نتیجہ مرتب کرتا ہے اور پھر جیسا کہ اس کا انداز ہے' یہ تو دلائل تھے۔ اب وہ اقوامِ سابقہ کی داستانوں کو' ان کے مآل اور انجام کے' شواہد کو پیش کرتا ہے۔ جیسا کہ قریب قریب ہر درس میں یہ دہرایا جاتا ہے' یہ داستانیں کوئی تاریخ کے نصاب کے طور پر پیش نہیں کی جاتیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا' اس قسم کی روش اختیار کی' اس کا یہ نتیجہ نکلا' جب اور جہاں بھی کوئی قوم اسی قسم کی روش اختیار کرے گی اور ایسا ہی نظام قائم کرے گی' اس کا نتیجہ بھی یہی نکلے گا۔ یہ ہے مقصود ان داستانوں کے بار بار دہرانے کا کہ تم دیکھ لو کہ تم کس روش پہ چل رہے ہو' تمہارا نظام کیسا ہے' اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی' ہم کسی کی خاطر اپنی روش کو نہیں بدلیں گے: لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (35:43)۔ یہ ہے مقصد ان داستانوں کے دہرانے کا۔

خارجی کائنات کے دلائل پیش کرنے کے بعد پھر قرآن کریم نے تاریخی شواہد پیش کیے ہیں۔ آنے والی چند آیات کے اندر قریباً قریباً یہ جتنے بھی اقوامِ سابقہ کا ذکر قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر آیا ہے' وہ ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا گیا ہے یعنی ان آیات میں زیادہ تفصیل نہیں بیان کی گئی کیونکہ ان کی تفاصیل تو مختلف مقامات پر اس نے بڑی شرح وبسط سے بیان کی ہوئی ہیں۔ ان کو یکجا کیا

---

❶ اس کا دوسرا مصرع ہے: جسے دیکھو یہی کہتا ہے ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

جائے تو وہ ہر ایک قوم کی پوری مسلسل تاریخ بن جاتی ہے۔ دوسرے مقامات پر وہ صرف کچھ اشارہ کرتے ہوئے آگے چلا جاتا ہے۔ بات وہ قومِ لوط سے شروع کرتا ہے۔ وہ جوان کے ہاں جنسی بدنہادی Sex Perversion تھی' میں اسے اشارے میں ہی بات کروں گا۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ چیز انفرادی نہیں ہوتی کہ اس تقاضے کی' جس طرح سے جی چاہے' تسکین کر لی جائے' اس کے لیے حدود مقرر ہیں۔ جو حدود فراموش قوم ہے' وہ بالآخر تباہ ہو کر رہتی ہے۔

حضرت لوطؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی باہمی ملاقات کا تذکرہ اور صاحبِ علم بیٹے کی حضرت ابراہیمؑ کو خوشخبری

جہاں بھی قومِ لوط کا ذکر آیا ہے' اس کی ابتدا قرآنِ کریم میں حضرتِ ابراہیم کے واقعہ سے ہی کی ہے کہ وہ راستے میں پڑتے تھے اور یہ جو حضرتِ لوطؑ کی طرف خدا کے فرستادہ گئے تھے' وہ پہلے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو مل کر آگے پہنچے تھے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے وطن سے ہجرت کی ہے تو ان کے ساتھ حضرتِ لوطؑ بھی آئے تھے' وہ ایمان لے آئے ہوئے تھے اور ابھی نبوت سے سرفراز نہیں ہوئے تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ آپ علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور وہ آپ علیہ السلام کے ساتھ ہی آئے۔ یہ جسے آج ہم Dead Sea (بحرِ منجمد) کہتے ہیں' یہ تمام اقوام فلسطین کے علاقوں کے گرد و پیش ہی تھیں اور وہاں تمام انبیائے کرام آئے تھے' اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' فلسطین کے ان علاقوں میں' جو شام کے ساتھ ملتا ہے' Settle (سکونت پذیر) ہو گئے یا یوں کہیے کہ شام کے علاقوں کے اندر رہائش پذیر تھے۔ وہاں سے اپنے ایک بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو' انہوں نے حجاز میں بسایا اور یہاں انہوں نے بیت اللہ کی بنیاد رکھی تو یہ کھنڈرات راستے میں پڑتے تھے۔

یہ اس دور کا ذکر ہے جب حضرتِ لوط علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہو چکے تھے اور حضرتِ ابراہیم علیہ السلام' ادھر شام کے علاقے میں تھے۔ قرآن کریم یوں ذکر کرتا ہے کہ اس کے فرستادہ' جو حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف گئے تھے' وہ راستے میں حضرتِ ابراہیم علیہ السلام سے ملتے ہوئے گئے اور اس کے لیے بھی یونہی راستے میں وہ ملتے ہوئے نہیں گئے۔ ان کے ذمے ایک اہم فریضہ تھا' ایک خوشخبری تھی جو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو دینی تھی۔ کہا کہ هَلْ اَتٰـکَ حَدِیۡثُ ضَیۡفِ اِبۡرٰهِیۡمَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ (51:24) اے رسول! کیا تمہیں ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا جو بڑے ہی معزز تھے' کا ذکر بھی معلوم ہے؟ ان کے متعلق قرآن حکیم کا بات بیان کرنے کا یہ انداز ہے۔ کہا کہ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ (51:25) قرآنِ کریم کی تعلیم کا انداز اور ملخص یہی ہے کہ ہر انسان دوسرے انسان کی سلامتی کا خواہاں ہو' اور سلماً بڑا ہی جامع لفظ ہے' اس میں ایک طرف حفاظت (Protection) امن ہے اور دوسری چیز صلاحیتوں کی نشو و نما اور برومندی ہے' ان صلاحیتوں کو تکمیل تک پہنچانا ہے۔ ایک لفظ کے اندر یہ دونوں معنی آ جاتے ہیں اور اس کے علاوہ بھی معنی ہیں۔ قرآن حمید نے انبیائے

کرامؑ کے متعلق بھی کہا' خدا بھی ان کو سلٰمٌ علیہ کہتا ہے' وہ آپس میں بھی یہی کہتے ہیں' وہ جو دوسرے افراد سے ملتے ہیں' وہ بھی یہی کہتے ہیں' ہمیں بھی یہی سکھایا گیا ہے کہ جب ملیے تو کہیے: السلام علیکم! یہ بڑی جامع چیز ہے اور اُدھر سے جواب آتا ہے: وعلیکم السلام- اور اب ہماری ہر زندگی کی طرح یہ بھی ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو سلام علیکم کہتے ہیں تاکہ ذرا قریب آئے تو میں جلدی سے گلا گھونٹ سکوں۔

''جب وہ آئے تو انہوں نے سلماً کہا' انہوں نے جواب میں بھی کہا سَلٰمٌ''۔

عزیزانِ من! آگے آیا ہے کہ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ (51:25) وہ کوئی جانے پہچانے ہوئے لوگ نہیں تھے' اجنبی تھے' حضرت ابراہیمؑ پہچان نہیں سکے کہ کون ہیں لیکن پہچانے نہ بھی جائیں بہرحال مہمان تو تھے' اجنبی بھی مہمان تھے اور وہ انہیں کچھ اوپرے سے معلوم ہوئے۔ کہا ہے کہ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ (51:26) چنانچہ وہ گھر میں گئے اور وہاں سے اس زمانے کی جو ضیافت تھی' جو دعوت تھی' وہ گوشت پہ ہی ان لوگوں کا گزارا تھا اور بہترین ضیافت گوشت کی ہی ہوتی تھی۔ وہ گھر میں گئے اور ایک بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے کر آ گئے۔ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ (51:27) وہ ان کو پیش کیا کہ کھایئے اور انہوں نے نہ کر دی کہ نہیں شکریہ! ہم نہیں کھاتے۔ تو یہ جو ان کا انداز تھا' اس سے انہیں کوئی ایسا احساس ہوا کہ انہوں نے کچھ یگانگت کا ثبوت نہیں دیا' مہمان بن کر آئے تھے تو مہمان کا تو طریقہ یہ تھا' کہ کچھ تھوڑی سی یگانگت ہوتی۔ تو یہ ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے اس انداز سے ایسا ردِعمل کیوں ظاہر کیا ہے؟ اس لیے انہیں کچھ اس کا احساس پیدا ہوا۔ آگے کہا ہے کہ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ (51:28) وہ بھی اندازے سے پہچان گئے کہ ان کو کچھ تردد ہوا ہے۔ کہا کہ کچھ تردد کی بات نہیں ہے' کہ جی! سیدھی سی بات ہے کہ ہمیں بھوک نہیں ہے' تردد کی بات نہیں ہے۔ ہم دشمن نہیں' دوست ہیں۔ ہم خدا کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے کہا کہ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ (51:28) ہم تمہیں ایک ایسے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو بڑا صاحب علم ہوگا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے کی عمر میں اولاد کی خبر کوئی معجزہ نہ تھا

عزیزانِ من! حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن حمید میں دوسرے مقام پہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اچھی خاصی' بڑھاپے تک کی عمر آ گئی ہوئی تھی اور ابھی ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تھی اور یہ بھی ہے کہ اگر پہلا بیٹا حضرتِ اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوا تھا تو اس کے چودہ سال بعد تک پھر دوسرا بیٹا نہیں پیدا ہوا۔ حضرتِ اسحاق علیہ السلام دوسرے بیٹے تھے اور وہ چودہ سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ ممکن ہے یہ کچھ ناامیدی کی چیز بھی ہو۔ جو بھی صورت ہو تو انہوں نے ایک لڑکے کی بشارت دی اور کہا کہ وہ عَلِيْمٍ (51:28) ہوگا یعنی وہ بیٹا بھی بہت صاحبِ علم ہوگا فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ (51:29) بیوی نے سنا تو اس نے جیسے کہتے

ہیں کہ ہائے میری توبہ! اس بڑھاپے کے اندر اولاد کی بات تم کر رہے ہو؟ کیا کہہ رہے ہو؟ یعنی جیسے عام طور پہ یہ کہتا ہے کہ یہ تو کچھ شرم کی سی بات ہے۔ اسی پچاسی سال کا یہ بوڑھا' میں ستر پچھتر سال کی بوڑھی اور تم میرے متعلق کہہ رہے ہو کہ میرے ہاں اولاد ہوگی! کیا کہہ رہے ہو؟ آگے کہا ہے کہ قَالُوْا كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (51:30) انہوں نے کہا کہ یہ بات ہم اپنی طرف سے نہیں کہتے' یہ تو ایک پیغامِ خداوندی تھا جو ہم تم تک پہنچا رہے ہیں اور جب اس خدا نے یہ بات کہی ہے تو بہر حال یہ تو ایسے ہو کر رہے گی۔ یہاں دو الفاظ آئے ہیں۔ کہا ہے کہ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (51:30) یہ ہیں مقام جہاں قرآن حمید کے لیے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ یہ جواب کہ اس بڑھاپے میں بھی اولاد ہو رہی ہے تو یہ کوئی معجزہ نہیں ہے۔ معجزے میں حکمت کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ جو معجزے کا تصور ہے' وہ تو یہ ہے کہ یہ جتنے قاعدے قانون عام ہوتے ہیں' ان کو عاجز کرتا ہوا ایک واقعہ سرزد ہوتا ہے۔ معجزہ کے تو معنی ہی عقل کا عاجز آ جانا ہے کہ عقل سمجھ ہی نہ سکے کہ کیسے ہو گیا تو جو چیز ایسی ہو' اس میں دلائل اور حکمت کا کیا تعلق! خدا کے حکیم ہونے کا کیا تعلق! وہ علیم ہے' وہ جانتا ہے کہ اولاد کیوں نہیں ہو رہی' وہ حکیم ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو حکمت کی رو سے ہو جائے گی ورنہ یہ ہونا چاہیے کہ خدا اس پہ قادر ہے' جو چاہے کر سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں کہا۔

بڑھاپے کی عمر میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اولاد کی بشارت کے سلسلہ میں آپ کی بیوی کا اسی قسم کا ذکر

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کس طرح سے یہاں یہ چیز سمجھا جاتا ہے اور یہ بات دوسرے مقام پہ آ چکی ہے۔ اسی قسم کا واقعہ حضرت ذکریاؑ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ ان کے ہاں بھی اولاد نہیں تھی' کبرسنی بھی تھی' انہیں بھی اسی طرح سے بشارت دی گئی' ان کا بھی ردِ عمل یہی تھا اور وہاں بھی یہی چیز تھی کہ حکمت سے کام لیا۔ اب آج کل کی اصطلاح میں واقعی حکمت اس کو کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا لفظ یا حکیم کا لفظ وہاں آتا ہے جہاں قاعدے قانون کے مطابق کوئی بات ہوتی ہے۔ وہاں قرآن حمید نے کیا کہا تھا؟ یہ کہ حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کیسے ہوئی۔ کہا کہ وَ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ (21:90) ان کی بیوی میں کوئی ایسا نقص تھا' بیماری تھی جس کی وجہ سے استقرارِ حمل نہیں ہو رہا تھا' اس کی اصلاح ہو گئی۔ کیا بات ہے! یہ قرآن حکیم ہے' ایک لفظ میں ساری گتھیاں سلجھا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ اَصْلَحْنَا (21:90) تو ٹھیک تھا کہ اس کی اصلاح ہو گئی۔ وہاں "لَهٗ" (21:90) ہے۔ خاوند میں کوئی نقص نہیں تھا اس کے لیے وہ اس قابل ہو گئی کہ استقرارِ حمل ہو جائے۔ یہ ہے اَصْلَحْنَا لَهٗ (21:90)۔ اب نظر آتا ہے کہ اس میں کوئی معجزے والی بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ ''اس کی اصلاح کر دی گئی' اس میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی''۔ خاوند تو ٹھیک ہی تھا' بھلا چنگا تھا: ''لَهٗ'' تو اس طرح سے اولاد پیدا ہو گئی اور یہاں بھی قرآنِ کریم میں حکیم العلیم کہا ہے۔ تو یہ اسی انداز کی کوئی چیز ہے۔ جیسے بھی ہے تفصیل تو قرآن حکیم نے نہیں دی لیکن خود

یہ چیز بتا رہی ہے کہ جیسے حضرتِ ذکریا علیہ السلام کے ضمن میں واقع ہوا تھا' یہ بھی کچھ اس قسم کی چیز ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضور کچھ فرشتوں کا کھانا کھانے کی روایات کا ماجرا اور تفسیروں میں کی جانے والی لاحاصل بحثوں کا معیار

عزیزانِ من! میں آگے بڑھنے سے پیشتر یہ عرض کر دوں کہ ہمارے ہاں بحثیں چلی ہوئی ہیں' اول تو یہی بحث چلی ہوئی ہے کہ وہ اولاد کیسے پیدا ہوگئی اور پھر یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ یہ آنے والے کون ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ وہ فرشتے تھے' ملائکہ تھے۔ اب یہ جو کہنے والے ہیں ان کے متعلق تو حیرت ہے کہ ہزار برس سے ہمارے ہاں یہ بات چلی آ رہی ہے کہ وہ فرشتے تھے' انسان کی شکل میں آئے' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا' انہوں نے کھانے سے انکار کیا' تو انسان کی شکل کے اندر آئے۔ کہا گیا کہ انہوں نے اس لیے انکار کیا تھا کہ وہ فرشتے تھے' فرشتے کھانا نہیں کھاتے' یعنی فرشتے انسان کی شکل میں تو آ جاتے ہیں لیکن کھانا نہیں کھاتے۔ اس میں تو کسی دلیل دینے کی ضرورت ہی نہیں' قرآن حکیم نے دیگر مقامات پر رسول ﷺ اور صحابہؓ سے ملائکہ کے متعلق خود کہا ہے کہ وہ نظر نہیں آیا کرتے۔ مجھے تو عزیزانِ من! حیرت ہوتی ہے ان چیزوں سے کہ اتنی لمبی چوڑی بحثیں ہیں' یہ صرف اس لیے ہے کہ ان کے سامنے قرآن حکیم نہیں ہے' وہ قرآن حکیم کی طرف نہیں جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی تفسیر لکھی جا رہی ہے اور قرآن حکیم کے اس مقام کو کوئی سامنے نہیں لایا جب کہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے اور بحثیں جاری ہیں کہ صاحب! وہ کون تھے' کس شکل میں تھے' کیوں آئے تھے' انسان تھے تو انسانوں کی کیسی شکل تھی؟ یہ بحثیں چلی ہوئی ہیں۔ پہلے تو عزیزانِ من! یہ سوچیے کہ دین سے اس سوال کا کیا تعلق ہے کہ وہ کون تھے آج ہم سے اس کا واسطہ کیا ہے کہ وہ کون تھے۔ قرآنِ کریم نے ان کو مرسلین کہا ہے' رُسل کہا ہے' جسے خدا کے فرستادہ کہتے ہیں' وہ بھیجے ہوئے تھے' قاصد تھے۔ رسول کا لفظ تو آتا ہی قاصد کے لیے ہے اور رسول' قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ انسان ہوتے تھے' بشر ہوتے تھے تو ٹھیک ہے کوئی بشر تھے۔ اب یہ بیٹھ کر کیا متعین کرنا اور پھر متعین کرنے کے لیے بحثوں میں پڑ جانا کہ وہ کون تھے' بشر نہیں ہو سکتے تھے کہ انہوں نے یہ بشارت اپنی طرف سے کی' خدا نے نہیں دیکھا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا رہے ہیں' اپنی طرف سے بشارت نہیں کی تھی' ملائکہ تھے۔ اب بحث شروع ہوگئی کہ ملائکہ بشکل انسانی آ سکتے ہیں کہ نہیں؟ چل بھئی! چلے ہوئے ہیں' کتابوں پہ کتابیں لکھی جا رہی ہیں' تفسیروں پہ تفسیریں لکھی جا رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر آپ یہ چیز مان لیں تو اس کے دین پر' اس کے ایمان پر' ہماری زندگی پر' کیا فرق پڑا۔

ہم تو ہزار برس سے Out of the Text (نصاب سے ورے) سوالوں کا حل تلاش کرنے میں مصروف ہیں: ویلی جٹّی اُن ویلے

قرآن کریم تو آیا ہی زندگیاں سنوارنے کے لیے ہے' انسان کو صحیح نظام دینے کے لیے ہے' کتنی بحثوں کے بعد اگر کسی نے یہ چیز مان بھی لی تو اس سے کیا فرق پڑا۔ ہمارا ایمان یہ ہے کہ خدا نے کہا ہے۔ وہ ہمارے فرستادہ تھے' بھیجے ہوئے تھے' پیغامبر تھے' وہ گئے تھے۔ اللہ اللہ خیر سلا' اس سے زیادہ تو وہ پوچھے گا ہی نہیں صاحب! اور قرآن کریم کہتا ہے کہ ان چیزوں کے متعلق تم سے پوچھیں گے ہی نہیں' مگر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! اس کا کیا اعتبار کہ لڑکوں کو امتحان میں Questions (سوالات) Out of the Text (نصاب کے باہر سے) بھی تو آجاتے ہیں پھر اس کے بعد Agitation (شورش) ہوتی ہیں۔ یہ اس لیے کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ پوچھ بیٹھے تو ہمیں اپنی طرف سے تو تیاری کر کے جانا چاہیے تو جناب! جواب دینے کی یہ تیاری ہو رہی ہے۔

عزیزانِ من! آج ہم اس چیز کو کچھ تھوڑا سا مذاق کے طور پہ ہی لیتے ہیں کہ پھر ہزار برس تک یہ ہوتا کیا رہا ہے؟ بات بڑی سہل ہے۔ یہ ملوکیت کا نتیجہ تھا کہ جتنے معاملات تھے وہ تو سارے بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں رکھ لیے' انہیں مذہبی پیشواؤں کے گروپ کو ساتھ رکھنے کی ضرورت تھی' یہ بڑا کام دیتے ہیں' ساتھ میں ان کو رکھ لیا' وظائف لگ گئے' کھانے کو مل گیا۔ اب یہ کیا کریں؟ فیر او ہی پنجابی دا محاورہ کواں (پھر میں وہی پنجابی زبان کا محاورہ کہوں) کہ' ویلی جٹّی اون ویلے' انہاں نوں دیدتا چھوٹا جیا ویلنا۔ ہن کپاس تے کوئی ویلے' اے اون ویلدے رئے ہزار برس (کام' نہ کاج' فارغ جٹّی تو اون بیلے۔ انہوں نے انہیں ایک چھوٹا سا بیلنا تھما دیا۔ اب کپاس تو بیلے (کہ بنولہ الگ ہو جائے) مگر یہ ہیں کہ ہزار برس سے اون ہی بیل رہے ہیں)۔ یہ آپ کے ہاں کتابوں سے لائبریریوں پہ لائبریریاں بھری ہوئی ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ختم ہی نہیں ہوتیں' یہ اس ہزار برس میں اتنی ہیں اور ان میں دیکھو کہ وہ سارا کچھ جو ہے' اک وڑیواں نظر نئیں کتے اوندا ساری اون ای ویلی ہوئی ہیگی (مگر کہیں دانے کا ایک بنولہ بھی نظر نہیں۔ انہوں نے ساری اون ہی بیلی ہوئی ہے)۔

دین کے نام پر نو نو سال کے کورس کی تیاری کے ماحصل کا نتیجہ

عزیزانِ من! اگر کوئی یہ بات سمجھ نہ سکے تو وہ اپنے ساتھ والے کسی بھائی سے پوچھ لے کہ میں نے کہا کیا ہے۔ یہ سارا کچھ اس طرح ہی ہے اور یہ سارے علوم جو آج پڑھائے جاتے ہیں' یہ نو سال تک پڑھاتے ہیں۔ اٹھارہ علوم ہیں۔ یہ سارے اون ویلنے کے اوپر ہیں' تو اب بساطِ دنیا کا جو کوئی اور کام نہ رہا' تو انہوں نے یہی کچھ کرنا تھا (اور کرنا) ہے۔

65ء کی جنگ میں پاک فوج کی فتح کا راز: ''کھان پین دے کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے''

افوہ! یہ کیا بات یاد آ گئی' صاحب! ایک ان پڑھ زمیندار فوج کا صوبیدار میجر یاد آ گیا۔ پھر ستمبر کا مہینہ آ رہا ہے' پھر 65ء کی جنگ یاد آ رہی ہے' جسے اس ناشکری قوم نے اس طرح سے فراموش کیا ہے اور خود بھگت رہے ہیں۔ میں 1965ء میں انڈیا اور پاکستان کی جنگ کے بعد ان میدانوں کو دیکھنے کے لیے گیا تھا' جہاں ان شہداء کے خون کی داستانیں رقم تھیں اور پھر ان کا ذکر طلوعِ اسلام میں ''پاکستان کی نئی زیارت گاہیں'' کے عنوان سے شائع کیا۔ میں حلّو' اٹاری وغیرہ کے مقام پہ گیا۔ ویسے تو صلح ہو چکی تھی' اس وقت فتح کے بعد جنگ تو نہیں تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہاں اس کنارے کے اوپر ایک سپاہیوں کی ٹکڑی (گروہ) تھی اور اس کا ایک کمانڈر صوبیدار میجر تھا' دوسری طرف سامنے ہندوؤں کی پلٹن تھی لیکن جنگ نہیں تھی۔ میں ان سب سے باتیں کرتا تھا۔ یہ بڑی معرکے کی جنگ تھی جو 65ء میں لڑی گئی تھی' جس میں تین دن اور تین راتیں مسلسل ایک منٹ کے وقفہ کے بغیر یہ جنگ ان سپاہیوں نے لڑی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ کے سپاہی تین دن کی متواتر جنگ لڑے! کہنے لگے! جی ہاں! ہم ہی تھے۔ وہ تو یونہی میں نے پوچھ لیا کہ تین دن تین راتیں آپ لڑتے رہے تو اس دوران کچھ کھانے پینے کا کیا کیا۔ عزیزانِ من! اس ان پڑھ صوبیدار میجر سپاہی نے مجھ سے جو کہا' وہ ایک نہ بھولنے والی داستان ہے۔ کہنے لگا: ''میاں صاحب! اے کھان پین دے کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے'' اللہ اکبر! (یہ کھانے پینے کے کام تو فارغ لوگوں کے ہوتے ہیں) ارسطو بھی یہ بات نہیں کہہ سکتا جو وہ دو لفظوں میں کہہ گیا کہ ''کم ویلیاں دے ہوندے ہیگے'' (یہ کام تو فارغ لوگوں کے ہوتے ہیں)۔ کہنے لگے کہ ''چنوں کی ٹوکری بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھی' پانی کی وہ کپی بھی ہوتی تھی مگر اس کی فرصت کسے تھی کہ سوچے کہ چنا کھائے یا کھانا کھائے''۔ ارے! کس کو فرصت تھی کہ وہ اس چیز کو دیکھتا۔ ''بلبل نے پھول سے کیا کہا؟ پھول نے کیا جواب دیا' صبا کیا کہتی ہوئی گزر گئی؟'' یہ جاننے کی کسے فرصت تھی!''

نو نو سال کے بعد فارغ التحصیل ہونے والوں کے مابین بحثیں اور مُرسلین کا انتباہ

عزیزانِ من! یہ تو بس یوں کہو کہ ''ویلی جٹی اُن ویلے'' اور ہم کو انہی بحثوں کے اندر الجھا دیا۔ سارے علوم جو آج پڑھائے جا رہے ہیں' جن کے بعد یہ فارغ التحصیل ہو کر عالم کا درجہ لیتے ہیں' وہ یہ تعلیم ہوتی ہے' یہ بحثیں ہوتی ہیں جو انہوں نے پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے تھے' وہ جو خدا کے فرستادہ تھے' انہوں نے وہاں یہ بات کہی تھی اور خدا نے کہا ہے کہ وہ بشارت ہم نے دی تھی اور ہم جانتے تھے کہ تمہارے ہاں پہلے اولاد کیوں نہیں ہوئی تھی اور اب تم میں یہ صلاحیت کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔

اب ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ وہ خدا کے رسول ہیں اور کسی خاص مہم کے لیے آئے ہیں اس لیے کہا کہ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ (51:31)۔دیکھیے! یہاں قرآن حمید میں مرسلون کا لفظ آیا ہے۔اس نے پوچھا کہ اے خدا کے بھیجے ہوئے قاصدو! تم کس مشن پہ آئے ہو؟ کیا محض مجھ سے ملنے آئے ہو؟ کہا گیا کہ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ o لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ o مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ(34-33-51:32)انہوں نے کہا کہ ہم حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف جارہے ہیں یا قوم لوط علیہ السلام کی طرف جارہے ہیں یا قوم لوط علیہ السلام کی بستیوں کی طرف جارہے ہیں۔وہ انسانیت سوز جرم میں حد سے بڑھ گئی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ قرآن حمید میں اسے لواطت کہتے ہیں اور میں نے کہا تھا کہ اب ہمیں یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔اس لفظ سے حضرتِ لوط علیہ السلام کی طرف ذہن چلا جاتا ہے۔یہ ہے Homo Sexuality[1]۔ان کی تباہی کے دن آگئے ہوئے ہیں۔انہوں نے کہا کہ ان کے اوپر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوگی' وہاں وہ یہ سمجھا رہے ہیں کہ جو لوگ حضرتِ لوط علیہ السلام پر ایمان لائے ہوئے ہیں ان میں اطلاع دیدی جائے کہ وہ اس سے پہلے اس بستی سے نکل جائیں' چلے جائیں۔

جرائم اور آفاقی آفتوں کا تعلق' قومِ لوطؑ کا گھرانہ اور کھنڈرات بطور سامانِ عبرت

عزیزانِ من! آگے مختلف اقوام کا ذکر آتا ہے' وہاں پہنچنے پر میں یہ عرض کروں گا کہ اس فعلِ بدنہادی کا اور پتھروں سے لائی جانے والی اس تباہی کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ فلاں قوم نے اس قسم کے جرائم کیے تو جھکڑ آیا' وہ تباہ ہوگئے' فلاں نے اس قسم کے کیے تو سیلاب آیا' وہ تباہ ہوگئے' فلاں نے ایسا کیا تو زلزلہ آیا' وہ تباہ ہوگئے۔ان دونوں میں تعلق کیا ہے یعنی ان کے ان اخلاقی جرائم کا یا مظلوم پر ظلم وستم کا اور آفاقی آفتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے اور جس طریق سے وہ تباہ ہوئے ہیں اس کا اخلاقی جرائم سے کیا تعلق ہے؟ کہا کہ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ (51:36) اس ساری بستی میں ایک ہی گھر تھا جو خدا کے قوانین کو صحیح مانتا تھا' اس پہ ایمان لایا تھا' اس کے سامنے جھکا ہوا تھا' ایک ہی گھرانہ تھا' ایک ہی گھر تھا اور وہ حضرتِ لوط علیہ السلام کا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ(51:36) کے معنی وہی ایک ہاؤس نہیں ہوسکتا۔وہ یہی ہے کہ وہ ایک مرکز' ایک گھرانہ' ایک خاندان تھا کیونکہ یہ جو حضرتِ لوطؑ کا گھر تھا' اس میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ انؑ کی بیوی بھی خلاف تھی۔میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس گھرانے کی تو خود حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی مخالفین میں سے تھی' اس لیے وہ بھی ان کے ساتھ ہی تباہ ہوگئی تھی اور خیر! کہا ہے کہ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ(51:36) ایک ہی

---

[1] جرمیات کی اصطلاح میں اسے Crimen innominatum کہتے ہیں۔مثلاً Buggery اور Sodomy۔آج اس کی نئی شکل Lesbian اور Gays کی صورت میں بھی آئی ہے۔یہ تمام Homo Sexuality کی ہی صورتیں ہیں اور ان کا اثر اقوام کے کلچر پر پڑتا ہے۔

گھرانہ تھا جو پوری بستی میں اسلام لایا ہوا تھا۔ کہا کہ وَتَرَكْنَا فِيهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (51:37) اس واقعہ میں جو اس بستی کے کھنڈرات پر منقوش چلا آ رہا ہے' ان لوگوں کے لیے عبرت و موعظت کا سامان ہے جو غلط روش زندگی کے الم انگیز انجام سے ڈرتے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں بیان کردہ تاریخی واقعات کا مقصد ثبوت کے طور پر حقائق کو سچ ثابت کرنا ہے

عزیزانِ من! اب یہ ہوا مقصد اس داستان کے بیان کرنے کا کہ جو بعد میں آنے والے ہیں' وہ اس سے عبرت پکڑیں کہ اس قسم کے معائب اور جرائم کا نتیجہ تباہی ہوا کرتا ہے۔ بات اتنی ہے جو قرآن حکیم نے بتانی ہے۔ واقعہ تاریخ کا بیان کرتا ہے کہ محسوس شواہد سے بات جلدی سمجھ میں آ جاتی ہے اور زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے کئی دفعہ یہ بتایا ہے کہ قرآن حکیم نے انہی اقوام کا اس لیے ذکر کیا کہ یہ عرب ان راستوں سے دن رات گزرتے تھے اور وہاں ان قوموں کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات پڑے ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں انہی کی کیا کرتے تھے' ان کے ہاں ان قوموں کا عام چرچا تھا۔ یہ ان کے سامنے کی بات ہے' اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مقامات پہ کہا ہے کہ تم وہاں سے دن رات گزرتے ہو' تو دیکھو! ان اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں پر' ان کی کیا داستانِ عبرت لکھی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم کہانیوں کی طرح ان داستانوں کو دہراتے رہتے ہو۔ ان کہانیوں کا جو اصل مقصد ہے' وہاں نہیں پہنچتے' تو یہی کچھ اگر تمہارے ہاں ہوا تو یہی انجام تمہارا ابھی ہو جائے گا۔ یہ ہے جو وَتَرَكْنَا فِيهَآ (51:37) آیا تھا۔ یہ ہے اصل مقصد داستان کے دہرانے کا کہ آنے والوں کے لیے ہم نے ایک پیغامِ عبرت رکھا ہے کہ وہ سوچیں کہ ایسی روش کا نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے اور محض اتفاقی یا ہنگامی طور پہ نہیں ہو جاتا' یہ Not By Chance ہوتا ہے' خدا کے مقرر کردہ قانونِ مکافات کے مطابق ایسا ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے' ہمیشہ ایسا ہوگا۔ یہ میں نے قومِ لوط کے متعلق کہا ہے کہ اس سورۃ میں' ان آیات میں' تفصیل نہیں دی اور تفصیل چونکہ مختلف مقامات پر ہمارے سامنے آ چکی ہے' آگے بھی آئے گی' اس لیے میں بھی ان اشاروں تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھتا ہوں ورنہ ایک ایک کی تفصیل میں جاؤں تو اس میں تو پھر دو دو چار چار دروس لگ جائیں گے۔ وہ تفصیل اپنے مقام پہ سامنے آ بھی ہے ہیں اور سامنے آتی بھی رہے گی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام' فرعون کے دربار میں اپنے محکم دلائل کے ساتھ: یہ جادوگری نہیں تھی

عزیزانِ من! ہر نبی کی طرح پھر قومِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آ گیا۔ کہا کہ وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ [1] (51:38) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو واضح کھلے ہوئے دلائل دے کر فرعون کی طرف بھیجا۔ اب اتنے سے یہ بات یہاں سمجھ میں آ گئی کہ وہ جو

---

[1] اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں بھی (اربابِ بصیرت کے لیے حقیقت بنی کی) نشانیاں ہیں۔ جب ہم نے اسے' فرعون کی طرف' واضح دلائل وقوانین دے کر بھیجا (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔ 1225)۔

ہمارے ذہن میں ہے کہ وہاں جادوگری کا کوئی کھیل تھا اور وہ عصا پھینکتے تھے تو وہ اژدھا بن گیا' ہاتھ دکھایا تو وہ چاند کی طرح چمکنے لگ گیا اور سامنے سے بھی وہ جادوگر تھے اور میدان میں جادوگری کا کھیل تھا۔ یہ جو بات تھی کہ اِدھر سے انہوں نے جادو کا کھیل کھیلا' اُدھر سے خدا کا ایک اولوالعزم پیغمبر بھی جادو کا کھیل کھیل رہا تھا اور یہ زیادہ زبردست جادوگر ہوا۔ تو یہ ہوا خدا کے پیغمبر کا کام' جس کو خدا نے خود کہا تھا کہ ہم نے تیری تربیت بچپن سے آج تک کی ہے اس لیے کہ ہمیں تجھے ایک بہت بڑی مہم پہ بھیجنا ہے تو کیا یہ ساری کی ساری مہم جادوگری کا کھیل تھی اور اللہ تعالیٰ ساری عمر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جادو سکھاتے رہے؟ عزیزانِ من! یہ چیزیں اپنے مقام پہ آ چکی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اتنا بڑا جادو تھا کہ یہ کامیاب ہو گئے جبکہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جادوگر جدھر سے جی چاہے آ جائے' کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن یہ تو جادو کو کامیاب کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ فرعون کے سامنے بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ (51:38) دلائل لے کر گئے تھے۔ ہر نبی اپنے پیغام کو دلائل اور براہین کی رو سے پیش کرتا ہے۔

یہ آج کی بات نہیں ہے' اس دور کی بھی ہے' جو ابھی جہالت کا دور تھا۔ عام طور پہ قومیں اس کی واقف نہیں تھیں' نبی پہلے دن سے دلیل سے بات کرتا تھا۔ خدا نے ہر نبی کے متعلق کہا ہے کہ وہ دلائل پیش کرتا تھا اور وہ مقابلے میں دھاندلی کرتے تھے اور پھر آخر میں ہم نبی اکرم ﷺ کے اس دور میں آئے ہیں۔ اتنا تو کم از کم آپ دیکھیے' یہاں تو یہ ہوا کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کے زمانے میں سیلاب آ گیا تو وہ قوم ڈوب گئی۔ حضرتِ لوط علیہ السلام کے زمانے میں پتھراؤ ہو گیا تو وہ قوم برباد ہو گئی' جو قوم عاد تھی تو وہاں زلزلہ آیا' جو قومِ ثمود تھی اس وقت جھکڑ چلا' وہ تباہ ہوئی تو یہ اگر اسی طریقے سے' ان کے جرائم کے بدلے میں' ان کو سزا دینے کے یا تباہ کرنے کے انداز تھے تو نبی اکرم ﷺ کا پورا دور ہمارے سامنے ہے' اس میں تو کوئی بات بھی معجزانہ نہیں ہوئی۔

جنگِ اُحد میں شکست کی وجوہات اور پھر فتح کی نوید

حضور ﷺ کی مدینے کی زندگی میں سات سال تک چھوٹی موٹی جھڑپوں اور بڑی بڑی جنگوں کی صورت میں بیاسی لڑائیاں لڑی گئیں۔ ان میں کامیابی بھی ہوئی اور شکست بھی ہوئی۔ حضور ﷺ خود زخمی ہو گئے' جنگِ احد کے اندر تو چھلنی ہو گئے' کہہ رہے ہیں کہ تیر یوں چبھے ہوئے تھے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے پہ ہوتی ہیں۔ صحابہؓ نے دیوار بن کر' کھڑے ہو کر بچایا تھا۔ بیٹی زخم بھرنے کے لیے مرہم لگانے آئی تھیں۔ وہاں شکست ہوئی ہے' قرآن کریم نے شکست کا ذکر کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ بھئی! شکست اس لیے ہوئی کہ تم نے اپنے کمانڈر کی جو ہدایات تھیں' ان کو نظرانداز کر دیا' جس مقام پہ اس نے تمہیں کھڑا کیا تھا اس مقام کو چھوڑ کر ادھر آ گئے' دشمن نے جگہ خالی دیکھی' وہ آ گیا اور یہ کہا گیا کہ گھبراؤ نہیں' یہ جو بات ہے اسے دیکھو کہ ایسا کرنے سے یہ ہوتا ہے' آئندہ ایسا نہ کرنا' ورنہ پھر ایسی شکست ہو جائے گی۔

شکست بھی اس لیے ہوتی تھی کہ Strategy (حکمت عملی) میں کوئی غلطی ہو جاتی تھی' اس لیے دشمن کو کامیابی ہوتی تھی۔ مدینے کے گرد حفاظت کے لیے خندق جسے وہ جنگِ خندق کہتے ہیں' عرب میں اس سے پہلے جنگ کی اس سٹریٹجی کو کوئی جانتا نہیں تھا' جب کوئی اور طریقہ نظر نہیں آیا تھا۔ قرآن حکیم نے حکم دیا ہے کہ اپنی سرحدوں پر طاقت ور رسالے رکھو کہ دشمن کو تمہاری طرف قدم بڑھانے کی جرأت ہی نہ ہو۔ یہ کوئی معجزہ نہیں ہو رہا تھا۔

قومِ نوح علیہ السلام کی تباہی کے اسباب اور اس سے محفوظ رہنے کا طریق

تو یہ بھی جو انبیاءؑ سابقہ کے زمانے میں ہم باتیں دیکھ رہے ہیں' وہ فطرت کے قوانین کی رو سے ہی ایسا ہوا۔ اب میں ابھی عرض کروں گا کہ پھر جرائم اور تباہی کی آفتوں' ان دونوں میں' تعلق کیا تھا؟ اب سیدھی سی بات یہ ہے ہر نبی کے سلسلے میں جو آتا ہے کہ ان پہ یہ تباہی آئی' تو وہاں یہ ہے کہ وہ جو ایمان لے آئے ہوئے تھے' ہم نے انہیں اس سے پیشتر ہی اطلاع دیدی اور وہ وہاں سے نکل گئے ورنہ ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اس بستی پہ پتھر برستے رہیں' یہ جتنے بھی فاسد اور گنہگار مجرم ہیں ان کو تو لگیں اور یہ جو ایمان والے ہیں ان کو وہ پتھر اور تیر نہ لگیں' وہ تو حضورِ نبی اکرم ﷺ کو بھی لگے' یہ ہوتے تو ان کو بھی لگتے' ان کو وہاں سے نکال لیا گویا طریقہ یہ ہے۔ پہلا ہی ذکر حضرتِ نوح علیہ السلام کا آتا ہے۔ یہ سیلاب آنے والی بات ہے۔ اس سے پیشتر نظر آتا ہے کہ وہ لوگ جانتے نہیں تھے کہ کشتی کسے کہتے ہیں۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم نے پہلی دفعہ نوحؑ کو یہ سکھایا کہ کشتی یوں بنائی جاتی ہے۔ وہ دور ایسا تھا کہ کشتی بنانا بھی خدا کی طرف سے وحی کے ذریعے ہوا تھا' یہ پہلے نہیں تھا۔ وہ کشتی بنا رہے تھے' یہ بتا رہے تھے کہ ایک سیلاب آنے والا ہے' اس میں اِسی سے بچا جائے گا' وہ مذاق کرتے تھے۔ اگر وہ' عزیزانِ من! ان کو مذاق نہ کرتے' Seriously (سنجیدگی سے) لیتے اور وہ بھی کشتی بنانے لگ جاتے تو وہ بھی بچ جاتے۔ بچایا تو کشتی نے ہے۔ جس کے پاس کشتی ہوگی' وہ بچ جائے گا۔

حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنے کافر بیٹے کو آواز دی تھی کہ آ جاؤ' تم بھی یوں بچ جاؤ۔ یہ تو الگ بات ہے کہ اسی نے انکار کر دیا ورنہ وہ آتا' کشتی میں بیٹھ جاتا' وہ بھی بچ جاتا' نہیں بیٹھا ہے تو ڈوب گیا ہے۔ میں ابھی عرض کروں گا کہ پھر ان دونوں میں تعلق کیا ہے؟ کہا ہے کہ فَتَوَلّٰی بِرُکۡنِہٖ وَقَالَ سٰحِرٌ اَوۡ مَجۡنُوۡنٌ (51:39) انہوں نے اپنی قوت سے' انانیت سے' اس میں اعراض برتا کہ میں بہت بڑا ہوں' تمہاری بات کیوں مانوں' تم تو غلام قوم کے فرد ہو' اس کے فائدے کی بات کر رہے' اس کے بچنے کی' تباہی سے محفوظ رہنے کی' بات کر رہے ہیں۔ اس نے نہیں مانا' انانیت میں نہیں مانا' قوت کے زور پہ نشے میں تھا' وہ بات نہیں سمجھنے کی کوشش کی۔ کہا کہ یہ مذاق کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہ یا تو اپنے دعوے میں بہت بڑا جھوٹا ہے' یاد رکھیے! عربی زبان میں ''سحر'' کے معنی جادو ہی نہیں ہوتا' باطل کے لیے بھی یہ لفظ آتا

ہے' جھوٹ کے لیے بھی آتا ہے' کذب کے لیے بھی آتا ہے' ہر بناوٹی چیز کے لیے بھی آتا ہے۔ کہا کہ یہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے یا تو دانستہ جھوٹ بولتا ہے یا یہ پاگل ہوگیا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اب! تم تباہ ہوجاؤ گے یہ جو تمہاری قوم غلام ہے' یہ صاحبِ قدرت ہوجائے گی۔ کہتے کہ یہ پاگل کی بات نہیں تو اور کس کی بات ہوسکتی ہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے سوچتے' جو کچھ یہ کہہ رہے تھے تو بچ جاتے۔ آگے کہا کہ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِی الْیَمِّ وَهُوَ مُلِیْمٌ (51:40) تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے کان ہی نہیں دھرا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں' کہ تمہاری تباہی آجائے گی' قوت کے زور میں' اس نشے میں' بدمست رہے' نتیجہ یہ ہوا۔ غلط چال چلی' یہ تو پار لگ گئے' وہ ڈوب گئے۔

قومِ عاد اور قومِ ثمود کے غلط نظامِ حیات کا نتیجہ: قوت کا نشہ

قومِ عاد کا بھی واقعہ تم کو معلوم ہے۔ کہا کہ وَفِیْ عَادٍ اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الرِّیْحَ الْعَقِیْمَ o مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْهِ اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِیْمِ (42-51:41) ایک جھکڑ چلا' ایک ہوا چلی' ہلاکت انگیز آندھی آئی۔ یہ تباہ کرنے والی تھی' اس نے کسی چیز کو چھوڑا ہی نہیں ہے۔ وہ جس پہ سے گزری اسے چورا چورا کر کے رکھ دیا۔ آگے کہا کہ وَفِیْ ثَمُوْدَ اِذْ قِیْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِیْنٍ (51:43) اور ثمود کے وقت میں بھی یہ کیفیت ہوئی۔ ان کو وارننگ دی تھی کہ باز آجاؤ' تمہارے پاس تھوڑا سا وقت ہے' بچ جاؤ گے۔ کہا کہ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ یَنْظُرُوْنَ (51:44) انہوں نے بھی سرکشی برتی' مذاق سمجھا کہ کیا کہہ رہے ہیں' ہم کیسے تباہ ہوسکتے ہیں؟ قوت کے نشے میں ہر شخص یہی کہہ رہا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! کہ ہم کیسے تباہ ہوسکتے ہیں؟ اسی دور میں' اسی زمانے میں' جن کے پاس یہ قوت نہیں ہوتی' یعنی جو اس نشے میں نہیں ہوتے' وہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ تباہی آرہی ہے' انہیں تو نظر آتا ہے' مگر یہ کچھ کر نہیں سکتے۔ انہیں اسی سے کہنا ہوتا ہے' وہ اس نشے میں ہوتا ہے اور جو نشے میں ہوتا ہے' وہ تو کوئی سمجھ کی بات مانتا ہی نہیں ہے۔ ہر شرابی کے نشے کو دیکھیے!' نشے کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو میں نہیں کہتا' ہم کہتا ہے: ''اوئے اسی وڈے ہونے آں۔ اوا پنے آپ نوں ''اسیں'' کہن لگ پیندا اے۔'' (اب! ہم بڑے طاقتور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ''ہم'' کہنے لگ جاتے ہیں)۔

دولت اور قوت کے نشہ نے انسان کو اَنا اور انی کے فرق کو محسوس کرنے سے ہمیشہ محروم رکھا ہے

جب بھی کوئی دوسرے کو ''تو'' اور اپنے آپ کو ''ہم'' کہنے لگ جائے تو سمجھ لیجیے کہ یہ نشے میں ہے' پھر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کہتا ہے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) یہ تھا فرعون۔ وہ ''انی'' بھی نہیں کہہ رہا۔ وہ ''انا'' کہہ رہا ہے۔ خدا ہوا' صرف خدا کو وہ طاقت حاصل ہے' وہ اپنے آپ کو ''انا'' کہتا ہے لیکن وہ بھی جب بندوں کے ساتھ بات کرتا ہے' ان کے ساتھ برتتا ہے تو اپنے آپ کو ''انی'' کہتا ہے' یہ ان کو ''انا'' نہیں کہتا ''انی'' اور ''انا'' میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ قرآن کریم کے انداز عجیب ہیں۔ پھر انا کہنے والے لوگ

ہوتے ہیں۔ کہا ہے کہ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ (51:45) کیا بات کہی ہے کہ ان کے غلط نظام سے ان بدمستوں کی یہ کیفیت ہوگئی۔ یہاں دو الفاظ ہیں' عزیزانِ من! کہ نہ تو اتنی قوت رہی کہ اپنے پاؤں پہ کھڑے رہ سکیں اور جنہیں سمجھ رکھا تھا کہ ایسے وقت میں وہ ہمیں مدد دیں گے' نہ ان کی صاحب! کوئی مدد پہ آیا۔

ظہورِ نتائج کے وقت کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہوتا

عزیزانِ من! یہ باتیں دو ہزار سال یا چار ہزار سال پہلے کی نہیں ہو رہیں' ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے۔ کہا کہ نہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی سکت رہی اور جن کے متعلق سمجھتے تھے کہ وہ بچا لیں گے نہ وہ بچانے کے لیے آئے۔ بنگال[1] میں ہی وہ جو بیڑا کہہ رہے تھے' سات دن تک اِدھر سے اُدھر تیرتا رہا اور مشرقی پاکستان بصورتِ بنگلہ دیش آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ یہ جو مدد دینے کے وعدہ کرتے ہیں وہ تو اس وقت' پھر یہ آپ خود Calculate (حساب کتاب) کرتے ہیں کہ ہمارا فائدہ کس میں ہے۔ آپ کو قائم رکھنے میں ان کا فائدہ ہوتا ہے تو آپ کو مدد دیتے ہیں' اگر اپنا غلام بنانا ہوتا ہے تو ہر قسم کی مدد دیتے چلے جاتے ہیں' قربانی دا بکرا بندا تریا جا' (قربانی کا بکرا بنتے چلے جاؤ)۔ اگر وہ دیکھتے ہیں کہ نہیں' ادھر اس کو ٹھوا ہی دینا چاہیے ادھر زیادہ فائدہ ہے' اُدھر کر دیتے ہیں۔

انسانی زندگی کا جوہر خود اعتمادی کی بنیاد پر استطاعت پیدا کرنے میں مضمر ہے

کیا بات کہی ہے کہ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ (51:45)۔ ''استطاعت'' کے معنی ہیں: اپنے طور پر خود کھڑے ہونے کی طاقت۔ کہا کہ انہوں نے اپنے طور پر خود کھڑے ہونے کی استطاعت نہ پیدا کی اور جنہیں سمجھتے تھے کہ ایسے وقت میں وہ ہماری مدد کو پہنچ کر بچا لیں گے' ایسے میں کسی نے آواز تک نہیں دی۔ کیوں کسی نے مدد نہیں کی؟ یہ بات تو پرانے دور کی نہیں یہ تو ہر دور کی داستان ہے۔ کہا ہے کہ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (51:46) اور سب سے پہلے جو قوم نوح علیہ السلام سے بات شروع ہوئی تھی تو کیا جرم تھا ان کا؟ یہ کہ انہوں نے معاشی طبقات پیدا کر دیئے ہوئے تھے۔ یہ عجیب بات ہے یہ پہلا نبی' پہلی قوم' پہلی داستان ہے اور بات قرآن حکیم شروع کرتا ہے طبقات کی تقسیم سے کہ ان کے ہاں کے جو دولت مند طبقات تھے' سردار تھے' وہ سردار وہی بن جاتے تھے جو جاگیردار اور دولت مند ہوتے تھے' وہ کہتے تھے کہ یہ جو کام کرنے والے' جن کو ہم کمّی کہتے ہیں' ہم بھی گاؤں میں ان کو کمی کہا کرتے تھے' وہ کمی سے ذرا آگے چلے تو کمین ہوگئے' یہ تمہارے ہاں کا جو کام کرنے والا طبقہ ہے' یہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اندازہ لگایئے کس قدر Perversion (بدنہادی) ہوتی ہے کہ کام کرنے والا نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ گاؤں میں کمّی کام کرنے والے کو کہتے تھے

---

[1] یہ 1971ء کی جنگ میں امریکا کے اس بحری بیڑے کی طرف اشارہ ہے جو اس نے سات دن کے اندر بھیجنے کا کہا تھا۔

اور وہ پست درجے کے سمجھے جاتے تھے۔

طبقاتی تفریق تو انسان کو انسانیت کے مقام سے متعارف ہی نہیں ہونے دیتی

عزیزانِ من! آج بھی میرا خیال ہے گاؤں میں یہ ہوگا۔ میرے زمانے میں تو یہی ہوتا تھا' اُس دور میں بھی یہ بات تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ کمّی ہیں' یہ کام کرنے والے ہیں' یہ ہمارے مقابل میں کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ تھا۔ یہ نہیں کہ جو بات تم کہتے ہو وہ غلط ہے' ہم اسے نہیں مانتے۔ کہتے تھے کہ یہ جو چیز ہے کہ یہ بھی ہمارے برابر آ کر بیٹھ جائیں' ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ اس قوم کی تباہی کس طریق سے آئی؟ استعارۃً کہوں گا کہ پانی کے سیلاب سے اور پانی تو پھر گڑھے کو اور اونچ و نیچ کو برابر کر دیا کرتا ہے۔ اس میں تو پھر کمّی اور سردار برابر کر دیئے' وہاں کمی تو بچ گئے۔ یہ کیسے بچے؟ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے۔ اگر یہ معجزے سے بچنا ہوتا تو پھر کشتی بنانے کے کیا معنی ہوئے؟ کشتی کے ذریعے بچنا ہے تو مومن اور کافر دونوں بچ سکتے ہیں۔ وہ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو کافر بیٹے کو آواز دے رہے تھے کہ آ جاؤ۔ وہ بیٹھ جاتا تو بچ جاتا۔ وہ خود نہیں بیٹھا تو بات تو آج بھی ہمارے لیے تباہیوں کے سیلاب سے بچنے کے لیے یہ ہے کہ جو قبل از وقت کشتیاں بنا لیتے ہیں وہ تو بچ جاتے ہیں اور جو اس وقت اپنے عیش و عشرت میں اور کھیل تماشے اور عیاشی میں' اپنی مفاد پرستیوں میں' لگے رہتے ہیں' کشتیوں کی فکر نہیں کرتے تو پھر

سیلاب نہ پُرسد درِ میخانہ کجاست

عزیزانِ من! یہ بڑا عمدہ مصرع ہے۔ سیلاب آتا ہے تو یہ آ کر نہیں پوچھتا کہ جی! دروازہ کہاں ہے جو میں وہاں سے داخل ہو جاؤں' وہ دروازہ نہیں پوچھا کرتا: سُیلاب نہ پُرسد در میخانہ کجاسب۔ وہ سب کو برابر کر دیتا ہے۔

وحی کی روشنی میں تعمیر کردہ معاشرتی بند قوموں کو سیلاب کی تباہی سے محفوظ کر دیتا ہے: قرآنِ حکیم کا ایک سنہری اصول

آخر میں آ کر قرآن حمید نے یہ بات کہی کہ جو قوم سیلاب کی آمد سے پہلے کشتیاں بنا لیتی ہے' وہ تباہی سے بچ جاتی ہے۔ اب تو خود بیٹھ کر سوچ لو کہ کس قسم کے سیلاب آنے والے ہیں اور تم نے اس سے بچنے کے لیے کیسی کشتیاں بنانی ہیں لیکن وہ کہتا یہ ہے کہ جو قوم بھی ان مقاصد کو چھوڑ کر عیش و عشرت میں پڑ جائے' قوت کے نشے میں پڑ جائے' انانیت کا شکار ہو جائے' وہ مدہوش ہو جاتی ہے اور یہ جو ساری قوم کی بات ہے' وہ یہ نہیں کرتا۔ وہ تو بڑی پتے کی بات کہتا ہے۔

غالباً حضرت صالح علیہ السلام نے ہی یہ کہا تھا یا حضرت ھود علیہ السلام نے یہ کہا تھا' دونوں ❶ میں سے ایک نے کہا تھا کہ یا اللہ! یہ تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے' میں ان کی اصلاح کیسے کر سکوں گا۔ اس قوم کی اتنی بڑی تعداد ہے' اس قدر یہ بگڑی ہوئی قوم ہے' ان میں خرابیاں ہی خرابیاں ہیں' تو میں کس طرح ان کی اصلاح کروں گا۔ کہا گیا کہ یہ ساری قوم کی بات نہیں' دارالخلافے میں نو بدمعاش ❶ اکٹھے ہوئے بیٹھے ہیں' ان کا انتظام کر دو تو ساری قوم ٹھیک ہو جائے گی' قوم تو ان کی وجہ سے بگڑتی ہے۔ کیا کیا باتیں نہیں بتا گیا قرآن حکیم! یہ ہے بات لیکن جب یہ انہیں ٹھیک نہیں کرتی' یہ ساتھ تباہ ہوتے ہیں تو پھر قرآن کریم یہ بھی کہتا ہے کہ یہ جہنم میں کہیں گے کہ بارِالٰہا! انہوں نے ہمیں تباہ کیا تھا' انہیں دگنی سزا دے' ہمیں کیوں سزا دی جا رہی ہے' ہم تو بے بس تھے۔ انہوں نے تباہ کیا تھا۔ جواب ملے گا کہ ان کو جو قوت حاصل تھی' وہ کس کی بدولت حاصل تھی؟ وہ تمہاری ہی دی ہوئی قوت تھی جو انہیں حاصل تھی ورنہ ان کے تو دو ہی بازو تھے' اگر تم ان کی تقدیر کا سامان نہ بنتے تو یہ کیا کر سکتے تھے' تم ذریعہ ہوان تمام خرابیوں کا جو ان کے ہاتھوں سے برپا ہوئی ہیں۔ اس لیے تمہیں بھی وہی سزا ملے گی' جو ملتی ہے۔ ٹھیک ہے:

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

یہ کوئی Excuse (بہانہ) نہیں ہے کہ ہم نہیں۔ قرآن کریم ان داستانوں کو' عزیزانِ من! اس لیے دہراتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیزیں جنہیں ہم فطرت کے حوادث کہتے ہیں یعنی یہ سیلاب' جھکڑ' تیز ہوائیں' زلزلے' آتے رہتے ہیں۔ جو قومیں قبل از وقت ان کے متعلق انتظام کر لیتی ہیں وہ ان سے بچتی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جن قوموں کے اکابرین اپنی مفاد پرستیوں میں پڑے رہیں' اپنی عیش پسندیوں میں پڑے رہیں' اپنی ہی وہ چالیں چلتے رہیں' وہ اپنی بساط پر ہی اس میں منہمک رہتے ہیں تو پھر انتظامات کے معاملے میں' یہ کام نہیں دیتیں۔ بعض اوقات' وہ ادھر سے غافل ہو جاتے ہیں' اس کو Neglect (فراموش) کر دیتے ہیں تو تباہی آ جاتی ہے۔

قومِ سبا کی تباہی کی وجۂ جواز

ارم کی جو قومِ سبا کے معاملے میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس قوم کی اچھی بھلی زراعتی اکانومی (معیشت) تھی' ان کی زراعت کے بڑے اچھے باغات تھے' لہلاتی ہوئی بڑی عمدہ کھیتیاں تھیں۔ انہوں نے ڈیم بنا رکھے تھے' ان میں وہ پانی اسٹور کرتے تھے' ان سے یہ سارا

---

❶ یہ حضرت صالح علیہ السلام تھے۔ کہا ہے کہ (27:48-49) اور (دیکھو) شہر میں نو آدمی تھے جو (ہمیشہ) ملک میں فساد برپا کرتے تھے اور (کبھی) اصلاح (کا خیال) نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے (آپس میں مشورہ کیا اور) کہا کہ ایک دوسرے کے سامنے خدا کی قسم کھا لو کہ ہم رات کو اس پر اور اس کے گھر والوں پر یکبارگی حملہ (کر کے انہیں قتل کر دیں گے اور) پھر (جب پوچھ گچھ ہو گی تو) ہم اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موجود نہیں تھے (نہ ہمیں اس بارے میں کوئی خبر ہے) اور ہم (اپنے اس بیان میں بالکل) سچے ہیں! (پرویزؒ: جوئے نور (1994)' ص 77۔

کچھ ہوتا تھا' بڑی خوشحال قوم تھی۔ قرآنِ حکیم کہنے لگا کہ ان میں جو ہوس آئی تو انہوں نے کہا کہ صاحب! یہ دور دراز تک ہم باہر کیوں نہ چلے جائیں مثال کے طور پر ابوظہبی میں اور قطر میں کیوں نہ چلے جائیں تو انہوں نے تجارت کے لمبے لمبے راستے اختیار کر لیے اور وہ ڈیم اسی طرح کمزور رہنے دیئے اور یہ آپ لگ گئے اس ہوس کے اندر۔ باہر جانے لگ گئے' ڈیم کی مرمت نہ کی' یہ ایک دم جو ایک ہلہ آیا ہے' اس نے بند توڑ کر رکھ دیئے تو کہنے لگے کہ وہ ہلّہ سارے کا سارا ہی بہا کر لے گیا اور یہ اس تجارت میں لگے رہے۔ یہ بتاتا ہے قرآن حمید۔ یہ تھے وہ ارم کے لوگ!

قومِ مسلم کی عملی تفسیر اور اس کا سدِ باب

عزیزانِ من! یہ وہ جرائم تھے جن کی وجہ سے یہ قومیں ان طریقوں سے تباہ ہوتی تھیں۔ یہ کوئی معجزے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تو ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ تباہیاں بھی قانون کے مطابق آتی ہیں۔ ان سے بچا جا سکتا ہے اگر حفاظت کے سامنے کر لو۔ حفاظت کے سامان کرنے کی صورت میں وہ کہتا ہے کہ یہ ہوتے ہیں۔ جب اربابِ نظام ہر وقت اس فکر میں رہیں کہ قوم کس طرح سے محفوظ رہ سکتی ہے' تباہیوں سے کس طرح حفاظت کا سامان بہم پہنچایا جا سکتا ہے' وہ اپنے آپ کو اس چیز میں لگائے رکھیں تو فطرت کی طرف سے یہ چیزیں آتی نہیں ہیں لہٰذا آج بھی جن قوموں نے اپنے انتظام کر رکھے ہیں' وہ آپ دیکھیے کیسے بچے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہی حال ہے' ان[1] کے پاس چپہ بھر زمین نہیں ہے' وہ سمندر کو پیچھے دھکیل کر لیے جاتے ہیں اور وہاں انہوں نے تختوں سے بند لگائے ہوئے ہیں کہ کہیں پانی نہ آنے پائے اور ایک مملکت بسا رکھی ہے۔ وہ سمندر کے پانی کو نہیں آنے دیتے۔ ساڈے کولوں لئی دا نالہ جیہڑا ہیگا اے راولپنڈی دا' او سنبھالیا نئیں جاندا (ہمارے ہاں راولپنڈی میں جولئی کا نالہ ہے وہی سنبھالا نہیں جاتا)۔ اس سے کیپٹل سٹی تباہ ہو گیا ہے۔ ہم نے کہا کہ وہاں کونسا دریا ہے' ہم نے تو دیکھا ہے کہ دریا بھی کچھ نہیں ہے۔ کہنے لگے: جی! ایک نالہ بہتا ہے شہر کے بیچوں بیچ' وہ نالہ بہہ کر تباہ کر گیا۔ میں نے کہا کہ جس قوم کو نالہ تباہ کر کے لے جائے' اگے کہن والی گل ای نئیں خدا حافظ خدا کیویں حافظ ہو سکدا اے۔ (جس قوم کو نالہ تباہ کر کے رکھ دی تو پھر وہاں آگے کچھ کہنے کے لیے بچتا ہی نہیں ہے تو پھر ان کا خدا کیسے حفاظت کرنے والا ہو سکتا ہے)۔

عزیزانِ من! ہم سورۃ الذّٰریٰت کی آیت 47 تک آ گئے' 48ویں آیت سے پھر آگے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

---

[1] یہ اشارہ ہالینڈ کی طرف ہے۔

چوتھا باب: سورة الذّٰریٰت (آیات 48 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اگست 1982ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ الذٰریٰت کی آیت 47 سے ہو رہا ہے:

(51:48)۔

قرآنِ حکیم کی بنیادی تعلیم کا نکتۂ ماسکہ اور کائناتی شواہد کو پیش کرنے کا مقصد

قرآنِ کریم کی تعلیم کا نکتہ ماسکہ جسے آپ بنیادی پوائنٹ کہیں گے وہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل یعنی ہر کام ایک متعین نتیجہ پیدا کرتا ہے' اسی کو قانون کہتے ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ یہاں قانون کی کارفرمائی ہے۔ انسانوں کی دنیا میں' تو جیسے میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے' وہ جسے آپ محسوس کام کہتے ہیں وہی نہیں ہیں' بلکہ دل میں گزرنے والے خیال تک بھی اپنا نتیجہ مرتب کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کی بنیادی تعلیم یہ ہے: ایک تو وہ ایسے اقدار اور اصول دیتا ہے جو اس کی انفرادی انسانی زندگی اور اجتماعی زندگی میں قانون کا کام دیتے ہیں اور یہ جو اس کا نکتہ ماسکہ ہے کہ ہر عمل اپنا ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے' وہ اسے مختلف طریقوں سے سمجھاتا ہے۔

بنیادی طور پر قرآن حکیم کے سمجھانے کے دو انداز ہیں۔ ایک تو وہ خارجی کائنات کو پیش کرتا ہے کہ اس میں دیکھو! کس طرح قانون کی کارفرمائی ہے۔ ایک ذرے سے لے کر عظیم الشان کرّوں تک' خارجی کائنات کی ہر شئے' قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور یہ

جو محیر العقول، عظیم القدر، کائنات کا سلسلہ ہے، وہ اس حسن زینت سے چل رہا ہے تو وہ صرف اس لیے ہے کہ ان میں کبھی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ انہیں اس کا اختیار ہی نہیں ہے۔ تو وہ خارجی کائنات کے مختلف شواہد کو یہ بتانے کے لیے پیش کرتا ہے کہ یہ دیکھو! کس طرح سے ہر شے قانون کے مطابق عمل کرتی ہے اور ہر قانون کا نتیجہ کس طرح سے وہی ہوتا ہے (مثلاً) جب بھی آگ میں انگلی ڈالو، انگلی جل جاتی ہے اور درد ہوتا ہے۔ ایک تو اس کا یہ طریقہ ہے۔ اس کے بعد دوسرا طریقہ اور ہے اس لیے کہ وہ صرف انفرادی زندگی کے متعلق ہی تعلیم نہیں دیتا، درحقیقت اس کی تعلیم اجتماعی زندگی کے متعلق ہے کہ معاشرے کا نظام کس قسم کا ہے، تمہاری روشِ زیست اجتماعی زندگی میں کس قسم کی ہے اور اس کے لیے وہ جو قوانین دیتا ہے، اب ان کے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں، انہیں سمجھانے کے لیے بہرحال تاریخ ہی ایک ایسی چیز ہے، جسے سامنے لایا جا سکتا ہے اور اس کے لیے وہ اقوامِ سابقہ کے تاریخی شواہد کو سامنے لاتا ہے کہ یہ دیکھو! فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم کیا تو قوانینِ خداوندی کے مطابق اس کے نتائج کس قدر خوشگوار برآمد ہوئے، جس قوم نے ان کی خلاف ورزی کی، ان کے خلاف کام کیا، اس کے نتائج کتنے تباہ کن تھے۔ سارے قرآن کریم میں اگر یہ بنیادی حقیقت آپ کے سامنے ہو تو اس میں یہاں سے وہاں تک ایک ربط نظر آئے گا اور یہ بات نہیں کہ وہ یہاں باہر تو وہ ایک گیہوں کے دانے کی مثال بیان کرتا ہے اور اس کے بعد قومِ عاد کا ذکر چھیڑ دیتا ہے تو ہمارے ہاں تو یہ چیز چونکہ ذہن میں نہیں تھی کہ قرآن حکیم کی تعلیم کا انداز کیا ہے اس لیے یہ ہوا کہ جی! یہ بڑا ہی غیر مربوط ہے، اس میں تو کسی قسم کی ترتیب نہیں، کوئی ربط نہیں، کہیں دیکھیے آپ! وہ فصلوں کا ذکر ہو رہا ہے، کہیں آسمان کے ستاروں کا ذکر ہو رہا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ یہاں کیفیت یہ ہے کہ

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

کائنات کی تخلیق کے بعد اس پر کنٹرول اور پھر قدم قدم پر اس کی وسعت کا تذکرہ

ان میں ربط باہمی ایسا ہے کہ جیمز جینز، جو فلکیات کا سب سے بڑا ماہر کہلاتا ہے، کہتا ہے کہ میں ایک طرف جو انگلی ہلاتا ہوں تو اس کا اثر کہکشاں پہ بھی جا کر پڑتا ہے جبکہ دوسری چیز وہ تاریخی شواہد پیش کرتا ہے۔ اب آج کے درس میں آجایئے۔ پہلے اس نے، آپ کو یاد ہوگا کہ آسمانی کروں کی، بادلوں کی، بارش کی، فصلوں کی مثالیں پیش کی تھیں یا شہادات پیش کی تھیں۔ یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد وہ فوراً اقوامِ سابقہ کی طرف آ گیا۔ پچھلی آیات میں قومِ نوح، عاد، ثمود، قومِ لوط، یہ جو تمام اقوام تھیں، ان کے انجام کی بات ہوئی اور اسی طرح قرآن کریم نگاہ ڈالتا ہوا آگے چلا آیا، چنانچہ آخر میں قومِ نوح کے متعلق آخری آیت میں یہ ذکر آیا تھا اور یہ بتانے کے بعد الفرقان پھر اسی انداز میں کائناتی شواہد کی طرف آ گیا۔ کہا کہ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (51:47) اور یہاں پہلی مثالوں سے بھی بلند اور

بالاتر مثال دی کہ ان آسمانی کرّوں کو تم دیکھو کہ خدائے علیم وحکیم میں کتنی بڑی قوت اور قدرت ہے کہ جس نے ان کی تخلیق کی اور پھر ان پر کتنا بڑا کنٹرول ہے۔ یہ سائنسدان یا فلکیات کے ماہر تو یہ بتا رہے ہیں کہ اگر سورج کی رفتار میں ایک سیکنڈ کے کروڑویں حصے کا بھی فرق پیدا ہو جائے تو یہ سارا سلسلہ تہس نہس ہو کر رہ جائے۔ کہا کہ اتنی بڑی قوت ہے۔ یہاں قوت کے لیے قرآن کریم میں ویسے تو لفظ ''اید'' کا بھی آتا ہے لیکن یہاں لَمُوْسِعُوْنَ (51:47) ہے۔ یہ جو وسعت ہے اس کے لیے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی قوت' استطاعت' استعداد کے بھی آتے ہیں لیکن وسعت تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ Extension کے معنی میں بھی آتی ہے۔ یہاں تو موسعون لفظ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کی ایک صفت الواسع بھی آئی ہوئی ہے یعنی Extend کرنے والا۔ یہ چیز مغرب کے Scientist (سائنسدان) جان سکتے ہیں کہ قرآن کریم بات کیا کہہ گیا ہے۔ آج کی تھیوری ہے۔ کائنات کے متعلق ایک کتاب ہے' جس کا نام ہی This Extended Universe ہے۔ نظریہ یہ ہے کہ یہ کائنات کوئی جامد نہیں کہ جو کچھ بننا تھا بن چکا اور پھر اسی طرح سے ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کے اندر Evolution (ارتقائی منازل) طے ہیں۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ Extend (وسعت حاصل) کر رہی ہے' تو اگر یہ الواسع جو قرآن کریم نے کہا ہے Extestion (وسعت) کے متعلق لیا جائے' تو ایک لفظ کے اندر وہ کتنی بڑی حقیقت بیان کر جاتا ہے اور اسی لیے اس نے کہا ہے کہ جوں جوں علم انسانی ترقی کرتا چلا جائے گا' حقائق کائنات پر پڑے ہوئے پردے اٹھاتا جائے گا' تو ہر پردہ جو اٹھے گا' اس کے نیچے سے جو چیز Discover (بے نقاب) ہو کر سامنے آئے گی' وہ قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعوے کی شہادت بنے گی صاحب! آج اگر یہ چیز ہے کہ یہ Extended Universe ہے تو میں سمجھتا ہوں وہ لوگ اس چیز کو جانتے ہیں کہ یہ واقعاً کیا چیز ہے جو قرآن کریم نے کہہ دی ہے کہ یہ اس کائنات کے اندر Extension ہے وہ اس پر قادر تھا کہ اس نے ان کو اس طرح سے قانون کی زنجیروں میں جکڑا اور جو کائنات ہے پھر یہ Extend کر رہی ہے اس میں وسعت بھی ہے۔

شہادت کے طور پر اس کائنات کے قانون میں زمین کی نوعیت اور ہر شے میں زوج کا تصور

اب دیکھیے کیا چیزیں وہ شہادت میں پیش کرتا جا رہا ہے۔ کہا ہے کہ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ (51:48)۔ یہاں دو الفاظ ہیں۔ کیا بات ہے صاحب! کہ زمین گول ہونے کے باوجود بالکل پھیلی ہوئی' چپٹی نظر آ رہی ہے اور اسی وجہ سے تم اس پہ رہ رہے ہو۔ دوسرے مقام پہ اس نے یہ کہا ہوا ہے کہ یہ چکی کے پاٹ کی طرح گردش کرتی ہے لیکن یہاں دو الفاظ ہیں فَرَشْنٰهَا اور مٰهِدُوْنَ۔ فَرَشْنٰهَا تو صرف ایک چیز کے چپٹے ہوئے ہونے' پھیلے ہوئے ہونے' کے لیے آ سکتا ہے۔ فرش کے معنی جیسا آپ جانتے ہیں ہم ساری عمر اس زمین پہ چلتے رہیں' کبھی احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ گول ہے۔ اگلا لفظ ہے مٰهِدُوْنَ۔ آپ کو پتہ ہے کہ جو ''مهد'' ہے' وہ تو بچے کے پنگوڑے

کو کہتے ہیں' گہوارے کو کہتے ہیں۔اب یہ عربی زبان کا لفظ' میں نے عرض کیا ہے کہ یہ تو عربی زبان کا اعجاز ہے' پہلے تو یہ ہے کہ اس میں اتنی وسعت ہے پھر خدا کا الفاظ کا انتخاب ہے۔اب جو ''مھـــــد'' ہے آپ دیکھیے! ذرا پنگوڑے کو سامنے لائیے۔اس میں حرکت ہوتی ہے' جھولنا جھلایا جاتا ہے۔اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ سو جاتا ہے' اس کو آرام ملتا ہے ورنہ ہر حرکت ایسی ہے کہ اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ پنگوڑے کی حرکت ایسی ہے کہ اس میں بچے کو آرام ملتا ہے۔تو یہ جو عربی زبان میں ''مھـــد'' لفظ تھا تو وہ حرکت ایسی حرکت ہے کہ جس سے سکون اور آرام ملے۔اس میں وہ حرکت ہوتی ہے تو مٰھِـــدُوْنَ ہے۔ارض کو ہم نے ایسا بنایا کہ گول ہونے کے باوجود وہ چپٹی ہے اور اس پہ تم سکونت اختیار کر سکتے ہو۔اتنی تیز حرکت کے باوجود وہ تمہیں سکون اور اطمینان کے ساتھ' آسائشیں بھی مہیا کرتی ہے اور وہ مٰھِدُوْنَ ہے۔خدا کی طرف سے فَنِعْمَ الْمٰھِدُوْنَ (51:48) آیا ہے۔

قرآنِ کریم میں ایسے الفاظ آتے ہیں (مثلاً) احسن الخٰلقین یا یہ فَـنِـعْـمَ الْمٰھِدُوْنَ. احکم الحٰکمون کے معنی ہیں کہ وہ احسن الخٰلقین کے لحاظ سے نیچے کے درجے پر قوانین کے مطابق اور کو بھی خالق وغیرہ مانتا ہے لیکن وہ جس مقام پہ خدا ہے یا جس انداز کا وہ ہے' اس کی مثل کوئی نہیں ہوسکتی۔وہ بہترین مٰھِــدُوْنَ میں سے بہترین ہے' نعم' بلکہ بہترین کا بھی لفظ نہیں ہے۔میں کیا عرض کروں' ایک ایک لفظ پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔یہ نعم کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ کتنی زیادہ آسائشیں بہم پہنچانے والا' وہ مٰھِــدُوْنَ میں سے ہے' ارض کو اس قسم کا بنایا کہ چپٹی ہے' گول ہونے کے باوجود سکون اور آرام دیتی ہے' متحرک ہونے کے باوجود وہ بہترین ہے' خواہشیں بہم پہنچانے والا ہے۔یہ کیسے ہو رہا ہے؟ صرف اس لیے کہ یہ قانون کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔کہا ہے کہ وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ (51:49).

چودہ سو سال پیشتر یہ بات کہنا کہ ہر شے جو ہے' اس کی زوج ہے' Pair ہے' کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔یہ جو چیزیں سامنے نظر آتی تھیں ان میں تو وہ نر اور مادہ صرف دیکھ سکتے تھے لیکن قرآن کریم تو کل شیء کہتا ہے۔یہ کل شیء کے لیے زوجین چودہ سو سال پیشتر عرب کی سرزمین میں اور پھر نبوت سے پیشتر ہی سہی' ایک اُمی ہے اس دور کا کون انسان یہ کہہ سکتا ہے۔پوچھیے مغرب کے سائنسدانوں سے' جو ایسے مقام پہ پہنچ کر بے ساختہ پکار اٹھے ہیں کہ اس دور میں کوئی انسان یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔یہ کبھی انسانی بات نہیں ہوسکتی صاحب!

لفظ زوج کا لغوی مفہوم اور مرورِ زمانہ سے لسان میں معنی کا فرق

یہ جو زَوْجَیْـــنِ ہے' یہ صرف نر اور مادہ کی بات ہی نہیں ہے۔اب تو Scientists (سائنسدانوں) کی جو تحقیق ہے' وہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی سی چھوٹی چیزوں میں بھی جو زَوْجَیْـــنِ ہے اس کو پاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کو معلوم ہے کہ زوج کے معنی ہوتا ہے ایسی دو چیزیں کہ ان میں سے اگر ایک نہ ہو تو دوسری ناکارہ رہ جائے' دو مل کر ایک مقصد کو پورا کریں اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔اسے

کہتے ہیں عربی زبان میں زوج۔ بات آئے گی، ہمارے ہاں بیٹیاں بھی ہیں۔ یہاں تو زوجہ ہی ہوتی ہے یعنی وہ جو خاوند ہے، وہ زوج نہیں ہوتا، وہ تو میاں ہوتا ہے، اللہ بھی میاں ہوتا ہے خاوند بھی میاں ہوتا ہے، جبھی تو ہم اسے مجازی خدا کہتے ہیں۔ کبھی آپ نے خاوند کے لیے زوج کا لفظ نہیں سنا ہوگا۔ لیکن زوجہ ضرور ہوتی ہے۔ یہ ہر شے میں جو زوج کہتا ہے تو زوج کے معنی میاں بیوی یا نر اور مادہ ہی نہیں ہے، وہ دو چیزیں ہیں، جو ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنیں، ایک دوسرے کی نشوونما کا ذریعہ بنیں، تو اب آپ نے سمجھ لیا کہ جو اس نے میاں بیوی کو بھی زوج کہا ہے، تو اس زوج کے معنی کیا ہیں۔ یہاں تو کسی کی صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ بننے کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو میاں ہوتا ہے جو اس کی ساری صلاحیتوں کو دبا کر رکھتا ہے۔ یہی ہوتی ہے بیچاری، وہ اس کو زوجہ کہہ لیجیے کہ یہ اس کے لیے کچھ کرتی چلی جائے، وہ زوج ہوتا ہی نہیں ہے۔

آپ الفاظ میں دیکھیے کہ معاشرہ میں جو ذہنی تبدیلیاں آتی ہیں، ان سے معنی میں کیا فرق آتا ہے اور یہ چیز ہے جس کے لیے میں بار بار کہتا ہوں کہ قرآن کریم اُس وقت سمجھ میں آئے گا، جب قرآن کریم کے جو مفردات ہیں، ان کے وہ معنی سامنے آئیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں تھے اور عرب ان کا مفہوم لیا کرتے تھے۔ مرورِ زمانہ سے Language (لسان) کے اندر بڑا فرق پڑتا ہے۔ عربی زبان کے جو طالب علم ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے۔

عربی زبان پر عباسیوں کے دَور میں ایرانی چھاپ کے اثرات اور فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ کا قرآنی مفہوم

میرا خیال ہے کہ یہاں تو مرورِ زمانہ سے زبان کے مفردات میں، معانی کے تغیر کو As a Subject (بطور مضمون) پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ یہ تو بڑا اہم Subject (مضمون) ہے کہ زبانوں میں مرور زمانہ سے، ان کے الفاظ کے معنی میں، کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کی عربی وہ نہیں ہے جو اس زمانے کی عربی تھی اور معنی تو اس کے دوسری تیسری صدی ہجری میں ہی بگڑ گئے تھے جب آپ کے ہاں کے پہلے لغت اور تفاسیر عباسیوں کے زمانے (132-656AH/750-1258AH) میں مرتب ہوئی ہیں۔ اس زمانے میں، عربی زبان پر ساری ایرانی چھاپ آ گئی تھی۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے، قرآن کریم کے سمجھنے کا یہ طریقہ ہے۔

عزیزانِ من! زوجین اور یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ ہم کوئی سائنس کی کلاس نہیں لے رہے کہ ہم نے انہیں پڑھانا ہے تا کہ یہ سب کچھ امتحان پاس کر لیں۔ وہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (51:49) تا کہ تم حقیقت کو سامنے لے آؤ کہ یہ باتیں کیوں بیان کی جا رہی ہیں۔ یہ قانون کی کارفرمائی کے لیے ہے تا کہ تم اس چیز کو اچھی طرح سے سمجھ لو۔ اب سوال یہ ہے کہ سمجھنے کے بعد پھر کیا ہو؟ یہ کہ جی! میں نے سمجھ لیا۔ کہا کہ سمجھنے کے بعد فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ (51:50) پھر ہر نظام کو چھوڑ کر، جو نظام خداوندی ہے، اس کی طرف لپک کر جاؤ، اس

کی طرف دوڑ کر جاؤ' تیزی سے جاؤ' وقت نہ ضائع کرو' ایک ایک لمحہ تمہیں ہلاکت کی طرف لیے جا رہا ہے' یاد رکھو! کیا بات ہے ''ففروا'' کی! کہ دوڑ کر جاؤ۔ کہا کہ اس لیے یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے۔ حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلایا کہ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ (51:50)۔ یہ تین الفاظ ہیں کہ میری جو حیثیت ہے' میں تم پہ کوئی داروغہ نہیں مقرر کیا گیا۔ میں اس کے معاوضے میں تم سے کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں چاہتا۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ میں کیوں اپنی جان کھپا رہا ہوں؟ اس لیے کہ تم تباہی سے بچ جاؤ۔ یہ لَکُمْ ہے۔ یہ لَکُمْ عربی میں بہت سے معنی میں آتا ہے۔ یہ کسی کے فائدے کے لیے جو بات ہو' جو منفعت ہو' جس کو نافع کہیے یہ اس کو لَکُمْ کہتے ہیں۔ یہ تمہارے فائدے کی بات ہے جو میں کہہ رہا ہوں' تمہیں اس سے آگاہ کر رہا ہوں کہ اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ پھر اگلا حرف دیکھیے کہ میں یہ اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ مِّنْهُ (51:50) ہے کہ خدا کی طرف سے یہ باتیں ہیں' جو میں تمہیں بتا رہا ہوں اور تمہارے فائدے کی ہیں جو باتیں میں بتا رہا ہوں' تمہیں آگاہ کر رہا ہوں کہ اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا' اور ''مبین'' کا لفظ ہے کہ میں بالکل واضح انداز میں یہ کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے دعوے کے ثبوت اور شہادت میں کہہ رہا ہوں۔ اس سے واضح اور کیا ہوگا! وہ کہیں قوانینِ فطرت کو لا رہا ہے' کہیں تاریخی شواہد کو لا رہا ہے۔ تو یہ شواہد مبین ہیں' یہ اتنی بڑی ''مبین'' چیز ہے صاحب! کہا کہ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰهِ (51:50) اس کے نظام کے تابع زندگی بسر کرو' اس کے قوانین اور اقدار کے مطابق زندگی بسر کرو وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (51:51) اور اس کے ساتھ اور کسی صاحبِ اقتدار کو نہ ملاؤ' کسی اور کا اقتدار تسلیم نہ کرو' کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو۔

ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کے تراجم نے حقیقی تعلیم کو ہی بدل کر رکھ دیا ہے

میں نے عرض کیا تھا کہ جب الفاظ کے معنی میں تبدیلی آتی ہے تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ اب ہمارے ہاں عام طور پہ ترجمے ہی ہیں جن سے قرآنِ کریم سمجھا جاتا ہے۔ ترجمے سے نہ بھی سمجھیے' عربی زبان کی کتابوں میں بھی آپ دیکھیے تو معنی یہی ہوتے ہیں (مثلاً) اللہ کے معنی ہی معبود ہیں یا وہ جس کی پرستش کی جائے' جس کی Worship کی جائے۔ اب اللہ اگر پرستش (Worship) کے لیے ہو کہ پرستش اسی کی کرو' اس کے ساتھ کسی اور کی نہ کرو' تو ہر مسلمان مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں تو بتوں کے آگے جھکتا ہی نہیں' میں کسی اور کی پرستش نہیں کرتا۔ پرستش اُسی کی کرتے ہیں۔ اس اللہ کے معنی پرستش ہو گئے۔ او پوچھو اس زمانے کے عربوں سے کہ وہ اللہ کے معنی کیا لیتے تھے' وہ قرآن کریم سے پوچھو کہ اللہ کے معنی کیا ہیں؟ وہ ہیں جس کی محکومیت اختیار کی جائے' جس کا اقتدار تسلیم کیا جائے۔ کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرنی۔ یہ تو تذلیل انسانیت ہے۔ کس کی محکومیت اختیار کرے گا؟ اگر وہ Superstition ہے' جہالت ہے تو کائنات کے جو مظاہر ہیں وہ ان کی اختیار کرے گا (مثلاً) چاند سورج ستارے دریا' وہ بڑے بڑے درخت جیسے ہمارے ہاں پڑوس میں جو قوم بستی

ہے ان کی کیفیت یہ ہے، وہ ان کی پرستش کرتی ہے، دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے۔ اسی پرستش میں ہم نے خدا کی پرستش شروع کر دی۔ ایک ذہنی چیز ہے کہ ہم اس کی پرستش کر رہے ہیں لیکن اگر اس الٰہ کا صحیح مفہوم وہی ہوتا جو قرآن حمید دیتا ہے تو ہم صرف اس کی محکومیت اختیار کرتے ہیں، کسی انسان کی حکومت کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ کہاں سے کہاں بات چلی گئی! کہا ہے کہ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (51:51) کسی اور قوت کو خدا کا ہمسر نہ بناؤ اور اس کے بعد کہا کہ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (51:51)۔ اسے پھر دہرایا۔ پہلے تو یہ دہرایا کہ اس کی طرف لپک کر جاؤ، تیزی سے جاؤ، دوڑ کر جاؤ، دیر نہ کرو اور دوسرا یہ کہا کہ خالص اسی کی محکومیت اختیار کرو اور پھر کہا کہ میں تمہیں وارن کرتا ہوں اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار کی تو یہ بھی وجہ تذلیل انسانیت ہے اور اگر اس کے ساتھ تم نے کسی اور کو ملا لیا تو یہ چیز بھی شرک ہے اور ظلم عظیم ہے، پھر میں Warn کرتا ہوں۔ کہا کہ یہ سب کچھ میں کہتا ہوں اور اس کے باوجود میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے۔

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی مخالفت اور عقلِ انسانی کی فسوں کاری، کرامات اور معجزات

عزیزانِ من! یہاں آگے جو لفظ آیا ہے، وہ ہے کہ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ (51:52) میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہر رسول نے یہی کہا تھا جو میں کہہ رہا ہوں اور ہر رسول کے ساتھ یہ ہوا کہ یہ جو اس کے ہاں کے بڑے بڑے سردار اور جاگیردار اور دولتمند لوگ تھے، انہوں نے اس کی مخالفت کی اور مخالفت میں انہوں نے یہ کہا کہ یہ ساحر ہے یا مجنون ہے۔ اب سحر یا ساحر کے معنی ہمارے ہاں جادوگر لے لیے جاتے ہیں یعنی یہ جادوگر ہے یا پاگل ہے۔ سحر کے معنی جادو ہی نہیں ہوتے، سحر کے معنی باطل چیز کے بھی ہوتے ہیں، ہر وہ شے جو حقیقت میں کچھ ہو، دکھائی کچھ دے، یہ سحر ہے۔ فریب کاری اس کے معنی ہوتے ہیں، جھوٹا اس کے معنی ہوتے ہیں، ساحر کے معنی میں وہ یہ چیزیں کہتے تھے۔ اب ہمارے ہاں تو یہ ہوا کہ وہ چونکہ معجزات دکھاتے تھے اور معجزہ تو بالکل جادو ہوتا ہے، بات سمجھ میں ہی نہیں آتی، اس لیے وہ اس کو جادوگر کہتے تھے، وہ معجزات دکھاتے تھے۔ اس کے مقابلے میں ان کے ہاں کے جو لوگ تھے، وہ بھی یہ کچھ دکھاتے تھے تو اب الجھاؤ آ پڑا کہ کیا کیا جائے، رسول بھی وہی دکھاتا ہے، یہ بھی وہی دکھاتے ہیں۔ جس مقام پر پہنچ کر دینِ اسلام نے تصوف کی پٹڑی بدلی تھی، وہ یہی مقام تھا کہ تصوف کا انتہا بھی یہی ہے کہ کرامات دکھائی جاتی ہیں اور وہ جو بت پرست ہیں، ان کے ہاں جو کرامات ہوتی ہیں، وہ ان سے بھی بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ سحر نہیں۔

نبی اکرم ﷺ پر جادوگری کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کا فرمان اور ہمارے ہاں کے نظریات

عزیزانِ من! وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ یہ فریب دہی ہے، یہ جو دعویٰ کر رہا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، یہ فریب دہی ہے، یہ باطل ہے، یہ

جھوٹ ہے' یا تو یہ دانستہ جھوٹ بول رہا ہے' فریب کار ہے۔ معاذ اللہ۔ اور مجنون ہے یا یہ پاگل ہو گیا ہے' اس کا دماغ چل گیا ہے' اپنے آپ کو کہہ رہا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ یہ دیکھیے یہ جو لفظ ہے یہاں یہ بڑی اہم بات آ گئی۔ سحر کے معنی ہر جگہ آپ کو جادوگر ملیں گے' تو کہا یہ گیا کہ ہر رسول جو آیا' کفار نے اس کی تکذیب کی' اور اس کے خلاف یہ کہا کہ یہ جادوگر ہے' اور خدا نے یہ بات کہی کہ کتنا بڑا جھوٹا الزام تھا جو ان کے خلاف لگایا' تو کسی رسول کے متعلق کہنا کہ وہ جادوگر تھا' وہ جادو کرتا تھا جبکہ قرآن حمید بتا رہا ہے کہ یہ کفار کی طرف سے ان کے خلاف اعتراض کیا جاتا تھا' وہ خود یہ کچھ نہیں تھے اور یہاں بڑے دھڑلے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے ساحرین کا مقابلہ ہوا اور انہوں نے کچھ سحر دکھایا' جادو دکھایا' اور انہوں نے اس سے بھی زیادہ بڑا جادو دکھایا' اتنے بڑے رسولؑ کو خود ساحر تسلیم کر رہے ہیں اور قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ کفار کی طرف سے ان پر الزام دھرا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ساحر ہے۔ کوئی نہیں کھڑا ہو کر سوچتا' تو رسول' عزیزانِ من! اس قسم کے تماشے نہیں دکھاتے تھے۔ وہ جادوگری کی بات نہیں تھی' وہ تو حق کو پیش کرتے تھے اور وہ اسے کہتے تھے کہ یہ شخص یا تو فریب کار ہے یا یہ جھوٹا ہے اور یا اس کا دماغ چل گیا ہے۔ کہا کہ اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (51:53) بظاہر یوں نظر آئے گا جیسے ہر جانے والی نسل آنے والی نسل سے کہہ جاتی ہے کہ تمہیں یہ کہا جائے گا' اس کا یہ جواب دینا' ان کے فریب میں نہ آ جانا۔ یہ جس چیز کو' جھوٹ کو' باطل کو' تواتر کہا جاتا ہے' یہ اب سند آ گئی ہے۔

قرآنی اقدار کے برعکس تواتر کا تصور آنے والے دَور کے لیے سند بن جاتا ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں مذہب کی دنیا میں ایک سند تواتر کی بھی ہے کہ جیسا ہوتا چلا آ رہا ہے' وہ پھر سند ہو جاتا ہے یعنی ایک غلط چیز جو ہزار سال پہلے کسی نے اختیار کی' اگر ہر نسل اس کو اپنے آباؤ اجداد کا مذہب سمجھ کر تقلیداً اختیار کرتی چلی آ رہی ہے تو یہ جو تواتر سے یہ چیز آ رہی ہے' آخر میں آ کر یہ سند بن جاتی ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ یہ نظر آئے گا کہ جیسے ہر آنے والی نسل سے یہ کہہ دیتی تھی کہ تم نے ایسا کرنا اور وہ چلی جاتی تھی' وہ یہی کرنے لگ جائی۔ تقلیدِ اسلاف اسی کو تو کہتے ہیں کہ کسی دور کے' کسی انسانوں کے گروہ کی' اتنی بڑی شخصیت تسلیم کر لی اور پھر یہ ہے کہ انہوں نے جو کہا ہے' وہ آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے بغیر سوچے سمجھے' بغیر قرآن کریم کی سند پیش کیے ہوئے' وہ آگے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے' ہم تک آ گیا ہے صاحب! اس کے صحیح ہونے کی سند کیا ہے؟ کہ جی! سند تواتر ہے اور ہر دور کے جتنے بھی ان کے ہاں کے اکابر ہیں' اپنے دور کی نسل' اپنے دور کی قوم' اپنے دور کے مسلمانوں کے متعلق وہی رونا روتے ہیں جو آج ہم رو رہے ہیں کہ فاسق ہیں' فاجر ہیں' اسلام سے دور ہو گئے ہیں' ان کا کردار نہیں رہا' ان کا اخلاق نہیں رہا' ہر دور کے' کسی بھی دور کے جو کچھ لکھنے والے ہیں' اس دور کے کہنے والے ہیں' ان کے اقوال کو آپ دیکھیے۔ وہ اپنے دور کے مسلمانوں اور اپنے دور کی قوم پہ رو رہے ہیں اور یہی جو

قوم نسلاً بعد نسلاً چلی آ رہی ہے' ان کے اس عمل کو تواتر کہہ کر سند قرار دیا جاتا ہے۔ دین میں یا مذہب میں حق کے لیے یہ سچی بات ہوگئی کیوں کہ یہ تواتر ہے۔

تواتر پرستی کی بنیادی وجہ: قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے فائدہ اُٹھانا ہے

قرآن حکیم کہتا ہے کہ یوں نظر آتا ہے جیسے یہ متواتر اس قسم کی بات ایک نسل دوسری نسل سے کہتے چلی آ رہی ہے۔ کہا ہے کہ یہ بات نہیں ہے بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ (51:53) ہر نسل جو ہے وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنا چاہتی ہے کیونکہ ان کا مفاد ہی اس میں ہوتا ہے کہ قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کریں۔ اس میں یہ سرمایہ داری نہیں رہتی' ملوکیت نہیں رہتی' مذہبی پیشوائیت نہیں رہتی' پھر اس میں پھنے خاں نہیں بنا جا سکتا۔ اس میں طاغون کا ترجمہ یہی ہوسکتا ہے۔ قرآن حکیم نے یہی لفظ کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ہر نسل اور ہر دور کی قوم یہ دیکھتی ہے کہ ہمارا فائدہ اسی میں ہے کہ اس کی خلاف ورزی کی جائے۔ اصل میں تو بات یہ ہوتی ہے۔ وہ اس کے لیے سند بہم پہنچاتی ہے کہ یہ ہوتا چلا آ رہا ہے' اگر یہ چیز ایسی غلط ہوتی تو یہ کیوں ایسا کرتے یعنی خود کوئی دلیل نہیں دے سکتے۔ اس کے لیے دلیل یہ ہے کہ اگر یہ چیز غلط ہوتی کہ یہ ایسا کیوں کرتے' کیا سند ہے' یہ ارے! تم بتاؤ' یہ بات دلیل و برہان سے بتاؤ' سند سے بتاؤ کہ یہ بات صحیح ہے تو ٹھیک ہے' یہ کوئی سند ہے کہ اگر یہ غلط ہوتی تو یہ کیوں کرتے چلے آتے؟

مسلمانوں کی حکومتوں میں یزید کی فراہم کردہ ملوکیت کی بنیاد کا نتیجہ خدا کی کتاب سے دُوری ہے

ہماری ساری تاریخ' اسلام کے خلاف چلی آ رہی ہے۔ پوچھو تو ان کے ہاں پہلی چیز' یہ ملوکیت ہے۔ ملوکیت کے متعلق' جو میں بار بار کہا کرتا ہوں' پہلی چیز ان کے ہاں یہ ہے کہ ملوکیت کی جو بنیاد ڈالی' وہ یزید (م 64 ہجری بمطابق 683ء) نے ڈالی اور وہ آپ کو معلوم ہے کہ انہیں کن الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ یہ ہوا اور اس کے بعد یزید سے آج تک' یہ جتنی مسلمانوں کی مملکتیں' حکومتیں ہیں' یہ ساری ملوکیت کی حکومتیں ہیں' یہ تواتر سے چلی آئیں' تو دین بن گئیں اور پھر سند ہوگئی۔ تواتر کوئی سند نہیں ہے' عزیزانِ من! سند تو صرف خدا کی کتاب ہے' صرف ایک سند ہے کہ لَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (51:51) اس کے ساتھ کسی اور صاحبِ اقتدار کو ہمسر نہ بناؤ' اسے سند مت سمجھو' اس کی اتھارٹی کو قبول نہ کرو' اتھارٹی صرف خدا کی ہے۔ کہا کہ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ (51:54) تم ان کی اس قسم کی باتوں سے دل گرفتہ نہ ہو اور ان سے الگ ہٹ کر' اپنے پروگرام کی تکمیل میں منہمک رہو۔ اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا کیونکہ تم نے فریضہ تبلیغ ادا کر دیا۔

نبی کے نزدیک ہجرت اپنے اندر ایک بلندترین مقصد لیے ہوتی ہے: سونا ملی ریت کی مثال

عزیزانِ من! داعی کی زندگی کے اندر ایک مقام آجاتا ہے' جہاں یہ عجیب چیز ہے' وہ سان گر' لوہے کی قینچیاں استرے وغیرہ سان پہ لگاتا ہے تو اس میں سے لوہے کے ذرا ذرا سے ذرے اس ریت میں مل جاتے ہیں' جو اس کے نیچے گری ہوئی ہوتی ہے' تو اس ریت میں مقناطیس پھیرتے ہیں' اس سے لوہے کے ذرے اس کے ساتھ لگ جاتے ہیں' وہ لوہا الگ ہو جاتا ہے اور باقی ریت رہ جاتی ہے۔ یہ جو دریاؤں اور ندیوں میں سے سونا نکالتے ہیں' اس کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ ریت میں سے ذرے الگ کر لیتے ہیں۔ ایک داعی کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ نظر آتا ہے کہ اس لوہے کے ذرے ملی ہوئی ریت یا سونے میں ملی ہوئی ریت کے اندر وہ آتا ہے اور اس میں سے وہ دیکھتا ہے' کہ کہاں کہاں لوہے یا سونے کا ذرہ ہے' وہ اس میں سے نکالتا چلا جاتا ہے' اور ایک مقام پہ آ کر جب وہ دیکھتا ہے کہ اب باقی ریت ہی رہ گئی ہے' ذرے نہیں ہیں' تو پھر وہ اس مقام سے دوسرے مقام کی طرف چلا جاتا ہے۔ ہجرت Escapism (فراریت) نہیں ہے' وہ اس مشن کا ایک حصہ ہے اور یہ وہ مقام ہیں جہاں پہنچ کر قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ اب انہیں چھوڑ دو' اتنا عرصہ تم نے ان کے اندر اپنا سر کھپایا' یہ کچھ کیا' ان میں سے جو سعادت روحیں تھیں' جنہوں نے دلیل و برہان کی رو سے حقیقت کو تسلیم کرنا تھا' وہ سونے کے ذرے اس میں سے نکل آئے ہیں' آ گئے ہیں' اس مقناطیس کے گرد وہ لوہے کے ذرے جمع ہو گئے ہیں' اب یہ ریت ہی رہ گئی ہے۔ اب اسے چھوڑ دو اور پروگرام کا اپنا دوسرا حصہ شروع کرو۔

نبوت کے پروگرام کا دوسرا مرحلہ: حقائقِ قرآنِ کریم کو آخری وقت تک پہنچائے چلے جاؤ

اب عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی کے ساتھ کچھ تعلق قائم کرتے وقت یہ ہوتا ہے کہ صاحب! بڑی خوشگواری سے' حسنِ سلوک سے' تعلق قائم کرنا چاہیے۔ اب چھوڑتے وقت تو ہمیشہ جھگڑا ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف اگر الزامات سے آگے بڑھے' تو گالیوں تک نوبت آئی ہوئی ہوتی ہے۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ انہیں چھوڑ کر الگ ہو جاؤ لیکن چھوڑو بھی حسن کارانہ انداز سے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ او گل نہ کر کہ میری لگدی کسے نے نہ دیکھی' تے ٹٹدی نوں جگ ویکھدا'' (ابے! بات نہ کر' میری جب دل لگی ہوئی تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو' جب ٹوٹی تو دنیا نے دیکھا کہ کیا دھوم دہائی ہوئی) مگر قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جگ تماشہ نہ دیکھے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ چھوڑنا بھی ہو تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑنا۔ یہ تعلیمِ خداوندی اور شریعتِ نبوی ہی ہو سکتی ہے۔ حضور ﷺ نے واقعی ان کو چھوڑا تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑا' کسی سے ترش کلامی تک نہیں کی' کسی سے بدلہ تک نہیں لیا' اور دوسرے مقام پہ ہے کہ چھوڑنے کے بعد بھی یہ نہ کر کہ اب کچھ صحیح بات کے قابل ہی نہیں ہے تو بات پہنچایا ہی نہ کر' اس کے متعلق یونہی فیصلہ نہ کر لے کہ اب کوئی

بھی ان میں باقی نہیں رہا۔اس میں یہ ہے کہ اس کے باوجود تُو قرآن کریم کی آواز پہنچائے چلا جا۔اور وہاں یہ ہے تا کہ ایسا نہ ہوا کہ کوئی ایک جان، ایک نفس بھی، اس لیے ہلاک ہو جائے کہ اس تک قرآن کریم نہیں پہنچا تھا لہٰذا تُو پھر بھی پہنچائے چلا جا۔کہا ہے کہ فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَاۤ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ (51:54) اس مقام پر اگر تُو ان کو چھوڑ کر، اب دوسروں کی طرف توجہ دے تو اس سے تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔گو کہ یہاں زیادہ امید وابستہ ہو سکتی ہے، ان میں اصلاح ہو سکتی ہے مگر اس سے تم پہ کوئی ملامت نہیں ہوگی، کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ تم نے ایسا کیوں کر دیا لیکن وَذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (51:55) قرآن کریم کی بات پہنچائے چلا جا، اس کے باوجود دہرائے چلا جا، جو بھی ان میں سے اس کو تسلیم کرے گا اس کے لیے یہ بڑی مفید چیز ہوگی، بڑی منفعت بخش چیز ہوگی، اور بات وہی ہے جو پہلے کہی گئی کہ فَفِرُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ (51:50) ایک خدا کی محکومیت کو اختیار کرنے کے لیے تیزی سے بھاگتے ہوئے آؤ۔

لفظ عبادت کے ایک غلط مفہوم نے قرآنِ حکیم کی پوری تعلیم کو ہی بدل دیا

یہ ہے قرآن حکیم کی تعلیم کا مرحلہ، اور نکتہ ما سکہ جو میں نے عرض کیا ہے اور آگے آ کر وہ فقرہ کہا جو دہرایا جاتا ہے اور پھر جس کا وہ غلط یا مروجہ متواتر مفہوم لینے سے بات کہیں سے کہیں چلی جاتی ہے۔کہا ہے کہ وَمَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَالۡاِنۡسَ اِلَّا لِيَعۡبُدُوۡنِ (51:56)۔آپ نے یہ ہر جگہ سنا ہوگا کہ ہم نے جن اور انس کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ ہماری پرستش کریں۔یہی ترجمہ ہوتا ہے، کہیں اصل لفظ لے آتے ہیں تو اس کا ترجمہ عبادت کریں ہوتا ہے۔تو عبادت کے معنی ہی پرستش ہوتا ہے۔اس طرح اس کا ترجمہ ہی یہ کیا جاتا ہے کہ ہم نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے۔جن کو تو چھوڑ دیجیے، وہ بات دوسری جگہ آئے گی، انس تو آ گیا، انسانوں کو پیدا ہی ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہماری پرستش کریں۔آپ اندازہ لگائیے یہ کوئی کھول کر بیان کرنے کی بات نہیں ہے۔ان کے بقول تخلیق انسانی کی غایت اور غرض و مقصود و مطلوب یہ ہے کہ وہ میری پرستش کریں۔اب ان سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ صاحب! پرستش تو یہی ہے کہ نماز پڑھ لی، کوئی نفل پڑھ لیے، اس کے بعد کچھ دیر وظیفے کر لیے۔کہا ہے کہ تخلیق کی غرض یہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہی نہیں ہے۔ظاہر ہے کچھ اور کیا تو وہ مقصدِ تخلیق کے خلاف چلا جائے گا۔تخلیق کا تو مقصد یہ ہے کہ ان میں سے جو بڑے سے بڑے بھی بزرگ ہیں وہ عبادت گذار ہیں۔اب ان کی بھی تو یہ صورت نہیں ہے کہ وہ چوبیس گھنٹے، ہر سانس میں، پرستش کی بات کرتے چلے جائیں اور کچھ بھی تو کرنا ہوتا ہی ہے تو جتنا کچھ اس وقت تک کیا، وہ تخلیق کا مقصد جو خدا نے بتایا، بقول ان کے، وہ بات اس کے خلاف چلی گئی اس لیے یہ اپنے ہاں کے جو بڑے بڑے مقتدا ہوتے ہیں، بزرگ ہوتے ہیں، ان کے متعلق یہ باتیں مشہور ہوتی ہیں کہ صاحب! وہ دن رات اسی میں ہی لگے رہتے تھے، نفلیں پڑھتے رہتے تھے، تسبیحاں پھیرتے رہتے تھے، ایک کمرے کے اندر بیٹھے رہتے تھے اور نفل پڑھتے تھے، کبھی نماز پڑھتے تھے، روزہ قائم الدہر ہوتا

تھا' ہمیشہ روزہ رکھتے تھے' بھوک لگتی تھی تو وہ لکڑی کی ایک روٹی لے رکھی تھی' اس کو چک مارتے تھے۔ یہ سب بنائے ہوئے ہیں۔ یہ کا ہے کے لیے بنائے ہوئے ہیں؟ کہا کہ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (51:56) مقصد ہی خدا کی پرستش ہے۔ پہلے تو اس مقصد پہ ذرا غور کیجیے' عزیزانِ من! کہیں تنہائی میں بیٹھ کر غور کیجیے گا کہ خدا کہتا ہے ان کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ میری پرستش کرتے رہیں۔ ایک لفظ عبادت کے مفہوم کے بدل جانے سے آپ دیکھیے' بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ تخلیق انسانیت کی غرض وغایت کچھ اور ہوگئی۔ یہ جو عبادت گذار قوم ہے' اس کی زندگی کچھ اور ہوگئی۔ پیدا کرنے والے نے تو یہ کہا تھا کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13) ساری کائنات تمہارے زیرِ تسخیر کردی ہے' اٹھو اور ان قوتوں کو اپنے قابو میں لے کر آؤ۔ وہ یہ بتا رہا تھا۔ یہاں یہ صورت ہے کہ بیٹھے ہوئے ہیں ایک گوشے کے اندر اور وہاں نفل پڑھے جا رہے ہیں' نماز پڑھی جا رہی ہے' تسبیح ہے' ورد ہیں' وظائف ہیں۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ کہ جی! اَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) خدا بتا رہا ہے کہ تخلیق کا مقصد یہی پرستش ہے خواہ وہ جن ہوں یا انس۔

لفظ یَعْبُدُوْنِ کا لغوی مفہوم: خدا کی محکومیت اختیار کرنا

عزیزانِ من! معاف رکھیے گا یہ تو غنیمت ہے کہ قوم اس پہ عمل پیرا نہیں ہے۔ اگر ساری قوم یہی کچھ کرنے لگ جائے جو بزرگ کرتے ہیں تو روٹی کون کمائے؟ یعبدون کے معنی کیا ہیں؟ سوچیے تو سہی پھر وہ تو جو یہ کچھ نہیں کرتے' بچے ہوئے ہیں۔ جو یہ کچھ کرتے ہیں ان کے لیے روٹی اور کماتے ہیں اور ان کو دے جاتے ہیں اگر سارے ہی اے کچھ کرن لگ پین: اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (51:56) تو روٹی کون کمائے؟ یہ ایک لفظ' عربی زبان میں بھی اور قرآنِ کریم میں بھی جو استعمال ہوا ہے' عزیزانِ من! اس کے معنی ہی محکومیت کے ہیں کہ شرفِ انسانیت یہ ہے کہ انسان نہ تو مظاہر فطرت میں سے کسی شے کے سامنے جھکے کیونکہ ہر شے اس کے تابع تسخیر ہے اور اس کے بعد انسان رہ جاتا ہے' انسان انسان کے سامنے جھکے تو یہ وجہ تذلیل ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ (17:70) ہر انسان یکساں واجب التکریم ہے تو جو یکساں واجب التکریم ہے اس میں سے ایک کا دوسرے کے سامنے جھکنے کا معنی ہی کیا ہے' یہ تو اس سے زیادہ تذلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ جو اپنے برابر ہے' اس کے پاؤں پر انسان نے سر رکھا ہوا ہو' اس کے سامنے جھکا ہوا ہو' اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لیا' اس کی محکومیت تسلیم کی ہے' تو نہ تو مظاہرِ فطرت میں سے کسی کے سامنے یہ جھک سکتا ہے' نہ اپنے جیسے انسان کے سامنے جھک سکتا ہے۔ زندگی میں کسی شے کی پابندی تو کرنی پڑتی ہے۔ کس چیز کی پابندی کرو؟ کہا کہ خدا کے قوانین کی پابندی کرو' ہم نے ان کو اس لیے پیدا کیا' ان کی تخلیق کی غایت یہ تھی کہ یہ کسی اور کے سامنے نہ جھکیں' صرف ہمارے قوانین کے سامنے جھکیں۔

خدا کی محکومیت کے نظام میں کیا ہے؟ دل و جاں سے جھکنا

اس کی محکومیت کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (51:57) پہلی چیز یہ ہے کہ ہم ان سے کچھ نہیں مانگتے، کچھ کھانے کو نہیں مانگتے، کچھ سامانِ زیست نہیں مانگتے۔ جو بھی کسی دوسرے سے لے کر کھانے والا ہے، وہ اس زمرے میں آ ہی نہیں سکتا، خواہ وہ کہیں حضرت صاحب ہوں اور خواہ وہ کوئی بھی ہوں، جو دوسرے کی کمائی سے روٹی کھاتا ہے وہ خدا کی اس صفت کے خلاف جاتا ہے، تو کہا کہ حکومت میں بھی آپ نے دیکھ لیا کہ جو ہم نے کہا ہے کہ ہماری محکومیت اختیار کرو، اس میں یہ نہیں ہے کہ تم نے ہماری محکومیت اختیار کی، کماتے جاؤ اور لا کر ہمیں دیتے جاؤ، ہم تو کسی سے رزق نہیں چاہتے، طعام نہیں چاہتے۔ کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (51:58) یہ کسی کی کمائی سے لیتا ہی نہیں ہے۔ جس کی محکومیت اختیار کی جائے، اس کے تو ذمے یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو رزق پہنچائے بجائے اس کے کہ ان کی کمائی سے خود کھائے۔ کیا کیا چیزیں کہاں کہاں کہہ جاتا ہے! کہا ہے کہ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (51:58) اور پھر وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو اُس چیز کی ضرورت ہے کہ صاحب! ووٹ کتنے آئیں گے اور میرا جتھہ کتنا بڑا ہوگا، میری پارٹی کتنی بڑی ہوگی۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے! وہ بڑی مضبوط قوتوں کا مالک ہے صاحب! اس کو اس کی ضرورت نہیں ہے، اس کی پرواہ نہیں ہے اور جو رزاق بنتا ہے، یہاں دنیا کے اندر بھی نظامِ کار، ہی کا سربراہ کیوں نہ ہو، جو رزاق بنتا ہے اس کی قوت کا ٹھکانہ کیا ہے، اس کے سامنے تو دل و جان سے لوگ جا کر جھکتے ہیں۔ وہ تو رزق ہے۔

انسانیت کی منفعت کے پروگرام کے سوا کوئی عمل ثمر بار نہیں ہو سکتا

کہا کہ فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ (51:59)۔ یہاں لفظ ظَلَمُوْا آیا ہے، ترجمہ کیا کہ جو ظلم کرتے ہیں۔ اب بہر حال یہ تو سارے اس میں سے نکل گئے، جو دنیا کے معاملات میں حصہ ہی نہیں لیتے۔ اس کا یہ تو سوال ہی نہیں، یہ تو الگ بات رہی کہ وہ کسی کی منفعت، کسی کا بھلا، بھی نہیں کرتے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ظلم نہیں کرتے۔ یہ ظلم نہ کرنا جو ہے، میں اس معنی میں لے رہا ہوں جس میں عام طور پہ ظلم کے معنی لیے جاتے ہیں۔ کسی پہ ظلم نہ کرنا بھی بڑی خوبی ہے، ہمارے ہاں بڑی اعلیٰ صفت گنی جاتی ہے، بڑا کیریکٹر سمجھا جاتا ہے تو یہ تو بات نہیں، یہ تو ایک منفی چیز ہے۔ کیا پتھر کسی پہ بھی ظلم کرتا؟ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو منفی سی چیز ہے، یہ پتھر ظلم نہیں کرتا۔ جس چیز کو آپ نیک کام کہتے ہیں، قرآن حکیم نے پتہ ہے کہ کیا بتایا ہے؟ کہا ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ (13:17) جو عمل نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہوگا، وہی ہے جس کو بقا نصیب ہوگی۔ اب یہ مثبت ہو گیا۔ بات یہ نہیں کہ وہ یہ نہیں کرتا۔

یہ نہیں کرتا' ٹھیک ہے' قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن وہ نہیں کرتے والی بات نہیں۔ یہ لا الہ کا حصہ نہیں ہے' یہ منفی ہے' آگے مثبت عمل بھی تو ہے' مثبت عمل یہ ہے کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) اسی عمل کے لیے بقا ہے جو نوعِ انسان کی منفعت کے لیے ہے۔ کیا بات ہے صاحب! اسی عمل کے لیے بقا ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا جائے' الناس کے لیے کیا ہے۔ یہ یہاں بڑی سے بڑی چیز جو کہی جاتی ہے وہ ہے اپنی قوم' اپنا ملک' My Country' خواہ وہ Right ہے تو بھی یا Wrong ہے تو بھی' My Nation ہے' اپنا جتھہ' اپنی پارٹی' یہ ساری انسانیت اسی میں بٹی ہوئی ہے۔ وہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ کہتا ہے۔

اب دیکھ لیجیے کہ اس چیز کے جانچنے کا معیار کیا کہ یہ کام نیک ہے یا نہیں؟ اس میں خدا کی عبادت ہو رہی ہے یا نہیں؟ میں نے وہی لفظ استعمال کر دیا جو مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ کے لیے ہوگا۔ وہ ہے عمل جس کے لیے بقا ہے اور وہی ہے جو خدا کے قوانین کی اطاعت کا لازمی نتیجہ منفعت الناس ہے۔ عزیزانِ من! اب یہاں (51:59) میں جو لفظ ظَلَمُوۡا آیا ہے آپ کو یاد ہوگا یہ لفظ کئی دفعہ آچکا ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ''جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو''۔ یہ بڑا ہی جامع لفظ ہے صاحب! کہ جو Deserve نہیں کرتا' اس کو اگر اس مقام کے اوپر اونچا بھی پہنچا دیا جائے تو یہ بھی ظلم ہے اور جو آن میرٹ کہیں ہونا چاہیے اگر اس کو وہاں نہیں بلکہ نیچے رکھ دیا جائے' تو یہ بھی ظلم ہے' جس کو جہاں ہونا چاہیے اگر وہ وہاں نہیں رکھا جاتا تو یہ ظلم ہے۔ اب انسانوں کو اگر مساوات انسانیہ کی رو سے یکساں واجب التکریم نہیں رکھا جاتا' اس میں فرق پڑتا ہے' تو یہ بھی ظلم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ لوگ جو ظلم کرتے ہیں' وہ اسی لفظ مِّثۡلَ ذَنُوۡبِ اَصۡحٰبِهِمۡ (51:59) میں آتے ہیں۔ یہ ''ذنب'' کا لفظ بڑا جامع ہے۔ ان کے ہاں ایسی چیز جو کسی کے پیچھے اس طرح چپکی رہے کہ جہاں جائے وہ چپکی رہے' پیچھا ہی نہ چھوڑے' جہاں جی چاہے جائے' اسے ذنب کہتے ہیں۔ پتہ ہے انہوں نے کہاں سے یہ لفظ لیا تھا؟ یہ عرب عجیب قوم تھی۔ یہ جو گائے بھینس یا اونٹ کی دم ہوتی ہے' اس کے لیے یہ لفظ بولتے ہیں۔ اب دیکھ لیجیے کہ یہ کیسی عمدہ تشبیہہ ہے کہ وہ کہیں جائے وہ چیز چپکی رہے اور پیچھے لگی رہے۔ کہتا ہے کہ انسان کے عمل کا نتیجہ تو اس طرح سے اس کے پیچھے چپکا رہتا ہے جیسا کسی اونٹ یا مویشی کی دم اس کے ساتھ چپکی رہتی ہے اور آخر الامر پھر وہ نتیجہ پیدا کر کے رہتی ہے۔ ذَنُوۡبِ پانی سے بھرے ہوئے ڈول کو بھی کہتے تھے جس کو ساتھ رکھنا پڑتا تھا۔ وہ تو ہمارے ہاں جو محاورہ ہے ''پیمانہ لبریز ہو گیا'' تو یہ معنی بھی ہوتے ہیں کہ آخر الامر پھر جب وہ نتیجہ برآمد ہونے کا وقت آجاتا ہے تو پھر پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ آگے ہے کہ اَصۡحٰبِهِمۡ اور یہ جیسا کہ وہ جو پہلوں کا کہہ رہے تھے کہ یہ بات تواتر سے آرہی ہے' کہا جیسا ان کا بیڑہ غرق ہوا تھا' اسی طرح سے ان کا بھی ہو جاتا ہے اور حضور ﷺ سے کہا کہ اس معاملے میں فَلَا یَسۡتَعۡجِلُوۡنِ (51:59) ان سے کہو کہ یہ جو بار بار اس کے لیے فرمائشیں کر رہے ہیں' آپ ﷺ سے اعتراض کر رہے ہیں' یہ ہوتا کیوں نہیں ہے' آتا کیوں نہیں ہے' وہ نتیجہ وہ

عذاب جسے کہہ رہا ہے' ان سے کہو کہ وہ کوئی عید کا چاند نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے ہو' تمہیں معلوم نہیں کہ جب وہ آئے گا تو کیفیت کیا ہوگی۔ جلدی نہ کرو' مہلت کا وقفہ غنیمت جانو' اس میں اپنی اصلاح کرلو' اپنی روش بدل لو' تباہی سے بچ جاؤ گے اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ جلدی مچا رہے ہیں کہ ہم جلدی تباہ کیوں نہیں ہوتے۔ کہا کہ فَوَیۡلٌ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ یَّوۡمِہِمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ (51:60) اور اس دن جو کچھ ان سے کہا جا رہا ہے اور جس دن اس کی نمود کا اور اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو پھر ان کے لیے تباہی ہی تباہی ہوگی۔ اس وقت پھر کوئی ان کو بچانے والا نہیں ہوگا' نہ ہی یہ خود بچ کر کہیں جا سکیں گے۔

قوموں کے نشیب و فراز کا دار و مدار ان کی اجتماعی زندگی کے اعمال سے وابستہ ہوتا ہے

کہا ہے کہ اس کے متعلق اقوام سابقہ کی داستانوں کو دیکھو۔ کیا یہی بات نہیں تھی کہ جب ظہورِ نتائج کا وقت آیا' تو ان میں سے کوئی ایک بھی بچ نہ سکا اور جو کہیں ایک بھی بچ نہ سکا تو قرآن کریم نے' عزیزانِ من! ہمارے لیے عجیب بات کہی۔ ہم تو خیر سارے ظالمین میں سے ہیں' کہا کہ جب وہ تباہی آیا کرتی ہے تو یاد رکھو! وہ صرف انہی کو گھیرا نہیں کرتی جنہوں نے ظلم کیے تھے' وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتی ہے۔ قوموں کی اجتماعی تباہی تو اس طرح سے ہوتی ہے اس لیے جو اس وقت اس ظلم میں شریک نہیں ہیں' انہیں چاہیے کہ اس ظلم کو روکیں۔ یہ نہ سمجھیں کہ جب وہ تباہی آئے گی تو وہ انہی کی تباہی ہوگی' ہمیں کیا کہے گی' ہم تو بہت اچھے ہیں۔ بالکل نہیں صاحب! یہ سب کو بہا کر لے جائے گی تو قبل اس کے کہ وہ سیلاب آ جائے کشتی بنا لو' پھر بچ جاؤ گے ورنہ نہیں بچ سکو گے اور یہ جو چیز کہی گئی کہ پھر ایسا ہو کر رہے گا تو اس کے بعد قرآنِ کریم پھر شہادت میں مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ اب یہاں سورۃ الذّٰریٰت ختم ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم شروع سے آخر تک ایک مربوط کتاب ہے: آیات کی ترتیب میں بھی اور سورتوں میں بھی

عزیزانِ من! اگلی سورۃ الطّور ہے۔ یہ 52 ویں سورۃ ہے۔ اسے ہم آئندہ لیں گے لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے' اس طرح سے ایک سورۃ کی آیات ہی باہم مربوط نہیں ہیں بلکہ سورتوں کی ترتیب میں بھی یہی چیز ہوتی ہے۔ جب یہ کہا ہے کہ یہ کچھ ایسے ہی ہوتا رہا بلکہ یہ تو ہر وہ رسول جو پیغام لاتا تھا' اس کے ساتھ یہی ردِ عمل ان اقوام کا ہوتا رہا۔ یہ سارا کچھ قصہ بیان ہو رہا تھا' اب اگلی سورۃ بھی یہیں سے شروع کی۔ وہ وَالطُّوۡرِ (52:1) سے ہے کہ یہ آسمانی رشد و ہدایت کا سلسلہ تھا جس کی نمود کبھی طورِ سینا پر ہوئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ جو سورۃ التین ہے وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ o وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ (95:1,2) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ قسم ہے مجھے زیتون کی: ''انجیر دی سوں'' قسم ہے مجھے طور کی' التین' انجیر کی' قسم ہے' قسم ہے مجھے کوہِ طور کی۔ یہ آپ کے ہاں ترجمہ آتا ہے تو آپ پھر اس کے بعد یہ پوچھتے ہیں اور اب تو

نوجوان بے باک ہوگئے ہیں، وہ پھر آپ سے پوچھتے ہیں کہ خدا قسمیں کھا رہا ہے، انجیر کی قسمیں کھا رہا ہے، زیتون اور کوہِ طور کی قسمیں کھا رہا ہے، یہ بات کیا ہے؟ میں عرض کرونگا کہ وہ زیتون کی اور التین کی اور انجیر کی قسمیں نہیں کھا رہا۔ یہ بات بہت اونچی ہے۔ یہ اگلی سورۃ ہے، اس کا نام ہی الطّور ہے، یہ شروع ہی الطّور سے ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وَالطُّوۡرِo وَ کِتٰبٍ مَّسۡطُوۡرٍ (52:1,2)۔ یہ ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ [1] (2:127)

❀......❀......❀

---

[1] اے ہمارے نشوونما دینے والے! تُو ہماری ان ناچیز کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرما، کہ تُو دل میں مچلنے والی آرزوؤں کو جانتا اور لب تک آنے والی تمناؤں کو سنتا ہے، اس لیے تو خوب جانتا ہے کہ ہم کن ارادوں کے ماتحت کوشاں ہیں۔

سورة الطور

پہلا باب: سورۃ الطور (آیات 1 تا 16)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1982ء کی 3 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الطّور سے ہو رہا ہے: (52:11)۔

ہمارے ہاں کے تراجم اور عربوں میں ''وَ'' کا استعمال

اس کا پہلا لفظ بھی الطور ہے اور اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِىْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ o (52:1-4) اور آگے اسی طرح سے اور ہے۔ یہاں تو صرف طور ہی کہا ہے' سورۃ التین میں جس کا نمبر 95 ہے' اس کے ساتھ اور بھی تین چیزیں ملائی گئی ہیں کہ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ o وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ o وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ o (95:1-3). آپ قرآنِ کریم کے تراجم میں دیکھیں گے' لکھا ہوا ہوگا کہ قسم ہے ان چیزوں کی' گویا خدا کس کس چیز کی قسم کھاتا ہے اور اس کے بعد آپ ترجمہ میں دیکھیں۔ التین انجیر کو کہتے ہیں' زیتون Olive کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اسے زیتون ہی کہتے ہیں کیونکہ ادھر تو ہوتا نہیں' وہیں کا پھل ہے۔ طور وہ کوہِ طور ہے اور بلدِ امین تو مکہ معظمہ یا امن و سلامتی کا مرکز خانۂ کعبہ ہے۔ اب اگر آپ یہ ترجمہ پڑھیں کہ قسم ہے مجھے انجیر کی اور میں قسم کھاتا ہوں زیتون کی' اور آگے وہ بات کہی ہوئی ہو کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِىْۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (95:4) میں انجیر کی قسم کھاتا ہوں' زیتون کی قسم کھاتا ہوں' کوہِ طور کی قسم کھاتا ہوں' تو کیا چیز آپ کے ذہن پہ نقش ہوگی؟ آپ اس سے کیا سمجھیں گے؟ ہر جگہ آپ کو یہی ملے گا۔ یہ جو ''وَ'' ہے، اس کے معنی قسم لیے جاتے ہیں۔ عربوں کے ہاں یہی ''وَ'' ہے' یہ گواہی یا شہادت کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ کہا ہے کہ

یہ چیزیں اس حقیقت کی شاہد ہیں جو آگے بیان کی جا رہی ہے۔اب ''قسم'' سے یہ بات الگ ہوگئی۔آگے وہ بات ہمیں سوچنے کی ہو جائے گی کہ یہ جو آگے بات کہی گئی ہے'اس کی شاہد کیسے ہیں'اس کی گواہ کیسے ہیں'اس کی شہادت کس طرح سے یہ چیزیں دیتی ہیں؟

قرآنِ کریم کی بلاغت وفصاحت درجۂ کمال پر ہوتی ہے

یہاں یہ بات شہادت' گواہی کی ہوگی' یہ نہیں ہے کہ خدا کہتا ہے کہ میں التین کی اور زیتون کی اور انجیر کی قسم کھاتا ہوں کہ انسان کو ہم نے احسنِ تقسیم میں پیدا کیا۔ یہ قسم کھاتا ہوں نہیں ہے' یہ شہادت ہے اور قسم درحقیقت شہادت کو مؤثر بنانے کے لیے ہوتی ہے' پختہ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ عدالتوں میں بھی' جو پہلے کہتے ہیں کہ اب یہ قسم اٹھا کر کہو کہ کیا کہتے ہو شہادت میں' گواہ سے جو قسم لی جاتی ہے تو وہ اس کی ہے جو وہ بیان کر رہا ہوتا ہے' شہادت دے رہا ہوتا ہے' وہ اس کی توثیق کے لیے ہے' وہ اسے اور زیادہ پختہ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔اس اعتبار سے یہ ''وْ'' قسم کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا ور نہ یہ بات شہادت ہی کی تھی' گواہی کی تھی کہ یہ اس بات پر شاہد ہے جو ہم کہہ رہے ہیں اور اتنا ہی نہیں' قرآنِ کریم میں آپ دیکھیں گے کہ اس ''وْ'' کے ساتھ شہادت میں قرآن کریم کن کن چیزوں کو پیش کر رہا ہے۔آگے کہا کہ وَالشَّمْسِ وَضُحٰـهَا o وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰـهَا o وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰـهَا o وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰـهَا o (91:1-4) سورج اور چانداور دن اور رات اور صبح میں ''وْ'' کے معنی وہی قسم میں لیے جاتے ہیں کہ میں سورج کی قسم کھاتا ہوں' قسم کھاتا ہوں چاند کی۔ یہ وہی چیز ہو جائے گی' صاحب! کہ یہ چیز ہوتی ہے حالانکہ عربی جاننے والے تو جانتے ہیں۔

قرآنِ کریم کی جو بلاغت وفصاحت ہے' وہ عرب اس کے سامنے عاجز آ گئے تھے حالانکہ اپنے زبان دان ہونے پر ان کو بڑا مان تھا لیکن اس کے مقابلے میں وہ کوئی چیز پیش نہیں کر سکتے تھے۔معنویت تو اور بات رہی کہ اس کے معنی ''مقاصد'' حقائق کیا ہیں' اسلوب بیان ہی اس کا ایسا تھا کہ وہ اس کے سامنے عاجز تھے۔تو اس میں بلاغت آتی ہے' ادب آتا ہے اور بلاغت کے جو تمام اصناف ہیں وہ آتے ہیں اور ادب اور بلاغت میں جسے آپ تشبیہات اور استعارات کہتے ہیں وہ تو ادب کی جان ہوتی ہے وہ ایک استعارے سے بات یوں چمک کر انسان کے سامنے آجاتی ہے' ایک تشبیہ سے وہ حقیقت پیکرِ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہے تو قرآن کریم کا یہ انداز ہے۔ یہ چیزیں ہم اپنے ہاں بھی تو کہتے ہیں۔

یاد تازہ ہوگئی۔عزیزانِ من! وہ میں کیا یاد تازہ کروں کہ باٹا پور نہر کے کنارے' آج تک اس کی شہادت دیں گے کہ ہمارے جانفروشوں نے کس پامردی سے دشمن کا مقابلہ کیا۔ وہ باٹا پور نہر کے کنارے ہم شہادت میں دے رہے ہیں۔آپ دیکھتے ہیں کہ اس میدانِ کارزار کا ذرہ ذرہ اس کی گواہی دے گا' وہ ذرات تو گواہی نہیں دیتے' یہ کہنے کا انداز ہے کہ وہاں یہ بات ہوئی تھی۔اب وہاں سے ہی یہ جو تاریخی حقیقت ہے' مستنبط کی جاسکتی ہے۔ یہ اقبالؒ کہتا ہے:

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو؟
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا [1]

وہ آبِ رودِ گنگا کو تو کچھ دن یاد نہیں ہوتے' کہنا تو یہی تھا کہ ہم مسلمان یہاں ہندوستان میں آئے ایک کارواں کی حیثیت سے آئے اور ان گنگا کی وادیوں میں پھیل گئے' اسلام اس طرح سے آیا' یہاں مسلمان اس طرح سے پھیلے' تو یہ انداز ہے' جو ادب کی جان ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی یہ بات کہنا شروع کر دے کہ صاحب! میں تو گیا تھا' وہاں جا کر گنگا کے کنارے میں نے دیکھا' اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا تو آپ بتائیے کہ اس کا جواب کیا دیا جائے۔ ابھی اگلی ہی جو سورۃ آتی ہے' وہ سورۃ النجم ہے۔ اس میں **وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى** (53:1) ہے یعنی ستارے کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے۔ ستاروں کے متعلق تو ہمارے ادب میں' ہماری شاعری میں' اس قدر مضامین ہیں' اس قدر ان کی گواہیاں لاتے ہیں کہ پوچھو نہیں!

1965ء پاک بھارت کی جنگ: سینے میں میرے درد سوا ہوتا ہے اور بات ہے غیر محسوس صداقتوں کی

عزیزانِ من! کچھ بات باٹا پور نہر کی یاد آ گئی اور پھر 1965ء کے جانفروشوں کی آ گئی۔ وہ ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے میرے سینے میں' تو پوچھو نہیں میں نے اس دوران کیا کیا دیکھا تھا۔ ان ستاروں کی بات جو ہوئی تو ہمارے ہاں جس انداز سے یہ چیزیں استعارۃً استعمال ہوتی ہیں وہ بات بھی بڑی سوز و گداز کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ

تنہائی کے نازک لمحوں میں کچھ تم ہی ستارو بات کرو
تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

میری شب کی سحر تو نہیں ہوتی' تم نے تو وہ شب دیکھی ہوگی' کچھ بتاؤ تو سہی' اس شب کی سحر کیسے ہوا کرتی ہے؟ ہم تو ستاروں سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ ہم پہ جو تاریکیٔ شب طاری ہوئی ہے تو نمودِ سحر کی کوئی کرن ہی نظر نہیں آ رہی۔ معاف رکھیے گا آج سینے میں درد سوا ہوتا ہے۔ یہ پانچ اور چھ ستمبر آ رہا ہے تو مجھ پہ کیفیت ہی کچھ اور طاری ہو جاتی ہے صاحب! اس نمودِ سحر کی کوئی علامت' جو نہ نظر آئے تو ہے۔ وہ مایوسی کے عالم میں خاموش تھا جس نے کہا تھا کہ

گم ہوئی ہے کہاں کلید سحر
گردشِ روزگار کچھ تو کہو

سن لیجیے ایک اور شعر بھی کہ

---

[1] اقبالؒ: بانگِ درا (ترانۂ ہندی)' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 91۔

گم شدہ راستوں کے ویرانو!
داستانِ غبار کچھ تو کہو

اب تو ہمارے گمشدہ راستوں پہ ویرانوں کی داستانِ غبار کہنے والا بھی آپ کو کوئی نہیں ملے گا۔ عزیزانِ من! یہ ایک زرد پتہ ❶ ہے، درختِ خزاں دیدہ کے او پر ٹھہرا ہوا ہے اور دوسرا مجھے اب نظر بھی کوئی نہیں آتا۔ بہر حال، بات کہاں سے کہاں چلی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! استعارات سے جو بات کہی جاتی ہے، تشبیہات میں جو کہی جاتی ہے، قرآن کریم نے خود اپنی آیتوں کے متعلق کہا ہے کہ کچھ تو محکمات ہیں، ان الفاظ کے اندر واضح احکام دیئے گئے ہیں۔ ان میں استعارہ اور تشبیہ نہیں ہے۔ احکام اور قوانین کے متعلق یہ بات نہیں ہوتی۔ مگر جو حقائق ہیں، جو Abstract Truths (غیر محسوس صداقتیں) ہیں، ان کو ہمیشہ تشبیہات کے انداز میں بیان کیا جاتا ہے اور قرآن کریم کا یہ ایک خصوصی انداز ہے کہ وہ اس قسم کے غیر مرئی Abstract Truths (مجرد حقائق) کو، جو محسوس نہیں ہوتے، جو دیکھے نہیں جاسکتے، تشبیہات کے انداز میں بیان کرتا ہے۔ آیاتِ متشابہات کے معنی یہ ہیں۔ اس پہ بھی پوچھو نہیں کہ ہمارے ہاں کیا کیا افسانے بنے۔

قرآنِ کریم مجرد حقائق کو تشبیہات کے انداز میں پیش کرتا ہے

قرآن کریم کا انداز یہ ہے، کہ جب کہتا ہے کہ وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ o وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ o وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِo (95:1-3). بات اس نے یہ کہی ہے کہ زمانہ نزول قرآن کریم میں یہ جو کشمکش حق و باطل ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ شرع سے یہی کچھ ہوتا رہا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔ قرآن مجید اپنے دعوے کی شہادت میں یہ پیش کر رہا ہے کہ جہاں کہیں بھی وحی کے پیغام کی نمود ہوئی، اس کی آواز بلند ہوئی، اس کی مخالفت میں یہ جتنے مترفین تھے، یہ جتنے مفاد پرست تھے، یہ جتنے مستبد حکمران، سرمایہ دار اور مذہبی پیشوا تھے، یہ سارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ اس کی گواہی میں کوہ تین، کوہ زیتون، طور سینین اور پھر بلبد الامین کو پیش کر رہا ہے۔ التین ❷ ایک پہاڑی (Mountain) کا نام ہے، جہاں سے حضرتِ نوحؑ نے حق دامن کی آواز بلند کی۔ زیتون ❸ بھی ایک پہاڑی کا نام ہے۔ یہ ہے Mountain fo Olives، وہاں حضرتِ عیسیٰؑ نے آواز بلند کی اب بھی انجیل میں یہی Sermon of the Mount (وعظ کوہ) ہے۔ یہاں حضرت عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے۔ طور سینین ❹ ہے۔ یہاں حضرتِ موسیٰؑ نے آواز بلند کی یعنی بجائے اس کے کہ وہ حضرتِ نوحؑ، حضرتِ عیسیٰؑ

---

❶ یہ خود باباجی کی طرف اشارہ ہے۔

❷ (یہ التین مغربی اردن کی ایک پہاڑی کا نام ہے)۔ التین انجیر یا انجیر کے درخت کو کہتے ہیں نیز ایک پہاڑی کا نام ہے جہاں سے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کی آواز بلند کی۔ اس طرح یہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کا مقام ہے۔

❸ زیتون کا مادہ ''ز ی ت'' ہے۔ زَیۡتٌ زیتون کا تیل اور زَیۡتُوۡنَۃٌ زیتون کا ایک درخت یا اس کا ایک پھل۔ اَلزَّیۡتُوۡن. زیتا نام پہاڑی ہے جو فلسطین میں واقع ہے۔ **لطائف اللغۃ** نے اسے ''جبل الشام'' لکھا ہے۔ (ماخوذ از پرویزؒ: لغات القرآن، ص: 824)

❹ طور سینین شام میں ایک پہاڑی ہے۔ اسے کوہِ طور بھی کہتے ہیں جس پر حضرت موسیٰؑ پکارے گئے تھے۔

حضرتِ موسیٰؑ کہے اوراس کے بعد حضور ﷺ کا نام لے' اس کا وہ انداز ہے کہ پوچھو کوہِ زیتون' کوہِ تین اور کوہِ طور کی چوٹیوں سے کہ یہ مخالفتیں کس طرح سے ہوئی تھیں۔ کیا حسین انداز ہے اس کا یہ کہنے کا! یہ ہے جو کچھ قرآن کریم اس انداز سے کہتا ہے اور پھر آخر میں ہر جگہ جہاں یہ واقعات آخر میں لاتا ہے وہ پھر مکہ یا کعبہ پہ آجاتا ہے کہ پوچھو ان میدانوں سے' ان پہاڑوں سے' ان وادیوں سے' جہاں جہاں یہ آواز اٹھی' کس طرح سے اس کی مخالفت ہوئی اور اس کے بعد پھر آج مکہ کی وادیوں میں' فاران کی چوٹیوں میں' وہی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ یہ تورات میں بھی ہے کہ اس کے بعد فاران کے اوپر چمکا۔ وہاں بھی قرآن کریم کا بات کرنے کا انداز یہی ہے۔ وہ ان پہاڑوں اور وادیوں سے نہیں کہتا کہ جا کر ان کے پتھروں سے پوچھو کہ وہ تمہیں جواب دیں گے۔ کہتا یہی ہے کہ جو واقعات وہاں رونما ہوئے تھے' ان کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ وہ کس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ وہ اسی بات کی شہادت دیتے ہیں جو ہم آگے کہنے والے ہیں۔

کہا کہ وَالطُّوْرِ (52:1) طور کی چوٹیوں سے حضرتِ موسیٰؑ نے جو انقلاب آفریں پیغام دیا اور جس انداز سے اس کی مخالفت ہوئی' وہ اس حقیقت پہ شاہد ہے۔ عزیزانِ من! اس کے بعد فوراً ہی وہ قرآنِ کریم پہ آ گیا کہ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:2-3). قرآن کریم کی ایک یا دو آیتوں میں اور یہاں ایک دو آیتیں ہی ہیں' دیگر مقامات پر اور آیات بھی ہیں' جس میں یہ نظر آتا ہے کہ شروع سے ہی یہ قرآن کریم لکھا جاتا تھا' مسطور تھا اور مسطور کے تو معنی آپ جانتے ہی ہیں صاحب! سطر یہیں سے ہی ہے۔ مسطور کے معنی ہی یہ ہوتا ہے جو چیز لکھی جائے۔ یہ سطروں پہ سطر وہیں سے کہا جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کے متعلق ایک گہری سازش اور پارچمنٹ

اس کے برعکس یہ جو چیز تھی کہ جی! قرآنِ کریم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو ایسے ہی منتشر تھا' کچھ ہڈیوں' پہ کچھ ٹھیکریوں کے اوپر' کچھ پتوں کے اوپر تھا اور ایک پتے کو حضرتِ عائشہؓ کی بکری کھا گئی اور وہ آیت ہی کہیں نہیں مل رہی تھی یعنی خاص سازشوں کے تحت' اس قدر افسانے تراشے گئے ہیں حالانکہ خدا اپنی کتاب کے متعلق کہہ رہا ہے کہ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:2-3) اس نے اتنا ہی نہیں کہا کہ یہ ایک تحریر شدہ کتاب ہے' کہا یہ ہے کہ یہ ''رق'' پر لکھی موجود ہے۔ اب یہ ہے کہ ''رق'' ہوتا کیا تھا؟ یہ جو ہمارے ہاں اب بھی کاغذ کہلاتا ہے' وہ نرم جھلی والا کاغذ ہوتا ہے' جو محفوظ رکھنے والی دستاویزات (Documents) ہوتی ہیں وہ ان پہ لکھی جاتی ہیں۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ آج کل بھی وہ ہے یا نہیں۔ کل تک جب میں سروس میں تھا تو وہاں تو ہم لکھا کرتے تھے۔ وہ Parchment کے اوپر ہوتا تھا' وہ ہرن کی باریک سی جھلی ہوتی تھی' وہ Parchment (پارچ منٹ) کا کام دیتی تھی۔ اس زمانے میں جو کتاب یا تحریر یا نوشتہ یا دستاویز محفوظ رکھنی ہوتی تھی' اسے اس جھلی پر لکھا جاتا تھا' Parchments پہ لکھا جاتا تھا تو یہ نظر آتا ہے کہ اس کتاب کی حفاظت کی اور اس کی تحریر کا کس قدر اہتمام تھا۔ مسطور تو قرآنِ کریم نے خود ہی کہا ہے' وہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ یہ ساتھ کے ساتھ لکھی جاتی تھی

اور پھر اہتمام یہ تھا کہ ایسی Parchment پہ لکھی جاتی تھی تا کہ یہ محفوظ رہے' ضائع نہ ہو جائے۔

یہ تو اس طرح سے لکھی ہوئی کتاب تھی جس کے متعلق آج افسانے مشہور ہو رہے ہیں کہ صاحب! یہ پھر یونہی تھا اور پوچھو نہیں کہ بعد میں پھر کس طرح سے یہ جمع ہوا' کس طرح لکھا گیا (اللہ اللہ!)۔ ان کو پڑھیے' ایک بات دوسرے سے ملتی نہیں ہے' یہ اضداد کے افسانے ہیں' اس میں فوراً Doubt Create (شک وشبہ پیدا) ہو جاتا ہے۔

قرآنِ کریم کی حفاظت کے متعلق بنیادی تصورات اور ہمارے ہاں کی روایتی افسانہ نگاری

سارا اسلام اور اس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی اصلی شکل میں حرفاً حرفاً' لفظاً لفظاً وہی ہے جو خدا نے نازل فرمایا' جو رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیا۔ اب اگر اس کی حفاظت کے متعلق پہلے سے ہی یہ شکوک پیدا ہو جائیں کہ یہ تو اس زمانے میں لکھا ہی نہیں گیا تھا' محفوظ ہی نہیں تھا اور بعد میں پھر یہ چیز آپ بار بار سن چکے ہیں' کہ فلاں آیت آئی ہے مگر وہ قرآنِ کریم میں ملتی نہیں تھی' ایک مثال یہ آیہ رجم کی ہے' اب کچھ اور ان کو ملتا نہیں ہے۔ اس آیہ رجم کے لیے' رجم کی سزا کے لیے' کوئی بھی قرآنِ کریم میں سند نہیں ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث ہے' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی ایک نہیں دو آیتیں تھیں' ایک بڑا ہو کر دودھ پئے تو وہ رضائی بھائی ہوتا ہے یا نہیں' دوسرا یہ آیہ رجم ہے' یہ دو آیتیں تھیں۔ جب قرآن کریم جمع ہونے لگا تو یہ کہیں ملتی نہیں تھیں (اللہ اللہ!)' اس کی ڈھنڈیا پڑی' پوچھتے پوچھتے حضرتِ عائشہ صدیقہؓ کے پاس گئے کہ آپ کو کچھ علم ہوگا' انہوں نے کہا: ہاں میرے بچو! علم کیا میرے تو سامنے کا یہ واقعہ ہے' یہ آیتیں کھجور کے دو پتوں کے اوپر لکھی ہوئی تھیں اور یہ اندر تخت کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن کریم کی یہ آیات صرف ایک ہی جگہ رکھی تھیں اور کہیں نہیں تھیں اور حضور ﷺ کی وفات پہ جب گھر میں کہرام مچا ہے تو وہ باہر ہماری جو بکری تھی' اس نے رسا تڑایا' ہم تو حضور ﷺ کی وفات میں لگے رہے' اور وہ اندر جا کر اس پتے کو بکری کھا گئی اب اور کہیں اس کا نام ونشان نہیں' وہ بکری کھا گئی' بکری کو قصاب نے ذبح کر دیا' اسے تم کھا گئے۔ قرآن جمع ہو رہا ہے۔

عزیزانِ من! اس کے بعد یہی ہے کہ پھر وہ اب کریں کیا؟ بھئی! حضرت عمرؓ نے کہا: ہاں' یہ آیتیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ہم پڑھا کرتے تھے۔ دیکھیے! ایک غلط بات کو ثابت کرنے کے لیے کتنے جھوٹ بولنے پڑتے ہیں کہ رجم کا حکم خدا کی طرف سے تھا' اس لیے قرآن کریم سے ملتا نہیں' یہ بکری کھا گئی پھر کیا کیا جائے؟ حضرتِ عمرؓ نے کہا: ہم پڑھا کرتے تھے (اللہ اکبر!)۔ انہوں نے کہا: آپؓ پڑھا کرتے تھے تو آپؓ تو اس معاملے میں بہت معتبر ہیں تو آپؓ اُسے قرآن کریم میں لکھ دیجیے۔ کہنے لگے: نہیں' میں نہیں لکھتا' یہ لوگ کہیں گے کہ قرآن کریم میں عمرؓ نے اضافہ کر دیا۔ خود کہہ رہے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھا کرتے تھے' خود ہی کہہ رہے

ہیں، میں نہیں کرتا اور عمرؓ جیسا جید کہہ رہا ہے: نہیں، میں نہیں لکھتا بھئی! کہنے لگے پھر کیا کریں، خدا کا یہ حکم تھا، قرآن کریم میں تو ہے نہیں؟ کہنے لگے: کوئی بات نہیں، قرآن کریم میں نہیں ہے تو ہم قرآن کریم میں تو اس کو نہیں ڈال سکیں گے، لیکن عمل اسی حکم کے اوپر کریں گے۔ چلیے بھئی! پوچھو کہ کیا کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے۔

قرآن حکیم میں کہا ہے کہ وَ كِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ o فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (52:2-3). قرآن کریم کے متعلق بے شمار مقامات پہ ہے کہ قرآن کریم لکھا جاتا تھا، ان کاتبانِ وحی کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ کتنے معزز قابل اعتماد تھے وہ لوگ جو وحی کو لکھا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں یہ چیز موجود ہے، کہ شہادت دے دی اپنے طور پر، نمودار ہونے والے انقلاب کی آواز کی، اور وہی آواز جواب اس کتاب کے اندر ہے، جو لکھی جا رہی ہے اور اس کا بین ثبوت ہے کہ وَّ الْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ (52:4)۔ اور یہ خدا کا آباد گھر (خانہ کعبہ) جو اس نظامِ خداوندی کا مرکز ہے، جس کا ضابطہ یہ کتاب ہے۔

اسلام سے پہلے کعبہ کی کیفیت مکافاتِ عمل کا عمل دخل

عزیزانِ من! یہاں اس آباد گھر (خانہ کعبہ) کی کیسی عجیب صفت بیان کی ہے۔ یہ یہاں کعبے کی عجیب بات ہے کہ جب بھی کعبہ تعمیر ہوا ہے، خواہ وہ حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں سے تھا یا وہ اس سے پہلے سے چلا آرہا تھا، عربوں کے ہاں اسلام تو بہت بعد کی بات ہے، اس سے پہلے بھی عربوں کا اجتماعی زندگی کا مرکز کعبہ چلا آرہا تھا۔ وہ کبھی ایک دن کے لیے بھی ویرانہ نہیں ہوا ہے اور پھر اسلام کے بعد تو آپ دیکھیے، تیرہ سو سال میں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوگا کہ وہاں کوئی آدمی نہ ہو۔ اس قدر مسلسل، یومِ تعمیر سے لے کر آج تک، اور اس کے بعد ہمارا یقین یہ ہے کہ قیامت تک، وہ بیت المعمور ہے، آباد گھر ہے، ویرانہ نہیں ہے، تو اسے قرآن کریم نے بیت معمور کہا ہے۔ کہا کہ یہ سب چیزیں اس حقیقت کی شہادت دے رہی ہیں جو ہم آگے بیان کر رہے ہیں۔ یہ سارا کچھ کیا تھا؟ آپ کو دوسری بات یاد ہوگی جو قرآن حمید کا نکتہ ماسکہ ہے۔ وہ ہے قانونِ مکافاتِ عمل! جس قسم کی روش، جس قسم کا نظام، کوئی قوم قائم کرے گی، اس کے مطابق اس قوم کا انجام ہوگا، غلط نظام کا انجام تباہی اور بربادی ہوگا۔ یہ ہے نکتہ ماسکہ فرد کے لیے بھی، جس قسم کا وہ کام کرے گا اس کے مطابق اس کو نتیجہ بھگتنا پڑے گا، قوموں کے لیے بھی، جس قسم کا نظام کوئی قوم اپنے ہاں قائم کرے گی، اس کے مطابق اس کا انجام ہوگا۔ یہ ہے قرآن حکیم کا نکتہ ماسکہ۔ اب اس تک پہنچنے کے لیے پہلے وہ کیا کر رہا ہے؟ یہ کہ وہ شہادت میں پیش کر رہا ہے اُن تاریخی واقعات کو، جو گذشتہ زمانے کے انبیائے کرامؑ کی کشمکش میں گزرے ہیں اور آپ کو یاد ہے کہ پھر ساتھ وہ کیا کرتا ہے؟ یہ کہ وہ دو ہی چیزوں کو، خارجی کائنات اور تاریخی شہادات کو، وہ قانون کے لیے بطور شہادت پیش کیا کرتا ہے کہ ہر شے قانون کے مطابق چل رہی ہے۔ وہ اس کے لیے ہمیشہ محسوس چیزیں پیش کرتا ہے اور وہ یہ خارجی کائنات ہے۔ کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ، گندم از گندم بروید جو از جو، گندم کا بیج ڈالو گے تو گندم پیدا ہوگی، جو کا بیج ڈالو گے تو وہی

پیدا ہوگا یعنی مکافاتِ عمل کا ایک ایسا اٹل قانون ہے کہ جیسا بیج ہوگا اسی قسم کی فصل ہوگی۔

تاریخی شواہد پیش کرنے کا قرآنی طریق

عزیزانِ من! اس لیے قرآن حکیم جہاں بھی تاریخی شواہد پیش کرتا ہے تو فوراً ساتھ ہی فطرت کے قوانین اور فطرت کے محسوس شواہد پیش کرتا ہے۔ اب یہاں بھی اس نے تین چیزیں تو پیش کیں اس نے ''طور'' کو پیش کیا' قرآن حکیم کو پیش کیا' ''بیت معمور'' کو پیش کیا' اور اس کے بعد کہا کہ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ o وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ o (52:5-6) وہ فوراً آ گیا خارجی کائنات پہ اور کہا کہ یہ فضا کی پہنائیاں اور ان میں مصروفِ گردش اتنے اتنے عظیم الجثہ کرّے' انہیں دیکھیے تو سہی۔ اور اس کے بعد ذرا ان سمندروں کو تو دیکھیے کہ اس قدر طوفان آمیز' تلاطم انگیز پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور ایک کے ساتھ دوسرے پورے کے پورے ملے ہوئے کو دیکھیے۔ کہا کہ دیکھتے ہو کہ یہ کس طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں' ان میں سوئی ڈالیے تو وہ تہ تک چلی جاتی ہے' قانون کے مطابق لوہے کا جہاز بنائیے وہ اتنا بڑا ہو کہ جس میں لاکھوں من بوجھ ڈال دیجیے۔ قانون کے مطابق اس کو بنائیے' اسی سمندر میں دیکھیے' وہ اس جہاز کو کس طرح پانی اپنی چھاتی پہ لیے جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں قانون کی کارفرمائی' تو دونوں شہادتیں پیش کرنے کے بعد کہا کہ کس بات کے لیے یہ شہادتیں پیش کی جا رہی ہیں؟ پھر کہا کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ (52:7) یہ جو تباہی بتائی جا رہی ہے کہ تمہاری یہ روش غلط ہے' اس کا نتیجہ تباہی ہوگا' یہ ہو کر رہے گا' یہ سب چیزیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ ایسا ہو کر رہے گا' آپ غور کیجیے' عزیزانِ من! ان آیات کے معنی کیا ہو گئے؟ ان کی تفسیر کیا ہوگئی؟ کہا ہے کہ یہ وَاقِعٌ (52:7) واقع ہو کر رہے گا آگے کہا کہ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (52:8) اسے کوئی روک نہیں سکے گا' کوئی قوت اسے روک نہیں سکے گی' یہ تباہی آ کر رہے گی۔ اس سوال میں یہ ہے کہ اس تباہی میں ہوگا کیا؟

پھر وہی تراجم اور ہماری تفاسیر کی گنجلک

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اب پھر آگے ایک اور بات آ رہی ہے یَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا o وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا o (52:9-10)۔ یہاں پھر وہی ترجمے ہیں' ان میں آپ دیکھیں گے کہ جس دن آسمان جنبش میں ہوگا' ہل جائے گا' یہ کرے پھٹ جائیں گے اور یہ پہاڑ اپنی اپنی جگہ سے ہل کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے' اس دن یہ بات ہوگی تو قرآن کریم یہ کہہ رہا تھا' انسانوں کو بتا رہا تھا کہ تمہارا غلط نظام کیا کرے گا؟ یہ کہا کہ یہ اس دن ہوگا جب یہ آسمان کے کرّے تھرتھرا جائیں گے' یہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے' پھٹ کے روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے۔ تو بات کیا بنی صاحب! اب اس کے متعلق آپ تفسیروں میں دیکھیے۔ وہ کہتے ہیں یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔ جب یہ قیامت آئے گی تو یہ ہوگا: زمین پھٹ جائے گی' پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو کر روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے' آسمان کے

یہ جو کرّے ہیں، یہ سارے کے سارے تباہ ہو جائیں اور کچھ نہیں رہے گا تو جب اس میں کچھ نہیں رہے گا، پھر کوئی بھی نہیں رہے گا، تو یہ کس بات کے لیے شہادت دیئے جا رہے ہیں، نہ اس کو ہم Avoid کر سکتے ہیں، نہ اس میں کچھ بچ سکتا ہے، اور اگلی بات تو یہ ہے کہ اس میں مومن اور کافر کی بھی تمیز نہیں ہوگی، اس میں تو مسجد اور مندر کی بھی تمیز نہیں ہوگی، جب زمین کا کرّہ ہی ریزہ ریزہ ہو جائے گا تو اس میں بسنے والے انسان ہی نہیں، جو ساری مخلوق ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی، آبادیاں ختم ہو جائیں گی، تو اس بات کے لیے کیا ہے جو ہمارے لیے وجہ عبرت بنا رہے۔

قرآن حکیم پہ غور کرو۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں دوسری چیز آتی ہے۔ قرآن حکیم اور وہ بھی عربی زبان دوسری چیز ہے، میں یہاں پھر عرض کردوں کہ یہ جو چیزیں کہی گئیں اگر معنی لیے جائیں کہ جو کرّے ہیں، یہ جنبش سے تہ و بالا ہو جائیں اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اس دن کیا ہوگا؟ یہ اگلی ہی آیت ہے کہ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (52:11) اس دن وہ لوگ، جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کو جھوٹا سمجھتے ہیں، ان کی تباہی ہوگی، تو گویا نظر آئے گا کہ یہ تو صرف ان کی تباہی ہے اور اگر یہ مانا جائے کہ یہ قرب قیامت کی نشانیاں ہیں کہ زمین پھٹ جائے گی، پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، تو یہ ان کے لیے تو نہیں ہے، وہ تو جو اس قانون کو ماننے والے ہیں اور نہ ماننے والے ہیں، وہ سارے ذی حیات ختم ہو جائیں گے، تو وہ کہتا ہے کہ اس دن ان لوگوں کی تباہی ہوگی۔ گویا نظر آیا کہ یہ بات نہیں ہے جو کہی جائے گی کہ یہ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں، پہاڑ پھٹیں گے، زمین ختم ہو جائے گی، آسمان کے جو کرّے ہیں، لرز جائیں گے۔ وہ تو کہتا ہے کہ اس دن ان کی تباہی ہوگی اور اگلی ساری آیتیں ان کے متعلق ہیں۔ یہ ایک دو نہیں ہیں بلکہ اگلی چار پانچ آیتیں انہی کے متعلق ہیں کہ اس دن ان کے ساتھ کیا ہوگا؟

قرآن کریم کے اسلوبِ بیان کا ایک دوسرا طریق لغوی نہیں بلکہ مجازی بھی ہے

یہاں پھر آیئے قرآن کریم کے اسلوبِ بیان پہ اور عربی زبان پہ۔ ہر زبان میں لفظ کے ایک تو جسے Literary Meaning کہتے ہیں، جسے لفظی معنی کہتے ہیں، ہمارے ہاں بھی لفظی معنی ہی کہتے ہیں، وہ ہوتے ہیں۔ لغوی معنی اس کو کہتے ہیں جو لغات کی رو سے مانے جاتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ صاحب! اس کی بہادری کا کیا پوچھتے ہو، وہ تو شیر ہے شیر، تو اس سے مراد وہ درندہ نہیں ہوتا جو جنگل میں رہتا ہے۔ کبھی کسی نے اس سے مراد یہ نہیں لیا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا بہادر، اتنا جری، اتنا دلیر، اتنا قوی، ہے جیسے شیر ہوتا ہے۔ اس کو شیر کے ساتھ تشبیہہ دی ہے۔ یہ جو مفہوم ہے کہ شیر کہا جائے اور اس کے معنی ایک بہادر انسان لیا جائے، اسے مجازی معنی لینا کہتے ہیں۔ شیر کے معنی جنگل میں رہنے والا درندہ، اس کے Literary معنی ہوں گے، لغوی معنی ہوں گے، لفظی معنی ہوں گے اور یہ کہ اس سے مراد ایک بہادر انسان ہے، یہ اس کے مجازی معنی ہوں گے، اور عربی زبان کے اندر Literary Meaning تو کچھ تھوڑے سے ہی

لکھے ہوتے ہیں' وہ مجازی معنی (Allegorical Meanings) تو ان کے ہاں پوچھو نہیں کہ کتنے ہوتے ہیں۔ وہ جو قوم ایک اونٹ کے لیے ہزار الفاظ اپنی زبان میں رکھتی تھی' وہ ہزار الفاظ کیا اس کے Literary الفاظ ہوں گے؟ اونٹ کے لیے تو ایک ہی لفظ کافی ہے' اونٹ' اور کیا چاہیے! وہ ان کی زبان مجازی معنی میں بڑی وسیع تھی اور زبان کی وسعت تو ظاہر ہے کہ مجازی معنی ہی لینے سے ہوگی' Literary Meaning لینے سے تو زبان میں ایک لفظ پانی ہے' اس کے لیے پانی کا لفظ ہے' پانی کے معنی پانی ہے' معاملہ ختم ہو گیا لیکن جب پھر آب و تاب ہوگا اور آب ہوگا تو یہ معنی مجازی لیتے چلے جائیں گے تو زبان میں وسعت پیدا ہوگی۔

عربوں کے ہاں زبان بڑی وسیع تھی اس لیے ان کے ہاں مجازی معنی بہت سے ہوں گے مثلاً ان کے ہاں سما کے معنی دیکھیے۔ ہمارے ہاں سما کے معنی بلندی لیتے ہیں' جیسے ہم کہتے ہیں کہ ان کا طرہ دیکھیے آسمان کو چھو رہا ہے۔ وہ جو اکڑ کر چلنے والے ہوتے ہیں' فخر کے ساتھ' تکبر کے ساتھ' بڑے بننے والے ہوتے ہیں' انہیں وہ اس سے تشبیہ دیا کرتے تھے' اس کے مجازی معنی یہ بھی تھے ان کے ہاں۔ جبال کے معنی تھے کہ وہ ایسے لوگ جو اپنے ذہن میں یہ سمجھے ہوئے ہوں کہ ہم جو جم کر بیٹھے ہوئے ہیں' ہماری جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ کوئی ایسا ماں کا لال نہیں پیدا ہوا جو ہمیں اپنے مقام سے ادھیڑ دے' ہلا دے' تو یہ ایسے لوگ جن کا یہ زعم تھا کہ ان کو کوئی ان کے مقام سے ہلا نہیں سکتا' وہ اس کو مجازی طور پر پہاڑ پر جبل کے طور پر' جبال کے معنوں میں استعمال کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق

عزیزانِ من! اب بات سمجھ میں آ گئی کہ یہاں ان الفاظ کے معنی مجازی لیے جائیں گے' لفظی یا لغوی نہیں لیے جائیں گے۔ یہ مقام قرآن کریم کے سمجھنے میں بڑا نازک ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس مقام پہ ہم جی چاہیں مجازی معنی لے لیں اور جہاں جی چاہے ان کے لغوی معنی لیے جائیں پھر تو معانی مسخ ہو جائیں گی۔ یہ ساری بات اس کے لیے بھی ہے کہ قرآنِ کریم کو سمجھنے کا طریقہ اور اسلوب ہونا چاہیے کہ کہاں مجازی اور کہاں لغوی معانی لیے جائیں گے۔ میں نے ابھی وہ بات بیان کر دی۔ قرآن کریم میں پہلے تو یہ کہا ہے کہ ان سے یہ کہہ دیجیے کہ یہ چیزیں اس پہ شاہد ہیں کہ تمہاری غلط روشِ زندگی کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ درمیان میں یہ دو چیزیں آئیں کہ جس دن' یہ جو اکابرین ہیں' جن کے طرّے آسمان کو چھوتے ہیں' اور جو سمجھ رہے ہیں کہ ہمیں کوئی ہلا نہیں سکتا' ان سے کہا کہ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (52:11) اُس وقت ان لوگوں کے لیے تباہی اور بربادی ہوگی جو خدا کے قانونِ مکافات کو جھٹلاتے ہیں۔ اور پھر اگلی آیت یہ ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ o يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّاo هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَo (52:12-13-14) یعنی یہ سارا کچھ جو اگلی آیات ہیں' وہ ساری اس تباہی کی تشریح کر رہی ہیں۔ ان آیات کو جب ہم دیکھیں تو پہلی ہی آیت میں یہ ہے کہ وہ تباہی کا عذاب واقع ہو کر رہے گا۔ اگلی آیات میں یہ ہے کہ یہ عذاب ان لوگوں پر مسلط ہوگا جو ان صداقتوں کا انکار کر رہے ہیں۔ تو اب جب یہ جسے سیاق و

سباق کہتے ہیں یعنی پہلی آیات کو اور ان کے بعد کی آیات کو سامنے رکھیے اور اس کے درمیان پھر دیکھ لیجیے، وہ آیات خود بتائیں گی کہ ان الفاظ کے معنی مجازی لیے جائیں گے، لفظی یا لغوی نہیں لیے جائیں گے۔ یہاں اس کے معنی پہاڑ اور آسمان نہیں ہوں گے، یہ جو معنی ہیں وہ فٹ نہیں بیٹھ سکتے، وہی معنی فٹ بیٹھیں گے جو پہلی آیت میں اور بعد کی آیت میں آئیں گے۔ یہاں کہا ہے کہ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (52:11) انسانوں کی بات ہو رہی ہے کہ ان کے لیے تباہی آئے گی۔ یہ طریقہ ہوتا ہے الفاظ کے مجازی معنی لینے کا۔ یوں نہیں کہ جہاں جی چاہے، یہ کر دیا۔

میں نے، عزیزانِ من! قرآنِ کریم پر غور و تدبر میں اپنی زندگی بسر کی ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ کم از کم بھی گنیے تو پچاس سال تو نکل آتے ہیں۔ اس طریق سے بھی یہی وہ چیزیں ہیں جن پہ غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے جو الفاظ ہیں، جنہیں مفردات کہتے ہیں، ان الفاظ کے وہ معنی جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں کے ہاں لیے جاتے ہیں، وہ معنی متعین کرنے ہوں گے۔ زبانوں پہ زمانے کے گزرنے سے الفاظ کے معنی میں بڑی تبدیلیاں آتی ہیں۔ آج کی عربی اس عربی سے بالکل ہی مختلف ہے اور پھر Modern (جدید) عربی تو پوچھیے نہیں کیا ہو گئی ہے۔ اگر آج کی عربی کی رو سے قرآن کریم سمجھنا شروع کریں تو بات ہی نہیں سمجھ میں آتی۔ وہ عربی زبان جو اس دور میں تھی، یہ پہلی چیز ہے، پھر اس عربی زبان میں ان کے ہاں جو اسلوب تھے، جو تحریر کے انداز تھے، وہ بھی دیکھنے پڑیں گے، وہ بھی ان کے ہاں موجود ہیں، پھر ان کے ہاں جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے، جو معنی وہ اپنے ہاں استعمال کرتے تھے، وہ مجازی معنی وہ اپنے ہاں بھی استعمال کرتے تھے، اور وہ بیشتر مجازی معنی استعمال کرتے تھے۔ اب ساتھ ہی ان کی بھی تحقیق کی جائے گی کہ وہ ان الفاظ کے مجازی معنی کیا لیا کرتے تھے۔ اب یہ کچھ کرنے کے بعد پھر آگے بات آئے گی کہ اس آیت میں ان الفاظ کے لغوی یا لفظی معنی لیے جائیں گے یا مجازی معنی لیے جائیں گے۔ یہ بات اس چیز پہ غور و تدبر سے سامنے آئے گی کہ اس آیت کے سیاق و سباق میں کیا مضمون چلا آ رہا ہے۔

قرآن حمید میں ربط ہے، عزیزانِ من! ان حضرات کے ہاں جنہوں نے قرآن حکیم کو تلاوت برائے ثواب رکھا ہے پوچھو نہیں، کہتے ہیں کہ یہ بڑی بے ربط کتاب ہے (معاذ اللہ)، مجمل ہے، مبہم ہے، بات ہی نہیں سمجھ میں آتی، اس کے اندر کوئی ربط ہی نہیں۔ کیا بات ہے صاحب! ان کی اپنی کسی کتاب کے متعلق یہ کہہ دیا جائے تو پوچھو نہیں، پیچھے پڑ جائیں۔ خدا کی کتاب کے متعلق یہ چیز ہے اور وہ بھی اس کی آخری کتاب ہے۔ وہ جو ربط ہے، وہ تو اس طرح سے سامنے آتا ہے۔ پھر اب یہاں یہ مجازی معنی لیجیے۔ بات صاف ہو گئی کہ یہ لوگ جو اس قدر تکبر میں، فخر میں، غرور میں، اکڑے ہوئے پھرتے ہیں، سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں کوئی ہلا نہیں سکے گا، وہ انقلاب آئے گا تو پھر یہ دیکھیں گے کہ یہ جو مکذبین ہیں، یہ جو اس حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں کہ ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ان سے کچھ کہا جاتا ہے کہ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ خَوْضٍ

يَلْعَبُوْنَ (52:12) ان سے اس کے بعد بجائے اس کے کہ وہ اپنی روش کو بدلیں، وہ باتوں میں لگے رہتے ہیں، بیانات دیتے رہتے ہیں، ان کے Interviews آتے ہیں، Explanations (وضاحتیں) آتی ہیں بس باتیں ہی باتیں ہیں اور وہ ان باتوں میں کھیلتے رہتے ہیں۔ کیا بات ہے قرآن کریم کی! کہ وہ زندگی کو Seriously (متانت سے) نہیں لیتے۔ یہ جو قرآن کریم کا لفظ ''لعب'' کا آتا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو Seriously (سنجیدگی سے) نہ لینا، یونہی کھیل کے طور پہ لینا۔ وہ زندگی کو کھیل سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اس پہ Seriously (متانت سے) غور ہی نہیں کر رہے، باتیں دیکھو تو ہزار کریں گے لیکن ان چیزوں کے اندر Serious (سنجیدہ) نہیں ہوں گے۔ یہ ان کے لیے کہا جا رہا ہے کہ یہ تباہی ان لوگوں کے لیے آئے گی، اس میں جس دن يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (52:13) ویسے بھی تو داخل ہونے کے لیے لفظ آ سکتا تھا۔ ایک ہوتا ہے دھکا دے کر اس میں داخل کرنا، یعنی وہ خود بچنا چاہیں گے۔ ایک لفظ میں قرآن حمید میں انداز کیا بیان ہوا ہے وہ خود وہاں سے بھاگنا چاہیں گے، بچنا چاہیں گے، لیکن وہ انقلاب کے حوادث، وہ جو تلاطم خیزیاں ہیں ان کو دھکیل کر ان کے اندر ڈال دیں گی، وہ بچ نہیں سکیں گے اور وہاں ان سے کہا جائے گا کہ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (52:14) یہ ہے وہ تباہ کر دینے والا عذاب جس کے متعلق تم کہا کرتے تھے کہ یونہی جھوٹی باتیں ہیں۔

نار کے اور سحر کے مجازی معنی اور بیان کا ایک انداز

عزیزانِ من! یہ ہے وہ عذاب۔ یاد رکھیے یہاں یہ ''نار'' کا لفظ آیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کے معنی آگ بھی ہوتے ہیں، اس کے مجازی معنی بھی بے شمار ہوتے ہیں۔ جہنم کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے جہاں نار کے معنی آتے ہیں: ''ہر شے جو تباہ اور برباد کر کے رکھ دے''۔ اس کے لیے ''نار'' کا یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ آتا ہے ''تباہی کی انتہا یہ ہے کہ خاکستر ہو کر رہ جائے، ہر کوئی چیز راکھ بن کر رہ جائے۔'' کہا کہ یہ کیفیت ہے۔ ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ تباہی کی آگ جسے تم جھٹلایا کرتے تھے۔ آگے کہا کہ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (52:15) . پھر یہ وہی لفظ آ گئے۔ سحر کے معنی ہمارے ہاں ہر جگہ جادو کیا جاتا ہے۔ کہا جائے گا کہ یہ بتاؤ، اگر جادو کے معنی لیے جائیں تو یہ جادو ہے۔ تم اس کو دیکھ رہے ہو یہاں جادو کی تو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ سحر کے معنی ان عربوں کے ہاں، ہر جھوٹ، ہر فریب کو کہا جاتا تھا۔ یہ اس انداز کا فریب ہے کہ وہ بظاہر تو صحیح حق نظر آئے لیکن درحقیقت فریب ہو۔ اس قسم کا جو فریب ہے، یہ تھا جسے وہ سحر کہا کرتے تھے۔ ہمارے ہاں اس کو ملمع سازی کہتے ہیں۔ اب اس قسم کی فریب کاری کہ بظاہر وہ صحیح اور سچی بات نظر آئے، درحقیقت وہ ویسے نہ ہو، اسے سحر کہتے تھے۔ اب اس انجام کے متعلق، اس تباہی کے متعلق، ان سے یہ کہا جا رہا تھا تو وہ کہتے تھے کہ الفاظ کے ذریعے سے تو یہ ٹھیک ہے جیسا تم کہتے ہو، مگر حقیقت یہ نہیں ہے، ایسے نہیں ہوگا، ہو ہی نہیں سکتا تھا، ہم نے بڑے انتظامات کر رکھے ہیں۔ کہا کہ تم بتاؤ یعنی یہ جو چیزیں ہیں کہ ان سے پوچھا جائے گا، ان سے کہا جائے گا، ان سے سوال کیا جائے گا، یہ بھی بیان کا ایک انداز ہے۔

قرآنِ حکیم کا محاکاتی انداز اور سحر کی مثال

عزیزانِ من! غائبانہ طور پر چیزیں بیان کرنے کا یہ بھی ایک اندازِ بیان ہے۔ہم نے روز یہ انداز اختیار کیا ہوا ہوتا ہے۔ میں نے صفحے لکھے ہیں' ان کتابوں کے اندر یہی انداز ہوتا ہے اور بڑا مؤثر انداز ہوتا ہے۔غائبانہ کسی سے یہ جو چیزیں کہنا ہے وہ اس کو محاکاتی انداز کہتے ہیں' جسے ہم ڈرامائی انداز کہتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے سچ مچ وہ واقعہ ہو رہا ہے۔ٹھیک ہے' جہنم کی آگ جل رہی ہے' اس کے کنارے ہیں' انہیں دھکیلا جا رہا ہے' وہاں ان سے باتیں ہو رہی ہیں' ان سے سوال کیا جا رہا ہے' یہ جواب دیئے جا رہے ہیں۔ یہ ایک اندازِ بیان ہے۔ یہ نہیں ہے کہ یہ فی الواقع محسوس طور پر ہی اس قسم کی یہ جو باتیں کہی جا رہی ہیں کہ یہ ایسا اس طرح سے ہوگا اور قرآن حکیم مختلف مقامات پہ خود ہی یہ واضح کر دیتا ہے کہ یہ کچھ ہے جو آج تک کسی آنکھ نے دیکھا نہیں ہے لیکن جیسے اس نے کہا کہ **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ** (13:35) بھئی! ان کی مثال یوں سمجھو۔ وہ تو خود اس کو مثال کہتا ہے کہ ان کی مثال یوں سمجھو جیسے یہ اور یہ اور یہ چیزیں کہی گئی ہیں' تو اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ تم جو کہا کرتے تھے کہ نہیں' یہ حقیقت نہیں' فریب دہی ہے' جھوٹ ہے' باطل ہے' اب سحر کے یہ معنی ہوئے۔ کہو کہ یہ جھوٹ تھا' فریب تھا' یا تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا ہے کہ یہ حقیقت ہے۔ اس وقت تو تمہیں یہ بات نظر نہیں آ رہی تھی' تم سے کہی جا رہی تھی' اور اس کہنے کے متعلق تم کہتے تھے کہ نہیں' یہ جھوٹ ہے' ایسا نہیں ہوسکتا' ہمیں کوئی اپنے مقام سے اکھیڑ نہیں سکتا' ہلا نہیں سکتا' صاحب! تو کہو وہ جو کہا جا رہا تھا' وہ جھوٹ تھا' باطل تھا' فریب تھا' دروغ گوئی تھی یا حقیقت تھی؟ آج تم دیکھ رہے ہو' کیا تمہیں آج یہ بات نظر نہیں آ رہی کہ وہ واقع تھا جو تم سے کہا جا رہا تھا' وہ حقیقت تھی جو تم سے بیان کی جا رہی تھی!

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں وارن (Warn) کرنا نبی اکرم ﷺ کی ذات تک ہی محدود نہ تھا

عزیزانِ من! یہ جسے تنذیر کہتے ہیں' کسی کو آگاہ کرنا یا کسی کو Warn کرنا کہتے ہیں کہ اس کا انجام یہ ہوگا' یہ نبی اکرم ﷺ کی ذات تک محدود نہیں تھا کہ حضور ﷺ یا نبیؑ یہ چیز کہتا ہے اور نبی کے بعد پھر معاملہ ختم ہوگیا۔ نبی کی یہ ساری چیزیں اس کی کتاب قرآنِ حکیم کے اندر محفوظ ہیں۔قرآن حکیم قیامت تک کے لیے محفوظ کتاب ہے' غیر متبدل ہے' مکمل ہے۔ وہ جو ساری تنذیرات ہیں' جو Warnings ہیں جو ان سے کہی جا رہی تھیں' وہ ساری قرآن حکیم کے اندر موجود ہیں اس لیے اگر حضور ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے اور ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا' جو کچھ نبی نے کہنا تھا' جو نبی نے کہا تھا' جو کوئی کہے گا' وہ تو سارا کچھ اس قرآن حکیم کے اندر موجود ہے۔اب وہی جو پوری وارننگ' جو تنذیرات ہیں وہ قرآن حکیم کے ذریعے سے ان لوگوں تک پہنچائی جائیں گی یا ان لوگوں تک دی جائیں گی وہ تو بہر حال وہ تھے جو قرآن حکیم پہ ایمان نہیں لائے تھے' جو ایمان لائے تھے ان کو تو اس وارننگ کی ضرورت نہیں تھی' وہ

تو اس جہنم سے بچ کر جنت کے معاشرے میں آ گئے ہوئے تھے۔ جو پھر اس کو آج مانتے ہی نہیں تھے اگر یہ چیز کہی جائے گی تو اس کے سب سے پہلے یہ مسلمان مخاطب ہوں گے۔ اب انہیں یہ قرآن حکیم کہیں سے لا کر نہیں دکھانا پڑے گا' وہ فخر سے کہتے ہیں کہ ہر گھر کے اندر قرآن حکیم موجود ہوتا ہے جنہیں یہ وارننگ دی گئی ہے ان کے گھروں میں بھی موجود ہے۔ ہمیں ہی وارننگ دی گئی ہے۔ میں کسی اور کا کیا ذکر کروں صاحب! قرآن حکیم موجود ہے' اس کی یہ وارننگ موجود ہے' اس نے بتایا ہے کہ کس قسم کا نظام ہے' اس قسم کا نظام کس قسم کے نتائج پیدا کرے گا' یہ بتایا گیا ہے' وضاحت سے بتایا گیا ہے' ہم اپنے نظام کو پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ یہ اس کے مطابق ہے جو اس نے کہا ہے کہ یہ تباہی لایا کرتا ہے اور اس میں لَا رَیۡبَ (2:2) ہے یعنی اس میں نہ بے یقینی ہے' نہ تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔

آج ہم بھی اسی طرح تکذیب کرتے ہیں

یہ کوئی مبہم بات نہیں ہے' اس میں کوئی کسی قسم کی Confusion (الجھاؤ) نہیں ہے قرآن کریم کی بالکل واضح چیزیں ہیں' قرآن کریم کتابِ مبین ہے تو یہ سب کچھ اس کے اندر موجود ہے اور بہرحال زبان سے ہی کہی' ایمان تو ہمارا یہ ہے کہ خدا کی کتاب ہے اور جو کچھ یہ کہتی ہے سچ ہے۔ کہہ تو ہم رہے ہیں اس لیے نبوت کے ختم ہو جانے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کسی اور کے آنے کی ضرورت نہیں کہ آ کر ہمیں یہ وارننگ دے' وہ سب کچھ اس میں موجود ہے اور جب یہ تلاوت بھی اس کی ہوتی ہے تو بہرحال تلاوت کرنے والے کو روز وارننگ تو دیتی ہے اور جو کیفیت وہاں تھی کہ وارننگ دی جاتی تھی اور وہ کہتے تھے کہ یہ کچھ بات نہیں ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے۔ آج اسی مقام پہ ہم ہیں۔ یہ نہیں کہ اب وارننگ نہیں دی جاتی اور ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ لہٰذا وارننگ تو موجود ہے' ہم روز اس وارننگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں' اور پھر اسے سچا نہیں سمجھتے۔ کون ہے وہ جو جلتی ہوئی آگ میں اپنے آپ کو جھونک دے؟ کیوں نہیں جھونکتا؟ وہ یہ ایک حقیقت کو سچ سمجھتا ہے کہ یہ آگ ہے اس میں داخل ہونے سے جل جاتا ہے' جلنے سے انسان مر جاتا ہے' اس پہ اس کا یقین ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ یہ جو غلط نظام ہے' اس غلط نظام کا نتیجہ اسی طرح سے ہی جل جانا ہے' تباہ ہو جانا ہے۔ اگر اسی طرح یقین ہو جیسا ہمیں آگ کے متعلق یقین ہے تو پھر تو کوئی بھی دانستہ آگ میں نہیں کودتا۔ وہ تو کوئی پاگل ہوتا ہے وقتی طور پہ' جو خودکشی کرتا ہے۔ اس قرآن کریم پڑھنے کے باوجود' یہ تنذیرات دیکھنے کے باوجود' ہم جو اس سے وہ سبق نہیں لیتے تو ہم اسی مقام پہ ہیں جس مقام پہ وہ مکذبین تھے۔ ہم بھی اس کی تکذیب کرتے ہیں اور پھر تکذیب کا لفظ تو خود بڑا جامع لفظ ہے۔ ایک تو انکار ہوتا ہے۔ قرآن حمید نے یہاں انکار نہیں کہا۔ تکذیب ہوتی ہے کہ ''کسی چیز کو زبان سے تو مان لینا لیکن عملاً یہ کہنا کہ نہیں صاحب! یہ بات ایسی ہی نہیں ہے۔ ہم مکذبین ہیں' قرآن حمید کو ماننے والے ہیں۔ کہیں متعین طور پر بیٹھ کر جو بھی چاہیں' ذرا اس کے اندر سے دیکھ تو لیں اور اپنے معاشرے کو اس آئینے کے سامنے رکھ کر دیکھ لیں کہ قرآن

حکیم اس کے متعلق کیا کہتا ہے پھر نظر آ جائے گا کہ ہمارا یہ دعویٰ کہ یہ خدا کی کتاب ہے' اس کا جو ایک ایک لفظ ہے' وہ حقیقت ہے' وہ واقعتاً ایسا ہے اور ایسا ہو کر رہتا ہے' ہم اسے کہاں تک مانتے ہیں اور کہاں تک اس کو جھٹلاتے ہیں' کہاں تک ہم صادقین میں سے ہیں' اور کہاں تک ہم مکذبین میں سے ہیں۔ کہا کہ دیکھتے ہو اپنی آنکھوں سے۔ تو اِصۡلَوۡهَا (52:16) اس تباہی کے اندر چلو۔

اپنی اصلاح کی خاطر مہلت کا وقفہ (Respite) ایک غنیمت ہے

عزیزانِ من! اب تو تباہی میں داخل ہونا پڑے گا اور اس کے بعد ہے کہ اب فَاصۡبِرُوۡۤا اَوۡ لَا تَصۡبِرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡكُمۡ (52:16) چیخو' چلاؤ' دہائی دو' یا صبر سے برداشت کر جاؤ۔ یہ یکساں ہے' اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ جب وہ تباہی آ جاتی ہے' اس وقت دہائی دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ تو اس سے پہلے کی بات ہے کہ جب ابھی اس کا مہلت کا وقفہ (Respite) ہوتا ہے کہ تم اپنی روش میں صحیح تبدیلی پیدا کر لو تو یہ جو تبدیلی پیدا کی ہوئی ہوتی ہے' اس کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس تباہی کو ٹال دیتا ہے۔ وہ ایسے نہیں رک جاتی۔ اس وقت تو کہا تھا کہ مَّا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ (52:8) کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ وہ تباہی جب آ جاتی ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ تباہی سے بچنے کا معاملہ تو اس سے پہلے پہلے کی بات ہوتی ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل اور ہمارے ہاں سزا کا تصور

عزیزانِ من! ہمارے ہاں عام تصور یہ ہے اور جب بھی آپ اچھے اچھے وعظ دیکھیں گے' وعظ ہی نہیں' اب تو ہمارے ہاں کے جو Intellectuals ہیں' وہ بھی جب خاص طور پہ اب ٹی وی پہ آتے ہیں' وہاں بھی بظاہر باتیں وہ نظر آتی ہیں کہ بڑی معقول ہوتی ہیں لیکن ذرا گہرائی میں جا کر دیکھیے' کہتے وہ بھی یہی کچھ ہیں کہ پھر اس کی سزا مل کر رہتی ہے' سزا ملنا ہوتا ہے۔ اس سزا کا تصور ویسا ہوتا ہے کہ جرم کیا ہے کسی اور نے' اس کے متعلق آ کر سزا دی' قرآن حمید کا قانونِ مکافاتِ عمل عجیب ہے۔ ایک تو سوسائٹی ہے۔ سوسائٹی کے اندر تو یہ ٹھیک ہے کہ کسی نے اگر کوئی جرم کیا ہے' جسے سوسائٹی نے جرم قرار دیا ہے' اس کی جو سزا ہے وہ تو ٹھیک ہے' سوسائٹی کی طرف سے ملتی ہے۔ یہ وہ سزا ہے۔ خدا کے ہاں اس انداز سے سزا والی بات نہیں ہوتی۔ اس کی سزا تو یہ ہے کہ آگ میں انگلی ڈالو تو وہ انگلی جلے گی اور اس سے اتنا درد ہوگا کہ سو نہیں سکو گے۔ تین مہینے کی قید اگر سوسائٹی کر دیتی تو وہ عذاب نہ ہوتا جو تم پہ ایک رات میں عذاب ہو جائے گا۔ یہ عذاب کسی عدالت کی طرف سے نہیں ملا' جیلر کی طرف سے نہیں ملا' پولیس نے تشدد نہیں کیا۔ یہ سزا کیا ہے؟ یہ اس عمل کے اندر پوشیدہ تھی۔ آگ میں انگلی ڈالنے سے نہ سپاہی کی ضرورت' نہ تفتیش کی ضرورت' نہ کسی گواہ کی ضرورت' نہ عدالت کی ضرورت' نہ فیصلے کی ضرورت' نہ کسی جیلر کی ضرورت' نہ جیل کی ضرورت۔ ڈالی انگلی سزا شروع ہوگئی۔ یہ سزا وہ ہے جس کے متعلق قرآن حمید کہتا ہے کہ ہر عمل کے اندر اس کا نتیجہ پوشیدہ

ہوتا ہے۔ کیا بات ہے قرآن حمید کی! یہ سارا کچھ گنانے کے بعد کہا کہ یہ ذہن میں نہ رکھو کہ ایسی باتیں ہوئی تھیں کہ جیسے گویا ہم ایک عدالت میں' بارگاہِ خداوندی میں' اوپر بیٹھے ہوئے ہیں' اور یہ مجرم آ رہے ہیں' ہتھکڑیاں لگی ہوئی ہیں' اور وہ گھسیٹے چلے جا رہے ہیں' اور ہم ان سے کہہ رہے ہیں کہ اب دہائی مچانے سے کیا فائدہ' تمہاری ایسی کی تیسی چلو جہنم کے اندر۔ کہا کہ یہ ساری بات تو سمجھانے کی تھی۔ میرے بندو! اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (52:16) تمہارے اعمال کے اندر یہ چیز موجود تھی' جو آج باہر آ کر اس شکل میں' تباہی کی شکل میں' تمہارے سامنے آتی ہے۔ آگ کے اندر یہ چیز موجود تھی کہ انگلی ڈالو گے تو یہ جلا دے گی۔ تمہارا جو آگ میں انگلی ڈالنا تھا' اس نے اس تکلیف کو تمہارے اوپر وارد کیا: اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (52:16) میں نے عرض کیا ہے کہ کئی جگہ بِمَا كُنۡتُمۡ بھی آتا ہے مَا كُنۡتُمۡ بھی آتا ہے۔ یہ معنی کے لحاظ سے تو ایک ہی ہے کہ جو کچھ تم نے کیا ہے' وہی اس کا نتیجہ ہے لیکن ایک طرف یہ ہوتا ہے کہ کسی ذریعے سے وہ نتیجہ ہے اور کوئی دوسری یہ چیز ہے کہ خود اس چیز کے اندر وہ نتیجہ ہے' (مثلاً) سنکھیا کھانے والا' جو موت کے مونہہ میں ہوتا ہے' اسکا گلا کوئی باہر سے نہیں گھونٹا' کوئی بندوق نہیں چلاتا' اس کے عمل کے اندر ہلاکت ہوتی ہے۔ تو یہ ہے تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (52:16) یہ جو کچھ تم کر رہے تھے' یہ ساری تباہی اور ہلاکت اس کے اندر موجود تھی۔ یہ پہلے سے مستور تھی' پوشیدہ تھی۔ چھپی ہوئی تھی۔ قرآن کریم میں یہ لفظ ہے کہ اب یہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ گئی ہے۔ فرق اتنا ہی پڑا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الطّور کی آیت 16 تک ہم آ گئے' یہ جہنم تھا۔ 17 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے' اور وہ دوسرا رخ آئے گا کہ جنہوں نے اس کو صحیح تسلیم کیا' اپنا نظام اس کے مطابق بنایا' اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اسے قرآن حکیم جنت سے تعبیر کرتا ہے اور اگلی آیات میں وہ آجاتی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسراباب: **سورۃ الطور** (آیات 17 تا 25)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1982ء کی 10 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الطّور کی آیت 17 سے ہو رہا ہے: (52:17)۔ سابقہ آیات میں حسب معمول وہی حق و باطل کی اور ان دو گروہوں کی کشمکش چلی آ رہی تھی۔ ان میں سے ایک گروہ کے متعلق تو بتایا گیا کہ انہیں ہزار وارننگ دیجیے' انہیں بار بار کہیے کہ جس روش پہ تم جا رہے ہو' آگے کنواں ہے' اس میں گر جاؤ گے۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' تم یونہی جھوٹ کہہ رہے ہو۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ پھر اندھے ہو کر آگے چلتے ہیں تو کنویں میں گر جاتے ہیں۔ یہی ہے جسے جہنم سے تعبیر کیا ہے کہ تباہی آ جاتی ہے' یہ جہنم کا عذاب ہوتا ہے تو وہ ایک گروہ ہو گیا۔ اب اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ ہے جو صحیح روشِ زندگی پر گامزن ہوتا ہے' خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتا ہے' تو اس کا انجام' اس کے اعمال کا نتیجہ' یہ ہوتا ہے کہ **اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۝ فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ** (52:17-18)۔

حضرت عمرؓ کی زبانی تقویٰ کا مفہوم

عزیزانِ من! *مُتَّقِيْنَ* کا لفظ اس کے مقابل میں آیا ہے۔ اُدھر مکذبین تھا۔ تقویٰ کے معنی ہوتا ہے: ''نگہداشت کرنا' اپنے آپ کو بچائے ہوئے رکھنا۔'' حضرتِ عمرؓ کی طرف سے ایک قول منسوب ہے۔ ان سے پوچھا گیا کہ تقویٰ کیا ہوتا ہے؟ وہ تو ان چیزوں کو محسوس مثالوں سے سمجھاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کبھی کسی ایسی پگڈنڈی پہ چلے ہو جہاں خاردار جھاڑیاں ہوں۔ عربوں کا لباس تو آپ جانتے ہیں' وہ سارا ڈھیلا ڈھالا اِدھر اُدھر پھیلنے والا ہوتا ہے۔ کہا کہ آپ اس پگڈنڈی پہ کیسے چلتے ہیں؟ اس نے کہا کہ جی! وہ اپنے لباس کو اِدھر

سے اُدھر سے لپیٹ کر' ان کانٹوں سے محفوظ رکھ کر' چلتے ہیں۔ کہنے لگے: بس اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ کیا بات ہے! اور یہی لوگ ہیں جن کو متقین کہا گیا ہے۔ اگر ان کی چادریں' ان کا لباس' بچ جاتا ہے' پھٹتا نہیں' اس میں دریدگی نہیں آتی تو یہ کوئی باہر سے نیا لباس ان کو نہیں دے دیتا۔ انہوں نے جو اپنے لباس کی حفاظت کی ہے اس کا نتیجہ ہے کہ ان کا لباس پھٹا نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں جزا اور سزا کا ذکر آتا ہے' اس بنیادی اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ خارج سے دی ہوئی سزا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں چونکہ سزا کا تصور آیا ہوا ہے' اس وجہ سے صحیح بات ذہن میں نہیں آتی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ بس وہ ایک خدا ہے' وہ بعض اوقات بعضوں سے ناراض ہو جاتا ہے اور پھر وہ سزا دیتا ہے' جہنم میں ڈال دیتا ہے' کوڑے مارتا ہے' پتہ نہیں کیا کچھ سزا دیتا ہے جبکہ بات یہ نہیں ہے بلکہ انسان کے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے' سنکھیا کھانے سے جو ہلاکت واقع ہوتی ہے' وہ کسی عدالت کی طرف سے سزا نہیں ملی ہوتی کہ اس کی موت واقع ہو جائے' وہ خود سنکھیے کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ چیز کہ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے اور جو کھانے والا ہے اس کا یہ جو عمل ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ اس سے تباہی آئے گی' وہ پھر بھی اسے کھالیتا ہے۔

قرآن کریم کے نزدیک سزا کا لفظ ہی صحیح نہیں جنت اور جہنم کا تصور

یہ جو اس کے بعد اس پہ بیتتی ہے' یہ خارج سے کسی نے اس کو سزا نہیں دی ہوتی۔ یہ اس کے اس عمل کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (56:24) تمہارے عمل کے اندر یہ نتیجہ پوشیدہ تھا' جو آج تمہارے سامنے آرہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پہلے نگاہوں سے چھپا ہوا ہوتا ہے' پھر وہ اپنے وقت پر محسوس شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ وہ جہنم بارز ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ لفظ ہے' بارز ہو جاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ تم جہنم سے اب بھی چھپے ہوئے نہیں ہو' اپنی آنکھیں تو تم بند کر لیتے ہو' تمہیں جہنم نظر نہیں آتا' جہنم تمہیں اس وقت بھی دیکھ رہا ہوتا ہے صاحب! صرف اتنا ہی ہے کہ اس وقت تمہاری نگاہوں کے اوپر سے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ جب تباہی محسوس شکل میں سامنے آتی ہے تو وہی جہنم جو مضمر ہوتا ہے پھر وہ بارز ہو جاتا ہے۔ تو یہ ہے قرآن کریم کی رو سے' جسے ہم جزا اور سزا کا فلسفہ کہتے ہیں۔ سزا کا یہ لفظ ہی غلط ہے۔ قرآن کریم کے تصور کی رو سے جزاء کے معنی ہوئے ''اس کے اندر چھپی ہوئی چیز'' تو اس طرح ہر عمل کا جو نتیجہ ہے وہ اس کے اندر مضمر ہوتا ہے اور وہی دراصل سامنے آتا ہے' وہ بارز ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم نے پہلے ان کا نتیجہ بتایا کہ جنہوں نے اس وارننگ پہ کان نہیں دھرا وہ اس کے باوجود دیدہ دانستہ اپنی تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔

ادھر کہا کہ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ (52:17)۔ اب وہ جنت کا ذکر آرہا ہے' جنت کی خوشگواریاں کا ذکر آرہا ہے۔ یہاں

پھر اس چیز کو سمجھ لیجیے کہ ایک تو جنتی زندگی ہے' میں نے کہا ہے کہ وہ جنّتی زندگی اسی دنیا کے اندر' اگر قرآن حکیم کے مطابق جو صحیح نظام ہے وہ متشکل کر لیا جائے تو اس کے انسانیت ساز خوشگوار نتائج اس دنیا کے اندر بھی سامنے آتے ہیں جنہیں قرآن طیبت کہتا ہے۔ ایک تو یہ جنّتی زندگی ہے جو اس معاشرے میں' اس دنیا میں قائم ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے بھی چلتی ہے۔ جسے ہم اخروی زندگی کہتے ہیں' جسے ہم موت کے بعد کی زندگی کہتے ہیں' یہ جو سلسلہ ہے انسانی اعمال کے نتائج کا' یہ مسلسل آگے بھی چلتا ہے' تو آگے جانے والی زندگی کے اندر جو خوشگوار نتائج ہیں' انہیں جنّت کہا گیا ہے بلکہ یہ الجنۃ ہے اور جو تباہ کن نتائج ہیں' انہیں جہنم کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! بات کچھ اور لمبی ہو جائے گی۔ میں نے کئی دفعہ یہ عرض کیا ہوا ہے کہ یہ جن کو ہم نیک اعمال کے خوشگوار نتائج کہتے ہیں' وہ اصل میں انسانی زندگی کے ارتقا کی اگلی منزل ہے اور جسے جہنم کہا جاتا ہے' اسے جحیم بھی قرآن کریم نے کہا ہے۔ وہ شے جو اس ترقی کو' اس ارتقا کو' روک دے' وہ وہاں جامد ہو جائے' تو یہ بات سائنس کی طرف چلی جائے گی' جو Evolution (ارتقا) کی تھیوری ہے کہ کس طرح سے ایک مقام پر آ کر ایک جنس' (Species) آگے بڑھنے سے رک جاتی ہے' تو بہر حال اس کا نام جہنم یا جحیم ہے۔ جہنم کے معنی ہے: ''جہاں انسانیت کو جلایا جائے'' تو وہ تو جہنم یا جحیم ہے۔ وہ بھی انسان کے اپنے اعمال کے اندر جو پوشیدہ نتائج ہیں' ان کا نام ہے اور اس کے برعکس جنت کی زندگی ہے۔

اب قرآن کریم اگلی دنیا کی زندگی کے متعلق کچھ بات کر رہا ہے۔ وہ اس زندگی جیسی محسوس مادی زندگی تو نہیں ہے لیکن اب اس نے جو ان چیزوں کو سمجھانا ہے وہ تو وہی الفاظ ہیں جو مادی زندگی میں آتے ہیں۔ وہاں کے لیے تو الفاظ بھی اگر اور استعمال کریں تو ذہن میں بات ہی نہ آئے کہ قرآن کریم یہ کیا کہہ رہا ہے تو قرآن کریم نے جنت کی زندگی یا جہنم کی زندگی کو مثال کے طور پر بیان کیا ہے' اس نے خود کہا ہے' اس کو تو ذہن میں رکھیے' اس حوالے کو بھی نوٹ کر لیجیے۔ یہ ہے مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ (13:35) متقیوں کے لیے جس جنت کا وعدہ دیا جا رہا ہے' بات کی جا رہی ہے کہ وہ مل کر رہے گی اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اب یہاں آیت تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (2:25) آ گئی۔ وہ ساری باتیں ہیں کہ باغات ہیں' ان کے نیچے صاف و شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی ہیں' نہایت عمدہ قسم کے پھل ہیں اور جتنی بھی اس زمانے کی مخاطب قوم عربوں کے نزدیک زندگی کی خوشگواریاں ہو سکتی ہیں' وہ تمام کی تمام قرآن کریم نے جمع کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں تو ذہن میں نہیں آتا کہ صاحب! یہ پانی کا بھی ذکر اتنا افراط سے قرآن کریم نے کیا ہے کہ صاف شفاف پانی کی ندیاں بہہ رہی ہوں گی۔ عربوں سے پوچھیے کہ اس ایک صاف شفاف پانی کے کٹورے کی قیمت کیا تھی۔

خانہ بدوش عربوں کے ہاں ایران جیسی عظیم سلطنت اور روما کے خزائن' جنت ارضی کی مثال ہیں

عزیزانِ من! آپ کو پتہ ہے کہ ایک بدو ایک کٹورے کے اندر پانی لے کر ہارون رشید کے دربار میں پہنچا تھا اور اس نے کہا تھا کہ کیا لائے ہو؟ وہ بدو کہنے لگا کہ صاحب! ایک چشمے سے مجھے ایسا پانی ملا جو میں نے زندگی بھر ویسا صاف شفاف پانی نہیں پیا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ پانی تو خلیفۃ المسلمین کے پاس تحفۃً لے کر جانا چاہیے' میں وہ پانی لے آیا ہوں۔قرآنِ کریم میں جو مثال کے ذریعے سے وہاں کی زندگی بھی بتائی ہے جو عرب قوم تھی' ان کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر جو وہ سمجھ سکیں وہ کہا ہے۔ان کے نزدیک اپنے مقابلے میں ایران کے معاشرے کی جو زندگی تھی جنت کے لحاظ سے وہ کہی ہے۔ یہ بے چارے تو کھجوروں کی گٹھلیوں پہ گذارا کرنے والے تھے' نخلستان میں کہیں چار درخت ہوئے' نیچے تھوڑا سا پانی ہوا' کچھ دیر وہاں رہ لیے' پانی خشک ہوگیا' وہاں سے خانہ بدوش' کندھوں پہ گھر کو اٹھایا اور پھر چل دیئے۔ ہر صبح سفر' ہر شام سفر' اور ساتھ ہی ان کے دیوار بہ دیوار ایران جیسی سلطنت' اُدھر روما جیسی سلطنت تھی اور پھر ایران جیسی سلطنت ہزار ہا سال کی تہذیب وتمدن کے خزائن اپنے اندر لیے تھے۔ جب یہ لوگ وہاں جاتے تھے تو جو کچھ وہاں دیکھتے تھے' ان سے تو یقیناً ان کے منہ میں پانی بھر آتا تھا تو قرآنِ کریم نے جنت کو جن مثالوں سے سمجھایا' یہ ہے ایران میں' بالخصوص روما میں بھی۔ ساتھ ہی ان تہذیبوں کے اندر جو چیزیں ان کے لیے بڑی وجہ جاذبیت تھیں' ان سب کا بھی قرآن کریم نے جنت کی زندگی میں ذکر کر دیا ہے اور یہ وعدہ فرداہی نہیں ہے' اسی زندگی میں ہے۔حضرتِ فاروقِ اعظمؓ کے زمانے میں' جب ایران اور روما بھی' بالخصوص ایران میں مدائن کی فتح کے بعد' جو وہاں سے حاصل شدہ نوادرات کی جس قسم کی چیزیں ملی تھیں' جب انہیں بابِ خلافت کے اندر بھیجا گیا ہے تو حضرت سعدؓ نے ساتھ خط لکھا۔ آپ دیکھیے اس میں لکھا ہی یہ ہے کہ قرآن کریم میں جس جنت کا وعدہ اخروی زندگی میں کیا ہے' وہ تو برحق ہے' لیکن ان میں سے ہمیں یہاں ایک ایک چیز ملی ہے تو وہ یہاں کی زندگی کے اندر بھی یہ چیزیں مل گئی تھیں۔ اسی لیے میں نے نقل کیا ہے لہٰذا وہاں کی زندگی کے متعلق جب بھی کوئی بات ذہن میں آئے تو سمجھ لیجیے کہ یہ مثال ہے جو لی گئی ہے اور وہی زندگی جب یہاں آئے گی تو وہ ہماری مادی زندگی کے متعلق سارے ساز وسامان ہوں گے جو یہاں میسر آئیں گے۔ سمجھ لیجیے کہ یہ اسلامی نظام کے نتائج ہیں۔

اس کے بعد جب وہاں اُخروی زندگی میں جائیں گے تو وہاں جس طرح سے وہ آئیں گے' آج ہم سمجھ نہیں سکتے۔قرآن حکیم نے کہا ہے کہ تمہاری نگاہوں سے ہم نے جس ٹھنڈک کو پوشیدہ رکھا ہے' تم آج اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ بات ٹھیک ہے' وہاں کی اُخروی زندگی آج کی زندگی سے بالکل ایک مختلف سطح کی زندگی ہے' تو دونوں چیزوں کو سامنے رکھیے۔ یہاں کی جنتی زندگی کے متعلق سوچنا ہو تو پھر تو یہی چیزیں ایسی ہیں۔اخروی زندگی کی جنت کے متعلق سمجھنا ہو تو کہیے کہ مثال کے طور پر یہ بات سمجھائی گئی ہے: مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ

(13:35)۔ابھی جو میں نے عرض کیا ہے وہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ جَنّٰتٍ وَّنَعِيۡمٍ (52:17) ایک جنت نہیں' باغات ہیں' بلکہ نعیم کہا گیا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ (1:6) جسے آپ نعمت کہتے ہیں۔اسی سے لفظ نعیم ہے۔یہ لفظ' جو نرم و نازک خوشگواریاں ہوں' ان کے لیے آتا ہے۔کہا ہے کہ فٰكِهِيۡنَ بِمَاۤ اٰتٰٮهُمۡ رَبُّهُمۡ (52:18) وہ جو کچھ ان کا نشو و نما دینے والا ہے' رب کا لفظ خاص طور پر آتا ہے' کیونکہ وہ تو ان کی نشو و نما جاری ہے ان کو جو کچھ وہ دیتا ہے' اس سے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔اس کے لیے 'فَكِهَ'' کا لفظ ہے۔عجیب قسم کی خوشی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔غیر محسوس سی جو خوشی ہوتی ہے اس کے لیے بولا جاتا ہے۔

اُخروی زندگی میں نیک و بد اعمال کے لیے میزان کھڑی کرنے کا مفہوم

کہا ہے کہ وَوَقٰٮهُمۡ رَبُّهُمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ (52:18)۔عزیزانِ من! یہاں ہمارے ہاں ایک اور اہم چیز آئی چونکہ سزا کا تصور ذہن میں ہے' اس لیے عام طور پہ آپ نے یہی سنا ہوگا' جب یہ سوال کیا جاتا ہے کہ صاحب! یہ جو گناہگار ہیں' ان کے گناہ بھی ہیں' انہوں نے نیکیاں بھی کی ہیں' وہاں جا کر کیا ہوگا' تو یہ کہا جاتا ہے کہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے پہلے جہنم میں بھیجا جائے گا اور وہاں اتنی سزا بھگتنے کے بعد پھر ان کو جو ان کے نیک اعمال ہیں ان کا بدلہ دینے کے لیے جنت منتقل کیا جائے گا۔یہی تصور ہمارے ہاں ہے۔یہ یکسر قرآن کریم کے خلاف ہے۔قرآن کریم تو بڑی بلند Scientific سطح پہ گفتگو کرتا ہے۔خود قرآن حمید میں مثال دے کر کہا ہے کہ وہاں اعمال تولے جائیں گے' میزان کھڑی کی جائے گی اور اس میں مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ (101:6-9) یعنی وہاں پلڑے کے جھکنے اور اٹھنے کا سوال ہے۔یہ نہیں ہے کہ جس کا یہ جو خوشگواریوں کا یا نیکیوں کا پلڑا ہے' آپ کہیے وہ جھکا ہے' اس کے مقابلے میں برائیوں کے پلڑے میں کچھ بھی نہیں ہے' وہ ہلکا ہے' یہ بھاری ہے اور اگر وہ بھاری ہے' یہ ہلکا ہے تو Determining Factor (فیصلہ کن حقیقت) بھاری پلڑا ہے۔انسان معصوم تو ہوتا ہی نہیں ہے۔کوئی نہ کوئی لغزش تو اس سے ہوتی ہے تو اس میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ يُذۡهِبۡنَ السَّيِّاٰتِ (11:114) انسان کی جو حسنات ہیں' وہ ان کی ان برائیوں کو' ان نتائج کو ڈھانپ لے گی' لے جائے گی۔

جہنم کے بعد جنت کے حصول کا تصور صحیح نہیں

عزیزانِ من! وہ جو میں مثال دیا کرتا ہوں کہ امتحان کے اندر 60% سے 70% پاس مارکس ہوتے ہیں اور جو 30% سے 40% پرچے میں غلطیاں ہوتی ہیں وہ 60% Cover سے ہو جاتی ہیں۔قرآن حمید نے پلڑے کا بھاری ہونا' پلڑے کا ہلکا ہونا تو خود بتایا ہے۔یہ نہیں ہے کہ جو پلڑا ہلکا ہے' اس میں یہ دیکھا جائے گا کہ صاحب! پہلے ان کو کتنے مہینے جہنم میں بھیجا جائے اور سزا دی جائے اور وہ سزا بھگتنے

کے بعد پھر کہا جائے کہ اب جنت میں بھیجو۔قرآن کریم نے کہا ہے کہ اہل جنت جہنم کی سنسناہٹ تک نہیں سنیں گے اور یہاں وہ لفظ ہے جس کے لیے مجھے یہ تفصیل بتانے کی ضرورت پڑی۔کہا ہے کہ وَوَقٰـهُـمْ رَبُّهُمْ عَـذَابَ الْـجَحِيْمِ (52:18) ان کا خدا بالکل محفوظ رکھے گا۔وہاں تو انداز یہ ہے۔سزا کا تصور ذہن میں لے آیئے تو یہ سب چیزیں آجاتی ہیں پھر ٹھیک ہے کہ جی! جو گناہ کیا ہے' اس کی سزا بھی ملنی چاہیے اور اس سزا کے لیے پہلے جہنم میں بھیج دیتے ہیں۔یہ تصور قرآن کریم کی رو سے غلط ہے۔جس کا پلڑا بھاری ہے وہ اگلی جماعت میں جانے کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔قرآن حکیم میں بھی یہی تھا اور میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیزیں تو نصاب کے طور پہ Classes میں' درس کے طور پر بتانی ہیں' جو میں بتاؤں کہ نظریہ ارتقایا Evolution Theory کے اندر Scientist نے کیا' یہی بات کہی ہے جو قرآن حکیم کہہ رہا ہے کہ جس چیز کے اندر آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کی صلاحیت اس کی کمزوریوں کو دبا دیتی ہے' وہ آگے بڑھ جاتی ہے اور جس کی کمزوریاں زیادہ ہوتی ہے' وہ وہیں کی وہیں رک جاتی ہے یا ختم ہو جاتی ہے۔

چودہ سو سال پہلے قرآن حکیم یہ آگے بڑھنے کا' رک جانے کا Determining Factor (فیصلہ کن) بتا رہا ہے۔کہا ہے کہ یہ ثَـقُـلَتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:6) اور خَـفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (101:8) کا اصول ہے۔سزا کا سوال نہیں ہے۔کہا کہ وَقٰـهُـمْ (52:18) محفوظ رکھے گا' بچائے رکھے گا۔دیکھیے وہاں متقین اور وَقٰـــهُـمْ دونوں کا ایک ہی تو مادہ ہے۔سوال یہ ہے کہ کس سے بچائے گا؟ یہاں عذاب الْجَحِيْمِ (52:18) ہے۔یہاں یہ لفظ آیا ہوا ہے۔میں نے عرض کیا تھا کہ جحیم کے معنی' وہ شے ہے' جو راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جائے''۔کیا بات ہے! کہیں فرصت ہوتی تو ایک ایک لفظ کے متعلق میں عرض کرتا کہ عصر حاضر کے علوم میں ان الفاظ کی اہمیت کیا ہے جو قرآن حکیم استعمال کر گیا۔کہا ہے کہ عذاب جحیم سے بچائے گا' کوئی چیز ان کے راستے میں آگے بڑھنے کے لیے رکاوٹ نہیں بنے گی۔کہا کہ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (52:19) وہ جو کچھ تم نے کیا تھا' یہ ساری چیزیں اس کے اندر مضمر تھیں' اس کا نتیجہ تھیں۔یہ ہے قرآن حکیم کی رو سے جسے ہم سزا اور جزا کہتے ہیں اس کا فلسفہ۔تمہارے ہی اعمال کے اندر یہ چیزیں تھیں' یہ کہیں خارج سے نہیں ملیں' کوئی احسان کے طور پر نہیں ملیں' خیرات کے طور پر نہیں ملیں' تم اس کے مستحق تھے۔کہا ہے کہ كُـلُـوْا وَاشْـرَبُـوْا هَـنِـيْـئًـا بِـمَـا كُنْتُمْ تَـعْـمَلُوْنَ o مُتَّـكِـئِـيْـنَ عَـلٰـى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ وَّزَوَّجْنٰـهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ o (52:19-20) یہ سب تمہاری اپنی ہی محنت کا ثمرہ ہے۔تمہارے لیے جاہ و مناصب کا سامان موجود ہے۔برابر برابر بچھے ہوئے تخت جن پر تم متمکن ہو۔

جنّتی زندگی اور ہمارے ہاں کی طبقاتی زندگی

عزیزانِ من! یہ وہی مثال کے طور پر ہیں جو سننا چاہیں یا جو یہاں کے معاشرے میں دیکھنا چاہیں۔کھانے پینے کو یہ چیزیں ہیں' ٹھنڈا پانی ہے' درخت ہیں' ان کے اندر جھکے ہوئے پھل ہیں اور لحمِ طیور ہے۔یہ ساری چیزیں ہیں اور وہ صوفوں پہ بیٹھے ہوئے ہیں' تختوں

کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں تو بات تو اتنی کافی تھی لیکن قرآن کریم تو ہر مقام پہ اپنا' جو اس کی تعلیم کا ملخص ہے' اس کو بھی ساتھ رکھتا ہے۔ یہاں کسی جگہ بھی نشستوں کو دیکھیے۔ اس میں طبقات کا اہتمام ہوتا ہے' طبقات کا اختلاف ہوتا ہے' یہ سرکاری تقاریب کے اندر ہم لوگ تو ان کو آج کل صرف ٹی وی پہ ہی دیکھتے ہیں' میں تو سروس میں رہا ہوں' مجھے پتہ ہے کہ وہاں یہ چیز Determine (متعین) کی جاتی تھی کہ صفِ اول میں کون کون' کس کس عہدے کے' پھر دائیں سے لے کر بائیں تک' کس طرح سے نیچے سے اوپر' پھر اوپر' یہ جانے والے' نیچے جانے والے' ہر جگہ طبقات کا خیال و لحاظ رکھا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! اسلامی نظام میں طبقات کہیں نہیں ہوتے۔ وہاں انسان اور انسان میں فرق صرف کفر اور ایمان کا ہوتا ہے' اعمال کے وزن کا ہوتا ہے۔ جسے ہم وہ پستیوں اور بلندیوں کے طبقات کہتے ہیں' وہ ہمارے ہاں تو یہ ہوتے ہیں کہ وہ نیچ ذات کا' اونچی ذات کا ہے' وہ غریبی اور امیری کے تفاوت ہیں' عہدوں کے تفاوت ہیں' اور قدم قدم پہ برادریوں کے تفاوت ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی مجسٹریٹ نے یہ کہا تھا کہ اس کو سزا تو یہ ہے کہ اس نے زنا کا کوئی جرم کیا تھا' وہ اتنی ہی سزا دینی چاہیے لیکن یہ میراثی ہے اور وہ لڑکی سید زادی ہے اس لیے اس کو دگنی سزا ہونی چاہیے یعنی اس جرم میں بھی یہ جو تفاوت ہے' اس کو ذہن میں رکھا جا رہا ہے۔ قرآن حمید کی رو سے یہ طبقاتی تفاوت نسلی برادری کے' ذاتوں کے طبقات' امارت و غربت کے ہیں مگر قرآنی معاشرے میں تو ان کا سوال ہی نہیں' وہاں یہ امیر غریب ہوتا ہی نہیں ہے۔ یہ جو انسان اور انسان میں تفاوت ہے اس کے اندر اس کے معیار یہ نہیں ہیں۔ جو بھی اس نے اہل جنت قرار دے دیا' جو بھی اس میں Enter ہو گئے' وہ تختوں پہ بیٹھے ہوئے ہوں گے۔ قرآن حمید کی بڑاوت کا اندازہ لگائیے کہاں تک پہنچتا ہے کہ سُرُرٍ مَّصۡفُوۡفَةٍ (52:20) برابر برابر بچھے ہوئے تختوں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہوں گے' نشستوں میں طبقاتی تفاوت نہیں ہوگا۔ کیا بات ہے صاحب! اصل چیز تو یہ ہے۔ انسان اور انسان کے اندر صرف ایک چیز میرٹ ہونی چاہیے جس کی بناء پہ دونوں کے اندر کچھ فرق کیا جائے اور کوئی تفاوت کی بات نہیں۔ جب آپ نے ایک جگہ آن میرٹ جنت کی زندگی میں' ان کو بھیج دیا' اب وہاں کوئی تفاوت نہیں ہے' افتراق اور اختلاف کوئی نہیں ہے' وہاں کوئی طبقات نہیں ہیں' سُرُر رسب کے لیے ہیں اور مصفوفۃ ہیں' وہ برابر برابر بچھائے ہوئے ہیں۔

لفظ زوج کی تفصیل قرآن کریم کے آئینہ میں

لیجیے عزیزانِ من! آگے اب پورا درس لے لینے والی بات آ گئی۔ کہا کہ وَزَوَّجۡنٰهُمۡ بِحُوۡرٍ عِيۡنٍ (52:20)۔ یہ لفظ حور تو آپ کے ذہن میں آ ہی گیا ہوگا۔ یہ لفظ ہمارے ہاں اتنا پامال ہوا ہے کہ ان حور بیچاریوں کا پتہ نہیں' وہاں کیا حشر ہوا ہوگا۔ یہاں حور' زوجنا آیا ہے۔ جونہی زوج کا یہ لفظ آیا اور انہوں نے فوراً نکاح پڑھا لیا۔ بیوی بنانے کے سوا ان کے ہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ان بیچاروں کے

اعصاب پہ عورت سوار [1] ہے۔ یہ وہی ہے جسے اقبالؒ نے کہا ہے۔ زوجنا کے معنی زوجہ بنانا' بیوی بنانا ہو گئے' کسی کے ساتھ نکاح پڑھا دینا؟ کہا کہ بحورعین' حوروں کے ساتھ ان کا نکاح پڑھا دیا جائے گا یا ان کو ان کی بیویاں بنا دیا جائے گا۔ آپ ہر جگہ حور کے یہی معنی دیکھیں گے اور عین کے معنی ''بڑی خوبصورت آنکھوں والی حوریں'' ہیں اور حوروں کے ساتھ نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ یہاں تین ہی الفاظ ہیں۔ زَوَّجْنٰھُمْ (52:20) زوج مادہ ہے۔ اس کے معنی ہوتے ہیں ''دو ہم مثل' ہم آہنگ' ایک جیسی چیزوں کو' ایک دوسرے کے ساتھ ملا دینا' ان کا رفیق بنا دینا۔'' ان چیزوں کو ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پہ جو میں کہتا ہوں' یہ جو ریڑھے کے دو پہیئے ہوتے ہیں' یہ ایک دوسرے کے زوج کہلاتے ہیں' وہ ان کا ہم مثل اور ہم آہنگ ہونا ہوتا ہے۔ ایک پہیہ ذرا سا دوسرے پہیے سے بھی چھوٹا ہو تو وہ گاڑی چل ہی نہیں سکتی۔ اب معاشرتی زندگی میں آپ زوج زوجہ اور ازواج کے معنی دیکھ لیجیے کہ اگر ایک پہیہ ذرا سا بھی چھوٹا ہو تو گاڑی نہیں چل سکتی اور اگر ایک گول ہو اور دوسرا چورس ہو' چلا لو گاڑی۔ یہ جتنی ہماری گھروں کی گاڑیاں رکی ہوئی ہیں وہ اسی لیے رکی ہوتی ہیں کہ یہ پہیے زوج نہیں ہو سکے' یہ ہم آہنگ' ہم نوا' ہم خیال' ہم سیرت' ہم مزاج' کوئی چیزیں بھی ہوں ان سے گھر بستا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عورت زوج ہے' مرد نہیں ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ ہم نے کائنات کی تمام چیزوں کو ازواج پیدا کیا ہوا ہے۔ یہ ازواج کے معنی ہوتے ہیں ''ایک دوسرے سے ملتی ہوئی چیزوں کا ایک گروہ'' قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ وَّ كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (56:7) وہاں جو تقسیم کی ہے ہم آہنگ ہونے کی ایک جیسے لوگ ہونے کی' تو کہا کہ ان کے تین گروہ بنا دیئے جائیں' یہی لفظ ازواج آیا ہوا ہے۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (81:7) یہ لفظ ہے۔ جب لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا جائے گا' ایک جیسے لوگوں کو آپس میں ملا دیا جائے گا' تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو لفظ ہے زَوَّجْنٰھُمْ (52:20) میں اس کے معنی ''نکاح پڑھا دینا یا بیوی بنا دینا نہیں ہے'' صرف وہ بھی ایک چیز ہے کہ صحیح اسلامی نظام کے اندر جو میاں بیوی ہوں گے وہ بھی ایک دوسرے کے زوج ہوں گے تو میں نے کہا ہوا ہے کہ ہمارے ہاں تو جب بھی یہاں یہ الفاظ آتے ہیں تو وہ تو زوجہ ہوتی ہے' میاں زوج ہوتا ہی نہیں ہے۔ زوج اس کو بنا دیں۔ اگر لفظ بھی استعمال کریں تو برابری ہو گئی اللہ اکبر یہ زَوَّجْنٰھُمْ (52:20) میں جنتی معاشرے کا ذکر ہے یا جنت والوں کا ذکر ہے۔ بہرحال عورتیں بھی تو جنت کے اندر جائیں گی' مرد بھی جنت کے اندر جائیں گے۔ اس معاشرے کی یہ خصوصیت بتائی گئی کہ وہ ہم آہنگ' ہم خیال' ہم سیرت' ہم سرشت' لوگ ہوں گے' وہ جنتی معاشرہ ہو گا' ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملایا جائے گا۔ یہ ساتھ ملانے کا باب ہے۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کہ جنت انفرادی زندگی کا نام نہیں۔

---

[1] ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں ''ہنروران ہند'' کے عنوان میں یہ شعر کہا ہے:

ہند کے شاعر و صورت گرد افسانہ نویس

آہ' بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

انفرادی زندگی کا تصور تصوف کا پیدا کردہ ہے قرآن کریم کا نہیں

عزیزانِ من! انفرادی زندگی کا تصور تو ہمارے ہاں تصوف نے دیا جو ہم نے دوسروں سے مانگ کرلیا۔ ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ورد و وظائف میں' ریاضتوں میں' مراقبوں میں' لو لگائے ہوئے ہیں' اور اس سے کہو کہ آپ کو جو کچھ حاصل ہوا ہے ہم تک پہنچا دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کیا بتائیں کہ ہمیں کیا کچھ حاصل ہوگیا' ہم تو روز جنت کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں' اور جنت تو کچھ مقام ہی نہیں ہوتا' ہم اس سے بہت آگے ہوتے ہیں' وہ تو اللہ میاں کے حضور روز ہوتے ہیں' وہاں ان سے کہا کہ صاحب! ہمیں بھی کچھ دکھا دیجیے' کچھ تھوڑا سا ہی اس کا سرور دے دیجیے۔ کہا کہ 'ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی! شراب کا نشہ تو اسی کو معلوم ہوتا ہے جو پیئے' خود کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں پیوں اور تمہیں بتاؤں کہ نشہ کیا ہوتا ہے' خود پیو گے تو یہ نشہ ملے گا یعنی اس کے اندر وہ اتنی انفرادیت لے آئے کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ یہ قرآن کریم کے تصورِ زندگی کے خلاف ہے۔ وہ انفرادی زندگی کو تسلیم ہی نہیں کرتا' وہ معاشرتی زندگی تسلیم کرتا ہے' وہ امت بناتا ہے' وہ ایک معاشرے کو یہاں بھی جنّتی کہتا ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی۔ وہ تو یہ شرط قرار دیتا ہے۔ کہتا یہ ہے کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْo وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْo (89:29-30) جنت میں جانا چاہتے ہو تو ہمارے بندوں کے زمرے میں شامل ہوجاؤ۔ وہ تو جنت کی شرط یہ بتاتا ہے۔ یہ ہے جی شرط کہ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْo وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْo (89:29-30)۔

جنت میں فرد نہیں جماعت جاتی ہے' افراد جاتے ہیں

عزیزانِ من! فرد جنت میں نہیں جاتا' جماعت جاتی ہے' امت جاتی ہے' گروہ جاتا ہے' اس کے اندر شامل ہونا پڑتا ہے' کارواں کا فرد بنے بغیر یہ سفر طے ہی نہیں ہوسکتا۔ سارا قرآن حکیم اجتماعیت اور اجتماعی زندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ ہم آہنگ لوگوں کو یکساں یکجا کرنے سے یہ سفر آگے چلتا ہے۔ پھر بات کہیں اور نکل جائے گی۔ کہا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) کے معنی یہ ہیں ''ہم آہنگ افراد کا ایک کارواں تشکیل کرنا''' یہ ہوتا ہے نبی کا کام۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ میرے بندوں میں داخل ہوجاؤ' پھر جنت میں جاسکو گے (89:29-30)۔

حُوْرٍ اور عِیْنٍ کا مفہوم اور عربی زبان کے مصادر

عزیزانِ من! زَوَّجْنٰهُمْ (52:20) کے تو معنی ہم سیرت' ہم خیال' ہم ذہنیت ہوگئے' ان افراد کا اکٹھے ہوجانا ہوگئے۔ یہ ایک گروہ بنتا ہے' ان کی دو صفتیں بتائی گئیں۔ زَوَّجْنٰهُمْ کے تو معنی آپ نے دیکھ لیے کہ اس کے معنی نکاح کرنا نہیں ہے' میاں بیوی بننا نہیں ہے' بلکہ ہم آہنگ افراد کا ایک گروہ بن جانا ہے۔ کس قسم کے یہ افراد ہیں؟ کہا کہ بِحُوْرٍ عِیْنٍ (52:20) اس قدر پختگی سے ہمارے ذہنوں کے اندر وہ حور کا تصور آیا ہوا ہے کہ بس یہ لفظ سامنے آیا اور وہاں کی وہ جنت کی عورتیں آئیں۔ سنیے! یہ دونوں الفاظ قرآن کریم میں متعدد

مقامات پہ آتے ہیں۔اسی طرح سے حوراور عین یہ الفاظ آئے ہیں۔حور کا مادہ ہے''ح ور''۔اس مادے کے بنیادی معنی آپ کو اب پتہ ہے عربوں کے ہاں الفاظ کے معنی مرتب کیسے کیے جاتے تھے۔مادہ ہوتا تھا ایک' اوراس کے اندر وہ جتنی اس کی خصوصیات ہوتی ہیں' وہ ساری اس مادے کے اندر لاتے تھے' وہاں سے پھر مختلف ابواب کے' مختلف شکلوں کے الفاظ' وہ قاعدے کی رو سے تراشتے تھے' بناتے تھے۔ان میں وہ بنیادی خصوصیت بہرحال ہونی چاہیے جو مادے کی خصوصیت ہے۔یہ عجیب Scientific Language (سائنسی زبان) ہے۔ یہ تو بنیادی خصوصیت ہے۔

اب یہ جو مادہ''ح ور'' ہے' اس کی بنیادی خصوصیت ہے: سفید ہونا' صاف ہونا' شفاف ہونا' بے داغ ہونا' اوراس کے ساتھ منتخب ہونا' جس چیز کا لبِ لباب نکالا جائے وہ صاف شفاف سفید ہو اور یہ منتخب بھی ہو' وہ عرب میدے کے لیے یہ لفظ بولا کرتے تھے۔کیا بات ہے ان لوگوں کی! اس کے اندر یہ ساری خصوصیات محسوس شکل میں سامنے آجاتی ہیں کہ لطافت بھی ہے' نفاست بھی ہے' سفیدی بھی ایسی عمدہ ہے جو ان کے ہاں دیکھی نہ جائے' پھر وہ گیہوں کا لبِ لباب بھی ہے' منتخب بھی ہے۔یہ''حواری'' آپ کو پتہ ہے کہ قرآن کریم میں حضرتِ عیسیٰؑ کے ساتھ جو رفقا تھے ان کے لیے یہ لفظ آیا ہوا ہے۔یہیں سے وہ لفظ حور ہے: پاکیزہ سیرت' صاف شفاف سیرت کے منتخب بے داغ انسان۔یہ سب اس کے بنیادی معنی ہیں۔اب یہیں سے لفظ حور ہے۔یہ لفظ واحد نہیں' جمع ہے۔اب آگے دیکھیے یہاں وہ فرق آیا ہے کہ یہ کون سے الفاظ ہیں' جن کی یہ جمع ہے۔اس کا واحد''احور'' بھی ہے جو مذکر کے لیے استعمال ہوتا ہے' مرد کے لیے استعمال ہوتا ہے اوراس کا واحد''حوراء'' بھی ہے جو مؤنث کے لیے استعمال ہوتا ہے تو حور کے معنی ہوئے''پاکیزہ سیرت' پاک فطرت' شفاف کردار کے منتخب افراد' عورتیں مرد دونوں۔عربی زبان کے اعتبار سے اس کے یہ معنی ہیں۔اب زَوَّجْنٰهُمْ (52:20) کی بات بھی سمجھ میں آگئی۔ ایک ایسا معاشرہ' ایک ایسی امت' ایسا گروہ اور ایسی جنت کی جماعت ہے جو مرد عورت دونوں پر مشتمل ہے اور دونوں کی خصوصیت یہ ہیں کہ صاف شاف منتخب پاکیزہ سیرت کے افراد ہیں ایسے جیسے میدہ' جیسے منتخب خصوصیات کی حامل افراد کی جماعت' جو عورتوں اور مردوں دونوں پر مشتمل ہے۔یہ منتخب کے لیے ہے۔یہ آگے بڑھے تو انہوں نے کہا کہ وہ انتخاب عقل وشعور اور فہم وبصیرت کی رو سے ہونا چاہیے چنانچہ ایڈورڈ ولیم لین (Edward William Lane) نے جو عربی۔انگریزی لغت (Arabic- English Lexicon) لکھی ہے' وہ بڑی خوبصورت لغات ہے اس نے حور کے معنی لکھے ہیں: Pure and clean intellect یعنی صاف شفاف عقل' پاکیزہ عقل۔

عقل کا ایک اپنا مقام ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

یاد رکھیے! یہ عقل بجائے خویش نہ تو عیار ہوتی ہے' نہ نیکوکار رہوتی ہے' یہ تو ایک صلاحیت ہے' اس کو اگر آپ تعمیری کاموں میں' صحیح کاموں میں' جسے آپ نیک کام کہتے ہیں' استعمال کریں گے' تو یہ جو خود عقل ہے' یہ نیک اور پاکیزہ بن جائے گی' اگر اسے آپ غلط کاموں

میں استعمال کریں گے، تو یہ عقل عیار ہو جائے گی۔ جب یہ عقل یہ کچھ کرے تو اقبالؒ بھی کہتا ہے کہ ''عقل عیار ہے، سوبھیس بنالیتی ہے'' لیکن یہ بات نہیں کہ آپ عقل کے پیچھے لٹھ لے کر پھرتے رہیں کہ صاحب! عقل ہی نہیں ہونی چاہیے۔ عقل تو وہ ہے جیسے تلوار آپ کے ہاتھ میں ہو، مظلوم کی حفاظت کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہے، مظلوم کے سینے میں گھونپنے کے لیے بھی استعمال ہوسکتی ہے۔ تلوار تو خود نہ اچھی ہے، نہ بری ہے۔ اس کا استعمال اس کو اچھا اور برا بناتا ہے۔ جس طرح دولت ہے، صحت ہے، توانائی ہے، اسی طرح سے آپ کی عقل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ اسے کس طرح سے استعمال کرتے ہیں۔ ایک طرف اقبالؒ یہ بھی کہتا ہے ''عقل عیار ہے'' اور دوسری طرف وہ یہ بھی دعا کرتا ہے کہ

یا عطا فرما خرد با فطرت روح الامیں

''خرد با فطرت روح الامیں'' اس کو حور کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ ہے Pure & Clean Intellect۔ اندازہ لگائیے ایک مستشرق غیر مسلم انگریز ❶ عربی کا لغت ❷ لکھتا ہے اور وہ عربوں کے تصور کے مطابق صحیح معنی Pure & Clean Intellect لکھتا ہے لیکن معاف رکھیے ہمارے ہاں تو عربی زبان کا ایک فقرہ ہے اور اس کے متعلق بعض اوقات تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ حدیث بھی ہے، بہر حال میں تو ان چیزوں کو حدیث نہیں مانا کرتا وہ ہے **اهل الجنت** ...... وہ جو جنّتی ہیں، تو وہ سائیں لوگ ہوتے ہیں، جی! اللہ میاں والے سے جنہیں بیوقوف کہتے ہیں کہ جی! وہ جنت میں تو ایسے بھولے بھالے اللہ میاں والے، سائیں لوگ جاتے ہیں'' جی! ہے اللہ میاں دیا جی'' کچھ پتہ ای نئیں ہیگا جی اینوں۔ آساڈے جیہڑا ہن نیک دا تصور ہیگا وے، ایک جیہڑا متقی دا لفظ ہیگا جتھے استعمال ہوندا ہیگا (جی! وہ اللہ تعالیٰ کا ہی ہے، اسے تو کچھ پتا ہی نہیں ہوتا۔ یہ جو ہمارے ہاں اب تک کا تصور ہے یہ جو متقی کا لفظ استعمال ہوتا ہے) یعنی یہ چیز ہے کہ وہ جی! اللہ میاں دا جی ہے جی اونوں تے پتہ ای نئیں جی ایناں چیزاں دا کجھ وی نئیں (جی! وہ تو اللہ میاں کا ہی ہے جی! اسے تو ان چیزوں کا علم ہی نہیں ہے)۔ یہ **اهل الجنت** ...... آپ کے ہاں مشہور ❸ ہے۔ یہ آپ کو معلوم ہے کہ یہاں سے ابلہ کا لفظ ہے۔ ابلہ وہ ہے جسے فریبی کہتے ہیں اور اقبالؒ نے بھی یہ لفظ اپنے ہاں اشعار میں استعمال کیا ہے کہ

نے اَبلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند ❹

---

❶ اس کا نام ہے ایڈورڈ ولیم لین

❷ اس کی لغت کا نام ہے Arabic- English Lexicon

❸ اور اس قسم کی روایات بھی وضع کی گئی ہیں کہ **لن یدخل احد کم الجنة بعمله** یعنی تم میں سے کوئی شخص اپنے اعمال کی بدولت جنت میں نہیں جا سکے گا۔ اس روایت کو تاج العروس نے نقل کیا ہے اور وہاں سے لین نے اپنے قاموس میں (حرف ب کے تحت) درج کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اور اس قسم کی دیگر روایات وضعی ہیں (حوالہ پرویزؒ: کتاب التقدیر، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور، 1986، ص: 393)

❹ کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے اَبلہ مسجد ہوں، نہ تہذیب کا فرزند (اقبالؒ: بالِ جبریل)

عزیزانِ من! عقل انسانیت کی بہت بڑی صلاحیت ہے جس کو آپ لوگ بصیرت کہتے ہیں' جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ اب اس کا استعمال ہے جو اس کو غلط اور صحیح بنا دیتا ہے۔

لفظ حور کے بعد لفظ عین کے معنی اور اس کا مفہوم

بہر حال یہ لفظ تو ہوا حور۔ اب دوسرا لفظ عین ہے۔ بنیادی طور پر اس لفظ کا مادہ ''ع ی ن'' ہے۔ یہ اتنا وسیع المعنی مادہ ہے کہ لغت کے اندر سو سے بھی زیادہ اس کے معنی کیے جاتے ہیں لیکن جو اس کی بنیاد ہے' وہ پھر صاف اور شفاف آنکھ کی ہے۔ عربوں کے ہاں یہ جو باہر صحرا کی گائے ہوتی تھی' ان کی اس قسم کی بڑی خوبصورت آنکھیں تھیں' اور بڑی آنکھ کی خوبصورتی یہ ہوتی ہے کہ اس کی سفیدی بھی بڑی سفید ہو' شفاف سیاہی بھی اس کی بڑی صاف ہو' اور دونوں کے اندر توازن ہو۔ ذرا سی سیاہی بڑھ جائے یا ایک طرف کو ہو جائے تو ساری خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے۔ تو یہ جو اس قسم کی آنکھ ہوتی تھی' وہ جنگلی صحرا کی گائے یا جنگلی گائے کی تھی۔ عین آنکھ کو کہتے تھے۔ ہمارے ہاں آہو چشم کہتے ہیں' یہ ہمارے ہاں شاعری میں ہرن کی آنکھ کو کہا جاتا ہے۔ ایران میں ہوتے تھے' انہوں نے اس سے تشبیہہ دی۔ عربوں نے اپنے ہاں کی گائے سے تشبیہہ دی۔ معنی بنیادی طور پر صاف اور شفاف آنکھ کے ہیں۔ بدبیں آنکھ نہ ہو' صاف اور شفاف ہو کہ نظر بھی اس کو سب کچھ آئے اور نیک بھی ہو۔ بدبیں نہ ہو۔ عقلِ جہاں بیں جسے اقبالؒ کہتا ہے: عقل خود بیں دیگر و عقلِ جہاں میں بیں دیگر است۔ یہ جو آنکھ ہے اس کو وہ عین کہتے تھے۔

جنّتی زندگی کے مکینوں کی بنیادی خصوصیات

حور کی طرح یہ لفظ ''عین'' بھی جمع ہے۔ اس کا واحد ''اعین'' بھی ہے جو مذکر ہے اور اعینہ بھی ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ حور بھی اور عین بھی مذکر و مؤنث دونوں کیلیے ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کہاں کی بات کہاں جا پہنچی۔ کہا ہے کہ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (52:20) ہم آہنگ اور ہم فکر لوگ اس معاشرہ میں اکٹھے کر دیئے جائیں گے لیکن یہ بدمعاش لوگ بھی تو ہم آہنگ باہم دگر ایک جیسے ہو جاتے ہیں' ہو سکتے ہیں۔ کہا کہ نہیں' وہ تو بِحُوْرٍ عِيْنٍ (52:20) ہیں' ان کی صاف شفاف سیرت ہے' وہ عقل منتخب کے مالک ہیں' پاکیزہ سیرت ہیں' ان کی ایسی نگاہ ہے جو صاف اور شفاف بھی ہے اور ہمیشہ نیکی کی طرف جائے۔ ان خصوصیات کے حامل افراد' مردوں اور عورتوں' پہ مشتمل یہ ایک معاشرہ ہوگا جس کو جنّتی زندگی کہتے ہیں۔ یہ ہیں معانی ان کے' عزیزانِ من!

جنت میں ماں باپ کے ساتھ اولاد بھی لیکن ایک شرط کے ساتھ واجب التکریم انسان ہے

لیجیے کہا ہے کہ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍo وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ (52:20-21) یہ

تو وہاں جائیں گے اور جو جانے والا ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ صاحب! ہمارے ہاں بال بچے بھی تو ہیں' وہ بھی تو ہمارے ساتھ ہونے چاہئیں' ہماری اولاد ہمارے ساتھ ہونی چاہیے "بلکہ او تے کیندے نیں ریل اچ ادھا کرایہ ایہد اہونداا ے بچے دا" (بلکہ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ بچے کا ریلوے آدھا کرایہ ہوتا ہے)۔ یہ ساتھ ہونے چاہئیں۔ کہا کہ یہ یہاں جو کسی کی اولاد ہونا ہے' یہ جنت میں جانے کا کوئی استحقاق نہیں ہے' انہیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو۔ تو کہا کہ وَاتَّبَعَتۡهُمۡ ذُرِّيَّتُهُمۡ بِاِيۡمَانٍ (52:21) ان کے بھی ایمان اور عمل تمہارے جیسے ہوں گے' تو پھر یہ تمہارے ساتھ' وہاں جنت میں ہوں گے' وہاں ہم تمہیں ماں باپ کے ساتھ ملا دیں گے لیکن اسی قسم کی اولاد جو اسی معیار کے اوپر پوری اترے' جو ایمان اور عمل کا معیار ہوتا ہے' محض کسی کی ذریت یا اولاد یا نسل یا نسب میں سے ہونا' کسی کو کسی مراعات کا بھی مستحق نہیں بناتا۔ قرآن کریم تو آیا ہی ان چیزوں کو مٹانے کے لیے تھا۔

عزیزانِ من! یہ نسلی امتیازات کہ یہ اونچی ذات کا ہے' یہ نیچی کی ذات کا ہے' صاحب! یہ بڑے کا بیٹا ہے' یہ چھوٹے کا بیٹا ہے۔ وہ جو پیدا ہونے والا ہے' یہ اس سے کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ بتاؤ! یہ تمہیں نیچی ذات والے کے گھر پیدا کر دیں یا سید کے گھر پیدا ہونا چاہتے ہو۔ وہ تو ایک طبعی فعل ہے' اس کے نتیجے میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے' وہ تو نہ خود بلند ہوتا ہے' نہ پست ہوتا ہے۔ وہ تو قرآن کریم کی رو سے وَ لَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ (17:70) ہر انسانی بچہ انسانی بچہ ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔ کیا بات ہے صاحب! تین لفظوں کے اندر قرآن کریم نے تفاوت اور طبقات کے تمام معیار ختم کر دیئے۔ کہا ہے کہ ہر انسانی بچہ' صرف انسانی بچہ ہونے کی بنا پر یکساں واجب التکریم ہے۔ امیر اور غریب کے گھر میں پیدا ہونے' اونچی ذات اور نیچی ذات والے کے گھر میں پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ تو انسانی بچہ ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک خون کے رشتہ کی یا ذریت کی اہمیت نہیں ہے

عزیزانِ من! آگے معاشرے کے اندر بسنے والے افراد کے درجات کا تعین یوں کیا کہ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا (6:132) اس کے بعد پھر یہ جس قسم کے معارے میں کام کرے گا اس قسم کا اسے مقام مل جائے گا' یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ کس کے گھر میں پیدا ہوئے۔ "ذات تیری کی ہیگی۔ ذات ای نئیں' اگے گوت پچھدے نیں" (یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ تمہاری ذات کون سی ہے مگر یہاں تو ذات ہی نہیں بلکہ گوت تک کا بھی پوچھتے ہیں کہ کیا ہے)۔ کہا کہ یہ بات لازمی جائے گی۔ تمہاری اولاد کا یہ جذبہ' ہم سمجھتے ہیں' کہ قابلِ تحسین ہے لیکن ہر اولاد نہیں۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ ہر شخص کی حالت کو' اس کے اعمال متعین کرتے ہیں۔ جیسے اعمال ویسی اس کی حالت۔ آپ کو یاد ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ سے فارغ ہونے کے بعد دعا کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ہاں ابراہیمؑ! ان چیزوں کا جو

صلہ ہے‘ وہ ہم تمہیں دیں گے۔ باپ تھا اور قرآن حکیم نے کہا ہے کہ بڑا حلیم الطبع باپ تھا۔ پوچھا کہ یا اللہ! یہ میرے ہیں اور جو میری اولاد ہے‘ اس کے لیے کیا ارشاد ہے؟ ابراہیمؑ کی اولاد کا ہونا تو ہمارے ذہن میں ہے۔ آپ سوچیے کہ محض سید کا نسب دے دینے سے کتنا بڑا مقام ہو جاتا ہے۔ میری اولاد کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ کہا کہ **لَا یَنَالُ عَهۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ** (2:124) وہ اگر ظالم ہوں گے تو پھر ان سے یہ وعدہ پورا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا اولادِ ابراہیمیؑ ہونا کوئی وجہ ترجیح نہیں ہے۔

عزیزانِ من! نسب اور حسب کی کوئی ترجیح یہاں نہیں ہے۔ یہ سب غیر قرآنی تصورات ہیں۔ انہی ذریت میں سے تمہارے ساتھ انہی کو ملایا جائے گا جو ایمان میں تمہارے ساتھ ہوں گے۔ کہا کہ **وَمَاۤ اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ** (52:21) ہاں یہ بات ضرور ہے کہ کسی کے عمل میں سے کوئی ذرہ برابر کمی نہیں کی جائے گی‘ اس کا پورا پورا بدلا دیا جائے گا۔ وہ تو میں نے عرض کیا ہے کہ اس میں کمی اور زیادتی کا سوال ہی نہیں ہے‘ وہ ”کمی اور زیادتی“ تو اس عمل کے اندر موجود ہوتا ہے۔

ہر انسان اپنے اعمال کے عوض رہن رکھا ہوتا ہے

اب یہ رہا کہ وہ ذریت کچھ کام نہیں دے گی‘ نسب وحسب کام نہیں دے گا۔ پھر سوال یہ ہے کہ کام کیا چیز دے گی۔ ایک فقرہ ہے‘ عزیزانِ من! پتہ نہیں کتنے کتنے اصول ہیں مگر وہ فقرہ دنیا کے اوپر بھاری ہے اور الفاظ سنیے! کن الفاظ میں بات کہی ہے؟ کہا کہ **کُلُّ امۡرِیًٔۢ بِمَا کَسَبَ رَهِیۡنٌ** (52:21) سن رکھو! اب کن الفاظ میں‘ میں اس کا ترجمہ کروں! ”ہر شخص جو کچھ اس نے کیا ہے‘ کہتے ہیں He is bound by it (وہ ان اعمال میں مقید ہے)‘ وہ ان میں Pledge ہو گیا ہے‘ ہمارے ہاں جس چیز کو رہن رکھا ہوا کہتے ہیں‘ کہا ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو ان چیزوں سے Bound (مقید) کر دیتا ہے جو وہ کرتا ہے‘ وہ اپنے اعمال سے رہن رکھا جاتا ہے‘ اس کے اعمال اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف یہ چیز ہے کہ ہر فرد ان اعمال کے اندر گھرا ہوا ہوتا ہے۔ اب اس میں حسب ونسب کا‘ رعایت کا‘ سوال ہی کچھ نہیں ہے وہ تو **کُلُّ امۡرِیًٔۢ بِمَا کَسَبَ رَهِیۡنٌ** (52:21) ہے۔ یہ قانونِ مکافاتِ عمل اس میں کسی قسم کی رو رعایت نہیں کرتا Natural Consequences of actions (اعمال کے فطری نتائج)‘ ہر فرد کے اپنے اپنے اعمال‘ اس کے گرد ایک گھیرا ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ان اعمال میں Bound by (مقید) ہے۔ اس کے لیے جو صحیح لفظ آ سکتا ہے وہ Pledge ہوتا ہے۔

جو کچھ تم چاہو گے ملے گا بلکہ اس سے بھی زیادہ

یہ تو ہوا ان کے متعلق۔ آگے کہا کہ **وَاَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاکِهَةٍ وَّلَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ** (52:22) اور اس کے علاوہ ہم ان کو اور بھی بہت سے پھل دیں گے اور پھر وہ گوشت بھی ہوگا‘ جسے لحم طیبت بھی اور نہایت عمدہ بافراط بھی کہا ہے۔ ہرنوں کا گوشت بھی ہوگا اور کس قسم کا

گوشت ہوگا مِـمَّـا یَشْتَهُـوْنَ (52:22) جس قسم کا چاہو گے ملے گا۔ ٹھیک ہے ایک ہی قسم کا گوشت سب کو دیا جائے تو طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اس لیے کہا کہ مِـمَّـا یَشْتَهُوْنَ (52:22) وہ ملے گا۔ اور دوسرے مقام پہ تو آپ کو معلوم ہے' قرآن حکیم نے کہا کہ جو کچھ مانگو گے ملے گا' جو کچھ چاہو گے ہوگا پھر کہا کہ وَلَـدَیْنَـا مَزِیْدٌ (50:35) اور ہمارے ہاں اس سے بھی زیادہ ہے جو کچھ تم چاہو گے اور مانگو گے۔ کیا بات ہے اس خدا کی! جو کہتا ہے کہ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ (52:22) جس قسم کا چاہو گے ویسا لے لو گے۔

مشروبات کی کیفیت بے تکلف محفل

عزیزانِ من! پھر اس کے بعد پینے والی چیزیں آتی ہیں۔ لفظ تو اس کے لیے شراب کا آجاتا ہے لیکن عربوں کے ہاں تو ہر پینے والی چیز کو شراب کہتے تھے' ہمارے ہاں یہ نہیں کہتے' ہمارے ہاں تو شراب شراب ہی ہوتی ہے' جس کو Wine کہتے ہیں جبکہ ان کے ہاں ہر پینے والی چیز کو شراب کہہ دیتے تھے۔ یہ پینے والی چیزیں ہیں۔ قرآن کریم نے یہ کہا ہے کہ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا (76:17) توانائیاں دینے والی چیز ہے۔ اب دیکھیے! بات وہ ان محفلوں کی کرتا ہے جو ایران و روم میں منعقد ہوتی تھیں۔ وہاں تو پھر آپ سمجھتے ہیں کہ شراب کے پیالے کس طرح سے چلتے تھے' کیسے محفلیں جمتی تھیں۔ قرآنِ کریم ان کے ہاں کا ذکر تو کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ خصوصیت کیا بیان کرتا ہے؟ کہتا ہے کہ یَتَنَـازَعُـوْنَ فِیْهَـا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِیْهَا وَلَا تَاْثِیْمٌ (52:23) پیالے میں وہ کچھ پینے کو ملے گا' جس کا نتیجہ یہ لغو اور تاثیم نہیں ہوگا۔ یہ جسے ہم شراب کہتے ہیں' اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس میں پہلی چیز یہ ہوتی ہے کہ انسان بڑے لغو' بڑے بکواس کرنا شروع کر دیتا ہے' لغو باتیں کرنا شروع کرتا ہے۔ ہوش تو قائم نہیں رہتے' پھر اس میں پہلی چیز لغو ہوتی ہے اور جب نشہ اترتا ہے' جسے خمار کہتے ہیں "او کیندے نیں ہڈیاں توڑسٹدا اے خمار جیہڑا ہوندا اے" (کہتے ہیں کہ جسے خمار کہتے ہیں' وہ ہڈیاں توڑ دیتا ہے) یہ جو اس سے افسردگی و اضمحلال پیدا ہوتا ہے' ہڈیاں ٹوٹنے والی جو چیز پیدا ہوتی ہے' کہا کہ نہ تو اس کے اندر لغو ہوگی کہ انسان بکواس شروع کر دے اور نہ ہی یہ ہوگا کہ اس کے بعد ایسا خمار ہو جو افسردگی اور اضمحلال پیدا کر دے۔ اثم کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس کا ترجمہ ہی گناہ کر دیا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ پینے کے لیے ایسی چیز ہوگی جس کے نتیجے میں نہ تو ہوش و حواس گم ہوں' اور نہ اس کے بعد اس کا خمار ایسا ہو کہ انسان کی رہی سہی توانائی بھی ختم ہو جائے' اضمحلال پیدا ہو' اس قسم کی چیز پیدا ہو بلکہ وہ تو توانائیاں عطا کرنے والی چیزیں ہیں جو قرآن کریم نے بتایا ہے کہ وہاں یہ چیز ہے اور توانائیاں ملیں گی۔

اب یہاں یَتَنَازَعُوْنَ فِیْهَا (52:23) ہے۔ عام طور پہ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک دوسرے سے وہ ہے جیسے چھینا جھپٹی ہوتی ہے۔ تنازعہ کے معنی یہ لے لیے جاتے ہیں۔ تنازعہ کا معنی جھگڑا بھی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تنازعہ کے معنی جھگڑا ہوا اور یہ ہوا کہ بس پھر وہ "اک

دوسرے کولوں کھو کھا کے پینیدے ہونگے'' (وہ ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو پڑتے ہوں گے)۔ اندازہ لگائیے کہ یہ بڑا خوبصورت لفظ ہے۔ اس قسم کی محفلوں میں جب ہم آہنگ' بے تکلف دوست بیٹھے ہوں' شراب کو تو چھوڑ دیجئے' عام کھانے پینے کی چیزوں میں آپ دیکھیں گے کہ ایک کھا رہا ہے' دوسرا لپک کر اس سے لیتا ہے ''اوسارا ای کھا گیا ایں'' (ابے! تُو تو تماماً چٹ کر گیا!) یہ باہمی یگانگت اور محبت کی بے تکلفانہ محفلیں ہوتی ہیں یعنی قرآن حمید کہاں تک جاتا ہے' عزیزانِ من! آپ غور کیجیے کیا نقشہ کھینچتا ہے! ہم آہنگی ہے' اس قسم کے دوست بیٹھے ہوئے ہیں' کسی قسم کی غلط فہمی نہیں' بے تکلفی ہے' تو وہ کہنے لگا کہ اس قسم کی چیز ہے کہ لپک جھپک کر ایک دوسرے سے لے لیں گے۔ او بھئی سارا ہی نہ پی جاؤ' میرا بھی اس میں سے حصہ رکھو۔ کہنے لگے کہ یہ اس کے اندر اس قسم کی محفلیں ہوں گی۔ کیا خوبصورت محفل ہے!

قرآن کریم کے ہاں غلمان کے معنی اور اُن کا کیریکٹر

عزیزانِ من! ایک لفظ اور بھی لے لیجیے۔ کہا ہے کہ **وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ** (52:24) پھر یہ اگلی بات آ گئی کہ وہ غلمان ان کے گرد گھوم رہے ہوں گے اور جیسے حور کی طرح پہلے بات آئی ہے اسی طرح' جب آپ غور فرمائیے' غلمان کے معنی تصور میں کیا لیے جا رہے ہیں۔ لڑکے اس کے عام معنی کیے جاتے ہیں۔ اس کے معنی بیٹے بھی تو ہیں۔ کیا یہ بیٹا لڑکا نہیں ہوتا؟ یہ عربی زبان کے اندر بولا جاتا ہے اور وہ ہے ایک خاص عمر سے خاص عمر تک' جوانی کے ابھار تک' کی عمر کا جو بھی بیٹا ہے' اس کے لیے لفظ غلمان آتا ہے۔ قرآن کریم نے بشارتیں دی ہیں حضرت ابراہیمؑ اور غالباً حضرت ذکریاؑ کو' اس میں یہ لفظ آئے ہوئے ہیں۔ بیٹوں کو بھی کہتا ہے۔ ابھی پچھلی آیت میں یہ تھا کہ ان کی ذریت' ان کے بال بچے' ان کے بیٹے' کہا کہ وہ بھی ساتھ ہوں گے جوان میں سے صاحبِ ایمان ہوں گے' وہ بھی وہاں ہوں گے' وہ وہاں گھروں کے اندر کام کاج کر رہے ہوں گے۔ ان کی بھی اور بڑوں کی جیسے کچھ خدمت سی کرنے والے ہوتے ہیں' وہی ہوں گے۔ یہ ہیں جن کے معنی غلمان کے ہیں اور ان کی بھی اتنی سی بات نہیں کی کہ غلمان کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ کہا کہ **لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ** (52:24)۔ کیا بات ہے صاحب! بے داغ جوانی' سپیدہ سحر کی طرح نوجوان لڑکوں کی بات آئی تو اس عمر کے اندر تو آپ دیکھتے ہیں لیکن یہ بے داغ جوانی ان کی کیسے بنی؟ واہ واہ کیا تشبیہہ ہے! کہا کہ وہ موتی تھے جنہیں سیپ نے اپنے آغوش میں پرورش کیا ہوا تھا' ان کو باہر کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ' عزیزانِ من! اس طرح یہ پرورش یافتہ غلمان بچے ہیں کہ وہ یہ موتی ہیں۔ موتی کیسے بنتا ہے؟ یہی کہا جاتا ہے۔ ویسے تو پانی کا قطرہ ہوتا ہے لیکن وہ سیپ کی آغوش میں اس طرح سے پرورش پاتا ہے' اقبالؒ کی تشبیہ یہ ہے کہ دعا جو اس نے مانگی تھی کہ زندگی ایسی ہو کہ موجوں کی تلاطم خیزیوں میں' طوفانوں کے اندر' جیسے وہ سیپ ہوتی ہے' اس کے اندر کے موتی کو پتہ نہیں چلتا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ یہ زندگی تصوف کی زندگی نہیں' خانقاہوں کے اندر بیٹھ جانا نہیں' اس کے اندر وہ

طوفانوں کا مقابلہ کر رہا ہوتا ہے' تلاطم خیزیاں ہوں لیکن کیفیت ہو کہ جیسے سیپ کے اندر محفوظ موتی ہوتا ہے۔ اس قسم کا نایاب یہ جوہر ہے۔ یہ سیپ کے اندر پرورش یافتہ موتی' اس قسم کے ان کے وہ لڑکے ہیں' وہ جوان بچے' بھی ان کے ساتھ ہوں گے۔

عزیزانِ من! اور اگلی بات یہ ہے جو میں کہا کرتا ہوں' جس سے میں ڈرا بھی کرتا ہوں' یہ بات اکثر ہوتی ہے کہ جی! وہاں کچھ ایک دوسرے کو پہچانیں گے بھی' ہم وہاں جانیں گے بھی؟ قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ **وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ** (52:25) ایک دوسرے کو ملیں گے' خوش آمدید کہیں گے۔ اب کیا ہو رہا ہے: او اچھا ہوا' آپ بھی آ گئے۔ ''اویار میں تے انتظار کر دا ریا'' (اے دوست! میں تو انتظار ہی کرتا رہا) کہ رہ ہی نہ جائیں' بڑی خوشی ہوئی آپ کو مل کر' آ گئے تم بھی! اچھا بڑی خوشی ہے ایک دوسرے کو۔ یہ چیز ہے پہچاننے والی اور وہی پہچاننے والی چیز ہی ہے جو میں کہا کرتا ہوں کہ میں تو جب اس پہ غور کرتا ہوں تو چیخیں نکل جاتی ہیں' عزیزانِ من! قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہاں صورت یہ ہوگی کہ یہاں جن لوگوں کے پاس تمہارے معاملات پڑے تھے اور کیفیت یہ تھی کہ تم بڑے معتبر بنے ہوئے تھے' بڑا اعتماد جمایا ہوا تھا کہ میں تمہاری خاطر جان دے دوں گا' بڑے امانتدار' دیانتدار' نیکوکار' سب کچھ بنے ہوئے تھے لیکن اس کے متعلق دل میں کچھ اور ہی تھا تم ادھر ذرا رخ کرو' تمہیں چھرا گھونپ دوں گا' تم نے سمجھا کیا ہوا ہے میرے متعلق۔ یہ وہ سب کچھ' جو کچھ بھی اس کے اندر ہے' وہ وہاں سامنے ہوگا اور جو کچھ تم دل میں اس کے متعلق سوچ رہے تھے' وہ عیاں ہو کر سامنے آ جائے گا۔ جن کے سامنے ہم تم اس دنیا میں اتنے معتبر بنے ہوئے پھرتے ہیں' عزیزانِ من! ساری زندگی اپنے آپ کو ان سے چھپائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ ان کے سامنے ہوں گے اور جو کچھ دلوں میں رکھا تھا وہ کھل کر سامنے آئے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ سب سے بڑا جہنم یہ ہے' عزیزانِ من! کہ جن میں ہم اتنے معتبر بنے ہوئے ہیں' ان کے سامنے ہمارے سینوں کے سارے راز جو ان کے خلاف تھے' وہ نکھر کر سامنے آ جائیں اور ایک دوسرے کو ہم پہچان رہے ہوں تو وہ تم یہ تھے (اللہ اکبر)۔ اس سے بڑا جہنم کیا ہوگا! تو یہ ہے جو قرآن حمید نے کہا کہ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے ہوں گے' ایک دوسرے سے باتیں کریں گے' ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ پھر میں آگے بات کروں گا' وہ دو تین آیتیں آگے آتی ہیں' کہ پوچھیں گے۔ اس کا جواب کیا ملے گا' اب درس کا وقت ختم ہو گیا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الطّور کی آیت 25 تک ہم آ گئے' 26 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورۃ الطور (آیات 26 تا 38)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1982ء کی 17 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الطّور کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (52:26)۔

آخرت میں ہر قسم کی منافقت اور پرہیزگاری تمام جاننے والوں کے سامنے عیاں ہو جائے گی اور وہ پہچانتے ہوں گے: گزشتہ سے پیوستہ وضاحت

بات اہل جنت کی ہو رہی تھی۔ سابقہ آیات میں ان کی خصوصیات بتائی گئی تھیں اور یہ آیت پھر ضمناً سامنے آ گئی تھی کہ وَاَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ يَّتَسَآءَلُوۡنَ (52:25) عام طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے' پوچھا جاتا ہے' اور میں نے تو وضاحت سے لکھا ہے کہ کیا اُخروی زندگی میں ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے؟ قرآنِ کریم تو یہ بتاتا ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ کم از کم میرے حساب کے نزدیک تو سب سے بڑا عذاب یہی ہوگا کہ اس دنیا میں ہم جن لوگوں کے سامنے بڑے معتبر' بڑے معتمد علیہ' بڑے دیانتدار' بڑے متقی پرہیزگار' دوست' ہمدرد' بہی خواہ' بظاہر بنے رہتے ہیں اور دل میں ان کے خلاف عداوت و نخوت کے جذبات پرورش پاتے ہیں' بظاہر ہنستے ملتے ہیں' دل میں یہ چیز ہوتی ہے کہ ذرا اس کا رخ پھرے اور دیکھیے میں کس طرح چھرا گھونپتا ہوں' دیانت اور امانت سے لوگوں کے اندر شہرت اور

مقبولیت حاصل کر لی ہوتی ہے جبکہ پوشیدہ زندگی ان کے بالکل خلاف ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ یہاں تو چھپایا جا سکتا ہے اور چھپاتے رہتے ہیں۔ ہم آخر دم تک معتبر بنے رہتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آ جائے گا جسے ہم آخرت کی زندگی کہتے ہیں' اس دن وہاں ہمارا آمنا سامنا ہوگا جن کو ہم کچھ اور بن کر دکھاتے تھے اور دل میں ان کے متعلق کچھ اور ہوتا تھا اور قرآن کریم کہتا ہے کہ جو کچھ دل میں ہوتا تھا وہ ابھر کر سامنے آ جائے گا تو آپ سوچیے کہ وہاں یہ موجود ہوں' جن سے ہم نے ساری عمر منافقت برتی اور وہ خیالات جو ان کے خلاف ہمارے دل میں گزرتے تھے' وہ ابھر کر' نمایاں طور پر' سامنے آ جائیں تو سوچیے پھر کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہاں اگر کہیں ایک دفعہ بھی ایسا ہو جائے کہ ہمارا جھوٹ کھل جائے' فریب نکھر جائے' وہ لوگ سامنے ہوں جن کے سامنے ہم معتبر بنے پھرتے ہیں تو وہاں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اگر ساری زندگی کے اس قسم کے بھید' اس قسم کی منافقت' کھل کر سامنے آ جائے اور وہ سب لوگ وہاں موجود ہوں جن کے سامنے ہم اتنے معتبر بنے بیٹھے تھے' تو کیا کیفیت نہیں ہوگی۔

میں نے عرض کیا ہے کہ میرے نزدیک جسے وہ جہنم کا عذاب کہتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ شدید عذاب اور رسوا کن عذاب ہوگا۔ قرآن کریم نے اسے رسوا کن عذاب بتایا ہے۔ اس سے بڑی رسوائی اور کیا ہو سکے گی کہ جس حلقے کے اندر ہم اپنے آپ کو اتنا معتبر اور اتنا زیادہ متقی اور پرہیزگار بنائے پھرتے تھے' ان کے سامنے اصلیت ظاہر ہو جائے اور وہ سارا حلقہ وہاں موجود ہو۔

عزیزانِ من! اس آیت میں قرآنِ کریم نے اہلِ جنت کے متعلق یہ بتایا ہے کہ **وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ** (52:25) یہ لوگ آگے بڑھ کر نہایت خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کا استقبال اور مزاج پرسی کریں گے۔ یہ قرآن کریم کا انداز ہے۔ بات تو اتنی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے باتیں کریں گے' سوال جواب کریں گے۔ ٹھیک ہے کہنا تو یہی تھا کہ وہ پہچانتے ہوں گے تو باتیں کریں گے مگر یہاں اقبل ہے یعنی آگے بڑھ کر کسی کا استقبال کرنا: آیئے! آپ تشریف لے آئے' انتظار ہی تھا آپ کا۔ یہ ہے کسی کو اس طرح سے' خندہ پیشانی سے' دل کی کشادگی سے ملنا' اس طرح سے اس کا استقبال کرنا۔

اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا تقابلی جائزہ

عزیزانِ من! اب اسی میں یہ بات آ گئی۔ ایک لفظ ''اقبل'' کہہ کر قرآن حمید نے بتا دیا کہ ان کے باہمی تعلقات کس قدر خندہ پیشانی کے اور خوشگواری کے ہوں گے اور وہاں تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہوگی کہ دل میں کچھ اور رکھا ہوا ہو اور چہرے پہ کچھ اور لکھا ہوا ہو۔ وہاں تو زبان اور قلب دونوں ہم آہنگ ہوں گے۔ وہاں جو لفظ اقبل ہے' ایک دوسرے کو مسرت سے' خوشی سے' پہچانتا ہے' ایک دوسرے کا استقبال کرنا ہے' یہی بڑی بات ہے۔ قرآن حمید نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ اہلِ جنت جب داخل ہوں گے تو جو پہلے دوسرے ہیں' وہ سلاماً سلام سے ان کا استقبال کریں گے اور اہلِ جہنم کے متعلق کہا ہے کہ جب بھی کوئی آئے گا تو پیشانی پہ بل پڑ جائیں' خوش آمدید نہیں ہوگی'

ایک دوسرے کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہو جائیں گے' کبیدہ خاطر ہو جائیں گے اور اہلِ جنت کے متعلق یہی کہا ہوا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا استقبال سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ کریں گے۔ کہا کہ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (52:26) اللہ تعالیٰ تو بار بار یہ کہتے ہیں کہ یہ جو جنت مل رہی ہے' وہ تمہارے اپنے اعمال کا ہی نتیجہ ہے۔

مومنین کا جذبہ شکرگزاری

لیکن مومن کا تو انداز یہ ہے کہ اس پہ بھی وہ یہ کہتا ہے کہ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا (52:27) نہیں' یہ خدا کا احسان ہی ہے جو اس نے ہم پہ کر دیا اور حقیقت میں یہی جذبہ شکر گزاری ہے۔ عزیزانِ من!! یہ بڑی چیز ہے قرآنِ کریم نے شکر گزار ہونے کی تاکید بھی کی ہوئی ہے ہمارے ہاں تو اب یہ ساری چیزیں رسمی ہوگئی ہیں جیسے سلام علیکم رسمی ہوگئی ہے۔ یہ اتنی عظیم چیز ہے کہ جب بھی آپ ملتے ہیں' اس سے پہلے یہ چیز کہتے ہیں کہ میں تمہاری سلامتی اور امن کا خواہاں ہوں' میری طرف سے تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا اور وہ جواب میں کہتا ہے وعلیکم السلام' میرا ردِ عمل بھی تمہارے متعلق یہی ہوگا۔ اگر دو افراد یا دو جماعتیں آپس میں ملیں اور ملتے ہی یہی ان کے دل کی آواز ہو' منافقت کی آواز نہ ہو بلکہ یہ ہو کہ میں تمہاری چیز کا' تمہارے امن کا' تمہاری مسرتوں کا' خواہاں ہوں تو وہ کیسا خوشگوار معاشرہ ہوگا!

جنت کا یہ پھل دنیا میں باہمی چاہت' شفقت اور محبت کا نتیجہ ہوتا ہے

لہٰذا وہاں یہ جو کچھ خدا نے ہمیں دیا ہے' کہا ہے کہ یہ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا (52:27) ہے۔ یہ اگلی آیت میں ہے کہ یہ اس کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں دیا ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ پہلے تو یہ خود کہہ دیا کہ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ (52:26) ایک خصوصیت یہ بتائی کہ ہم دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ' ہمدردی سے رہتے تھے' بہی خواہی کے ساتھ رہتے تھے' شفقت اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ ایک خصوصیت بتائی۔ کہا کہ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا (52:27) اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ہم پہ یہ احسان کیا کہ ہم جنت میں آ گئے تو گویا اہلِ جنت کی خصوصیات میں پہلی چیز یہ بتائی کہ ہم آپس میں وہاں' ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے' شفقت سے' پیار سے' ہمدردی سے' غم خواری سے' رہتے تھے اور پھر یہ بھی کہ اس میں منافقت نہیں تھی بلکہ خلوص سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ تو یہ بھی جنت میں آنے کی ایک چیز ہوئی۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم اہلِ جنت کی جن خوبیوں کو گنا تا ہے اور دوسری طرف اہلِ جہنم کے جن ذمائم اور جرائم کا ذکر کرتا ہے تو پہلی بات اہلِ جنت کی جن خوبیوں کو گنا تا ہے یہ نہیں ہے کہ ان کے اندر یہ خوبیاں' یہ صفات' جنت میں جا کر پیدا ہوں گی۔ وہ ان کی ساری صفات اس دنیا کے اندر ہیں۔ ان کے اعمال اس دنیا کے اندر ہیں۔ اگر وہ انہیں کہتا ہے کہ دیانتدار' امانتدار' خلوص' محبت' شفقت' کی چیزیں ہیں تو وہ اسی دنیا کے اندر ان کے ہاں ہیں۔

انسان کو دنیا میں ہی اعمالِ صالحہ کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی تو یہ دنیا جنت بن جائے گی

عزیزانِ من! یہ ساری چیزیں یہ تمام صفات ایسی نہیں ہیں کہ یہاں سے تو وہ ایسے ہی چلے جائیں گے اور جونہی جنت میں داخل ہوئے یہ ساری چیزیں ان میں پیدا ہوگئیں بلکہ یوں کہیے کہ جنت میں وہ جائیں گے جن کی اس دنیا کی زندگی میں یہ خصوصیات پیدا ہوچکی ہوں گی' انہی کو اعمالِ صالحہ یا نیک عمل کہتے ہیں تو اہلِ جنت کی جتنی صفات وخصوصیات قرآن کریم نے گنائی ہیں' وہ اس دنیا کے اندر ان میں پیدا ہوچکی ہوتی ہیں' ان کے اعمال ایسے ہوتے ہیں' انکی خصوصیات وصلاحیتیں اس قسم کی ہوتی ہیں' انہی کو وہ اپنے ساتھ وہاں لے کر جاتے ہیں تو وہ جنت میں داخل ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر ان کو Acquire (حاصل) نہیں کرتے وہ تو اور آگے بات ہے کہ پھر جنت کی زندگی میں مزید کیا کچھ وہ Acquire (حاصل) کریں گے۔ Promotion (ترقی) میں جب لڑکا میٹرک سے کالج کے (مثلاً) ایف اے میں جاتا ہے تو وہ میٹرک کی صلاحیتوں کی بنا پر ایف اے میں داخلہ لے لیتا ہے۔ جب کہتے ہیں کہ اس نے فرسٹ ڈویژن لی تھی یا ہائی مارکس لیے تھے تو وہ میٹرک کی اپنی خصوصیات کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے۔ اب آگے جا کر اس نے جو ایف اے میں یا بی اے میں مزید علم حاصل کرنا ہے' وہ وہاں کی اور بات ہے۔ اس کا کالج میں داخلہ جو پچھلے امتحان یا اس کی میٹرک کی پچھلی زندگی تھی ان میرٹس کی بنا پر اگلی کلاس میں داخلہ ملتا ہے تو جنت میں جو لوگ جائیں گے قرآنِ کریم میں ان کی خصوصیات کا بہت تفصیل سے بار بار ذکر آیا ہے تو وہ ہمارے ذہنوں میں کچھ ایسا ہوتا ہے کہ یہ جنت میں کچھ لوگ ہوں گے' یہ ان کی بات ہے۔ یہاں والوں کی بات نہیں ہے۔ جس شخص میں' جس گروہ میں' یہاں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہوں گی' جو اہلِ جنت کی بتائی ہیں' وہ جنت میں جا ہی نہیں سکیں گے۔ یہاں ویسا بننا ہوگا جیسا وہ اہلِ جنت کو جس طرح سے قرآن کریم قرار دیتا ہے' تو جب ان میں یہ خصوصیات پیدا ہوجائیں تو اہلِ جنت تو یہ یہیں ہوگئے۔ باقی تو Formal (رسمی) سی بات رہ گئی کہ امتحان ہوگا' اس میں پاس ہوں گے تو پھر Promote (ترقی) ہو کر ایف اے میں چلے جائیں' قابلیت تو اس نے پیدا کرلی ہوئی ہے اور اگر یہ افراد ایک ایسا معاشرہ قائم کرلیں گے' ایک ایسا نظام قائم کرلیں گے اس قسم کے افراد جن میں یہ خصوصیات پیدا ہوچکی ہوں گی' تو یہی معاشرہ جنت کی مثل بن جائے گا' اس دنیا کی جنت بن جائے گا۔

اُخروی جنت کے لیے پہلے دنیا کی جنت کا حصول ضروری ہوگا

یہ زندگی جسے میں بار بار جنتِ ارضی کہا کرتا ہوں' وہ بھی کہیں اوپر سے آئی ہوئی چیز نہیں ہے۔ افرادِ معاشرہ کے اندر یہ خصوصیات پیدا ہوجائیں اور وہ اس قسم کا ایک معاشرہ قائم کرلیں' اس قسم کا نظام قائم کرلیں تو یہاں یہ معاشرہ یا نظام جنتی کہلائے گا اور یہاں سے جب آگے بڑھتے ہوئے' اگلی دنیا میں یا اگلی زندگی میں جا پہنچیں گے' یہ اپنی جنت ساتھ لے جائیں گے' جس طرح سے اہلِ جہنم اپنا جہنم ساتھ

لے جائیں گے۔ اہلِ جہنم کے متعلق، جن جرائم، گناہوں، ذمائم کا ذکر قرآن کریم کرتا ہے وہ وہاں جا کر نہیں پیدا ہوتے، وہ یہاں کے جرائم ہوتے ہیں جن کی بنا پہ ان کی زندگی جہنم کی ہوتی ہے۔ تو یہ چیزیں ذہن میں رکھنی چاہئیں کہ قرآنِ کریم میں یہ جو اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کے متعلق ذکر آیا ہے تو وہ اسی دنیا کے اندر جن انسانوں میں وہ چیزیں پیدا ہو گئی ہوں گی، وہی جنت میں داخلے کے قابل ہوں گے جہنم میں جانے کے سزاوار ہوں گے۔ جہنم کی تو بہر حال بات ہی اور ہے۔ وہاں تو ارتقا رک گیا، مزید ترقی کا سوال ہی نہیں ہے۔ جنت کے اندر قرآن کریم نے بتایا ہے کہ اس سے آگے بڑھنے کے، ارتقائی منازل طے کرنے کے، بھی وہاں امکانات ہوں گے تو وہاں کوئی اور پروگرام ہوگا، وہاں کا نصاب کچھ اس میٹرک سے مختلف ہوگا تو اس نصاب کے مطابق پھر آگے چلنا ہوگا لیکن داخلہ جنت میں ان خصوصیات کے ساتھ، ان اعمال کی بنا پر ہوگا جو اس زندگی کے اندر انسان نے کیے ہیں۔ وہ اسی لیے کہا ہے کہ اِنَّا کُنَّا قَبۡلُ فِیۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِیۡنَ (52:26)۔ یہ ''قبل'' کا لفظ قرآن حکیم نے کہا ہے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں واضح کر دوں کہ یہ کیا ہے کہ جنت میں آنے سے پہلے کی زندگی میں ہماری کیفیت یہ تھی اور اس کی وجہ سے فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيۡنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ (52:27) سو اس کی وجہ سے اللہ نے ہم پر یہ نوازشات ارزاں فرمائی ہیں اور ہمیں اس عذاب سے بچا لیا ہے جو تمام محنتوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے۔

ہمارے ذہنوں میں نتائج کے بجائے سزا کا تصور ہی پایا جاتا ہے جو غلط ہے

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی لفظ آیا ہے۔ میں نے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ عام طور پہ ہمارے ہاں ذہن کے اندر سزا کا تصور ہے، نتائج کا تصور نہیں ہے، تو اس بنا پر ذہن میں یہ چیز ہے کہ وہ جو بھی یہاں سے جائے گا، اس نے کچھ تو گناہ کیے ہوئے ہوں گے، کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، بہر حال ہر شخص اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے جہنم میں جائے گا، کوئی تین مہینے کی قید، کوئی چھ مہینے کی قید، کوئی سال بھر کی، کوئی چودہ سال کی سزا پر ہوگا اور وہاں سے سزا بھگتنے کے بعد پھر اس کو نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔ یہ ہے ہمارے ذہنوں کے اندر تصور جبکہ یہ سزا والی بات نہیں ہے اور پھر اس کے بعد ہمارے ہاں جب یہ تصور ہوا کہ سب کو آخر میں جنت میں بھیج دینا ہے، تو پھر عجیب مثالیں ہوئیں کہ وہ تو سینیٹوریم ہوتا ہے جس میں ٹی بی کے مریضوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں ان کا علاج ہو جاتا ہے، پھر وہ تندرست ہو کر آ جاتے ہیں۔ ایک مثال دیتے ہیں کہ صاحب! وہ دھوبی کے ہاں کپڑے بھیجتے ہیں، ان پر آلائش ہوتی ہے، اس کے ہاں وہ میلے ہوتے ہیں، میل کچیل ہوتی ہے، وہ بھٹی پہ چڑھاتا ہے، تو میل کچیل کٹ جاتی ہے، وہ کپڑے صاف ستھرے ہو جاتے ہیں تو یہ سارے تصورات غلط ہیں، عزیزانِ من! قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ غلط اس لیے میں کہہ رہا ہوں کہ قرآن حکیم جہاں بھی یہ کہتا ہے کہ وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ (52:27) عذابِ سموم سے محفوظ رکھا، دور رکھا۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اہلِ جنت کے تو کانوں میں اس کی بھنک تک نہیں پڑے گی، اس کی آواز تک نہیں آئے گی، اتنی دور رکھا جائے گا، تو یہ بات نہیں ہے کہ پہلے وہاں بھیجا جائے گا اور وہاں سے سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ جنت

میں جائیں گے۔ یہ یہودیوں کا تصور تھا۔ انہوں نے یہ کہا تھا۔ قرآن کریم میں بھی یہ ہے کہ ان کا قول یہ ہے کہ ہم چند دنوں کے لیے جہنم میں جائیں گے اور پھر اس کے بعد وہاں سے نکال لیے جائیں گے۔ وہ نکالنے کے الگ الگ طریقے ہیں وہ تو کہتے ہیں کہ ہمارے جو بڑے بوڑھے ہوں گے' بزرگ ہوں گے' اسلاف ہوں گے' وہ وہاں مقدمات میں کوئی شہادت دینے کو کہیں عدالت میں رُکے ہوئے ہوں گے تو اتنے عرصے میں ہمیں وہ جہنم میں بھیج دیں گے اور پھر جب ان کو پتہ چلے گا تو وہ آئیں گے اور وہاں سے ہم کو نکال کر لے جائیں گے یعنی تصور یہ ہے کہ پہلے جہنم میں بھیجیں گے اور وہاں سے نکال کر جنت میں لے جائیں گے۔

ہلاکت کا اثر سنکھیے کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور میزان کا تصور

سزا کا یہ تصور ان کا تصور تھا لیکن قرآن حکیم سزا کا تصور نہیں دیتا' قرآن حکیم میں' جیسا مثال میں کہا کرتا ہوں' کہ سنکھیا کھانے سے جو ہلاکت ہوتی ہے' وہ کسی عدالت کی دی ہوئی سزا نہیں ہوتی' وہ سنکھیا کھانے کا جو عمل ہے یا جو سنکھیا ہے اس کے اندر یہ نتیجہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسے سزا نہیں کہا جا سکتا۔ یہ مکافاتِ عمل ہے۔ اس عمل کے Natural Consequences (فطری نتائج) ہیں اسی لیے یہ وہ تصور نہیں ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے کہا کہ جن کے پاس مارکس مثلاً 60% ہوں گے' ان کو پروموٹ کر دیا جائے گا' آج کی اسکول کی اصطلاح میں یوں سمجھ لیجیے کہ ان کا 60% جو ہے' وہ ان کی 40% غلطیاں ہیں' وہ ان کو Cover (پورا) کر جائے گا۔ دیکھا یہ جائے گا کہ اس میں اگلی کلاس میں چلنے کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہوگئی ہے یا نہیں اور اس کے لیے ایک معیار مقرر ہو جائے گا کہ میرٹ کا پلڑا جھکتا ہو۔ میں نے پچھلی دفعہ بھی کہا تھا اور قرآن کریم میں متعدد مقامات پہ آیا ہے کہ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ (101:6) خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ (101:8) وہ میزان کھڑی کرتا ہے' جونسا پلڑا جھکتا ہے اس کے مطابق اس کا انجام ہوتا ہے' قابلیت اور اعلیٰ خصوصیات اور صفاتِ مومنین کا پلڑا جھکتا ہے وہ جنت میں جاتا ہے حالانکہ دوسرے پلڑے میں بھی کچھ برائیاں ہوتی ہیں اور اگر وہ پلڑا جھکا ہوا ہوتا ہے تو حالانکہ اس پلڑے میں بھی تو کچھ بیشتر اچھائیاں ہوتی ہیں' جو پاس مارکس حاصل نہیں کرتا ہے' اس کے جو مارکس Obtaind (حاصل) ہوتے ہیں' وہ بھی ضائع چلے جاتے ہیں۔

چودہ سو سال پیشتر کے بیان کردہ حقائق' آج کی تحقیق اور ضابطہ ہدایت کو آواز دینا

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیزیں تو کوئی کلاس ہوتی تو میں اس میں یہ عرض کرتا کہ یہ جتنی Scientific Discoveries (سائنسی انکشافات) ہمارے ہاں ہو رہی ہیں' یہ Evolution (ارتقا) کی تھیوری پر ہو رہی ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان' اپنی تحقیق کے بعد' اس نتیجے پہ پہنچے ہیں جو قرآن کریم نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا کہ ارتقا کے سلسلے میں' جس میں اگلی منزل میں جانے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہو' وہ اگلی منزل میں چلا جاتا ہے حالانکہ اس میں بہت سے اسقام اور کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن

کریم نے جو کہا تھا کہ حسنت کا پلڑا بھاری ہو تو سیأت کو Cover (پورا) کر لیتا ہے۔ یہ بات عین Scientific (سائنسی) ہے۔ یہ سارا اصول Evolution (ارتقا) کا ہے وہ سارا اس بنیاد پہ چلتا ہے اور وہ اس پہ تحقیق کرتے ہیں کہ کس جنس میں اتنی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی یا ہو جاتی ہے کہ وہ اگلی منزل میں جانے کے قابل ہو جاتی ہے تو قرآن حکیم میں یہ اصول دیا ہے۔ یاد رکھو! اسی لیے کہا ہے کہ ہمیں اس عذاب السموم سے جو یہ سب کچھ جلا دینے والا عذاب ہے اس سے اس نے بچائے رکھا ہے محفوظ رکھا ہے دور رکھا ہے۔ کہا کہ ہمارے باہمی تعلقات تو ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور شفقت اور رحمت اور غمخواری اور ہمدردی کے تھے۔ کہا کہ **اِنَّـا كُنَّـا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ** (52:28) اور ہمارا مسلک یہ تھا کہ زندگی کا کوئی معاملہ بھی آتا تھا تو ہم وہاں خود فیصلہ کرنے کی بجائے اسے آواز دیتے تھے۔ یہ قرآن کریم کی اصطلاح ہے۔ چوراہے پہ کھڑا ہو کر یا دوراہے پہ کھڑا ہو کر اگر معلوم نہ ہو کہ صحیح راستہ کونسا ہے جس پہ میں نے جانا ہے اور کوئی دور کھڑا ہو تو اس کو بلا کر پوچھا جاتا ہے کہ او بھائی! مجھے ذرا بتا دیجیے گا میں نے حسین چوک کی طرف جانا ہے کدھر سے جاؤں۔ یہ ہے ایک انداز کہنے کا۔ تو قرآنِ کریم نے جو خدا کا بلانا خدا کو آواز دینا کہا ہے خدا کو آواز اس کی کتاب کو آواز دینا ہوتا ہے کہ اس سے پوچھ لیا جائے کہ صحیح راستہ کونسا ہے میں کس طرف جاؤں۔ کہا کہ ہمارا مسلک زندگی یہ تھا کہ ہم زندگی کے ہر دوراہے پر اسی کے ضابطہ ہدایت کو آواز دیتے تھے اسی کو Consult کرتے تھے اس سے پوچھتے تھے۔ وہ آیت تو شروع میں آ گئی گذر گئی تھی پھر آئے گی پھر عرض کر دوں گا کہ میرے بندے میرے متعلق پوچھتے ہیں تو ان سے کہو کہ میں ہر بلانے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں تو اس سے پھر بڑے مسئلے مسائل چلے کہ صاحب! اتنی دعائیں مانگی جاتی ہیں تو وہ ہر دعا تو قبول نہیں ہوتی اور یہاں کہا ہے کہ ہر دعا قبول کرتا ہوں۔ یہ ہر دعا قبول کرنے کی بات نہیں تھی۔

انسان کی ہر پکار کا جواب کیسے ملتا ہے؟

عزیزانِ من! کہا یہی تھا کہ جب بھی کوئی کسی مقام پہ کھڑا ہو کر ہم سے پوچھتا ہے کہ بتایئے صحیح راستہ کونسا ہے ہم فوراً اس کا جواب دیتے ہیں کہ صحیح راستہ کونسا ہے۔ اور خدا کا اور ہمارا تعلق اس کی کتاب کی رو سے ہے عزیزانِ من! یہ جواب دیتی ہے اور یہ صحیح ہے ہمارا ایمان ہے اور میں چھوٹا منہ بڑی بات ہے علی وجہ البصیرت میں یہ عرض کروں گا کہ زندگی کا کوئی معاملہ اور کوئی مسئلہ بھی ہو جہاں آپ کو کسی قسم کے استفسار کی پوچھنے کی ضرورت پڑے تو قرآن کریم اس کا جواب دیتا ہے۔

ہم ہر سوال کا جواب تو دیتے لیکن یہ نہیں کہ ہر دعا قبول کر لیتے ہیں

ارشادِ خداوندی ہے کہ ہم جواب دیتے ہیں جب پکارنے والا ہمیں پکارتا ہے۔ پکار یہ ہے پوچھتا یہ ہے وہ جواب دیتے ہیں۔ قرآن

کریم نے وہاں یہ نہیں کہا ہے کہ دعا قبول کر لیتے ہیں۔ جواب کس طرح سے ہمیں ملتا ہے؟ ہمیں براہِ راست ملتا' گو کہ براہِ راست خدا سے ہمارا تعلق ہی نہیں' ہمارا تعلق اب اس کی اس کتاب کے ذریعے سے ہے اور یہ کتاب جواب دیتی ہے۔ کہا ہے کہ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡہُ (52:28) ہمارا مسلک زندگی یہ تھا یعنی ہم کیوں جنت میں آ گئے؟ ہمارا یہی معاملہ تو اس قسم کی محبت اور شفقت کا تھا۔ مسلک زندگی یہ تھا کہ ہر اس مقام میں جہاں کہیں کوئی دو Possibilities یا دو ممکنات یا دوراہا کہیں ہوتا تھا' وہاں ہم کھڑے ہو کر پوچھتے تھے کہ کونسا راستہ ہماری منزل کی طرف ہمیں لے جائے گا۔ وہاں سے جواب ملتا تھا اور اس طرح سے ہم اس راستے پہ چلے۔ کہا کہ اِنَّہٗ ھُوَ الۡبَرُّ الرَّحِیۡمُ (52:28) اس کا وہ دستِ کرم بڑا کشادہ ہے' سامانِ نشوونما بڑی بہتات سے دیتا ہے' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم یہاں آج اس جنت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ کچھ جنت والوں کے متعلق کہا کہ وہ ایک دوسرے سے باتیں کریں گے اور ایک دوسرے سے یہ کچھ کہیں گے۔

ذکر کا قرآنی مفہوم اور ہمارا تصورِ حیات

عزیزانِ من! یہ کچھ کہنے کے بعد پھر نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر لیا کہ فَذَکِّرۡ (52:29) تیرا کام یہ ہے کہ تو ہماری راہنمائی کو' ہمارے قانون کو' ہماری ہدایت کو' ان تک پہنچائے چلا جا' ان کے سامنے اعلان کرتا چلا جا' بتائے چلا جا۔ یہ ہے جو فَذَکِّرۡ ہے۔ اب یہاں ذکر آیا ہے اور وہ ذکر کرنا یہ ہوا کہ تُو ذکر کرتا رہ۔ ذکر وہ ہے جو' اب ہم مسجدوں میں' نمازوں کے بعد زور زور سے سنتے ہیں جو آدھی رات کے بعد بھی قریباً چلتا ہے۔ وہ ذکر خفی اور ذکر جلی ہے اور اس گناہگار نے تو برسوں تک یہ ذکر کیے ہوئے ہیں اسی لیے انسان دل کا مریض ہو جاتا ہے اس کے بعد تو ذکر یہ ہو جاتا ہے۔ کہا ہے کہ فَذَکِّرۡ (52:29) میں نے کہا کہ قرآن کریم اپنی تفسیر آپ کرتا ہے' دوسرے مقام پر اس نے کہا ہے کہ فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (50:45) تُو اس قرآن حمید کے ذریعے بات صاف کر دیتا ہے کہ ان کو مطلع کرتے رہو' بتاتے رہو' جتاتے رہو' دکھاتے رہو کہ کون سا راستہ بالکل صحیح ہے۔ نبی اکرم ﷺ بھی قرآن کریم کی رو سے راہنمائی کرتے تھے خود خدا کا یہ ارشاد ہے کہ فَذَکِّرۡ بِالۡقُرۡاٰنِ (50:45) اور یہاں کہا کہ فَذَکِّرۡ (52:29) سو تو (اس قرآن کریم کی تعلیم کو ان کے سامنے برابر پیش کیے جا)۔

داعیٔ حق کو پیش آنے والی مشکلات اور ہمارے ہاں کے کاہن اور مذہبی پیشوا

اب رہے ان لوگوں کے یہ الزامات اور اعتراضات' تو اب یہاں سے نظر آتا ہے کہ ایک داعیٔ حق کے متعلق یہ نہ ماننے والے کیا کیا کچھ کہتے تھے اور کیا کیا کچھ کرتے ہیں۔ آج بھی ان کی یہ کیفیت ہے کہ ہر قسم کا جھوٹ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں' مطعون کرتے ہیں' کیا کیا اعتراضات ہیں؟ یہ کہ فَمَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَتِ رَبِّکَ بِکَاہِنٍ وَّ لَا مَجۡنُوۡنٍ (52:29)۔ نظر آیا کہ وہ یہ کچھ کہتے تھے کہ کاہن ہے۔ یہ جو فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے' قسمتوں کا حال بتانے والے ہوتے ہیں' یہ تو نچلی کلاس کے کاہن ہوتے ہیں۔ کچھ بڑی بڑی درگاہوں

کے، خانقاہوں کے، جو بڑے بڑے ہیں، وہ بڑے بڑے کاہن ہوتے ہیں۔ سب اپنی قسمتوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ہی جاتے ہیں، یا جو مصیبت آتی ہے، اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے وہاں سے کچھ دوا اور اس دور کا تعویذ لے کر آتے ہیں۔ زمانہ نزول قرآن کریم تک عرب میں کہانت بڑی زیادہ مشہور تھی۔ ان کے ہاں کے جو بڑے بڑے پروہت، مذہبی پیشوا اور بزرگ ہیں، وہ اسی بنا پہ بزرگ ہوتے تھے کہ وہ قسمتوں کا حال بتاتے تھے صاحب! تو حضور نبی اکرم ﷺ قسمت کا حال نہیں بتاتے تھے، بتاتے یہ تھے کہ یہ روش جو تم اختیار کر رہے ہو، اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق قرآن کریم کی طرف سے تردید کہ وہ کاہن ہے اور نفع نقصان کے معیار

چنانچہ بات یہ بھی تھی کہ یہ مذہبی پیشوا اور بزرگ بھی کچھ آنے والی تباہی کے متعلق ہمیں بتاتے ہیں، اصل میں تو قسمت کا حال ہی بتاتے ہیں۔ یہ ایک بڑے پیمانے پہ سمجھ لیجیے۔ کاہن ہی ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن کریم کس طرح اس کی تردید کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّکَ بِکَاهِنٍ (52:29) یہ خدا کا انعام ہے کہ تُو کاہن نہیں ہے۔ جو بھی یہاں قسمتوں کا حال بتانے کا دعویٰ کرتا ہے وہ کاہن ہے، وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتا، نہ وہ سنتِ نبوی ﷺ کا پیروکار ہوسکتا ہے کیونکہ خدا نے تو حضور ﷺ کو کہا ہے کہ یہ خدا کا انعام ہے کہ تُو کاہن نہیں ہے۔ نبوت اور کہانت میں بڑا فرق ہے۔ ابھی آگے چل کر بات آتی ہے۔ پھر وہ آگے کیا کہتے تھے؟ کہتے تھے کہ وَّلَا مَجْنُوْنٌ (52:29)۔ وہ کہتے تھے کہ پاگل ہوگیا ہے۔ میں نے آگے بھی بتایا تھا، تاریخ بتاتی ہے کہ وہ کس بنا پہ پاگل کہتے تھے۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ یہ پاگل ہے، اسے اپنے نفع نقصان کا بھی ہوش نہیں، تو جسے نفع نقصان کا ہوش نہ ہو، اسے دنیا پاگل کہتی ہے۔ کہتی ہے کہ تیری مت ماری ہوئی ہے۔ بس ذرا سا ہی تو اِدھر سے اُدھر کرنا تھا، پچاس ہزار روپیہ وہ پڑا تھا تمہارے لیے، ہزار سمجھایا اس کو، اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ پاگل ہوگیا، رشوت کا یہ کم از کم پچاس ہزار روپیہ تھا، کسی کو پتہ بھی نہیں چل سکتا تھا، اس کے اندر بس تھوڑی سی ملاوٹ کرنی تھی اسے ہم کہتے تھے کہ دیکھیے! تُو ساری عمر گھس گھس کرتا رہے گا، اس دیانتداری کے بدلے میں روٹی نہیں ملے گی، اس دور میں بہتیرا سمجھایا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا نہیں سمجھ میں آتا؟ نفع نقصان سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ نفع ان کے معیار کے مطابق ہے، معیار ان کا ہے، نفع یہ ہے کہ ہر ناجائز طریقے سے جو حاصل ہو، وہ نفع ہے، منافع ہے، یہ حاصل نہیں کرتے، تو نہ کریں۔ یہ تو چھوٹے سے پیمانے کے اوپر تھا۔ یہ جو اس قسم کی پیشکش تھی جو ہم کہہ رہے ہیں کہ تھوڑی سی رشوت، تھوڑی سی ملاوٹ آمیزش اور بہت بڑا نفع۔

نفع اور نقصان، جنون اور عقل کے معیار میں فرق

نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو انہوں نے آفر (پیشکش) کیا تھا کہ آپ ﷺ چاہتے ہیں تو ہم آپ کو پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کر لیتے

ہیں مگر یہ تبلیغ چھوڑ دیجیے۔ وہ اتنی بڑی آفر (پیشکش) دے رہے تھے' خود اپنے چچا ابو طالب نے یہ بات کہی تھی کہ یہ' یہ کچھ کر رہے ہیں اور پھر اس کے ساتھ یہ تھا کہ یہ کرو گے تو پھر تم دیکھو گے کہ ہم تمہارا جینا حرام کر دیں گے۔ انہیں کہا تھا کہ بیٹا! یہ بڑے سخت قسم کے دشمن ہیں' بات تھوڑی سی ہے اور پھر اتنا بڑا لالچ بھی تو ساتھ ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے' وہ فقرہ حضور ﷺ کا ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہاں کی صرف بادشاہت دیتے ہیں' اگر میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے پہ چاند بھی رکھ دیں تو میں اپنے اس دعوے سے باز نہیں آ سکتا۔ یہ حق کی آواز ہے' اس کو بیچا نہیں جا سکتا ہے' میں بک نہیں سکتا تو اتنی بڑی قیمت جو مل رہی ہو اور پھر بھی وہ نہ بلے تو انہوں نے تو کہنا ہی تھا کہ پاگل ہو گیا ہے۔ اصل میں جنون اور عقل کے معیار الگ الگ ہوتے ہیں۔ بڑا خوبصورت مصرع ہے:

خلقِ پس دیوانہ او دیوانہ بکار

دنیا دیوانے کے پیچھے' کوئی پتھر مار رہا ہے' کوئی اینٹ مار رہا ہے' کوئی کچھ کر رہا ہے

دیوانہ بکارِ خویش ہشیار!

اور وہ اپنے کام میں مگن چلا جا رہا ہے' اس کو پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ یہ کیا بک رہے ہیں' یہ کیا کر رہے ہیں۔ خلقِ پس دیوانہ او دیوانہ بکار' یہ دیوانگی درحقیقت کوئی دماغی خرابی نہیں ہوتی' یہ وہ دیوانہ ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ دیوانہ بکارِ خویش ہشیار: وہ ان سب سے زیادہ عقلمند ہوتا ہے۔ عقل اور دیوانگی کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔

اے رسول! تُو کاہن نہیں' پاگل نہیں اور نہ ہی تُو شاعر ہے

نفع اور نقصان کے معیار مختلف اور اوزان مختلف ہوتے ہیں' اس کے ترازو مختلف ہوتے ہیں۔ یہاں تو اس کاروبار میں جتنا نقصان ہوتا ہے' ان کے معیار کے مطابق' اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوتا ہے' ہاں یہ اس کا احسان ہے کہ تُو ان کے معیار کے مطابق مجنون پاگل نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کاہن بھی نہیں ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ (52:30) پھر کہتے ہیں کہ کوئی شاعر ہے۔ عربوں کے ہاں نزولِ قرآن کریم سے پہلے کوئی اور لٹریچر نہیں تھا۔ عربوں کے ہاں کوئی کتاب ہی نہیں تھی' عجیب صورت ہے اور زبان میں عرض کر چکا ہوں کہ دنیا کی کوئی زبان' خواہ وہ آج زندہ ہے یا مردہ ہو چکی ہے' عربی زبان کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتی تھی' بغیر لٹریچر کے' بغیر کسی تحریرِ دستاویز کے' یہ زبان کس طرح سے قائم تھی اور آگے بڑھ رہی تھی۔

سروش اور الہام کے علاوہ ہمارے ہاں وجدان کی حقیقت

شاعروں کے متعلق ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے
(غالب)

یہ ایرانیوں کا خیال ہے۔ وہ اسے الہام سمجھتے تھے۔ یہ ایران والے سروش الہامی فرشتے کو کہتے ہیں۔ اب بھی یہ کیفیت ہے۔ ہمارے ہاں اس کو وجدان کہتے ہیں' Intuition کہتے ہیں۔ غیب سے خیالات آتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) نبی اکرم ﷺ بھی کہتا ہے کہ یہ خیالات میرے نہیں ہیں' مجھے تو غیب سے آتے ہیں' وحی ہوتی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بھی شاعری ہے' یہ شاعری ہے جو یہ کہہ رہا ہے۔

تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

او کیا کہتے ہو؟ وہ تو کہتا ہے کہ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں میرے خیالات کا دخل ہی نہیں ہے۔ تو پھر یہ کہاں سے آتے ہیں اور وہ کیا سمجھتے؟ وہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ بات سمجھ میں تو آ سکتی تھی۔ وہ یہی کہہ سکتے تھے کہ شاعری ہے' Intuition ہے' وجدان ہے' نوائے سروش ہے۔ اور اگلی بات یہ کہتے ہیں کہ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ (52:30) شاعر ہے' اس کی بات کو Seriously (سنجیدگی سے) نہ لینا' وہ تو شاعری ہے۔ ہمارے ہاں بھی اب تک یہی کہتے ہیں: اوئے! یہ شاعری کر رہا ہے یعنی جو چیز ناممکن العمل ہو' وہی توہمات ہوں خیالات میں ہو' مضامین آفرینی ہو' اس کے متعلق ہوتا یہ ہے کہ یہ شاعری ہے یعنی آدمی اسے Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لیتا۔ وہ بھی یہ کہتے تھے۔ شاعروں کی اتنی عظمت تھی کہ ایک شاعر ایک مصرع یا ایک قطعہ یا ایک شعر کہہ دیتا تھا تو قبیلے کا قبیلہ تباہ ہو جاتا تھا' سو سو سال تک لڑائیاں جاری رہتی تھیں' ان کی پرستش بھی کرتے تھے' شاعروں کو سمجھتے تھے کہ ان کو غیب سے یہ چیزیں آتی ہیں' اس کے باوجود شاعری کے متعلق وہ کہتے تھے کہ اس کو Seriously (سنجیدگی سے) نہیں لینا چاہیے' یہ جذباتی چیز ہوتی ہے' تھوڑے وقت کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ دیکھیے! قرآن حکیم کیا کہتا ہے؟ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (52:30) شاعر ہے' شاعری کر رہا ہے' زمانے کی گردشیں اس کی شاعری کو خود مٹا دیں گی' شاعری میں تو یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ اس کو بقا ہو' وہ جذباتی چیز ہوتی ہے۔ آپ بھی غور کیجیے۔ عربوں کے ہاں تو خیر شاعری اور ہی قسم کی تھی' یہ آپ کے ہاں گزشتہ دو سو سال یا سو سال کے عرصے کے اندر ذرا آپ غور کیجیے وہ جو شاعری آپ کے ہاں ہے یعنی وہ آپ کے ہاں سارا ملک کتابوں سے بھر جائے اگر وہ شاعری کہیں مدون ہو جائے' آپ کے ہاں اتنی شاعری ہے اور پھر شاعری تو زوال کے زمانے میں اور زیادہ پنپتی ہے' عملی کام تو کچھ ہوتا نہیں ہے' بیٹھے ہوئے ہیں یہاں' روٹی کا محتاج ہے' اور کہہ یہ رہا ہے کہ میں تو اس کے ایک سیاہ خال کے اوپر سمرقند اور بخارا کو نچھاور کر کے رکھ دوں جناب! (اللہ اکبر) ''اپنے رہن لئی کوٹھا نئیں ہیگا'' (اپنے رہنے کے لیے جھونپڑی تک نہیں ہے) شعر پڑھ کر کہتا ہے ''دے جا اللہ

تیرا بھلا کرے گا'' خدا تعالیٰ نے کہا کہ ان کی باتوں پر تم نہ جاؤ۔ تم دیکھو گے کہ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ (52:30) زمانے کی گردشیں ان کو خود مٹا دیں گی تو Worry (غم) کیوں کر رہے ہو؟ اتنا پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ جواب ملتا ہے کہ قُلْ تَرَبَّصُوْا (52:31) ان سے کہو کہ بہت اچھا۔ تم بھی انتظار کرو۔

ان ہر دو پروگرام کے نتائج خود بتا دیں گے کہ کون حق پر ہے

ان سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے انتظار کرو اور فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ (52:31) میں اپنی جگہ انتظار کرتا ہوں۔ یہ انتظار کرنا کوئی شاعری نہیں بلکہ قرآنِ حکیم میں مختلف مقامات پہ یہ چیز آئی ہے۔ ان سے جب کہا جاتا ہے' جب وہ بہت زیادہ جھگڑتے تھے' کسی طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے' مخالفت جاری رکھتے تھے' تو آخر میں ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ دیکھو بھئی! جھگڑنے کی کچھ بات نہیں ہے' ایک پروگرام میں پیش کر رہا ہوں' اس کے برعکس دوسرا پروگرام تم پیش کر رہے ہو' میرا دعویٰ یہ ہے کہ میرے پروگرام کا جو نتیجہ ہے' وہ خیر و برکت کا نتیجہ ہے' خوشگواریوں خوشحالیوں کا نتیجہ ہے' تم کہتے ہو کہ نہیں' یہ بات ہے' ہمارا پروگرام ہے' اس کا جو نتیجہ ہے' یہ ہے خوش بختیوں کا نتیجہ۔ کہنے لگے کہ دو متضاد پروگرام ہیں' دو متضاد دعوے ہے' ہمارے ہاں فیصلہ کیسے ہو' سمجھانے کی کوشش کی' تم سمجھتے نہیں ہو' تو پھر انتظار کر لو۔

عزیزانِ من! یہ ہے دین' یہ وعظ نہیں ہے لہٰذا اب اس کے پرکھنے کا طریقہ کیا ہے کہ دونوں میں سے کس کا دعویٰ سچا ہے سوائے اس کے کہ تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو' میں دخل نہیں دوں گا' مجھے میرے پروگرام پر عمل کرنے دو' تم دخل نہ [1] دو' پھر فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:135) سو عنقریب یہ بات صاف ہو جائے گی' معلوم ہو جائے گا' ساری دنیا دیکھ لے گی کہ کس کا دعویٰ سچا تھا۔ کس کا دعویٰ جھوٹا تھا' دنیا دیکھ لے گی کہ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6:135) انجام کار کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے۔

قانونِ فطرت یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی

اور میں یہ اس لیے اس دھڑلے سے یہ دعویٰ کر رہا ہوں کہ قانونِ قدرت' قانونِ فطرت' خدا کا قانون یہ ہے کہ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی۔ میں اس لیے یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ تم ظلم پہ مبنی ہو' تمہاری کھیتی پنپ نہیں سکتی لیکن میں اب باتوں سے نہیں' وعظ سے نہیں' دلائل سے نہیں' وہ تم سنتے نہیں ہو' سیدھی سی بات ہے' تم اپنی جگہ اپنے پروگرام پہ عمل کرو' مجھے میرے پروگرام پہ عمل کرنے دو' یہ بات انجامِ کار ظاہر اور صاف ہو جائے گی کہ کس کا پروگرام سچ پر مبنی ہے۔ یہ ہے طریقہ' یہ ہے جو طریق ہے۔

---

[1] اس کا حوالہ (6:136) ہے۔

آج کے دور کا سیاسی دعویٰ اور قرآنِ حکیم کی راہنمائی

عزیزانِ من! نتائج سے پرکھا جائے کہ کوئی پروگرام کیسا ہے۔ یہ بھی ہمارے اس دور میں ایک بہت بڑا سیاسی دعویٰ ہے جو کیا جاتا تھا۔ اسے Pragmatic Test (استنتاجی آزمائش) کہتے ہیں کہ زیادہ بحث ومباحثے کی ضرورت نہیں ہے' اس کے بعد دیکھ لو' کہ نتیجہ کیا ہے' یہ چودہ سوسال پیشتر اس دنیا میں کچھ نتیجہ دکھانا تھا' لہٰذا فرمایا کہ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (6:135) ابھی تمہیں نظر آجائے گا۔ یہ نہیں کہا کہ تم اپنی جگہ کام کرو اور مجھے اپنی جگہ کرنے دو' قیامت میں جا کر دیکھ لیں گے کہ کون جنت میں جاتا ہے' کون جہنم میں جاتا ہے۔

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

یہیں نظر آجائے گا تمہیں اور اس ''میں'' کی کیا بات ہے۔ چیلنج دیتے ہیں کہ میں کس بنا پر یہ تعدی سے اور تعرضی سے یہ کہتا ہوں کہ تم کامیاب نہیں ہوسکتے وہ اس لیے کہ تم ظلم پہ مبنی ہو اور اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (6:135) ظالم کی کھیتی پنپ نہیں سکتی' چلو یہ تھا طریقہ۔

وعظ ونصیحت اور بحث ومباحثہ کی بجائے عمل کا نتیجہ بطور ثبوت زیادہ مؤثر ہوتا ہے

عزیزانِ من! یہ وعظ ونصیحت اور بحث ومباحثہ کی بات نہیں ہے' مناظروں کی بات نہیں' یہ تو کر کے دکھانے کی بات ہے اور اسلام کی افضلیت ثابت کرنے کے لیے یہ کچھ چلا جا رہا ہے' الزام بحثیں ہو رہی ہیں' مناظرے ہو رہے ہیں' سیمینار مقرر ہو رہے ہیں' سب کچھ ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ اعْمَلُوْا (6:135) کوئی نہیں کہتا کہ ہم عملاً اس دین کی افضلیت اور توقیر ثابت کر کے دکھائیں گے اور وہ یہی نہیں چاہتے تھے' وہ قریش جانتے تھے کہ اگر کسی جگہ بھی اس کا یہ پروگرام عملاً نافذ ہوگیا' یہ نظام قائم ہوگیا تو اس کے انسانیت ساز اثرات جو دنیا کی منفعت کے لیے ہوں گے وہ وہاں تک محدود نہیں رہیں گے' جہاں تک یہ نظام قائم ہوگا' اس کا اثر دور دور تک ہوگا۔ یہاں کا بھی غریب اور مظلوم غلام جب دیکھے گا کہ وہاں کا غریب میرا بھائی' جو وہاں گیا تھا' وہ تاجدار بن رہا ہے' یہاں کوئی بھی آرام سے نہیں بیٹھ جائے گا' وہ ان قریش میں انقلاب برپا کر دیں گے' ورنہ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس لیے ان کو یہ خطرہ تھا کہ حضور ﷺ کی ہجرت کے بعد بھی جب حضور ﷺ مدینے چلے گئے انہیں خطرہ تھا۔

آج کفار کی کوشش یہ ہے کہ ''ہونہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں''

عزیزانِ من! اس زمانے کا تین سومیل کا مسافت آج بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ آپ سوچیے ان کو فکر کیا تھی؟ کہ جی ان قریش کو مناقشت اس لیے نہیں تھی کہ حضور ﷺ ان کے معبودوں کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ اب تو وہ مدینے چلے گئے' اب یہ ان کا کیوں پیچھا کر رہے ہیں؟ تین سومیل وہاں جا کر سات سال تک' ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل جنگیں اور لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کیا بات تھی؟ سوائے اس

کے کہ ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں' یہ ہے طریق اپنے دین کی صداقت کی کامیابی کو ثابت کرنے کا کہ اس چیز کو عملاً نافذ کر کے بتاؤ۔ آج ساری دنیا میں' جو آپ سے میں بار بار یہ کہا کرتا ہوں کہ مغرب کی قوتیں بھی بڑی کوشش کرتی ہیں کہ آپ کے یہاں وہ مذہب پھیلے' جس نے دین سے آپ کو بیگانہ بنا رکھا ہے' کہیں دین نہ پھیل جائے۔ دین کی مملکت تو' عزیزانِ من! اتنے سے خطے' مدینہ منورہ' میں ہی قائم ہوئی تھی بارہ لاکھ مربع میل تک تھی' خود حضور ﷺ کے زمانے میں ہی پھیل گئی تھی' بائیس لاکھ مربع میل حضرتِ عمرؓ کے دور تک تھی۔ ہندوستان تک کا جو علاقہ تھا وہ وہاں تک آ پہنچے تھے۔ مصر بازنطینی ایمپائر' ایرانی' یہی اس زمانے کے سارے کے سارے علاقے مہذب اور متمدن ہوتے تھے۔ یہ چیز نہیں تھی کہ فوجوں نے فتح کیے تھے۔ دنیا اس نظام کے جو خوشگوار نتائج دیکھ رہی تھی' باقی دنیا اس کی وجہ سے اس کی طرف جھک رہی تھی تو وہ یہ کہتے تھے کہ کوئی بات نہیں ہے' یہ شاعر ہے' گردشِ زمانہ اس کو خود ختم کر دے گا۔

آپ ﷺ کہتے تھے کہ بہت اچھا' تم انتظار کرتے ہو' میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ انتظار یہ نہیں ہے کہ تم چپکے بیٹھے رہو' میں بھی چپکے بیٹھا رہتا ہوں۔ انتظار کے یہ معنی ہیں کہ تم اپنے پروگرام پہ عمل کرو' مجھے میرے پروگرام پہ عمل کرنے دو' نتائج خود بتا دیں گے صاحب! یہ ہے عزیزانِ من! اسلام کی حقانیت اور صداقت کو ثابت کرنے کا طریقہ۔ کہا ہے کہ اَمۡ تَاۡمُرُهُمۡ اَحۡلَامُهُمۡ بِهٰذَاۤ اَمۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ (52:32) کیا یہ عقل و فکر کی بنا پر سوچ سمجھ کر یہ بات کہہ رہے ہیں کہ تم غلط کہہ رہے ہو اور ہم صحیح کہ اگر یہ عقل و فکر کی بنا پر خالی الذہن ہو کر سوچتے تو کبھی یہ روش اختیار نہ کرتے۔ بات ساری یہ ہے کہ ان کے مفادات پر اس کی زد پڑتی ہے۔ پوچھو نہیں کہ قریش کس مقام اعلیٰ پر تھے۔ کعبے کے متولی ہونے کی وجہ سے ان کی پرستش ہوتی تھی' ساری دنیا کے جو تجارت کے قافلے تھے' لٹتے تھے' ان کی بھیڑ بکری کی طرف بھی کوئی بری نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کعبے کے متولی تھے' اتنے خوشحال تھے' اتنے غلام ان کے ہاں تھے' صاحب! وہ خود کام ہی کچھ نہیں کرتے تھے۔ یہ اس قسم کی آمریت تھی۔ انہیں یہ ساری چھنتی نظر آتی تھی۔ پہلے تو جو نسبی خصوصیت تھی صرف قریش ہونے کی بنا پر' وہی ختم ہو جاتی تھی۔

رسول اکرم ﷺ کی مخالفت کی اصل وجہ

کہا کہ یہ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ (52:32) ہے' یہ سرکش قوم ہے' ان کے مفادات پہ زد پڑتی ہے' ان کی سرکشی ہے' جو اس طرف آنے نہیں دیتی۔ یہ بات نہیں کہ انہوں نے عقل و فکر کی رو سے' ٹھنڈے دل سے' سوچا ہے اور پھر اس نتیجے پہ پہنچے ہوں کہ نہیں' یہ روشِ زندگی غلط ہے اور ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں' وہ صحیح ہے۔ یہ بات تھی ہی نہیں۔ قرآن کریم نے دوسرے مقام پہ فرعون کے متعلق ایک بات کہی اور وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ قوم فرعون کے متعلق تمام دلائل و براہین جتنے تھے' وہ سامنے لے آئے' اس کے بعد حضرتِ موسیٰؑ سے اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا (7:136) اس کے باوجود اس سے انکار کیے چلے جا رہے ہیں بلکہ انکار سے بھی زیادہ سخت لفظ ضِدًّا (19:82) ہے'

یہ ضد کے اوپر اڑے ہوئے ہیں لہٰذا کہا کہ اندر سے دل تو ان کا مانتا ہے کہ بات یہ ٹھیک ہے لیکن یہ جو رعونت' غلو' برتری' حکومت' دبدبہ ہے' یہ اس طرف آنے نہیں دیتا۔ یہ راستے میں روک بن جاتا ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ کچھ اتنے ہی بدھو نہیں ہوتے کہ ان کو یہ بات سمجھ میں نہ آئے جو یہ کہہ رہا ہے کہ اگر ان غلاموں کو اتنا دباؤ گے تو ایک دن یوں کھڑے ہوں گے۔ یہ بات نہیں ہے' سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ جو اپنا مفادِ خویش غلوب و برتری اور کبریائی اور تکبر اور رعونت و سرکشی ہے' یہ نہیں ماننے دیتی صاحب! اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (52:32) یہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ اس کی وجہ ہے۔ کہا ہے کہ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (52:33) یہ کہتے ہیں کہ یہ یونہی دعوے ہیں کہ مجھ پہ وحی نازل ہوتی ہے' خدا کی طرف سے یہ چیز آتی ہے' فیصلہ پہلے کیے ہوئے ہیں کہ ہم نے ماننا ہی نہیں ہے۔ ''من حرامی حجتاں ڈھیر'' وہ من حرامی ہے اس لیے وہ سرکشی اختیار کر لیتے ہیں۔

کفار کی ہزار سالہ حجتیں اور قرآنِ حکیم کا ارشاد

یہ ساری چیزیں' جتنی بھی ہیں' یہ سب حجتیں ہیں۔ تیرے بعد یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے' یہ اس کی اپنی ہی بنائی ہوئی چیز ہے' خود اس کا اپنا وضع کردہ ہے' جسے یہ خدا کی وحی یا قرآن کریم کہتا ہے۔ فوراً اس کا جواب دیا اور یہ تو قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (52:34) ہم تو بار بار یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ ایک انسان کا بنایا ہوا ہے' جو کچھ یہ پیش کر رہا ہے' وہ خدا کا نہیں تو تم سارے انسان مل کر اس کی مثل دس آیتیں بنا دو' چار آیتیں ہی لے آؤ۔ انہیں بحدیث کہا' اس جیسی ایک ہی بات لے آؤ۔ پھر وہی دعویٰ ہے کہ لاؤ! عزیزانِ من! عجیب چیز ہے کہ قرآن حکیم میں اتنے مقامات پر ان کو چیلنج دیا ہے اور بہر حال یہ عربی زبان میں لکھی ہوئی ایک چیز ہے' کہی ہوئی ایک چیز تھی' عربی زبان تو ان کی تھی' اور پھر ان کے ہاں کے وہ شاعر تھے' ان کے قصیدے تو کعبے پہ لٹکائے جاتے تھے۔ انہیں چیلنج دیا جا رہا ہے کہ تم اس کی مثل لاؤ' تمہارے ساتھی بھی آ جائیں' جن کو اور بلانا چاہتے ہو' انہیں بھی ساتھ بلا کر لے آؤ۔ دس آیتیں اس جیسی تم بنا کر لے آؤ یعنی وہ ان کے ساتھ بیاسی لڑائیاں تو لڑ سکتے تھے' دس آیتیں لانے کا چیلنج قبول نہیں کرتے تھے اور چودہ سو سال سے یہ چیلنج ساری دنیا کے سامنے ہے۔ یہ تین تین سو سال تک صلیبی جنگیں تو لڑ سکتے ہیں' ان کے ہاں عربی زبان کے بڑے بڑے اسکالر ہیں۔ آج بھی بڑے بڑے اسکالر موجود ہیں۔ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے۔ اسلام کو یا مسلمانوں کو (معاذ اللہ) شکست دینے کے لیے اس سے اور موزوں میدان کونسا ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم کا یہ چیلنج ہے کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کوئی انسان' انسانوں کا گروہ' بھی مل کر اس کی دس آیتوں جیسی آیتیں نہیں بنا سکتا تو کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پہلے دور کے اور خود ان کے ہاں کے جو عربوں کے ہاں علما یا اسکالر تھے' ان کو تو چھوڑیئے' اس دور میں ہمارے مستشرقین کے ہاں

کے اتنے اتنے بڑے عربی کے ماہرین انہیں لے آؤ۔ عربی زبان کا جو لغت ہے میں نے بھی اپنا لغت لکھا' تو یہ جتنے لغات تھے ان کو دیکھنے کا موقع ملا' وہ نہایت سائنٹفک طریقے پر بہترین لغت ہے وہ پھر یہ گبز (Gibbs) جیسے عربی زبان کے یہ اتنے اتنے بڑے اسکالر ہیں لیکن یہ چیلنج کوئی قبول نہیں کر رہا' آج تک نہیں قبول کیا جا سکا' یہ تو جو اسکالر (Seholars) ہیں' وہ طے نہیں کر سکے کہ یہ جو Language (لسان) ہے' یہ نثر ہے یا یہ شعر ہے۔ وحی کی زبان ہی کچھ مختلف ہوتی ہے۔ بہر حال ان سے کہا کہ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (52:34) اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ اس نبی کا اپنا بنایا ہوا ہے' خدا کی وحی نہیں ہے تو اس جیسی کوئی ایک قانون کی بات بنا کر لے آؤ' بات طے ہو جائے گی' صاف ہو جائے گی۔

تخلیقِ کائنات کی مثال اور انسان کی بے بسی

کہا کہ پھر ان کو اپنی طرف توجہ دلا وَاَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ (52:35) ان سے کہو کہ کوئی چیز جو پیدا ہوتی ہے' Create ہوتی ہے' تخلیق ہوتی ہے' ان سے کہو کہ تم بھی مخلوق ہو' کیا تم از خود پیدا ہو گئے ہو؟ بتاؤ کہ کیا خود پیدا ہو گئے ہو یا تم نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا ہے؟ جہاں کوئی مخلوق ہوگی خالق ماننا پڑے گا۔ اب کرہ ارض پہ انسان سے بڑی تو کوئی اور مخلوق نہیں ہے۔ انہی سے کہا گیا کہ تم اپنے متعلق بتاؤ کہ از خود وجود میں آ گئے ہو یا تم نے خود اپنے آپ کو پیدا کر لیا ہے۔ اس کا تو دعویٰ ہی کوئی نہیں کر سکتا۔ تو آپ کے ذہن کے اندر خالق کا تصور آئے گا کہ خالق کی ہستی ہے' اسی کی طرف تو یہ دعوت دیتا ہے۔ اس کو بھی چھوڑو۔ کہا کہ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (52:36) یہ جو ارض و سما کا سلسلہ کائنات ہے' یہ تم نے پیدا کیا ہے؟ قرآن حکیم کا جو انداز ہے' وہ خارجی کائنات کی طرف آ جاتا ہے۔ کہا کہ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ (52:36) بات ساری یہی ہے کہ یہ ماننا نہیں چاہتے' یقین نہیں کرنا چاہتے اور یہ جو ساری چیزیں ہیں' یہ پیدا کیے چلے جا رہے ہیں۔ کہا کہ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُسَيْطِرُوْنَ (52:37) کیا یہ جتنے بھی اس دنیا میں سامانِ رزق کے خزانے ہیں' یہ ان کی ملکیت ہیں؟ کیا یہ داروغہ مقرر کیے ہوئے ہیں کہ ساری دنیا کے اوپر انہی کی چلے' کسی اور کی نہیں۔ قرآن حکیم ایک ایک چیز کا جواب دیئے چلا جا رہا ہے۔ اب بڑی اہم بات آ گئی۔ کہا کہ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (52:38) کیا یہ بات ہے کہ ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس سے چڑھ کر یہ خدا کے ہاں سے کچھ باتیں سن آتے ہیں؟ وہ ان کے کاہن براہِ راست خدا کے ہاں سے علم حاصل کرنے کے لیے دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہ ایک چیز کہی کہ کوئی ہے ایسی سیڑھی جس سے یہ خدا کے ہاں چلے جاتے ہیں' باتیں سن آتے ہیں۔ وحی والا تو یہ کہتا ہے کہ وہ مجھ پر نازل ہوتی ہے' اوپر سے نیچے آتی ہے اور وہ خدا کا ایک قاصد' فرشتہ' رسول ہے' اس کے ذریعے سے وہ وحی مجھ پہ نازل ہوتی ہے۔ یہ اس کے تو قائل نہیں ہیں تو کیا یہ ان کی کیفیت ہے کہ یہ خود اوپر جا کر کوئی چیزیں جو غیب کی ہیں' یہ سن آتے ہیں۔

وحی اورعلمِ انسانی میں فرق

میں نے کہا تھا۔عزیزانِ من! کہ وقت تھوڑا سا ہے' بات بڑی ہے۔ وحی اور علمِ انسانی میں فرق یہ ہے کہ وحی براہِ راست خدا کی طرف سے وہ علم حاصل ہوتا ہے' جس نبی یا رسول پہ وحی نازل ہوتی ہے اس کے اپنے ذاتی خیالات کا' کوشش کا' کسب و ہنر کا' کوئی دخل نہیں ہوتا' یہ Objectively (خارج سے) آتی ہے' وحی خدا کی طرف سے آتی ہے۔اس میں نبی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ باقی انسان کے جتنے علوم ہیں وہ ان کے اپنے کسب و ہنر کے' اپنی کوشش کے' پیدا کردہ ہوتے ہیں' وہ خود پیدا کیا ہوا ہے' دوسرے سے فکری طور پہ حاصل کیا ہوا ہے' صرف وحی ایک مستثنا ہے کہ جو اس طرح سے ملتی ہے' کوئی جا کر خدا کے ہاں سے یہ نہیں لاسکتا۔خود رسول بھی جا کر نہیں علم لاتے تھے' آتا تھا یہ علم براہِ راست۔جا کے خدا کے ہاں سے لینے والی جو بات تھی اُسے قرآن حکیم نے یہاں کاٹ کر رکھ دیا ہے۔وحی کا سلسلہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔حضور ﷺ کے بعد قیامت تک اب خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملنے کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا۔ اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے تو یہ اس ثبوت کا دعویٰ ہو گیا کہ مجھے خدا کی طرف سے علم ملتا ہے۔ یہ براہِ راست دعویٰ نبوت ہے تو ہم اس طرح سے کان کھڑے کر لیتے ہیں۔ ہمارا جو تصوف ہے اس کی بنیاد اس پر ہے' ان صوفیائے کرام' اولیائے کرام کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ انہیں خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا ہے۔اسے وحی کہنے کی بجائے کشف کہا جاتا ہے' الہام کہا جاتا ہے۔قرآن حکیم میں یہ ہے ہی نہیں۔ یہ ہوتی وہی بات ہے خدا کی طرف سے براہِ راست علم کا ملنا پھر وہ جو یہ بات تھی کہ وہ آتا ہے ایک فرشتہ ان کے اوپر' یہ ان کو پوچھیے تو یہ بتاتے ہیں کہ روز ہم تو بارگاہِ خداوندی میں' اللہ تعالیٰ سے باتیں کر رہے ہوتے ہیں' وہاں سے یہ جاتے ہیں' وہاں قرآن کریم کہتا ہے کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس سے یہ اوپر جاتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہاں صاحب! ہمارے پاس جو ہمارا علم ہے' جو ریاضتیں' چلّے ہیں' یہ تو تصوف کی چیزیں ہیں۔ان کی رو سے ہم خدا تک جاتے ہیں ❶ اور وہاں سے یہ لے کر آتے ہیں ❷۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

---

❶ وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی انسان' کسی اپنے ذریعہ سے' اسے حاصل نہیں کر سکتا۔وہ خدا کی طرف سے انسان پر نازل ہوتی ہے۔اس کے برعکس' ارباب تصوف کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اپنے کسب و ہنر سے جب چاہیں علم خداوندی حاصل کر سکتے ہیں۔(اسے وہ کشف والہام سے تعبیر کرتے ہیں)۔ یہ دعویٰ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔کسی انسان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی نہیں جس کے ذریعے وہ علم خداوندی تک پہنچ سکے۔وہ علم' خدا جس پر چاہے' نازل کرتا تھا۔اور اس کا سلسلہ رسول اللہؐ کے بعد ختم ہو گیا۔(پرویزؒ: مفہوم القرآن، فٹ نوٹ 1، ص۔1234)۔

❷ آگے ٹیپ ختم ہو چکا ہے۔اگلے ہی درس میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

چوتھا باب: **سورۃ الطور** (آیات 38 مسلسل تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج ستمبر 1982ء کی 24 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الطّور کی آیت 38 سے ہوتا ہے: (52:38)۔

یہودیوں کے ہاں پیشین گوئی کرنے والے کو نبی کہا جاتا تھا مگر قرآن کریم نے اسے چیلنج کر دیا: گزشتہ سے پیوستہ

اس آیہ مبارکہ کے چند فقرے تو سابقہ درس میں بھی آ گئے تھے لیکن وہ موضوع تشنہ رہ گیا تھا' اسی کو میں پھر دہراتا ہوں۔ عربوں کے ہاں بھی اور اس دور میں بھی قریب قریب ہر مذہب میں قسمتوں کا حال بتانے والوں' پیشین گوئیاں کرنے والوں' کا بڑا اونچا مقام ہوتا تھا۔ یہودیوں کے ہاں تو پیشین گوئی کرنے والے کو نبی کہتے ہیں' وہیں سے یہ Prophesy کا' جو انگریزی زبان میں لفظ ہے' آیا ہے۔ اس کے معنی پیشین گوئی ہے۔ یہ Prophet سے ہے تو وہ نبی کو Prophet کہتے تھے اور نبی کے معنی پیشین گوئیاں کرنے والے لیتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہودیوں کی یہ اصطلاح آئی' جس نے نبوت کے سارے مفہوم' منصب' مقام' کو مسخ کر کے رکھ دیا اور اسے صرف پیشین گوئیاں کرنے والا بنا کر رکھ دیا گیا۔ اس اصطلاح کو ہم بھی اپنے ہاں لے آئے اور انگریزی میں نبی کا ترجمہ Prophet ہی کرتے ہیں' کبھی کھڑے ہو کر سوچتے نہیں ہیں کہ ان کے ہاں تو نبوت کا تصور ہی یہ پیشین گوئیاں کرنے والے کا تھا' اس کے لیے یہ ایک لفظ یا ایک

اصطلاح آئی، انگریزی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ ہوا اور یہ اس لیے ہوا کہ Christianity (عیسائیت) میں بائبل Latin (لاطینی زبان) کے Through (ذریعہ) انگریزی کے اندر آئی، وہی ان یہودیوں کا تصور در کر آیا اور اُدھر عیسائیوں کی جو اصطلاحات تھیں، وہی ہمارے ہاں آئیں۔ انہوں نے بھی وہی اصطلاحات اپنے ہاں لے لیں۔

ہاں تو، عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس زمانے میں دنیا کے ہر مذہب میں، ان پیشین گوئیاں کرنے والوں کا بڑا بلند منصب گنا بھی جاتا تھا اور تصور بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح کہانت والے، غیب کی باتیں بتانے والے، پیشین گوئیاں کرنے والے، قسمت کا حال بتانے والے، بڑا منصب رکھتے تھے۔ اب جب رسول اللہ ﷺ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو ان کے ذہن میں اس سے زیادہ کچھ آ ہی نہیں سکتا تھا۔ قرآنِ کریم کا جو انداز تھا، اس سے انہوں نے یہ سمجھا کہ یہ نثر کی کتاب نہیں، تو اسے شاعری کی کتاب کہا، آپ ﷺ کے متعلق کہا کہ شاعر ہو گئے اور آگے بڑھے، جب آپ ﷺ یہ کہتے تھے کہ یاد رکھو! تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہو گا تو انہوں نے کہا کہ یہ غیب کی باتیں بتاتا ہے یا تقدیر کا حال بتا رہا ہے تو کہانت کی طرف ان کی نگاہ گئی کہ یہ کاہن ہے اور پھر وہ جو میں نے عرض کیا تھا کہ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ شخص اپنے نفع نقصان کی بھی نہیں سوچتا تو وہ کہتے تھے کہ ہم اسے سارے ملک کی بادشاہت دیدیتے ہیں، اگر یہ چاہے تو حسین ترین لڑکی سے شادی کر دیتے ہیں، دولت اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں مگر یہ اپنے اس دعوے سے باز آ جائے تو حضور ﷺ نے اپنے چچا سے یہ کہا تھا، جیسا تاریخ کہتی ہے کہ اگر یہ میرے ایک ہاتھ پہ چاند رکھ دیں، دوسرے پہ سورج رکھ دیں، تو میں پھر بھی اس سے باز نہیں آ سکتا، تو ان کے ذہن میں یہ ہوا کہ یہ شخص جو اپنے نقصان کا بھی نہیں سوچتا تو یہی ہے کہ یہ دیوانہ ہے جسے پاگل کہتے ہیں، جسے وہ مجنون کہتے تھے۔ وہاں کہانت کے متعلق بات چلی آ رہی تھی جب انہوں نے شاعری کا کہا تو قرآن کریم نے تو چیلنج دے دیا۔

عربوں کے ہاں شاعری کا مقام: آسمان کی باتیں جاننا

عربوں کے ہاں شاعری ہی وجہ امتیاز تھی۔ شاعر کا بڑا مقام تھا۔ وہ قوموں کو پاگل کر دیتا تھا۔ ان کا لٹریچر اور کچھ تھا ہی نہیں سوائے شاعری کے۔ عربوں کے ہاں عربی زبان میں پہلی تحریری کتاب قرآن کریم ہے۔ اس سے پہلے ان کے ہاں شاعری ہوتی تھی اور شعرا کا کلام زبانی ہوتا تھا، اشعار لوگوں کے زبان زد ہوتے تھے۔ سلسلہ شعر چلتا تھا۔ جب شاعر کہا تو قرآن کریم نے چیلنج دیدیا کہ بہت اچھا! تمہارے ہاں اتنے اتنے بڑے شاعر ہیں، سارے اکٹھے ہو جاؤ اور اپنے ساتھ جن کو اور ملانا چاہو، انہیں بھی ملا لو اور اس قرآن کریم جیسا پوری کتاب، پورا ضابطہ نہیں، دس سورتیں لے آؤ، اس قسم کی ایک ہی حدیث لے آؤ، لاؤ! یہ تو تمہارا میدان ہے۔ اس چیلنج کو مانتے کیوں نہیں۔ قبول کیوں نہیں کرتے، مگر انہوں نے چیلنج قبول نہیں کیا، اتہامات والزامات کی یہ چیزیں بدستور جاری رہیں کہ کاہن ہے، کہانت

ہے۔ کاہنوں کے متعلق ان کے ہاں یہ تھا کہ یہ آسمان کی خبریں جانتے ہیں' وہاں پہنچتے ہیں اور وہاں سے اس دنیا کے یہ جو کچھ وہاں معاملات طے ہوتے ہیں' اُن کی خبر وہاں سے معلوم کر لیتے ہیں اور پھر آ کے عام لوگوں کو بتاتے ہیں۔ یہ تھا ان کا کہانت کا تصور کہ یہ غیب کی باتیں جا کر سن لیتے ہیں۔ اس طرح انہیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے تو یہ کہا کہ **اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ** (52:38) کیا ان کا سلم (سلم تو ویسے سیڑھی کو کہتے ہیں) یا کسی جگہ پہنچنے کا ذریعہ کوئی بھی ہو کہ یہ اس ذریعے سے وہاں آسمانوں پر پہنچتے ہیں اور وہاں جو باتیں طے ہوتی ہیں' یہ وہاں سن لیتے ہیں اور سن کر پھر واپس آ کر تم لوگوں کو بتاتے ہیں؟ کیا یہ بات ہے؟ قرآن کریم نے آگے ایک ایسی بات کہی ہے۔

علم کی تعریف اور وحی کا علم

عزیزانِ من! میں عرض کرتا ہوں کہ یہ چلتے چلتے قرآن کریم سمجھنے کی بات نہیں ہے' کھڑے ہو کر سمجھنے کی بات ہے کہ قرآن حکیم کہہ کیا جاتا ہے۔ کہا کہ **فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ** (52:38)۔ اسی زمانے میں نہیں بلکہ یہ جو کہانت کا' پیشین گوئیاں کرنے کا' قیاس آرائیوں کا' جسے اس زمانے میں کہانت کہتے تھے' تصور ہے' اسے قیامت تک کے لیے کاٹ کر رکھ دیا۔ بعد میں یہ جو انسانی علم ہے جسے حاصل کیا جاتا ہے' اس کی تعلیم دوسرے کی طرف منتقل کی جاتی ہے' وہ اس کہانت یا پیشین گوئیوں سے الگ ہے۔ اس علم کے لیے شواہد چاہئیں' دلائل چاہئیں' بصیرت چاہیے' عقل چاہیے' فکر چاہیے' شعور چاہیے۔ یہ تمام چیزیں ہوں تو علم حاصل ہوتا ہے۔ جو علم ہوتا ہے اسے پھر دلائل کی رو سے سمجھایا جاتا ہے' اس کے دعاوی کی تصدیق کی جاتی ہے' دلائل کے ذریعے سے توثیق کی جاتی ہے۔ انسانی علم یہ ہے۔ وحی ہے کہ وہ انسانی فکر کا حاصل کردہ علم نہیں ہوتا' انسان کے اپنے خیالات وکسب و ہنر کا دخل نہیں ہوتا' وہ علم خدا کی طرف سے براہِ راست نبی کو ملتا تھا۔ اس حد تک تو وہ انسانی علم سے الگ ہو گیا۔ علم حاصل کرنے کا جو انسانی ذریعہ تھا اس وحی کے علم میں ان ذرائع میں سے کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ مگر حاصل تو وہ ہوا۔ اب بات یہ ہوئی۔ وہاں اسے کہانت کہتے تھے۔ جب آگے چلی ہے تو وہ اصطلاح ہی بدلی ہے۔

وجدانی علم کی کیفیت

ایک اصطلاح Intuition (وجدان) ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ یہ بات انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہوتی' سوچ کا نتیجہ نہیں ہوتی' علم اور بصیرت کا نتیجہ نہیں' یونہی ایک خیال آ جاتا ہے۔ شاعری میں عام طور پر اسے Intuition (وجدان) کہا جاتا ہے' اسے وجدانی علم کہا جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ شاعروں کا دعویٰ ہی یہ ہوتا کہ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ایرانیوں کے ہاں اس فرشتے کو سروش کہتے تھے جو ان خیالات کو شاعروں تک پہنچاتا تھا۔ وہ حقیقت میں وحی کی ہی بات تھی' انہوں نے الفاظ بدل دیئے' ادھر یہ جو سامی مذاہب تھے' ان کے ہاں اس فرشتے کو جو پیغام لاتا تھا جبریل کہا جاتا تھا۔ ان کے ہاں انہوں نے جبریل نہیں لیا۔ یہ جو ایرین تھے' انہوں نے اس کی بجائے ایک نام سروش رکھا۔ یہ وہ فرشتہ ہے جو غیب کے مضامین شعرا تک لاتا ہے تو اس لیے ''غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے''۔ کیا بات ہے غالب کے اندازِ بیان کی! صریرِ خامہ نوائے سروش ہے۔ اسے یہ وجدان کہتے ہیں۔ ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں''۔ ان سے پوچھا جائے کہ یہ بات تم کیسے کہتے ہو؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ تو ہم نہیں بتا سکتے' اس کے لیے ہم دلیل نہیں دے سکتے کہ ایسا کیوں ہوا' بس یہ تو ایک غیب کی بات ہے جو ہم تک پہنچی' ہم نے آپ تک پہنچا دی' دلیل نہیں ہوتی' Intuition (وجدان) کے لیے دلیل نہیں ہوتی۔ یہ جو ''نوائے سروش ہے'' اس کے لیے دلیل نہیں دے سکتے۔ یہی چیز' یہ جو قسمت بتانے والے ہیں' اگر ان سے پوچھا جائے کہ تم جو کہتے ہو کہ بھئی! تم اس ملک کے بادشاہ بن جاؤ گے' تو تمہارے پاس اس کے لیے کیا دلیل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے دلیل نہیں ہوتی۔ یہ چیزیں دلیل سے نہیں ثابت کی جا سکتیں۔ یہ تو غیب کی بات ہے' ہم تک پہنچی' ہم نے تم تک پہنچائی۔ یہ دلیل نہیں ہوتی۔

نوائے سروش کی کوئی دلیل نہیں ہوتی

یاد رکھیے! اس چیز Intuition (وجدان) کے لیے' نوائے سروش کے لیے' دلیل نہیں دی جا سکتی۔ یہ بھی جو آپ کے ہاں فٹ پاتھوں پہ قسمت بانٹنے والے بیٹھے ہوتے ہیں' یہ جو ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ کر غیب کی بات بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ (مثلاً) تمہاری شادی دس سال کے بعد ہوگی' بھئی! تم کیسے کہتے ہو کہ ہوگی۔ علمِ انسانی کی رو سے کہا جائے گا تو وہ بتائے گا کہ میں نے یوں اندازہ لگایا ہے لیکن یہ جو قسمت کا حال بتانے والا یا پیشین گوئی کرنے والا ہے' وہ یہ نہیں بتا سکے گا کہ میں نے یہ کیسے کہا ہے' یہ کیسے ہوگا۔ میں نہیں جانتا' مجھے پتہ ہے یہ ہوگا' ایسے میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ کیسے ہوگا یعنی اس میں دلیل نہیں ہوتی۔ میں یہ اس لیے زور دے رہا ہوں کہ شاید آپ کے ذہن میں نئی سی بات آئے کہ قرآنِ کریم نے یہاں کتنی بڑی عظیم بات کہی ہے اور کتنا فرق کر کے بتا دیا ہے۔ وحی کی رو سے ایک دعویٰ کرنے میں اور یہ جو قسمت بانٹنے والے اور غیب کی پیشین گوئیاں کرنے والے ہیں' ان کے ہاں سے یہ چیز کہنے میں' قرآنِ کریم نے ایک بنیادی فرق یہاں پیدا کر دیا اور وحی کو ان پیشین گوئیاں کرنے والے سے الگ کر کے رکھ دیا۔ ان سے پوچھیے تو کہتے ہیں کہ (مثلاً) صاحب! فلاں سال کے اندر یہاں طاعون پھیلے گا اور یہ ہوگا۔ بھئی! کیسے کہہ رہے ہو؟ کہیں گے کہ صاحب! چار دن کے بعد یہاں بارش ہوگی۔ محکمہ موسمیات والا تو وہ دو اور دو چار کی طرح سائنٹفک طریقے سے یہ چیز کہتا ہے کہ صاحب! ہم یوں اس نتیجے پہ پہنچے ہیں۔ سائنس یا علم دلیل دیتا ہے' بتاتا ہے کہ کیوں ہم ایسا کہتے ہیں اور وہ جو کہتا ہے کہ ہم نے جو کہہ دیا یہ ہوگا' جاؤ بھاگ جاؤ' یہاں سے' یہ ہوگا۔ بھئی! کیسے ہوگا؟

ہم نے کہا ہے کہ یہ خدا کی باتیں ہیں۔

پیشین گوئی کے تمام تصورات قرآنِ حکیم کے علی الرغم ہیں

پہلی یہ چیز سن لیجیے کہ قرآنِ کریم نے دونوں ہی چیزوں کی نفی کر دی ہے۔ پیشین گوئیوں کی نفی کر دی کہ اس نے کہا کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ میں کیا عرض کروں کہ ہم کس قسم کے روایاتی عقائد میں چلے آ رہے ہیں۔ پیش گوئیوں کی بنا پر ہمارے ہاں اولیاء بنتے ہیں' صوفیائے کرام ہوتے ہیں' حتیٰ کہ وہ مرزا صاحب ❶ نبوت کا ہی دعویٰ کرتے ہیں۔ صاحب! دلیل کیا ہے؟ اس کے لیے ثبوت کیا ہے؟ اس کے لیے دلیل تو ہوتی نہیں۔ ثبوت کیا ہے؟ کہ جی! قرآن کریم کے علی الرغم پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بجز وحی کے مجھے بھی غیب کا علم نہیں

قرآن کریم کہتا ہے کہ خدا کے سوا کسی کو غیب کا علم نہیں۔ رسول کہتا ہے کہ مجھے بھی غیب کا علم نہیں ہے بجز اس کے جو وحی کے ذریعے مجھ تک منتقل ہوتا ہے' وہاں سے الگ ہٹ کر بحیثیت انسان' مجھے بھی غیب کا علم نہیں ہے۔ آپ اندازہ لگائیے اب قرآن کریم کی اس تھدی کے بعد کسی کا یہ کہنا کہ میں پیشین گوئی کرتا ہوں' مجھے غیب کا علم ہے' اسے کہاں پہنچاتا ہے!!! اور اس کو ہم نبی نہیں مانتے۔ چلیے! ان کو تو چھوڑ دیجیے۔ مقربین بارگاہِ الٰہیا' اولیائے عظام' صوفیائے کرام' بڑے بڑے ولی' کن باتوں پر ہوتے ہیں؟ کہ جی! وہ جو بات کہہ دیتے ہیں پتھر پہ لکیر ہوتی ہے صاحب! وہ ٹل ہی نہیں سکتی' کوئی کھڑے ہو کر نہیں پوچھتا کہ صاحب! یہ تو خدا کہتا ہے کہ نہیں' غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ہے غیب کا علم۔ تم دیکھو کہ پورا ہوتا ہے یا نہیں اور یہ ان کی اولیائی اور ان کے تقرب باری تعالیٰ کے دعوے کے ثبوت میں اسے پیش کرتے ہیں کہ وہ غیب کا علم جانتے ہیں۔

تقدیر کا لکھا یا قسمت کا لکھا خالص ایرانی تصور ہے' قرآنِ کریم کا نہیں ہے

باقی رہا وہ قسمت کی بات تو یہ خالص ایرانی چیز ہے۔ جسے یہ لوگ تقدیر کہتے ہیں' یہ چیز کہ لکھی لکھائی ہوئی پہلے سے چیز ہے' خدا کے ہاں رکھی ہوئی ہر شخص کی ہے کہ یہ یہ کرے گا' یہ یہ ہوگا' یہ سارا کچھ ہے۔ انسان کا کوئی اختیار اور ارادہ نہیں ہے۔ ساری چیز پہلے سے لکھی ہوئی ہے اور مجبوراً اسے اس کے مطابق کرتے رہنا چاہیے۔ اس کے لیے چوائس ہے ہی نہیں۔ قرآن کریم کی پوری تعلیم جو بنیاد ہے مکافاتِ عمل کی' اس کو یہ تصور گرا دیتا ہے۔ اس کی پھر ذمہ داری نہیں رہتی۔

---

❶ یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف ہے۔

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضارا

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند ❶

ٹھیک ہے گنہگار ہیں، فاجر ہیں، ہر قسم کے عیب ہیں، برائیاں ہیں، وہ کرتے ہیں۔

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضارا

تجھے ہمارا یہ انداز پسند نہیں ہے تو اس میں ہمارا کیا جرم ہے، تقدیر ہماری بگڑی ہوئی ہے، اس کو بدل، ہم سے کیا کہتا ہے جی! انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے، عزیزانِ من! یہ بنی بنائی ہوئی نہیں ہوتی لیکن ہمارے ہاں اسے قسمت کہتے ہیں، تقدیر نہیں۔ قسمت کا حال بتانے والے بھی اور غیب کی خبریں دینے والے بھی ہیں۔ قرآن کریم نے کہا تھا کہ قرآن کی وحی کے بعد، ان کے ہاں کی اس کہانت کو تو آتشی کوڑا پڑتا ہے۔ وہ رسول ﷺ کو یہ کہہ کر معطون کرتے تھے کہ یہ کہانت ہے۔ یہ الزام لگاتے تھے۔ قرآن کریم اس کی تردید کرتا ہے کہ یہ نہیں ہے مگر قرآن حکیم کو ماننے والی اس قوم کے مدعی، تیرہ سو سال سے، ان حضرت صاحب کو مقربین بارگاہِ الٰہی قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ کہانت نہیں ہے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآن کریم کے دو الفاظ ہیں، انہیں کھڑے ہو کر سوچیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن کریم اسے کیسے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ قرآن حمید نے دو لفظوں میں کہا کہ یہ کہتے ہیں، یہ اس چیز کا دعویٰ کرتے ہیں کہ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (52:38) دعوے کی صداقت کی پرکھ یہ ہے کہ اس کے لیے دلیل لاؤ کہ ایسا کیوں کہتے ہو اور ان کا کہنا یہ ہے کہ اس کے لیے ہم کوئی دلیل نہیں دے سکتے۔ کہانت، تقدیر بنانے، قسمت بتانے، پیش گوئی کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کی جو Why of it (وجہ جواز) ہے، وہ نہیں بتائی جا سکتی کہ یہ کیوں نہیں ہوگا؟ یہ نہیں بتایا جا سکتا۔ اسباب کی کڑیوں کو جوڑ کر کسی نتیجے پر پہنچنا تو سائنٹفک طریقہ ہے، علم کا طریقہ ہے۔ ان پیشین گوئیاں کرنے والوں اور قسمت بتانے والوں سے اگر تم پوچھو کہ یہ کیسے کہتے ہو صاحب! کہ (مثلاً) میری شادی نہیں ہوگی یا میری شادی چار سال کے بعد ہوگی، وہ کہتا ہے ہم دیکھتے ہیں، تمہاری قسمت میں یہ لکھا ہے۔ یہ بات ختم ہوگئی۔ اندازہ لگایئے کہ قرآن کریم نے کیا کہہ دیا! یہاں نبی کا دعویٰ ہے کہ وہ وحی تو غیب کی خبریں دیتی ہے۔

---

❶ حافظ شیراز کا یہ شعر یوں ہے:

در کوئے نیک نامی مارا گذر نہ دادند

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضارا

وحی کی روشنی میں مکافاتِ عمل کے نتائج سے آگاہی اور کہانت کے دعویٰ کا انداز

عزیزانِ من! مکافاتِ عمل بھی تو ان کے نزدیک غیب کی خبر ہی ہے کہ یوں جاتے ہو تو تباہ ہو جاؤ گے اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں کون تباہ کر سکتا ہے!! دونوں کے اندر اتنا فرق ہے۔ وہ قسمت کا حال بتانے والے بھی کہتے ہیں کہ تباہ ہو جاؤ گے۔ ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کیسے کہتے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ بھئی! یہ تمہاری قسمت میں لکھا ہے۔ بات ختم ہوگئی۔ وحی والا بھی کہتا ہے کہ یہ انداز اختیار کرو گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیوں کہتے ہو؟ وہ دو اور دو چار کی طرح کیوں کا جواب دیتا ہے۔ عزیزانِ من! وہ سائنٹفک طریقے سے بتا دیتا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہتا ہے کہ میں یہ نہیں بتا رہا کہ یہ غیب کی بات ہے جو میں بتا رہا ہوں، صرف یہ چیز ہے کہ تم اپنے ذہن میں یہ حساب کتاب نہیں کرتے، اسباب کی یہ کڑیاں نہیں ملاتے، خوش فہمی میں مبتلا ہو، خود فریبی میں مبتلا رہتے ہو، بدمستی میں مبتلا رہتے ہو، نشے کی حالت میں رہتے ہو، عقل اور شعور سے کام لو تو پھر سمجھ جاؤ کہ میں ایسا کیوں کہتا ہوں۔ میں سمجھاتا ہوں کہ میں کیوں کہتا ہوں۔ وحی کا ملنا تو ایسا ہے کہ اس میں انسانی کسب و ہنر اور فکر و دلیل کا کوئی دخل نہیں، وحی کا جو متن آتا ہے، جس کو نبی پیش کرتا ہے، اس کے لیے جو دعویٰ کرتا ہے، وحی کی رو سے نبی یا جو وحی دعویٰ کرتی ہے، اس کیوں کا جواب دیتا ہے، اس کے لیے دلیل دیتا ہے اور قرآن حمید نے کہا کہ اگر یہ ایسے ہی کہتے ہیں کہ یہ بھی وحی کا ہی مقام ہے جہاں سے یہ کہانت اور پیشین گوئی لے کر آتے ہیں تو ان سے کہو کہ وحی کا تو دعویٰ یہ ہے کہ میں دلیل دیتا ہوں، جس بات کا بھی دعویٰ کرتا ہوں کہ یوں ہوگی، ان سے کہو: دلیل لاؤ۔ اس طرح کہنے کی کیا بات ہے! وہ تو پہلے ہی کہتے ہیں کہ اس کے لیے دلیل نہیں ہوتی، پیش گوئی کے لیے دلیل نہیں ہوتی جو ہم قسمت بتاتے ہیں تو اس کے لیے ہم دلیل نہیں دے سکتے۔ ان حضرات سے پوچھیے! وہ کہتے ہیں کہ ہم وہاں جا کر لوحِ محفوظ سے پڑھ کر آتے ہیں اور تمہیں دلیل کیا دیں!! جب کہیے کہ صاحب! ہمیں بتا دیجیے کہ یہ کیسے ہوتا ہے؟ کہنے لگے کہ یہ بتانے کی چیز نہیں ہے:

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

تم اسے کہتے ہو کہ یہ میں جو کہتا ہوں کہ شراب سے نشہ ہوتا ہے، تم کہتے ہو، بتاؤ! نشہ کیا ہوتا ہے، وہ تو جو پئے گا، اسے ہی پتہ چلے گا کہ نشہ کیا ہوتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ کتنی بڑی چیز قرآن کریم نے دو لفظوں میں کہہ دی ہے۔ وحی میں اور انسانی دعاوی میں، جو وحی کے بغیر کیے جاتے ہیں، بنیادی فرق یہ بتا دیا۔ آج کی اصطلاح میں اسے Intuition (وجدان) یا کشف والہام سے تعبیر کرتے ہیں یا اسے نوائے سروش کہتے ہیں یا اس چیز کو آپ پیشین گوئیاں کہتے ہیں یا یہ قسمت کا حال بتانے والے لیتے ہیں، وہ جو دعویٰ کرتے ہیں، اپنے دعوے کے لیے کوئی دلیل نہیں لا سکتے کہ ہم ایسا کیوں کہتے ہیں۔ اس کے برعکس وحی جو دعویٰ کرتی ہے جو دلیل دیتی ہے کہ میں ایسا کیوں کہتا ہوں، مگر وہ دلیل نہیں دیتے۔ قرآن حمید کا تو کہنا ہی یہ ہے کہ هَاتُوا بُرۡهَانَكُمۡ إِن كُنتُمۡ صَٰدِقِينَ (2:111) دیکھا، قرآن کریم کا یہ دعویٰ کتنا

عجیب ہے! اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو جیسا میں کرتا ہوں تو کوئی فیصلہ کن دلیل لاؤ: هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (2:111) قرآن حمید یہ دلیل لاتا ہے مگر یہ جو پیش کرتے ہیں' یہ پہلے ہی کہتے ہیں کہ اس کے لیے برہان اور دلیل ہے ہی نہیں۔ یہ تو وہ علم ہے جو خدا کی طرف سے ہمیں آتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا جو میں نے عرض کیا تھا کہ یوں بظاہر نظر آتا ہے کہ یہ جو آگے بات کہی گئی ہے یہاں اس کا کوئی ربط نہیں۔

الہام اور سروش کے بالمقابل قرآنِ کریم اپنے دعوے کی تائید پیش کرتا ہے

عزیزانِ من! کیا پوچھتے ہیں کہ کیا ربط نہیں ہے' وہ تو اتنی عظیم بات کہہ گیا ہے' ایک ابدی حقیقت بیان کر گیا ہے۔ یہ وحی ہے اور یہ جو مدعیان ہیں' اسی قسم کی چیزیں بتانے والے' ان دونوں کے درمیان وہ اتنا بڑا بنیادی فرق بتا گیا ہے کہ وحی جو دعویٰ کرتا ہے اس دعوے کی تائید میں دلیل پیش کرتا ہے' یہ جو اس قسم کے دعاوی کرتے ہیں ان سے پوچھیے یہ پہلے ہی کہہ دیتے ہیں کہ اس کے لیے دلیل نہیں دی جا سکتی' کیوں کہ جواب نہیں دیا جا سکتا صاحب! سن لیا آپ نے۔ پھر بات تو اس کہانت کی تھی۔ آپ کے ہاں یہ کشف اور الہام اور سروش پیشین گوئیاں' غیب کی باتیں اور تقدیر اور قسمت بتانے والے' یہ سب اس کے اندر آ جاتے ہیں۔ دعاوی ان کے بھی یہ ہیں کہ جو ہم کہتے ہیں اس کے لیے ہماری اپنی فکر کی یہ تراشیدہ بات نہیں ہے' غیب سے یہ چیزیں آتی ہیں۔ نبی کو بھی کہتے ہیں کہ تم بھی تو کہتے ہو کہ غیب سے آتی ہیں۔ کہا کہ دونوں میں فرق ہے۔ آؤ! تمہیں بتاؤں۔ میں جو کہتا ہوں کہ غیب سے ملی ہے' اس کیوں کا جواب دیتا ہوں کہ کیوں ایسا ہو گا۔ تم پہلے یہ کہتے ہو کہ ہم کیوں کا جواب نہیں دے سکتے' اب یہ اس زمانے کی کہانت کی بات ہی نہیں رہی' بلکہ قیامت تک کے لیے یہ بات ہو گئی جسے آپ Intuition یا وجدانی علم کہتے ہیں' یہ پیشین گوئیاں کرنے والے' یہ کشف اور الہام والے' یہ کہتے ہیں [1]

قرآن کریم کی رو سے یہ تمام دعاوی باطل ہیں۔ قرآن حکیم کے خلاف جاتے ہیں۔ اگر وحی کو تائید میں پیش کرتے ہو کہ یہ بھی تو علم ایسا ہے جس میں انسان کی فکر کا دخل نہیں' اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے' ذریعہ علم کی رو سے ایسا ہے' جو میں کہتا ہوں۔ نبی یہ کہتا ہے کہ اسے تم پھر دیکھو! میں اس کے لیے دلیل پیش کرتا ہوں۔ تو یہ جو معیار ہوا' وہ کسی چیز کے جانچنے کے لیے قولِ فیصل ہوا جو دعویٰ کوئی کرتا ہے تو وہ دلیل ہے اور دلیل بھی بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (52:38) ہونی چاہیے کہ خود روشن ہو' دوسری چیز کو روشن کرنے والی ہو' دلیل اتنی واضح ہو' یہ مبہم

---

[1] یہ ارباب نہیں کبھی دلائل و براہین کی رو سے پرکھنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ ان کے نزدیک فکری دلائل یکسر ناقابل اعتماد ہوتے ہیں۔ عقل و فکر کے تو وہ جانی دشمن ہوتے ہیں بلکہ علم و بصیرت کے بھی۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ...... پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکین بود
اس مسلک نے قناعت' توکل' صبر' شکر' راضی برضا' وغیرہ کے غیر قرآنی مفاہیم سے' اس قوم کے اعصاب پر اس طرح موت طاری کر دی کہ یہ دیکھتے ہی دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ یہی وہ مرگ آفرین عقائد ہیں جو ہم میں صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں۔

نہیں ہونی چاہیے'اس کے اندر ابہام نہیں ہونا چاہیے' پیشین گوئیوں کا تو مدار ہی ابہام پہ ہوتا ہے۔اس کے بعد ان کے جو پیرا وٗ اور معتقدین ہوتے ہیں' جب ان سے کہو کہ صاحب! یہ تو انہوں نے کہا تھا اور یہ یہ نکلا' کہنے لگے کہ تم سمجھے نہیں۔کہا یہ تھا' اس کے معنی یہ تھے۔پیشین گوئیوں میں بھی اتنا سقم ہوتا ہے۔ان کا ابہام دور کر کے' انہیں معنی پہنا کر وہ چسپاں کرتے ہیں مگر قرآنِ کریم نے بِسُلۡطٰنٍ مُّبِيۡنٍ (52:38) کہا ہے کہ یہ اس کے نبوت میں کوئی سند اور دلیل اور حجت پیش کریں، بلا دلیل کوئی دعویٰ مانا نہیں جا سکتا۔میں کیا عرض کروں! یہی کہ اما تو چیزے دیگر است۔

قیاس آرائیاں کرنے والے عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی

یہ تو رہے یہ قیاس آرائیاں کرنے والے۔یہ عیسائی بھی تھے' یہودی بھی تھے۔یہ جو پہلی چیز ہے یہ یہودی اور یہ قریش' دونوں کے ہاں' مشترک تھی۔یہودیوں کے ہاں تو میں نے عرض کیا ہے کہ ان کے جو معابد تھے' ان کے Temples تھے، مندر تھے' جہاں یہ پیشین گوئیاں کرنے والے نبی ہوتے تھے' قریش کے ہاں یہ کاہن ہوتے تھے۔

عیسائیوں کے ہاں فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مانا جاتا تھا

دوسری جگہ جہاں عیسائیوں کا عقیدہ ابن اللہ کا آیا ہے' ان مذاہب میں یہ چیز بھی تھی جنہیں خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ان کے ہاں دیوتا بھی ہوتے تھے اور دیویاں بھی ہوتی تھیں۔ان کے ہاں بھی فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ہی کہتے تھے۔ان کے ہاں فرشتوں کی اس قسم کی مخلوق کا یہ تصور تھا لیکن انہیں وہ بیٹیاں کہتے تھے' انہیں وہ بیٹیوں کی طرح مانتے تھے۔عربوں کے ہاں بھی یہ جوان کے بت تھے' ان میں یہ بیٹیوں یا جسے مؤنث کہتے ہیں' وہ بھی ان کے ہاں تھیں۔وہ انہیں خدا کی بیٹیاں مانتے تھے۔کہنے لگے کہ یہ دیکھیے! وہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔عیسائیوں کے اس دعوے کو تو قرآن کریم نے ایک فقرے میں ردّ کر دیا۔

خدا کا بیٹا ہونے کے سلسلہ میں قرآن کریم کا جواب

ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرتِ عیسیٰؑ خدا کے بیٹے تھے۔قرآن کریم نے کہا کہ خدا کی تو بیوی ہی نہیں تھی تو بیٹا کیسے ہوسکتا ہے۔عجیب بات ہے کہ وہ حضرت مریمؑ کو خدا کی بیوی نہیں مانتے اور قرآن کریم نے یہ کہہ کر اب دیکھا کہ دلیل کتنی محکم ہے کہ یہ اولاد بیٹا ہو' بیٹی ہو' اولاد تو ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ مرد اور عورت' مؤنث اور مذکر' کا اختلاط نہ ہو' تو تم خود مانتے ہو کہ خدا کی بیوی تو نہیں ہے' تو جس کی بیوی نہیں ہے' اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے؟ چار لفظوں کے اندر ساری بات کاٹ کر رکھ دی اور انہی کے اوپر کہا کہ تم بھی مریمؑ کو خدا کی بیوی تو

نہیں مانتے، تو بیوی تو ہے نہیں، ہم تو نہ اولاد مانتے ہیں، نہ بیوی مانتے ہیں، لیکن تم اولاد مانتے ہو تو تم بھی بیوی تو نہیں مانتے کہ خدا کی کوئی بیوی ہے تو کہا کہ جس کی بیوی نہیں ہے اس کے ہاں بیٹا کیسے ہو جائے گا۔

آپ نے غور کیا کہ یہ سائنٹفک دلیل ہے، اس کے مقابلے میں کچھ نہیں کہہ سکے انہیں یہ کہا کہ یہ قریش جیسے جو تھے خدا کی بیٹیاں ماننے والے کہنے لگے کہ ذرا ان کو دیکھیے بظاہر ان سے پوچھیے تو خدا کو بڑا مانتے ہیں، حالت ان کی یہ ہے کہ انہیں اگر صحیح خبر مل جائے کہ ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے تو ان کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے، منہ چھپاتے پھرتے ہیں اور اس کے بعد کوشش کرتے ہیں کہ اس کو زندہ ہی دفن کر دیا جائے۔ بیٹی ان کے نزدیک اتنی قابلِ نفرت شے ہے اور اندازہ لگائیے کہ اپنے ہاں تو بیٹوں کے لیے دعائیں مانگتے ہیں اور بیٹے سے خوش ہوتے ہیں، خدا کے ہاں کہتے ہیں کہ بیٹی ہے یعنی ''ایناں نالوں وی گیا گذرا ہویا'' (ان سے گیا گزرا ہو)۔ کیا بات ہے! یہ ساری چیزیں رد کر کے کہا کہ یہ دلائل و براہان تو علم کی بات تو ہے نہیں، تو کیا ایک اور بات ہو سکتی ہے کہ **اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ** (52:40) کیا یہ بات ہے کہ تم جو ان سے اس کے بدلے میں اپنا دعویٰ منوانا چاہتے ہو ان سے تم کچھ معاوضہ مانگتے ہو جو ان کے اوپر بہت گراں گزر رہا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں بھائی! اس بھاؤ تو اس سودے کو ہم نہیں خرید سکتے، رکھو تم اپنے ہاں۔ یعنی جو دعاوی ہیں، ان کے لیے دلیل کی رو سے تو کوئی چیز نہیں کہہ سکتے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ بھئی! چیز تو مجھے پسند ہے، بس ٹھیک ہے جو تم کہتے ہو کہ یہ خالص ہے میں مانتا ہوں خالص بھی ہے، سب کچھ ہے لیکن بھئی! ہمیں پڑتی نہیں ہے مہنگی ہے، اس کے دام زیادہ ہیں، ہم نہیں خرید سکتے۔ کہنے لگے کہ ایک یہ بھی بات ہو سکتی ہے کہ کیا تم ان سے کچھ معاوضہ مانگتے ہو اور وہ اسے جرمانہ کا بارِ گراں سمجھ کر تجھ سے کنارہ کش رہنا چاہتے ہیں اور یہی کچھ سورۃ القلم میں 46 آیت میں کہا کہ ذرا سوچو کہ یہ جو تجھ سے اس طرح گھبرا کر بھاگ جانا چاہتے ہیں تو کیا تُو ان سے کچھ معاوضہ مانگ رہا ہے جسے یہ اپنے لیے ناقابلِ برداشت جرمانہ سمجھ رہے ہیں۔ قرآن کریم نے تو قدم قدم پہ کہا ہے، جب رسول نے پہلی سانس میں یہ کہا ہے، آپ نے دیکھا ہے کہ سورۃ ھود وغیرہ یا سورۃ شعراء میں یہ دعویٰ ہے۔

ہر نبی کا دعویٰ یہ رہا تھا کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا

ہر نبی پہلے دعوے کرتا ہے کہ **اعبدو اللہ** محکومیت صرف خدا کی اختیار کرو۔ اس کے ساتھ کہتا ہے کہ میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا اور یہ بڑی بنیادی چیز ہے۔ جو شخص معاوضہ نہ مانگے اور کوئی بات کہے، اس کی بات اس قابل ہوتی ہے کہ کھڑے ہو کر سوچ لیا جائے کہ اس میں اس کا اپنا فائدہ تو ہے نہیں، وہ یہ کہتا ہے کہ اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، تو سوچ لینا چاہیے۔ اگر نظر آ جائے کہ اس کا اپنا فائدہ بھی اس کے اندر ہے تو پھر بھی آدمی سوچتا ہے، وہ کہتا ہے کہ مفاد پرست ہے۔ کہا کہ کیا یہ بات ہے کہ یہ کچھ تم سے اس کا معاوضہ مانگتا

ہے اور ایسا معاوضہ مانگتا ہے کہ تم کو وہ جرمانہ نظر آتا ہے' چٹی نظر آتی ہے' ادا نہیں کر سکتے۔ مزید کہا کہ **اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَیۡبُ فَهُمۡ یَكۡتُبُوۡنَ** (52:41) کیا واقعی ان کے پاس وہ غیب کی بات ہے' جنہوں نے لکھ لکھا رکھی ہے' اس کو محفوظ کر رکھا ہے۔ یہ چیزیں کہتے رہتے ہیں' ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ بات کیا ہے؟

ظہورِ اسلام کے وقت قریش کی مفاد پرستیوں کی کیفیت

کہا کہ **اَمۡ یُرِیۡدُوۡنَ كَیۡدًا** (52:42) مقاصد کچھ اور ہیں' ان پر زد پڑتی ہے۔ ان کی مفاد پرستیوں کے اوپر قریش جو کچھ بنے ہوئے تھے' ان کا تو کچھ رہتا نہیں تھا اگر یہ کہیں نظام قائم ہو جاتا۔ نسل پرستی' نسب پرستی' تفاخر' اس کے اندر کعبے کی تولیت' اتنی اتنی بڑی تجارت' اتنی دولت' اس میں سینکڑوں کی تعداد میں غلام اور لونڈیاں' یہ سارا معاشرہ یہ تھا۔ اسلام کے ایک نظام قائم ہو جانے سے ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی تھی صاحب! تو ان کی مخالفت اس اعتبار سے قابلِ فہم ہے۔ افسوس اس چیز کا ہے کہ یہ جاہلیت عرب کے زمانے کے قبل از اسلام کے یہ عرب اور خاص طور پہ قریش' ان میں بڑی خصوصیات تھیں۔ ان کے اندر جو بعض چیزیں تھیں' وہ بڑے عمدہ پختہ کیریکٹر کی نمائندگی کرتی تھیں۔ ان میں جرأت تھی' بے باکی تھی' مہمان نوازی تھی' تواضع تھی' اور عہد کی پابندی تھی' وعدہ ایفائی تھی۔ یہ ساری چیزیں تھیں لیکن اس باب میں بھی ان کی یہ کیفیت تھی کہ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ہمارے مفاد پہ زد پڑتی ہے اس لیے ہم یہ نہیں مانتے ''اوجنوں جتّاں کیندے نیں ساڈے او جتّاں ای لاوندے سن'' (وہ جسے ہمارے ہاں جتیں کہتے ہیں وہ جتیں ہی کرتے تھے) دلیل نہیں دے سکتے تھے' نہ اس کا اعلانیہ اعتراف کرتے تھے کہ بات یہ ہے جو ہمارے اوپر زد پڑتی ہے اور کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ کہا ہے کہ **اَمۡ یُرِیۡدُوۡنَ كَیۡدًا** (52:42) مخفی خفیہ تدبیریں کرتے تھے۔ یہ جو تدبیر تھی کہ صاحب! کسی طرح سے بھی یہ شخص ﷺ (معاذ اللہ معاذ اللہ) باز نہیں آتا' اس کا خاتمہ کرو۔ یہ ان کی ایک خفیہ تدبیر تھی اور اس اعتبار سے کہ یہ بہرحال قریش کا ہاشمی گھرانہ تھا' اس کا تو بڑا پاس ہے کہ اس کے بعد باز پرس ہوگی' اور یہیں دینی پڑے گی تو پتہ نہیں کتنا ہوگا' تو کیا کریں کہ کسی ایک پہ الزام نہ آئے جیسے حریف بتا دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ جتنے بڑے بڑے قبیلے ہیں' جو قریش کے شعوب تھے ''گوتاں جنوں کیندے نیں'' (جنہیں گوتیں کہتے ہیں) ان میں سے ایک ایک نمائندہ اکٹھے ہو کر اس کے بارے میں تدبیریں کرتے تھے۔ بہرحال قرآنِ کریم نے ایک لفظ خفیہ تدبیر کہہ دیا کہ وہ یہ کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے یہاں صرف ان کی تدبیر کا جواب ہی نہیں دیا۔

باطل کی بنیاد پر اقتدار حاصل کرنے والی تدبیروں کا نتیجہ

عزیزانِ من! پھر قرآنِ حکیم نے یہاں ایک اصول بیان کر دیا جو قیامت تک قائم رہتا ہے۔ کہا کہ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ (52:42) اور اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے قرآن کریم نے آیت (35:43) میں عجیب اصول گنا دیئے اور کہا یہ ہے کہ اسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَ مَكْرَ السَّيِّئِ (35:43) یعنی باطل کا اقتدار سنبھالے ہوئے ہیں اور پھر اس کے لیے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا کرنے والی اور برائیاں پیدا کرنے والی تدبیریں کرتے رہتے ہیں۔ یہ انداز ہے ان کی سیاست کا یعنی قوم کو قوت کے زور پہ محکوم بنائے ہوئے ہیں اور پھر اس قسم کی بدتدبیریاں کرتے ہیں، سازشیں کرتے رہتے ہیں کہ جو ناہمواریاں پیدا کرتی چلی جائیں اور یہ قوم ابھرنے نہ پائے۔ یہ ہے وہ اصول جو قرآن کریم نے بیان کیا کہ وَ لَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (35:43) یاد رکھو! اس قسم کی انسانیت کے خلاف تدبیریں کرنے والے جو بھی ہیں ان کی تدبیریں پلٹ کر انہی کو گھیر لیتی ہیں:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

(اقبالؒ)

انسانیت کی ساری تاریخ اس پہ شاہد ہے، عزیزانِ من! جہاں جہاں بھی کسی نے قوموں کے خلاف ایسی سازشیں کی ہیں، سو تاریخ کے اندر کا انجام آپ دیکھیے کہ وہ ساری سازشیں پلٹ کر ان کے اوپر جا پڑتی ہیں چنانچہ قریش کا انجام بھی ایسا ہی ہوا۔ یہاں ایک اور بات بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (52:43) ایک تو تم کہتے ہو کہ محکومیت صرف خدا کی ہے، لہٰذا جو اس کو مانتا ہے تو اس کو پھر ڈر کس کا؟ دراصل بات یہ ہے کہ ان کا کوئی اور بھی صاحبِ اقتدار ہے جس کے ڈر کی وجہ سے یہ بات نہیں مانتے۔ ان سے کہو کہ خدا صاحبِ اقتدار ہے تو وہ اپنے اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں، اس لیے کسی سے ڈرنے کا سوال ہی نہیں ہے، لہٰذا تم ادھر آؤ، تمہیں ہم بتائیں کہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
(اقبالؒ)

قوت کے نشے میں بدمستی کی کیفیت

قوت کے نشے میں بدمستی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اور یہ خوش فہمیاں کچھ اس قسم کی ہوتی

ہیں: کہو کہ وَاِنۡ یَّرَوۡا کِسۡفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا یَّقُوۡلُوۡا سَحَابٌ مَّرۡکُوۡمٌ (52:44) یعنی اگر ان کو آسمان سے یا فضا سے بھی کوئی ایسی چیز نظر آ جائے کہ جو نیچے گر کر' انہیں تباہ کر دے گی تو بھی یہ اس کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ ایک سہانا بادل ہے' جو ہمارے کھیتوں پر برسے گا' تو پھر اس سے ہماری کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی' اور اس طرح تباہی پیدا کرنے والے ان عناصر کو یہ زندگی عطا کرنے والا بادل سمجھے ہوئے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو یہ کیسی عجیب بات ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم تشبیہات میں باتیں کرتا ہے' یہ صرف اقتدار کے نشے میں بدمست' خوش فہمیوں میں مبتلا ہیں جبکہ ان پر ہر طرف سے تباہی آ رہی ہے' سانپ ڈس رہے ہیں' بڑے بڑے گہرے غار ہیں' جن کے کنارے پہ کھڑے ہیں لیکن انہیں یہ کچھ نہیں نظر آتا' نہ صرف یہ کہ نظر نہیں آتا' بلکہ ان چیزوں میں وہ اپنی زندگی کے آثار دیکھتے ہیں' مرفع الحالی دیکھتے ہیں' وہ اس لیے کہ نشے میں انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور خوش فہمیاں وغیرہ بھی ساری نشے کی ہی نہیں' حقیقت میں ان میں عقل و شعور نہیں ہوتا' اس لیے ان کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ ہر دوسرے دیکھنے والے کو تو نظر آ جائے کہ یہ گرا اوپر سے' اور یہ تباہ ہوئے لیکن یہ خوش ہو رہے ہیں کہ صاحب! ایک بڑا عمدہ سہانا پانی سے بھرا ہوا بادل آ رہا ہے' سبحان اللہ' یہ برسے گا' کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔

آخر کار ایسے لوگوں کے لیے خدا کا ارشاد

لہٰذا آپ نے غور کیا کہ کہا ہے کہ فَذَرۡهُمۡ (52:45) یہ کہاں آیا ہے فَذَرۡهُمۡ جو یہاں تک پہنچ جائیں کہ نہ عقل و بصیرت سے کام لیں' نہ اپنے دعوے کی صداقت کے لیے کچھ دلیل پیش کریں' کٹ حجتیاں کرتے چلے جائیں' سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ رہے' بدمستیاں نشے کی خوش فہمیاں عقلِ فریب کارکی پیدا کردہ ہوں تو کہا کہ اب کب تک ان کے اوپر تم جان مارو گے۔ اس لیے فَذَرۡهُمۡ (52:45) ٹھیک ہے چھوڑ دو۔ کہا کہ حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ فِیۡهِ یُصۡعَقُوۡنَ (52:45) ان کی اس غلط روش کے نتائج محسوس طور پر سامنے آ جائیں اور پھر وہ اس طرح سے سامنے آتے ہیں کہ کھیتیاں جھلس کر رہ جاتی ہیں جسے قرآن کریم نے بَرق (2:19) اور الصّٰعِقَة (51:44) کہا ہے' پھر اس قسم کی ہلاکت انگیز تباہی آتی ہے تو چھوڑ دو ان کو' یہ وہاں پہنچ چکے ہیں کہ جہاں اب کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا لیکن قرآن کریم نے دوسرے مقام پہ جب ذَرۡهُمۡ کہا ہے' یاد رکھیے! ایک تو جہاں بھی کہا ہے کہ چھوڑ دو' چھوڑ دینے کے متعلق بھی کہا ہے کہ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡرًا جَمِیۡلًا (73:10) چھوڑو بھی تو حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔ بڑی عجیب چیز ہے صاحب! یہاں تک پہنچتے ہوئے انہوں نے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا کو اس قدر تکالیف بہم پہنچائیں تھیں کہ تاریخ پڑھنے سے انسان کپکپا اٹھتا ہے۔ اتنا لمبا عرصہ حضور ﷺ نے ان کی بہتری کے لیے اتنی جان کھپائی لیکن پھر بھی ان کی یہ کیفیت ہے' لہٰذا کہا گیا کہ اب جو بھی ان میں سعادت مند روحیں آنے والی تھیں' وہ آ گئی ہیں' ان کو ساتھ لیے ایسی فضا میں جاؤ کہ جہاں تمہارے اس پیغام کے لیے حالات مساعد ہوں اور ہجرت کے بعد واقعی ایسا

ہوا لیکن وہاں بھی قرآن کریم نے ایک تو کہا ہے کہ جَـمِيْلاً (73:10) حسن کارانہ انداز سے چھوڑو۔ اس کے ساتھ کہا ہے کہ اس کے باوجود قرآن کریم کی آواز ان تک پہنچاتے جاؤ تاکہ ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسا فرد ایسی روح جو نچ سکتی ہو اس لیے تباہ ہو جائے کہ اس تک قرآن حمید نہیں پہنچا تھا' چھوڑنے کے بعد بھی یہ کیفیت ہے۔

عزیزانِ من! کہا ہے کہ پہنچاتے چلے جاؤ' وہ دن کہ جب پھر تباہی آتی ہے تو کہا کہ يَوْمَ لَا يُغْنِىْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (52:46) یہ اس زمانے کی بات نہیں' یہ تو قوموں کی تاریخ ہے' آج ہمارے سامنے وہ رہا ہے صاحب! کہ جب اس غلط روش' غلط نظام کی تباہیاں سامنے آتی ہیں' تو پھر یہ جو خفیہ تدبیریں اس دوران کرتے رہتے تھے' کوئی تدبیر کام نہیں آتی اور پھر جو ان حالات میں جب یہ صاحبِ اقتدار تھے' ان کا وقار تھا' ان کا وزن تھا' قوموں کی زندگی میں بہت سے دعوے کرنے والے تھے کہ ہم تمہارے مددگار ہیں' ہم تمہارے ساتھی ہیں' چلو اٹھو تم دیکھو تو سہی کہ ہم کس طرح سے کیا کچھ کر دیں گے' لیکن اس وقت پھر کوئی مدد کے لیے نہیں آیا۔

دوسروں کے سہاروں اور وعدوں پر جینے والی قوموں کا حشر

دور پیچھے جانے کی ضرورت نہیں' عزیزانِ من! اپنے ہی دور کی تاریخ کو آپ دیکھیے جس قوم کے سہاروں' آسروں' وعدوں پر ہم نے کوئی قدم اٹھایا' ہم سے مراد صرف اہلِ پاکستان ہی نہیں ہیں' باقی مسلمان ممالک بھی ہیں جو سپر پاور کے سہاروں پہ جی رہے ہیں' اس نے کبھی بھی وعدہ ایفائی نہیں کی۔ کہا ہے کہ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (52:46) کیا بات قرآن حمید کہہ گیا ہے کہ تم ان کے ان وعدوں پر نہ رہو' ان پہ اعتماد نہ کرو' تمہارے اوپر جب برا وقت آئے گا تو پھر کوئی مدد کے لیے نہیں آسکے گا' کوئی بچا نہیں سکے گا۔ پچھلے دنوں جو کچھ فلسطین میں ہوا ہے وہ تو بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو بہر حال اس کو برداشت ہی نہیں کر سکا۔ یہ جو بات میں کہہ رہا ہوں' آج ہی صبح یاسر عرفات کا وہ بیان آیا ہوا ہے: ''پھر اس کے بعد میں کبھی امریکہ کی ضمانتوں پر بھروسہ نہیں کروں گا۔'' یہ پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا لیکن ہم تو ان حالات میں اس مقام پہ پہنچے ہوئے ہیں کہ سمجھنے کے بعد بھی کیا کیا جائے۔ اب جو کچھ ہو چکا ہے تو سب کچھ سمجھ لیا سوائے اس کے کہ ہم نمازوں میں دعائیں مانگیں' عرفات والوں سے کہیں کہ حج کے بعد التجائیں کرو' خدا کے ہاں یو این او کے ہاں درخواستیں بھیجو۔ عزیزانِ من! مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک' ایک عرب آبادی کا بحرِ ذخار موجیں مار رہا ہے' مسلسل مسلمانوں کی آبادیاں چلی جاتی ہیں اور آزاد مملکتیں ہیں' اب ساری کی ساری ہیں اور ان میں ایک چڑیا جتنا یہ بنی اسرائیل کا ٹکڑا' ان کا عطا کردہ' ان کی چھینی ہوئی وہ زمین' آبادی اس کی لاہور شہر جتنی نہیں' اور وہ کہتے ہیں جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش' کل ابھی وہ وجود میں آیا ہے' آپ اندازہ لگایئے اور پھر کسی سیاسی چال کی بنا

پہ برہنہ شمشیر، ننگاں ظلم، اس قدر ستم کہ انسانیت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی جو کچھ وہاں ہوا ہے۔ٹھیک کہا ہے وَّلاَ هُـــمْ يُـنْصَرُوْنَ (52:46)۔یاسرعرفات غلطی تھی۔کہا ہے کہ وَّلاَ هُـمْ يُـنْصَرُوْنَ o وَاِنَّ لِلَّـذِيْـنَ ظَـلَـمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِکَ وَلٰـکِنَّ اَکْثَرَهُمْ لاَيَعْلَمُوْنَ o (47-52:46)۔قرآن حکیم اسی دنیا کی تباہی تک محدود نہیں رہتا، وہ تو زندگی کو مسلسل آگے بھی لے جاتا ہے۔اس دنیا کے جتنے بھی غلط نظام ہیں، وہ افراد کے ہوں، اقوام کے ہوں، ان کے نتائج یہاں بھی سامنے آئیں گے۔افراد واقوام آگے جائیں گی، تو وہاں کا جو تباہ کن عذاب ہے وہ اس کے علاوہ ہے، وہ بھی اس کے ساتھ ہے، یہیں قصہ ختم نہیں ہو جاتا: وَلٰـــــــكِـنَّ اَکْثَــرَهُــمْ لاَ يَعْلَمُوْنَ(52:47) لیکن یہ اس سے بالکل بے خبر ہیں۔

ان تمام خطرات سے بچنے کا ایک ہی طریق ہے

عزیزانِ من! دقت ساری یہ ہے کہ یہ لوگ اتنا کچھ سمجھانے کے باوجود، اس بات کو نہیں سمجھتے کہ انسان کا کوئی عمل، کوئی کام بھی، نتیجہ مرتب کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔بات ساری اتنی سمجھنے کی ہے۔غلط کام کرنے والے نہیں سمجھتے۔یہ نہیں ہوتا کہ ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ غلط کام ہیں، وہ مطمئن رہتے ہیں۔جیسا میں نے کہا ہے کہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں، کہ نہیں نہیں اس کا یہ نتیجہ نہیں نکلے گا، ٹھیک ہے ہم نے انتظام کر رکھے ہوئے ہیں، ہمارے پاس ایسے سارے انتظامات ہیں، کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔یہ ہوتا ہے۔اگر یہ یقین اور ایمان ہو جائے کہ غلط کام کا جو غلط نتیجہ ہے وہ برآمد ہو کر رہتا ہے، تو پھر انسان بہت بڑی حد تک تباہیوں سے بچ جائے، قومیں بھی اور افراد بھی۔

اتنا کچھ کہنے کے بعد پھر آخری آیت وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ(52:48) خدا کی حکومت، خدا کی حاکمیت، کو قائم کرنے کے لیے جو کچھ تم کرتے چلے جا رہے ہو اس پر وَاصْبِرْ (52:48) استقامت سے جمے رہو، ان مخالفتوں کا، ان معاندین کا، کوئی خیال نہ کرو۔ان ساری چیزوں پر اگر تم ثابت قدم رہو گے تو کامیابی آخر الامر تمہاری ہی ہے۔صاحب! اس راستے میں کٹھن منزلیں آئیں گی، خطرناک مقامات آئیں گے، بظاہر مایوسیاں بھی نظر آئیں گی لیکن یقین رکھو کہ اگر تم ثابت قدم رہے تو آخر الامر کامیابی تمہاری ہوگی۔

انسان کے ہر عمل کی نگرانی ساتھ کے ساتھ ہو رہی ہوتی ہے

کہا ہے کہ فَاِنَّکَ بِاَعْيُنِنَا(52:48) یہ نہیں ہے کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اس کی نگرانی کوئی نہیں کرتا۔کیا خوبصورت انداز میں یہ کہا کہ تم ہماری زیر نگرانی یہ کچھ کر رہے ہو، ہمارے ہی بتائے ہوئے قوانین ہیں، اصول ہیں، ضوابط ہیں، جن کے مطابق تم زندگی بسر کر رہے ہو، جن

کے مطابق تم یہ اتنی بڑی لڑائی لڑ رہے ہو اور یہ جو چیز ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں' وہ بات یہ ہے کہ وہ جو ان قوانین اور ان ضوابط میں کہا گیا ہے وہ اتنا اٹل اور یقینی ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ اس کے مطابق تم زندگی بسر کرتے جاؤ اور وہ نتائج نہ نکلیں جو ہم نے کہے ہیں۔ کرنا کیا ہے؟ یہ کہ وَاصْبِرْ (52:48) استقامت سے جمے ہو۔ کہا کہ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ o (52:48-49)۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ہمارے ہاں جب دین' مذہب میں بدلا' تو قرآن کریم میں جہاں بھی یہ سبح یا تسبیح وغیرہ کا لفظ آیا ہے تو یا تو اس کے معنی تسبیح ہی آ گئے جو خود مسلمانوں کے اندر غیروں سے مانگی ہوئی ایک چیز ہے جو آئی ہوئی ہے' یعنی عربوں کے ہاں جاہلیت میں بھی تسبیح نہیں ہوتی تھی' یہ عیسائیوں کی چیز بدھوں کے ہاں' بدھوں سے مستعار لی ہوئی چیز' وہاں سے آئی ہوئی ہے اور سبح کا ترجمہ تسبیح کرنا ہوا۔ ان کی زبان میں' Language میں' یہ بات نہیں تھی۔ میں عرض کرتا ہوں دین کا تصور تو ایک طرف رہا' یہ تصور تو بدھوں کا تھا' گنتی کے روسے' اعداد کی روسے' جو چیزیں حاصل کرتے تھے' یہاں ہمارے ہاں گنتی کا کیا سوال؟ بہر حال کہا ہے کہ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (52:48) نظام خداوندی کے قیام واستحکام کے لیے مصروف جدوجہد رہو۔ اب یہاں پھر آگے بڑھے تو اس کا ترجمہ نماز پڑھنا بھی انہوں نے کر لیا اور اس قسم کی آیات سے پھر نماز کے اوقات کا تعین بھی انہوں نے کیا۔ کہا کہ حِيْنَ تَقُوْمُ (52:48) جب تو اٹھے رات کے کسی بھی حصے میں اور ستاروں کے غروب ہونے کے بعد بھی' یہ اس کا عام ترجمہ کیا گیا۔ بہر حال سبح کا ترجمہ عربوں سے پوچھ لیتے ہیں' قرآن حکیم سے پوچھتے تو بات ہی اور ہو جاتی۔ اس لفظ سبح کے معنی تو آپ کو معلوم ہیں: پوری پوری قوت سے' جس طرح سے کہ وہ گھوڑا پورے ٹاپ سے بھاگتا ہے' تیراک پورے ہاتھ پھیلا کے تیرتا ہے۔ کہا کہ حِيْنَ تَقُوْمُ o وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ o (52:48-49) تم دن رات اور صبح وشام اپنی ان Activities میں سرگرم رہو' اپنے پروگرام میں جمے رہو' ثابت قدم رہو' اور اس کے لیے مسلسل کوشش کرتے رہو اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ وہ نتیجہ نکل کر رہے گا جو ہم کہتے ہیں۔

عزیزانِ من! سورۃ الطّور ختم ہوئی۔ میں ابھی وقت کے متعلق ایک بڑی اہم بات عرض کر دوں۔ ایک تو یہ ہے تا کہ آپ اسے مس نہ کر جائیں۔ اس کے بعد سورۃ النجم آتی ہے یوں تو قرآنِ کریم کی کون سی سورۃ' کون سی آیت ہے جو اہم نہیں ہے' جو بلند مقام نہیں ہے' لیکن یہ خاص طور پہ اس سورۃ کو اہمیت حاصل ہے اس لیے کہ یہ جسے نبی اکرم ﷺ کا معراج کہا جاتا ہے اس کے لیے دو ہی مقام ہیں جہاں سے دلیل لائی جاتی ہے۔ ایک تو سورۃ بنی اسرائیل ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا (17:1) اس کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ مکے سے بیت المقدس تک جو وہاں براق کے اوپر پہلی منزل تھی اور وہاں سے

بیت المقدس تک پھر آگے آسمانوں کے اوپر، پھر بارگاہِ الٰہی میں عرشِ معلیٰ، پہ حضور ﷺ کا تشریف لے جانا۔اس کے لیے یہ دوسری جو سورۃ النجم ہے، یہ جو آگے سورۃ آرہی ہے، وہ ہے سورۃ النجم تو یہی چیز ہے جو مسلمہ کے طور پر ہمارے ہاں چلی آرہی ہے۔ میں نے اس لیے عرض کیا ہے کہ میں پہلے یہ بتا دوں تاکہ آپ اسے مس نہ کر سکیں۔ اگلے درس میں یہ چیز ہمارے سامنے آئے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ(2:127)

❀......❀......❀

سورة النجم

پہلا باب: سورۃ النجم (آیت 1)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1982ء کی پہلی تاریخ ہے درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم سے ہوتا ہے۔ یہ 53ویں سورۃ ہے:(53:1)۔

واقعہ معراج کے سلسلہ میں یہودیوں کی عبادت گاہ ہیکل سلیمانی کا تذکرہ

میں نے سابقہ درس میں یہ عرض کیا تھا کہ اس سورۃ کا تعلق نبی اکرم ﷺ کے واقعہ معراج سے بتایا جاتا ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ میں سورۃ تک آنے سے پہلے، پس منظر کے طور پر، اس واقعہ کے کچھ کوائف آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ واضح رہے کہ میں عقائد سے بحث نہیں کروں گا، میں صرف واقعات تک محدود رہوں گا۔

واقعہ معراج کو دو مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے: ایک نبی اکرم ﷺ کا مکے سے بیت المقدس تک جانا اور دوسرا مرحلہ بیت المقدس سے آسمانوں پہ جا کر اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنا، پھر اسی طرح سے وہیں بیت المقدس میں واپسی اور وہاں سے پھر واپس مکے شریف میں تشریف لانا۔

جہاں تک پہلے مرحلہ کا تعلق ہے اس کی تائید میں سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت پیش کی جاتی ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا(17:1) اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے ''پاک ہے وہ ذات، جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف یا مسجد اقصیٰ تک لے گئی'' گویا یہ پہلا مرحلہ ہوا۔ مسجد حرام سے مراد کعبہ یا مکہ شریف ہے، مسجد اقصیٰ سے مراد بیت المقدس لیا جاتا ہے اور مسجد سے مراد عبادت گاہ ہے۔ ٹھیک ہے یہ لیا جا سکتا ہے۔ یہودیوں کی عبادت گاہ یروشلم میں جسے بیت المقدس کہتے ہیں، وہاں واقع تھی۔ جس زمانے میں یہودیوں کی اپنی مملکت تھی، وہ ان کا وطن تھا، تو وہاں ان کا ہیکل تھا، جسے عام طور پہ ہیکل سلیمانی کہتے ہیں۔ یہ ان کا بہت اہم مرکز تھا اور ان کی عبادت گاہ تھی۔ تو گویا کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم میں یہ جسے مسجدِ اقصیٰ کہا ہے، اس سے مراد بیت المقدس کا وہ ہیکل ہے یا خود بیت المقدس ہی ہے کہ وہی یہودیوں کی عبادت گاہ تھی تو اس سے مراد مکے سے وہاں تک لے جانا لیا جاتا ہے۔

واقعہ معراج کے متعلق ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ کے تصورات کی مکمل تفصیل اور ہیکل سلیمانی کا متضاد تعارف

مذکورہ آیت کے اندر یہاں سے وہاں تک کی تفصیل کتب روایات میں متعدد مقامات پر آئی ہے۔ اُدھر ہمارے ہاں کی کتب تفاسیر میں وہی بات آئی ہوئی ہے، متقدمین کے ہاں ایسا ہی ہے لیکن میں اس کی تفصیل، ہمارے دور کے جو مفسر، ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ہیں، جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ان کی ایک تحریر جو 1951ء کے ترجمان القرآن کے شمارے میں چھپی ہے، پیش کروں گا۔ وہ اس لیے ہے کہ متقدمین کی چیزیں پیش کی جاتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ان میں بعض چیزیں اس دور سے متعلق بھی تھیں یا بعض ان کے خیالات بھی تھے۔ یہ ہمارے دور کے ہیں اور ان کے متعلق ان کا یہ دعویٰ ہے کہ میں ہر حدیث کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ ''جسے میں خود اپنے معیار کے مطابق جانچ پرکھ کر صحیح سمجھتا ہوں، اسے ہی لیتا ہوں'' اور پھر اس دور میں انہیں عام طور پہ روشن خیال بھی سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال میں ان سے یہ حوالہ لے رہا ہوں۔ یہ ان کے خیالات نہیں ہیں، یہ تمام چیزیں کتبِ روایات میں آئی ہوئی ہیں۔ میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ اس کے بغیر یہ پسِ منظر جو میں نے عرض کیا ہے، وہ سامنے نہیں آ سکتا۔

یہ ان کی تقریر تھی، جو اگست 1951ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''حضرتِ محمد ﷺ کو پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہوئے بارہ سال گذر چکے تھے، باون برس کی عمر تھی، حرمِ کعبہ میں سو رہے تھے کہ یکا یک جبرئیل فرشتے نے آپ ﷺ کو جگایا۔ بیدار حالت میں اٹھا کر آپ ﷺ کو زم زم کے پاس لے گئے، سینہ چاک کیا، زم زم کے پانی سے اسے دھویا، پھر اسے حلم اور بردباری اور دانائی اور ایمان ویقین سے بھر دیا۔ میں یہ چیزیں پیش ہی کیے جاؤں گا، اس پہ کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔'' اس کے بعد آپ کی سواری کے لیے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور قد خچر سے کچھ چھوٹا تھا، وہ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام براق تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے۔ جب آپ سوار ہونے لگے تو وہ چمکا، جبرئیل نے تھپکی دے کر کہا کہ دیکھ کیا کرتا ہے، آج تک محمد ﷺ سے بڑی شخصیت کا کوئی انسان تجھ پر سوار نہیں ہوا ہے، پھر آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے اور جبرئیل آپ ﷺ کے ساتھ چلے۔ پہلی منزل مدینہ تھی، جہاں اتر کر آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔ جبرئیل نے کہا: اس جگہ آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ دوسری منزل طورِ سینا کی تھی، جہاں خدا حضرتِ موسیٰؑ سے ہمکلام ہوا تھا۔ تیسری منزل بیت اللحم کی تھی جہاں حضرتِ عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ چوتھی منزل بیت المقدس تھا جہاں براق کا سفر ختم ہوا۔ بیت المقدس پہنچ کر آپ ﷺ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اس کو باندھا کرتے تھے۔ ہیکل سلیمانی میں داخل ہوئے تو ان سب پیغمبروں کو موجود پایا جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ﷺ کے پہنچتے ہی نماز کے لیے صفیں بندھ گئیں، سب منتظر تھے کہ امامت کے لیے کون بڑھتا ہے۔ جبرئیل نے آپ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھا دیا اور آپ ﷺ نے سب کو نماز پڑھائی پھر آپ ﷺ کے سامنے تین پیالے پیش

کیے گئے۔ایک میں پانی' دوسرے میں دودھ' تیسرے میں شراب تھی۔آپ ﷺ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا۔جبرئیل نے مبارک باد دی کہ آپ ﷺ فطرت کی راہ پا گئے۔اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبرئیل اس کے ذریعے سے آپ ﷺ کو آسمان کی طرف لے چلے۔''

عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہوا۔پہلی چیز جو انہوں نے کہی کہ یہ وہاں بیت المقدس میں حضور ﷺ پہنچے تو وہاں ہیکل سلیمانی میں داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی' گویا وہاں یہ ہیکل سلیمانی یا یہ جو وہاں یہودیوں کی عبادت گاہ تھی یہ وہاں موجود تھی اور وہاں حضور ﷺ داخل ہوئے اور وہاں آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔یہ چیز ذرا غور طلب ہے۔میں نے عرض کیا ہے کہ میں کوائف عرض کروں گا' واقعات پیش کروں گا۔انہیں بڑے غور سے سنیے گا' جی چاہے تو نوٹ بھی کرتے چلے جائیے گا۔اب انہوں نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ بیت المقدس میں جا کر ہیکل سلیمانی کی مسجد میں داخل ہوئے اور وہیں آپ نے نماز پڑھی۔آج کل آپ کو معلوم ہے' کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ بیت المقدس جسے ہم مسجد اقصیٰ کہتے ہیں' اس کے متعلق یہودیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ تو شروع سے ہماری مسجد' ہماری عبادت گاہ تھی' مسلمانوں نے اسے مسمار کیا اور اس کی جگہ اپنی مسجد بنا دی۔اسی دعوے کی بنیاد پہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے' مسلمانوں کا اس پہ کوئی حق نہیں ہے۔انہوں نے تو غصب کر کے اس مقام پر اپنی مسجد بنالی تھی۔یہ مسجد سلیمان' ہیکل سلیمانی ہماری عبادت گاہ تھی' جسے مسلمانوں نے مسمار کر کے اس جگہ پر اپنی مسجد بنائی اس لیے انہیں حق نہیں پہنچتا۔چنانچہ اس دعوے کے جواب میں انہی مودودی صاحبؒ نے ترجمان القرآن کی ستمبر 1969ء کی اشاعت میں تحریر فرمایا۔میں اسے پھر دہرا دوں کہ ابھی ابھی آپ نے دیکھا ہے کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ حضور ﷺ بیت المقدس میں تشریف لے گئے اور ہیکل سلیمانی میں داخل ہو کر اس مسجد میں آپ ﷺ نے نماز پڑھی بلکہ انبیائے کرام کی امامت کرتے ہوئے نماز پڑھائی۔

1969ء میں یہودیوں کے معبد کی تاریخی حیثیت

عزیزانِ من! اب آپ کے ذہن میں آ گیا کہ یہودیوں نے جب یہ دعویٰ کیا کہ یہاں تو ہماری مسجد تھی' ہیکل سلیمانی تھا' مسلمانوں نے اسے مسمار کیا۔اس کے جواب میں مودودی صاحبؒ نے ستمبر 1969ء میں یہ لکھا کہ ''یہودیوں کے معبد ہیکل سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ 70ء میں اسے بالکل مسمار کر دیا گیا تھا❶ گویا جو یہودیوں کی آخری تباہی ہے' وہ 70ء میں رومنز کے ہاتھوں ہوئی تھی'❷ اور انہوں نے آ کر ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔اس سے جو معبد یا ہیکل تھا' وہ کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا تھا اور ان کو

---

❶ یہ نبی کریم ﷺ کی بعثت سے بھی پانچ سو سال پہلے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے صرف 70 سال بعد کا واقعہ ہے۔

❷ یہ حملہ ایک رومی جرنیل نے کیا تھا اس طرح 70ء میں یہودیوں کے ہیکل کا کوئی نام ونشان تک باقی نہ تھا' اس طرح کوئی مسجد نہیں تھی' کوئی ہیکل نہیں تھا' کوئی معبد نہیں تھا' کہیں ایک دیوار باقی رہ گئی تھی جسے یہ ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) کہتے ہیں۔

وہاں سے نکال دیا گیا تھا۔اس طرح 70ء میں رومنز نے یہ کیا تھا اور اس کے بعد اس مقام پہ انہوں نے قبضہ کیا اور وہاں پھر جو عیسائی تھے ان کا یہ مرکز بن گیا۔ 70ء کے بعد وہاں سے انہوں نے یہودیوں کا نام ونشان مٹا دیا: یہودیوں کی پہلی سابقہ عمارات کا بھی' معبد کا بھی' ہیکل کا بھی۔ 70ء کے بعد کوئی چیز باقی نہیں تھی۔ نبی اکرم ﷺ تو چھٹی صدی عیسوی میں مبعوث ہوئے ہیں۔ 70ء میں اس معبد کی یا اس مسجد کی یہ کیفیت ہوگئی تھی۔ ابھی ابھی انہوں نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ وہاں گئے اور اس مسجد میں داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی۔ کہتے ہیں کہ یہودیوں کے معبد ہیکلِ سلیمانی کے متعلق یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ اسے 70ء میں بالکل مسمار کر دیا گیا تھا اور حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں جب بیت المقدس فتح ہوا' یہاں یہودیوں کا کوئی معبد نہیں تھا۔ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں بھی کوئی معبد نہیں تھا تو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں تو معبد ہو ہی نہیں سکتا' وہ تو 70ء میں قریباً پانچ چھ سو سال پہلے کی بات ہے' کہ وہ مسمار کر دیا گیا تھا' وہاں صرف کھنڈرات تھے۔ اس کے متعلق میں اس کی تاریخ بعد میں عرض کروں گا لیکن میں انہی کی سند سے یہ پیش کر رہا ہوں کہ ابھی انہوں نے کہا ہے کہ حضور ﷺ وہاں ہیکلِ سلیمانی کی مسجد میں تشریف لے گئے' وہاں نماز پڑھی' ابھی یہ کہتے ہیں کہ یہاں حضور ﷺ کا زمانہ تو ایک طرف حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی وہاں کوئی معبد نہیں تھا' وہ اس سے بہت پہلے مسمار ہو چکا تھا' کھنڈر پڑے ہوئے تھے' اس لیے یہاں مسجد اقصیٰ یا ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بارے میں کوئی یہودی یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ ان کے کسی معبد کو توڑ کر مسلمانوں نے یہ مسجد بنائی تھی' یہ بالکل ٹھیک نہیں' وہاں یہ تھا ہی نہیں۔

مسجد اقصیٰ کے متعلق جناب مودودیؒ سے کیا گیا ایک سوال اور اس کا جواب

اس کے بعد پھر یہ دشواری پیش آئی کہ وہ جو واقعہ معراج میں ہے کہ اس ہیکل میں یا اس عبادت گاہ میں' حضور ﷺ تشریف لے گئے' وہاں نماز پڑھی' نماز پڑھائی' تو اس کے متعلق پھر کیا کہا جائے گا۔ ستمبر 1969ء کے ترجمان القرآن میں یہ لکھا گیا۔ ہوا یوں کہ یہودیوں کے اس دعوے کے جواب میں' اسی ستمبر 1969ء میں' ان کے درس میں' ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ جو مسجد اقصیٰ کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ تشریف لے گئے اور وہ وہاں ہے' اس کی کیا کیفیت ہے۔ وہی مہینہ ہے' وہی سال ہے۔ پوچھا یہ گیا تھا کہ وہ قبلہ اول کس طرح سے ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ سوال یہ کیا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا' یہ مودودی مرحوم کی بات ہے کہ ''یہ قبلہ اول اس لیے ہے کہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی' پہلے اسی طرح رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔'' یہ ایک دوسری بات آ گئی ہے۔ میں اس کے متعلق بھی پہلے کئی دفعہ عرض کر چکا ہوں کہ جب تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی یعنی پہلے حضور ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے' پھر جب قبلے کے بدلنے کا حکم آ گیا' تو کعبے کی طرف آپ ﷺ نے رخ کیا۔

حضور ﷺ تو پہلے دن سے ہی کعبہ کی طرف رُخ کرتے تھے: دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا

میں نے اپنے ہاں تشریح کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ روایات وضعی ہیں' حضور ﷺ پہلے دن سے کعبہ ہی کی طرف رخ کرتے تھے کہ وہی بیت اللہ تھا' اسی ملت ابراہیمیؑ کے آپ ﷺ پیروکار تھے اور وہ تو حضرتِ ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ' اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (3:96) تھا' پہلے ہی وہی تھا۔ بہرحال وہ دوسری بات ہے۔ جب تحویل قبلہ کا حکم آ گیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی لیکن قبلہ اول ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے یہ عبادت گاہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدس اور محترم قرار پائی۔ پھر کہا کہ یہاں جب تک مکہ معظّمہ میں حضورؐ کا قیام رہا آپ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے کہ مسجد اقصیٰ اور خانہ کعبہ ایک رخ میں آجاتے تھے۔ اب یہاں اس کو مسجد اقصیٰ کہا جس کے متعلق ابھی ابھی لکھ چکے ہیں کہ وہاں یہودیوں کے معبد کا بھی کوئی نام ونشان نہیں تھا چہ جائیکہ وہاں کوئی مسجد اقصیٰ ہوتی۔ ابھی یہ کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ جب تک مکہ میں تھے تو آپ ﷺ اس طرح سے نماز پڑھتے تھے کہ مسجد اقصیٰ یعنی وہی بیت المقدس والی اور خانہ کعبہ ایک رخ میں آجاتے تھے لیکن مدینے میں یہ انتظام ممکن نہ تھا کیونکہ اب ان عبادت گاہوں کے رخ مختلف سمتوں میں پڑ جاتے تھے تو گویاں وہاں مسجد اقصیٰ بتائی اور عبادت گاہ بتائی' تحویل قبلہ سے پہلے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ ایک طویل عرصے تک مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ کہاں تھی وہ مسجد اقصیٰ؟ خود پہلے کہہ چکے ہیں کہ مسجد اقصیٰ مسلمانوں کی مسجد تو ایک طرف' یہودیوں کا ہیکل' ان کا معبد بھی' وہاں نہیں تھا' اس کا نام ونشان تک نہیں تھا' وہاں تو کھنڈرات تھے اب اس کو صرف عبادت گاہ ہی نہیں کہا' مسجد اقصیٰ کہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں غیر جانبدارانہ طور پر صرف واقعات پیش کروں گا ان دو ہی اقتباسات کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ کس نتیجے پہ آپ پہنچتے ہیں۔ اب وہ جو یہودیوں کا دعویٰ ہے' اعتراض ہے کہ یہاں پہلے ہمارا معبد تھا' ہیکلِ سلیمانی تھا' اس کی جگہ مسلمانوں نے یہ مسجد بنالی' تو تسلیم کرلیا کہ وہاں وہ ہیکل تھا اور اسی پر وہ دعوے کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ ان کا دعویٰ کیا ہے' بنیاد کیا ہے۔ وہ تو میں تاریخ سے کچھ اور ثابت کروں گا۔ یہ بات تو خود پہلے یہ بتا رہے ہیں' کہ وہاں حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں بھی کوئی معبد نہیں تھا' کوئی ہیکل نہیں تھا' کوئی مسجد نہیں تھی' کوئی عبادت گاہ نہیں تھی' کھنڈرات تھے اور ابھی ابھی یہ فرما رہے ہیں کہ حضور ﷺ جب مکے میں تھے تو وہ مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے' وہی ہمارا قبلہ اول ہے تو گویا وہ جو قرآنِ کریم سے میں نے جو بھی سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت پیش کی کہ ''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گئی' تو جو مسجد اقصیٰ ہے وہ اب بتایا کہ یہ وہ تھی جو بیت المقدس ہے۔ یہاں ابھی ابھی اسی سانس میں'

اسی مہینے میں، اسی سال میں، یہ اپنے پرچے میں کہہ رہے ہیں، کہ وہاں کوئی عبادت گاہ نہیں تھی، وہاں کوئی ہیکل نہیں تھا، وہاں کوئی یہودیوں کی مسجد نہیں تھی۔ ابھی یہ کہہ رہے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے حضور ﷺ نماز پڑھا کرتے تھے۔ عزیزانِ من! میں نے عرض کیا ہے کہ میں عقیدے سے بحث نہیں کروں گا۔ پہلے اس کو دیکھیے کہ آدمی کس نتیجے پہ پہنچے گا؟ آدمی آپ کے ہاں کا ایک ہی شخص ہے، پہلے انہوں نے وہ بتایا جو حضور ﷺ کی مکے سے تشریف براری تھی، وہاں کہا کہ حضور ﷺ بیت المقدس میں پہنچے، ہیکلِ سلیمانی میں داخل ہوئے، مسجد سلیمانی میں حضور ﷺ نے نماز پڑھی، انبیائے کرام کی امامت کرائی۔ وہاں یہ چیز ہوگئی کہ وہاں ایک مسجد تھی، ہیکلِ سلیمانی تھا، یہودیوں کی عبادت گاہ تھی۔ اس سے یہ چیز بتائی۔ یہ حضور ﷺ کی نبوت کے بارھویں سال کا واقعہ بتادیا۔ اس کے بعد یہ چیز خود ہی بتادی کہ وہاں کوئی ہیکل نہیں تھا، وہاں کوئی عبادت گاہ نہیں تھی، وہاں کوئی معبد نہیں تھا، وہ تو کھنڈرات پڑے ہوئے تھے، وہاں ہیکل کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔ دوسرا بیان یہ آگیا۔ تیسرا یہ بیان آگیا کہ مسجد اقصیٰ وہاں موجود تھی۔ اور حضور ﷺ اور صحابہؓ مکے کی پوری زندگی میں اور پھر مدینے کی ابتدائی زندگی میں بھی اس مسجد اقصیٰ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔

عیسائیوں کے نزدیک یروشلم کی اور پادری کی اہمیت اور حضرت عمرؓ کی ادائیگی نماز کے لیے جگہ کا انتخاب

تاریخ کی تحقیقات بتارہی ہیں کہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں یہ علاقہ فتح ہوا تھا، بیت المقدس میں عیسائیوں کا مرکزی کلیسا تھا۔ یروشلم تو آپ جانتے ہیں، ان کے نزدیک کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کا مذہبی مرکز ہی یروشلم رہا ہے۔ بیت المقدس کے اندر ان کا سب سے بڑا ٹیمپل یعنی کلیسا تھا۔ آپ کی تمام تاریخیں ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کی تاریخیں بھی اس سے اتفاق کرتی ہیں کہ جب یہ علاقہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں اس وقت کے جسے لاٹ پادری کہتے ہیں، نے کہا کہ یہ جو فتح نامہ پر ہم میں اور مسلمانوں میں، معاہدہ قرار پایا، اس کے لیے آپ کا سربراہِ مملکت خود تشریف لائے تو میں اس کے ساتھ یہ معاہدہ کروں گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ تشریف لے گئے۔ یہ جو آپؓ کا مدینہ سے یروشلم کا سفر ہے اس کی بڑی تفاصیل ہماری تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں کہ کس طرح سے آپؓ (عمرؓ) منزل بہ منزل گئے تھے۔ کیا انداز تھا، میں اس تفصیل میں نہیں جاتا۔ وہاں جب حضرت عمرؓ پہنچے تو ان کے اس کلیسا یا اس کے گرجے میں اس کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔ غیر مسلم تک یہ واقعات لکھ رہے ہیں کہ نماز کا وقت آگیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ نماز کہاں پڑھی جائے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا اس وقت جو پادری تھا، اس نے کہا کہ میں یہاں جائے نماز بچھائے دیتا ہوں، آپ رضی اللہ عنہ نماز پڑھ لیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں، اگر آج میں نے اس ضرورت کے تابع یہاں نماز پڑھ لی، تو ہوسکتا ہے ہماری آنے والی یہ امت، اس چیز کو بطور سند پیش کر کے، کہ یہاں نماز پڑھی گئی تھی، یہاں تمہارے گرجے کی جگہ مسجد بنالیں۔ میں یہ طرح نہیں ڈالنا چاہتا! کیا بات ہے! وہ جو کہتے ہیں کہ مندروں کو گرا کے اور گرجوں کو مسمار کر کے، نماز پڑھی، وہاں یہ بتایا تھا کہ نماز نہیں پڑھی کہ "بعد میں آنے والے اس کو ایک سند قرار دے دیں گے اور یہاں مسجد

بنالیں گے، ہمیں نماز یہاں نہیں پڑھنی چاہیے۔'' آپ رضی اللہ عنہ باہر نکلے تو یہ جس جگہ ہیکلِ سلیمانی تھا، وہ کھنڈرات تھے، صاف کیا اور وہاں نماز پڑھی۔

عیسائیوں اور یہودیوں کی باہمی عداوت اور نفرت کی بنا پر یہودیوں کی عبادت گاہوں کا حشر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بلند نگہی

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ عیسائی یہودیوں کے خلاف سخت عداوت اور نفرت کے جذبات رکھتے تھے۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ نہیں بلکہ ان کی تاریخ یہ بتاتی تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب پر، یہودیوں ہی نے چڑھایا تھا، انہی کے کہنے سے رومن گورنر نے یہ فتویٰ دیا تھا، ان ہی کے ہاتھوں ایسا ہوا تھا اور یہودی تو (معاذ اللہ معاذ اللہ) حضرت مریم علیہا السلام پر بھی تہمتیں لگاتے ہیں تو یہودیوں کے خلاف سب سے شدید نفرت اور عداوت عیسائیوں کو تھی۔ اب سوچیے کہ ان عیسائیوں کے ہاتھ جب بیت المقدس آ گیا، وہاں یروشلم کو انہوں نے اپنا مرکز بنا لیا تو ان کے ہاں جو نشانات یا عبادت گاہیں تھیں یا اس زمانے میں اس کے ساتھ ہیکل تھے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ خود رومنز کی 70ء کی تاریخ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے کہ کس طرح ان تمام نشانات کو مٹایا گیا، انہیں کھنڈر بنا دیا گیا تو وہاں آپ رضی اللہ عنہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے دیکھا کہ اس مقام پر کھنڈر ہی نہیں بلکہ یہ عیسائی اپنے ہاں کا سارا کوڑا کرکٹ وہاں جا کر پھینکا کرتے تھے، آپ رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر کہا کہ تمہیں یہودیوں سے نفرت ہی سہی، عداوت ہی سہی لیکن ان کے کسی ایسے مقام کی بے حرمتی کرنا، جو ان کے نزدیک واجب التکریم ہو، انسانیت کے خلاف ہے۔ یہ غیر مسلم تک لکھ رہے ہیں۔ اب فاتح کی حیثیت سے آپ رضی اللہ عنہ وہاں کھڑے تھے۔ وہ اس وقت کا لاٹ پادری آپ رضی اللہ عنہ کو منع نہیں کر سکتا تھا۔ آپ رضی اللہ عنہ (عمر رضی اللہ عنہ) خود اٹھے، ساتھیوں سے نہیں کہا، فوجیوں سے نہیں کہا، سپاہیوں سے نہیں کہا، خود آگے بڑھے اور اس کوڑے کو ٹوکری میں بھر بھر کر دوسری جگہ پھینکنا شروع کیا، پھر ساتھی رفقاء نے بھی یہ کچھ کیا۔ عیسائیوں کا یہ کوڑا کرکٹ اور غلاظت پھیلائی ہوئی تھی، جسے اس مقام پر مسلمانوں کے سربراہِ مملکت امیر المومنین نے اپنے ہاتھوں سے خود صاف کیا۔ کہا کہ جو مقام تم نے مسمار کیے گو وہ یہاں نہیں ہیں لیکن بہر حال دوسروں کے جذبات کا احترام تو ضروری ہے تو وہاں وہ جگہ صاف کی۔ وہاں ایک چٹان تھی جسے قبہ کہتے ہیں اور یہودی اپنے ہاں اسے چٹان کہتے ہیں تو اس کے بعد وہاں سے غلاظت صاف کی اور وہاں یہ جو کچھ تھوڑی سی اونچی تھی، وہاں آپ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی۔

بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور عیسائیوں کے مابین ہونے والے ایک عہد نامہ کی نوعیت

اب وہ جو مقام تھا، وہاں یہودیوں کا تو سوال ہی نہیں تھا، یہودی کوئی تھا ہی نہیں، وہاں عیسائیوں کے قبضے میں تھے، مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا۔ اب تو یہ مسلمانوں کا مفتوح علاقہ تھا۔ وہ عیسائیوں کے ساتھ جو عہد نامہ ہوا ہے، اس میں یہی تھا کہ ان کو اجازت دی گئی تھی کہ

تمہارا کلیسا یہاں رہے گا، تمہیں اپنے مذہب کی اجازت ہوگی، تمہیں اپنی پرستش کی اجازت ہوگی، ہم تمہارے کلیسا کی حفاظت کریں گے لیکن اس کے بعد یہ جتنا مقام تھا، وہ تو ان کا مفتوحہ علاقہ تھا، جو جی میں آئے وہاں کرتے۔ تو اس مقام پہ وہ کوئی چٹان تھی، جہاں آپؓ نے اسے صاف کر کے نماز پڑھی تھی۔ اس کے قریب ہی نشان کے طور پر ان لوگوں نے یہ جو چٹان ہے یونہی ایک سادہ سی مسجد بنا دی۔ یہ بات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور کی کہہ رہا ہوں، وہاں کوئی مسجدِ اقصیٰ نہیں تھی، وہاں کوئی معبد نہیں تھا، وہاں ہیکل کا نشان تک نہیں تھا۔ یہ جس چٹان پہ، یا پتھر پہ آپ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی تھی، اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد نشانی کے طور پر، الگ جگہ پہ، بنا دی تھی۔ خاندان امیہ کے زمانے (41-132H/661-750AD) میں عبدالملک بن مروان نے چٹان کے اوپر گنبد تعمیر کیا اور پھر یہ مسجد بنائی اور اس مسجد کو پہلی بار اس اعتبار سے مسجدِ اقصیٰ کہا کہ یہ ان تمام مقامات سے بہت دور ایک جگہ مسجد بنی ہوئی ہے۔ اقصیٰ کے معنی ہی ''بہت دور جگہ'' کے ہیں۔ اس طرح یہ مسجد وجود میں آئی ہے۔

صلیبی جنگوں کی تباہ کاریاں اور مسلمانوں کا یہودیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

72 ھ کے قریب وہاں وہ تعمیر کی ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ اس تختی پہ یہ لکھا ہوا ہے کہ اسے عبدالملک بن مروان نے تعمیر کیا۔ وہ قبہ اور اس کے ساتھ ہی ایک مسجد ہے اور 72 ھ لکھا ہوا ہے اور اس کے اوپر اس کا نام مسجدِ اقصیٰ ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ تو اس لیے باطل ہے کہ خود ان کی تاریخ میں یہ ہے کہ 70ء کی ان کی تباہی رومن کے ہاتھوں ہوئی تھی، انہوں نے وہاں اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ عیسائیوں کے زمانے میں تو یہودیوں کو وہاں جانے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ اجازت کیا، یہ خود ڈر کے مارے وہاں نہیں جا سکتے تھے کہ وہاں جائیں گے تو قتل کر دیئے جائیں گے۔ عیسائیوں کو تو یہودیوں سے اتنی نفرت تھی۔ مسلمانوں نے ان کو اس بات کی اجازت دی تھی کہ تمہارے ان مقامات کے کھنڈر رہی سہی، وہاں تمہارے نزدیک اگر وہ واجب الاحترام ہیں تو ٹھیک ہے، تم سال میں ایک مرتبہ، جو بھی تمہارا مقدس دن آتا ہے، اس دن وہاں جا کر ان مقامات کی زیارت کر آیا کرو۔

یہودیوں کا دیوارِ گریہ کے سامنے افسردگی کا اظہار

آپ کو معلوم ہے کہ وہاں ایک چھوٹی سی دیوار ہے، جسے دیوارِ گریہ (Wailing Wall) کہا جاتا تھا وہ باقی تھی تو یہ ہر سال وہاں جا کر روتے تھے، چیختے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارے اتنے بڑے بڑے یہ نشانات، معبد، اور عبادت گاہیں تباہ ہو گئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے اندر سیاست ایسی تھی کہ انہوں نے اس چنگاری کو زندہ رکھا تھا کہ ایک دن ہم یہاں آ کر آباد ہوں گے۔ یہ ان کا فقرہ چلا آ رہا تھا۔ یہ ایک دوسری کہانی آ جائے گی جو میں تاریخی اعتبار سے عرض کروں گا کہ یہ جو فتنہ آج اس طرح سے ایک لاوا اور آتش فشاں پہاڑ کی شکل

اختیار کر گیا ہے' اس کی چنگاریاں اس زمانے میں تھیں اور مسلمانوں نے ان کی اجازت دی تھی کہ وہاں جائیں' وہاں جا کر یہ اپنے ہاں دیوارِ گریہ (Wailing Wall) کے سامنے روتے تھے اور ان کے ہاں یہ عام دعا ہے کہ یہ ہم سے چھن گئی ہوئی ہیں' ہم یہاں آ کر آباد ہوں گے۔ صدیوں سے یہ چیز وہاں دیوارِ گریہ کے سامنے کرتے تھے اور وہاں کوئی نشان نہیں تھا' مسجدِ اقصیٰ' جس کا نام قبہ موجود ہے۔ یہ مسلمانوں کے قبضے میں رہے' کچھ تھوڑا سا صلیبی جنگوں کا زمانہ درمیان میں آیا جس میں یہ صرف تھوڑے سے وقت کے لیے یہ ملک عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا تھا۔ اس زمانے کے عیسائیوں کے قبضے میں' جب صلیبی جنگیں ہوئیں تھیں' ان کے واقعات وغیرہ تو آپ نے پڑھے ہوں گے۔

صدیوں بعد ایک چھوٹے ٹکڑے پر اسرائیلی حکومت کا قیام اور پوری ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار

وہ پھر تاریخ کا ایک واقعہ صرف تھوڑے وقت کے لیے تھا' اس کے بعد پھر جب صلیبی جنگوں میں ان کو شکست ہوئی ہے اور یہ بیت المقدس فلسطین کا پورا علاقہ پھر مسلمانوں کے قبضے میں آیا اور اس کے بعد پھر یہ عیسائیوں کے یا یہودیوں کے قبضے میں نہیں گیا اگرچہ اس کے بعد پھر اسرائیل نے اس ٹکڑے میں خود عربوں کے ملک کے ایک حصے کے اندر' اپنی غالب طاقتوں کی مدد سے' وہاں اپنے آپ کو متمکن کیا۔ اپنی ملکیت بنا ڈالی اور آج ان کی یہ کیفیت ہے۔ یہ ابھی پہلی جنگِ عظیم کے بعد کل کا واقعہ ہے' جب یہ حصے بخرے ہونے لگے ہیں' تو اس زمانے کی یہ بات ہے۔ اس سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے لے کر آخر تک' درمیانی عرصے کو چھوڑ کر' جس میں یہ صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا تھا' پھر یہ مسلمانوں کے قبضے میں آیا ہے اور یہ علاقہ تو آج تک بھی مسلمانوں کے قبضے میں ہے بجز اس بحرِ ذخار میں ایک چھوٹے سے بلبلے کے جو بلبلہ ایٹم کا بلبلہ بن رہا ہے' آج یہ ان کے قبضے میں بھی نہیں آیا تھا' وہ مسجد وہاں موجود ہے' وہ قبہ وہاں آج تک موجود ہے۔ وہی تو مسجد ہے جس پہ وہ آتا ہے کہ انہوں نے آگ لگا دی۔ اس کو مسمار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

مسجدِ اقصیٰ کی تاریخی حیثیت اور جناب مودودیؒ کی قابلِ غور متضاد بیانی

یہ ہے وہ مسجد جس کا وجود 72ھ میں ظہور میں آیا اور وہ ہے مسجدِ اقصیٰ۔ اب جو چیز پہلے کہی ہے' وہ جو معراج کی روایات ہیں اس میں ابھی میں نے آپ کے سامنے مودودی مرحوم کا اقتباس پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ وہاں ہیکلِ سلیمانی کی مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھی' اس کے بعد خود ہی یہ کہا گیا ہے کہ وہاں کوئی ہیکل نہیں تھا' وہاں کوئی عبادت گاہ نہیں تھی' کچھ کھنڈرات تھے۔ وہاں کسی مسجد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' یہ واقعہ ہے کہ یہ جو حصہ ہے' یہ عیسائیوں کی تاریخ بتاتی ہے کیونکہ رومن عیسائیوں کے ہاتھوں سے یہ ان کے ہاں کے جو معبد تھے' کھنڈر بنے تھے' وہ یہودیوں کے ہاں موجود ہے اور وہ انہیں پھر بڑی تفصیل سے روتے چیختے چلاتے بیان کرتے ہیں۔

وہاں سے یہی نہیں کہ ان کے معبد کھنڈرات میں تبدیل ہوئے تھے' یہ وہاں سے جو نکالے گئے ہیں' تو پھر انہیں The Wandering Jews کہا گیا ہے یعنی یہودی سرکردہ خانماخراب' جن کا کوئی گھر ہی نہیں تھا' اس کے بعد یہ آج تک اس اسرائیلی مملکت سے پہلے تک ان کا دنیا میں کوئی گھر نہیں تھا۔ وہاں تو یہ کچھ تھا ہی نہیں۔ مسجدِ اقصیٰ تو امویوں کے زمانے میں 72 ھ میں وجود میں آئی اور وہ مسجدِ اقصیٰ موجود ہے۔

قرآنی آیات کی رو سے مسجدِ اقصیٰ سے متعلق ہمارے ہاں کے غلط تصورات اور ان کا حقیقی مفہوم

اب ہمارے ہاں یہ اس آیۂ جلیلہ (17:1) کو لیتے ہیں کہ ''پاک ہے وہ ذات' جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئی''، تو وہاں وہ مسجدِ اقصیٰ اب موجود ہے۔ مسجدِ اقصیٰ تو اس نسبت سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت میں جو مسجدِ اقصیٰ آئی ہے' یہ وہ مسجد ہے جو وہاں مسجدِ اقصیٰ ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو وہاں مسلمانوں کی مسجد تو ایک طرف رہی یہودیوں کی کوئی سجدہ گاہ بھی وہاں موجود نہیں تھی' ان کا ہیکل موجود نہیں تھا' ان کی عبادت گاہ موجود نہیں تھی' ان کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ تاریخ کے ان قواعد کی رو سے' عزیزانِ من! اس آیہ جلیلہ (17:11) میں مسجدِ اقصیٰ سے وہ مسجدِ اقصیٰ جو بیت المقدس میں ہے وہ مراد لینا صحیح نہیں ہوسکتا۔

72 ھ میں مسجدِ اقصیٰ کی تعمیر کی اصل تختی آج تک وہاں کندہ ہے

غیر مسلم مؤرخین اور مستشرقین تو ان کے ہاں بہت تحقیقات کرتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے' جس میں کچھ زیادہ کاوش کی ضرورت بھی نہیں ہے' ان یہودیوں کی اور عیسائیوں کی خود آپ کی جو تاریخیں ہیں' ان میں یہ چیزیں موجود ہیں کہ تاریخ 70ء میں یہ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ حضور ﷺ کے زمانے بلکہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے تک کھنڈرات تھے۔ اس مسجد میں جو قبہ بنا ہوا ہے' ان کے اوپر وہ تعمیر کی تختی لگی ہوئی ہے' اس کے اوپر 72 ھ لکھا ہوا ہے' کندہ ہے۔ عجیب بات ہے اگرچہ بعد میں وہاں اس کے کچھ حصے بوسیدہ ہو گئے تھے یا کسی حادثے سے کچھ حصہ مسمار ہو گیا تھا تو ہارون رشید کے زمانے (170-193AH/786-809AD) میں اس نے اس کی مرمت کرائی تھی لیکن یہ اتفاق کہیے یا اس میں کاریگروں کا سہو ہوا کہ انہوں نے اچھی خاصی مرمت کی لیکن وہ پہلی اور یجنل 72 ھ والی تعمیر کی تختی تھی' وہ ویسی کی ویسی رہی۔ وہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے۔ وہاں میں خود تو نہیں گیا کہ میں اسے چشم دید کہوں لیکن یہ تو وہ چیز ہے جس پہ ہزاروں لوگ ہر سال وہاں سے ہو کر آتے ہیں۔ صاحب! اس کی تفصیل بڑی تفاصیل سے لکھی ہوئی ہے۔ ان علاقوں کے متعلق تو بہت کچھ سیاحتوں میں لکھا گیا ہے کہ یہ موجود ہے' لہٰذا اس سے وہ مسجد تو مراد نہیں ہوسکتی۔

قرآنِ حکیم کی روشنی میں مسجدِ اقصیٰ کا واضح تعین اور خدا کی نشانیوں کا ذکر

حضور ﷺ کے زمانے میں تو وہاں وہ مسجد ہی نہیں تھی' وہاں ہیکل بھی نہیں تھا' وہاں یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ بھی نہیں تھی' تو سوال

پیدا ہوتا ہے کہ اس آیہ جلیلہ (17:1) میں پھر یہ جو چیز ہے کہ ''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے' مکے سے' مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئی'' سے وہ مسجدِ اقصیٰ سے کیا مراد ہے۔ بنی اسرائیل کی سورۃ تو بہت پہلے درس میں آچکی ❶ ہے۔ وہاں آگے یہ ہے کہ وہاں جا کر ہم پھر اپنی وہ بلند تریں' عظیم تریں' نشانیاں دکھائیں جن کے لیے مکے کے اندر یہ پہلے تیاریاں ہو رہی تھیں اور آگے ہے اس قسم کی نشانیاں ہیں جیسے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو مصر سے ہجرت کرنے کے بعد' سینا کی وادیوں میں اور فلسطین کے علاقوں میں دکھائی گئیں۔ اس قسم کی بے دست و پا' ذلیل و خوار' مظلوم و مقہور' قوم بنی اسرائیل کو مملکت کا مالک بنایا گیا' تمکن عطا کیا گیا اور پھر ہزاروں سال تک شوکتِ سلیمانی اور سطوتِ داؤدی کی سی چیز عطا ہوئی جو دنیا کی تاریخ کے اندر بے نظیر ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا مسجدِ اقصیٰ کی طرف سفر کا ذکر جس سے مراد مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت ہے

شوکتِ سلیمان اور سطوتِ داؤدی کی سی ان چیزوں کو خدا نے اپنی نشانیاں قرار دیا ہے' جیسا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو یہ دکھایا اسی طرح ایسا کچھ دکھانے کے لیے ہم اپنے بندے کو مکے سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئے۔ کہاں لے گئے؟ میں درمیان میں اپنی ''میں'' کی بات نہیں کرتا' واقعہ عرض کرتا ہوں کہ مدتوں تک میں اس پر تحقیق کرتا رہا ہوں' کاوش کرتا رہا ہوں۔ میں نے یہ بات لکھی ہے کہ یہ آیت تو نبی اکرم ﷺ کی ہجرت سے متعلق ہے جو حضور ﷺ نے مکے سے مدینے کی طرف راتوں رات ہجرت کی تھی۔

علامہ عنایت اللہ عصری اہلِ حدیث کی تائیدی تحقیق اور پہلی ہجرت

سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ مسجدِ اقصیٰ یہاں کیسے آگیا۔ میں نے بھی لکھا اور اس کے بعد مجھے خوشی ہوئی کہ ایک بہت بڑے علامہ عنایت اللہ عصری وزیر آبادی ہیں' انہوں نے بھی یہی لکھا اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ بہت بڑے اہلحدیث تھے' گجرات میں رہتے تھے' دو تین سال ہوئے ان کا انتقال ہوا ہے۔ میں نے یہ چیز بہت پہلے لکھی تھی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یاد رکھیے! وہ بہت بڑے اہلحدیثوں کے امام تھے۔ انہوں نے احادیث کی رو سے یہ ثابت کیا کہ جو میں نے لکھا ہے' وہ صحیح ہے اور یہ آیت ہجرت سے متعلق ہے اور وہ ان چیزوں کو لائے پھر یہ کہا کہ جو اقصیٰ ہے وہ معنی کے لحاظ سے ''بہت دور'' (Far East) ہے' جسے آپ دور کی بات کہتے ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ مکے سے مدینے کا' اس دور میں اب بھی وہ فاصلہ کچھ کم نہیں' قریباً تین سو میل کا فاصلہ ہے۔ تو وہ تو اقصیٰ تھا: بہت دور۔ وہ اتنا دور تھا کہ جس اونٹ یا اونٹنی پہ نبی اکرم ﷺ نے ہجرت میں سفر فرمایا تھا' اس کا نام ہی اقصیٰ ہے: اقصیٰ کی طرف لے جانے والی اونٹنی۔ نبی اکرم ﷺ کی ہجرت سے

---

❶ اس کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: مطالب الفرقان فی دروس القرآن: بنی اسرائیل (زیرِ نگرانی: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق) ادارہ طلوعِ اسلام لاہور' 2004ء۔ (اس کے کل 16 دروس تھے جو 8 جون 1975 تا 21 ستمبر 1975 تک دیئے گئے تھے)۔

پہلے مدینے میں مساجد موجود تھیں، وہاں نماز پڑھی جاتی تھی، وہاں جمعہ پڑھایا اور پڑھا جاتا تھا۔ جس مقام پہ حضور ﷺ پہلے مسجدِ قبہ میں جا کر فروکش ہوئے ہیں، عارضی طور پر وہاں بھی نماز ہوتی تھی، وہاں مسلمانوں کا اجتماع ہوتا تھا جہاں مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی ہے یہاں بھی نماز ہوتی تھی، انہیں مساجد کہا جاتا تھا تو اب یہ مساجد تو موجود ہیں اور یہ مقامِ اقصیٰ بھی موجود ہے۔ یہ ہے ''دور'' اور یہ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡٓ (17:1) میں جو سُبۡحٰنَ کا لفظ قرآن کریم میں آتا ہے وہ تو کوئی بڑی عظیم چیز ہوتی ہے جس کو بیان کرنے سے پہلے یہ آتا ہے کہ ''وہ ہے جس کو یہ قدرت بھی حاصل ہے''۔ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں تو یہ مکے جیسی زندگی بسر کرنے والے تھے۔ مکے کے اندر پتھر پڑ رہے ہیں، گالیاں پڑ رہی ہیں، وہ جان کے لاگو ہو رہے ہیں، بلند آواز سے کلمہ زبان پہ نہیں آنے دیتے تھے، ان حالات میں آپ ﷺ کے ساتھی پہلی ہجرت میں حبش کی طرف چلے گئے ہیں، حضور ﷺ طائف کی طرف تشریف لے گئے ہیں تو وہاں انہوں نے حضور ﷺ کو پتھر مارے۔

مکہ کے ناگفتہ بہ حالات کے برعکس مدینہ منورہ میں نبی اکرم ﷺ کو بہت بڑے تمکن کی نوید

عزیزانِ من! وہاں ان حالات میں پہلے دن سے حضور ﷺ کا یہ دعویٰ تھا کہ خدا کا وعدہ ہے کہ انہیں ﷺ بہت بڑا تمکن حاصل ہوگا، اس دین کو مملکت حاصل ہوگی: اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ (24:55) ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں اے رسول ﷺ! تمہارے ساتھیوں کو، محمد رسول اللہ ﷺ کو اور والذین معہؓ کو استخلاف فی الارض حاصل ہوگا۔ یہ وعدے اور یہ دعاوی ہو رہے تھے۔ مکے کی زندگی اس قسم کی تھی، تو یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، یہ ہیں وہ آیاتِ کبریٰ۔ تو اب ان آیاتِ کبریٰ کو دکھانے کے لیے ضروری ہو گیا۔ یہ آیاتِ کبریٰ دکھانا ایسے ہی تھا جیسے موسیٰ علیہ السلام نے ساتھیوں کے ساتھ مصر سے سینا کی طرف ہجرت کی تھی۔

لفظ مسجد سے مراد وہ مرکز ہوتا ہے ''جہاں خدا کی حاکمیت عملی طور پر متشکل ہو''

قرآن کریم میں آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ اسی طرح سے اس مقام سے ایک ایسے مقام کی طرف ہجرت کی جائے گی اور وہاں بھی اس کو مسجد کہنا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ تو ٹھیک بات ہے کہ وہاں مساجد موجود بھی تھیں، نہ بھی ہوتیں، میں کہہ رہا ہوں تو جہاں جا کر مسجد کے معنی اس قسم کی عمارت ہی نہیں ہے، وہ سنٹر ہے، وہ مرکز ہے، جہاں سے خدا کی حاکمیت کی آواز بلند ہونی ہے، جہاں خدا کے اس نظام اور اس قانون نے نافذ ہونا ہے، جس مقام پہ بھی ہو، خواہ وہاں عمارت نہ بھی ہو، وہ مسجد ہے، جہاں ہم اس کے قانون کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا، حضور ﷺ کی اس قسم کی احادیث تو موتیوں کی طرح چمکتی ہیں کہ میری امت کے لیے پورہ کرہ ارض مسجد ہے، جہاں بھی کوئی عبدِ مومن ہے اور وہ خدا کے قانون کے سامنے سر جھکاتا ہے، وہ مسجد ہے، عمارت وہاں ہو یا نہ ہو۔ کہا کہ پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات مسجدِ حرام سے، دور کی جگہ جہاں مسجد ہے بھی نہیں، اور جسے اب مسجد بننا ہے، وہاں لے گئی تاکہ وہ نشانیاں جو ابھی تک زیرِ نقاب تھیں، جو ابھی تک چھپی ہوئی تھیں، وہ حقیقتِ منتظر جو تھی، وہ لباسِ مجاز میں نظر آ جائے۔ چنانچہ اپنے عبد کو راتوں رات وہاں لے گیا۔

مدینے کا احتراماً ایک نام مسجدِ اقصیٰ بھی تھا

اگلی بات سنیے' عزیزانِ من! ہماری تاریخوں کے اندر خود مدینے کا ایک نام مسجدِ اقصیٰ ہے۔اس کے بعد اور کچھ کہنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے جب یہ لکھا تھا کہ اس سے مراد ہجرت ہے اور مدینہ ہے' مجھے اس چیز کا اعتراف ہے کہ یہ بات اس وقت میرے علم میں نہیں تھی کہ خود مدینے کے مختلف نام ہیں' مدینے کے احتراماً نام رکھے ہوئے ہیں' تبرکاً نام رکھے ہوئے ہیں' تعظیماً نام رکھے ہوئے ہیں' ان میں مدینے کا ایک نام خود مسجدِ اقصیٰ ہے جو ہماری تاریخوں میں بھی موجود ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ چیز اس وقت تک میرے علم میں نہیں آئی تھی' یہ بعد کی بات ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں قرآن کریم کی کاوش اور تاریخ سے جس نتیجے پہ پہنچا تھا' اس کی تائید تاریخ کر رہی ہے' اس کی تائید پھر یہ احادیث اور روایات کر رہی ہیں کہ مدینے کے اندر یہ مساجد موجود تھیں' وہاں نماز ہوتی تھی' وہاں خطبے ہوتے تھے اور یہ چیز ہے کہ خود اسی جہت سے مدینے کا نام مسجدِ اقصیٰ ہے۔

وہاں تو یہودیوں کی کوئی عبادت گاہ موجود ہی نہ تھی بلکہ وہاں تو کھنڈرات ہی کھنڈرات تھے

بہر حال تو وہ آیت ہے کہ جس سے ہمارے ہاں وہ دلیل لائی جاتی ہے کہ جس کی تفصیل مودودی مرحوم کی زبان میں بیان ہوتی ہے کہ اس طرح سے آپ ﷺ وہاں براق پہ تشریف لے گئے اور اس طرح سے نماز ہوئی جبکہ وہاں مسجدِ اقصیٰ تھی ہی نہیں۔ عزیزانِ من! اس آیۂ جلیلہ میں جو مسجدِ اقصیٰ ہے' یہ وہاں کی کسی عبادت گاہ کو کہا ہی نہیں گیا' کیوں کہ وہاں تو ان کی کسی قسم کی عبادت گاہ تھی ہی نہیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہاں کھنڈرات ہی کھنڈرات تھے اور وہ بھی اس قسم کے تھے جو عیسائیوں کے تسلط میں تھے' وہاں یہودیوں کو جانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ان مقامات کے کھنڈرات پہ یہ کوڑا کرکٹ پھینکا کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر صاف کیا' وہاں مسجد بنی 72ھ میں اور یہ جو چیز تھی کہ یہاں مساجد بھی تھیں اور خود مدینے کا ایک نام مسجدِ اقصیٰ بھی ہے' یہ ہمارے ہاں موجود ہے۔

قرآنِ حکیم کی اس مذکورہ آیت کا مفہوم تو کچھ یوں ہے

اب اس کی روشنی میں وہ آیت صاف ہوگئی کہ وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے' وہ مکے جیسی زندگی میں کہ جہاں مفتوح مظلوم مقہور لوگ ہیں' جنہیں ہر قسم کے شدائد اور مصائب اور تکالیف برداشت کرنے پڑتے ہیں انہیں رہنے تک کا ٹھکانہ نہیں' ان کا کوئی گھر بار نہیں' ان سے سب کچھ چھینا ہوا ہے' وہ ان حالات میں اپنے بندے کو نکالتا ہے اور راتوں رات نکالتا ہے' اس کو اس مقام کے اوپر لے جاتا ہے جو بہت دور ہے کہ جس نے مرکز بننا تھا قوانینِ خداوندی کا' جس نے سجدہ گاہ بننا تھا اس کے بعد نظام خداوندی کا' جہاں مساجد موجود تھیں اور اس اعتبار سے اس شہر کا نام مسجدِ اقصیٰ تھا۔ مکے سے چلو تو وہ ایک ہی شہر آتا ہے' اس کے بعد اب بھی وہاں عرب کے اندر' اس علاقے کے اندر

ایک ہی شہر ہے حالانکہ یہ بڑے متمدن تھے' بڑا دارالحکومت تھا اور بڑے اہم مقامات ہیں' وہاں شہر اب بھی وہی دو تین ہی ہیں اور نامور شہر تو اس زمانے کے اندر سمجھیے یہ دو ہی تھے: مکہ اور مدینہ اور جو مدینہ تھا وہ مکے سے اتنی دور واقع ہوا تھا' وہ تو اقصیٰ تھا ہی۔

قرآن کریم نے سورۃ انفال میں جہاں جنگِ بدر کا ذکر آیا ہے' وہاں اس مقام کو' بدر کے مقام کو' مکے سے اقصیٰ کہا ہے: دور تو عزیزانِ من! ان حقائق اور کوائف کی رو سے یہ جو معراج کا پہلا حصہ بتایا جاتا ہے' مکے سے بیت المقدس جانا' ان حقائق کی روشنی میں وہ ان چیزوں کے اوپر پورا نہیں اتر رہا۔ مسجدِ اقصیٰ سے مراد حقیقت میں مدینہ طیبہ ہی ہے۔ یہ آیۃ جلیلہ ہجرتِ نبی اکرم ﷺ سے متعلق ہے۔ یہ ہے جو میں نے عرض کیا ہے کہ کوائف اور حقائق کی روشنی میں جس نتیجے پر ہم پہنچتے ہیں۔ یہ پہلا حصہ آ گیا۔ وہ بیت المقدس سے آسمانوں کے اوپر جانا' حضور ﷺ کا بارگاہِ خداوندی اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے شرف یاب ہونا' یہ اگلا حصہ ہے اور اس کے متعلق جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے' سورۃ النجم کو پیش کیا جاتا ہے۔

اب اس دوسرے حصے کے متعلق میں آئندہ درس میں انشاء اللہ عرض کروں گا کیونکہ آج کا وقت تو اسی میں ختم ہو گیا۔ جو سورۃ النجم ہے اس میں کیا کہا گیا ہے اور یہ جو آسمانوں کی طرف جانے کا واقعہ ہے' حقائق کی روشنی میں یہ کس طرح پورے اترتے ہیں' عرض کروں گا۔ میں پھر عرض کر دوں کہ مجھے عقائد سے بحث نہیں' حقائق سے صرف بحث ہے' میرا خیال ہے اتنے حصے کے متعلق تو آپ احباب نے اپنے ذہن میں یا اپنے کاغذوں پر نوٹ کر لیا ہو گا کہ یہ ہیں وہ واقعات' یہ ہیں وہ کڑیاں۔ ان کو ملانے کے بعد آپ دیکھیے کہ کس نتیجے پہ انسان پہنچتا ہے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

دوسرا باب: سورة النجم (آیت 1 مسلسل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1982ء کی 8 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم سے ہوتا ہے: (53:1)

واقعہ معراج کا دوسرا حصہ یعنی آپ ﷺ کا بیت المقدس سے یروشلم اور پھر یروشلم سے عرش پہ پہنچ کر خدا سے ملاقات کرنا

میں نے جیسا کہ پچھلے درس میں عرض کیا تھا' اس سورۃ سے اور سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت سے' واقعہ معراج کے لیے سند لائی جاتی ہے تو میں نے مناسب سمجھا تھا کہ تمہیداً اس واقعہ کا تعارف کرادوں جو ہمارے ہاں مروجہ طور پہ چلا آ رہا ہے۔ اس واقعہ کو دو مراحل میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ مرحلہ اوّل نبی اکرم ﷺ کا مکہ معظّمہ سے بیت المقدس یروشلم جانا اور مرحلہ دوم وہاں سے آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے بارگاہِ خداوندی میں پہنچنا اور وہاں خدا کے ساتھ ہمکلام ہونا یعنی خدا کی ملاقات کے لیے عرشِ عظیم پہ پہنچنا۔ یہ دوسرا مرحلہ تھا۔ پہلے مرحلے کا ذکر سابقہ درس میں آ گیا تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس تفصیل کے لیے متقدمین کی تفسیروں میں جانے کی بجائے خود ہمارے دور کے یہ جو مفسر سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مرحوم) گزرے ہیں' حال ہی میں جن کا انتقال ہوا ہے' ان سے پوچھ لیا جائے تو انہوں نے جو سرگذشت پیش کی ہے' وہ روایات اور تفاسیر پر ہی مبنی ہے لیکن میں نے انہی کی زبان میں اسے پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔ سو میں نے پہلا مرحلہ پیش کر دیا تھا۔

حضور ﷺ وہاں بیت المقدس میں تشریف لے گئے' انبیائے کرام نے آپ کی امامت میں نماز ادا کی اور اس کے بعد ایک سیڑھی آپ ﷺ کے سامنے پیش کی گئی۔ جبریل اس کے ذریعے آپ ﷺ کو آسمان کی طرف لے چلے۔ عربی زبان میں سیڑھی کو معراج کہتے ہیں اور اسی مناسب سے یہ سارا واقعہ معراج کے نام سے مشہور ہے تو اب یہ دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اس سیڑھی کے ذریعے جبریل حضور ﷺ کو آسمانوں کی طرف لے گئے۔ تفصیل اس کی ذرا طویل ہے لیکن چونکہ یہ موضوع سامنے آ گیا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے

میں مناسب رہے گا کہ وہ تفصیل بھی آپ کے سامنے آ جائے کیونکہ وہ بھی اسی سے متعلق ہے۔

پہلے آسمان پر حضرت آدم سے ملاقات کے علاوہ وہاں کے منظر نامے کا حال

جب آپ ﷺ پہلے آسمان پر پہنچے تو دروازہ بند تھا۔ مودودی صاحب (مرحوم) نے یہ تفصیل دی ہوئی ہے کہ محافظ فرشتوں نے پوچھا کہ کون آیا ہے۔ جبریل نے اپنا نام بتایا۔ پوچھا کہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبریل نے کہا: محمد ﷺ۔ کیا انہیں بلایا گیا ہے؟ کہا: ہاں۔ تب دروازہ کھلا یعنی آسمان کا دروازہ جو بند تھا' اس کے بعد پھر وہ دروازہ کھلا اور آپ ﷺ کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ یہاں آپ ﷺ کا تعارف فرشتوں اور انسانی ارواح کی ان بڑی بڑی شخصیتوں سے ہوا جو اس مرحلہ پر مقیم تھیں۔ ان میں نمایاں شخصیت ایک ایسے بزرگ کی تھی جو انسانی بناوٹ کا مکمل نمونہ تھے' چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں' کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا یعنی وہ جسمانی شکل کے اندر' جسمانی پیکر میں' وہاں موجود تھے اس لیے کہا کہ چہرے مہرے اور جسم کی ساخت میں کسی پہلو سے کوئی نقص نہ تھا۔ جبریل نے بتایا کہ یہ آدم ہیں آپ کے مورث اعلیٰ۔ ان بزرگ کے دائیں بائیں بہت لوگ تھے۔ وہ دائیں جانب دیکھتے تو خوش ہوتے اور بائیں جانب دیکھتے تو روتے۔ پوچھا: یہ کیا ماجرا ہے؟ بتایا گیا ہے کہ یہ نسلِ آدم ہے۔ آدم اپنی اولاد کے نیک لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور برے لوگوں کو دیکھ کر روتے ہیں' پھر آپ کو تفصیلی مشاہدہ کا موقع دیا گیا۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں اور جتنی کاٹتے ہیں' اتنی ہی وہ بڑھتی جاتی ہے۔ پوچھا: یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے ہیں۔ میں اتنا عرض کردوں کہ یہ مودودی مرحوم نے ریڈیو پہ تقریری کی تھی' پھر اس کے بعد اپنے ہاں اسے اپنے پرچے میں جاری کیا تھا' گویا ریڈیو پہ معراج کی یہ تفصیل بتائی گئی تھی۔ پھر دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ پوچھا: یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی انہیں نماز کے لیے روکے دیتی تھی۔ کچھ اور لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں آگے اور پیچھے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ پوچھا: یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ وہ ہیں جو اپنے مال میں سے زکوٰۃ خیرات کچھ نہیں دیتے تھے۔ پھر ایک شخص کو دیکھا کہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ نہیں اٹھتا تو اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ پوچھا: یہ کون احمق ہے؟ کہا گیا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر امانتوں اور ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ تھا کہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر یہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بار اپنے اوپر لادے چلا جاتا ہے۔ پھر دیکھا کہ کچھ لوگوں کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کترے جا رہے ہیں۔ پوچھا: یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ غیر ذمہ دار مقرر ہیں' جو بے تکلف زبان چلاتے اور فتنہ برپا کیا کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ دیکھا کہ ایک پتھر میں ذرا سا شگاف ہوا اور اس میں سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا۔ پھر وہ بیل اسی شگاف میں واپس جانے کی کوشش کرنے لگا مگر جا نہ سکا۔ پوچھا: یہ کیا معاملہ ہے؟ کہا گیا کہ یہ اس شخص کی مثال ہے جو غیر ذمہ داری کے ساتھ ایک فتنہ انگیز بات کرتا ہے' پھر نادم ہو کر اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے مگر نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر کچھ لوگ تھے جو اپنا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پوچھا: یہ کون ہیں؟ کہا گیا کہ یہ دوسروں پر زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ انہی مراحل میں سے آپ ﷺ گزرتے ہوئے آگے چلے گئے۔ اسی قسم کی اور مثالیں دی گئی ہیں۔

پہلے آسمان کے بعد دوسرے آسمان کی تصویر کشی کے دوران حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ملاقات

ان مشاہدات کے بعد اس مرحلہ سے گزر کر آپ ﷺ دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں کے اکابرین میں دونوں جوان سب سے ممتاز تھے۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ یہ یحییٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ تیسرے آسمان پر آپ ﷺ کا تعارف ایک بزرگ سے کرایا گیا' جن کا حسن عام انسانوں کے مقابلے میں ایسا تھا جیسا تاروں کے مقابلے میں چودھویں کا چاند۔ معلوم ہوا کہ یہ یوسف علیہ السلام ہیں۔ چوتھے آسمان پر حضرتِ ادریس علیہ السلام' پانچویں پر حضرتِ ہارون علیہ السلام' چھٹے پر حضرتِ موسیٰ علیہ السلام آپ ﷺ سے ملے۔ ساتویں آسمان پر پہنچے تو ایک عظیم الشان محل بیت المعمور دیکھا جہاں بے شمار فرشتے آتے اور جاتے تھے۔ اس کے بعد آپ ﷺ کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی جو خود آپ ﷺ سے بہت مشابہ تھے' تعارف پر معلوم ہوا کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر آگے بات چلتی ہے۔

ساتویں آسمان کے بعد سدرۃ المنتہیٰ کی طرف قصد اور وہاں جنت کا مشاہدہ

پھر مزید ارتقا شروع ہوا' یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے' جو بیچ گاہ رب العزت اور عالم خلق کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیچے سے جانے والے یہاں رک جاتے ہیں اور اوپر سے احکام اور ترامیم براہِ راست یہاں آتے ہیں۔ اسی مقام کے قریب آپ ﷺ کو جنت کا مشاہدہ کرایا گیا اور آپ ﷺ نے دیکھا کہ اللہ نے اپنے صالح بندوں کے لیے وہ کچھ مہیا کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی کان نے سنا' نہ کسی کے ذہن میں اس کا تصور آ سکا۔

بارگاہِ جلالِ ربی سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرنے کی تفصیل کا ذکر

سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل ٹھہر گئے اور آپ ﷺ تنہا آگے بڑھے' ایک بلند ہموار سطح پر پہنچے تو بارگاہِ جلال ربی حضور ﷺ کے سامنے تھی۔ ہمکلامی کا شرف بخشا گیا۔ جو باتیں ارشاد ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں: ہر روز پچاس نمازیں فرض کی گئیں' سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیتیں عطا فرمائی گئیں' شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔ ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے' اس کے حق میں نیکی لکھی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

ربِ جلال و جمال کی بارگاہ سے واپسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات اور خدا کی بارگاہ سے ملنے والے تحفوں کی واپسی کا معاملہ

پیشیِ خداوندی سے واپسی پر نیچے اترے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ یہ ٹکڑا زیادہ غور طلب ہے۔ انہوں نے روداد سن کر کہا کہ میں بنی اسرائیل کا تلخ تجربہ رکھتا ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کرسکتی۔ خدا نے پچاس نمازیں فرض کی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لے کر تحفہ کے طور پر نیچے اترے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملے ہیں تو انہوں نے یہ کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت پچاس نمازوں کی پابندی نہیں کر سکے گی' جایئے اور کمی کے لیے عرض کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گئے اور اللہ جل شانہ نے دس نمازیں کم کردیں' پلٹے تو حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے پھر وہی بات کہی' ان کے کہنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اوپر جاتے رہے اور ہر بار دس نمازیں کم کی جاتی رہیں' آخر پانچ نمازوں کی فرضیت کا حکم ہوا اور فرمایا گیا کہ یہی پچاس کے برابر ہیں۔ مودودی مرحوم نے یہاں آگے وہ بات نہیں لکھی' یہ بخاری کی روایت ہے اور اس کے بعد بخاری میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ پھر جایئے' یہ پانچ بھی امت سے نہیں پڑھی جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ مجھے تو اب جاتے ہوئے شرم آتی ہے اسی لیے میں پانچ ہی لے کر چلا جاتا ہوں۔

واپسی پر بیت المقدس میں تمام پیغمبروں سے ایک بار پھر ملاقات' مکہ کی واپسی پر ملاقات کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت

واپسی کے سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے' یہاں پھر تمام پیغمبر موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نماز پڑھائی جو غالباً فجر کی نماز تھی' پھر براق پر سوار ہوئے اور مکہ واپس پہنچ گئے۔ یہ اس سفر کا دوسرا مرحلہ ہے اس واقعہ کا ذکر احادیث کی جو صحیح ترین کتابیں شمار کی جاتی ہیں' ان سب میں ہے' انہی سے تفاسیر میں انہوں نے لیا ہے۔ آگے یہ بھی ان میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبح مکے واپس تشریف لائے' یہ بات بیان کی تو کفار نے مضحکہ اڑایا بلکہ انہوں نے تو یہاں تک بھی لکھا ہے کہ آناً فاناً یہ خبر تمام مکہ میں پھیل گئی۔ بہت سے مسلمان اس کو سن کر اسلام سے پھر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر راستے کی کچھ نشانیاں بیان فرمائیں۔ ثبوت مانگنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ فلاں مقام' پر فلاں قافلہ پر' سے گزرا' جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا' قافلے والوں کے اونٹ براق سے بھڑکے' ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا' میں نے قافلہ والوں کو اس کا پتہ بتادیا' واپسی میں فلاں وادی میں فلاں قبیلے کا قافلہ مجھے ملا' سب سو رہے تھے' میں نے ان کے برتن سے پانی پیا اور اس بات کی علامت چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسے ہی کچھ اور اتے پتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے اور بعد میں آنے والے قافلوں سے اس کی تصدیق کی' اس طرح زبانیں بند ہوگئیں۔

واقعہ معراج کے مروجہ تصوّر کو بیان کرنے کے بعد ایک الجھن

میں نے سابقہ درس میں بھی عرض کیا تھا کہ مجھے اس بیان کردہ واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا۔ بتانا صرف یہ ہے کہ یہ ہے معراج کے متعلق وہ بات جو چلی آ رہی ہے اور اسے حضور ﷺ کی شان میں بہت بڑی عظمت مانا جاتا ہے۔ اس میں دو باتیں ہیں۔ پہلے یہ لیجیے کہ کہا یہ گیا ہے اور یہ ہمارے ہاں ایک مسلّمے کے طور پر چلا آ رہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکے میں مبعوث ہوئے' حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے' قریش تھے' مکے کے رہنے والے تھے' کعبہ وہاں تھا' لیکن حضور ﷺ نبوت کے ملنے کے بعد بھی تیرہ سال مکے میں' کعبے کی طرف رخ کر کے' نماز پڑھنے کی بجائے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ یہاں بات یوں بنی رہی کہ اگر کعبے کی ایک سمت میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تو کعبہ بھی سامنے آ سکتا تھا اور رخ ایسا تھا کہ بیت المقدس بھی اسی رخ پہ پڑتا تھا اس لیے دونوں ایک سمت میں پڑتے تھے تو دل میں کشمکش کی کوئی بات نہیں پیدا ہوتی تھی۔ مدینہ تشریف لائے تو وہاں شکل یہ تھی کہ مکہ اگر مثلاً جنوب کی جانب تھا تو بیت المقدس شمال کی جانب تھا۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ دو متضاد سمتوں میں تھے درمیان میں مدینہ' پیچھے کی طرف مکہ' ادھر کی طرف بیت المقدس۔ اب نماز پڑھتے وقت حضور ﷺ کے دل میں بڑا اضطراب پیدا ہوتا تھا۔ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے تو پیٹھ مکے کی طرف ہو جاتی تھی تو آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے ہی پڑھتے رہے۔ دو سال یا تین سال کا عرصہ بتایا جاتا ہے۔ اب اس کے بعد پھر کعبے کی طرف رخ کرنے کا خدا کا حکم ہوا۔

تبدیلِ قبلہ کا مروجہ تصوّر اور اس کی اصل حقیقت

عزیزانِ من! وہ ایسے ہوا کہ ایک دن آپ ظہر یا عصر کی نماز ایک مسجد میں' اپنی مسجدِ نبوی میں نہیں' بلکہ کوئی باہر مسجد ہے' اس مسجد میں باجماعت نماز پڑھ رہے تھے' صحابہ رضی اللہ عنہم پیچھے تھے۔ دو رکعتیں غالباً پڑھ چکے تو عین حالت نماز میں حکم آیا کہ کعبے کو اپنا قبلہ مقرر کیجیے تو آپ ﷺ کا رخ تو بیت المقدس کی طرف تھا تو میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو بالکل اس کی Opposite Side (مخالف سمت) پہ پڑتا تھا تو جب حکم آیا تو امام آپ ﷺ ہی کھڑے تھے' وہ پیچھے جو جماعت میں امتی تھے' امت کے احباب صحابہ کبار رضی اللہ عنہم تھے ان کے لیے تو یہ آسان تھا کہ انہوں نے وہیں سے رخ بدلا تو دوسری طرف ہو گیا لیکن امام کے لیے تو یہ مشکل تھا۔ حضور ﷺ وہاں سے ساری جماعت کا چکر کاٹ کر دوسری طرف تشریف لائے تو وہاں پھر آپ ﷺ امام کے مقام پر کھڑے ہوئے تو پھر آپ کا رُخ مکہ کی طرف یا کعبے کی طرف ہُوا اور باقی نماز اس طرح سے پڑھی۔ یوں تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ اسے تبدیلِ قبلہ کہتے ہیں یعنی قبلہ کی سمت کا بدلنا' چنانچہ وہ مسجد دو قبلتین کہلاتی ہے یعنی دو قبلوں والی مسجد۔ اس میں دونوں طرف محراب بنے ہوئے ہیں۔ ایک محراب کعبے کی جانب ہے اور ایک محراب

بیت المقدس کی جانب ہے اسی لیے ان کو دو قبلوں والی مسجد کہتے تھے۔ ابھی تھوڑا عرصہ پہلے تک جو حاجی وہاں سے آتے تھے‘ وہ بتاتے تھے کہ وہاں محراب تھے۔ میں جو وہاں حاضر ہوا ہوں تو دیکھا کہ اب وہاں جو بیت المقدس کی سمت کا محراب ہے‘ وہ محراب نہیں‘ اس کی بجائے محراب جیسی ایک لکیر نشانی کے طور پر کھینچ دی گئی ہے یہ بتانے کے لیے کہ پہلا قبلہ یہ تھا اور دوسرا یہ۔

نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اگر ذریتِ ابراہیمی علیہ السلام تھی تو آپ ﷺ ملتِ ابراہیمی علیہ السلام سے بھی ہیں

پہلی چیز تو یہ قابلِ غور ہے کہ نبی اکرم ﷺ ‘ میں نے عرض کیا‘ کہ ذریت ابراہیمی علیہ السلام میں سے ہی نہیں ہیں‘ بلکہ ملتِ ابراہیمی علیہ السلام میں سے بھی ہیں۔ نبوت سے پہلے بھی آپ ﷺ عرب کے باشندے ہیں‘ قریش کی ممتاز شخصیت ہیں اور یہ کعبہ سارے عرب کا مرکز تھا اور قریش کا تو واجب عزت اور شرف مقام تھا‘ قریش کی نسبت ہونے کی حیثیت سے کعبے کی تولیت بھی ان کے پاس تھی‘ کعبے کا نظم ونسق بھی ان کے پاس تھا اور ان کی وجہ سے تمام عرب کے اندر ان کی بڑی عزت تھی۔ قرآن کریم یہ بتاتا ہے کہ کعبے کے ساتھ نسبت کی بنا پہ کیفیت یہ تھی کہ باقی لوگوں کے قافلے دن دیہاڑے لوٹے جاتے تھے مگر ان قریش کے قافلوں کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اتنا احترام تھا اتنی عظمت تھی کعبے کی طرف نسبت سے۔

کعبے کے مقابلے میں بیت المقدس کی عظمت کو بڑھانے کی غرض سے ایک گہری سازش کا وجود قائم کیا گیا

نبی اکرم ﷺ وہاں مکہ میں پیدا ہوتے ہیں‘ نبوت سے پہلا دور اس طرح گزارتے ہیں۔ روایات کے مطابق نبوت کے بعد آپ ﷺ نماز شروع کرتے ہیں تو اپنا رخ بیت المقدس کی طرف کرتے ہیں۔ تیرہ سال مکے کے‘ دو تین سال مدینے کے‘ نبوت کے دوران‘ رخ بیت المقدس کی طرف یعنی یہودیوں کے قبلے کی طرف کیا جاتا ہے جو کہ خود ان مودودی مرحوم کی تحقیق کے مطابق بھی اس زمانے میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ وہ ہیکلِ سلیمانی یا وہ مسجدِ سلیمانی یا بیت المقدس کا مقام‘ عبادت گاہ کے طور پر وہاں موجود ہی نہیں تھا‘ اس کے کھنڈرات تھے‘ عیسائی وہاں غلاظت ڈالتے تھے‘ جسے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں‘ جب یروشلم فتح کیا تو اس کو جا کر خود صاف کیا تھا۔ اس بیت المقدس کی طرف ان روایات کی رو سے حضور ﷺ بحیثیت نبی رخ کر کے نماز پڑھتے تیرہ سال مکے کے اور دو تین مدینے کے یعنی پندرہ سولہ سال بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ اس سے کعبے کے مقابلے میں بیت المقدس کی عظمت کتنی بڑھ گئی۔ معراج کا واقعہ ہوا تو حضور ﷺ کعبے سے آسمان کی طرف تشریف نہیں لے گئے۔ کہا گیا کہ آپ ﷺ کعبے میں سو رہے تھے اس میں بھی روایات میں بڑا اختلاف ہے مگر آپ ﷺ کعبے سے بیت المقدس میں گئے۔

روایات کا باہمی تضاد اور پھر پچاس نمازوں کے تحفہ کو واپس کرنے کے قصے میں حضرت موسیٰؑ کی ذات کا سہارا

عزیزانِ من! روایات کے اختلاف تو آپ پوچھیے نہیں۔ وہاں ایک نماز کو لیجیے تو اتنے اختلافات ملتے ہیں۔ یہ تو ایک واقعہ تھا۔ کہیں یہ ہے کہ حضورﷺ اپنی چچازاد بہن حضرت ام ہانی کے گھر میں سو رہے تھے۔ کہیں یہ ہے کہ کعبے میں تھے۔ یہ کب کا واقعہ ہے؟ اس کے متعلق ان روایات کے اندر متعدد تاریخیں ملتی ہیں۔ بہرحال اس قصے کو چھوڑ دیجیے کہ آپﷺ کعبے سے نہیں گئے۔ عام یہ ہے کہ آپﷺ کعبے میں سو رہے تھے۔ کعبے سے، سیدھے بیت المقدس میں، براق کے ذریعے گئے ہیں۔ بیت المقدس سے پھر عرش کی طرف واپس بھی وہیں آئے، وہاں سے پھر براق پہ مکے میں آئے، تو کعبے کے مقابلے میں دوسرا مقام عظمت بیت المقدس کو یہ حاصل ہوگا۔ یہ بڑی غور طلب چیز ہیں۔ خدا حکم دینے والا ہے کہ پچاس نمازوں کا رسول اللہ تحفہ قبول کر کے نیچے واپس آنے والے ہیں، پھر وہی یہودیوں کے پیغمبر، حضرتِ موسیٰؑ، آپﷺ سے کہہ رہے ہیں کہ یہ آپﷺ کیا حکم لے آئے ہیں، یہ آپﷺ کی امت سے نہیں پڑھی جائیں گی (معاذ اللہ)۔ نہ خدا، جس نے حکم دیا، اس کو اس کا احساس ہوا کہ یہ نہیں پڑھی جائیں گی، نہ حضورﷺ جنہوں نے یہ تحفہ قبول کیا، انہیں اس کا احساس ہوا کہ یہ ناممکن العمل ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ نے احساس دلایا اور اس پر آپﷺ نے وہ بات مانی تو پھر تشریف لے گئے۔ اس پہ خدا نے بھی، وہ جیسا کہتے ہیں کہ دس کم کر دیں، خود ہی حضرت موسیٰؑ کے مشورے سے اپنے حکم میں تبدیلی کی۔

یہودیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں نبی اکرمﷺ کے مقامِ بلند کو نیچا دکھانے کی کوشش

یہ نکتے بڑے غور طلب ہیں، عزیزانِ من! روایات کے مطابق آپﷺ پھر تشریف لے گئے یعنی آپ سوچیے کہ احکام خداوندی ملتے کس طرح سے تھے، ان میں تبدیلیاں کیسے پیدا ہوتی تھیں، حضورﷺ کا مقام حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں کیا رہا، قرآن کریم کی رو سے ہم تمام انبیائے کرام پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں، تمام رسولوںؑ کو ہم رسول مانتے ہیں، ان کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے مکلّف ہیں۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ ہم نے بعض انبیا کو دوسرے انبیا پر فضیلت دی ہے، ہم فضیلت کے قائل ہیں اور فضیلت کے اعتبار سے تو نبی اکرمﷺ سب سے اونچے ہیں۔ ابھی ابھی یہ کہا گیا ہے کہ حضورﷺ نے جو وہاں نماز پڑھائی تو تمام انبیائے کرام آپﷺ کی امامت میں تھے، وہاں حضرت موسیٰؑ بھی تھے، وہ بھی اس میں شامل ہوں گے۔ اس کا تو خاص طور پر ذکر نہیں آیا، وہ بات تو رہی مبہم۔ متعین بات یہ ہوگئی کہ وہاں خدا کا حکم دینے والا ہے، رسول اللہﷺ اس حکم کو تحفتہً قبول کرنے والے ہیں، دونوں کو احساس نہیں ہوا کہ یہ حکم ممکن العمل نہیں ہے۔ البتہ حضرت موسیٰؑ کو اس کا احساس ہوا تو ان کے کہنے پر حضورﷺ واپس گئے، پھر حکم ہوا، پھر واپس آئے یعنی اس طرح بار بار تشریف لاتے جا رہے۔ اس کے بعد آخری بات جو تھی، میں نے عرض کیا کہ وہاں آخر حضورﷺ نے یہ فرمایا کہ نہیں، مجھے اب تو جاتے

ہوئے شرم آتی ہے' تو آپؐ نے کہا کہ اچھا! نہ جائیے لیکن امت پڑھ نہیں سکے گی اور واقعی وہ جو یہودی کہتے ہیں کہ یہ بتایا کہ ہمارے نبی ﷺ نے صحیح کہا تھا' چلے جاتے تو یہ کم ہو جاتیں تو تمہارے پڑھنے کے لیے آسان تو ہو جاتا۔اب تک وہ یہ کچھ کہتے ہیں۔

حضورﷺ کی عظمت کے بارے میں قرآنِ حکیم کا ارشاد اور یہودیوں کے لیے پیغام

بہر حال نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔قرآن قریم کی رو سے حضورﷺ کی عظمت ہے' انؐ پہ ختم ہوئی' نبوت اسلام آیا۔وہ آخری دین ہے' مکمل ہے' غیر متبدل ہے' قیامت تک رہنے والا ہے' تمام سابقہ ادیان کو منسوخ کر دیا ہے۔قرآن حکیم نے خود یہودیوں کو بار بار یہ تاکید کی' حکم دیا کہ تم اس قرآن حکیم پر' اس نبی ﷺ کی نبوت پر' ایمان لاؤ۔قرآن حکیم میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے خدا سے یہ التجا کی تھی کہ مجھ پر اور میری اس حاضرہ امت پر' تو آپ نے اتنا انعام کیا ہے' میں چاہتا ہوں کہ یہ انعام اسی طرح برقرار رہے۔قرآن حکیم میں ہے کہ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھیے! ایک وقت آئے گا جب خاتم الانبیا ﷺ تشریف لائیں گے اور آخری دین آئے گا۔تمہاری امت اس دین کا اتباع کرے گی' اس رسول ﷺ پر ایمان لائے گی' تو پھر یہ نعمتیں ان کو مل سکیں گی ورنہ نہیں مل سکیں گی۔یہ مقام ہے اسلام کا بحثیت دین کے' نبی اکرم ﷺ کا بحثیت رسول کے۔یہودیوں سے بار بار دلائل مانگے جاتے تھے کہ اگر تم کہتے ہو کہ یہودیوں کا جو دین ہے' وہ اس دین سے افضل ہے تو هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (2:1) کیونکہ انہیں کہا جاتا تھا کہ تمہیں نجات وسعادت کے لیے اس قرآن کریم پر' اس نبی ﷺ پر' اس اسلام پر ایمان لانا ہوگا۔وہ کہتے تھے کہ ہمارا دین جو ہمارا مذہب ہے' وہ اس سے افضل ہے۔ان سے کہا جاتا تھا کہ اس کے لیے دلیل لاؤ۔دلائل کی رو سے تو کوئی دین بھی اسلام سے افضل ثابت نہیں ہوسکتا۔

ہمارے ہاں کی روایات میں بیت المقدس اور نبی اکرم ﷺ کی عظمت کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا

عزیزانِ من! قرآن کریم نے صاف کہہ دیا تھا کہ لَا بُرْهَانَ لَهُ (23:117) ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی' ان کے دلائل کی رو سے تو وہ افضل ثابت نہ ہوسکا' نہ ہوسکتا تھا' تو آپ غور فرمائیے کہ آپ کی کتبِ احادیث میں جو یہ ساری روایات درج ہوئی ہیں' جس میں کعبے کے مقابلے میں بیت المقدس کا یہ مقام ہے' حضرتِ موسیٰؑ کا رسول اللہ ﷺ کے مقابلے میں یہ مقام خود بخود ہی اونچا ہو گیا۔نظر آتا ہے کہ یہ روایات ان یہودیوں کی وضع کردہ ہیں۔ان کتابوں میں کیسے آئیں؟ یہ دیکھنا میرا کام نہیں ہے' روایات خود منہ سے بول رہی ہیں کہ یہ حضورﷺ کی یا خدا کی طرف سے ارشاد فرمودہ چیزیں نہیں ہوسکتیں۔نظر آ رہا ہے کہ یہ سازش ہے۔عیسائیوں کے ساتھ بھی انہوں نے یہ کچھ کیا۔میں یہاں ان کی جہت سے ''اپنا رسول ﷺ' اپنا نبیؐ'' کہہ رہا ہوں۔ورنہ سب ہمارے بھی انبیاءؑ ہیں' ہمارے بھی رسول ﷺ ہیں۔انہوں نے اپنے رسولؑ کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر دیا کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے' زندہ آسمان پہ ہیں' جونہی عیسائیت اور اسلام کا

تقابل ہوا تو بجائے اس کے کہ وہ ان دونوں مذہبوں میں یا ادیان میں مقابلہ کرتے' کوئی دلائل پیش کرتے' انہوں نے کہا صاحب! نبی کا نبی سے مقابلہ کیجیے' ہمارا نبی بغیر باپ کے پیدا ہوا' آپ کا نبی تو عام بچوں کی طرح' ماں باپ کے ذریعے پیدا ہوا۔ نبی کا نبی سے مقابلہ کر لیجیے' ہمارا نبی آسمان پہ زندہ موجود ہے' قیامت تک زندہ رہے گا' تمہارا نبی تہہ خاک ہے۔

حضرت عیسیٰ ؑ کے متعلق عیسائیوں کے مختلف غیر قرآنی عقائد کو ہم نے پوری طرح تسلیم کر رکھا ہے

آپ نے غور فرمایا اب اگر ان کا یہ دعویٰ ہوتا تو ہم یہ کہتے کہ یہ تمہارا دعویٰ ہے ہمارا تو نہیں۔ یہ جو سارے دعاوی تھے' وہ آپ کی کتبِ روایات کے اندر درج کر دیئے۔ اب آپ کے ہاں حیات و وفاتِ مسیح ؑ اور حضرتِ عیسیٰ ؑ کی پیدائش کے جو واقعات عیسائیوں کا عقیدہ ہیں' وہ آپ کے ہاں کے ایسے عقائد بن گئے ہیں کہ ان سے انکار کرنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتے ہیں' کیا کیا سازشیں ہوئی ہیں ہمارے ساتھ!

احادیث کے متعلق ہمارے ہاں کی پیش کردہ تعلیم

عزیزانِ من! قرآن کریم میں تو ایک لفظ کی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا تھا۔ آسان یہ تھا کہ اس قسم کی روایات وضع کی جائیں اور پھر اُس کے بعد اب اس زمانے میں چھاپے خانے تو تھے نہیں' کہ کوئی چھپا ہوا بخاری کا' مسلم کا مستند نسخہ کہیں محفوظ پڑا ہوا ہو یا ان کے ہاں کا مرتب کردہ ہی کوئی نسخہ ہو۔ معلوم نہیں کہ کس طرح ان میں یہ روایات آئیں لیکن بہر حال یہ جو ہزار سال سے آپ کے ہاں یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں' یہ آج بھی ہیں' ان تمام میں یہ روایات موجود ہیں اور ان روایات کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' مثلہ معہ ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ مسلم اور بخاری کی کسی ایک حدیث کا انکار بھی مسلمان کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی طرح یہ احادیث بھی وحی پر مبنی ہیں' وحی کی دو قسمیں ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم اور ان روایات میں کوئی تضاد نظر آئے تو پہلے تو یہ کوشش کرو کہ قرآن کریم کی آیت کی کسی طرح سے تاویل کر کے حدیث کے مطابق بنا لی جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ سمجھو کہ قرآن کریم کی آیت منسوخ ہے' حکم حدیث کا رہے گا۔ ان روایات کی رو سے یہ عقائد ہو گئے۔ اب ان عقائد کی رو سے آپ دیکھ لیجیے کہ یہودیوں کے معبد' عبادت گاہ' ان کا جو مرکز تھا اس کا کیا مقام ہے۔ جس نبی کو وہ اپنا نبی کہتے ہیں' آپ کے کعبے اور آپ کے رسول ﷺ کے مقابلے میں اس نبی کا مقام کیا ہے۔

ہمارے ہاں کی وضعی روایات نے ہی بیت المقدس یا ہیکل سلیمانی کی قانونی حیثیت کو اُجھار رکھا ہے

یہ جو بیت المقدس کا حال میں قصہ چلا ہے کہ وہ کس کی تحویل میں رہنا چاہیئے' کس کی تولیت میں بھی رہنا چاہیئے' بلکہ ملکیت میں رہنا چاہیئے' کس کا ہے؟ یہ قصہ حال کی سیاست میں اٹھا ہے۔ بات اگر یہی رہتی کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں وہ یروشلم میں جسے آپ بیت

المقدس وغیرہ کہتے ہیں' ہیکلِ سلیمانی کہتے ہیں وہ مسجد جسے عبادت گاہ کہتے ہیں' اس کا وہاں وجود ہی نہیں تھا۔ اگر وہ مسجد بعد میں بنی ہے' تو خالی جگہ پہ بنی ہے' اس لیے یہودیوں کا تو کوئی دعویٰ قابلِ ثبوت ہی نہیں ہے۔ اگر یہودیوں کے اس دعویٰ کو تسلیم کرلیا جائے کہ وہاں ہماری عبادت گاہ تھی' ہمارا ہیکل تھا' اس کو مسمار کرکے مسلمانوں نے اپنی مسجد بنالی تو آج کی عدالت بھی ان کے حق میں فیصلہ دے دے گی کہ ان کی مسجد پہلے موجود تھی' اُسے مسلمانوں نے مسمار کیا اور بعد میں اپنی مسجد بنالی' اولیں حق تو ان کا ہے لیکن آپ کے ہاں تو عقیدہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بیت المقدس موجود تھا' ہیکلِ سلیمانی موجود تھا' وہ عبادت گاہ تھی' حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے' وہاں جا کر یہ نمازیں پڑھیں' وہاں سے آسمان کی طرف تشریف لے گئے' تو وہاں تو آپ کہتے ہیں کہ یہ موجود تھیں اور پھر اس کے بعد موجود نہیں رہیں' اس کی جگہ وہاں مسجد آگئی' خواہ وہ بنی امیہ کے زمانے کی عبدالملک کے عہد کی 72ھ کی بنی ہوئی کیوں نہ ہو' مسجد اس کی جگہ آگئی جس بیت المقدس کو' جس ہیکلِ سلیمانی کو' جس عبادت گاہ کے وجود کو' آپ نے تسلیم کرلیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تھی' یہ چیزیں بعد میں نہ رہیں اور پھر ان کی جگہ مسجد آگئی' ان کا دعویٰ کتنا مضبوط کردیا آپ نے کہ حق ہمارا ہے ان کا نہیں ہے۔ انہوں نے ہی ہمارے ہیکل کو مسمار کرکے اپنی مسجد بنائی ہے' یہ ثبوت بہم پہنچادیا۔

ستمبر 1969ء میں ہیکل سلیمانی کی بابت مولانا مودودیؒ کی متضاد بیانی قابلِ غور ہے

عزیزانِ من! میں پھر دہراؤں' وہ جو میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ ستمبر 1969ء میں انہوں نے خود یہ چیز لکھی تھی کہ ظہورِ اسلام کے وقت یروشلم میں یہودیوں کا کوئی معبد تھا ہی نہیں۔ یہ بڑی صاف بات کی تھی۔ اس سے یہودیوں کا دعویٰ خارج ہو جاتا ہے اور چند ہی دن گزرے' اسی ستمبر 1969ء میں انہوں نے اپنے درس میں یہ کہا اور پھر یہ ان کے پرچے نے لکھا کہ یہ یروشلم قبلہ اول اس لیے ہے کہ حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی' پہلے اسی طرف رخ کرکے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جب تحویلِ قبلہ کا حکم آگیا تو اس کی وہ اہمیت نہ رہی لیکن قبلہ اول ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے لیے یہ عبادت گاہ' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقدس اور محترم قرار پائی۔ جب تک مکہ معظّمہ میں حضور ﷺ کا قیام رہا' آپ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ مسجدِ اقصیٰ اور خانہ کعبہ ایک رخ میں آجاتے تھے لیکن مدینے میں یہ انتظام ممکن نہ رہا کیونکہ اب ان عبادت گاہوں کے رخ مختلف سمتوں میں پڑتے تھے۔ ہجرت مکہ سے پہلے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم ایک طویل عرصے تک مسجدِ اقصیٰ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے یعنی اسی ستمبر 1969ء میں چند دن پہلے کہا ہے کہ وہاں کوئی عمارت تھی نہیں' نہ مسجد اقصیٰ' نہ کوئی ہیکلِ سلیمانی' اور نہ کوئی عبادت گاہ' اب یہ فرما رہے ہیں کہ یہ وہاں موجود تھی' حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی تیرہ سال مکے کے اور دو تین سال مدینے کی زندگی کے' اس کی طرف رخ کرکے نماز پڑھتے رہے تھے تو اس کے وجود کا تو اعتراف آپ کے ہاں موجود ہوا اور حدیثوں میں یہ موجود ہے۔ ان کا انکار کیجیے گا تو اسلام کے دائرہ سے آپ خارج ہو جائیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ

تو آپ کے ہاں خود موجود ہے۔ اسے آج تک قبلہ اول کہے چلے جا رہے ہیں' تو اس کے وجود کی شہادت اور ثبوت تو خود بہم پہنچا رہے ہیں۔ آپ غور کیجیے گا کہ یہ چیزیں کس طرح ہماری روایات میں داخل ہوئیں۔ قرآنِ کریم میں نہ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کا کوئی ذکر ہے' نہ تحویلِ قبلہ کا۔ جب پہلے اس کو بنانے کا ہی ذکر نہیں تو اس کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' وہ کعبہ تو پہلے دن سے تھا۔ یہی نہیں تھا بلکہ حضور ﷺ کے زمانے میں اس کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (3:96) آپ کا سب سے پہلا گھر تھا' وہ قبلہ اول بھی' دوم تو اب کہا ہی کیا جائے گا اور وہی تھا اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ (3:96) تمام نوعِ انسانی کے لیے پہلا گھر خدا کا۔

اس قدر واضح حقائق کے باوجود ہم آج تک اسے قبلہِ اول ہی کہتے چلے آ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

ان حقائق کی روشنی میں عزیزانِ من! آپ سوچ لیجیے کہ یہ جو پہلا مرحلہ بیان کر دیا جاتا ہے یعنی حضور ﷺ کو مکے سے بیت المقدس پہنچا کر وہاں سے آگے حضور ﷺ کو معراج' سیڑھی کے ذریعے آسمانوں کی طرف پہنچایا جاتا ہے' اس کی حقیقت کیا ہے!!

واقعہ معراج کا دوسرا حصہ جس میں آپ ﷺ کا عرش پر خدا تعالیٰ کے ساتھ ملاقات کا ذکر ہے یعنی Time & Space کا معاملہ اور اس کا حل

اب خدا کو ملنے کے لیے اگلا مرحلہ لیجیے یہاں سے کسی خاص مقام میں پہنچنا' جو سات آسمانوں کے اوپر ہے' وہ عرش ہے' خدا وہاں ہوتا ہے' یہ ذرا لطیف سا نکتہ ہے۔ اس پہ ذرا غور کیجیے گا' خدا کسی خاص مقام (Space) میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس سے بات سمجھ میں آئے گی۔ Space یا مکان یا جگہ تو ہمیشہ کسی نہ کسی Material (مادی چیز) کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ مادہ جگہ گھیرتا ہے' یہ چوتھی پانچویں میں پڑھایا جاتا تھا حالانکہ Time & Space (زمان ومکان) کی یہ دونوں چیزیں مادے کے ساتھ ملتی ہیں' مختص ہیں۔ میں اس وقت خدا کے لیے ٹائم کی بات نہیں کرتا۔ قرآنِ کریم نے تو اللہ کی ذات کو ان مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند و بالا' مبرا اور منزا قرار دیا ہے۔ کہا ہے کہ هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ[1] (57:3) تو یہ چیزیں جو کوئی مادی شے ہو' اس کے لیے یہ ضروری ہیں کہ کسی وقت میں' وہ وجود

---

[1] اس کی ذات' زمان ومکان کی نسبتوں سے ماوراء ہے۔ سب سے اول بھی ہے اور سب سے آخر بھی وہی۔ اس کے لیے نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ وہ ہر شے پر غالب ہے لیکن اس کا غلبہ غیر مرئی اور غیر محسوس طور پر کام کرتا ہے (قانون ہوتا ہی غیر مرئی اور غیر محسوس ہے' لیکن اس کے نتائج محسوس اور مرئی ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جملہ کائنات' اس کی صفت خالقیت و ربوبیت کی مظہر اور اس کی ہستی کی زندہ شہادت ہے' لیکن اس کی ذات' انسانی نگاہوں سے پنہاں اور مستور ہے۔ اس اعتبار سے وہ باہمہ بھی ہے اور بے ہمہ بھی۔ الٰہیات کی اصلاح میں یوں کہا جائے گا کہ وہ Transcendent بھی ہے Immanent بھی (پرویز: القرآن، ص ۱۲۷۶).

میں آئے‘ کسی وقت میں وہ ختم ہو جائے۔ یہ تو ٹائم ہوا۔ اگر کسی ایک مقام کے اوپر ہو‘ تو پھر تو وہ دوسرے مقام پہ نہیں ہوگی۔ جہاں ہوگی اس کے لیے آپ کو Space کی ضرورت ہوگی۔ Space تو ایک Material (مادی) چیز کے لیے ہوتی ہے۔ خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ کوئی ایک مقام ہے‘ جسے عرش کہتے ہیں‘ وہ وہاں رہتا ہے‘ کسی نے اگر خدا سے ملنا ہو تو اس مقام پر جانا پڑے گا۔ جانے والا بھی میٹریل حیثیت میں جا رہا ہے‘ جسے بجسدِ عنصری کہتے ہیں۔ جسم مبارک کے ساتھ‘ اسی جسم کے ساتھ‘ وہ جا رہا ہے۔ مادی جسم Space (مکاں) میں ہی جائے گا اور جس کے پاس جا رہا ہے‘ وہ بھی ایک خاص مقام پر ہے‘ وہاں جا کر اس سے ملنا ہوگا۔

عام لوگوں کی طرف سے اعتراض اور اس کا جواب

عزیزانِ من! کھٹ سے اعتراض کیا جاتا ہے کہ کیا تم خدا کی قدرت کے قائل نہیں ہو کہ وہ اپنے بندے کو لے جائے۔ یہاں قدرت کا سوال نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے تسلیم کرنے کے بعد خدا کا آپ کے سامنے کیا تصور آتا ہے۔ اس انداز سے خدا خدا نہیں رہتا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ بہ شرفِ نفیس ملاقات ہوئی‘ حضور ﷺ تشریف لے گئے‘ یہ اس لیے ہے کہ اس سے انکار کیا جاتا ہے کہ ایسا مان لینے سے خدا کو ایک خاص جگہ پہ محدود ماننا پڑتا ہے اور اول تو یہ خدا کے تصور ہی کے خلاف ہے۔

قرآنِ حکیم کا خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق ارشاد

قرآن حکیم میں تو مختلف مقامات میں آپ دیکھیں گے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ **اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ** (2:186) میرے متعلق میرے بندے پوچھتے ہیں‘ ان سے کہو: میں کہیں عرشوں پہ نہیں بیٹھا ہوا‘ **اِنِّیْ قَرِیْبٌ** میں‘ پاس ہی ہوں‘ اتنا پاس‘ اس قدر پاس کہ **وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ** (50:16) اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب‘ اس سے اقرب‘ انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب۔ ایک اور ریفرنس لیجیے‘ ویسے تو میں نے عرض کیا ہے کہ پوچھو نہیں‘ کتنی ریفرنسز دی جا سکتی ہے: **هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ** (57:4) تم کہیں بھی ہو‘ خدا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ تو جب نبی اکرم ﷺ مکے میں تشریف رکھتے تھے‘ اس رات تو وہاں بھی‘ اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ تھا۔ ان کے کہنے کے مطابق‘ اگر بیت المقدس میں آئے ہیں‘ تو اس وقت بھی یہاں سے ساتھ تھا‘ جہاں کہتے ہیں وہ تو **هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ** (57:4) تم کہیں بھی ہو‘ وہ تمہارے ساتھ ہے‘ تو جو ہر وقت ساتھ ہے‘ رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے‘ اس کو ملنے کے لیے کسی خاص مقام پر جانا‘ اس تصور کو باطل قرار دے دیتا ہے۔ یہ دو متضاد تصور ہیں کہ جہاں تم ہو‘ وہ تمہارے ساتھ ہے‘ رگِ جان سے بھی قریب تر‘ اور اس کے ساتھ ہی یہ کہ نہیں‘ وہ یہاں نہیں‘ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہے‘ اتنی دور ہے۔ اقبالؒ نے کہا ہے کہ

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تُو نے اے واعظ!
خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے
(بانگ درا)

اپنے بندوں سے اتنی دور، تو اگر ملنے کا امکان ہوا تو ایک نبی اکرم ﷺ کو اور اِن کو خاص اہتمام سے لے گئے، باقی کسی اور کو نہیں۔ یہ معراج کے متعلق تو نہیں بتایا گیا۔

خدا کو دیکھنے کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خواہش کا جواب

باقی بندے تو ایک طرف رہے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام، جن کا ابھی ابھی معراج کی روایت میں یہ مودودی رحمہ اللہ ذکر کر رہے تھے جن کا مقام اتنا بتایا گیا ہے قرآن حکیم نے یہ کہا کہ انہوں نے اس آرزو کا اظہار کیا کہ بات تو تمہاری یہ ہے کہ میں آپ کے جلوہ سے بھی اپنی آنکھوں کو فردوس جنت بنا دوں، ذرا بے نقاب ہو کے تو سامنے آ، کھٹ سے جواب ملا کہ تم نہیں دیکھ سکتے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (6:103) کوئی آنکھ اسے نہیں دیکھ سکتی، وہ ان نسبتوں سے بلند ہے، دیکھ تو محسوس شے کو سکتی ہے، انہیں یہ جواب ملا ہے۔ تو میں نے عرض کیا اور کوئی تو ایک طرف رہا، کسی نبی کے متعلق بھی یہ بات ممکن نہیں کہ خدا بے نقاب اس کے سامنے یوں آ جائے، وہ تو محسوس شے آتی ہے۔ وہاں بھی یہی کہا گیا ہے کہ یہ چیزیں جو ہیں کہ یوں سامنے آ، میں تجھے دیکھ سکوں، یہ کسی محسوس شے کے متعلق کہا جا سکتا ہے، اور خدا تو محسوسات کی نسبتوں سے بلند ہے۔

عرش پر لے جانے کے سلسلہ میں لاحاصل دلائل

عزیزانِ من! اس لیے اس پہ یہ اعتراض پڑتا ہے۔ ایک دوسرے مرحلے کے اوپر کس طرح سے آپ تشریف لے گئے۔ وہ یہی ہے۔ اس میں یہ سوال نہیں کہ خدا کو یہ قدرت حاصل ہے یا نہیں اور پھر ان کے ہاں کے تو صاحب! دلائل پوچھیے نہیں کیا ہوتے ہیں! انہیں تو کوئی تنکے مل جائیں اس کے اوپر سے ہاتھی گزارتے ہیں۔ صاحب! یہ ہوائی جہاز نئے نئے چلے، کہنے لگے: آپ دیکھیے صاحب! کس طرح سے عام انسان زمین سے اتنی بلندیوں کے اوپر چلا جاتا ہے تو اگر اس طرح سے چلا جاتا ہے تو ایک انسان خدا کی قدرت سے عرش پر کیوں نہیں جا سکتا۔ چاند پہ چلے گئے تو پہلے تو خیر انکار ہی کرتے رہے کہ ممکن ہی نہیں ہے، جنہوں نے مانا انہوں نے اسے بحیثیت، بطور دلیل پیش کیا کہ ایک انسان اگر چاند پر جا سکتا ہے تو خدا کی قدرت سے ایک انسان عرش تک کیوں نہیں پہنچ سکتا؟

خدا کے متعلق وہ تصوّر جو قرآنِ حکیم نے پیش کیا ہے دنیا بھر کے اندر کسی شکل میں بھی موجود نہیں

میرے بھائی! بات یہ نہیں ہے کہ خدا کی قدرت سے ایسا ممکن ہے یا نہیں ہے۔ سوال سارا یہ ہے، قرآنِ کریم کی بنیادی عظمت یہ

ہے کہ خدا کا جو تصور قرآن کریم نے دیا ہے' دنیا میں کہیں اور یہ تصور نہیں ملتا۔ عزیزانِ من! اس قسم کا مادی آلائشوں سے منزیٰ اور معریٰ اور بلند اور بالا' ہے: برتر از قیاس وخیال وگمان ووہم۔ یہ تصور اس نے دیا ہے ورنہ ہر مذہب کے اندر آپ دیکھیں گے کہ یہ خدا کو محسوس پیکروں میں' کسی نہ کسی شکل کے اندر لے آئے' کبھی بتوں کی شکل میں آتا ہے' کبھی وہ اوتاروں کی شکل میں آتا ہے' کبھی وہ خدا کے بیٹوں کی شکل میں آتا ہے' کبھی وہ رات میں ان بادلوں میں آتشیں بریت کی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے فرشتوں کے ساتھ اترتا ہے۔ ہر جگہ آپ دیکھیں گے کہ محسوس پیکروں کے اندر وہ خدا سامنے آتا ہے۔ قرآن حکیم کا یہ تصور کہ کوئی آنکھ اس کا ادراک نہیں کر سکتی' اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو' جس جگہ بھی تم ہو' رگِ جان سے بھی قریب تر' اور اس کے بعد کیونکہ محسوسات کی کوئی شے اس میں نہیں ہے۔ آنکھ تو ایک طرف رہی' وہ تو ادراکِ انسانی میں بھی نہیں آ سکتا۔

خدا کا تصوّر تو ادراکِ انسانی میں آ سکتا ہی نہیں

انسان کے ذہن میں بھی وہی چیز آئے گی جو کسی نہ کسی طرح مادی پیکر کی شکل اختیار کر لے تو یہ جو دوسرا مرحلہ میں نے عرض کیا ہے' اس کے خلاف یہ اعتراض پڑتا ہے کہ اس سے خدا کا وہ منزہ اور معریٰ تصور باقی نہیں رہتا جو خدا کے تصور کے بارے میں قرآن حکیم کی خصوصیت ہے۔ کسی خاص مقام پر خدا کا رکھنا اور وہاں جا کر اس کو ملنا' یہ اس کو Space (مکاں) کے اندر محدود کر لیتا ہے' اسے مادی پیکر دے دیتا ہے۔ یہ ہے اس کے خلاف جو اعتراض پڑتا ہے۔

سورۃ النجم میں نبی اکرم ﷺ کے کسی جگہ آنے کا ذکر ہی نہیں لہٰذا اگر اس سلسلہ میں وحی کی ماہیت کو سمجھ لیا جائے تو ساری الجھن ختم ہو سکتی ہے

میں نے عرض کیا تھا' عزیزانِ من! کہ سورۃ النجم تک آنے سے پہلے واقعہ معراج کے لیے جن دو آیتوں کو تائید میں پیش کیا جاتا ہے' ان میں ایک یہ سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت ہے جس میں **سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا** (17:1) کہا ہے اور دوسرا وہاں سے بیت المقدس یا مسجدِ اقصیٰ سے آسمان تک جانا تو میں پہلے وہ جو مروجہ تصور یا عقیدہ جو اس کے متعلق ہے' وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اسے آپ پیش نظر رکھیے۔ اس کے بعد بات سمجھ آ جائے گی کہ سورۃ والنجم میں کیا کہا گیا ہے۔ اس ساری سورۃ میں' نہ نبی اکرم ﷺ کے کہیں جانے کا ذکر ہے' نہ خدا سے ملنے کا ذکر ہے۔ خدا سے جو ملنا ہے' جو ہم کلام ہونا ہے' وہ تو نبوت کے پورے تیئس سال ایسے تھے' جن میں مسلسل ہم کلامی ہوتی تھی' خدا کی طرف سے وحی آتی تھی۔

نبی اکرم ﷺ کو پورے کا پورا قرآن حکیم وحی کے ذریعہ ہی ملا تھا

عزیزانِ من! یہی ایک نبی میں ایک اور سلسلہ رابطہ تھا اور یہ مسلسل قائم تھا' تیئس سال تک رہا۔ اگر اللہ تعالیٰ سے ہی کچھ احکام لینے کے لیے آسمان پہ جانا تھا' جیسے کہا گیا ہے کہ وہاں سے وہ تین حکم ملے' پچاس نمازیں ملیں' سورۃ البقرۃ کی دو آخری آیتیں ملیں تو آپ غور کیجیے کہ یہ تو وحی کے ذریعے تیئس سال سے رسول اللہ ﷺ کو یہ احکام مل رہے تھے سورۃ البقرۃ بھی' باقی قرآن حکیم کی طرح وحی کے ذریعے ہی حضور ﷺ کو ملی تھی۔ اس کی شاید دو سو چھیاسی آیتیں ہیں' یہ باقی بھی ساری وحی کے ذریعے سے ملیں اور آخری دو کے متعلق یہ کہنا کہ براہِ راست حضور ﷺ وہاں گئے تو ملیں' سارے قرآن کریم کے متعلق یہ ہے کہ پورا قرآن کریم وحی کے ذریعے سے ملا۔ یہ بھی وحی کے ذریعے سے ملیں تو یہ ہے وہ قرب جو نبی کو حاصل ہوتا ہے۔

عربی زبان میں نبی کا مفہوم تو مقامِ بلند پر کھڑے ہونے کا ہے

نبی کے متعلق بھی' ہمارے ہاں جیسا میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے' ایک غلط تصور ہے۔ یہ یہودیوں کے ہاں تصور تھا کہ نبی پیشن گوئیاں کرتے تھے اور یہ ان کے ہیکل میں پروہتوں میں سے ایک بہت بڑے پروہت کا منصب تھا کہ وہ پیشن گوئیاں کرتا تھا' قسمتیں بتاتا تھا' تقدیر کے حال بتاتا تھا' وہ اس کو نبی کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ''نبا'' کا جو لفظ ہے' یہ گرامر کی بات چلی جائے گی یا لغت کی۔ یہ جو پیشن گوئیاں کرنے والا ہے' یہ نہیں بتایا ہے۔ اس نے جو ''نبی'' کا لفظ لیا ہے' وہ عربی زبان کا دوسرا مادہ ہے جس کے معنی ہیں مقامِ بلند پہ کھڑا ہوا۔ کہا ہے کہ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى o مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (53:1-2) یہ عظیم سورۃ ہے اور آپ دیکھیں گے کہ یہ جو مقامِ نبوت کی بلندی ہے کس کس انداز سے' کیسے خوبصورت تشبیہات و استعارات سے' قرآنِ کریم نے ادھر کی بات کی ہے کہ جو ذہنِ انسانی میں' ادراکِ انسانی میں' آ نہیں سکتا' وہ اُدھر کی بات ادھر کی زبان میں کس خوبصورتی سے قرآن کریم نے سمجھائی ہے! قرآن حمید کا تو انداز یہ ہے۔

سورۃ النجم مقامِ نبوت کی رفعت کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے' عزیزانِ من! یہ چیز آئندہ درس میں ہمارے سامنے آئے گی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(2:127)

❀......❀......❀

تیسرا باب: سورۃ النجم (آیات 1: مسلسل تا 8)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1982ء کی 15 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم سے ہو رہا ہے۔ یہ 53 ویں سورۃ ہے۔

واقعہ معراج کے متعلق سابقہ دو درسوں کا ملخص نیز مقامِ محمدی ﷺ کے سلسلہ میں سورۃ النجم کا مقام

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ دو درسوں میں اس سورۃ کی تشریح کی تمہید میں، میں نے عرض کیا تھا کہ یہ جو ہمارے ہاں نبی اکرم ﷺ کے معراج کے متعلق مکہ سے بیت المقدس تک جانے کے لیے عام عقیدہ ہے اس کے لیے سورۃ بنی اسرائیل کی پہلی آیت اور پھر وہاں سے آسمانوں کی طرف جانے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے کے لیے سورۃ والنجم کے حوالے دیئے جاتے ہیں۔ اس میں، میں نے دو درسوں میں تشریح سے بتایا تھا کہ حقائق کی رو سے پہلی چیز صحیح نہیں اور عقائد کی رو سے اللہ تعالیٰ کا جو تصور قرآنِ کریم نے دیا ہے، اس کی رو سے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ خدا کو ملنے کے لیے کسی خاص مقام میں جانا پڑتا ہے، وہ تو ہر انسان کے ساتھ ہے اور ہر جگہ ہے۔ کہا ہے کہ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (57:4)۔ بہرحال سورۃ النجم میں درحقیقت مقامِ محمدی ﷺ یا مقامِ نبوت کی تشریح کی گئی ہے۔ یوں تو قرآنِ کریم کا اسلوب اور انداز منفرد اور بے مثال ہے لیکن بعض سورتیں ایسی ہیں جن میں وہ انداز جاذبیت کے اعتبار سے بھی، اور حسن و خوبی کے اعتبار سے بھی، اپنی معراج تک پہنچا ہوا ہے اور جہاں تک میں نے قرآنِ کریم کا مطالعہ کیا اور یہ قریباً پچاس سال سے زیرِ غور ہے، اس کے تحت مجھے یہ سورۃ اس نکتہ نگاہ سے سرفہرست نظر آتی ہے۔

خارجی کائنات کا وہ گوشہ جہاں سے انبیائے کرامؑ کو وحی ملتی تھی اس کا ادراک انسان کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے

قرآن کریم کا تو ہر لفظ قرآن ہے، اس کے اندر ایک ایک لفظ معنی رکھتا ہے۔ اس کا وہ حصہ، جسے ماوراالکائنات کہتے ہیں، اس خارجی

دنیا سے ماورا دنیا ہے اس کے لیے تو ہم کوئی نام بھی تجویز نہیں کر سکتے' اس کا تصور بھی نہیں آ سکتا اور جہاں سے انبیائے کرامؑ کو وحی ملتی تھی تو اس کا ایک حصہ تو اس سے متعلق ہے۔ اب آپ غور کیجیے کہ جو ماورائے کائنات ہے' وہاں کے متعلق ہماری زبان میں کچھ گفتگو ہو رہی ہے تو اس میں کس قدر جامعیت اور ارتکاز ہوگا۔ یہ چیز ہے اس سورۃ کے اندر۔ پھر اس کا اگلا حصہ اس وحی کو نبی اکرم ﷺ نے جس طرح سے اس دنیا میں ایک نظام کی شکل میں متشکل کرنا تھا' وہ حصہ بھی ایک ایک دو دو الفاظ کی آیات پر مشتمل ہے لیکن اس کے اندر پوری جامعیت آ گئی ہے کہ ان خصوصیت کی اس رسالت کے لیے کیا ضرورت ہے۔ میں عرض کر دوں' اسے سمجھنے کے لیے یوں کہیے کہ خدا کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو یا نبی کو جو وحی ملتی تھی' اسے آپ نبوت کہہ لیجیے اور اس وحی کو انسانی دنیا میں ایک عملی نظام کی شکل میں متشکل کرنے کا جو فریضہ تھا' اسے آپ رسالت کہہ لیجیے۔ نبوت کے مقام پہ بھی نبی اکرم ﷺ بلند ترین مقام پر آئے تھے کہ حضور کو آخر مکمل غیر متبدل کتاب دی گئی۔ اس سے پیشتر جتنے انبیائے کرامؑ آئے' ہر ایک کو خدا کی طرف سے وحی اور کتاب ملی' لیکن کسی کتاب کی یہ خصوصیت نہیں تھی کہ وہ آخری کتاب ہو تو اس اعتبار سے میں نے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کو قرآنِ کریم سے مرتب کیا اور اس کا نام بھی میں نے ''معراج انسانیت'' رکھا۔ حضور شرفِ انسانیت کے معراجِ کبریٰ پر فائز تھے اور سورۃ النجم کی تشریح میں نے لگ بھگ تیس سال پیشتر لکھی تھی' اس کا نام بھی میں نے مقامِ محمدی ﷺ رکھا تھا۔ یہ سورۃ نبوت اور رسالت دونوں کی انفرادی خصوصیات اپنے اندر سموئے ہوئے ہونے کی وجہ سے ان کی جامع ہے۔

قرآنِ حکیم کے بیّن تعلیمی حقائق کے وہ بنیادی اوصاف جن کی تلاش میں عقلِ انسانی سرگرداں ہے اور جولین ہکسلے کا بیان

یورپ میں Humanism ❶ کی تحریک کے نشانات تو اب بھی ہیں لیکن وہ آگے چلی نہیں تھی۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ انسانوں کو واقعی کسی مذہب کی تو ضرورت ہے لیکن وہ مذہب وحی یا خدا کی طرف سے آئی ہوئی تعلیم پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس تحریک میں جولین

---

❶ یہ ایک فکری تحریک اٹھی تھی جس کی رو سے کہا یہ گیا کہ اس کائنات کے پیچھے تو یقیناً ایک عظیم قوت ہے جو اسے اس حسن وخوبی سے چلا رہی ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی معاملات کا تعلق ہے' خدا اور اس کی راہنمائی کا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہیں۔ انسانی راہنمائی کے لیے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔ یہ تحریک Humanism کے نام سے متعارف ہے۔ اس تحریک کے علمبردار اسے فکری تحریک تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتے تھے۔ ان مفکرین کا مسلک یہ ہے کہ اُس خدا کو تو مان لیا جائے جس کے قوانین خارجی کائنات میں کارفرما ہیں لیکن اس خدا سے انکار کیا جائے جس کے قوانین انسانی دنیا میں راہ نمائی کا کام دیتے ہیں۔ ان کی یہ روش ایک قسم کا نفسیاتی تضاد (Psychological Contradiction) ہے جس کی رو سے وہ ایک طرف اس تسکین کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان سے نصیب ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ ان پابندیوں سے آزادی چاہتے ہیں جو خدا پر ایمان کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے انہی Humanists کو للکارا ہے۔

ہکسلے (Julian Huxley) ❶ ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا' اس نے کتاب ہی Religion Without Revelation (مذہب وحی کے بغیر) لکھی تھی تو اس نے ایک دعویٰ کیا تھا کہ میں جس قسم کے انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب کی تلاش میں ہوں اس کے متعلق میں چاہتا یہ ہوں کہ اسے ایسے انداز میں پیش کیا جائے' یہ اس کے الفاظ ہیں کہ "جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہوسکیں۔ اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پُر معنی کہ بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو ❷ جائے"۔ قرآنِ کریم میں یہ دونوں خصوصیات موجود ہیں۔ چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین میں جہاں نوشت وخواند تک بھی لوگ محدود تعداد میں تھے' یہ عرب جو اس اعتبار سے دنیا کی پست ترین قوم تھے' وہ قرآنِ کریم کی اولیں مخاطب قوم تھی۔ قرآن کریم جیسے حقائق ان کے سامنے پیش کرنا کہ وہ بھی سمجھ جائیں ایک مشکل کام تھا۔ قرآن کریم تو قیامت تک کے لیے راہنمائی کا ضابطہ ہے' کہ علمِ انسانی جتنی ترقی جی چاہے کرتا چلا جائے' قرآن کریم ان کی امامت کرے گا' تو آپ سوچیے کہ ایک ہی کتاب' جس کی یہ کیفیت ہو' اس کا انداز کس قدر منفرد اور جامع ہوگا۔ قرآنِ کریم کا یہی انداز ہے۔ اب دیکھیے! اسی سورۃ میں ان عربوں کو پہلے یہ سمجھانا ہے کہ رہنمائی کے لیے اس قسم کے نشانات ہونے چاہئیں جو مٹیں نہیں' جو بدلے نہ جائیں' جو دھوکا نہ دیں' جو کہیں ساتھ نہ چھوڑ جائیں۔

عربوں کو قندیلِ آسمانی کی روشنی سے آگاہ کرنے کا قرآنی طریق

عزیزانِ من! اب ان عربوں کو یہ بات سمجھانی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک درس میں غالباً یہ چیزیں ضمناً آئی تھی اور یہاں پھر وہ یقیناً آئیں۔ سورۃ النجم کا تو آغاز ہی اسی سے ہوتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ عربوں کی صحرانوردی کی زندگی ہر صبح سفر' ہر شام سفر' دن کے وقت

---

❶ اسی مصنف کی ایک دوسری کتاب کا نام ہے: Man in the Modern World وہ انسانوں کے خود ساختہ لیکن خدا کی طرف منسوب کردہ مذاہب کے ہاتھوں اس قدر تنگ آچکا ہے' اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایسے مذہب کی تلاش میں ہے جس کی بنیاد وحی پر نہ ہو۔ اسے جس مذہب کی تلاش ہے وہ اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"میرا عقیدہ ہے کہ انسان کے تمام فرائض کو ان چند الفاظ میں سمٹایا جاسکتا ہے یعنی بہت زیادہ زندگی' جتنی اپنے لیے' اتنی ہی اپنے ہمسائے کے لیے۔ میرا یقین ہے کہ مشقت' پریشانیوں اور تکالیف کے ساتھ ہی سہی' انسان اس قابل ضرور ہے کہ وہ ایسا کرسکے۔

جو مذہب اسی اصول کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھے اور پھر انسانی ممکنات اور موانعات دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے' اس نصب العین کو کشادہ نگہی سے تعبیر کرے' وہی مذہب حق وصداقت پر مبنی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ مذہب زندگی کے ساتھ دوش بدوش چلے گا۔ وہ زندگی کی نشوونما کی حوصلہ افزائی کرے گا اور اس کے ساتھ ساتھ خود اس کی اپنی نشوونما بھی ہوتی چلی جائے گی۔ میں اس قسم کے مذہب حیات بخش کا قائل ہوں۔" (Religion Without Revelation, P.113)

❷ یاد رہے یہ جولین ہکسلے نے 22 اگست 1956ء میں نیو یارک میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا۔ حوالے کے لیے دیکھیے: نیو یارک ٹائمز مورخہ 22-08-1956۔

بہت کم کیونکہ وہاں گرمی کی بڑی شدت ہوتی تھی' عام طور پر راتوں کو سفر کرتے تھے۔ صحراؤں میں' جہاں کوئی نشاناتِ راہ ہوتے ہی نہیں تھے' کوئی سڑک نہیں' سڑک پہ کوئی روشنی نہیں' راستے میں کوئی بستیاں نہیں' کوئی گاؤں نہیں' اور سینکڑوں میل لق ودق صحرا چلا جا رہا ہے۔ رات کا وقت ہے' صحراؤں کے نشانات کی یہ کیفیت ہے' کہ آج اگر کسی جگہ کوئی چھوٹا سا ٹیلہ ہے' دوسری صبح ہوا تیز چلی ہے تو اس کی جگہ گڑھا ہو جائے گا' ٹیلہ کہیں اور چلا جائے گا' کہیں اگر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں نظر آتی ہیں تو وہ اتنی تیز بادِ سموم چلے گی کہ وہ ہوا سے ڈھک جائیں' نظر ہی نہ آئیں کہ یہاں کوئی جھاڑی تھی۔ یعنی یہ جو چھوٹے موٹے نشانات بھی وہاں ہوتے تھے' وہ ہر آن بدلتے رہتے تھے۔ اس قسم کے راستوں میں رات کی تاریکیوں میں انہوں نے سفر کرنا ہوتا تھا۔

ان سے پوچھا گیا کہ تم کس طرح سفر کرتے ہو' کہاں سے تمہیں راہنمائی ملتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان ستاروں سے۔ کہا کہ کیا ان ستاروں نے تمہیں کبھی دھوکا دیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کبھی دھوکا نہیں دیا۔ ان سے پوچھا کہ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کبھی ایک جگہ وہ ستارہ تھا' دوسری رات جو تم چلے ہو تو وہ ستارہ وہاں موجود ہی نہیں تھا' کہیں گم ہی ہو گیا تھا۔ کہا کہ وہ تو ایسا بھی نہیں ہوا تھا' نہ دھوکا دیا' نہ ساتھ چھوڑا' آسمان پر تو غیر متبدل مکمل ضابطہ حیات لکھا ہوا ہے۔ کہا کہ راہنمائی دینے والے کی یہ اس قسم کی خصوصیت ہونی چاہیے۔ اب وہ تو تم اپنے سفر کے لیے آسمانی راہنمائی لاتے ہو' انسانی زندگی میں بھی راہنمائی کی ضرورت ہے' تو کہو کہ اگر وہاں بھی اسی قسم کا ایک ضابطہ راہنمائی ملے' جیسے آسمان کے ستاروں کا ہے' تو وہ تمہاری مشکلات کو کس قدر آسان کر دے گا۔ یہ تھی وہ بات جو ان سے کہنی تھی۔ ابتدا یہاں سے کی۔ کہا کہ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (53:1)۔ دو الفاظ ہیں: ایک یہ ستارہ ہے اور دوسرا ہوٰی ہے۔ اب یہ دیکھیے ایک لفظ ہوٰی کے اندر ستارے کا طلوع ہونا' اپنی پوری گذرگاہ سے سفر کرتے ہوئے چلے جانا اور اس کے بعد غروب ہو جانا ہے۔ یہ جو طلوع اور سفر اور غروب کے منازل ہیں' وہ ان کے ہاں اس ایک لفظ ہوٰی کے اندر آ جاتا تھا۔ کہا کہ یہ ستارہ جو طلوع ہوتا ہے' ایک خاص گذرگاہ میں سفر کرتا ہے' ایک خاص مقام پر جا کر غروب ہو جاتا ہے' یہ کس بات کی دلالت کرتا ہے؟ اس کی کہ یہ نہ تو اپنے راستے کے تلاش کرنے میں سرگرداں پھر رہا ہے اور نہ ہی راستہ مل جانے کے بعد بھٹک جاتا ہے۔ کہا کہ یہ بات ہے یہی چیز تم کہتے ہو۔ کہا کہ یہ اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى (53:2) تمہارا یہ رفیقِ سفر جو تمہیں زندگی کے صحیح راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے' نہ تو راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ بھول جانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ کیا ربط ہے کیا بات ہے! وہ سر پٹختے تھے۔

قرآنِ کریم میں نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعارف

وہ عرب' جن کی زبان' جن کی شاعری دنیا کے اندر کسی کو اس کا مثل قرار نہیں دیتی تھی' باقی دنیا کو گونگا کہتے تھے' کہتے تھے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس انداز بیان کو ہم شعر کہیں یا نثر کہیں' یا کیا کہیں۔ کہا کہ یہ پہلی بات ہے جو تم سے کہی ہے کہ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى (53:1)

طلوع ہونے والا ستارہ جب اپنا راستہ طے کرنے کے بعد غروب ہوتا ہے' اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہے کہ اس کے بعد یہ تمہارا صاحب' تمہارا ساتھی' تمہارا رفیق' نہ راستے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے اور نہ ہی راستہ پانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ کیا مقام دیا ہے! یہ مقام امامت کا نہیں دیا' لیڈر شپ کا نہیں دیا' مقام ان کو دیا' رفیق کا ساتھی کا' وہ اس طرح سے جیسے کہ کارواں کے افراد ایک دوسرے کے ساتھی ہوتے ہیں۔ یہ نام دے کر پکارا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ (53:2)۔ ضل کے معنی ہوتے ہیں ''راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرنا'' اور ہویٰ ہوتا ہے ''راستہ پانے کے بعد بھٹک جانا'' جس راستے کے نشانات روز بدلتے ہوں جیسے کہ ان کے ہاں صحرا کے نشانات بدلتے تھے۔ ابھی ابھی میں نے عرض کیا ہے' اس میں تو یہ ہوسکتا ہے کہ ایک دفعہ راستہ مل تو جائے لیکن دوسری صبح اٹھیں تو وہ نشانات گم ہو چکے ہوں یا وہ بدل چکے ہوں' یہ ''غویٰ'' ہوگا' یہ بھٹک جانا ہوگا۔ کہا کہ یہ جس راستے کی طرف تمہاری راہنمائی کرتا ہے' نہ تو یہ راستے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہا ہے' نہ راستہ پانے کے بعد بھٹک گیا ہے۔ صاحب وحی کی طرف سے جو راستہ ملتا ہے' اس کی بنیادی خصوصیت یہ بتا دی کہ وہ اس راستے کو پالیتا ہے اس لیے کہ یہ اس کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہوتا' کہ وہ راستے کی تلاش میں سرگرداں پھرے۔ جس نے خود راستہ تلاش کرنا ہو' وہ تو سرگرداں پھرے گا۔ نبی کی کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ وحی پانے میں یا وحی میں اس کی اپنی کاوش' اپنے خیالات' اپنی خواہشات' اپنی آرزوؤں' اپنی فکر' کا دخل ہی نہیں ہوتا۔ کہا کہ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ نہ وہ راستے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہا ہے' نہ راستہ پانے کے بعد بھٹک گیا ہے' تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) وہ اپنے خیالات سے بات نہیں کرتا' یہ جو کچھ کہتا ہے' اپنی طرف سے نہیں کہتا۔

وحی اور عقلِ انسانی میں فرق کی وضاحت اور پھر عقل کو وحی کے تابع رکھنے کا نتیجہ اور وحی کا پہنچانا

عزیزانِ من! فکرِ انسانی یا عقلِ انسانی کی کیفیت یہ ہے کہ اس کے سامنے جو مواد ہوتا ہے' جو میٹریل ہوتا ہے' جو معلومات ہوتی ہیں' وہ اس کی رو سے کسی فیصلے پہ پہنچتی ہے اور پھر اگلے ہی سانس میں' اگلے ہی دن' اگر ان معلومات میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے' تو اس کے فیصلے میں بھی تبدیلی ہو جاتی ہے۔ انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں:

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

کیا بات ہے اس تراشد کی بھی! اس ❶ کو بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب ملکہ دیا تھا۔ یہ کوئی نقص نہیں ہے' Material Given (دیئے گئے مواد) پر مبنی نتیجہ اخذ کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ تبدیل ہو جائے تو اس کا نتیجہ بھی بدل جائے گا لہٰذا کہا کہ یہ اس طرح سے اپنی عقل و فکر کی رو سے

---

❶ یہ اشارہ مفکر قرآن علامہ محمد اقبالؒ کی طرف ہے۔

یہ راہنمائی نہیں کر رہا بلکہ جس نتیجے پہ چل رہا ہے وہ اس نے اپنی عقل و فکر کی رو سے متعین نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی** (53:3) اپنی فکر سے یہ بات نہیں کرتا، اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ **اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوحٰی** (53:4) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو اس کی طرف آ رہی ہے۔ یہ ویسے ہی ہے جیسے ستاروں کی طرف وحی ہے۔ قرآن کریم نے وحی کا لفظ کہا ہے کہ سماء کی طرف وحی، ارض کی طرف وحی، کائنات کی اشیاء کی طرف وحی، شہد کی مکھی کی طرف وحی کی ہے۔ وحی وہ راہنمائی ہے جو کسی کی اپنی کاوش کا نتیجہ نہ ہو۔ اس قسم کی مکمل اور غیر متبدل ہے کہ جو کہا ہے کہ ستاروں کی طرف بھی وحی ہم نے کی تھی، آسمان کی طرف وحی کی تھی، وہ اسی قسم کی ایک وحی ہے جو اس انسان کی طرف ہم نے کی ہے کہ وہ تم تک پہنچا دے۔

ستاروں کی طرح وحی کی راہنمائی انسان کو یقینی طور پر منزل مقصود تک پہنچا دے گی

اب یہ جو ستاروں کی بات ہے، تم نے ان کی راہنمائی کے مطابق سفر کر کے دیکھ لیا ہے کہ یہ ٹھیک منزل تک پہنچاتے ہیں، دھوکا نہیں دیتے، ساتھ نہیں چھوڑ جاتے۔ جس نے تجربے کے بعد اس پہ پہنچا ہو، اس نے ان کی راہنمائی کا وہ تجربہ نہیں کیا وہ اس سے کوئی استفادہ ہی نہیں کر سکتا، وہ یقین سے کہہ ہی نہیں سکتا کہ فی الواقعہ ان کا بتایا ہوا راستہ منزل تک حتمی طور پہ پہنچا دے گا، دھوکا نہیں دے گا۔ وہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ وہی کہیں گے جنہوں نے تجربہ کیا۔ کہا کہ یہ صحیح بات ہے، یہ بھی ایک راستے کے کچھ ستارے ہیں، کچھ نشاناتِ راہ ہیں، جو وحی دیتا ہے، اس پہ بھی تجربہ کر کے دیکھ لو، وہی طریق عمل جو ان ستاروں کے متعلق تم نے اختیار کیا تھا، وہی طریقِ کار ان نشانات کے متعلق بھی اختیار کر لو، اس کے بعد خود دیکھ لو کہ یہ کس نتیجے پہ تمہیں پہنچاتے ہیں۔

نتائج کے حصول کے لیے اپنے اپنے پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی تجویز

کہا ہے کہ **اعملوا علیٰ مکانتکم انی اعمل** (6:135) اپنے دعوے کی صداقت کی شہادت کا طریق یہ ہے کہ اگر تم یہ کہتے ہو کہ میرا بتایا ہوا پروگرام صحیح منزل پہ نہیں پہنچائے گا، بلکہ اس کے برعکس کہہ رہے ہو کہ تمہارا پروگرام ہی پہنچائے گا، تو کہا کہ اس میں کوئی بحث، مناظرے، جھگڑے فساد کی بات ہی نہیں ہے، تم اپنے پروگرام کے مطابق عمل کرو، میں دخل نہیں دوں گا، مجھے میرے پروگرام کے مطابق عمل کرنے دو، تم دخل نہ دو، نتیجہ خود بتا دے گا کہ کس کا پروگرام انسانیت کے لیے نفع بخش ہے۔ بات صاف ہو گئی۔ تجربہ کرو Pragmatic Test (استنتاجی جانچ) کرو۔ مذہب کی دنیا میں، عزیزانِ من! یہ نہیں ہوتا۔ صداقت کی پرکھ پر، اپنے دعوت کی ثبوت میں یہ طریق بتانا کہ اس پہ عمل کر کے دیکھ لو کہ تم کس نتیجے پہ پہنچتے ہو، ایک بہت ہی بڑی بات ہے۔ مذہب کے ہاں تو یہ سوال ہی نہیں ہوتا، وہاں تو یہ چیز ہوتی ہے کہ Take it for granted جیسا کہا گیا ہے، ویسا کرتے چلے جاؤ۔ ارے بابا! کرنے سے کچھ ہوتا تو ہے نہیں۔ کہا کہ قیامت میں جا کر پتہ چلے گا، تمہیں ثواب ہو رہا ہے، وہاں جا کر جنت ملے گی، یہاں کچھ بھی نہیں یعنی مذہب (Pragmatic) استنتاجی

طریق کہتے ہیں کہ نتیجے سے کسی دعوے کا ثبوت مہیا ہونا' تو مذہب یہ کر ہی نہیں سکتا' وہ کرتا ہی نہیں ہے' اس کے ہاں یہاں نتیجہ ہی نہیں نکلتا۔ یہ دین ہے جو مناظروں سے' مکالموں سے' منواتا نہیں ہے بلکہ کہتا ہے کہ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ (2:111) بات کرنی ہے تو دلیل لاؤ' اور ثبوت مانگتے ہو تو تجربہ کر کے دیکھو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صحیح ہے یا نہیں۔ تجربہ کر کے دیکھو۔ یہ ہے' عزیزانِ من! دین کی خصوصیت' یہ ہے مذہب کے مقابلے میں اس کی حیثیت' اور کیفیت۔ ان عربوں سے جو صرف ستاروں کے سہارے سفر کرتے تھے' یہ کہا کہ وہ جو اس ❶ نے کہا تھا کہ ''عام انسان بھی بات سمجھ لے اور پھر بڑے سے بڑا مفسر بھی اس کو سمجھے''۔ تو عام انسان تو جو اولین مخاطب عرب قوم تھی انہوں نے بات سمجھی۔

کائناتی انکشافات کے سلسلہ میں سر جیمز کی طرف سے کی گئی تحقیق کی اہمیت اور وحی کا بیان

آج اس علم و تحقیق میں جو ہمارا دور' ان ادوار سے بہت آگے ہے اور زیادہ نہیں تو علم الافلاک (Astronomy) سے پوچھیے! یہ کتنا وسیع علم ہے اور اس پہ کتنی بڑی تحقیق ہو رہی ہے۔ اگر کسی نے ابتدائی کتابیں ہی دیکھی ہوں' سر جیمز جینز کی The Mysterious Universe یا The Starry Way of Heavens دیکھیے صاحب! انسان سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک کہکشاں کے ایک ستارے کے یا ایک جھرمٹ کے متعلق' جو کچھ وہ لکھتا ہے' انسان وجد میں آ جاتا ہے۔ تو ایک طرف اس دور کا جو عرب بدو' صحرا نورد تھا' اس نے بھی اس دلیل سے بات سمجھ لی' اور آج تک سر جیمز جینز بھی اسی دلیل سے یہ بات سمجھتا ہے اور اسی نتیجے پہ پہنچا ہے کہ غیر متبدل قانون ہے' جس کی زنجیروں میں ذرے سے آفتاب تک جکڑا ہوا ہے۔ یہ تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو ان علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے ان ''عالموں'' کو کیا معلوم!! ان علوم پر عبور رکھنے والے کہنے لگے کہ ربط باہمی کی یہ کیفیت ہے کہ (مثلاً) ''انگلی ہلاتا ہوں تو کہکشاں کے ستارے پر جا کر اس کا اثر پڑ جاتا ہے۔ کائنات اس قدر مربوط ہے' غیر متبدل قوانین کے تابع چل رہی ❷ ہے۔ یہی بات تو ان عربوں کو ان کی زبان میں کہی گئی تھی۔ آج سر جیمز جینز کی زبان میں یہی بات سامنے آتی ہے۔ اسی لیے تو مورس بکائے وجد میں آ گیا تھا کہ چودہ سو سال پہلے کے زمانے کی یہ جو آیتیں ہیں' جوں جوں ہمارے ہاں سائنس کے انکشافات ہوتے جاتے ہیں' ہر انکشاف ان آیات کے دعوے کی صداقت کا ثبوت بنتا چلا جاتا ہے۔ اس کی کتاب کا تو پوچھو نہیں' وہ شخص وجد میں آ جاتا ہے۔ ہر مثال کے بعد وہ اس چیز کو Repeat (دہراتا) کرتا ہے کہ او دنیا کے سائنسدانوں اور دانشورو! خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ چودہ سو سال پیشتر کوئی انسان اپنی فکر سے یہ بات کہہ ❸

---

❶ یہ اشارہ جولین ہکسلے کی طرف ہے جو اس نے نیویارک ٹائمز کی 22 اگست 1956ء کی اشاعت میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا۔

❷ یہ اشارہ سر جیمز جینز کی طرف ہے۔

❸ اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: Bucaille, Maurice (1998). The Bidle, The Quran and Science, Islamic Book Service, Lahore.

سکتا تھا۔ تو وہ جو سر جیمز جینز نے ایک معیار بتایا تھا کہ ''سطح بیں انسان بھی اس سے راہنمائی حاصل کرے اور بڑے سے بڑا مفکر بھی اس کے انکشافات کی روشنی میں وجد میں آجائے''❶ وہ کس طرح سے پوری ہو رہی ہے۔

قرآن حکیم کے متعلق ہمارا دعویٰ یونہی اعتقادی نہیں ہے۔ ہم اعتقاد میں کیا کریں گے' ہم نے تو اس طرح سے قرآن حکیم کو سمجھا ہی نہیں' پرکھا بھی نہیں' یہ لوگ ان نتائج پر پہنچ رہے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰی (53:4) یہ صرف اس وحی کو بیان کرتا ہے جو خدا کی طرف سے اس کو دی جاتی ہے۔ ستاروں کے متعلق کہ یہ کس طرح تمہاری راہنمائی کرتے ہیں قرآن کریم کی بہت سی آیات ہیں۔ میں نے غالباً پچھلے درس میں وہ آیات بھی پیش کی تھیں' ان کے حوالے بھی پیش کیے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے' ہمیں آگے بڑھ جانا چاہیے۔ احتیاطاً دو تین آیتوں کے صرف حوالے لکھ لیجیے: 6:98,56:75,81:15 اور ان جیسی اور متعدد آیات میں بتایا ہی یہ گیا ہے کہ ستارے کس طرح سے یقینی راہنمائی دیتے ہیں جو غیر متبدل ہوتی ہے' ابدی ہوتی ہے' اور ابدی تو آپ دیکھیے' انسانوں سے پہلے ہی یہ آسمان' یہ ستارے موجود تھے' اس وقت سے لے کر اور پھر معلوم نہیں جب تک' انسان موجود ہے' اس وقت تو یہ موجود ہی ہیں۔ یہ غیر متبدل اس طرح سے ہے کہ یہ اتنا زمانہ جو ہے' اس کو تو ہم Calculate (شمار) بھی نہیں کر سکتے کہ یہ کتنا لمبا ہوگا لیکن وہ اسی طرح سے غیر متبدل طور پر ان کی روشیں ہیں' ان کے نشانات ہیں یہ چیز کہ غیر متبدل ہو' مکمل ہو' اس کی ستاروں کی دنیا سے شہادت بہم پہنچائی اور انسانوں کی دنیا میں' جو وحی پر مبنی قوانین ہیں' اپنے نتیجے کو ان پر منطبق کیا۔ اب آگے بڑھیے' یہ وحی ہے اس حقیقت کے اظہار کے لیے سورۃ النجم میں وحی کے بیان کے بعد کہا ہے کہ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (53:5) نبی کو یہ علم اس خدا نے دیا ہے جو بڑی قوتوں کا مالک ہے۔

مذہب اور دین کی سوچ اور پروگرام میں بنیادی فرق ہوتا ہے

عزیزانِ من! غور کیجیے گا کتنی عظیم حقیقت ہے جو اس میں بیان ہوگئی! نصیحت کی باتیں' اخلاقیات کی باتیں' وعظ و نصیحت کے طور پر ساری دنیا میں ہوتی چلی آرہی ہیں۔ مذہب وعظ ہی کہتا ہے' دین وعظ نہیں کرتا' دین اپنے نظام کو متمکن (Establish) کرتا ہے' مخالفین کی قوتوں کا جواب دیتا ہے' ان سے ٹکراؤ ہوتا ہے' پھر اس نظام کو قائم کرتا ہے' مستحکم رکھتا ہے۔ دین کو تمکن کے لیے قوت کی ضرورت ہوتی ہے' مذہب کو نہیں' تحریکِ پاکستان کے دوران یہی تو سارا جھگڑا تھا۔ کئی دفعہ میں کہہ چکا ہوں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ یہاں ہمیں نماز روزہ حج زکوٰۃ کی اجازت ملتی ہے' نکاح طلاق کی بھی اجازت ملتی ہے' اس کے لیے الگ مملکت کی کیا ضرورت ہے اور الگ طاقت' قوت کی کیا

---

❸ اس کے اپنے الفاظ کا رواں ترجمہ یہ ہے: جو ایک طرف ایسا سلیس اور سادہ ہو کہ عام سطح کے انسان بھی اس سے نفع اندوز ہو سکیں اور دوسری طرف اس قدر عمیق اور پرمعنی کہ بلند پایہ مفکر بھی اس سے مطمئن ہو جائے (نیویارک ٹائمز مورخہ 22/8/1956)

ضرورت ہے۔ٹھیک ہے، ضرورت ہی نہیں لیکن دین کو متمکن کرنے کے لیے تو اپنی مملکت کی بھی ضرورت ہے اور اس مملکت کو قائم رکھنے کے لیے قوت کی بھی ضرورت ہے۔ جہاں عَلَّمَهٗ (53:5) کہا کہ اس نے علم دیا۔ یہاں تک تو معاملہ صرف تعلیم تک کا نظر آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس نے دیا ہے؟ کہا کہ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی (53:5) جس نے دیا ہے وہ بہت بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اس لیے وحی اور وحی کی تعلیم کے بعد قوت نافذہ کی ضرورت ہے:

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

(اقبالؒ)

نظام ربوبیت شروع سے آخر تک بدلتے ہوئے تقاضوں پر یقینی طور پر پورا اترتا ہے: بچے کی غذائیت کے لیے دودھ کی مثال

پھر اگلی بات یہ ہے کہ عربوں کے ان قافلوں کے لیے بھی ضروری نہیں تھا کہ ایک قافلے کو عمر بھر ایک ہی راستے پہ چلنا ہوتا تھا۔ انہیں مختلف مقامات کی طرف جانا ہوتا تھا، مختلف منازل کی طرف سفر کرنا ہوتا تھا، الگ الگ متعدد راستے تھے، منازل الگ الگ تھیں۔ انسانی زندگی کی بھی یہ کیفیت تھی کہ زندگی کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک فرد کی زندگی میں بھی، مختلف عمر میں، اس کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں حتیٰ کہ میں نے شاید پچھلے درس میں یہ بھی کہا تھا کہ یہ تو بچے کے پیدا ہونے کے ساتھ اس کو رزق کے چشموں سے جو دودھ ملتا ہے، شروع میں اس کی غذائیت بہت کم ہوتی ہے، پانی زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا معدہ زیادہ غذائیت، بالخصوص جو Fat (چربی) ہوتی ہے، اسے ہضم نہیں کرسکتا، پانی اس میں زیادہ ہوتا ہے۔ اب تو خیر وہ تخصیص ہی مٹ گئی ہے۔ گوالوں کے ہاں سے جو دودھ آتا ہے، کبھی گاڑھا ہوتا ہے، کبھی پتلا ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ مساواتی فرق ہی مٹا دیا ہے صاحب! پہلے کبھی ایسا ہوتا تھا تو پوچھا کرتے تھے کہ دودھ پتلا کیوں ہے۔ او کہندا ہونداسی جی: اے منجھ تازہ چوئی ہوئی ہے (وہ کہا کرتا تھا کہ جی! یہ تازہ بھینس کا دودھ دھویا گیا ہے) وہ ٹھیک بات تھی اور وہاں تک نہ بھی جائیں، تو گھروں کے اندر جو مائیں بچوں کو دودھ دیتی تھیں، ان کی کیفیت بھی یہی تھی اور یہ ہے اس کی ربوبیت کہ جوں جوں بچے کی عمر بڑھتی چلی جاتی تھی، از خود وہ دودھ گاڑھا ہوتا چلا جاتا تھا، جو از خود اس کی عمر کے ساتھ اس غذائیت کا تقاضا ہے۔ جب اس نے ربوبیت اپنے ذمے لی ہے تو جسے وہ رحمت کہتا ہے، تو اس کے اوپر کنٹرول کی کیفیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی پرورش میں غذائیت کا تقاضا مختلف ہوتا چلا جاتا ہے، اسے خدا کی طرف سے جو غذا دی جاتی ہے اس میں اسی نسبت سے خود بخود تبدیلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ہے اس کی ربوبیت کا نظام۔

خدا تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کی خصوصیات، نظامِ ربوبیت کو عملی شکل میں متشکل کرنے والی ہستی کی خصوصیات

عزیزانِ من! یہ تو ابھی بچے کی زندگی ہے، یہ آگے بڑھتی چلے جائے گی۔ فرد کی پوری زندگی پہ آپ غور کیجیے کہ آپ کی ضروریات کے تقاضے کتنے مختلف ہوتے چلے گئے۔ آپ کی زندگی کتنی مختلف گذرگاہوں سے گزری۔ کہا کہ جب خدا نے اپنے ذمے یہ چیز لی ہے تو یہ نہیں کہ اس نے ایک ہی دفعہ ایک ہی ماپ کی کوئی ایک چیز دے دی ہاں صاحب! ساری عمر اسی پہ گزر کرو۔ کہا کہ نہیں، یہ بات نہیں۔ وہ اگر شَدِیۡدُ الۡقُوٰی (53:5) ہے، اس کے پاس قوتیں ہیں، اس کا کنٹرول ہے، اس کے ساتھ ہی ذُوۡ مِرَّۃٍ (53:6) ہے۔ وہ زندگی کی مختلف گذرگاہوں کا مالک ہے۔

میں نے عرض کیا تھا، عزیزانِ من! ایک ایک لفظ میں معنویت کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ خالی قوت والا جو ہے وہ ایک ہی چیز جانتا ہے: لٹھ، شمشیر، بندوق اور ایک ہی طریقہ جانتا ہے، لیکن جس نے ربوبیت کے تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر دور کے تقاضوں سے واقف ہو اور اس کو اس کے مطابق ربوبیت کا علم اور کنٹرول حاصل ہو۔ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی (53:5) سے، ذُوۡ مِرَّۃٍ (53:6) سے، یہ ہے کہ وہ زندگی کی تمام گذرگاہوں کا مالک بھی ہو، جاننے والا بھی۔ وحی دینے والے خدا کے متعلق یہاں تک آیا۔ اب اس کے بعد وہ نبی آیا جس کو یہ وحی دی گئی تھی اور پھر رسول جس نے اس وحی کے مطابق یہاں انسانی معاشرہ کو متشکل کرنا تھا۔ اس کے بعد نبوت کے متعلق ہے، یوں کہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق ہے، حضور ﷺ کے متعلق ہے، یعنی یہ پہلے چار الفاظ خود خدا کے متعلق ہیں جس نے وحی دی ہے۔ اب آگے وہ رسول آتا ہے جس کو وحی دی گئی اور جس نے اس وحی پر عمل کرنا ہے۔ اس کی پہلی صفت کیا ہے؟ یہاں خدا نے کیا صفت بتائی تھی؟ یہ کہ علم، قوتِ زندگی کے مختلف تقاضوں سے واقف ہو۔ وہ ان ضروریات کا پورا کرنے والا صاحب قوت بھی ہے، اُسے علم بھی ہے۔

مقامِ نبوت میں صفاتِ حسنہ کا تعارف

اس کے بعد اس کے ذمے یہ نظم و نسق بھی ہے۔ اس نے صحنِ چمنِ کائنات کو سنوارنا بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ہستی کے اندر خود کس قسم کی صفات ہونا چاہئیں؟ وہ یہ ہیں کہ اس میں قوت بھی ہونی چاہیے، علم بھی ہونا چاہیے، ربوبیت بھی ہونی چاہیے، رحمت بھی ہونی چاہیے، اُسے زندگی کے مختلف تقاضوں سے واقف بھی ہونا چاہیے۔ یہ دو ہی چیزیں ہیں، اگر آپ لے لیں کہ قوت بھی ہونی چاہیے اور ربوبیت بھی ہونی چاہیے۔ اگر اس کے اندر ایک ہی چیز ہو تو اس فریضے کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔ فریضہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے اندر علم بھی ہو، قوت بھی ہو، ربوبیت بھی ہو، رحمت بھی ہو۔ یہ کچھ ایک ہی ذات کے اندر ہے۔ اگر یہ متضاد کیفیات ہوں اور ان متضاد کیفیات یا خصوصیات یا صفات میں توازن نہ ہو تو وہ فساد برپا کر دے گا۔ اگر قوت بڑھ گئی، چنگیز خاں ہو جائے گا، قوت نہ رہی، کم ہو گئی، اس کے اندر

صرف علم ہی رہا تو وہ مولوی صاحب تو بن جائے گا مگر اس کائنات کے اندر دین کے نظام کو متشکل کرنے والا نہیں بن سکتا۔ اگر قوت ہو اور اس کے ساتھ علم نہ ہو تو پوچھیے نہیں' پھر وہ کیا بنتا ہے۔ اگر اس کا نصب العین رحمت نہ ہو' قوت ہی قوت ہو' تو ہڈیاں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ تو ضرورت ہے کہ اس کے اندر یہ ساری خصوصیات ہوں اور صحیح Proportion (تناسب) بھی ہو۔ یہ آج کے سائیکولوجسٹ سے پوچھیے کہ وہ پروپورشن (تناسب) پہ کتنا زور دیتا ہے۔

دورِ حاضر میں سائیکولوجی کے علم کی اہمیت اور اس کا انکشاف

یہ جتنے جنہیں ہم نفسیاتی امراض کہتے ہیں' پھر بات میں سے بات نکلے گی' ان کی ابتدا ہمارے ہاں تو بیسویں صدی میں جا کر ہوئی یا زیادہ سے زیادہ انیسویں صدی میں ان کی ابتدا ہوئی۔ یہ جو سائیکولوجسٹ تھے' ان کے انکشاف کہیے' یا وضع کردہ کہیے کہ یہ نفسِ انسانی کے اندر کی یہ چیز ہے اور پھر انہوں نے یہ کہا کہ اس نفسِ انسانی کے اندر امراض ہوتے ہیں اور ان نفسیاتی امراض کا علاج یہ نفسیاتی سائیکوجسٹ یا سائیکاٹرسٹ کرتے ہیں چنانچہ اس دور میں اس پر ان کو بڑا فخر ہے اور انسان کو ہونا چاہیے' عزیزانِ من! یہ بڑی چیز ہے۔ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ آئندہ اس کے بعد دور ہی اس کا آنے والا ہے۔ چودہ سو سال پہلے' جس زمانے میں ابھی کسی کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ نفسِ انسانی کوئی اس قسم کی چیز ہے' قرآن کریم نے کہا ہے کہ فِیۡ قُلُوۡبِھِمۡ مَّرَضٌ (2:10) ان کے دلوں کے اندر روگ ہے اور اس کے لیے قرآن کریم ہے۔ کہا ہے کہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ (10:57) دل کے روگوں کا علاج کرنے والا ہے اللہ اکبر!

دلوں کا روگ انسان کے اندر کی صلاحیتوں کے بگڑ جانے کا ہی نام ہے

عزیزانِ من! اُس دور میں کوئی یہ اصطلاح بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ بات کیا کہہ گیا ہے' یہ دل کے روگ کیا ہیں۔ ہمارے ہاں دل کے لیے لفظ قلب ہی تھا Heart ہی ہو سکتا تھا حالانکہ اب تو آپ جانتے ہیں Heart کچھ اور چیز ہوتی ہے۔ سائیکی (Psyche) جو انہوں نے ایک ٹرم اپنے ہاں وضع کی ہے' یہ دل (Heart) سے بالکل مختلف ہے۔ دل کے امراض ہوتے کیا ہیں؟ دل کا مرض ہوتا کیا ہے؟ خیر بات تو لمبی ہے۔ کہا ہے کہ تحت الشعور کے اندر کوئی چبھن ہوتی ہے' گم گشتہ آرزوئیں ہوتی ہیں' پامال تمنائیں ہوتی ہیں' ناکردہ گناہ کی سزائیں ہوتی ہیں۔ بات پھر دوسری طرف چلی جائے گی۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ یہ جو اندر صلاحیتیں ہیں' ان کا توازن بگڑ گیا ہے۔ یہ روگ کی بنیاد ہوتی ہے' ان صلاحیتوں میں Proportion (تناسب) صحیح رہا' وہ Disproprtion (غیر تناسب) ہو گئی ہیں' ان کا توازن برقرار کرنا ہوتا ہے۔ یہ ہے اس کا علاج۔ کبھی سائیکالوجی پہ درس آئے گا تو میں عرض کروں گا کہ پھر قرآن کریم نے کیا کیا علاج کے طریقے بتائے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ کرتے یہی ہیں کہ بگڑے ہوئے توازن کو صحیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں' توازن صحیح ہو جاتا ہے' مرض دور ہو جاتا ہے' تو ان کے نزدیک تو یہی صحیح ہے' یہی تندرست ہے۔ یعنی دل کی طرف سے تندرست وہ ہے جس کے اندر ان متضاد قوتوں کا

توازن صحیح ہو، پروپورشن (توازن وتناسب) صحیح ہو۔

نبی اکرم ﷺ کی حسین وجمیل استویٰ پر مبنی، متوازی شخصیت جو معراجِ انسانیت کی بلند ترین چوٹی پر ارجمند ہے

آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ہاں تو اب حسن یا Beauty کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ وہ صحیح ترین Proportion (تناسب) کا نام ہوتا ہے۔ اگر نہایت حسین وجمیل چہرا بھی ہو مگر انسان کی آنکھ کی سیاہی ایک طرف سے ذرا سی، ایک ذرّے کے برابر، ایک طرف ہوگئی ہو، ذرا Disproportion (غیر متناسب) ہوگئی ہو تو آپ دیکھیے کہ سارا حسن بگڑ جاتا ہے۔ اگر کہیں Perfect Proportion ہے تو وہ شخصیت ہے جو اس معیار پہ پوری اترتی ہے۔ علم اور قوت اور ذُو مِـرَّةٍ (53:6) کے بعد حضور ﷺ کے متعلق فرمایا کہ فَـــاسْتَـــوٰی (53:6) اس رسول کی ذات میں پورا پورا توازن پیدا ہوا اور پاکیزگی سیرت اپنی انتہا تک پہنچ گئے۔ اسے Balanced Personality (متوازن شخصیت) والی شخصیت کہیے۔ دنیا حیران ہے کہ حضور ﷺ نے یہ انقلاب کیسے برپا کر دیا۔ اسے استویٰ کہتے ہیں۔ پھر میں عرض کروں کہ اسے لوگ سمجھیں گے جس کا Proportion (تناسب) بگڑتا ہے، وہ اپنی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ ایک کرسی کے چار پاؤں میں سے، ایک پاؤں کو، ایک ٹانگ کو ذرا باقی تین کے مقابلے میں چھوٹا کر دیجیے، دیکھیے! وہ کرسی ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ کوئی چیز بھی آپ دیکھیے گا، جو توازن کے سہارے کھڑی ہے، اس کے توازن میں ذرا سا فرق پیدا کر دیجیے، وہ کھڑا ہی نہیں رہ سکتا۔ ان عربوں کی عجیب بات تھی، یہ جو استویٰ کا لفظ تھا، یہ وہ تھا کہ جو صحیح طور پر کھڑا ہی نہ رہ سکے، جس کا توازن اس طرح سے بگڑ جائے اور استویٰ والا وہ تھا کہ جس میں یہ توازن، یہ جو مختلف صلاحیتوں کا، قوتوں کا تضاد کا Proportion (تناسب) ہے وہ Proportion (تناسب) اس کی Perfection (اکملیت) تک پہنچی ہوئی ہو، اس کے لیے صاحب یہ استویٰ لفظ آتا ہے۔ حضور ﷺ کی ساری سوانح حیات اس ایک لفظ کے اندر آجاتی ہے، عزیزانِ من! اسے قرآنِ کریم نے فَـــاسْتَـــوٰی (53:6) کہا ہے۔ ٹھیک ہے اپنی ذات میں تو وہ یہ ہوا، کیا بات ہے جو آگے بات آرہی ہے!

دنیائے تصوُّف کی انتہا تارک الدنیٰ کی تاریک راہوں پر متواتر سفر کرنا ہے

عزیزانِ من! اور پھر وقت بھاگتا جا رہا ہے۔ اپنی ذات میں توازن بھی ہو، پروپورشن بھی ہو، حسن بھی ہو، ان خوبیوں کا مالک بھی ہو، اور وہ کہیں الگ تھلگ خلوت گاہوں کے اندر بیٹھا ہوا ہو، آسمان کی بلندیوں پہ ایک طرف کہیں ہو، تو اس کا ہمیں کیا فائدہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

تصوف اور نبوت میں فرق ہی یہ ہے۔ان وادیوں میں سے تو میں گذر ا ہوا ہوں۔وہ اپنے اندر جو کچھ بھی کہیے' جتنی خوبیاں' جتنے جوہر' جتنے کمالات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں' اتنے ہی باقی دنیا سے سمٹتے چلے جاتے ہیں' ترک ترک تارک الدنیا تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ان کی ابتدا ہی دنیا سے الگ ہوتے چلے جانے سے ہوتی ہے۔یہ کمال ہے' اس میں جتنا زیادہ ترک ہو جائے گا' اتنا ہی وہ کمال پہ پہنچتا چلا جائے گا' چلیے! ان کا دعویٰ صحیح کہ ہمارے اندر بھی وہ Proportion (تناسب) ہے' توازن ہے' حسن ہے تو میں نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے' ابن مریم ہوا کرے کوئی۔یہ بڑی عجیب چیز ہے۔

مقامِ نبوت آسمان کی بلندیوں سے اپنا رشتہ استوار کرنے کے بعد انسانیت کی تاریک راہوں کو منوّر کرنے کا عملی پروگرام ہے

عزیزانِ من! اس کا فائدہ کیا ہے۔نبی تو ان بلندیوں پر ہوتا ہے یعنی ان کے ہاں تو جو کچھ بھی یہ کہتے ہیں' مجھے تو اب معلوم ہے کہ وہ ہوتا کیا ہے۔یہ حضرات اسے کشف اور الہام کہتے ہیں۔یہ دوسرا درجہ ہے۔نبی تو اس مقام پہ ہے جو وحی خداوندی کا' علمِ خدوندی کا وحدت ہے۔علمِ خداوندی براہِ راست خدا سے یہاں نبی کے سینے میں پہنچتا ہے' خدا سے یہ علم براہِ راست آتا ہے۔یہ اس مقام کے اوپر یقینی علم ہوتا ہے۔اگر اُس کی بھی یہ کیفیت ہو کہ یہ علم حاصل کرنے کے بعد وہ اسی طرح سے خلوتوں کے گوشوں میں چلا جائے' تو انسانیت کو اس سے کیا فائدہ پہنچے گا؟ اس کی ذات جو کچھ جی چاہے بنتی ہے' بنے' انسانیت کو کیا فائدہ پہنچے گا۔وہ ان بلندیوں پر سے اتر کر انسانوں کی دنیا کی طرف آئے گا۔عزیزانِ من! سنیے دو الفاظ اور پھر کم از کم اگلے درس تک تو اس کے نشے میں رہیے۔وہ یہ بتاتا ہے کہ وہ اتنی بلندیوں کے بعد اس دنیا کی سطح کے اوپر آجاتا ہے۔کیا آپ کے ذہن میں کوئی محسوس تشبیہہ یا کوئی مثال اس کے سمجھانے کے لیے آتی ہے؟ وہ تو خدا ہی کو آتی ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ جہاں یہ آسمان اور زمین ملتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کو افق کہتے ہیں۔وہاں آسمان کی بلندیاں زمین کے ساتھ ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان بلندیوں سے' جیسے کوئی اتر کے زمین کی سطح کے اوپر آگیا ہو' اور مقامِ نبوت کی بلندیاں ہیں اور آگے یہ بتاتا ہے کہ وہ پھر تمہاری دنیا کی سطح پہ آتا ہے۔سنیے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (53:7) آسمان کی بلندیوں سے افق کی وسعتوں میں آگیا ہوا ہو۔

اتر کر حرا ❶ سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

---

❶ غار حرا اور پہلی وحی کے متعلق جو کچھ ہمارے ہاں مشہور ہے اس کا قرآن کریم میں کوئی ذکر نہیں ہے۔یہاں حرا سے مقصود نبوت کا ملنا ہے۔

وہ ہے بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (53:7) اس کے ساتھ ہی وہ علم کی ان بلندیوں پر بھی جا پہنچا جہاں عقل انسانی کی رسائی ناممکن ہے۔ سوچیے عزیزانِ من! میں تو اپنی کیفیت بتاتا ہوں کہ یہ چیز جب تک ذہن میں نہیں تھی' اس کو بیان کرنے کے لیے محسوس شکل میں' کہ اتنی بلندیوں سے اتر کر وہ انسانی دنیا کے اندر یوں آ گیا' اسے کس طرح سے ادا کیا جائے۔ بہرحال زیادہ نہیں تو اپنی بھی یہ کیفیت ہے' لفظوں سے کھیلتے ہوئے افق و بالافق الاعلیٰ کی اس قسم کی کوئی تشبیہ ذہن میں نہیں آ سکتی تھی۔ جی چاہتا ہے کہ یہاں میں تھوڑا سا وقفہ دے دوں۔

خطباتِ اقبالؒ میں تصوّف اور مقامِ نبوت کی وضاحت کے سلسلہ میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ذکر قابلِ غور ہے' نکتہ آغاز سے نکتہ تکمیل تک

اقبالؒ نے اس چیز کو اپنے ہاں بیان کیا ہے۔ وہ اپنے خطبات میں' جو اس کے Six Lectures [1] ہیں' خدا اتنی صلاحیت دے' بڑے مشکل ہیں' فلسفے کے ہیں لیکن اگر فرصت اور صلاحیت ہو تو انہیں ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ ٹھیک ہے قرآن کریم میں آگے بڑھیں گے' بعض مقامات میں آپ کو اختلاف بھی ہو گا لیکن انہیں ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ بہرحال بات میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ تصوف اور رسالت میں فرق کرتے ہیں۔ اس لیکچر کے اندر' ہمارے ہاں ایک حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ بہت بڑے صوفی گزرے ہیں۔ وہ گنگوہی شریف کے تھے' ان کا ایک قول نقل کیا کہ "محمد ﷺ عربی فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔ خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔"

اقبالؒ لکھتا ہے کہ یہ "الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔ تصوف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوت اور تصوف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کر دیں۔ ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لیے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت (واپسی) نوعِ انسانی کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس' ایک نبی کی مراجعت تخلیقی (Creative) مقصد کے لیے ہوتی ہے۔"

اس لفظ کو ذہن میں رکھیے گا' آگے بات آتی ہے کہ "وہ مراجعت تخلیقی مقصد کے لیے ہوتی ہے" آگے کہا ہے کہ "وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کر دے۔ ایک صوفی کے لیے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے۔ لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں جن کا

---

[1] یہ اشارہ علامہ محمد اقبالؒ کے خطبات The Reconstruction of Religious Thought in Islam کی طرف ہے۔ پہلے یہ چھ خطبات (Lectures) تھے۔ بعد میں انہوں نے Is Religion Possible? کے نام سے ساتویں خطبے کا اضافہ کیا۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہو جائے نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔ اسی لیے ایک صاحب وحی کے تجربہ کی قدر و قیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت ابھر کر سامنے آ گئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔''

یہ ہے افقِ اعلیٰ پہ آنے کی بات۔ علم کے بلند ترین سرچشمہ سے وحی پانے کے بعد وہ دنیائے انسانیت کی' عام الفاظ میں' پست سطح کے اوپر آ جاتا ہے کہ اس نے اس زمین کو آسمان بنانا ہوتا ہے: هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (53:7) عزیزانِ من! اگر میں مزید تشریح میں جاؤں تو آسمان سے زمین کی طرف کئی مقامات آئیں گے خود خدا نے یہ چیز کہی ہے۔ یہی جو بات ہے' وہ یوں ہے کہ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (32:5) خدا کی تدبیر' نظامِ خداوندی کی جو رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ سما کی بلندیوں سے اترتا ہے اور پھر زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز کرتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتا ہے نقطۂ تکمیل کی طرف اٹھتا ہے' تکمیل ہوتی ہے۔

وحی کی تعلیم میں علم کی وسعت اور حکمت و دانش دونوں بدرجۂ اتم ہوتی ہیں

یہ جو نیچے اترنا ہے وہ ہے وحی' یہ خارج سے انکشافِ حقیقت کا نام ہے جسے ''نزول'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وحی کی بنیادی خصوصیت اس کی Objectivity ہے۔ اگلا لفظ ہے کہ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (53:7) وہ افق کے اوپر تھے۔ آگے کہا کہ ثُمَّ دَنَا (53:8) پھر وہ اور قریب ہوتا ہے' اور قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جتنے جتنے تصوف کے کمالات بڑھتے ہیں' وہ پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔ یہ آتا ہے تو اور قریب ہوتا چلا جاتا ہے: ثُمَّ دَنَا (53:8) قریب ہی نہیں ہوتا' بلکہ انسانی دنیا اور ان کے معاملات اور ان کے تقاضوں کی گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ کسی کے قریب ہونا اور کسی کے دل میں اتر جانا' آپ سمجھتے ہیں کہ یہ فرق کتنا ہے۔ جوڈ (Joad) نے ایک جگہ لکھا ہے [1] اگر کسی انسان میں علم کی وسعت ہو تو وہ مفکر یعنی فلاسفر ہوتا ہے اور اگر اس میں جذبات کی گہرائی ہو تو وہ تخلیقی نابغہ یعنی Creative Genious ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ علم کی وسعت اور آفاق کی گہرائیوں میں اترنے کی صلاحیت دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ یہ جو میں نے کہا تھا کہ وہ تخلیقی لفظ آیا ہے تو ذہن میں رکھیے گا کہ وہ رسول آتا ہے' ایک تخلیق کرتا ہے' ایک نئی دنیا کی تخلیق ہوتی ہے۔ جب حقائق کی گہرائیوں میں کوئی اترتا ہے' قریب ہوتا ہے' تو صرف محسوسات کے طور پر' علمی نکتہ نگاہ سے' قریب تر ہوتا ہے' پھر وہ

---

[1] اس کے لیے دیکھیے برگسان کی کتاب: The Two Sourees of Religion and Morality۔

حقائق کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہے۔ وہاں اس کو معلوم ہوتا ہے کہ انسانی دنیا کے تقاضے کیا ہیں۔ یہاں آکر وہ Creative Genius برگسان کے الفاظ میں بنتا ہے' ایک نئی دنیا Create کرتا ہے۔

قاب قوسین کا حقیقی مفہوم اور ہمارا مروجہ تصور

سنیئے' عزیزانِ من! اَلْاُفُقِ الْاَعْلٰی (53:7) کے بعد کہا ہے کہ ثُمَّ دَنَا (53:8) اور قریب آ گیا حقائق کائنات سے اور یونہی Perceptibly محسوس طور پہ نہیں بلکہ فَتَدَلّٰی (53:8) گہرائیوں میں اتر گیا۔ ایک ایک لفظ پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہ ان گہرائیوں میں اتر گیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد علم پایا' انسانوں کی سطح پہ آیا' انسانوں کے قریب تر ہوا' ان کے دلوں میں اتر گیا۔ تو کیا بس اپنی بات تک اتنا ہی کچھ کیا؟ کہا کہ نہیں' مقصد تو آگے آتا ہے اور درس کا وقت پورا ہو گیا۔ عزیزانِ من! یہ میں پھر اگلے درس میں عرض کروں گا کہ جو آگے کہا ہے کہ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (53:9)۔ اگلی دفعہ عرض کروں گا کہ یہ قاب قوسین کیا ہے۔ ہمارے ہاں تو اب تک وہ تصور ہی اور ہے کہ اس طرح سے حضور ﷺ بجسدِ عنصری گئے' سامنے خدا تھا' وہاں اس کے سامنے بیٹھے آپس میں باتیں ہوئیں' اور قاب قوسین کے معنی ہوئے کہ خدا کا اور آپ ﷺ کا جو فاصلہ تھا' وہ دو کمانوں کے برابر فاصلہ بھی ماپ لیا گیا۔ فاصلہ تو محسوس شے کے متعلق ہوتا ہے' عزیزانِ من! ہنسیے نہیں' روئیے' جو شے محسوس نہیں ہے Invisible ہے' حتیٰ کہ اس قسم کی محسوس جیسے ہوا ہے' اس میں بھی فاصلہ نہیں ماپا جا سکتا' فاصلے تو محسوس اشیا میں ماپے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ چیز ہے کہ خدا اور رسول اللہ ﷺ اتنے قریب ہو گئے کہ وہ دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا: فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ (53:9)۔ اب آ گئی وہ چیز' وہ ایک تصور پہلے ذہن میں لے آیئے کہ حضور ﷺ محسوس طور پر خدا کے ہاں اس طرح تشریف لے گئے' پھر اس کے بعد باقی ساری چیزیں محسوسات کی دنیا کے اندر یا محسوسات کی زبان میں کہی جائیں گی۔ اس کے معنی قاب قوسین کے لیے اور پھر یہ لفظ تو آپ نے نعتوں کے اندر سنا ہو گا اور وعظوں کے اندر اور میلاد کے اندر سنا ہو گا کہ قاب قوسین' دو کمانوں کے درمیان فاصلہ ہو گیا۔ یہ تمام اگلے درس میں بشرطِ زندگی عرض کروں گا کہ یہ قاب قوسین کیا ہے' یہ سارا کچھ ہونے کے بعد اس کا ماحصل یہ پروگرام ہے کہ حضور ﷺ کا' نبی کا' رسول کا' جو قاب قوسین کے اندر آ گیا' وہ کیا تھا۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

چوتھا باب: سورۃ النجم (آیات 9 تا 13)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1982ء کی 22 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 9 سے شروع ہوتا ہے: (53:9)۔

وحی کی خصوصیات اور نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ

سورۃ النجم کی سابقہ آیات میں ایک تو یہ کہا گیا تھا کہ یہ رسول' جو آپ سے کہتا ہے' یہ اس کے اپنے خیالات کی ترجمانی نہیں ہوتی' یہ خدا کی طرف سے دیا گیا علم ہے' جسے وحی کہتے ہیں۔ وحی کی راہنمائی نہ کبھی کسی کا ساتھ چھوڑتی ہے' نہ کبھی کسی کو دھوکا دیتی ہے۔ یہ اس خدا کی طرف سے ملی ہے' جسے حقائق کا بھی علم ہے اور وہ بڑی قوتوں کا مالک بھی ہے' زندگی کی مختلف گذرگاہوں کا علم رکھتا ہے' اس لیے انسانی زندگی کے انفرادی تقاضے ہوں یا اجتماعی مسائل' کوئی بھی ایسی بات نہیں' جو اس کی نگاہ سے چھپی ہو' اس لیے اس کے متعلق قرآن کریم میں راہنمائی نہ آئی ہو۔ یہ مکمل راہنمائی ہے اور ایسی ہے جو کبھی دھوکا نہیں دے سکتی' کبھی گمراہ نہیں کر سکتی اور یہ رسول' جس کی وساطت سے اس راہنمائی کو دیا گیا ہے' وہ پاکیزگی سیرت اور بلندیٔ کردار کے معراجِ کبریٰ پر فائز ہے۔ جتنی انسانیت کی صفات وحسنات ہو سکتی ہیں' وہ اس کی ذات کے اندر منتج ہیں' اس حیثیت سے ان میں کامل توازن پایا جاتا ہے۔ آج کی اصطلاح میں جسے Balanced Personality (متوازن شخصیت) کہتے ہیں' نہ کوئی خصوصیت حد سے بڑھی ہوئی ہے' نہ کسی میں کمی رہ گئی ہوئی ہے' پورے پورے توازن لیے ہوئے' یہ تمام خصائص انسانیت اس کی ذات میں جمع ہیں۔

خدا کا رسول ﷺ سما سے حاصل کردہ زندگی کے رموز سے حیات انسانی کو جنت ارضی میں بدلنے کا فریضہ سرانجام دیتا ہے

آگے یہ بتایا ہے کہ وہ صرف آسمانی باتیں نہیں کرتا ہے بلکہ اس کا تعلق اس زمین کے مسائل سے بھی ہے اس لیے اس کی مثال یوں سمجھو جیسے یہ افق یا (Horizon) تمہیں نظر آتی ہے کہ آسمان آ کر کس طرح زمین کے لبوں کو چومتا ہے' تو رسول کی یہ خصوصیت بھی عظیم

ہوئی کہ وہ نرا فلاسفر یا نرا صوفی نہیں ہے کہ وہ اپنی ہی ذات اور اپنے ہی تخیلات سے اس کو واسطہ ہے' وہ آسمانِ علم کی بلندیوں کے بعد زمین کی پستیوں کے اوپر آتا ہے کیونکہ اس کا معاملہ انسانی دنیا سے آ کر پڑنا ہے۔ وہ یہاں آتا ہے تو پھر ان معاملات میں قریب تر ہو جاتا ہے' تارکِ دنیا نہیں ہوتا بلکہ اور قریب ہو جاتا ہے' انسانی معاملات کی گہرائیوں میں اتر تا ہے' یہاں تک عزیزانِ من! یہ آٹھویں آیت تک ہم آئے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ رسول کی یہ جتنی صفات' اس کے کردار کی جتنی بلندیاں پاکیزگیاں' اس کے علم کی یہ جتنی وسعتیں گنائی گئیں تو وہ تو یہ ساری چیزیں اس کی ذات میں ہی ہوں گی۔ ٹھیک ہے کہ وہ Perfect (مکمل) ہو' وہ کامل بھی ہو' اعتدال کی بلندیوں پر بھی ہو' حسنات کی خوبیاں بھی اپنے اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی ہوں' تو انسانیت کو اس سے کیا فائدہ؟ یہ وہی ہے جو میں (اسد اللہ خان) غالب کی بات بار بار دہرایا کرتا ہوں کہ

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

واقعہ معراج کے قصے میں خداتعالیٰ اور نبی اکرم ﷺ کے مابین دو کمانوں کے فاصلے کی حقیقت اور مقامِ نبوت

اب اس کے بعد سوال ہوا کہ اس Perfection (اکملیت) یہ پہنچایا ہوا جو رسول تھا' اس کا پروگرام کیا تھا' مقصدِ حیات کیا تھا' اس نے کیا کرنا تھا' اسے کیوں ایسا بنایا گیا؟ یہ اہم سوال ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے اور وہ بات ہے جو اگلی آیت میں آئی ہے کہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (53:9)۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے' عزیزانِ من! کون سی بات عظیم نہیں ہے' جب میں وجد میں آجاتا ہوں تو اس بات کو عظیم کہہ دیتا ہوں۔ قرآن کریم کا تو ہر نقطہ (اور نکتہ) عظیم ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جو احباب ہمارے ہاں مسلسل درس سنتے چلے آرہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ میں قرآنِ حکیم کو قرآن حکیم سے جس طرح سمجھتا ہوں اسے پیش کرتا ہوں۔ اب ہمارے ہاں جو معراج کا تصور چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ اس جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پہ گئے تو وہاں اس کا بھی جو ترجمہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا اور ان کا آپس میں فاصلہ دو کمانوں کے برابر رہ گیا تھا۔ اس خدا کا اور آپ ﷺ کا' یہ اتنے قریب ہو گئے تھے' تو بہر حال یہ عقیدہ چلا آرہا ہے۔ میں عقائد پہ بحث نہیں کیا کرتا' میں تو قرآنِ کریم کو قرآنِ کریم سے جس طرح سمجھتا ہوں اسے پیش کرتا ہوں۔ اس پہ اعتراض یہ پڑتا ہے کہ فاصلہ دو محسوس چیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ تو جسدِ عنصری کے ساتھ تھے' یہ تو محسوس تھے' کیا اس کے مقابلے میں دوسری طرف' جسے وہ کہتے ہیں کہ خدا عرش پہ بیٹھا تھا' اسے بھی ایک محسوس شے تصور کیا جائے کہ دونوں کے درمیان فاصلہ ماپا جائے' بات کیا ہے!!!

رسولوں کی بعثت کا مقصدِ عظیم اور خدائے کریم کی کرم نوازی کا ذکر

میں نے عرض کیا ہے کہ یہاں آگے بات یہ بتائی کہ جو سب کچھ دیا' قرآن کریم کے حقائق دیئے' وہ دینے والا جو ہے' اس کو اس کی

صفات میں، خصائص میں، سیرت میں، کردار میں، اتنی پاکیزگی اور بلندی عطا کی۔ یہ کا ہے کے لیے ہوا، اس سے مقصد کیا تھا؟ کہا کہ یہ قَابَ قَوْسَيْنِ (53:9) تھا۔ میں اس قَابَ قَوْسَيْنِ (53:9) کا کیا عرض کروں۔ اس آیت تک آنے سے پہلے، میں پھر عرض کر دوں کہ رسولوں کی بعثت کا مقصد خود خدا نے کیا بتایا ہے؟ اس کے لیے حضرتِ موسیٰؑ کی داستانِ حیات سامنے لائی گئی ہے۔ وہ داستان خدا نے بڑی تفصیل سے لائی ہے۔ مقام وہ ہے جہاں وہ مدین میں، اپنے بال بچوں کے ساتھ یا اہل کے ساتھ، (ایک ٹھنڈی رات) ، آگ لینے کے لیے، آگ کے نشان پر وہاں پہنچے ہیں اور وہاں انہیں نبوت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس کی تفصیل تو وہاں آئے گی جہاں یہ آیات آتی ہیں۔ میں صرف وہ نکتہ بیان کروں گا جس کے لیے میں نے یہ حوالہ پیش کیا ہے۔ وہاں یہ چیز آئی ہے۔ نبوت تو بہت بڑی چیز ہے۔ حضرتِ موسیٰؑ یہ تو جانتے تھے کہ نبوت کیا ہوتی ہے۔ یہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ ان کو تاجِ نبوت سے سرفراز کیا جائے گا۔ جب وہاں یہ بات آئی تو تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے وہ سر بارگاہِ الٰہی کے اندر جھک گیا کہ یہ تو آپ کا بڑا احسانِ عظیم ہے جو مجھ پہ آپ نے کیا ہے، تو کہا کہ موسیٰؑ! یہ پہلا احسان نہیں ہے جو تم پہ کیا گیا ہے۔ سورۃ طٰہٰ کی یہ آیات بڑی خوبصورت ہیں۔ (20:37) سے یہ بات شروع کیجیے۔ اگر قرآن کریم کے نسخے آپ کے ہیں تو دیکھیے کیا الفاظ ہیں! کہا یہ ہے کہ یہ پہلی بات نہیں ہے۔

پیغمبری کے تاج سے سرفراز ہونا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا

کہا کہ وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰۤى (20:37) ان احسانات کا سلسلہ تو بہت پیچھے سے، تمہاری پیدائش کے وقت سے چلا آ رہا ہے جب تمہارے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ تم فرعون کے محلوں میں پہنچو۔ محکوم اور غلام قوم کا بنی اسرائیل کے گھرانے کا یہ ایک بچہ ہے، آخر میں جا کر اس نے ایوانوں میں، فرعون کی سیاست سے، اپنے اس ماحول کے اندر رہتے ہوئے، ٹکراؤ پیدا کرنا ہے۔ اگر وہ وہاں نہیں رہتا بستا تو اسے پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا کہ محلاتی سیاست ہوتی کیا ہے اور جب اس کا اسے علم ہی نہیں ہو سکتا تھا تو یہ اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ اب اس محکوم قوم کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو، ان معاملات کا عملی تجربہ کرانا مقصود تھا، اس کے لیے اسے فرعون کے محل میں بھیجا گیا، وہاں پرورش ہوئی۔ کہنے لگے کہ موسیٰؑ! یہاں سے بات شروع ہوئی تھی، پھر اس کے بعد یہ نہیں تھا کہ تم نے شہزادہ بننا تھا اور فرعون کے ساتھ، فرعون کی طرح، ایک بادشاہ بننا تھا، تمہیں تو انسانوں کے مسائل اور عوام کے جو مسائل ہیں، ان کو حل کرنا تھا، تو ان کا بھی تو تجربہ ضروری تھا، تو وہاں سے گزار کر تمہیں مدین کے میدانوں میں بھیجا گیا، اور ریوڑ چرانے سے بہترین تجربہ ہوتا ہے۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ وہاں تم نے بارہ برس تک عوام میں زندگی بسر کی، فطرت کی فضاؤں میں زندگی بسر کی، ریوڑ چرائے، ان کے معاملات سنوارے، یہ کچھ کرتا ہوا چلا گیا، تو اور اس کے علاوہ کتنی ہی بھٹیاں تھیں، کتنی ہی کٹھالیاں تھیں، جن میں تمہیں گزارا گیا اور اس طرح سے اس لوہے کو کندن بنایا گیا۔ کیا الفاظ ہیں صاحب! بہت ہی کٹھالیاں تھیں جن میں سے تمہیں گزارا گیا۔ یہ سب کچھ کا ہے کے لیے کیا گیا؟ ٹھیک ہے، ان تمام

کٹھالیوں میں گزرنے سے تمہارے اندر یہ تبدیلی پیدا ہو رہی تھی لیکن یہ کچھ تمہاری خاطر نہیں کیا جا رہا تھا۔ عزیزانِ من! سنیئے وہ جو کہتے ہیں کہ

خدا کے دین کا موسیٰ ؑ سے پوچھیے احوال
آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

ایسے ہی تو اس وقت کوئی تھا' خدا نے کسی جگہ سے پیغمبری دینی تھی' ہاتھ میں رکھا ہوا تھا وہ تاج' یہ وہاں جا نکلے' انہوں نے وہاں آگ دیکھی اور اس کے سر پہ رکھ لیا۔ کوئی اور جاتا' اس کے سر پہ رکھ دیتے۔ وہ یہاں ہمارے ہاں کے (معاذ اللہ) نبی کہتے [1] ہیں کہ میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا۔ لو! یہ خصوصیت ہے نبوت کی۔ یہ سارا کچھ کیوں کرایا گیا؟ یہ سب کچھ کیوں کرایا گیا؟ ان کٹھالیوں میں سے یہ تمام مراحل کیوں طے کرائے؟ کیا لفظ ہے قرآن کریم کا! ان کٹھالیوں میں سے کیوں گزارا؟ کہا کہ ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوۡسٰی (20:40) اس کے بعد کہیں جا کر تم ہمارے معیار پہ پورے اترے۔ آہاہا! ٹھیک ہے جی! معیار پہ پورے اترے' تو کیا حضرتِ موسیٰ ؑ کا کوئی کام رکا ہوا تھا جس کے لیے یہ سارا کچھ بنایا گیا؟ اس طرح سے یہاں یہ ہے۔ کیا بات ہے!

قادرِ مطلق کی طرف سے حضرت موسیٰ کی شخصیت کے چناؤ کا مقصدِ عظیم فرعون کی سرکشی کا سدِ باب کرنا تھا

کہا ہے کہ وَ اصۡطَنَعۡتُکَ لِنَفۡسِیۡ (20:41) اور اس طرح ہم خدائے قادرِ مطلق نے تمہیں اپنے لیے چن لیا۔ کائنات کی ہر شے اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اس کو اس کی کیا ضرورت پڑی ہوئی ہے کہ ایک انسان کو اس کی پیدائش کے زمانے سے تیار کرتا چلا جا رہا ہے' ان مراحل سے گزارتا چلا جا رہا ہے' ان بھٹیوں سے اس کو نکالتا چلا جا رہا ہے' پھر وہ جا کر ایک مکمل انسان بنتا ہے' اور وہ کا ہے کے لیے بنتا ہے؟ خدا کہتا ہے: ہم نے تمہیں اپنے لیے چن لیا۔ سطحی نگاہ سے یوں نظر آتا ہے جیسے اللہ میاں کا کوئی کام معاذ اللہ اٹکا ہوا تھا اور وہ تنہا اس کو کر نہیں سکتا تھا' ایک طرح سے اس ایک رسول کو تیار کیا اور پھر اس کو کہا کہ لو بھئی! یہ ہمارا کام ہے' یہ اب تم کر دو' ہم سے اکیلے نہیں ہو سکتا تھا یا ہم سے ہو نہیں سکتا تھا' تم کر سکتے ہو۔ خدا کے متعلق تو یہ تصور ہی نہیں ہے۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے' رسول کو خدا اپنے کسی کام کے لیے تیار کرتا ہے۔ وہ کیا کام تھا جس کے متعلق کہا کہ ہم نے تمہیں اپنے لیے چن لیا؟ ارشاد فرمائیے۔ کہا کہ اِذۡهَبَاۤ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰی (20:43) جاؤ فرعون کی طرف' وہ بہت سرکش ہو گیا ہے' حدود فراموش ہو گیا ہے' ساحل ناآشنا ہو گیا ہے' اس کی طغیانی نوعِ انسانی کو سیلاب کی طرح بہا کر لیے جا رہی ہے۔ ہم نے تمہیں اپنے لیے چن لیا' فرعون کی طرف جاؤ اور اس کی سرکشی کا جواب دو۔ یہ ہے خدا کا ایک مقصد' جس کے لیے اس رسول کو فرعون کی سرکشی کو روکنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ کا ہے کے لیے ہے؟ محکوم' مغلوب' مقہور' بنی

---

[1] یہ اشارہ (غالبًا) مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف ہے۔

اسرائیل کو اس کے پنجہ استبداد سے چھڑانے کے لیے مقصدِ خداوندی تھا۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ ہم نے چاہا کہ بنی اسرائیل کے اوپر اپنا احسان کریں اور ہم نے پھر یہ انتظام کیا یعنی یہ مشیتِ خداوندی ایسے ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔

انسانوں کی دنیا میں خدا کی مشیت انسانوں کے ہاتھوں ہی بروئے کار آتی ہے

غور کیجیے، عزیزانِ من! اگر خدا کا پروگرام ہو، مشیتِ خداوندی ہو، کسی شے کو بروئے کار لانا ہو تو اس وقت مشیتِ خداوندی وجود میں آجاتی ہے۔ اگر مشیتِ خداوندی یہ تھی کہ فرعون کی طغیانیوں کو ساحلوں کے اندر پابند کیا جائے، بنی اسرائیل کو اس کے استبداد کے پنجے سے چھڑایا جائے، تو اس کے از خود بروئے کار آجانے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی تھی، کیا خدا کی مشیت کے راستے میں کوئی کھڑا ہو سکتا تھا؟ نہیں، قطعاً نہیں۔ اب بات کیا ہوئی؟ بات یہ ہوئی کہ انسانوں کی دنیا میں، خدا اپنی مشیت کو، انسانوں کے ہاتھوں سے پورا کراتا ہے۔ یہ ہے اصل چیز۔ اسے سمجھ لینے سے قرآن حمید کے بے شمار مقامات سمجھ میں آجاتے ہیں۔ منسوب وہ اپنی طرف کرتا ہے کہ ہم نے یہ کیا، ہم نے یہ کیا، ہم نے فرعون کی طغیانیوں کا اُسے مزا چکھایا، ہم نے اس کی تباہی کا سامان کیا، ہم نے اس کے ساتھ یہ کیا، ہم نے یہ کچھ کرنا ہے اور ''ہم نے'' کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک شخص کو اس مقصد کے لیے تیار کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ، جو ہم نے کرنا تھا جا کر وہ کرو۔ اس سے تقدیر کے اس مشکل ترین مسئلے کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔

عزیزانِ من! یہ ارسطو کے زمانے سے لے کے حضور ﷺ کے وقت تک ہی نہیں، آج تک بھی فلاسفروں کے نزدیک لاینحل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ قرآن حمید یوں اس گرہ کو کھول کر رکھ دیتا ہے کیونکہ وہ اس کی مشیت ہوتا ہے اس لیے وہ اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے کہ ہم نے یہ کیا، وہ آ کر خود بخود نہیں کرتا۔ اتنی بڑی قدرت، اتنا بڑا اقتدار رکھنے کے باوجود وہ خود نہیں کرتا، انسانوں کی دنیا میں آ کر وہ اپنی مشیت کو انسانوں کے ہاتھوں سے پورا کراتا ہے۔ کہا کہ موسیٰ! یہ اس کے لیے ہم نے تمہیں تیار کیا ہے۔ یہ میں نے اس لیے یہ عرض کیا ہے کہ یہ اصولی بات سمجھ میں آجائے کہ خدا اپنے پروگرام کو، اپنی مشیت کو، انسانوں کی دنیا میں کس طرح نافذ کرتا ہے۔ یہاں سے رسول کے اور خدا کے تعلق کا پتہ چل گیا کہ خدا کی مشیت اس کے ہاتھوں سے پوری ہوگی۔ یہ ہے دونوں کا تعلق۔ اسے ذہن میں رکھیے۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصدِ عظیم اور جماعتِ مومنین کا کردار

عزیزانِ من! اب آجائیے نبی اکرم ﷺ کی بعثت مقدسہ کی طرف۔ جماعتِ مومنین کی طرف اعلان کیا کہ **وَ كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ** (30:47) مومنوں کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے۔ الفاظ بھی وہ کم درجے کے نہیں ہیں۔ **حَقًّا عَلَيْنَا** کہا ہے کہ مومنوں کی مدد کرنا خدا پر فرض ہے، یہ مدد واجب ہو جاتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر کہیں یہی مومنوں کی جماعت مدد کی محتاج ہو، تو وہ ان کی مدد کرنا تو فریضہ

خداوندی ہے۔ وہ مدد کیسے ہوتی ہے؟ مکے کے مسلمانوں کا، وہاں کی اذیتیں برداشت کرتے کرتے، ایک حصہ تو ایسا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینے چلا گیا، وہاں جا کر انہوں نے اپنی مملکت بھی قائم کر لی، یہ دوسرا حصہ ابھی مکے میں رہ گیا، مکے والے پہلے کچھ کم اذیتیں نہیں دیتے تھے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے ایک گروہ نے وہاں مملکت قائم کر لی ہے، یہ یہاں ہیں، ان کا آپس کا رشتہ ہے، تو آپ سوچیے کہ ان کے ساتھ وہ کیا نہیں کرتے ہوں گے۔ یہ کہا کہ ان مکے کے مظلوم مسلمانوں نے خدا سے فریاد کی کہ ہمارے لیے کچھ انتظام کر، ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے، کوئی ہماری مدد کو آ نہیں سکتا، اور یہاں کی اذیتیں اور تکلیفیں ناقابلِ برداشت ہو گئی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کہا ہوگا کہ تم نے تو کہا ہے کہ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30:47) ہم پر مدد کرنا واجب ہو گیا ہے تو آپ اپنا وہ فریضہ کب ادا کریں گے؟

ہم خاک ہو جائیں گے تم کو خبر ہونے تک

قرآنی نظام میں حکومت وقت کی ذمہ داریوں کا تعین جنہیں خدا تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے

معلوم ہے کہ کیا جواب دیا؟ ان سے کچھ نہیں کہا۔ مدینے کے مسلمانوں سے، جن کے پاس اب اتنا سامان ہو گیا تھا کہ وہ اپنی مدافعت بھی کر سکتے تھے اور دوسرے کی مدد بھی، کہا کہ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (4:75) اُو! تمہیں کیا ہو گیا ہے، ان کی مدد کے لیے اٹھتے کیوں نہیں ہو، وہ خدا سے پکار رہے ہیں: ہماری مدد کر، خدا نے کہہ رکھا ہے کہ ہم پر مومنین کی یہ مدد واجب ہو جاتی ہے۔ وہ پکار رہے ہیں، خدا مدینہ کے مسلمانوں سے کیا کر رہا ہے؟ کہتا ہے: او کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ بات آگے ہے۔ کہا ہے کہ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (4:75) سنتے نہیں ہو کہ وہ وہاں مکے کے مظلوم کس طرح سے ہمیں پکار رہے ہیں کہ اے خدا! یہاں سے نکالنے کا کوئی سامان پیدا کر، یہاں رہتے ہوئے ہمارے لیے کوئی مددگار کہیں پیدا کر، کوئی مدد کا انتظام کر، او سنتے نہیں ہو، مدینے کے مسلمانو! وہ کس طرح ہمیں پکار رہے ہیں اور تم اٹھتے نہیں ہو۔ بات صاف ہو گئی۔ پھر یہ اٹھے، بدر کا میدان آ گیا، وہاں گھمسان کا معرکہ پڑا، تلواریں چلیں، تیر برسے، وہاں مشیت خداوندی کی بات بھی ہوئی کہ یہ کون تلواریں چلا رہا تھا، کون تیر برسا رہا تھا؟ یہ مدینے کے مسلمان تھے، یہی فوج جماعتِ مومنین تھی۔ وہ کچھ سامنے نظر آ رہا تھا لیکن وہ مشیتِ خداوندی تھی جو پوری ہو رہی تھی۔ آپ کو معلوم ہے، جب اس جنگ کو Describe (بیان) کیا ہے تو کیا کہہ کر کیا ہے؟ کہا یہ گیا کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8:17) انہیں تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم قتل کر رہے تھے۔ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (8:17) تم نہیں تیر چلا رہے تھے ہم خود تیر چلا رہے تھے۔

نعت کی دنیا میں غالب کا ایک بلند ترین شعر

پوچھنے والا پوچھتا کہ صاحب! یہ آپ نے ہی قتل کرنا تھا، آپ نے ہی یہ تیر چلانے تھے، تو وہاں ہمیں کیوں کہا تھا کہ اٹھتے کیوں نہیں

ہوئاں کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے۔ یہ تمہیں پکار رہے ہیں تو پھر آپ نے ہمیں کیوں میدانِ جنگ میں بھیج دیا؟ ان کی بھی کیا بات تھی! وہ سمجھتے تھے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں' وہ چیز درس میں آ چکی ہے' (اسد اللہ خاں) غالب کا وہ شعر متعدد بار آ چکا ہے جس کے متعلق میں نے کہا تھا کہ نعت کی دنیا میں کم از کم میری نگاہ سے اس سے بہتر شعر نہیں گزرا۔ وہ یہ مقام ہے' جس کو وہ شخص بیان کرتا ہے۔ یہ شخص شعر کے انداز میں بہت بلند حقائق بیان کر جاتا ہے (اسد اللہ خان) غالب کو یہ چیز نصیب تھی۔ اس کے بعد اقبالؒ کو یہ چیز آئی لیکن (اسد اللہ خان) غالب کا انداز اپنا ہے۔ اس حقیقت کو آپ دیکھیے کہ غالب کن الفاظ میں استعمال کرتا ہے' کیا کہتا ہے:

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است

یہ ٹھیک ہے قضا کے تیر خدا کے ترکش کے اندر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ترکش آپ جانتے ہیں۔ یہ وہ ہے جس کے اندر تیروں کا گٹھا ہوتا ہے' وہاں سے ایک ایک تیر نکال کر چلاتے ہیں:

تیرِ قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
لیکن کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

تیر تو نکلتا ہے خدا کی قضا کا لیکن نکلتا ہے محمد ﷺ کی کمان سے۔

جنتِ ارضی کی تشکیل کے لیے جماعت مومن کی ضرورت اور اس کی اہمیت

عزیزانِ من! یہ کمان نہ ہو تو تیر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ مظلوم پس جاتے ہیں' مقہور پامال ہو جاتے ہیں' ان کی چیخیں کوئی نہیں سن رہا ہوتا۔ براہِ راست خدا کا تیر ترکش سے نہیں نکل رہا' یہ کیوں مظالم ہوتے ہیں' یہ چیز کیوں ہے کہ غریب کی کوئی نہیں سنتا' خدا بھی نہیں سنتا۔ یہ اس لیے ہے کہ محمد ﷺ کی کمان نہیں ہوتی۔ اس لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ ایک جماعت کی ضرورت ہے جو مشیتِ خداوندی کو پوری طرح اپنے دست و گریباں سے پورا کرے۔ یوں مشیت خداوندی کارفرما ہوتی ہے' عزیزانِ من! لیکن کشادِ آں ز کمانِ محمد ﷺ است۔ اب آ جائیے' اس لفظ کمان میں ساری بات واضح کر دی۔ کہا ہے کہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (53:9) رسول ﷺ نے اس طرح سے خدا کے اس پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا پختہ عہد دے دیا' آپ ﷺ کا خدا کے قوانین کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق قائم ہو گیا' اس خدا کے ساتھ کہ جو صاحبِ قوت بھی ہے' علم بھی رکھتا ہے' شدید القویٰ بھی ہے' ذو مرۃ بھی ہے۔ یہ سب کچھ تو وہ خدا ہے لیکن اس کے ساتھ اس رسول کو تیار کیا گیا ہے۔

قاب قوسین او ادنیٰ کے روپ میں خدا اور رسول ﷺ کے باہمی تعلقات کی نوعیت

اب خدا اور رسول کا تعلق کیا ہے؟ وہ یہ ہے' عزیزانِ من: قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (53:9)۔ عربوں کے ہاں یہ روایت چلی آ رہی

تھی کہ دو شخصوں نے جب آپس میں انتہائی رفاقت اور دوستی کا معاہدہ کرنا ہوتا تھا تو اس کی عملی شکل' اس کی محسوس شکل یہ ہوتی تھی کہ وہ دونوں اپنی اپنی کمانیں لیتے تھے' ان کو اکٹھا ایک دوسرے کے اوپر رکھتے تھے اور کمانوں کے نیچے وہ جو چلہ ہوتا ہے' وہ ایک دوسرے کے اوپر آجاتا تھا' وہ ایک ہوجاتا تھا' کمانوں کی قوسیں دو ہوتی تھیں' وہ قوسین ہوتی تھیں' نیچے یہ ایک ہوتا تھا' جسے قاب کہا جاتا تھا' ان دونوں میں سے ایک اس کو کھینچتا تھا' دوسرا کمان کو کھینچتا تھا' وہ تیر چلاتے تھے اور اس کو پختہ تریں رفاقت اور دوستی کا معاہدہ کہتے تھے۔ قاب قوسین کے یہ معنی ہیں: دو کمانیں' ایک چلہ' دو چلانے والے' ایک رفاقت!

خدا تعالیٰ کے ساتھ نبی اکرمؐ کی لازوال رفاقت قاب قوسین سے بھی آگے اوادنیٰ کی ترجمان ہے

عزیزانِ من! کیا بتاؤں کہ قرآن کریم کیا ہے! اور پھر یہ بات ہے کہ جی! وہ کس طرح سمجھ گئے تھے! حضور ﷺ کے زمانے کے اولیں مخاطب جو عرب تھے کہ وہ اس طرح سمجھ گئے تھے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ ہم (اللہ تعالیٰ) نے ان کی زبان میں اسے نازل کیا تھا' یہ ان کی زبان تھی' وہ جانتے تھے کہ قاب قوسین کس کو کہتے ہیں۔ وہ تو روز یہ کرتے تھے۔ خدا اور رسول کا تعلق جو باہمی ہے' وہ اس قسم کی باہمی رفاقت کا تعلق ہے' جس طرح قاب قوسین والے دو دوست آپس میں رفیق بنا کرتے ہیں۔ آگے کہا کہ اَوۡ اَدۡنٰی (53:9) اس سے بھی زیادہ قریب' اوادنیٰ کہہ کر بات اور زیادہ پختہ کی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تو طبعی زندگی میں کسی تلخ تجربے کے بعد توڑ بھی دیں۔ اوادنیٰ کے معنی یہ ہیں کہ یہ جو آپس میں کیا ہوا معاہدہ ہے' یہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ اب بات سمجھ میں آگئی' عزیزانِ من! کہ خدا شدید القویٰ ہونے کے باوجود اپنے پروگراموں کو خود کیوں نہیں تکمیل تک پہنچا رہا تھا' رسول کو ایسا کیوں بنایا گیا تھا' یہ جتنی پہلے صفات سامنے آئی ہیں' یہ ابتــغٰــی تھا' وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ اتر رہا ہے' وہ سمٰوٰت والارض دونوں اس کے ساتھ ہیں' یہ سب کچھ افق اعلیٰ کے اوپر ہے' یہ خدا' یہ اس طرح تیار کردہ رسول' ان کا باہمی تعلق اور قاب قوسین والی رفاقت' اس سے بھی زیادہ اور محکم رفاقت!

خدا تعالیٰ کا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہم کلامی کا سلسلہ صرف وحی کا طریق اختیار کیے ہوئے تھا

اس رفاقت کے بعد' عزیزانِ من! یہ جو معراج شریف کا مسئلہ ہے سارا حل ہوجاتا ہے۔ مجھے افسوس یہ ہوتا ہے کہ ایک آیت ہے جس نے بات ہی ساری واضح کر دی۔ یہ سارا کچھ کرنے کے بعد اگر یہ بات ہو کہ حضور ﷺ خود وہاں موجود تھے خدا سامنے موجود تھا' دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے' تو وہ تو کچھ بات ہی اور تھی' جو ہم نے رسول کو یہ بتا دیا۔ آگے آتا ہے کہ فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی (53:10) اس قسم کا یہ رسول' یہ ہماری مشیت' یہ اس کے پورا کرنے کا طریق' جب یہ اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر ہم نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کر دیا۔ اس طریق سے ہم نے اپنے ''عبد'' (نبی اکرم ﷺ) کی طرف وحی کر دی۔ وحی تو حضور ﷺ پر تیئیس سال ہوتی رہی تھی۔ وحی کے لیے تو عرش پر جانے کی ضرورت نہیں تھی حتیٰ کہ جو پہلی وحی بھی تھی وہ زمین پہ ہی ہوئی تھی۔ تیئیس سال حضور ﷺ کی وحی

زمین پہ ہی ہوتی رہی تو یہ کیا خصوصیت تھی کہ اس کے لیے حضور ﷺ کو وہاں خود جانا پڑتا اور براہِ راست اللہ تعالیٰ سامنے بٹھا کر یہ وحی کرتے!!

پہلے لفظ سے آخری لفظ تک پورے کا پورا قرآن حکیم بذریعہ وحی زمین پر قلب نبوی پر ہی ہوا تھا

کہا ہے کہ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (53:10)۔یہی اوحیٰ ہے جو پہلی آیت کے اندر آیا ہے کہ یہ اپنے خیالات سے کچھ نہیں کہتا بلکہ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (53:4)۔یہ کیا ہے؟ یہ پورا قرآن ہے جو کچھ یہ وحی سے کہتا ہے۔وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں' یہ بھی قرآن ہے۔وحی دینے کی بات ہے اور جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ حضور ﷺ پہ تو تئیس سال وحی ہوتی رہی' اسی زمین پہ ہوتی رہی۔وحی کے اس حصے کے لیے یہ ایک دوسرا طریق اختیار کرنے والی بات کی گئی ہے اور پھر وہاں جو کچھ روایات میں آیا ہے' وہاں وہ جو وحی حضور ﷺ کو ملی جو بھی خدا کی طرف سے اشارات ہوئے' وہ تھے کیا؟ یہ کہ پچاس نمازیں ملیں اور وہ میں نے عرض کیا تھا' اسی روایت کے اندر یہ چیز ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کے کہنے پہ حضور ﷺ بار بار تشریف لے جاتے رہے' آتے رہے' واپس جاتے رہے' اور پھر وہ ہر دفعہ کم ہوتی گئی' کم ہوتی گئی' وہ پانچ تک رہی۔یہ پہلی وحی جو وہاں جا کر بھیجی' اس وحی کی تو یہ صورت ہے اور خدا قرآنِ کریم میں کہتا ہے کہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (10:64) اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی مگر یہ تو پچاس سے پانچ تو وہیں رہ گئیں' اور پھر سورۃ البقرۃ کا کہتے ہیں کہ وہ غالباً آخری دو تین آیات دیں' اس قسم کی دو ایک چیزیں اس وحی کے لیے دیں۔یہ جو وحی کی چیز ہے یہ تئیس سالہ زندگی میں آئی مگر یہاں وحی کا جو طریق تھا یہ دو تین چیزیں کہنے کے لیے اس میں ایک استثنیٰ (Exception) کی جا رہی ہے اور جو وہاں پچاس نمازوں کی کہی جا رہی ہے ان کی کیفیت یہ ہو رہی ہے کہ خدا متعین کرنے والا ہے اور اس کا رسول ﷺ اس تحفے کو لے کر آنے والا ہے' راستے میں حضرتِ موسیٰؑ اس طرح سے ان کو واپس بھیج رہے ہیں' کم ہو رہا ہے' پھر آ رہے ہیں' پھر جا رہے ہیں۔قرآنِ حکیم میں کہا ہے کہ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (53:10) اپنے نبی کو جو وحی دیتے ہیں وہ یہ بات نہیں ہوتی کہ'' آگ لینے کو جاتا ہے پیغمبری مل جاتی ہے''۔کہا یہ ہے کہ وحی کا مہبط جس سینہ مبارکہ کو بننا ہوتا ہے' وہ یہ بات نہیں ہوتی ہے کہ وہ چلے چلتے جو آگ لینے آتا ہے تو اس کو ہم وحی دے دیتے [1] ہیں۔

---

[1] یہ اس شعر کی طرف اشارہ ہے کہ

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

نبی اکرم ﷺ کا مقامِ محمود پر مامور ہونا سیرتِ طیبہ کی معراج ہے

وحی کا یہ سارا کچھ اس مقام پہ ہوتا ہے۔ وہ رسول جس کو وحی کا مہبط بنایا جاتا ہے وہ اتنی عظیم بلندی پر ہوتا ہے' عزیزانِ من! بہرحال ہمارے ایمان کی رو سے اور اب تو باقی دنیا بھی مان رہی ہے کہ جس مقام پر یہ وحی ہے' یہ قرآن ہے' سیرتِ طیبہ کی جن بلندیوں پہ نبی اکرم ﷺ ہیں' دونوں چیزوں کو مغرب کے مستشرقین بھی اب مان رہے ہیں کہ اس کی عالمِ انسانیت میں کہیں مثال نہیں مل رہی۔

بعد از خدا بزرگ تو ای قصہ مختصر

میں نے اسی لیے اپنے حضور ﷺ کی سیرت پہ جو کتاب لکھی' میں نے اس کا نام معراجِ انسانیت رکھا ہے۔ اس سے بلند تر کوئی انسان تصور بھی نہیں کر سکتا لیکن آپ کو پتہ ہے کہ خدا کے ہاں اس کا مقام کیا ہے؟ کہا کہ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (53:10) ان بلندیوں پر جا کر انسان خدا کا عبد بنتا ہے اور یہی سب سے بڑا اشرف ہے' عزیزانِ من! اگر کوئی واقعی مکمل طور پر خدا کی عبدیت کو اپنے اوپر وارد کر لے' تو اس سے بڑے شرف اور سعادت کی تو بات ہی نہیں ہو سکتی۔ یہ جتنی فضیلتیں اور جتنے حسنات ہیں' وہ سارے اس کے صدقے میں آ جاتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ خدا کی عبدیت حاصل کر لی جائے' محکومیت واطاعت اختیار کر لی جائے' اس کے قوانین پر فدا ہو جایا جائے۔ رسول کی حیثیت عبد کی حیثیت ہے اور ہمارے لیے یہ بہت بڑی چیز ہے۔ مقامِ رسالت کے متعلق بھی یہ کہہ دیا کہ رسول اس سے آگے قدم نہ بڑھانا' رسول کریم قدم قدم پہ کہتے رہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ، اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں مگر وحی مجھ پر آتی ہے۔ ادھر سے خدا وحی دینے والا یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا جو مقام ہے وہ ہمارے عبد کا مقام ہے۔ خدا اور رسول کا جو تعلق ہے یا مقامات کی جو نسبت ہے' وہ یہ ہے: یہ رسول خدا کا عبد ہے۔ اب جو رسول ہے' وہ خدا کا عبد ہے' تو باقی جتنے بھی ہیں' وہ کتنے ہی مقاماتِ بلند اپنے لیے کیوں نہ تجویز کر لیں' وہ عبدیت سے آگے تو نہیں جا سکتے' اگر آگے گئے تو خدا کی سند حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ تو رسول کو بھی اپنا عبد کہتا ہے: تا بہ دیگراں چہ رسد۔

لفظ وحی کی خصوصیت اس کی اہمیت اور مقامِ نبوت کی حدود

عزیزانِ من! کہا ہے کہ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰی (53:10)۔ یہ وحی کیا ہے؟ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ النجم سورۃ ہے' صاحب! دو دو لفظوں کی ایک ایک آیت ہے' اس کے اندر کائنات کی حقیقتیں سمٹ کر آ گئی ہیں۔ وحی ❶ کیا ہے! جن کی نگاہ فلسفے پر اور فلسفے کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ جو انسانی تخیلات ہیں' ان سے کچھ پیدا کی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ Illusions بھی ہوتی ہیں'

---

❶ جو زمان ومکان (Time and Space) کے ہر قسم کے اثرات سے مبرّیٰ ہو' اور قلبی وذہنی عواطف ومیلانات کی رنگینی سے معرا۔ اسے وحی کہتے ہیں۔ وحی خارج سے انکشافِ حقیقت کا نام ہے جسے ''نزول'' کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وہ Reality بھی ہوتی ہیں۔ یہ میں نے آپ کو ایک درس میں بتایا تھا۔ عربی زبان کی رو سے بھی اور ادھر سے فلاسفرز کے ہاں سے بھی ایک چیز ہے جس کو انہوں نے Reality (ٹھوس حقیقت) کہا ہے۔ ٹھوس حقیقت ہر آن میں حقیقت ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں، فلسفے میں ایک دوسری چیز ہے جو Illusion کہلاتی ہے کہ وہ نظر تو ایسی آئے جیسی وہ ہے لیکن درحقیقت وہ ایسی نہ ہو، وہ فریب نگاہ ہو، وہ تو خیر ایک اور چیز ہے کہ وہ کس چیز کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے ایک مصرع میں Reality اور Illusion دونوں کو واضح کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں:

حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی ❶

یہ میری Thinking (فکر) کی Creation (تخلیق) نہیں ہے، میری فکر کی تخلیق نہیں ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں یہ حقیقت ہے، یہ Reality ہے۔ ایک تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ وحی حقیقت ہوتی ہے اور حقیقت وہ شے ہوتی ہے جو بدلتی نہیں ہے، معدوم نہیں ہوتی، ابدی ہوتی ہے، ہمیشہ کے لیے ہوتی ہے، ویسی کی ویسی ہوتی ہے اور یہ جو تخیل کی خلاقی ہوتی ہے، وہ ہے:

زماں زماں شکن از آں چہ می تراشد عقل

عقل کی پیدا کردہ جو تخلیق ہے وہ تو قدم قدم پہ بدلتی رہتی ہے، ہر آن بدلتی رہتی ہے افراد میں بھی اور قوموں کی زندگی میں بھی۔ یہی کیفیت تصوف میں کشف اور الہام کی ہوتی ہے۔ وہ انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے، خارجی علم یا خارجی حقیقت نہیں ہوتی، اپنے ذہن کی تخلیق ہوتی ہے۔

وحی کے مقابلے میں تنہا عقل انسانی کی کیفیت اور کشف و الہام کے تصور میں پائی جانے والی بنیادی کمزوری

مجھے پھر درمیان میں ''میں'' لانا پڑتا ہے۔ یہ تو میں خود اپنی واردات بیان کر رہا ہوں، میں خود ان مقامات سے عملاً گزرا ہوا ہوں۔ ایک بات تھی جس سے یہ چیز مجھے بھی کھٹکتی تھی کہ یہ حقیقت نہیں ہے، یہ انسانی خیال کی خلاقی ہے۔ ہمارے ہاں ایک چیز ہوتی ہے کہ کوئی ایک ورد بتا دیا جاتا ہے، ہمارے ہاں اس سلسلے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ رات کو پڑھ کے سوئیے تو نبی اکرم ﷺ خواب میں تشریف لاتے ہیں

---

❶ یہ بالِ جبریل میں، اقبالؒ کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے:

الٹ جائیں گی تدبیریں، بدل جائیں گی تقدیریں
حقیقت ہے، نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

مجھے یہ کچھ وظیفے کا معلوم تھا' اس ورد کا معلوم تھا' ہم کیا کرتے تھے' مختلف قسم کے خاص خاص لوگوں کو' جب وہ آتے تھے تو وہ بتائے جاتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیدار کرنے کے یہ ورد کرو۔ وہ کہتے ہیں کہ خواب میں آتے ہیں۔ کہتے تھے کہ وہ اتنی راتیں پڑھو' اتنے دن پڑھو' یہ تصور ذہن میں قائم کرو۔ وہ دور وہ تھا جس دور میں' میں بھی ان چیزوں کو حقیقت ❶ مانتا تھا کہ وہ آتے ہیں۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ کی زندگی کا وہ حصہ جو تصوف کی وادیوں کی نذر رہوا

میں عرض کر رہا ہوں کہ میری طبیعت فطرت کی طرف مائل تھی' یہ بڑی نقاد واقع ہوئی تھی۔ میں ہر چیز کے اوپر مانتا تھا' مگر وہ ان چیزوں کو اس دور میں ماننا تقلیداً تھا لیکن کھڑا ہو کر سوچتا بھی تھا کبھی یہ جن جن کو یہ کچھ یہ بتایا اور جنہوں نے دیکھا' میں نے ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ حضور ﷺ کو آپ نے خواب میں دیکھا ہے تو کس قسم کی مشابہت تھی' شباہت کیسی تھی' حلیہ کیسا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک کا حلیہ دوسرے سے ملتا ہی نہیں تھا۔ میں عرض کروں گا' مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ تم نے یہ تصوف چھوڑا کیوں تھا؟ یہ چیزیں تھیں۔ یہ میں ان میں سے ایک بات بتا رہا ہوں آپ کو' نہ تو میں کسی چیز کو یوں اختیار کرتا ہوں' نہ اسی طرح سے جھٹک کر چھوڑتا ہوں' میں علیٰ بینات کھڑا ہو گیا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اگر حضور ﷺ ہی خواب میں تشریف لاتے ہیں تو وہ تو ہر ایک کے خواب میں وہی ہونے چاہئیں' اپنے پہ کنٹرول رکھا' میں نے پھر کسی کو کوئی وظیفہ نہیں بتایا لیکن یہ سوچتا رہا کہ یہ تو ہر ایک کے اپنے اپنے تخیل کی خلاقی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کے متعلق ایک بڑھیا کا خواب

تخیل کی اتنی دور سے عمرِ رفتہ کو آواز دینی پڑتی ہے اور اس کی بعض جزئیات ایسی ہیں جن کو میں بھولتا نہیں ہوں۔ ایک گاؤں کی بڑھیا مائی تھی' عزیزہ تھی' پنجابی سمجھنے والے اور جنہوں نے یہ بات دیکھی ہے وہ اس کی داد دیں گے اس بڑھیا نے جو بیان کی تھی' جو حقیقت اپنے الفاظ میں' اس کی تشبیہ تو دیکھیے وہ بتا رہی تھی: میں نے کہا کہ مائی! رنگ کیسا تھا حضور ﷺ کا؟ غور کیجیے گا جن کو یہ ذہن میں بات آتی ہو' وہ Appreciate (پسند) کریں گے۔ کہنے لگی: جس طراں میں رسی ہوئی لسوڑی ہوندی اے نا ایسی طراں دا رنگ سی۔ آہاہاہا! اپنی زبان میں' اپنے مشاہدے میں وہ بھی کیا کہہ گئی۔ ہزار شاعریاں صدقے ہیں اس کے اس تخیل کے اوپر۔ میں نے کہا ہے کہ اس کی داد وہ دے سکتا ہے جس نے کبھی رسی ہوئی لسوڑی دیکھی ہووے' تازہ ہووے تے اجے اُتّے ہی ہووے' پیڑ ٹہنی دے نال لگی ہووے' رسی ہوئی لسوڑی اینوں رنگ سی ❷۔ میں نے کہا: یہ محبت ہے رسول ﷺ کی جو اس کی زبان سے بول رہی ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کا'

---

❶ اس موضوع پر پرویزؒ کی کتاب ''تصوف کی حقیقت'' کا مطالعہ مفید ہے۔

❷ تازہ ہو' اور ابھی ٹہنی پہ ہی ہو اور ہو رسی ہوئی لسوڑی۔ (بس یوں کہو کہ) ایسا ہی رنگ تھا۔

حضور ﷺ کے حسنِ مبارک کا' جو اس کے تخیل میں ہے اس تشبیہہ کے رنگ میں آیا ہے! کتنی خوبصورت تشبیہہ ہے۔

تصوف کی دنیا میں انسانی خواب کا حصہ 40 فی صد ہے؟

میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ اپنے تخیل کی ساری چیزیں' یہ کشف اور الہام' عزیزانِ من! وحی نہیں ہے۔ وحی خارجی حقیقت ہوتی ہے۔ یہ انسان کے اپنے تخیل کی خلاقی نہیں ہوتی۔ انسانی خیالات کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ہر آن بدلتے رہتے ہیں۔

زماں زماں شکند آں چہ می تراشد عقل

انسان خود اپنے خیالات کو بدلتا چلا جاتا ہے اسی طریقے سے' وہ جو کشف اور الہام کی چیزیں ہوتی ہیں' بدلتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے ہاں عام طور پہ تصوف میں بھی خواب کے متعلق کہا جاتا ہے اور جو خواب ہیں انہیں تو نبوت کا چالیسواں حصہ قرار دیا جاتا ہے۔ اب

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جو مرضی کہہ لیجیے' اب اپنے آپ کو نبی کہہ دیا تو پھر وحی کے متعلق بھی جو جی میں آئے کہتے چلے جایئے۔ خواب کی حقیقت ہی کیا ہے؟ ہمارے ہاں تو کسی نے تحقیق ہی نہیں کی۔ جنہوں نے تحقیق کی ہے' انہیں یہ کہہ کر جھڑک دیتے ہیں کہ صاحب! ملحد ہے' کافر ہیں۔ چلیے! ملحد اور کافر کی کسی تحقیق کو بھی دیکھیے یہ آپ کے ہاں جو جو وہ فریبِ نفس ہے اس تحقیق سے اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ سائیکولوجسٹ نے اس پہ تحقیق کی ہے۔ اگر نہ بھی کی ہو تو پھر خواب کا معاملہ آ گیا۔ (اسد اللہ خان) غالب کیا باتیں کر جاتا ہے! یہ شخص کہتا ہے کہ

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

''یہ خیال کو تجھ سے معاملہ'' کیا ہے؟ یہ شخص عجیب ہے۔ اس کے دور میں ابھی خوابوں کے متعلق اتنی نفسیاتی تحقیقات ہوئی نہیں تھیں۔ اب تحقیق ہوئی ہے کہ وہ بھی ایک خیال ہوتا ہے جو خواب میں متشکل ہو کر آتا ہے۔ اگرچہ وہ نفسِ غیر شعوری میں دبا ہوا خیال ہوتا ہے لیکن غور کیجیے' یہ شخص کیا کہہ گیا ہے:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی' نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

لکھ وی ئیں سی پلے (اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا)۔

وحی کی کیفیت انسانی خیالات و تصورات سے ہمیشہ الگ نوعیت کی حامل ہوتی ہے

خواب کی دنیا کے متعلق اگر اجازت دیں تو ذرا نیچے اتر کر تھوڑی سی شگفتگی کی بات بھی کر لوں۔ اس نے خواب میں دیکھا' بکری ہے خریدار آ گیا ہے' یہ سو روپیہ مانگتا ہے' وہ پچاس روپے دیتا ہے' سودا ہوتا چلا جا رہا ہے' ساٹھ ستر تک بات پہنچی' تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ بند

کر کے کہتا ہے: اوتو! چالیس سٹ بھئی! (بھئی! پھینک چالیس روپیہ ہی) لیکن خواب میں دوبارہ آنکھ بند کرنے سے تو ''وہ خواب کبھی آتا ہی نہیں''، اوجیہڑا ہوندا اے۔ یہ ہے جناب کہ

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

قرآن کریم کہتا چلا جا رہا ہے کہ وحی ان چیزوں سے بالکل الگ حقیقت ہوتی ہے۔ وہ تخیل کی خلاقی نہیں ہوتی، وہ تصورات کی دنیا سے تمہیں جو حقیقتیں بن کر دکھائی دیتی ہیں، وہ حقیقت نہیں ہوتیں۔ وہ خوابوں کے معاملے ہوتے۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کہا کہ خواب میں، خیال میں، نگاہ کی فریب کاری میں، جو کچھ نظر آتا ہے، جب وہ چیز نہیں رہتی تو دل اس کی تصدیق نہیں کرتا کہ وہ بات واقعی ٹھیک تھی، دل تصدیق نہیں کرتا۔ وہ نگاہ کا فریب ہوتا ہے۔ فریب کھل جاتا ہے تو دل خود بخود اس کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ ہاں! یہ چیز تو میری آنکھوں کا فریب تھا، ایویں خیال سا، جیا پیاسی (بس یونہی ایک خیال تھا جو در آیا تھا)۔ آپ پنجابی جانتے ہیں اس کی دل تصدیق نہیں کرتا۔ دل تصدیق کرتا ہے کہ وہ چیز نہ رہے، خواب نہ رہے، تو بھی وہ حقیقت اسی طرح سے ہو، وہ تخیل نہ رہے، تو پھر بھی وہ حقیقت اسی طرح سے ہو، پھر وہ اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کا دیکھنا علم ویقین کا دیکھنا ہوتا ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کا دل اس کی کبھی تکذیب نہیں کرتا۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ملنے پر نبی اکرم ﷺ کا دل وجان سے تصدیق کا اظہار

عزیزانِ من! کہا ہے کہ ہم نے اپنے ''عبد'' (نبی اکرم ﷺ) کی طرف اس مقام پہ پہنچ کر وحی کی اور وحی کی کیفیت یہ تھی کہ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (53:11) اس کے دل نے جو کچھ دیکھا اس نے اس کی تکذیب نہیں کی۔ اگر یہ خواب تھا تو خواب کی تصدیق دل تو نہیں کرتا۔ اگر وہ Illusion تھا تو Illusion کی تصدیق دل تو نہیں کرتا۔ دل تو حقیقت کی تصدیق چاہتا ہے اس لیے دو لفظوں میں خواب کو ان تمام تخیلات وتصورات اور اس تصوف کی دنیا اور اس تمام دنیا سے الگ کر دیا: مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (53:11) اس کا ثبوت کیا ہے کہ نبی کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا، اس کے دل نے اس کی تصدیق کی ہے، تکذیب نہیں کی ہے۔ کیا ثبوت ہے؟ ان باتوں سے سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ قرآن کریم یہ کیوں کہہ گیا ہے۔ آنکھ کھل گئی، دیکھا حقیقت تھی، دل نے تصدیق کی، تصدیق کی تو کیا ہوا؟ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ (2:285) سب سے پہلے یہ خود اس بات کے اوپر ایمان لایا کہ یہ واقعی خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی ہے۔ رسول ایمان لایا کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ کہنے کی ضرورت یہ تھی کہ وحی کے بعد بھی یہ بات نہیں تھی کہ رسول نے کہا کہ پتہ نہیں، میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے، وہ واقعہ ہے یا نہیں، وہ حقیقت ہے یا نہیں، اس کے بعد بھی اس نے دیکھا حقیقت ہے، تو حقیقت ہی تھی، تو پھر اس کے اوپر ایمان لایا۔ نبی اس چیز کے اوپر ایمان لایا جو اسے وحی کی گئی تھی۔

قرآن حکیم کے نزدیک وحی کے معاملے میں عقل وشعور کی اہمیت، دلیل و براہین کی اہمیت

کیا بات ہے، صاحب! ایمان کے متعلق تو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ جب خدا کی آیات بھی ان کے سامنے پیش کی جائیں، وہ اندھے بہرے بن کر اس پر نہیں جھک پڑتے، تو ایمان کا تقاضا تو عقل وفکر کی کسی چیز کو ماننے کا ہے، دل تصدیق کرے گا، تو انسان اس طرح سے مانے گا کہ رسول کے اوپر بھی وحی آئی۔ ہمارا ایمان ہے کہ حضور ﷺ کو اس پر ایمان ہوگا لیکن وہ خدا نے جو ایمان لانے کا طریق بتایا تھا اپنی وحی کے متعلق، نبی نے بھی وہ اختیار کیا۔ کہا ہے کہ اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ (2:285) یہ ایمان لایا اس کا ثبوت ہوا کہ مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی (53:11) جو علم نبی کو وحی کے ذریعے دیا گیا اس کی کیفیت یہ نہیں ہوتی کہ آنکھیں جو کچھ دیکھیں دل کو اس کا یقین نہ ہو کہ وہ حقیقت ہے یا فریب نگاہ۔ نبی کی آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، اس کا دل اس کی تصدیق کرتا ہے اس لیے مخاطبوں سے کہا کہ اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی (53:12) جس چیز کو، جس حقیقت کو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر قبول کیا ہے اس کے متعلق تم اس سے جھگڑ رہے ہو۔ ٹھیک ہے Illusion کے متعلق جھگڑو، خواب میں خیال کے متعلق جھگڑو، تخیل کی خلاقی کے متعلق جھگڑو، کشف والہام کے متعلق جھگڑو۔ وہ چیزیں تو اس نے خود دیکھی ہیں، اس کا دل تصدیق کرتا ہے، اور پھر اس کا ثبوت یہ ہے، عزیزانِ من! خواب کی باتوں کو آپ دلیل اور برہان کی رو سے کسی کو نہیں سمجھا سکتے کہ میں اڑتا چلا جا رہا تھا، اوپر چلا گیا اور درمیان میں دیکھا کہ ایک پری آ گئی۔ وہ پھر پوچھے گا کہ میاں! اس کے لیے کوئی دلیل دو، کہنے لگے کہ دلیل یہ ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ نبی اپنی وحی کو جو کچھ پیش کرتا ہے، دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتا ہے، علم وبصیرت کی رو سے منواتا ہے۔ اس لیے کہا کہ تم اس سے جھگڑ رہے ہو جس کے لیے وہ تمہیں دلیل دے رہا ہے یہ تو نہیں کہہ رہا کہ ہاں صاحب! حضرت صاحب نے دیکھیا سی، اسی تکیا سی، اوئے من۔ اوئے من نئیں مندا، جا گھر نوں۔ (دیکھا تھا، ہم نے دیکھا تھا۔ ابے! اسے مان لے، اسے مان لے۔ اگر نہیں مانتے ہو تو جاؤ گھر بیٹھو، ہمیں اسے نہ ماننے سے کیا غرض! مگر) وہ تو یہ نہیں کہتا۔

وحی کے مقابلے میں کشف والہام کا تمام تر تصور دلائل و براہین سے کوسوں دور ہوتا ہے

وہ کہتا ہے کہ ھَاتُوۡا بُرۡھَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ (2:111) جو میں کہتا ہوں، دلیل کی بنا پہ کہتا ہوں، تم اس سے انکار کرتے ہو۔ دلائل لاؤ۔ جو کشف اور الہام اور خواب ہیں، جو تخیلات ہیں، ان کے لیے دلیل نہیں پیش کی جا سکتی۔ یہ وحی کی عجیب دنیا ہے، سرچشمہ وحی کائنات سے ماوراعلمِ وحی حاصل ہوتا ہے، اپنی فکر کا اس میں کوئی دخل نہیں، لیکن جو وحی ہے اس کو خالص فکری طریق کے اوپر پیش کیا جاتا ہے، وہ ہر قسم کے فکری دلائل کے اوپر پورا اترتا ہے، یہ وہ ہے کہ جس کا علم حاصل ہونا، اپنی فکر کی بنیاد پہ نہیں ہے۔ یہ ہے وحی، عزیزانِ من!

کوئی کہاں سے اس کی مثال لے آئے گا۔ وہ جو قرآن کریم کہتا ہے کہ لاؤ اس کی مثل، یہ تو کوئی لا ہی نہیں سکتا۔ کہا ہے کہ عَلٰی مَا یَرٰی (53:12) وہ جو کچھ کہتا ہے آنکھوں دیکھا کہتا ہے۔ یہ اگلی بات ہے کہ تیئیس سال تک یہ وحی حضور ﷺ کو ملتی آئی۔

انسانی خواب کی حقیقت اور اس کا مقام مگر وحی سے الگ

میں نے عرض کیا ہے کہ خواب کی دنیا میں، ایک خواب جو آپ کو آ جائے، آپ لاکھ کوشش کیجیے ہو سکتا ہے کہ اس کے کچھ خدوخال دوسری دفعہ آپ کے پاس آ جائیں مگر وہ آپ کے خواب کی تمام جزئیات دوبارہ ساری عمر کبھی نہیں آتیں محض چند نمایاں چیزیں جنہوں نے تمہارے تخیل کے اندر زیادہ گرفت کی ہو، وہ تو کبھی دوبارہ آتی ہیں، مگر وہ بھی تمام جزئیات کے ساتھ دوبارہ نہیں آتیں۔ یہ جتنی تخیل کی خلاقیاں ہوتی ہیں، Illusions ہوتے ہیں، وہ بھی دوبارہ اس طرح سے نہیں آتے۔ کہا کہ اس میں تو وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی (53:13) اس نے اسے بارِ دگر بھی دیکھا اور فی الحقیقت (لَقَدْ رَاٰهُ) دیکھا ہے۔ اس لیے اس کا یہ دیکھنا خواب کا دیکھنا نہیں۔ وحی خواب نہیں ہوتا۔ حقیقت کا یقینی مشاہدہ ہوتا ہے اور بار بار ہوتا ہے۔

نبی کے علاوہ وحی کے ملنے کے سلسلہ میں کوئی شخص آگہی حاصل کر ہی نہیں سکتا

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس سورۃ کے اندر، یہ ابھی ہم تیرھویں آیت تک ہی آئے ہیں، دو دو لفظوں کے اندر، کیا کیا حقائق کی دنیا مقصود چلی آ رہی ہے۔ وہ حقائق جن کا تعلق میٹا فزکس سے ہے، ماورا الطبیعات سے ہے، اس کا سرچشمہ فلسفے سے، سائنس سے ماورا ہے، ان حقائق کو جاہلیت عرب کی زبان میں بیان کیا جا رہا ہے۔ بنیاد اس کی یہ ہے کہ وہ جو علم ہے وہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی (53:3) یہ جو کچھ کہتا ہے اپنی طرف سے نہیں کہتا، یہ رسول کی اپنی فکر کا نتیجہ نہیں ہے اور جو کچھ وہ وحی دی گئی ہے وہ فکر کے ہر تقاضے کو پورا کرتی چلی جاتی ہے۔ اب یہاں تک تو وہ وحی کے متعلق یہ کچھ کہا۔ اب ایک نبی، جس کو وہ وحی ملتی ہے، اور انسانی عقل میں نے عرض کیا ہے کہ جو وحی کا متن ہے، جو کچھ بھی انسانوں کو دی گئی ہے اس پہ تو اسے دلیل و براہان کی رو سے ہی پیش کیا جاتا ہے، منوایا بھی اسی طرح سے جاتا ہے، یہ بات تو انسانوں کی سمجھ میں آتی ہے۔ وحی کا سرچشمہ کیا ہے؟ وحی ایک انسان کو ملتی کیسے ہے؟ یہ ایک منفرد حقیقت ہے جو صرف نبی کے ساتھ ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان اسے جان ہی نہیں سکتا کیونکہ کسی اور انسان کو اس طرح سے، خارج سے، یہ علم ملتا ہی نہیں ہے۔ جسے وہ علم کہتا ہے، وہ اس کے تحت الشعور میں دبی ہوئی کچھ حقیقتیں ہوتی ہیں، اس کے شعور کی، تخیل کی، خلاقی ہوتی ہے، خواب کی دنیا کے کچھ شواہد ہوتے ہیں، یہ اس قسم کی چیزیں ہوتی ہیں: Will Power کی Concentration سے ہے۔ جس کو ہم کشف یا الہام کہتے ہیں، یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ چیزیں انسان کی دنیا کے ساتھ ہوتی ہیں، انسان کی دنیا میں کوئی بھی ہو، یہ چیزیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وحی کا سلسلہ تو خیر ختم ہو گیا، لیکن اس کے

اوپر Discussion تو جاری رہے گی۔ فلسفہ بہت آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے لیکن یہ بات کسی کی گرفت میں نہیں آسکتی کہ وہ سرچشمہ علم کیا ہوسکتا ہے کہ جس میں انسانی فکر کا کوئی دخل نہ ہو اور اس قسم کے حقائق اس کو براہِ راست ملتے ہوں اور وہ حقیقتیں ہوں' اس کے ذہن کی خلاقی نہ ہو' اس کا تخیل نہ ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں واقعی فلسفہ بھی اس سرچشمے کی تہہ تک نہیں پہنچتا اور عقلِ انسانی وحی کی ایک تاویل پیش کرتا ہے۔ یہ بھی ایک خصوصیت ہے۔

اب درس کا وقت ہوگیا ہے اور اگلی آیت ہے: عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى (53:14) ہمارے روایتی عقیدے کے مطابق کہتے ہیں کہ سدرۃ ایک بیری کا درخت ہے جو اوپر عرشِ معلیٰ کے قریب اگا ہوا تھا۔ بہرحال میں نے عرض کیا ہے کہ میں ان عقائد پر تنقید نہیں کر رہا۔ میرا مقصد تو قرآن حکیم کی حقیقت کو بیان کرنا ہے۔ یہ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى کیا ہے؟ اب وقت ہوگیا' اسے ہم اگلے درس پہ اٹھا رکھتے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

پانچواں باب: **سورۃ النجم** (آیات 14 تا 18)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج اکتوبر 1982ء کی 29 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 14 سے ہو رہا ہے: (53:14)۔

مقامِ نبوت کے سلسلہ میں سورۃ النجم بنیادی خصوصیات کی حامل ہے: گزشتہ سے پیوستہ

گزشتہ کئی درسوں میں یہی سورۃ جلیلہ زیرِ نظر رہی ہے اور آپ نے یہ دیکھا ہوگا کہ جیسا کہ میں نے شروع میں یہ کہا ہے کہ اس سورۃ میں نبوت کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ اسی اعتبار سے میں نے عنوان مقامِ محمدی ﷺ یا مقامِ نبوت ﷺ تجویز کیا تھا۔ دو دو لفظوں کی ایک ایک آیت ہے، مضمون اتنا مشکل، دقیق، عمیق اور گہرائی و گیرائی لیے ہے کہ ذہن میں نہیں آ سکتا کہ اس کے لیے الفاظ کیا تجویز کیے جائیں لیکن یہ تو خدا کے تجویز کردہ الفاظ ہیں۔ ایک ایک لفظ کے اندر آپ نے دیکھا ہوگا کہ معنی کے ذخائر پوشیدہ ہیں۔ بڑا مشکل موضوع ہے۔ نبوت کی خصوصیات، جو ماورائے عقل انسانی ہیں، اسے انسانی الفاظ میں بیان کرنا تو خدا ہی کر سکتا تھا اور پھر قرآن حمید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ان الفاظ کے معنی خود سمجھا دیتا ہے۔

بیان پہلے تو یہ تھا کہ وہ جو نبی ہے وہ یہ نہیں جیسا کہ عام ذہنوں میں تصور ہے کہ آگ لینے کو جائے اور پیغمبری مل جائے، یونہی چلتے چلاتے کہیں سے گئے اور اللہ تعالیٰ نے کسی کو نبی بنانا تھا اور جیسا کہ ہمارے ہاں کے بنے ہوئے نبی کہتے تھے کہ میں نہ آتا تو کوئی اور ہی آیا ہوتا۔ اس سے یہ ملاحظہ فرماؤ۔ نبوت کی خصوصیت وَ اصۡطَنَعۡتُکَ (20:41) ہے، یہ چن لینا ہے؛ یہ نہیں ہے کہ یونہی آگ لینے کو نکلے اور ہم نے نبوت کا تاج رکھ دیا۔ وہ ایک عظیم شخصیت ہوتی تھی۔ اب نبوت کا سلسلہ تو ختم ہوا لیکن حضور ﷺ کی رسالت تو قیامت تک ہے۔ قرآنِ کریم نے ایک لفظ فَاسۡتَوٰی (53:6) استعمال کیا ہے۔ دیکھنے کو تو یہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے اس قدر جامع ہے کہ انسانی ذات کے معراج کبریٰ کی ساری تابانیاں اس کے اندر مرتکز ہو گئی ہیں۔ اس کے مفہوم کے لیے یوں سمجھیں جیسے دورِ حاضر کی

اصطلاح میں پہلی چیز Balanced Personality ہے یعنی وہ ذات جس میں انسانیت کی مضمر صلاحیتیں مکمل طور پر نشوونما پا کر پورے پورے اعتدال اور حسن وتوازن کے ساتھ جمع ہوں' جس میں انسانی قوتیں اور جوہر انتہائی اعتدال کے ساتھ جلوہ فرما ہوں۔ ارتقائے شرف انسانیت میں اس سے بڑا مقام اور کون سا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ پہلی خصوصیت کبریٰ۔ کہا کہ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی (53:7) وہ آسمان کی بلندیوں سے علم لیتا ہے اور زمین پہ اتر کر اس کو عمل میں لاتا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! نبی ﷺ کا وہ علم انسانی دنیا کے حقائق کے ساتھ متمسک ہوتا ہے اور یونہی فرضی طور پر ان کے ساتھ نہیں ہوتا کہ چھوتا ہوا آگے نکل جائے' بلکہ وہ تو انسانوں کے قریب ہوتا ہے' وہ اس دنیا کو بھی دیکھتا ہے جو دوسرے انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس دنیا کو بھی جہاں انسان بستے ہیں۔ وہ علم کی ان بلندیوں پر ہوتا ہے اور ان گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ اس کا تو منصب ہی یہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کا جو پروگرام ہے وہ اس کے ہاتھوں سے برومند ہوتا ہے' نافذ ہوتا ہے' کامیاب ہوتا ہے۔

خدا کا اور اس کا تعلق' باہمی رفاقت کا ہوتا ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ قَابَ قَوْسَیْنِ (53:9) آپ ﷺ کا خدا کے قوانین کے ساتھ انتہائی رفاقت کا تعلق ہوتا ہے اور وہاں اس مقام پہ پہنچ کر کہا کہ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (53:10) جو کچھ خدا نے وحی کرنا ہوتا ہے' وہ اس مقام سے اسے وحی کرتا ہے' اور وہ وحی خواب نہیں ہوتی' تخیل نہیں ہوتا' بلکہ اس کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں' دل تصدیق کر رہا ہے' اور وہ کوئی ایک بار کی بات نہیں ہے کہ ہنگامی طور پر یہ ہو گیا' اور اس کے بعد پھر ختم ہو گیا' یعنی جب آنکھ کھل گئی تو نہ زیاں تھا نہ سود تھا' وہ ایسی بات نہیں ہے' وہ تو اسی نوعیتوں' خاصیتوں' انفرادیتوں' کو ساتھ لیے ہوئے' کئی سال تک مسلسل اور متواتر Repeat ہوتا چلا گیا' اس کے اندر تسلسل تھا' ہنگامی طور پر یہ بات نہیں تھی کہ ایک چمک تھی پیدا ہوئی۔ ذہنِ انسانی میں یہ چیز Genius ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ جس پہ عقل حیران ہو جاتی ہے لیکن وہ کسی ایک وقت اتفاقی طور پہ ایسی صورت ہو جاتی ہے' اس کے خیالات میں ایسا تسلسل نہیں ہوتا مگر یہاں تو تیئیس سال کے عرصے تک' اسی انداز' اسی اسلوب' انہی خاصیتوں کے ساتھ' وہ پیغام چلا آ رہا ہے' کہیں تضاد نہیں' کہیں تزاحم نہیں' کہیں اختلاف نہیں' کہیں اس کی سطح میں پستی نہیں' نشیب نہیں یا فراز نہیں۔ یہ انداز چلا آ رہا ہے۔

لفظ قاب قوسین کی حقیقت اور ہمارے ہاں کے تراجم کی کیفیت

اب اگلی آیت ہمارے سامنے آئی۔ کہا کہ عِنْدَ سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی (53:14)۔ کیا عرض کروں' جو کچھ ہمارے ہاں قرآن کریم کے یہ معنی مسلسل متواتر چلے آ رہے ہیں! آپ احباب اس کو ترجمہ میں دیکھتے ہوں گے' مجھے بھی بیان کرنا ہی پڑتا ہے۔ قَابَ قَوْسَیْنِ (53:9) کہا ہے۔ آپ نے تو یہ ترجمہ دیکھ ہی لیا تھا کہ کہ خدا کا اور رسول کا' ان دونوں میں' اتنا سا فاصلہ رہ گیا تھا جیسا کہ دو کمانوں کا فاصلہ ہوتا ہے گویا خدا وہاں بیٹھا ہوا تھا' حضور ﷺ یہاں بیٹھے تھے اور آپس میں اتنا فاصلہ رہ گیا تھا' قَابَ قَوْسَیْنِ (53:9) کے پھر یہ معنی ہو گئے۔ میں نے وہیں عرض کیا تھا کہ علاوہ' قطع نظر' دیگر اعتراضات کے' یہ فاصلہ دو محسوس چیزوں کے اندر ماپا جاتا ہے۔ ان کے قول کے مطابق

یوں ہے کہ حضور ﷺ بجسدِ عنصری تشریف لے گئے تھے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو سامنے دوسری چیز ہے جس سے فاصلہ ماپا جا رہا تھا' وہ تو خدا تھا' تو وہ بھی ایک محسوس شے تھا' جو فاصلہ ماپا جا رہا تھا۔ وہاں اس کے یہ معنی کیے گئے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ میں اس کے معنی تو انہی عربوں کی زبان سے لے رہا ہوں۔ معاذ اللہ مجھ پہ کوئی وحی نازل نہیں ہوتی' عزیزانِ من! جو میں یہ بات کہتا ہوں لغات کے اندر اس کی سندیں موجود ہیں' قرآن حمید موجود ہے اور ہر لفظ کے معنی کی سند میں نے انہی کے لغات اور انہی کی تفاصیل سے لی ہے۔ (اور یہ تفصیل میری لغات القرآن میں موجود ہے)۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے وحی ملنے کی کیفیت کوئی دوسرا شخص جان ہی نہیں سکتا

اگلی چیز اب آئی۔ وہاں خدا اور رسول کا تعلق تھا۔ اس کے آگے عقلِ انسانی اور وحی کا تعلق آتا ہے۔ وحی کے سلسلے میں ایک تو یہ ہے کہ وہ سرچشمہ علم' جہاں سے وحی ملتی تھی یا جس طریق سے وہ حاصل ہوتی تھی' یہ چیز تو ایک نبی ہی جان سکتا تھا' انسان اسے جان نہیں سکتا' عقلِ انسانی اسے نہیں جان سکتی کہ وہ کیا ہے لیکن وحی کا جو متن (Text) تھا' جو دوسروں تک پہنچایا جاتا تھا' وہ علمِ انسانی' عقلِ انسانی' شعورِ انسانی' بصیرت' فکر' تدبر کی رو سے سمجھ میں آتا تھا لیکن اس کا جو سرچشمہ ہے' کہاں سے ملتا ہے' کیسے ملتا ہے' کیا طریق ہے' وہاں عقلِ انسانی حیرت میں رہ جاتی ہے۔ اس وحی کو سمجھا جا سکتا تھا اور سمجھنے کے بعد اس پہ عمل کیا جا سکتا تھا (اور کیا جا سکتا ہے) عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ زندگی بھی جنت کی زندگی بن جاتی تھی اور وہاں تو جنت کی ہے ہی۔ یہ تھا جو موضوع نظر آتا تھا جہاں یہ کہا تھا کہ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی (53:10) جب یہ ''عبد'' (نبی اکرم ﷺ) اس مقام تک پہنچ گئے تو پھر خدا نے انہیں وحی کی خلعت سے سرفراز کیا' خدا نے اپنے بندے کی طرف وحی کیا جو کچھ کرنا تھا۔ یہ تو وحی کیا گیا' سارا قرآن حمید وحی ہوا۔ یہ تو وہی بات ہے کہ وحی کا جو سرچشمہ یا طریق تھا' یہ کیا تھا' اسے عقلِ انسانی نہیں جان سکتی' یہاں کھڑے ہونے کے بعد عقل کے حصے میں حیرت کے سوا کچھ نہیں آتا' وہاں انسانی نگاہ متحیر و ششدر ہو جاتی ہے' نہیں سمجھ سکتی اس لیے کہ انسان کے نزدیک جو علم کے ذرائع ہیں' وہ سارے ہی محسوس ذرائع ہیں' یا کسی استاد سے پڑھے گا یا کسی کتاب سے پڑھے گا یا کسی سے سنے گا' یا سوچے گا' خود اپنی فکر ہو گی۔ یہ ساری چیزیں محسوسات کی ہیں۔ وحی ایک ایسا علم ہے کہ جو اس صاحب وحی کی فکر کا نتیجہ نہیں' کسی استاد سے نہیں پڑھا' کسی کتاب سے نہیں پڑھا' کسی سے سنا نہیں ہے۔ یہ براہِ راست' خارج سے (Objectively) اسے وہ علم حاصل ہو رہا ہے' جس علم کی مثال لانے سے ساری دنیا کے انسان عاجز اور قاصر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو ایک عجیب قسم کا طریق تھا۔ علمِ انسانی کا یہ جو ذریعہ ہے' عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں ہے' اسے وہ سمجھ ہی نہیں سکتی کہ اس طریق سے علم کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقلِ انسانی کے لیے تحیر کے سوا کوئی شے نہیں' حیرت کے سوا کوئی شے نہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کے تفسیری بیانات کے برعکس اس کا لغوی مفہوم

اور عزیزانِ من! الفاظ آئے ہیں کہ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53:14)۔ آپ تراجم میں تفسیروں میں دیکھیں گے تو لکھا ہوگا کہ وہاں ایک بیری کا درخت تھا اور بہت بڑا درخت تھا۔ یہ وہاں بقول ان کے معراج کی بات ہو رہی ہے۔ وہاں اس آیت میں خدا اور رسول کے درمیان دو کمانوں کا فاصلہ تھا اور وہاں ایک بیری کا درخت تھا۔ یہ اس کی نشانی بتائی۔ میں کیا عرض کروں! وہاں بات یوں ہے کہ عربوں کے ہاں گرمی کے موسم میں، صحرا میں، سفر کرنے والا وہ تنہا کھڑا ہے، سخت تمازت ہے، وہ شعلوں کی لپٹیں ہیں، صحرا سے دور دور تک شعلے اٹھ رہے ہیں، ہم نے تو کبھی صحرا میں گرمی دیکھی نہیں ہے۔ وہ یوں ہوتا ہے کہ وہاں ساری فضا لپکتی کانپتی نظر آتی ہے، اس کے اندر لہریں اٹھتی نظر آتی ہیں، انسان کی جو آنکھ ہے وہاں عاجز آ جاتی ہے، صاف دکھائی نہیں دیتا، چکا چوند ہو جاتی ہیں، وہاں انسان مبہوت کھڑا ہو جاتا ہے، وہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، تحیر ہوتا ہے۔ عرب زبان میں ''سدرۃ انتہائی تحیر اور حیرت کو کہتے تھے''۔ یہ وہ مقام تھا جہاں عقلِ انسانی کے حصے میں انتہائی تحیر اور حیرت (Wonder) کے سوا کچھ نہیں آتا تھا اور وہاں یہ نبی ﷺ کھڑا تھا۔ اس کی نگاہ میں ذرا سی بھی جھٹکی پیدا نہیں ہوئی، آہاہاہا!

ہمارے ہاں پائی جانے والی مذہبی تعلیم نے نوجوان نسل کو ذہنی طور پر متنفر کر دیا ہے اور عالمی سطح پر وحی کی ضرورت کا احساس

کیا بات ہے! کیا عرض کروں قرآنی الفاظ کے چناؤں کا! یہاں سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53:14) کے الفاظ آئے ہیں یعنی حیرت، انتہائی حیرت کا عالم ہے۔ مغرب کی عیسائیت میں، جس قسم کا مذہب تھا، اس کا تو اندازہ ہم خود آپ لگا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی تو مذہب کا جو چرچا ہو رہا ہے، یہ نوجوان طالب علم، نوجوان طبقہ، تعلیم یافتہ، یوں کہیے کہ وہ اس سے برگشتہ ہو رہا ہے، آہستہ آہستہ متنفر ہو رہا ہے، ابھی اس کے دل کے اندر، گہرائیوں میں، یہ چیزیں پرورش پا رہی ہیں، معاشرے کے دباؤ کی وجہ سے ابھی وہ کھل کر زبان پہ نہیں لاتا۔ ذرا دباؤ ہٹے، آپ یہ دیکھیے گا کہ یہ سب کے سب برگشتہ نظر آئیں گے، عیسائیت کے ساتھ یورپ کے اندر یہی ہوا۔ وہ منکر ہو گئے، انہوں نے وحی کا انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس ذریعہ علم کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ ضرورت تو محسوس کی کہ یہ ان کے ہاں مذہب کی ایک تدبیری ضرورت ہے۔ میں نے شاید پہلے بھی بتایا تھا کہ ان کے ہاں Humanism[1] کی ایک تحریک اٹھی تھی۔ یہ بات تو سارے انسانی معاملات حل کرنے کی ہے۔ وہاں اس تحریک کے مشہور مفکر کی ایک کتاب آئی: Religion without Revelation۔ یہ اس تحریک کے ایک مشہور مفکر جولین ہکسلے کی کتاب کا نام ہے۔ Humanism میں یہ تو اٹھی تھی۔ ٹھیک ہے کہ مذہب کی تو ضرورت ہے

---

[1] اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ انسانی معاملات کا خدا اور اس کی راہنمائی سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسان کو اپنے معاملات عقل کی رو سے طے کرنے چاہئیں۔ انسانی راہنمائی کے لیے عقل سے بلند کوئی سرچشمہ نہیں۔ اس تحریک کے علمبردار اسے فکری تحریک تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے، وہ اسے ایک مذہب کی حیثیت سے اختیار اور رائج کرنا چاہتے تھے۔

لیکن (بقول ان کے) وحی والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی' وہ خالص عقل کی رو سے معاملات کا حل چاہتے تھے وہ ردِعمل تھے اس مذہب کا' جو وہاں عیسائیت نے ان کے سامنے پیش کیا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرنے پایا تھا' ہماری اس صدی کے اندر ہی وحی کی اس ضرورت کو محسوس کر لیا گیا۔ میں یہاں انہی کے ہاں کے مذہب پرست طبقہ کا ذکر نہیں کر رہا اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ آج وہاں کے بڑے بڑے سائنس دان' بڑے بڑے فلاسفرز' بڑے بڑے مورخین' خود اس مقام پہ پہنچے ہیں کہ تنہا عقلِ انسانی کے ذریعے انسانی معاملات کا حل نہیں مل سکتا۔ اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔

علامہ پرویزؒ کی سعی و کاوش کے خلاف مذہبی پیشوائیت کا منفی کردار' اس کا نتیجہ اور انسان نے کیا سوچا؟

عزیزانِ من! اتنا وقت تو نہیں ہے کہ میں تفصیل سے ان کے اقوال پیش کروں۔ یہ میری کتاب ہے' اس کا نام ہے: ''انسان نے کیا سوچا؟'' میری مشکل یہ ہے کہ جب کبھی بھی ''میں اور میری'' کی طرف آتا ہوں' تو مجھ میں ایک طبعی انکسار ہوتا ہے' جی نہیں چاہتا کہ میں اپنی بات کروں' لیکن ضرورتاً یہ بات کہنی پڑتی ہے۔ عزیزانِ من! ہمارے اس دور تک میں جو کچھ ابتدا سے آخری منزل تک انسانی فکر کے متعلق لکھوں گا' وہ یہ بات ہوگی کہ اس فکرِ انسانی کی دنیا آگے نکل چکی ہوگی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے اور ادھر اس مذہبی پیشوائیت نے خاص پروگرام کے تحت یہ کیا ہے کہ یہ جو میں نے فکرِ انسانی یا فکرِ اسلام دی تھی' اس پہ انہوں نے شجرۃ الذقوم بنا کر اس طرح سے Red Paint بنایا کہ کوئی اس کے قریب نہ آنے پائے۔ قوم کی بڑی محرومی ہے۔

عزیزانِ من! یہ نوجوان طبقہ اس وقت اسلام کو سینے سے لگائے ہوئے پھرتا ہے۔ اگر انہیں یہ چیزیں پڑھائی جاتیں' تو وہ خود پوچھتا کہ وحی اس معاملے میں کیا کہتی ہے۔ اب تو اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ معاشرے پر قدامت پرستی اتنی مسلط ہوگئی ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ اب اس کے بعد اس زنگ کو کھرچنے کے لیے کتنی صدیاں درکار ہونگی لیکن بہرحال میری یہ جو باتیں ہیں' کیونکہ یہ تو ذریعہ ایسا ہے' جس میں انہیں محفوظ رہنا ہی ہے' ممکن ہے کہ جو آنے والا مورخ ہے' جو آنے والا مفسر ہے' یہ اس تک پہنچیں تو میں اُن کے لیے یہ بات کہوں گا کہ اگر آپ نے اسلام سمجھانے کے لیے تعلیم کا سلسلہ شروع کرنا ہو جن کو Post Graduate اسٹوڈنٹس کہتے ہیں' انہیں سب سے پہلے یہ ''انسان نے کیا سوچا؟'' کتاب پڑھایئے۔ میں نے اس میں کیا یہ ہے کہ فارقلیط سے لے کر یونانی فلاسفرز' جو اڑھائی ہزار سال پہلے ہوئے ہیں' اُن اڑھائی ہزار سال میں انسانی معاملات کو سلجھانے کے لیے' فکرِ انسانی نے' تنہا عقل کی رو سے جو کچھ کہا ہے' اس کی پوری تاریخ اس کے اندر ہے۔ اسے یوں کہو کہ یہ اڑھائی ہزار سال کے مفکرین کی فکر کی تاریخ ہے اور ایک ایک مفکر کی زبان سے یہ اعتراف موجود ہے کہ عقلِ انسانی' انسانی معاملات کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اس نوجوان کی تعلیم کی ابتدا اس سے کر دی جائے۔ ہمارے ہاں کے نوجوان کو تو چونکہ تعلیم ہی مغرب کی آ رہی ہے' اس کے ذہن کے اوپر مغرب کے مفکر اور دانشور بہت مسلط ہیں۔ اگر انہی کی زبان سے یہ

بات ان تک آ جائے کہ تنہا عقلِ انسانی کے بس کی یہ بات نہیں ہے' اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے' تو وہ خود یہ پوچھنے کے لیے کھڑا ہو جائے گا کہ اب مجھے بتائیے کہ وحی اس معاملے میں کیا کہتی ہے' جہاں عقل عاجز آ گئی ہے؟ جہاں یہ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى (53:14) ہے' مجھے بتائیے کہ اس سے آگے جہاں عقل کے لیے تحیر کے سوا کچھ نہیں' وہاں وحی کیا کہتی ہے۔ یہاں یہ تحیر والی بات آ گئی۔

دانش کدۂ اقبالؒ کے ہاں دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی کا باہمی فرق

عزیزانِ من! یہ جو بات تھی کہ سدرۃ المنتہیٰ کے معنی ''حیرت کی فراوانی ہے' تحیر کی انتہا ہے'' اقبالؒ نے یہ بات کہی ہے' اقبالؒ ان چیزوں پہ پہنچا تھا:

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی

وہ ''وحی اور عقل'' دونوں کو دانش قرار دیتا ہے۔ کیا بات ہے صاحب! دونوں ہی دانش ہیں' وحی کو قرآن کریم نے خود بصیرت کہا کہ وحی کی دانش اب اک دانشِ برہانی ہے اور دوسری اک دانشِ نورانی ہے مگر

ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

یہ ہے سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى (53:14).

یورپ کے مفکرین کے نزدیک تنہا عقلِ انسانی کا مقام اور وحی کی اہمیت

میں نے عرض کیا ہے کہ یورپ کے مفکرین میں Scientists (سائنسدان) شامل ہیں جن کے متعلق ذہن میں آتا ہے کہ ان کو ان معاملات سے واسطہ ہی کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے۔ اس وقت میں آپ کو دو تین ریفرنسز دینا چاہتا ہوں۔ یہ انسان نے کیا سوچا؟ [1] صفحہ 405 کے ہیں۔ سب سے پہلے میرے سامنے برگسان آتا ہے۔ یہ بہت بڑا سائنس کا فلاسفر ہے۔ یہ اس کی آخری عمر کی کتاب ہے: The Two Sources of Religion and Morality۔ اس نے Two Sources کا کہا ہے۔ ان Sources میں وہ کہتا ہے ''انسان تنہا عقل کی روشنی میں صحیح راہ پر چل ہی نہیں سکتا۔ عقل اسے کسی دوسرے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ عقل ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس بلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو شاید' ورنہ حقیقت کا پتہ تو کسی صورت میں دے ہی نہیں سکتی (ص 201)۔'' آپ نے یورپ کے بلند ترین مفکر آئن سٹائن کا نام سنا ہوگا۔ سائنس کی دنیا میں آج بھی بڑے Scientists اس کا نام لیتے ہیں تو اپنا سر جھکا لیتے ہیں۔ اس کی بھی' عمر

---

[1] پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002 (بلا ترمیم) ص۔ 405 تا 607۔

کے آخری حصے میں' جو کتاب تھی اس کا نام ہے: Out of my Later Days۔ یہ آئن سٹائن کی' یقیناً آخری تصنیف۔ وہ اس میں یہ چیز لکھتا ہے کہ

''ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشری زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں...... ان کے لیے اقدار کی ضرورت ہے۔ یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ عقل کا طریق Experimental (تجرباتی) ہوتا ہے' تجربے کرتی ہے۔ ایک تجربہ کیا' ناکام رہا' پھر دوسرا کیا۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لیے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربے سے درست ثابت ہو۔'' آہاہاہا! یہ Pragmatic Test (استنتاجی آزمائش) ہے۔ اس پہ یہ لوگ اس طرح سمجھیں پھر یہ کہ جو سرچشمہ وحی کا ہے' وہ تو عقل کی رو سے نہیں سمجھ میں آسکتا' نہ یہ اقدار Experiment کی پیدا کردہ ہوتی ہیں' یہ مقتدر ہستیوں کے ذریعے ملتی ہیں۔ یہ تو معلوم نہیں کہ وہ ان کا علم کا ذریعہ کیا ہوتا ہے لیکن جو کچھ وہ وحی کے ذریعے دیتے ہیں وہ تجربے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک صداقت کہتے ہی اسے ہیں۔

جو صداقت تجربات کی کسوٹی پر پورا نہ اترے اسے وحی کہا ہی نہیں جاسکتا

کیا بات ہے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورا اترے۔ حضور ﷺ نے اپنے مخالفین سے کہا تھا کہ نظریاتی بحث اور زبانی مناظرے کی یہ جو چیزیں ہیں' ان کی ضرورت نہیں ہے: یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ (39:39) تجربے میں لاؤ اس چیز کو جو تم دعویٰ کرتے ہو' تم اس کے اوپر تجربہ کرو' جو میں دعویٰ کرتا ہوں' اس کے اوپر مجھے تجربہ کرنے دو۔ اس پر میں نہ تمہارے پروگرام میں دخیل ہوں گا' نہ تم میرے پروگرام میں دخل دو گے۔ دیکھو! نتیجے خود بتا دیں گے کہ کون سچا ہے' کون جھوٹا ہے۔ آئن سٹائن آج یہ کہتا ہے کہ صداقت کا ثبوت تجربے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ وحی اپنی سند آپ ہوتی ہے۔ اس سے اگر یہ سند مانگیں تو وہ اپنی سند آپ ہوتی ہے۔ کیا بات ہے صاحب' ان لوگوں کی! فکرِ انسانی اس طرح سے حقیقت تک پہنچاتی ہے۔ اگر صحیح روشنی میں اس سے کام لیا جائے تو یہ اپنی سند آپ ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہم کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے کہ یہ کیسے ملتی ہے' اس لیے کہ یہ استدلالی طریق کا' Logic (منطق) یا Rationalism (عقلیت) کا نتیجہ ہوتی نہیں ہے' یہ Logic (منطق) کے ذریعے سے حاصل کردہ علم نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم بعد میں وحی کی تائید میں عقلی دلائل پیش کر دیں۔ کہا ہے کہ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیۡ (12:108) ہم جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتے ہیں تو علیٰ وجہ البصیرت' عقل کی رو سے' دعوت دیتے ہیں۔ میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم بعد میں وحی کی تائید میں عقلی دلائل پیش کر دیں لیکن جس طریق سے وحی حاصل ہوتی ہے وہ استدلالی نہیں ہوسکتا۔

عزیزانِ من! یورپ کا ایک مورخ وحی کے متعلق یہ چیز آپ کو کہہ رہا ہے کہ وہ قرآن حکیم چودہ سو سال پیشتر جس نے یہ بات کہی کہ یہ ملتی کس طرح ہے' اس طریق کا تو آپ کو پتہ نہیں' وہاں پہنچ کر اگر آپ دریافت کرنا چاہیں گے' کرید کرنا چاہیں گے' تلاش کرنا چاہیں گے تو یہ ہے سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53:14) کا مقام ہے جہاں عقل کے حصے میں تحیر کے سوا کچھ نہیں آئے گا' نہیں معلوم ہو سکے گا۔ جس طریق سے وحی حاصل ہوتی ہے' وہ استدلالی نہیں ہوتا۔

علامہ پرویزؒ کی کتاب ''انسان نے کیا سوچا؟'' کی اہمیت

غور فرمایا آپ نے' میں وقت کی تنگی کی وجہ سے انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ اگر آپ کا معلومات کرنے کا ذوق و تجسس ہو تو کتاب ملتی ہے' موجود ہے۔ یہ عجیب و غریب چیز ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ علمِ انسانی کے جتنے بھی مختلف شعبے ہیں' ایک ایک شعبے کے متعلق' اس شعبے کی علم کی دنیا میں جو اتھارٹیز مانی جاتی ہیں' آج ان کے اپنے اقوال سے' ان کی تحریروں سے' اس میں یہ چیز بتائی گئی ہے کہ وہ اس کے قائل ہیں کہ انسانی معاملات کا حل تنہا عقل کی رو سے نہیں ہو سکتا' وحی کی ضرورت ہے۔ وحی ملتی کیسے ہے؟ یہ ہم عقل کے ذریعے سے معلوم نہیں کر سکتے۔ وحی پہ تجربہ کرنے کے بعد اس کی صداقت کا ثبوت مل سکتا ہے۔ یہ ساری کتاب اس موضوع پہ ہے' عزیزانِ من! یہ اڑھائی ہزار سال کی انسانی فکر کی داستان ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی معاملات کا حل تنہا عقل کی رو سے نہیں ہو سکتا اس کے لیے وحی کی ضرورت ہے اس کے سوا عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53:14) عقل کے حصے میں تحیر ہے' تحیر ہی ہے۔

میں جو یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ قرآن کریم آپ کو مروجہ تراجم سے سمجھ میں نہیں آئے گا' ان تراجموں کے اوپر ہی تفسیریں مبنی ہیں۔ آپ فرمائیے کہ جہاں یہ بتایا جائے کہ حضور ﷺ عرشِ معلیٰ پہ تشریف لے گئے' وہاں اللہ تعالیٰ سامنے تھے' ادھر حضور ﷺ بیٹھے تھے' درمیان میں ان دونوں کا فاصلہ دو کمانوں کا تھا اور اس مقام پر ایک بیری کا بہت بڑا درخت تھا' آپ سوچیے' میں تنقید نہیں کرتا' آپ سوچیے' ایک نوجوان سے پوچھیے کہ یہ کچھ' جو اسے بتایا جائے' وہ کس طرح اعتبار کرے گا کہ وہاں یہ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (53:10) ہے کہ جب یہ ''عبد'' (نبی اکرم ﷺ) اس مقام تک پہنچ گیا تو پھر خدا نے اسے وحی کی خلعت سے سرفراز کیا۔ اور یہ کہ یہاں پہنچے کے بعد وحی ہوتی تھی' جو آمنے سامنے بیٹھے تھے تو وہ نوجوان اس کے متعلق کیا کہے گا' خدانہ کردہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی غلط بات پیش کر کے اس کی Conviction (یقین) کروں یا اس سے اطمینان حاصل کرلوں۔ نہیں' قطعاً نہیں۔

لفظ سدرة المنتہیٰ کا لغوی مفہوم اور قرآنی الفاظ کے سلسلہ میں چناؤ کی اہمیت

عزیزانِ من! میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ قرآن کریم کو قرآن کریم کی رو سے پیش کیجیے اور پھر اس سے پوچھیے' پھر وہ بتائے گا کہ قرآن کریم نے جو سدرة المنتہیٰ کہا ہے تو اُس میں حیرت کی فراوانی ہے' تحیر کی فراوانی ہے' اس سے اس کی نگاہ میں وہاں خیرگی پیدا ہو جائے اور

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ عربوں کی زبان عجیب وغریب تھی۔ وہ جو محسوس مشاہدات تھے' ان سے کچھ نتائج اخذ کر کے' وہ اس کے لیے ایک لفظ قائم کیا کرتے تھے۔

اب یہ جو منظر ہے کہ سخت گرمی کے موسم میں صحرا کے کنارے پہ مسافر کھڑا ہے' دوپہر کا وقت ہے' چلچلاتی دھوپ ہے' لہریں اٹھ رہی ہیں' شعلے اٹھ رہے ہیں' تمازت کے' گرمی کے' شعلے دور دور تک پھیل رہے ہیں' صحرا کی ریت ہی ریت ہے' وہاں انسان کی آنکھ پہ جو بیتتی ہے' جو گزرتی ہے' اسے سدرۃ کہتے ہیں اور ایسے شخص کو جس کی یہ کیفیت پیدا ہو سادر کہتے ہیں۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن حمید ان کی زبان میں نازل ہوا ہے۔ حیرت کے لیے ان کے ہاں اور بھی بیسیوں الفاظ ہوں گے اور ہیں' وہ تو اتنی وسیع زبان ہے' ایک ایک شے کے لیے ان کے پاس ہزاروں الفاظ ہوتے تھے۔ قرآن حمید میں یہ چیز کیوں چنی؟ اس لیے کہ ان میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ ایسے مقام پہ انسانی نگاہ پہ کیا بیتتی ہے' وہ کیسے ہوتی ہے؟ ایسے صحراؤں کے اندر' یہ چھوٹے چھوٹے جھڑ بیری درخت بھی ہوتے ہیں' وہاں یہ چھوٹے چھوٹے پودے بھی ہوتے ہیں' لغت میں یہ بھی ہے کہ ایسے مقام پہ اس قسم کا کوئی اور درخت نہیں ہوتا' ایسے صحرا کے اندر جھڑ بیریوں کے درخت کہیں نظر آتے۔ اب انہوں نے وہ معنی تو لے لیے کہ وہاں بیری کا درخت ہے اور عرب جس معنی کے اندر یہ سدرۃ یا سادرۃ استعمال کرتے تھے' ان کے لغت کے اندر موجود ہے' یہ میرے لغت کی کتاب (لغات القرآن) ہے' اس میں دیکھیے' میں نے اس کے سارے ریفرنسز دیئے ہوئے ہیں۔ بلند ترین لغوین' کے لغت کے یہ مستند کتب ہیں' انہوں نے کہا ہے کہ بنیادی طور پر اس لفظ کے معنی ''حیرت اور اضطراب'' کے ہوتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ جہاں اس طرح سے انسان کی عقل گم ہو جائے' حیرت ہی حیرت ہو' تو اس سے انسان کو اپنی دنیا میں فائدہ کیا پہنچے گا' اس نے تو علم اور عقل وبصیرت کی رو سے ہی سب کچھ طے کرنا ہے۔ کہا کہ یہ وحی کے سرچشمے کے متعلق ہم کہہ رہے ہیں' اس وحی کی رو سے' اگر اس کو عقل کی روح سے سمجھا جائے اور پھر اس کو عملی دنیا میں لایا جائے تو اس وحی کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰی (53:15) اس کے پاس ہی تو جنت پڑی ہوئی ہے۔ عقل کی حیرت اس مقام پر ایک دیوانے کا خواب نہیں ہوتی' عملی دنیا میں لاؤ' ہم نے کہا' ہم نے تو بتایا یہ ہے کہ وحی کا سرچشمہ اور وحی کا جو طریق ہے' اس کے متعلق تم نہیں سمجھ سکتے۔ وحی کی رو سے تو آپ کی یہ ساری دنیا کائنات کا یہ نظام' آپ کی یہ زندگی' مرتب ہونا ہے وہ سب کچھ عقل کی رو سے ہوگا' علم کی رو سے ہوگا' اس وحی کے مطابق یہ کچھ کرو گے تو اس کے بعد عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰی (53:15) ہے' جنت ہے' نہایت آرام کا رہنے کا ٹھکانہ ہے۔

بات دوسری طرف نکل جائے گی کہ جنت کی خصوصیت کیا ہے؟ کہا کہ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ (2:38) اس میں کسی کو کسی قسم کا خوف نہیں ہوگا' حزن نہیں ہوگا' دل کی افسردگی نہیں ہوگی' یہاں کہا کہ مقام وحی اگر عِنۡدَ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰی (53:14) ہے تو

عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى (53:15) جنت بھی اُسی کے پاس ❶ ہے۔ جو شخص عقل کی رو سے مقام نبوت کو اپنے حیطہ ادراک میں لانے کی سعی لا حاصل کرتا ہے اس کے حصہ میں حیرت کی فراوانیوں کے سوا کچھ نہیں آتا لیکن جو شخص عقل وبصیرت کی رو سے وحی کے پیغامات کو عملی نظام میں متشکل کرتا ہے وہ اپنے اور اپنے ساتھ باقی انسانیت کو جنت کے آغوش میں لے آتا ہے جہاں وہ اضطراب باقی نہیں رہتا جو عقل کی نارسائی کی وجہ سے قدم قدم پر اس کے لیے وجہ خلش بنتا تھا اسی لیے کہا ہے کہ جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى o اِذۡ يَغۡشَى السِّدۡرَةَ مَا يَغۡشٰى (53:15-16) جنت بھی اسی کے پاس ہے۔ وحی کا مقام وہ ہے جہاں عقل انسانی بار ہی نہیں پا سکتی۔ انسانی آنکھ کے لیے تحیر ہی تحیر ہوتا ہے۔ جہاں حیرت کی حیرت' تحیر کا تحیر چھایا ہوا تھا' محیط تھا۔ کیا بات ہے اس منظر کی! مگر نبی کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب ان تحیر کی وادیوں میں ہر طرف سے علم الٰہی چھایا ہوا ہوتا ہے تو اس کی آنکھ اس مقام پر ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔

قرآنِ حکیم میں محاکاتی انداز کا اختیار کرنا حقائق کو سمجھنے کا ایک بلیغ انداز ہے

عزیزانِ من! قرآن حکیم کو اگر اس نکتہ نگاہ سے بھی دیکھا جائے' جسے محاکاتی انداز کہتے ہیں' کہ وہ تناظر کس قسم کے پیش کرتا ہے وہ سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى (53:14) کہہ دیا' وہی ایک بڑی چیز تھی' انتہائی درجے کا تحیر تھا' کہا کہ نہیں آگے اور بات کرتے ہیں اور آپ دیکھیے گا' اگلا وقت جب آئے گا تو پھر نظر آئے گا کہ مقامِ نبوت کتنا ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کہا ہے کہ اِذۡ يَغۡشَى السِّدۡرَةَ مَا يَغۡشٰى (53:16) جہاں چاروں طرف سے تحیر' حیرت چھائی ہوئی تھی' ہر طرف سے حیرت ہی حیرت تھی' اس مقام کے اوپر صحرا کا جو مسافر ہے' جس کی آنکھ وہاں کچھ نہیں دیکھ سکتی تھی' دیکھ سکتی تھی تو چھلاوے دیکھتی تھی' Illusion دیکھتی تھی' وہاں حقیقت میں کچھ نظر نہیں آتا تھا' اس مقام پہ نبی کے کھڑے ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ وَمَا طَغٰى (53:17) اس کی آنکھ' نبوت کی آنکھ' اپنے نکتے سے ذرا ادھر ادھر نہیں ہٹتی جہاں عقلِ انسانی کے حصے میں حیرت اور حیرت کے سوا کچھ نہ آئے اور وہ ایسا ہے کہ کیا بات ہے قرآن حکیم کی! یہ نبی ﷺ اس کے اندر کھڑے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ مَا زَاغَ الۡبَصَرُ (53:17) اُن کی آنکھ ذرا اپنے نکتے سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹی' وہ نہایت سکون سے' نہایت سکوت سے ہیں' انہیں کسی قسم کا اضطراب نہیں ہوا' کچھ حیرت نہیں ہوئی' ذرا سی آنکھ اِدھر اُدھر نہیں ہوئی۔ اگر نبی کی آنکھ میں بھی' وحی کے پانے پہ' اس قسم کا ان کے قلب میں اضطراب پیدا ہو جائے تو اسے کہتے ہیں نگاہ کا اِدھر اُدھر ہٹ جانا' تو پھر ہم خدا کے اس آسمان

---

❶ اگر سِدۡرَةِ الۡمُنۡتَهٰى کے معنی ''علم الٰہی جو تمام حقائق کا سرچشمہ ہے'' کے لیے جائیں تو عِنۡدَهَا جَنَّةُ الۡمَاۡوٰى (53:15) سے مراد یہ ہوگی کہ جن لوگوں کی کشتِ امل وحی الٰہی کے پانی سے سیراب ہو' وہ جنت کے مالک ہوں گے (پرویزؒ: سلیم کے نام' جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1984' ص۔ 47 (فٹ نوٹ 1 اور 2)

کے نیچے صداقت کہاں سے ڈھونڈیں' صداقت تو اسی کے ذریعے آتی تھی۔ اگر اس پہ ہی اس کی یہ کیفیت ہو جائے تو آپ سوچیے کہ وہ کیا لاتے تھے' اتر کے آئے گا تو کس انداز سے آئے گا' اور پھر وہی بات آ گئی۔

لطافت بے ثقافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں بخاری شریف میں پہلی وحی کے نازل ہونے کی روداد

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہاں بخاری شریف کو اصح الکتب بعد الکتب اللہ' مانتے ہیں یہ بخاری شریف کی کتاب قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب ہے' اگر چہ یہ بھی ذرا تکلفاً کہا گیا ہے' کتاب اللہ کے بعد عقیدہ یہ ہے کہ اگر کتاب اللہ میں اور اس میں کہیں تضاد واقع ہو تو یہ حدیث اس کتاب اللہ قرآنِ کریم کو منسوخ کر دے گی۔ بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس کتاب میں' جو صحیح ترین صحیفہ مانا جاتا ہے' کتاب اللہ کے بعد اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس بخاری شریف کی پہلی حدیث یہ ہے کہ وحی کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اب تو اس کے ترجمے بھی ہو گئے ہیں' ترجمہ ہی پڑھ لیجیے گا کہ وحی کی ابتدا کیسے ہوئی لیکن بات کچھ سنانی پڑے گی کیونکہ یہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (53:17) کی اہمیت سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک یہ بات سامنے نہ آئے کہ ہمارے ہاں (حدیث کے نکتہ نظر سے) وحی کی ابتدا کس طرح سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ ہے کہ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (53:14) کے مقام پہ جانا عقلِ انسانی کا طریق ہے' جہاں ہر طرف حیرت ہی حیرت چھائی ہوئی تھی مگر نبوت کی آنکھ ذرا بھر بھی نہیں گھبرائی۔ یہاں (اس حدیث کے نکتہ نظر سے) یہ کہا جا رہا ہے کہ پہلے تو حضور ﷺ کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ کچھ دنوں کے لیے کھانے پینے کا سامان' ستو اور پانی ہوتا تھا' لے کر غارِ حرا میں تشریف لے جاتے' کئی کئی دن وہاں رہا کرتے تھے۔

غارِ حرا میں چلّے کاٹنے کے دوران آپ ﷺ کی طرف جبرئیل کی معرفت وحی کا ذکر اور اس کا طریق

نظر آ رہا ہے کہ یہ بعد میں' جب ہمارے ہاں تصوف آیا' تو تصوف میں صوفیا میں تو چلّے اسی طرح سے کاٹے جاتے ہیں' یہ ہم سے پوچھیے کہ کیسے کاٹے جاتے ہیں' آپ ﷺ غاروں میں تھوڑے سے ستو اور پانی لے کر جاتے تھے۔ گویا ان میں یہ کہا کہ جیسے رسول بھی چلّے کاٹا کرتے تھے اور پھر آگے جب یہ کہا کہ اس کے بعد وہاں وحی ہوئی تو انہوں نے اپنے کشف والہام کی سند پیش کر دی کہ یہی طریق نبوت تھا' یہی ہمارا طریق ہوتا ہے' ان کو وحی ملی اور الہام ہو گیا' تو یہ بات وضع کر دی کہ نبی کو بھی اس طرح سے وحی ملی تھی' آپ ﷺ بھی اس طرح غاروں میں جا کر ریاضتیں کیا کرتے تھے۔ اندازہ لگایئے۔ تو وہاں پہلی تو بات یہ ہے کہ یہ کچھ کیا جاتا تھا' اسی طرح سے آپ ﷺ کیا کرتے تھے کہ ایک دن اسی غار کے اندر جبرئیل آ گئے اور وہ جو مشہور ہے کہ انہوں نے آ کر آپ ﷺ سے یہ کہا کہ پڑھ' آپ ﷺ نے کہا کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔ سوچیے تو سہی' خدا خود لکھا ہوا دے کر جبرئیل کو بھیجنے والا ہے اور جبرئیل لے کر آنے والا ہے'

ان دونوں کو معلوم نہیں ہے کہ یہ پڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ بہر حال وہ ان کے سامنے رکھا ہے اور ان سے کہا کہ پڑھ' اقراء۔ کیا عرض کروں جب اقراء پہ آؤں گا تو عرض کروں گا کہ قرآن حکیم کیا کہہ گیا ہے' جبرئیل نے کہا کہ پڑھ۔ وہ کہتے ہیں۔ آپ ﷺ کہتے ہیں کہ میں تو پڑھنا نہیں جانتا' جب میں پڑھنا جانتا ہی نہیں تو کیسے پڑھوں۔ پھر دس دفعہ کہو گے تو میں یہ سیکھ لوں گا۔ بہر حال جبرئیل نے گلے سے لگایا اور بھینچا اور ساری تعلیم حاصل کر لی۔ یہ پہلی وحی مل رہی ہے۔

وحی کے ملنے پر آپ ﷺ کی اضطرابی کیفیت اور ورقہ بن نوفل کا بیان

اس کے بعد وہ بات ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں۔ وہاں سے آپ سخت اضطراب کے عالم میں گھبرائے ہوئے چلے آرہے ہیں' سہمے ہوئے ہیں' کانپ رہے ہیں' گھر میں آئے ہیں' بیوی سے کہہ رہے ہیں کہ مجھ پر جلدی سے لحاف اوڑھاؤ' مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے مجھے تھوڑا اڈرا لگ رہا ہے' بیوی تسلیاں دے رہی ہے کہ آپ کیوں ڈر رہے ہیں' آپ تو بڑے نیک ہیں' دیانتدار ہیں' امین ہیں' تو آپ کے ساتھ یہ کچھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ تمہیں پتہ نہیں' مجھ پہ کیا ہو رہا ہے' جلدی سے کپڑے اوڑھاؤ' مجھ پر لحاف اوڑھاؤ' مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ نبی کی اس کیفیت کو سامنے رکھیے گا جو یہ بیان ہو رہی ہے۔ اب حضرتِ خدیجۃ الکبریٰؓ نے یہی چیز سوچی کہ ان کا چچا کا ایک بیٹا تھا' عیسائی ہو گیا تھا' وہ تھا ورقہ بن نوفل اور اس زمانے میں بہت ضعیف ہو گیا' بڑا عالم تھا' وہ تاریخ لکھا کرتا تھا' انجیل لکھا کرتا تھا' گویا ایک عیسائی عالم تھا' اب اور تو انہیں کوئی سوجھی نہیں' وہ آپ ﷺ کو اس ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ وہاں جا کر آپ ﷺ نے یہ قصہ سنایا تو ورقہ نے کہا کہ آپ ﷺ کچھ ڈر رہے ہیں' سہم رہے ہیں' یہ تو وہی جبرئیل ہے' جو پہلے نبیوںؑ پہ آیا کرتا تھا' تم تو نبی ہونے والے ہو۔ اچھا جی! معاذ اللہ معاذ اللہ۔ وہ جو عیسائی عالم تھا' میں نے کہا ہے کہ یہودی اور عیسائیوں نے وہ کچھ ہمارے ساتھ کیا ہے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ اس پر وہ کیا ریمارکس دیا کرتے ہیں۔ زبان ساتھ نہیں دیتی' میں کانپ اٹھتا ہوں لیکن کیا کیا جائے جب یہ چیز ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں اور اگلی بات اس نے کہی کہ جب آپ ﷺ کو نبوت ملے گی تو اگر میں زندہ رہا تو آپ ﷺ پہ ایمان لے آؤں گا۔ یہ نبوت تو مل گئی' یعنی یہ وحی ملی ہے' نبوت اسی کو کہتے ہیں۔ وہ یوں ہے جیسے اس کے بعد کچھ اور ملنے والا ہے۔ ورقہ نے کہا ہے کہ اس وقت میں ایمان لاؤں گا۔ آج وہ یہ سننے کے بعد کہہ رہا ہے کہ تم تو نبی ہو کہ جب آپ ﷺ کو نبوت ملے گی' اگر میں زندہ رہا' تو آپ ﷺ پہ ایمان لاؤں گا اور جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو نکالے گی' اگر میں زندہ رہا' تو آپ ﷺ کی مدد کروں گا اور اس پہ پھر آپ ﷺ واپس آئے' تو حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ دیکھا! میں نے آپ ﷺ سے کہا تھا تو پھر آپ ﷺ کو یہ اطمینان ہوا کہ میں تو نبی بن گیا ہوں' یہ تو نبوت ہے جو ورقہ کے سرٹیفکیٹ پر مجھے مل گئی ہے صاحب! معاذ اللہ معاذ اللہ۔

میں یہ ان مستشرقین کی بات کہہ رہا ہوں جو اس سے کہا کرتے ہیں کہ دیکھا آپ نے! کہ آپ کا رسول نبی کیسے بنا؟ ورقہ کی تصدیق

پراوراب یہ ان کا حق ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے اعتراض کریں۔اس نے کہا کہ سوچو تو سہی! اگر ورقہ نے ویسے ہی رٹا دیا ہوتو؟ کیونکہ وہ ایمان نہیں لایا' نظر آتا ہے کہ وہ نہیں مانتا تھا' انہیں اس نے ایک راستے پہ ڈال دیا اور یہ اس کے کہنے پر اپنے آپ کو نبی سمجھنے لگ گئے۔ معاذ اللہ معاذ اللہ۔لیکن ہم ان سے کیا کہیں' یہ آپ کے ہاں کی اصح الکتب کی پہلی روایت ہے' ساری ورقہ پہ بات جا پہنچی۔خوف ہے' سہمے ہوئے ہیں' حیرت ہے' سمجھ میں بات نہیں آرہی کہ یہ کیا ہوا ہے' میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔یہ کیفیت ہے اس نبی ﷺ کی جس کو وحی ملی ہے' جس کے متعلق شہادت یہ ہے کہ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَ ۃَ مَا یَغْشٰی (53:16) جب کہ تمام کائنات کے تمام ماحول پر' حیرت کی فراوانیوں کے بادل چاروں طرف چھائے ہوئے تھے اور وہاں اُن کی کیفیت یہ تھی: مَا زَاغَ الْبَصَرُ (53:17) اس کی آنکھ میں ذرا حیرت پیدا نہ ہوئی۔

قرآنِ حکیم کا بیان نبی اکرم ﷺ کی عظمت اور عقل انسانی کی حدود اور قرآنی نظام کی تشکیل

آپ غور فرما رہے ہیں کہ قرآن حکیم بات کیا کہہ رہا ہے؟ کہہ رہا ہے کہ جہاں عقلِ انسانی کی یہ کیفیت ہو جائے' وہاں جو نبوت پانے والا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی آنکھ نہ ذرا بھکتی ہے' نہ اپنے نکتہ ماسکہ سے اِدھر اُدھر ہٹتی ہے۔زَاغَ [1] کے معنی ہوتا ہے ''ذرا کسی چیز کا ادھر ہٹ جانا''۔یہ ہے علم نبوت کی شان۔یہ قرآن حکیم ہے' عزیزانِ من! میں نے اس آیت سے پہلے دو الفاظ پیش کیے ہیں۔کہا ہے کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ (53:17) آنکھ ادھر اُدھر نہیں ہوتی۔جہاں عقلِ انسانی عاجز آجاتی ہے' اس مقام پہ کھڑے ہو کر بھی نگہ نبوت کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ نبی کی آنکھ ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔یہ علمِ وحی کتنا نبی پہ چھایا ہوا ہوتا ہے! غور کریں کہ عقل انسانی اور نگہ نبوت میں کتنا عظیم فرق ہوتا ہے۔یہ فرق درجہ (Degree) یا کمیت کا (Quantitative) نہیں ہوتا۔یہ فرق اصل و بنیاد کا ہوتا ہے۔ کمیت کی بجائے کیفیت کا (Qualitative) ہوتا ہے۔عقل انسانی کسب و ہنر سے اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتی لیکن اس مقام سے ملے ہوئے پیغامات سے نفع یاب ہوسکتی ہے۔یہ تو ہے نگہ نبوت کا تقابل عقلِ انسانی سے۔آپ یوں کہیے کہ عقل کے مقابل میں وحی یا نبی کا علم۔

اگلی بات یہ آگئی کہ نبی کے علم اور خدا کے علم میں کیا نسبت ہے؟ کیا یہ جتنا علمِ خدا ہوتا ہے وہ تمام نبی کو پہنچا تا ہے؟ یہ تو سوال نہیں ہے' علمِ خداوندی تو لامنتہا ہوتا ہے' نبی کو اتنا ہی علم ملتا ہے جتنا خدا دیتا ہے۔اسے آپ عقلِ انسانی کے مقابلے میں تو لامنتہا کہہ لیجیے لیکن علمِ خداوندی کے مقابلے میں تو یہ محدود ہوتا ہے۔دیکھیے' عزیزانِ من! اگر آپ کے پاس قرآن حکیم کے نسخے ہیں تو اس کے دو الفاظ ملاحظہ ہوں۔یہ ہیں مَا زَاغَ الْبَصَرُ (53:17) عقلِ انسانی کے تغیر کی فراوانیوں کے مقام پر بھی نبی کی آنکھ' اس کا علم ہے' اتنا مستقل و مستحکم ہوتا

---

[1] صاحب تاج العروس کے مطابق زَاغَ صرف اس ہٹ جانے اور جھک جانے کو کہتے ہیں جو حق سے باطل کی طرف ہو۔(پرویزؔ: لغات القرآن جلد دوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960ء ص: 825)۔

ہے کہ اس کی نظر ذرا اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی لیکن یہ لامنتہا نہیں ہوتا اور ساتھ ہی یہ بات کہہ دی کہ وَمَا طَغٰی (53:17) اور اس کی آنکھ اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکی' اس دنیاوی علم یا انسان کی اپنی فکر سے حاصل کردہ جو علم ہے' جسے عقل کہا جاتا ہے یا علم انسانی کہا جاتا ہے' اس کے مقابل میں تو وحی لامحدود ہے لیکن جب اس علم کو خدا کے مقابلے میں لایا جائے گا تو پھر یہ علم محدود ہو جائے گا۔ خدا کا علم ہی ہے جو لامنتہا ہے۔ اس لیے ایک طرف تو نبی کا تقابل علمِ انسانی کے ساتھ کیا گیا' جہاں حیرت کی فراوانیاں ہوتی ہیں۔ اس میں مَا زَاغَ (53:17) بڑی بات ہے صاحب! اور اسی مقام پہ آپ غور کیجیے کہ قرآن حکیم کس طرح ایک ایک مقام پہ' وہی بات صاف کر دیتا ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ علمِ نبوت' علم خداوندی ہو گیا۔ خدا خدا ہے اور نبی نبی ہے۔ نبی کا علم خدا کا عطا کردہ ہوتا ہے۔ اس لیے عقلِ انسانی کے مقابلے میں تو اس کی آنکھ ذرا نکتے سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹتی لیکن وہ جو اس کے علم کا اور اس کے بعد خدا کے علم کا خطِ امتیاز کھینچا گیا ہے' وہاں کہا ہے کہ وَمَا طَغٰی (53:17) اس نے اپنی حد سے تجاوز نہیں کیا۔ اب اس میں مقامِ نبوت تو اِدھر انسانیت کی رو سے واضح کیا' اُدھر وحی کی رو سے واضح کیا کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا تو بہر حال کہا ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (18:110) میں تمہارے جیسا انسان ہوں۔ مجھے بس وحی ہوتی ہے۔ وہ جو میرا علم ہے' تم سے زیادہ ہے' جو تمہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس خدا کی طرف سے عطا کردہ وحی یا علم کو اگر سند مان لیا جائے تو میں پھر تمہارے جیسا ہی انسان ہوں اور اب میں جو کچھ کروں گا وہ اس وحی کو یہاں نافذ کرنے کے لیے انسان کی حیثیت سے کروں گا اور جو کچھ ایک انسان کر سکتا ہے' وہ ہر انسان کر سکتا ہے' وحی تو نہیں مل سکتی' کیوں کہ نبوت کا سلسلہ آپ ﷺ کے بعد ختم ہو گیا البتہ وحی پر عمل کرنے سے جو نظام قائم کیا جانا مقصود ہے' جو حضور ﷺ نے کیا ہے وہ حضور ﷺ نے بشریت کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس لیے کیا ہے کہ A [1] man can do what a man has done. (جو کچھ انسان نے کیا ہے وہ ایک آدمی کر سکتا ہے)

قرآنِ حکیم کا پیش کردہ نظامِ زندگی قیامت تک انسان کے ہاتھوں متشکل ہو سکتا ہے مگر بہانے بازی!

یہی بات ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت اور قرآن حکیم کی یہ تعلیم قیامت تک کے لیے ممکن العمل ہے۔ اب جب یہ بات ان سے کہیے کہ صاحب! وہ آپ بھی کچھ کام کیجیے' کہنے لگے: لو صاحب! ہم کام کریں بندہ بشر' ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں نام نہیں لیتا۔ یہ جو ہمارے

---

[1] یہ یہاں پر شعورِ ذات (Self Consciousness) کا مقام آتا ہے جو عام انسانی شعور کی سطح ہے۔ یہاں عقل (Intellect) کام کرتی ہے اور علم کا ذریعہ حسیاتی سے گزر کر تصوراتی (Conceptual) ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان Perception کے ذریعہ تصورات (Concepts) قائم کر لیتا ہے اور ان تصورات سے اس کی عقل نتائج مستنبط کرتی ہے۔ اس مقام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (انسان جانتا ہے کہ وہ جانتا ہے) اس کا نام بک کے نزدیک شعور ذات ہے۔ حیوان صرف جانتے ہیں۔ ان میں ''میں جانتا ہوں'' کا تصور نہیں ہوتا۔ ''میں جانتا ہوں'' صرف انسان ہی کہہ سکتا ہے (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 2002ء' ص۔ 409)

ہاں اقامت دین کے بہت زیادہ مدعی تھے انہوں نے یہ بات کہی کہ صاحب! ہم میں اب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نہیں پیدا ہو سکتے۔ چلیے! تو پھر قرآنِ حکیم کا ہے کے لیے قیامت تک کے لیے رکھا ہوا ہے۔ ان کا زندہ انسانوں کے ساتھ یہ تعلق نہیں کہ ہم میں تو اب پیدا ہی نہیں ہو سکتے۔ معاملہ ختم ہوا ادھر وحی بند ہوگئی، وحی پر عمل کرنے والے جو انسان تھے اس کے بعد وہ پیدا نہیں ہو سکتے، اس کے بعد پوجا کیجیے: علمِ نبوت کے متعلق، عقل کے مقابلے میں یہ کیفیت، خدا کے علم کے مقابلے میں یہ کیفیت، اور بشریت ساتھ ساتھ۔

رسول اعلان کیے چلا جا رہا ہے کہ اس پر جو عمل کرنا ہے وہ انسانوں نے کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ **وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوۡلٌ قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ اَفَا۠ئِنۡ مَّاتَ اَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلٰۤی اَعۡقَابِکُمۡ** (3:144) کیا بات ہے! سن رکھو کہ محمد بجز ایں نیست کہ خدا کا ایک بھیجا ہوا رسول ہے، اس سے پہلے اس قسم کے کئی رسول آئے اور اپنا اپنا پروگرام پورا کر کے چلے گئے۔ کل کو اگر اس کی بھی موت آ جائے یا قتل ہی کر دیا جائے، تو تم یہ کہو گے کہ بس یہ معاملہ تو اس شخص کے ساتھ تھا، یہ چلا گیا، معاملہ ختم ہو گیا تو کیا تم پھر اپنے پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟ آج یہ جو کہنے والے ہیں کہ صاحب! نبوت تو ختم ہوگئی اور اس کے بعد بھی جو اس کو قائم کرنے والے حضور ﷺ کے رفقا صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ تھے اب وہ ان جیسے پیدا ہی نہیں ہو سکتے تو یہ معاملہ تو ختم ہو گیا۔ پھر وہ تو وہی بات ہوگئی جو قرآن حکیم نے کہی تھی کہ اس کے بعد تم یہ کہو گے کہ اب تو کوئی اس کو قائم ہی نہیں کر سکتا تو اس لیے ہم اپنے نظامِ کہن کی طرف لوٹ جائیں۔ یاد رکھو! **وَ مَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡـًٔا** (3:144) اس کے بعد یہ ہے کہ یہ کرو گے تو اپنا ہی کچھ نقصان کرو گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔

عزیزانِ من! کہا ہے کہ **مَا طَغٰی** (53:17) یہ سارا کچھ جو قیامت تک محفوظ کیا گیا ہے، یہ کا ہے کے لیے یہ سب کچھ کیا؟ اس مقام کے اوپر نبی کا سامنے آنا، اس قسم کا علم حاصل ہونا، وحی کی یہ کیفیت ہونا، یہ سارا کچھ کا ہے کے لیے تھا؟ کہا کہ **لَقَدۡ رَاٰی مِنۡ اٰیٰتِ رَبِّہِ الۡکُبۡرٰی** (53:18) اُس نے اس مقام پر اپنے نشوونما دینے والے کی آیاتِ کبریٰ (عظیم نشانیوں) کو دیکھا۔ یہ سب اس لیے ہوا۔

اب اس کے بھی یہ معنی ہیں کہ خدا کی بلندتریں آیات جو ہیں، اس کو وہ بھی دکھائیں کہ بس معراج کی تفسیر میں تو یہ ہو گیا کہ اس کے بعد پھر آپ جنت کی طرف گئے، وہاں سب کچھ دیکھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میں، میں نے دیکھا تو اکثریت آپ عورتوں ہی کی تھی، چلو یہ بھی کیا خوب ہی کہا یا للعجب!!! یعنی ماں کے پاؤں کے نیچے جنت اور جس کے پاؤں کے نیچے جنت ہے وہ جہنم میں [1] ہے۔

---

[1] اب یہاں دو تین منٹ آواز صحیح نہیں ہے۔

آیاتِ کبریٰ کا مفہوم اور اس کے عملی نتائج

عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ آیاتِ کبریٰ جو کہا گیا ہے کہ **لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰی** (53:18)۔ یہ آیاتِ کبریٰ کیا ہوتی ہیں؟ خدا کی آیاتِ کبریٰ کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کریم اپنے آپ کو خود سمجھاتا ہے' قرآن کریم کو قرآن کریم سے سمجھا جاتا ہے' عزیزانِ من! یہ اب کہاں آیا آیاتِ کبریٰ؟ اسی قسم کی ایک وحی اس سے پہلے حضرتِ موسیٰؑ پر بھی ہوئی تھی۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر بڑا تفصیل سے ہوا ہے۔ جب طور کی چوٹیوں پر وہ وحی ملی تو سارا کچھ کہنے کے بعد فرمایا **لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى** (20:23) تاکہ ہم تجھے اپنی آیات الکبریٰ دکھائیں۔ اس کے بعد ہے کہ **اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24) فرعون کی طرف جاؤ کیونکہ وہ بڑا ہی سرکش ہو گیا ہے' وہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی پانے کے بعد نبی کے سامنے پروگرام یہ ہوتا ہے کہ وہ سرکش قوتوں کو ان کے ظلم و استبداد سے روکے اور مظلوم انسانیت کو ان کے دندانِ حرص و آز سے چھڑائے۔ وہ اس عظیم مقصد کو لے کر آتا ہے اور طاغوتی قوتوں کو قیامت خیز تصادمات کے بعد شکست اور ان کے غاصب و ظالم نظام کی جگہ' خدا کے نظام ربوبیت عالمینی کا قیام' وہ آیاتِ کبریٰ ہیں جن کا مشاہدہ نبی ﷺ کو کرایا جاتا ہے۔ تو عزیزانِ من! کہا یہ گیا ہے کہ ہماری جو بلند ترین نشانیاں ہیں' وہ دکھائی جائیں۔ وہ نشانیاں کیا تھیں جو دکھائی جانی تھیں۔ یہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ضمن میں عملی بات ہوئی۔ یہ کوئی ذہنی سی بات نہیں تھی' کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ ہم اپنے ذہن میں فیصلہ کرلیں قرآنِ کریم ذہن میں فیصلہ نہیں کرنے دیتا اس کے لیے قرآنِ کریم نے راہ نما اصول دیئے ہیں۔ دیکھا کہ آیاتِ کبریٰ کہاں دیکھی جائیں گی' کہاں دکھائی جائیں گی' کہا ہے کہ **اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى** (20:24) جاؤ فرعون کی طرف' بڑا سرکش ہو گیا ہے' انسانیت کو کچل رہا ہے' ظالم جابر مستبد ہے' جاؤ اس کی طرف' استبداد کی جا کر گردن مروڑ دو' خدا کے نظام اور اس کی حکومت کو قائم کرو۔ یہ خدا کی آیاتِ کبریٰ ہیں جن کو دکھانے کے لیے موسیٰؑ کو مامور کیا جا رہا تھا۔

یہ آیات جنہیں معراج کا واقعہ کہا جاتا ہے دراصل یہ مکے سے مدینے کی طرف ہجرت کے متعلق ہیں

آیتِ کبریٰ حضرت موسیٰؑ ہی کے متعلق نہیں تھا۔ یہ وہی جسے سورۃ بنی اسرائیل کہتے ہیں' جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی کہ پہلی آیت میں ہی یہ چیز ہے کہ **سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا** (17:1) ''خدا کی ذات بڑی پاکیزہ ہے''۔ میں نے کہا تھا کہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ ''وہ راتوں رات مکے سے بیت المقدس کی طرف لے گیا۔'' وہاں سے معراج کی پہلی سیڑھی قرآن کریم نے کہا ہے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ یہ ہجرت کا مقام بیان ہے کہ آپ ﷺ ہجرت کے لیے مکے سے مدینے تشریف لے آئے۔ حضور ﷺ نے کاہے کے لیے یہ ہجرت تھی؟ کہا ہے کہ یہ وہی الفاظ آرہے ہیں کہ ہماری وہ آیات جو پیغامات تھیں' جن کے برحق ہونے کی صفات مضمر اور پوشیدہ تھیں' وہ مکے کی زندگی کے اندر محسوس طور پہ سامنے نہیں آئی تھیں۔ آپ ﷺ کو مدینے

لے گئے۔ وہاں جا کر یہ محسوس اور مشہود شکل میں سامنے آ جائیں۔

عزیزانِ من! آئیں وہ سامنے، پھر وہاں مملکت قائم ہوئی ہر جنگ میں ان کو شکست ہوئی، اس کی وسعتیں پھر پوچھو نہیں، فارس اور روم تک پھیل گئیں۔ یہ آیاتِ خداوندی تھیں۔ حضرتِ موسیٰؑ کو بھی یہ دکھائی گئیں، بنی اسرائیل کے متعلق بھی وہی الفاظ آئے ہیں کہ ہم نے **یَسۡتَخۡلِفَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ** (7:129) رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاءؓ کے متعلق بھی ہے کہ **وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ** (24:55) ہمارا وعدہ ہے، یہ ہمارا قانون ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کے نتیجے میں تمہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ ہے جو آیاتِ ربی ہیں جن کو دکھانے کے لیے یہ وحی کا سلسلہ بیان کیا ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہم سورۃ النجم کی آیت 18 تک آ گئے، انیسویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

چھٹا باب: سورۃ النجم (آیات 19 تا 25)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1982ء کی 5 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 19 سے شروع ہو رہا ہے: (53:19)۔

مقامِ نبوت کی عظمت کو ذہن نشین کرانے کے لیے قرآنِ حکیم کا ایک حسین ولازوال محسوس انداز

آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے چند ایک دروس کا عنوان مقامِ محمدی ﷺ یا مقامِ نبوت تھا اور جس انداز سے قرآنِ کریم نے نبوت کے مقام کا تعارف کرایا ہے تو وہ ہمارے الفاظ میں بیان ہی نہیں ہوسکتا، خود قرآن حکیم نے بھی اپنے اعجازی انداز سے جو تعارف کرایا ہے، وہ واقعی جو انسانی ذہن یا شعور ہے، آسمان کو چھونے لگ جاتا ہے۔ یہ مقام اتنی بلندیوں پر تھا۔ اب اس مقام کے بعد جو سامنے قریش کی مخاطب قوم تھی فوراً آتا ہے کہ قریش بت پرست تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کعبے میں بھی بتوں کو استادہ رکھا تھا، ان کی پرستش کرتے تھے، وہاں بھی تھے اور باقی قبائل کے الگ الگ بت بھی تھے۔ قرآن حکیم انسان کو فوراً ہی ان بلندیوں پر لے جاتا ہے اور اس کے بعد ان کی پستیوں کی طرف آجاتا ہے کہ دونوں کے تقابل سے معلوم ہو جائے کہ یہ مقام کیا ہے اور تم کس مقام پر ہو۔ فوراً ہی وہ اس چیز سے شروع کر دیتا ہے جو آج ہم اچھی طرح سمجھ نہیں سکتے کہ وہ اتنا عظیم فلک پیما، بلکہ عرش بوس مقام تھا۔

اس کے فوری بعد ہی یہ کہا کہ **اَفَرَءَ یْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰیo وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الْاُخْرٰی** (53:19-20)۔ ان میں کیا ربط ہے؟ اس کے بعد ان لات اور عزّیٰ اور ان کے تیسرے ساتھی منات کا ذکر آ گیا۔ تو ربط تو یہی ہے کہ وہ جو مخالف قوم سامنے تھی، پہلی آیات بھی تو ان کے سامنے ہی پیش کی جارہی تھیں، بتایا جارہا ہے تھا کہ مقامِ نبوت کیا ہے اور اسے تو حضور ﷺ نے جو اپنا پہلا پیغام اس قوم تک پہنچایا ہے، اس کو جسے عملاً کہتے ہیں، پیش کر کے بتا دیا تھا کہ نبی کس مقام پر ہوتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے، وہ خود بجائے خویش ایک ایسی مثال ہے جو

قرآن کریم نے کہا تھا کہ افقِ اعلیٰ پہ ہوتا ہے' آسمان کی بلندیوں سے اس کو تعلیم ملتی ہے' زمین پر رہنے والے انسانوں کے معاملات کا وہ حل پیش کرتا ہے' تو یہ نبوت کا عجیب قسم کا اشتراک تھا۔

اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے پہلی بار جب اپنا یہ پیغام پیش کیا ہے تو وہ یہی تھا کہ آپ ﷺ ایک پہاڑی پر کھڑے ہو گئے تھے اور وہاں سے آپ ﷺ نے آواز دی تھی۔ عربوں کے ہاں جو کسی بہت بڑے خطرے کی آگہی کے لیے طریق ہوتا ہے جو آواز دی جاتی ہے۔ آپ ﷺ نے وہ آواز دی تھی تو وہ فوراً یہ مکے کے قریش' لپک کر' دوڑ کر' وہاں پہاڑ کے نیچے پہنچے کہ کوئی بہت بڑا خطرہ ہے تو حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ آپ لوگ آ گئے۔ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اس پہاڑ کی دوسری طرف ایک بہت بڑا لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہوگا اور تمہیں تباہ کر دے گا' تو کیا تم اسے تسلیم کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہم کیوں نہیں تسلیم کریں گے' اس لیے کہ ایک تو یہ ہے کہ زمانہ قبل از نبوت میں بھی حضور ﷺ کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی' ایک تو اس لیے کہ آپ ﷺ نے ساری عمر' کبھی جھوٹ نہیں بولا' تو اب یہ بات ہم سے کیوں کہیں گے اور دوسری بات صاف ظاہر تھی کہ آپ ﷺ اس مقام پہ کھڑے ہیں' جہاں دوسری طرف جو کچھ ہے' وہ بھی آپ ﷺ کو نظر آتا ہے اور اس طرف کو بھی نظر آتا ہے اور ہم اس مقام کے اوپر ہیں یا آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم اس مقام پر ہو کہ تم اِدھر ہی کی بات کو دیکھ سکتے ہو' اُدھر کی بات تم دیکھ نہیں سکتے اور میں اس مقام پہ کھڑا ہوں کہ جہاں میں دونوں طرف کے مقامات کو دیکھ سکتا ہوں تو نبوت کا یہ مقام تھا۔

وحی کی راہنمائی کے بغیر انسانی سوچ کی پستی کا عملی مظاہرہ: بتوں کے سامنے سجدے

خود ''نبی'' کے معنی مقامِ بلند پہ کھڑا ہونے والا ہے' پیشگوئیاں کرنے والا نہیں ہے' تو وہ اس مثال سے بھی حضور ﷺ نے خود اس چیز کو Illustrate (واضح) کیا ہے کہ وہ مقامِ بلند' جس پہ نبی فائز ہوتا ہے' اس طرف کے حقائق بھی اس کے سامنے ہوتے ہیں جو تمہارے سامنے نہیں ہوتے اور اُدھر تو وہ پھر حرا سے اتر کر آتا ہے تو وہ تو بشر ہوتا ہے تو اس قوم کو جب یہ چیزیں بتائی گئیں کہ پہلے جتنا بلند ترین وحی کا مقام تھا تو اس کے بعد پھر ان سے یہ کہا گیا' تو ربط یوں ہے کہ ان سے کہا گیا کہ یہ مقام ایک طرف اور اس کے بعد پھر تم اپنے مقام کے اوپر نگاہ ڈالو کہ کیا مقام ہے کہ یہ پتھر کے ٹکڑے' جنہیں تم نے خود اپنے ہاتھوں سے تراش کر یہاں نصب کر رکھا ہے' لا کر خود نصب کرتے ہو' ان میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ اگر ان پہ مکھی بیٹھ جائے تو یہ خود اس کو اڑا سکیں' وہ بھی تمہیں کچھ کرنا پڑتا ہے' تو اس قسم کی جو چیزیں ہیں' پھر تم ان کو اپنا خدا مان رہے ہو' ان کے سامنے سجدے کر رہے ہو' ان سے مرادیں مانگ رہے ہو! یا للعجب !!

خدا کا غلط اور صحیح تصور انسانی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے تو پھر اللہ کا صیغہ مونث کیوں؟

ذرا اس پستی کو دیکھیے' اس بلندی کو دیکھیے' اور واقعی یہ تقابل ایسا ہے کہ وہاں سے ادھر لا کر اگر یہ جو نظری طور پر ان کے عقائد تھے' وہ

بیان کیے جاتے تو وہ بات بشکل سمجھ میں آتی وہ جو عملاً محسوس چیز پتھر کے ٹکڑے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ کہا کہ یہ تم سوچو کہ کس مقام پہ تم کھڑے ہو اور پھر وہ لوگ خدا کو نہیں مانتے تھے۔ یہ دو تین جتنے بت تھے وہ جیسے ہندوؤں کے ہاں بھی یہ چیز تھی' جہاں بھی بت پرستی ہوتی ہے' وہ لوگ کہتے یہی ہیں کہ یہ خدا ہی کو ہم مانتے ہیں' وہ اس محسوس شکل میں دنیا کے اندر آتا ہے' وہ خدا کو ہی مانتے ہیں حتیٰ کہ جو اللّٰت ہے' اس کے متعلق تو یہ تھا کہ یہ مؤنث کا صیغہ ہے جسے آپ Feminine کہتے ہیں تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ الہ یا اللہ صیغہ Feminine (مؤنث) ہے جو اللّٰت انہوں نے بنایا ہے' تو بہر حال انہوں نے کہا کہ یہ سوچو تو سہی کہ یہ مانتے ہو۔ خدا کو تو وہ مانتے تھے۔

حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے خدا تعالیٰ کے متعلق پائے جانے والے تصور کی وضاحت

حضور ﷺ کی بعثت سے پیشتر ان کے ہاں اللہ کا تصور تھا' حضور ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ تھا اور تو اور رہا وہ اللہ کو مانتے تھے لیکن تصور اسی قسم کا ہی تھا جیسا بت پرستوں کے ہاں ہوتا ہے' تو انہوں نے کہا کہ یہ بھی چیز ہے کہ تم اللہ کو یہ بت مانتے ہو اور ان میں ان کی یہ ساری دیویاں تھیں' دیوتا نہیں تھے۔ تو وہ ان کو مانتے تھے۔ یہ کہا کہ ذرا اس کو تو سوچو کہ تم کس قسم کا خدا مانتے ہو' خدا کے ہاں تم کہتے ہو کہ یہ اس کی لڑکیاں یا بیٹیاں ہیں۔ اور عربوں کے ہاں یہ چیز موجود تھی کہ بیٹی کی پیدائش سے ان کا جیسے قرآن حکیم نے خود کہا ہے کہ چہرہ سیاہ ہو جاتا تھا اور وہ منہ چھپاتا پھرتا تھا کہ کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میرے ہاں بیٹی ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ اس کو زندہ رہنے دوں یا زندہ در گور کر دوں' گاڑ دوں۔ وہ واقعی بیٹیوں کو پیدا ہونے کے بعد ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے یعنی بیٹی کی پیدائش ان کے نزدیک اس قدر باعث شرم چیز ہوتی تھی کہ وہ اس سے بچنے کے لیے بیٹی کو زندہ ہی دفنا دیتے تھے۔ کہا کہ یہ سوچو تو سہی کہ تم کہتے ہو' ہم خدا کو بھی مانتے ہیں' ایسے خدا کو مانتے ہو کہ جس کے ہاں تم کہتے ہو کہ یہ اس کی بیٹیاں ہیں اور اپنے ہاں تم بیٹے پسند کرتے ہو۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تمہارا خدا کو یہ ماننا ہی صحیح نہیں ہے تو یہ ساری جتنی بھی تھیں' ان کے ہاں کی دیویاں تھیں' دیوتا بھی نہیں تھے۔ کہا کہ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (53:21-22) پہلی تقسیم تم دیکھو کہ اپنے ہاں تو بیٹوں کی خوشخبریاں اور جشن مناتے ہو اور خدا کے ہاں تم یہ بیٹیاں مانتے ہو اور بیٹی کے متعلق تمہارا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ اس سے تو انسان کو شرم آجاتی ہے۔ یہ بت تو رہے وہ پتھر کے ٹکڑے!

بت پرستی کی حقیقت کو بیان کرنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا ایک عظیم اور بلیغ اندازِ بیان

عزیزانِ من! آگے وہ بات آرہی ہے جو کتنی عظیم حقیقت ہے اور قرآن حکیم کی کون سی حقیقت عظیم نہیں ہے' وہ تو جب یہ ایک چیز سامنے آتی ہے تو جس پہ میں خود اندر سے تڑپ اٹھتا ہوں کہ پھر زبان پہ یہ الفاظ آجاتے ہیں کہ کتنی عظیم حقیقت ہے! حالانکہ اس کا تو ایک ایک لفظ عظیم ہے۔ کہا ہے کہ یہ جنہیں تم اپنا خدا بنا رہے ہو' خدا کہہ رہے ہو' ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کہ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ

اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ (53:23)۔ان کی حیثیت کیا ہے؟ بڑی غور سے سننے کی بات ہے کہ قرآن حکیم یہاں کیا کہہ گیا ہے' عزیزانِ من! کہا ہے کہ تم سوچو یہ ان کی حیثیت کیا ہے؟ پتھر کا ٹکڑا کہیں پڑا تھا' اسے تم لے آئے' اسے خود تراشا' کوئی بھونڈے سے نقش و نگار بھی اس میں پیدا کیے' یونہی کچھ شکل تشبیہہ سی بنائی اور یہ کچھ کرنے کے بعد تم نے اس کا نام (مثلاً) اللّٰت رکھ دیا۔اب وہ تمہارے نام رکھنے سے لت بن گیا۔ اس کا یہ نام نہیں رکھا تھا تو وہ پتھر کا ٹکڑا تھا۔تم نے خود ہی اس کا نام یہ اللہ یا لت رکھ دیا تو وہ خدا بن گیا۔تو یہ تو تمہارا خود نام دیا ہوا ہے جس سے اس کی یہ حیثیت بن گئی ہے۔جس کسی کو یہ معلوم نہیں ہے' یہ لت ہے جسے معلوم ہے اس کے نزدیک وہ پتھر ہی ہے۔

کسی شے کا یا کسی شخص کا احترام ہو' اس کی عزت اس کے نام سے نہیں بلکہ اس کی خصوصیات سے ہوتی ہے

بڑی گہری چیز ہے جو یہ کہہ گیا ہے۔اس کی حقیقت تو پتھر کے ٹکڑے کی ہے۔تم نے اس کو ایک نام دے دیا' اسی قسم کا ایک دوسرا نام دیا تو پھر اس کو تم نے منات کہہ دیا۔وہ یہ بن گیا۔اب اگر کسی کو اس کے یہ نام معلوم نہیں ہیں تو وہ ان کے لیے بھی پتھر ہیں۔تمہارے ہاں اگر یہ اگلی آنے والی نسل بھول جائے' جو معلوم نہ ہو کہ کیا نام تھے یا کیا چیزیں تھیں' ان کے نزدیک پھر پتھر ہے تو گویا ان چیزوں کی جو حقیقت ہے وہ تو یہی ہے کہ پتھر کے ٹکڑے ہوتے ہیں' تم نے ان کا ایک نام رکھ دیا تو اس کی بنا پہ یہ ساری ان کی جو عظمت تھی وہ قائم ہوگئی۔ان کا نام ہٹا دیجیے یہ پتھر کے پتھر رہ جائیں گے۔ایک چیز ہے' وہ فی الحقیقت اپنی کچھ خاصیت رکھتی ہے' وہ شے ہوتی ہے' اس کی ہستی ہوتی ہے' اس کی خاصیتیں ہوتی ہیں' اس کی صفات ہوتی ہیں' اس کے خواص ہوتے ہیں (مثلاً) پانی ہے۔اس کی خاصیت ہے کہ وہ اپنا وجود رکھتا ہے' اس کے خواص ہیں' کچھ پیاس بجھاتا ہے' زندگی بخشتا ہے۔ہمارے ہاں اس کا نام پانی ہے' ذرا آگے چلے جائیے تو اسے فارس والے آب کہتے ہیں' عربوں کے ہاں جائیے تو وہ مآء کہتے ہیں' انگریزوں کے ہاں جائیے تو وہ اسے Water کہتے ہیں اور زبانوں میں بھی اس کے اور نام ہوں گے۔اتنے نام تو ہمیں بھی معلوم ہیں' تو یہ جو الگ الگ نام ہیں' ہم نے پانی کہہ دیا' اس نے آب کہہ دیا' یہ نام کے بدلنے سے اس کے خواص نہیں بدلتے کیونکہ اس کے خواص خود متعین ہیں (کہ) وہ اپنی ہستی رکھتا ہے' وہ پانی وہ پانی ہی ہے' ایران میں پہنچ کر اگر آپ پانی کہیں گے تو وہ بات نہیں سمجھیں گے اُسے آب کہہ دیں گے تو آپ کہیں گے کہ یہ صحیح ہے۔نام سے اس چیز کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا' وہ اپنی حیثیت خود رکھتا ہے' وہ اپنے خواص رکھتا ہے' تمہارے پانی کہنے سے' اس کے آب کہنے سے' اس کے مآء کہنے سے' اس کی حیثیت میں' اس کی ہستی میں' اس کی خاصیت میں' فرق نہیں آتا۔وہ وہی چیز ہے لیکن جو فی الواقع وہ چیز نہیں ہے' پتھر کا ٹکڑا ہے تو خدا نہیں ہے' وہ تو پتھر ہے' تم نے اس کا نام رکھا تو خدا بن گیا' نام ہٹا دیجیے پتھر رہ گیا' پانی کا نام آب کہہ دیجیے' مآء کہہ دیجیے' Water کہہ دیجیے' اس کا کچھ نام رکھ دیجیے اس نام کی وجہ سے پانی اپنی خاصیت نہیں رکھتا' وہ بالذات اپنی خاصیت رکھتا ہے' اپنی حیثیت رکھتا ہے' اپنی شخصیت رکھتا ہے' اپنے خواص رکھتا ہے' بالذات پانی پانی ہے' کسی نام سے پکارو۔

قائداعظمؒ کی گاندھی سے ایک خوبصورت چپقلش اوراس کے سوٹ کیس میں رکھی گئی مورتی کی پوجا کا ذکر

یہ جو الفاظ میں نے کہے' قائداعظم یاد آ گئے۔ (موہن داس) گاندھی سے تو ان کی ہمیشہ چپقلش رہتی تھی اور جس زمانے میں ان کا آپس میں مذاکرات کرنے کا دور تھا تو وہ اس میں کسی نے لکھا تھا کہ گاندھی نے کہا تھا کہ مجھے آپ بتائیے کہ میں آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کیا کروں؟ قائداعظم کہا کروں' مسٹر جناح کہا کروں' مائی برادر لکھا کروں' کیا کہہ کر آپ کو مخاطب کروں' تو وہ تو مسلمانوں کا قائداعظم تھا اور مقابل میں گاندھی تھے جب بھی مذاکرات کا دور آتا تھا تو ان کی بحث ہو جایا کرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ گاندھی! کیا کہتے ہو نام! نام میں کیا رکھا ہے' پھول کو کسی نام سے پکارو' وہ تو پھول ہی ہوتا ہے۔ کیا بات تھی صاحب! اس شخص کی! ہمارے ہاں نام کی وجہ سے عزت بنتی ہے۔ تم نے پتھر کو تراش کر کرشن بنالیا تو وہ کرشن ہے۔ گاندھی کا وہ جو سوٹ کیس ہوتا تھا' اس کے اندر بت ہوتے تھے۔ جب پہلی ملاقات ہوئی تو سوٹ کیس سے نکال کر ان کا بت سامنے رکھا ہوا تھا' اس نے اسے سجدہ کیا۔ اس زمانے میں' میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ تو اللہ کا احسان ہے کہ قرآن کریم نے یہ حیثیت دی تھی کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہے کہ اپنے ہاں سے وہ اتنی سی مورتی نکالتا ہے اور اس کے سامنے سجدہ کرتا ہے' اس نے کارنامہ کیا کرنا ہے؟ تو اتنی بڑی بات تھی' قائداعظمؒ نے یہ کہہ دی کہ تمہارے ہاں لفظ کو اہمیت حاصل ہے' نام کو اہمیت حاصل ہے' ہمارے ہاں وہ پتھر ہی ہوتا ہے' پھر ان کے ہاں اسی پتھر سے بنا کر انہوں نے ''کرشنا'' کہہ دیا تو وہ ایک Sect یا ایک فرقہ بن گیا' وہ خدا ہوا' اسی قسم کے پتھر کے ٹکڑے کا انہوں نے دوسرا نام ''راما'' رکھ لیا' تو دوسرا خدا بن گیا۔

اب آپس میں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ کس چیز پہ لڑائیاں ہوتی ہیں؟ کہ دونوں نام نہ رکھتے' وہ پتھر اب بھی باہر چٹانوں کی صورت میں پڑے ہوئے ہیں' وہاں ان کی تو لڑائیاں نہیں ہوتیں' ان پتھروں کو جب کچھ نام دے دیا تو اب دیکھیے! اس میں وجہ تفریق وتخصیص کیا چیز ہوگئی؟ وہ جو نام رکھ دیتے' وہ ان کے ہاں خدا بن جاتے' اس خدا کا نام ''راما'' ہو جاتا اور ادھر دوسرے کا نام ''کرشنا'' ہوتا تو یہ ادھر والا رام بن جاتا اُدھر والا کرشن بن جاتا' ادھر والا برہما بن جاتا۔ کہا ہے کہ اِنۡ هِىَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23) یاد رکھو! ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک مشرک کی تعریف

عزیزانِ من! ہم مطمئن ہیں' فخر سے کہتے ہیں کہ بہرحال ہم بت پرست نہیں ہیں۔ بہت اچھی بات ہے جو قرآن حکیم نے کہا ہے کہ بہت سے تم میں سے مومن کہلاتے ہوئے بھی مشرک کے مشرک ہی ہوتے ہیں۔ کبھی سوچا بھی کہ وہ کون ہیں جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے؟ کہنے والا خدا ہے۔ کسی کے پیچھے نہ پڑ جایئے کہ ہمیں تم نے یہ کیا کہہ دیا ہے۔ تم نے نہیں کہہ دیا' وہ خدا ہے جو کہہ رہا ہے' اور کیا کسی کو بھی' کسی

سے بھی آپ نے یہ سنا ہے' جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں مشرک ہوں؟ وہ کہہ رہا ہے کہ تم میں مشرک نہیں کہتا' میں اپنے آپ کو بت پرست نہیں کہتا۔ یہ ضرور ہے کہ ایک پتھر کی تو نے قدر کی' اس کا نام آپ نے ''داتا صاحب'' رکھ دیا' اگر وہ اسی طرح کی قبر رہتی اور وہاں یہ نام نہ رکھا جاتا تو جیسی وہاں ایک اور قبر ہے' اتفاق سے اسی کی طرح کی ایک اور قبر ہوتی۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ یہ جتنے بھی ''داتا صاحب کا دربار'' کہنے والے ہیں' وہ ''داتا صاحب'' کی قبر کو دربار نہ کہیں' اس کو یہ قبر ہی کہیں اور اگلی جنریشن آ جائے تو اس کو یہ معلوم نہ ہو تو اس کی یہ قبر وہی چونے اور پتھر کی رہ جائے گی۔ اس کی حیثیت یہ ہو گی۔ یہ نام ہے جو ہم نے دے دیا۔ یہاں کئی قبریں ہم نے ایسی دیکھی ہیں' ہماری زندگی میں ایسا ہوا ہے کہ وہ قبر کی قبر تھی' کسی کے ذہن میں کچھ آیا' اس کا کاروبار چلتا نہیں ہو گا' اس نے آ کر اس پہ جھنڈی گاڑی' اس کے اوپر ایک چادر پھینکی' اس کے اوپر ایک دیا جلایا' جمعرات کے دن یا کسی دن بھی جا کر ڈھول بجایا' اس کے بعد اعلان کر دیا کہ یہ فلاں حضرت صاحب قبلہ ہیں' فلاں جگہ سے تشریف لائے تھے' اور آج ان کا عرس ہو گا' اور اس کے بعد آپ دیکھیے کہ مخلوقِ خدا جمع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اس نے کچھ نام رکھ دیا جب نام نہیں رکھا تھا تو وہ قبر ہی تھی' نام رکھ دیا' دربار ہو گیا' نام ہٹا دیجیے' قبر رہ گئی۔

''داتا صاحب'' کے مزار کے متعلق مولانا احمد علیؒ کا انکشاف کہ آپ کی ذات یہاں دفن ہی نہیں: اسے دبا دیا۔ کیوں؟

آپ کو شاید یاد ہو گا کہ مولانا احمد علی مرحوم نے یہ کہا تھا کہ یہ جو ''داتا صاحب'' کا مزار ہے' حقیقت میں ''داتا صاحب'' یہاں دفن نہیں ہیں' ان کا مزار تو قلعے میں' انہوں نے کوئی جگہ بتائی تھی کہ وہ وہاں دفن ہوئے تھے' تو اس زمانے میں تو یہ سارے متولی تھے۔ یہ بڑی ریاست' جو ان کے نام کے ساتھ منسوب ہے' وہ سارے اس کے مالک تھے۔ انہوں نے اس کی بڑی مخالفت کی' اور ایسی کوشش کی کہ یہ آواز اٹھنے نہ پائے کیونکہ اگر یہ پتہ چل جائے کہ یہ ''داتا صاحب'' کا مزار نہیں ہے اس کے بعد یہ خالی قبر کی قبر رہ جائے گی' دربار رہے گا ہی نہیں' وہ بنے یا نہ بنے' اگر یہ مشہور ہو جائے کہ یہ ''داتا صاحب'' کا مزار نہیں ہے' تو اس کی حیثیت قبر کی رہ جاتی ہے۔ نام دے دیجیے' ساری عظمتیں اس میں آ جائیں گی۔ کس چیز میں یہ عظمت ہے؟ کہا ہے کہ اَسۡمَآءٌ سَمَّيۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُكُمۡ (53:23) ''اَنۡتُمۡ'' کا تو ہم دیکھتے ہیں' ہمارے سامنے ہے' قبریں دربار بنتی ہیں اور ''اٰبَآؤُكُمۡ'' جو چلی آ رہی ہیں' تو جو شے فی الحقیقت کچھ اور ہو' اور اس کا نام دے کر اس کی عظمت کو بلند کیا جائے' نام ہٹا دیا جائے تو وہ باقی وہی کچھ رہ جاتی ہے۔ اصل چیز وہی ہے۔ قائداعظم نے جو مثال دی تھی کہ وہ ''پھول ہونا چاہیے'' اس کا کچھ بھی نام رکھ دیجیے' وہ فی الحقیقت پھول ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ فی الحقیقت کیا ہے۔ کہا کہ جن کو تم یہ خدا بنائے بیٹھے ہو' جب تم نے ان کا نام نہیں رکھا تھا' تو یہ پتھر تھے۔ اگر آج یہ نام ان میں سے ہٹا دیا جائے' کسی کو معلوم نہ ہو' تو یہ پتھر ہیں کیونکہ فی الواقعہ' فی ذاتہٖ یہ پتھر ہیں' خدا نہیں ہیں' اور جو فی الواقعہ خدا ہے' اقتدار اس کی ذات میں ہے۔

خداتعالیٰ کی ذات اپنے ناموں کی صفات سے متعارف ہے' وہ تو کائنات کے وجود سے پہلے بھی خدا تھا اور آخر بھی خدا رہے گا

کیا بات ہے صاحب قرآن حکیم کی! پھر سن لیجیے کہ فی الواقعہ ان میں کوئی قوت نہیں' کوئی اقتدار نہیں' کوئی خصوصیت نہیں' پتھر کے ٹکڑے ہیں' تم نے ان کا نام رکھ دیا' خدا کہہ دیا' وہ خدا ہو گئے' یہ نام نہ رکھو' پتھر رہ گئے' اس کا نام الٹ کر ادھر رکھ دیجیے تو پھر یہ لات کا منات ہو جائے گا اور منات کا لات ہو گیا۔ یہ فی الواقعہ تو ان کی یہ بات کچھ ہے ہی نہیں' یہ تو نام ہیں' جو فی الواقعہ کچھ ہیں (مثلاً) پانی ہے' فی الواقعہ پانی ہے' اسے آب کہیے' مآء کہیے' Water کہیے' پانی پانی رہتا ہے' اس کی خاصیت وہی رہتی ہے' اس کے خواص وہی رہتے ہیں' پھول پھول رہتا ہے' کسی نام سے اس کو پکار لیجیے۔ کہا کہ یہ تو ان کے صرف ناموں کی حیثیت ہے۔ ایک ذات ایسی ہے' جسے خدا ہونا زیب دیتا ہے' وہ فی الواقعہ اپنا وجود رکھتا ہے' اس کے وجود کے اندر خدائی ہے' اقتدار اس کی ذات کے اندر ہے' نام کی بات نہیں ہے' نام اس کے بھی الگ الگ کہیں۔ یہ نام ذات کے اعتبار سے الگ الگ ہیں قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (17:110) کہہ دو کہ تم اپنی نگاہ حقیقت پر رکھو' لفظی نزاع میں نہ پڑو۔ تم خدا کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر' اس سے اصل حقیقت میں کچھ فرق نہیں پڑتا مگر تم ہو کہ نام کے اوپر تم بہت ناز کرتے ہو۔ نام کی کیا بات ہے؟ کہا کہ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (17:110) اسے کسی نام سے پکارو' خدا خدا ہی رہتا ہے۔ بڑی عجیب چیز ہے وہ اس لیے اللہ نہیں بن گیا کہ تم نے اللہ کہہ کر اس کو پکار دیا تو وہ الٰہ حقیقی بن گیا' سارے اقتدارات اس کے اندر سمو دیئے۔ یہ بات نہیں ہے۔ ہم اسے اس نام سے نہ بھی پکارتے تو پھر بھی وہ اپنی ذات کے اندر وہی تھا' یہ خصوصیات' یہ صفات رکھتا ہے۔ تمہارے ناموں کی وجہ سے وہ ایسا نہیں ہو گیا۔ یہ نہیں ہے کہ تم اس کو رزاق کہو تو وہ رزاق ہو گیا' تم یہ کہنا چھوڑ دو تو وہ رزاق نہ رہے' ساری دنیا بھی خدا کے وجود سے انکار کر دے تو وہ پھر بھی اپنی ذات میں برقرار رہے گا۔ ایک ماننے والا بھی نہ رہے' جب کوئی بھی ابھی پیدا نہیں ہوا تھا' تو وہ تو اس وقت بھی خدا تھا۔ جب کوئی نہیں رہے گا تو وہ اس وقت بھی خدا رہے گا۔ نام کی تبدیلی تو ایک طرف رہی' کوئی اس کو ماننے والا' خدا کہنے والا' بھی نہیں رہے گا یا نہیں تھا' تو وہ اس وقت بھی خدا تھا اور اس کے بعد بھی وہ خدا ہے۔ کہا کہ تم ان ناموں کے اوپر پر عظمت ہو' نام کی بات نہیں ہے' وہ اپنی ذات میں اللہ ہے' اسے کسی نام سے پکار لو' وہ وہی ہے۔ اس نے قرآنِ کریم میں یہ جو ہم مختلف نام کہتے ہیں کہ وہ رحیم ہے' رحمٰن ہے' یہ اس کی صفات ہیں' یہ اگر تم پانی کے متعلق نہ بھی کہو' تم نہ بھی مانو' تو وہ پیاس بجھائے گا۔ وہ جب تک پانی ہے' اس کی یہ خصوصیت باقی ہے۔ ساری دنیا بھی مل کر کہہ دے کہ پانی پیاس نہیں بجھاتا' تو پھر بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا خدا ہی رہتا ہے کیونکہ وہ تمہارے دلوں میں' ناموں کی وجہ سے' ایسا نہیں بن گیا ہوا' وہ بالذات ایسا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ

یہ کیا بات کہہ گیا ہے پھر ان سے کہا کہ اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ (53:23) کیا بات ہے اس انداز کی! کہ اس کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں کہ تم نے ان کا نام یہ رکھ دیا تو یہ بن گئے:

تمہیں تو ''تم'' کے سوا کوئی کچھ نہ کہتا تھا

''حضور'' ہم نے بنایا ' ''جناب'' ہم نے کیا

کسی کو حضور اور جناب کہنے سے وہ بنتا ہے' وہ تو وہی ہوتا ہے۔ وہ ذات ایسی نہیں ہے کہ ہمارے جناب اور حضور کہنے سے وہ ایسے بن جائے۔ وہ اپنی ذات میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

پتھروں سے تراشیدہ بتوں سے مرادیں پوری کرانے کی امیدیں اور حضرت صاحب کے نام پر نذرانے کی داستانیں

عزیزانِ من! آپ نے دونوں میں فرق دیکھ لیا کہ خدا کے بھی اسماء ہیں' ان کے بھی اسماء ہیں' دونوں میں کس طرح فرق کر کے بتا دیا کہ ان دونوں کے اندر فرق کتنا ہے۔ یہاں تو یہ پتھر کے بتوں کو ہی کہا ہے' دوسرے مقام پہ سوال پتھر کا ہی نہیں' انسانوں نے انسانوں کو یہ جو حاکم بنایا ہے یعنی یہ جن کو بت بناتے ہیں' یہ جن کو پوجتے ہیں' ان کو یہ صاحبِ اقتدار مانتے ہیں کہ ہماری مرادیں پوری کرتے ہیں' ان کی اگر کسی طرح سے توہین ہو جائے تو غضب نازل ہو جاتا ہے' یعنی ان بتوں کو تو خیر میری تو بہر حال ایک آدھی زندگی ان کے ساتھ گزری ہوئی ہے' میں جانتا ہوں کسی بڑے مزار کی طرف ادھر پشت کر کے آ جایئے اور اس کے بعد دیکھیے اگر وہ عقیدت مند رہے' اس پہ بیتتی کیا ہے: روتا گڑگڑاتا ہے کہ پتہ نہیں اب کیا عذاب مجھ پہ نازل ہو جائے گا' میں نے حضرت صاحب کی توہین کر دی' نذرانے مانتا ہے' نیازیں دیتا ہے کہ میں نے ان کی توہین کر دی۔ سوچیے! کہ ذہنی طور پر کتنا ڈر رہے! اپنے کمرے کی تنہائیوں کے اندر' اگر ان حضرت صاحب' کہ جو زندہ بھی نہیں ہیں' قبر میں ہیں' کے متعلق کوئی بات ذہن کے اندر بھی گزرتی ہے' تو یہ چیخ اٹھتا ہے کہ شیطان نے یہ وسوسہ میرے دل میں پید کر دیا۔ یا حضرت! میں ایسا نہیں' میں تو آپ کو وہی کچھ مانتا ہوں' اب بھی وہی کچھ مانتا ہوں۔ ڈر رہا ہے' خوف کھا رہا ہے کہ یہ کیا ہے۔

اذہان اور اعصاب پر حکومت' عذاب کی نوعیت اور لفظ تعبدون کا مفہوم اور مروجہ قرآنی تراجم کی نوعیت

دنیا کے حاکم ہیں' ان کی حکومت تو صرف جسموں پر ہوتی ہے مگر ان کی یہ حکومت قلوب واذہان اور اعصاب پر ہوتی ہے۔ دل میں گزرنے والے خیال پر بھی کسی کی گرفت نہیں ہو سکتی لیکن یہ تو ان کے خلاف اگر دل میں کوئی خیال گزرتا ہے تو اس میں بھی وہ شخص جو عقیدت رکھتا ہے کانپ اٹھتا ہے۔ یہ اتنی بڑی گرفت ہے اور پھر یہ جو دنیاوی حاکم ہوتے ہیں' ان کا ڈر' ان کا خوف' ان کی گرفت کا تو ہمیں

پتہ ہے صاحب!

یہ کہاں کہا ہے قرآن کریم نے! سورۃ یوسف میں کہا ہے کہ جو وعظِ یوسفی ہے' وہ عظیم حقیقت رکھتا ہے۔ ہر نبی کا وعظ ایک عظیم حقیقت رکھتا ہے۔ کہا ہے کہ یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ (12:39) اے قید خانہ کے ساتھیو! تم یہ بتاؤ کیا مختلف مالکوں کی نوکری اچھی ہے یا ایک کی؟ کیا بات ہے اس آیت کی! کہا ہے کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْھَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ (12:40) یہ جو کچھ تم محکومیت اختیار کیے ہوئے ہو' ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تم نے ان کا ایک نام رکھ لیا اور وہ صاحبِ حکومت بن گئے' صاحبِ اقتدار بن گئے۔ جہاں بھی قرآن کریم نے مَّآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِھَا مِنْ سُلْطٰنٍ (12:40) کہا ہے' وہاں بھی یہ کہا ہے کہ صاحبِ اقتدار وہی ہے جس کی سند خدا کی طرف سے ملے۔ تمہارے نام رکھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں یوں کہا جائے گا۔

مَا تَعْبُدُوْنَ کے جو عام ترجمے ہوتے ہیں' وہ یہی ہیں کہ تم جو پرستش کرتے ہو۔ کہا ہے کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں اور فوراً ہی توجہ بتوں کی طرف مبذول کرا دیتے ہیں۔ میں نے جیسا عرض کیا ہے' اب آپ احباب کو تو پتہ ہے' درس سنتے ہوئے پچیس سال ہو گئے۔ یہ ''عبادت'' یہ ''تعبدون'' محکومیت کے معنی میں آتا ہے اور ابھی اس آیت میں آپ دیکھیے جو پہلے آئی ہے۔ کہا ہے کہ ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ (12:39) متفرق مالکوں کے یہ نام ہیں جو تم نے رکھ لیے ہیں۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (12:40) خدا کے سوا حکومت کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہاں بتا دیا کہ ''تَعْبُدُوْنَ'' کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے' کسی انسان کو نہیں۔ سوال یہاں پتھر کے ٹکڑوں کے سامنے جھکنے کا نہیں ہے' کسی انسان کا کسی انسان کے سامنے جھکنا بھی تذلیل انسانیت ہے' بہت بڑا شرک ہے۔ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے جو عملاً اس کی کتاب کی رو سے نافذ ہوتا ہے۔ خدا کی حکومت اس کی کتاب کی حکمرانی کا نام ہے۔

عزیزانِ من! عام انسان تو ایک طرف رہے' اس نے تو صاف کہہ دیا ہے کہ مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَ الْحُکْمَ وَ النُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا' خواہ اسے حکومت حاصل ہو' قانون حاصل ہو' نبی بھی کیوں نہ ہو کہ وہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں' میرے بندے بن جاؤ۔ جونہی آپ نے کسی انسان کی محکومیت اختیار کی شرک ہو گیا۔ اُس نے کہا ہے کہ لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا (18:26) وہ اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق نبی کہہ کر کہا کہ ان کو بھی حق حاصل نہیں۔ حضور ﷺ کا خود یہ فرمان ہے کہ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48) تم بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے کرو:

حکمراں ہے اک وہی ' باقی بتانِ آذری

وحی کی راہنمائی سے ہٹ کر کوئی سند قبول نہیں کی جائے گی

اپنے ہاتھوں سے تراشا ہوا پتھر کا ٹکڑا ہو یا اپنے تصور میں قائم کیا ہوا وہ کوئی قبروں والا خدا ہو یا اب تسلیم کیا ہوا ہو' ظاہر ہے' آپ کے ہاں کا خدا جہاں بھی حکمرانی کتاب اللہ کی نہیں ہے' وہاں یا تو آپ کے وہاں کی کوئی سند حاصل ہو جائے گی جیسے یہ دیوی دیوتا یا ارباب یا مزاروں کے یا کوئی انسان وہ کہیں بھی ہو اور باقی جتنے بھی ہیں۔ قرآن حمید کہتا ہے کہ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ (12:40) یہ اسماء ہیں' نام رکھ دیئے ہیں تم نے' حقِ حکومت اُسی کا ہے تو اسی لیے اللہ نے اپنی ذات کا نام اللہ کہا ہے تو وہ یہی الہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں۔ کہا کہ اَسۡمَآءً سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ مَّآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ (12:40) یاد رکھو! ان دیوی دیوتاؤں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے اس کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ ویسے دلائل سے تو نہیں ہیں۔ آپ نے ان عقائد کے جواز میں بھی کوئی دلیل دی ہے؟ انسان دلیلیں دیتا ہے تو ہر انسان جسے Justificatory Reason (وجہ جواز) کہتے ہیں' وہ چیزیں تو ہر ایک شخص اپنے اپنے مسلک کے برسرِ حق ہونے کے لیے دیتا ہے۔ قطعاً دلیل نہیں اور سند وہ ہے جو خدا کی دی ہوئی ہے۔ کہا ہے کہ خدا کی سند پیش کرو کہ اس نے اس کو صاحبِ حکومت بنایا ہے' اس نے یہ کہا ہے کہ اس کے سامنے جھکو' پھر تو یہ بات ہے تمہارے اپنے اسلاف سند نہیں اور خدا نے کوئی اس قسم کی سند دی ہی نہیں کہ جو غیر خدا ہے اس کا بھی حکومت کا حق ہے۔ کہا ہے کہ اِنۡ يَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهۡوَى الۡاَنۡفُسُ (53:23) یہ ظنِ انسانی ذہن کی تراشیدہ چیزیں ہیں' یہ جتنی بھی ہیں' یہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ایک تو چیز ہے کہ پانی ایک حقیقت ہے' جیسے پانی ہے تو اس کے وہ خواص بھی اس کے اندر موجود ہیں' جو خدا نے عطا کیے ہوئے ہیں۔ وہ ظنی چیز نہیں ہے۔ وہ ایک حقیقی شے ہے۔

انسان اپنے جذبات کی تسکین کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتا

یہ چیز کہ پتھر کے ٹکڑے کو تم نے خدا بنا لیا یا کسی انسان کو خدا سمجھ لیا' یہ تمہارے اپنے ذہن کا تراشیدہ ہے' فی الحقیقت ایسا نہیں ہے۔ جو کچھ بھی فی الحقیقت وہ نہ ہو جو اس کا نام رکھا گیا ہے' یہ ظن ہوتا ہے' یہ یقینی چیز نہیں ہے' یہ حقیقی چیز نہیں ہے اور یہ ظن کیوں پیدا کرتے ہو؟ اس لیے کہ اس سے تمہارے جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے' واہ واہ واہ! ساری یہ بات ہے صاحب! کہ وہ جذباتی چیز ہے۔ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ یہ جذباتی چیز نہیں ہے۔ اس کے پینے سے جذبات کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ حقیقت ہے۔ اس سے پیاس بجھتی ہے۔ پیاس بھی تسکین ہوتی ہے' جو سراب ہے وہ جذباتی چیز ہوتی ہے' وہ ہمارے ذہن کا پیدا کردہ پانی کا تالاب ہوتا ہے۔ اس کے پاس جا کر دیکھیے تو اسی قسم کا

صحرا ہوتا ہے' تو کہا کہ یہ جتنی چیزیں تمہارے ذہن کی تراشیدہ ہیں' جن کو تم نے خدا بنا رکھا ہے' صاحبِ اقتدار سمجھ رکھا ہے' یہ تم اس سے وہ کچھ پورا کرتے ہو تو تمہارے جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے۔

حکومت کی بجائے خدا کی پرستش کا عمل خالصتاً ایک جذباتی چیز ہے

عزیزانِ من! جسے خود خدا کی بھی پرستش کہتے ہیں' یہ کی جائے تو اس کا تعلق جذبات سے ہی رہتا ہے' اس کی محکومیت اختیار کی جائے تو یہ جذباتی چیز نہیں ہے۔ یہ تو فی الحقیقت اس کا حکم ہے کہ چیز آئے گی' تمہاری اطاعت کی گئی ہے۔ وہ اطاعت تو اس چیز کی ہے کہ تم نے خدائی کو تسلیم کیا ہے' اطاعت نہیں کی ہے تو اس کو تم نے خدا تسلیم نہیں کیا ہے' وہ جذباتی چیز نہیں ہے' مذہب جذباتی چیز ہوتی ہے۔ اس میں جو بھی چیز ہے وہ پرستش کی ہے' چیزوں کو' رسوم کو' جو اس میں تم ادا کرتے ہو' اس سے تمہارے جذبات کی تسکین ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سے ہٹ کر پوچھا جائے کہ تمہیں کیا ملا ہے تو تم بتا نہیں سکتے' صرف یہ ہے کہ ٹھنڈ پے جاندی اے جی! کلیجے نوں۔ (جی! کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے)۔

پیر اسی شخص سے مالی فائدہ اٹھاتا ہے جو شخص اسے اپنا پیر سمجھے' دیکھیے اس میں دین خداوندی نے کیا کہا

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ تیرے جی نوں پے جاندی اے' میرے نوں تے نئیں پیندی۔ کیوں نئیں پیندی میرے؟ (تمہارے دل میں ٹھنڈک پڑ جاتی ہے مگر میرے دل میں نہیں۔ یہ ٹھنڈک کیوں نہیں پڑتی؟) اس لیے کہ میں نے اسے خدا نہیں تسلیم کیا جسے تم نے خدا تسلیم کیا ہوا ہے۔ یہ جذباتی چیز ہے۔ پھر وہی ہمارا پنجابی زبان کا محاورہ آ گیا۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ پیر مندیاں نوں کھاندا اے' اے جیہڑا اس بندے دے پتر نوں پیر من لے' بس فیر ٹھیک ہے اوہ اونوں کھاندا اے۔ جیہڑا اونوں بندہ ای سمجھدا ہیگا' اونوں کی کھانا ہیگا' او تے ٹکا نئیں دیندا: چل او چل کم کر' کوئی کما کے کھا (پیر ماننے والوں کو ہی کھاتا ہے' یہ جو اس پدر بشر کو پیر مان لے بس پھر تو ٹھیک ہے' وہ اُسے ہی کھاتا ہے۔ جو اسے بشر ہی سمجھتا ہے اس نے اُسے کیا کھانا! وہ تو ٹکا تک نہیں دیگا: چل بے چل کوئی کام کر)۔ لیکن جس نے اس کو پیر تسلیم ہی کر لیا ہے وہ اُسے کھائے گا۔ یہ کیا ہے؟ کہا ہے کہ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَاٰبَآؤُکُمۡ (53:23) یا تمہارے باپ دادا نے کہہ دیا تھا کہ وڈے پیر جی اوندے پئے نیں (وہ بڑے پیر صاحب آ رہے ہیں) تم نے ان کو تسلیم کر لیا وہ تو عظیم الشان ہستی آپ کے ہاں کی' کہتی ہے کہ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ (41:6) پیر نہیں کہتا' میں تہاڈے ورگا بندہ ہیگا واں (میں اپنے آپ کو پیر نہیں کہتا۔ میں تم جیسا ہی ایک بشر ہوں) وہ یہ کہہ دے تو دوکانداری ختم ہو گئی اور وہ جو کہتا ہے میں تمہارے جیسا بشر ہوں اس لیے کہ اس کی دکانداری نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں تم سے اس کا کوئی صلہ نہیں مانگتا جو میں تم سے کہتا ہوں' وہ کوئی صلہ نہیں ہے۔

عزیزانِ من! ہدایت وہی دے سکتا ہے جو صلہ نہ مانگے۔ یہ دکانداری نہیں ہوتی۔ قرآن حمید کیا بات ظن کے ساتھ کہہ گیا ہے کہ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (53:23) یہ ساری جذباتی چیزیں ہیں جو تم مان رہے ہو۔ مذہب جذبات پہ قائم ہوتا ہے' الدین حقائق پہ قائم ہوتا ہے۔ اس نے اطاعت کی ہے اپنے خدا کی' وہ عملاً موجود ہے کہ کی گئی ہے تو وہ تو پھر خدا کو خدا مانا ہے۔ مذہب کے اندر اگر اپنے طور پر ہی تم نے تسبیح کے دانے کے اوپر اللہ کا نام لے کر گننا شروع کر دیا تمہارے جذبات کی تسکین ہوگئی۔ خدا کو تم نے الہٰ نہیں مانا۔ اطاعت اور خداؤں کی کرتے رہے' پرستش تم نے اپنے ذہن میں ایک تراشیدہ خدا کی' یہ جذبات کی تسکین ہوگئی' فی الحقیقت نہیں مانا گیا۔ یہاں اس کی کتاب کی اطاعت مقصود ہے۔ حکمرانی مقصود ہے۔ کہا ہے کہ مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ (53:23) مقصد اس سے اپنے جذبات کی تسکین ہے اور بات آگے اگلے ہی ٹکڑے میں صاف کر دی۔ یہ لمبی چوڑی بحثوں کی بات ہی نہیں ہے۔ بات تو اتنی ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (53:23) اس کی طرف سے راہنما کتاب آ گئی' ہدایت آ گئی۔

سوال اب یہ ہے کہ اب اس کے مطابق عملاً کون چلتا ہے یعنی قرآن حمید یہ نظری بات نہیں رہنے دیتا' وہ جو چیز ہے کہ یہ خدا کی حکومت ہے وہ ہمارے ہاں بھی' جو آئین سب سے پہلے بنا تھا غالباً اب بھی یہ ٹکڑا چلا آتا ہے کہ کائنات میں تمام مقام پر خدا کا اقتدار ہے' جناب! Sovereignty belongs to Allah کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں' باہر کی دنیا کے اندر' اقتدار اللہ کا ہے اور اپنی دنیا میں ہمارا اقتدار ہے' بھئی! یہ تم کون ہوتے ہو؟ کہ جی! ہم خدا کے نام پر یہ اقتدار تم سے لیتے ہیں' اس کے نام پہ اس نے تمہیں یہ کون سی سند دے دی تھی کہ جاؤ! میرے نام پہ اقتدار لیتے رہو۔ کیا ان کے پاس کوئی ایسا سرٹیفکیٹ ہے؟ وہ تو اپنے رسول سے بھی یہ کہتا ہے کہ وَلَقَدْ جَآءَ هُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (53:23) نظری باتیں نہیں ہیں' پتھر کے ٹکڑے نام رکھنے سے خدا نہیں بن جاتے۔ خدا کو جذباتی طور پر تم خدا مانتے چلے جاؤ تو وہ بھی خدا کا ماننا نہیں ہے۔ ''اس کی طرف سے ہدایت آئی ہوئی ہے' اس کی طرف سے کتاب موجود ہے' اس کی اطاعت کرو گے تو تم اس کو خدا مانو گے۔'' اس صورت میں تم اپنے آپ کو یوں کہہ سکتے ہو کہ میں خدا کو حاکم مانتا ہوں اور کسی کو نہیں مانتا۔

ہندو کے نزدیک کائناتی قوتوں کو ہی خدا مانا جاتا ہے: اٹھو! قوانینِ فطرت کو مسخر کرو

اگلی آیت میں یہ آیا ہے کہ یہ پتھر کے ٹکڑوں کو ہی خدا نہیں مانتے۔ تم یہ ہو کہ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا ❶ (53:26)۔ ہمارے قریب تریں تو یہ ہندو تھے جن کا ہم نے خود مطالعہ نہیں' بلکہ ان چیزوں کا مشاہدہ کیا کہ یہ جتنی فطرت کی قوتیں ہیں' وہ انہیں بھی خدا مانتے ہیں (مثلاً) بادلوں کو خدا' گرج کو خدا' چمک کو خدا' آگ کو خدا' گنگا اور جمنا کو خدا' گائے اور بیل کو خدا۔ اصل یوں ہے کہ جب یہ قوم اُدھر سے آئی ہے تو یہ گنگا جمنا کی پہنائیوں میں Settle (سکون پذیر) ہوئے ہیں' زراعت ان کی معیشت

---

❶ اس کی وضاحت اگلے درس میں کی گئی ہے۔

(Agricultural Economy) تھی۔ زراعت پیشہ تھے۔ پہلے پہل تو یہ جتنی چیزیں کھیتی باڑی کے لیے مدد و معاون ہو سکتی تھیں وہ تھیں اس لیے وہ گائے خدا اور بیل خدا' وہ ان سے ہل چلاتے تھے' گنگا اور جمنا جہاں پانی تھا' جہاں یہ دریا نہیں تھے' بارش تھی اس لیے بارش خدا' بادل خدا' حرارت خدا' سورج خدا۔ یہ چیزیں فائدہ دیتی تھیں۔ جن سے ڈرتے تھے (مثلاً) شیر سے ڈرتے تھے' سانپ سے ڈرتے ہیں' اس کے سامنے بھی ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ بادل کو تم نے دیوتا بنالیا' تو بادل دیوتا بن گیا۔ بادل تو بادل ہی تھا۔ جب تم اس کو دیوتا نہیں کہتے تھے تو وہ بادل ہی تھا۔ ان کے ہاں بھی وہ بادل ہی ہوتا ہے۔ کہا کہ سَمَّيْتُمُوْهَآ (53:23) تم نے اس کا نام دیوتا رکھ دیا تو وہ دیوتا نہیں ہو گیا۔ جن قوموں نے اس کو دیکھا کہ وہ یعنی فطرت کی قوتیں ہیں' انہیں تسخیر کیا' وہ مقام آدم پہ آ گئیں۔ میں پھر کہوں گا کہ جن قوموں میں قرآن حمید کی کہی یہ چیز آ گئی کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (45:13) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جتنی فطرت کی قوتیں ہیں' وہ تمہارے لیے تابع تسخیر ہیں۔ اٹھو! یہ قوانینِ خداوندی' قوانینِ فطرت ہیں' ان کا مطالعہ کرو' یہ قوتیں تمہارے اقتدار میں آ جائیں گی۔ یہ تمہارے خدا نہیں ہیں' وہ تم سے تو مسخر ہو جائیں گی' ان چیزوں سے مقامِ آدم بہت بلند ہے یہ تو کچھ شے نہیں ہیں' تو کہا کہ تم نے ان کا نام خدا رکھ لیا تو تم بڑے نہیں بن گئے اور اس کے بعد دیکھیے کہ جب بھی اور جب تک بھی یہ قومیں ان چیزوں کو خدا مانتی رہیں' وہ پست رہیں' ذلیل رہیں' محتاج رہیں' مقہور ہیں۔

مذہب کی دنیا میں خدا کا صحیح اور منزہ تصور پیش ہی نہیں کیا جاتا جس کا نتیجہ مقام انسانیت سے محرومی ہے

عزیزانِ من! جہاں جہاں بھی مذہب رہا ہے وہ قومیں ہمیشہ محکوم رہی ہیں' ہمیشہ کمزور رہی ہیں۔ جوان قوتوں کو اپنا خدا مان لے' جو محکوم ہیں' وہ انہیں حاکم تسلیم کر لیں تو ذلیل تو ہونا ہی ہوا۔ انہیں جب بھی ابھرنے کا خیال آیا' تو انہوں نے اس مذہب کو چھوڑا' سیکولرازم پہ ہی آ گئے سہی' وہ کم از کم مقامِ آدم پہ تو آ گئے' مقامِ مومن تو بہت بلند ہے' وہ آگے جا کر آتا ہے۔ اس مقام پہ تو آ گئے' باقی قوموں کے زمرے میں تو شمار ہونے لگ گئے لیکن جو قوم پتھروں کو خدا بنانے والی' قبروں کو خدا بنانے والی' ذہنوں کے اندر ان کا جو خوف ماننے والی ہے اور اس کو خدا ماننے والی ہے' یہ قوم تو اُن سیکولرازم قوموں کے مقابلے میں بھی نہیں آ سکتی' عزیزانِ من! یہ قوم ان سیکولر قوموں کی بھی محتاج رہتی ہے چہ جائیکہ ساری دنیا سے منہ موڑ کر کہے کہ حَنِيْفًا ط وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (2:135) ہر طرف سے کٹ کر' منہ موڑ کر' میں صرف ایک ذات کی طرف جاتا ہوں۔ اور کسی غیر خدائی تصور کو شریک نہیں کرتا۔ یہ ہے مقامِ مومن صاحب! کہا کہ تم جاتے ہو ان کی طرف' اپنی مرادیں مانگنے کے لیے۔ ان کے ہاں ہر ایک مراد کے لیے الگ الگ دیوتا ہوتے تھے' یہ کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ عربوں کے ہاں بھی بہت سے دیوی دیتا ہوتے تھے' یہ تو بڑے بڑے تھے۔ کہتے ہیں کہ کعبے میں 365 کے قریب بت تھے۔ خیر یہ 365 اس قسم کے پتھر کے ٹکڑے تو ہو نہیں سکتے' وہاں تو اتنی گنجائش ہی نہیں تھی کہ انہیں رکھ سکیں۔ ممکن ہے وہ ان کی تصویریں بھی بناتے ہوں' ان کی بھی پرستش کرتے

ہوں' تو بڑی تعداد میں ہر مراد کے لیے' ہر تقاضے اور ہر ایک مطلب کے لیے' الگ دیوتا بنایا ہوا ہے۔ کہا کہ مراد کے لیے الگ دیوتا بنا لیتے ہو' تو خود تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے دل میں جو طلب پیدا ہوئی' اس طلب کے لیے' اس دیوتا کے پاس چلے گئے' تو وہاں سے یہ ہو گیا۔ کہا کیا ہر فرد کے لیے یہ ممکن بھی ہے کہ جس چیز کی بھی وہ تمنا کرے' وہ پوری ہو جائے؟ کیا تمہارے ہاں یہ ہوتا ہے؟

ذہنی پستی کی انتہا!

عزیزانِ من! پھر وہی بات آ گئی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ میرا تو کسی فرقے سے تعلق نہیں ہے۔ ہم اپنی تمنائیں' اپنی مرادیں' لے کر پتھر کے ٹکڑوں کے سامنے جو یوں کھڑے ہوتے ہیں' کیا ہم نہیں جاتے ہم ان ٹکڑوں کے سامنے جاتے ہیں جو کھڑے بھی نہیں ہوتے' لیٹے ہوئے ہوتے ہیں' وہ تو اس قوم سے کہتے ہیں: گنہگار جھک جائے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا' تو ہم تو ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر جاتے ہیں۔ جب وہ فوت ہوئے تھے' مردہ بدست زندہ' وہ ہمارے ہاتھ میں تھے' جو جی میں آئے ہم ان کے ساتھ کرتے' کسی نے آج تک سنا ہے کہ مرنے کے بعد ان کے جو مرید تھے ان سے کہا ہو کہ اوئے ٹھنڈا پانی نہ پانا...... یہاں دفن نہ کرنا' یہ کچھ نہ کرنا۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہوتا مگر وہ بدست زندہ' ان کے ساتھ جو کچھ جی میں آئے' آپ اپنی مرضی کے مطابق کریں' جونہی آپ نے ان کو ہزار من مٹی کے نیچے دبا دیا' اب وہ تمہاری تقدیروں پر حاکم ہو گئے۔ اب آپ اپنی مرادیں ان کے پاس لے جا رہے ہیں۔ اُف! میرے اللہ! یہ خدا کو ماننے والے ہیں!! کہا کہ یہ کچھ ہوتا بھی ہے جو تم لے کر جاتے ہو تو کیا وہاں سے ہر مراد پوری ہو جاتی ہے؟ کہیے کہ اگر ہر مراد پوری ہو جائے' پھر بھی انسان فریب میں آ جائے گا کہ پوری نہیں ہوتی تو اس کے بعد کہا کہ جی! اس میں بھی وہ تمہارا بھلا ہی ہے جو نہیں پوری ہو رہی' چلیے صاحب! پوری ہو جاتی جب بھی تمہارا بھلا تھا' نہیں پوری ہوتی تو جب بھی تمہارا بھلا ہے۔ انہوں نے تو دامن چھوڑنے ہی نہیں دینا' وہ وہاں جوان قبروں کے اوپر ایک فوج بیٹھی ہوئی تھی' جن کا روزگار چلتا ہے' روٹیاں چلتی ہیں۔ کہا ہے کہ یہ ہوتا کہ اِنۡ هِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَهۡوَی الۡاَنۡفُسُ وَ لَقَدۡ جَآءَهُمۡ مِّنۡ رَّبِّهِمُ الۡهُدٰیo اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰیo فَلِلّٰهِ الۡاٰخِرَةُ وَ الۡاُوۡلٰی (53:23-24-25) یاد رکھو! ان دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے رکھ چھوڑے ہیں (7:71)۔ اللہ نے اس کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ (نہ ہی انہیں علم و بصیرت کی رو سے ان عقائد کے جواز میں کوئی دلیل مل سکتی ہے)۔ یہ لوگ محض اپنے قیاسات کی پیروی کرتے ہیں اور مقصد اس سے اپنے جذبات کی تسکین ہے۔ اس کے مقابلے میں' (جو کچھ' اے رسول! تم پیش کرتے ہو) وہ ان کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ایسا ضابطۂ حیات ہے (جو سرتاپا علم و حقیقت پر مبنی ہے)۔ (تم میں سے ہر شخص اپنی اپنی مرادیں لے کر ان بتوں کے پاس آتا

ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی ہر مراد پوری ہو جائے گی۔ ذرسوچو تو سہی کہ) کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہر شخص کی مراد پوری ہو جائے (مثلاً جب دو شخص ایسی مراد لے کر آئیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوں تو ان دونوں کی مرادیں کس طرح پوری ہو جائیں گی! انفرادی زندگی میں ہمیشہ یہی ہوگا۔ اس کے برعکس' خدا کا عطا کردہ نظام' ایسی اجتماعی زندگی کا تصور دیتا ہے جس میں ہر فرد کے پیش نظر' نوع انسانی کا کلی مفاد ہوتا ہے' اس لیے اس میں انفرادی مفاد کا تصادم ہوتا ہی نہیں۔ اس اجتماعی نظام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں انسان کو) قریبی مفاد بھی حاصل ہو جاتے ہیں اور اس کا مستقبل بھی روشن اور تابناک ہو جاتا ہے۔

صرف قرآن حکیم کا پیش کردہ نظام حیات ہی تمام معاشرے کو جنت ارضی میں تبدیل کر سکتا ہے

عزیزانِ من! اسے پھر یاد رکھیے اور میں پھر دہرادوں کہ ان کے ہاں یہ کہیں نہیں ہے کہ آؤ خدا کے نظام کے تابع زندگی بسر کرو' تمہاری موجودہ مرادیں تو ایک طرف رہیں' آنے والی نسلوں کی مرادیں بھی پوری ہو جائیں گی۔ یہ ہے فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (53:25) آؤ کبھی خدا کے اقتدار کے نیچے بھی آ کر دیکھو' پرستش نہیں' خدا کی اطاعت کرو جو ایک نظام کے تابع ہوتی ہے' یہ اس کی کتاب کی حکمرانی ہے' اس کے مطابق نظام قائم کر کے دیکھو' جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہر فردِ معاشرہ کی اور اس کی اولاد کی رزق کی ذمہ داری اس نظام پہ ہوتی ہے۔ اس سے بڑی مراد اور کیا ہو سکتی ہے! کہا کہ آؤ جس کی تم پرستشیں کرتے ہو' خدا کی بھی پرستش ہی کرتے رہتے ہو' خدا کے نظام کے تابع آ کر دیکھو' پھر دیکھو کس طرح تمہارا حال بھی سنورتا ہے اور کس طرح سے تمہارا مستقبل بھی روشن و تابناک ہو جاتا ہے۔

عزیزانِ من' اب وقت ہو ہی گیا ہے' ایک دو منٹ رہے ہیں' اگلی آیت میں نے لی تو پھر اور بات چلے گی۔ آگے یہ ہے کہ یہ وہاں آیا ہے کہ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا(53:26)۔ یہاں ''ملک'' کا لفظ تفصیل طلب آ جائے گا' اس میں وقت لے گا' شفاعت کا لفظ آ جائے گا' تفصیل طلب ہے اور اگر وہ درس میں تشنہ چھوڑ دیا جائے تو آپ کا جو اگلا ہفتہ ہے' وہ شکوک و شبہات میں گزرتا رہے گا' اس لیے میں آپ کو وہاں لٹکتا نہیں چھوڑنا چاہتا' اسے ہم اگلے ہی درس میں لیں گے۔ آج وقت ہو گیا ہے۔ سورۃ النجم کی آیتیں تو چھ سات ہی ہوئیں لیکن کام کی بات ہو گئی۔ یہ 25 ویں آیت تک ہو گئیں۔ 26 ویں سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ(2:127)

❀......❀......❀

ساتواں باب: **سورۃ النجم** (آیات 26 تا 32)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1982ء کی 12 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 26 سے ہو رہا ہے: (53:26)۔

صرف نام رکھنے یا بدلنے سے اس کی خصوصیات نہیں بدلتیں

سابقہ آیات میں قریش کا بالخصوص اور دنیا بھر کے بت پرست' توا ہم پرست' کی طرف تخاطب تھا۔ یہ بالعموم ایک بڑی عظیم حقیقت تھی جس کی طرف ان کی توجہ دلائی گئی اور اسے میں نے بڑی تشریح سے پچھلی دفعہ بیان کیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ ذرا سوچو تو سہی! یہ پتھر کے ٹکڑے وہاں پہاڑوں میں پڑے تھے' ان کو پتھر ہی کہا جاتا تھا' تم نے ان کو تراشا' کچھ یونہی ذرا سے نقش و نگار سے بنائے اور اس کے بعد تم نے ان کو دیوتا کہنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی حقیقت اس پتھر سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ وہی ہیں تم نے حقیقت نہیں بدلی' ان کا نام رکھ لیا' کسی کا لات اور کسی کا منات اور کسی کا عُزّیٰ۔ ان کا یہ نام نہیں تھا تو پتھر تھے۔ ان کا اس سے یہ نام ہٹا دو تو پتھر رہ جائیں گے۔ کہا کہ یہ جو انسانیت میں بہت بڑا فریب چل رہا ہے' وہ یہ ہے کہ اس سے اس شے کی وہ حقیقت نہیں ہوتی جو اس کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ پتھر کے ٹکڑے کا نام دیوتا رکھنے سے' اس میں پھر دیوتا کی قوت نہیں آ جاتی۔ وہ پتھر ہی ہوتا ہے۔ اسے اگر آپ پھیلائیں گے تو دیکھیں گے کہ آپ پر عجیب

عجیب حقائق منکشف ہوں گے۔ نام رکھ دینے سے یہ کتنا بڑا فریب کھایا جاتا ہے۔ جب نیا نیا ڈالڈا چلا ہے' یہ ابھی کل کی بات ہے' ہمارے زمانے کی بات ہے' گھی ہوتا تھا' یہ ہمارے ہاں چلا ہے تو وضع دار لوگ اسے کھلے بندوں خریدنے نہیں جاتے تھے' اسے بازار سے چوری چھپے لاتے تھے' جہاں ضرورت ہوتی تھی تو ذرا سا چپکے سے لے کر آتے تھے' اس کا نام ڈالڈا ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا نام ڈالڈا کی جگہ گھی پڑ گیا۔ آج سب اسے گھی کہتے ہیں' کھلے بندوں خریدتے ہیں' کھلے بندوں یہ چلتا ہے تو یہ وہی ڈالڈا گھی ہے۔ اب اندازہ لگائیے کہ اس سے کتنی غلط فہمی پیدا ہو گی۔ کل کو آنے والی نسلوں میں سے کسی کو گھی کا تو پتہ نہیں ہو گا۔ اصل گھی تو کمیاب ہو رہا ہے' یہ ہو گا ہی نہیں' کتابوں میں گھی کے خواص لکھے ہوئے ہوں گے کہ اس کے کھانے سے طاقت آتی ہے' مقوی بھی ہوتا ہے' مالش بھی کی جاتی ہے' زچہ کو دیا جاتا ہے۔ یہ گھی کے جتنے فوائد ہیں وہ سارے ہوں گے۔ وہ یہ ڈالڈا کھائے گا جس کا نام اب گھی ہے۔ اس کے کھانے سے جتنی کمزوریاں پیدا ہو رہی ہیں آپ دیکھ رہے ہیں۔ کس نتیجے پہ وہ پہنچے گا؟ وہ یہی کہے گا کہ گھی کے متعلق یہ جو لکھا ہوا ہے' پہلے لوگوں نے بالکل غلط لکھا ہے' گھی یہ کچھ نہیں کرتا' گھی تو یہ کچھ کرتا ہے۔

مروجہ اسلام جس پر صدیوں سے مسلمانوں کے ہاں عمل ہو رہا ہے یہ فرقہ بندی پر مبنی خود ساختہ اسلام ہے

عزیزانِ من! شاید اس وقت کوئی یہ بتانے والا بھی نہ ہو کہ یہ گھی نہیں ہے' یہ ڈالڈا ہے' ڈالڈا کا نام ہی ختم ہو جائے گا' آج ختم ہو چکا ہے۔ ڈالڈا ہی گھی بن گیا ہے۔ باطل کا نام بدل دینے سے آپ دیکھتے ہیں' وہ حق کیسے بن جاتا ہے اور یہی چیز آپ کے اسلام کے ساتھ ہوئی ہے۔ مروجہ مذہب' جو انسانوں کا بنایا ہوا ہے' کا نام اسلام رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام کیا کرتا ہے؟ یہ جتنی عظمت ہے اس نے یہ کچھ کر کے دکھایا تھا۔ جب اس کو ہماری نئی نسل پڑھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ۔ معاذ اللہ۔ یہ افسانے ہیں جو نصاب (Curriculum) میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ ہمارے سامنے ہے کہ اسلام ساری دنیا میں' جتنی مسلمان قومیں ہیں' جن کے ہاں یہ اسلام ہے' وہ سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہو رہی ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ اعلون پہ پہنچ جائیں گے۔ وہ اس لیے ہے کہ ہم نے اس مروجہ مذہب کا نام اسلام رکھ دیا' ہم ڈالڈا کو گھی کہہ رہے ہیں۔ یہی ہے نا اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ (53:23) تم نے غلط نام رکھ دیئے۔ حقیقت تو وہی ہے جو خدا نے بتائی ہے۔

ملت اسلامیہ کی برومندی کا راز اس دین کو تسلیم کرنے میں ہے جس کی سند خود خدا کی کتاب ہے

خدا نے قرآن کریم میں کہا تھا کہ ہم نے اس کے لیے یہ سند نازل نہیں کی ہے کہ یہ دین ہے۔ ہماری سند تو ہماری کتاب کے اندر ہے۔ اس لیے اصول یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق ہے' وہ سچا ہے' وہ دین ہے' وہ حقیقی ہے۔ اسے یوں کہو کہ اصلی گھی ہے اور جو اس کے خلاف ہے' وہ غلط ہے' وہ باطل ہے۔ یہ اصول ہے۔ تم جو جی میں آئے' اس کا نام رکھ لو۔ پتھر کا نام دیوتا رکھنے سے' وہ دیوتا نہیں

بن جاتا۔ جس دن اس معیار اور اس اصول پر امت آ گئی' آپ دیکھیے گا کہ پھر سے دین کا احیاء ہوگا اور پھر اس کو وہی رفعتیں اور ثروتیں حاصل ہو جائیں گی۔ جس دن یہ ڈالڈا بند ہو گیا اور اس کے بعد وہ جو خالص گھی ہے وہ کسی طرح سے Produce (پیدا) ہو کر آنے لگ گیا تو وہ وہی اپنے نتائج مرتب کرے گا جو گھی کے نتائج ہوتے تھے کیونکہ اب ہم نے غلط چیز کا نام گھی نہیں رکھ دیا' وہ اصلی گھی ہمارے پاس آ گیا۔ دینِ خالص خدا کی کتاب ہے' معیار یہی ہے' سند یہی ہے' جو اس کے مطابق ہے وہ سچ ہے' جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔ تو پہلی چیز وہاں ان کے بتوں کے متعلق یہ ہے کہ یہ پتھروں کی مورتیاں ہیں جنہیں یہ دیوتا کہتے تھے۔

ذاتی خواہشات کی تکمیل کی خاطر خدا تعالیٰ کی بارگاہ سے قبولیت حاصل کرنے والے وسیلے اور طریقے

اور اب آگے آج کا درس آ گیا۔ کہا ہے کہ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى (53:26). وہ ان پتھروں کو ہی دیوتا نہیں مانتے تھے' جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے تو پڑوس میں ہیں' اس زمانے کے وہ مذہب والے' جو یہ کہنے والے تھے وہ تو عرب میں نہیں رہے اس کے بعد' پھر اس اسلام کا احیاء نہیں ہوا مگر یہاں ہمارے ہی پڑوس تو یہ تھے۔ کیا کرتے تھے؟ ان کے ہاں بادل دیوتا' بارش دیوتا' بجلی دیوی' اگنی دیوی' پانی دیوتا' گنگا دیوی' چاند دیوتا' سورج دیوتا' یعنی انہوں نے ان مظاہر فطرت یا Forces of Nature (فطرت کی قوتوں) کو دیوتا بنا رکھا ہے۔ وہ عرب انہیں اس ناموں سے نہیں پکارتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ ملائکہ ہیں' فرشتے ہیں۔ وہ فرشتوں کو بھی خدا کی بیٹیاں کہتے تھے' اس لیے ان کو دیویاں ہی کہتے تھے' دیوتا نہیں کہتے تھے۔ دیوی تو مونث ہوتی ہے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ان کی معاونت ہمارے ساتھ ہو' تو سارے کاروبار صحیح ہو جاتے ہیں۔ وہ تو یہ مانتے تھے۔ اب اگر اعتراض کیجیے کہ تم ان کو خدا مانتے ہو' تو یہ ہندو بھی کہا کرتے تھے کہ نہیں صاحب! ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاں یہ ہماری سفارش کر دیں گے اور ہم میں سے وہ جتنے ہیں' اب تو ان کی اکثریت ہے جو قبر والوں کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ ہم انہیں پوجتے' ان سے مرادیں نہیں مانگتے' ہم تو ان سے یہ عرض کرتے ہیں کہ ہماری درخواست خدا تک پہنچا دیجیے۔ وہ بھی یہی مانا کرتے تھے۔ یہ ہندو بھی اپنے ان دیوتاؤں کے متعلق یہی کہتے ہیں۔ کہا جائے گا کہ بتیس کروڑ خدا مانتے ہو' کہنے لگے کہ بالکل نہیں' برہما تو ایک ہی ہے' یہ تو اس کے ہاں ہماری سفارشیں پہنچاتے ہیں' مرادیں لے کر جاتے ہیں۔

انسانی فکر کو جلا بخشنے کے سلسلہ میں قرآن حکیم کی تعلیم کا ملخص سفارش نہیں' قوانین کی پاسداری ہے

یہ تو قرآن حکیم آیا جس نے ان تمام تو ہم پرستیوں کی جڑ ہی کاٹ کر رکھ دیں۔ کہا کہ جب میرے بندے' میرے متعلق پوچھیں' تو ان سے کہو کہ وہ تمہارے ساتھ ہے' تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہے' تم میں اور ان کے درمیان کسی درمیانی وسیلے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ

وسیلہ اس نے ختم کر کے رکھ دیا۔ کہا کہ ہر پکارنے والا' جب پکارتا ہے' ہم اس کی پکار کو سنتے ہیں۔ کسی کے Through (توسط سے) درخواستیں بھیجنا تو دنیاوی نظام ہے۔ پھر ہمارے ہاں' عزیزانِ من! سفارش کا عقیدہ آیا۔ یہاں کسی دنیاوی حاکم کے متعلق کہیے اور آج کل تو عام طور پہ کہتے ہیں کہ صاحب! یہاں تو سفارش کے بغیر کام ہی نہیں چلتا' جو کچھ کرانا ہو اس کے لیے بڑی سے بڑی سفارش پہنچا دیجئے' کام ہو جائے گا۔ یہ اپنے ہاں تو سفارش اتنی معیوب گنی جاتی ہے' اس طرح سے ہم اس کا ذکر کرتے ہیں مگر عقیدہ یہ رکھتے ہیں کہ۔ معاذ اللہ۔ اور تو اور نبی اکرم ﷺ مجرموں کی' گناہگاروں کی' خدا کے ہاں سفارش کریں گے اور وہ بخشش دے گا۔ رسول اللہ ﷺ سفارش کرنے والے' خدا سفارش ماننے والا اور مجرم چھوٹ جائیں گے۔ عام عدالتوں میں' عام دفتروں میں' ایک چیز یہ تھی۔ معاذ اللہ

مکافاتِ عمل کے سلسلہ میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی اور ہمارے ہاں کے غلط قرآنی تراجم

جب ہم اسے حضور نبی اکرم ﷺ اور خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں تو وہی چیز ''سبحان اللہ صاحب!'' بن جاتی ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ یہ قرآن حکیم کی رو سے مکافاتِ عمل کے خلاف ہے۔ مکافاتِ عمل کا قانون تو ایسا ہے کہ حضور ﷺ بھی یہ خود فرماتے ہیں' قرآن حکیم میں یہ ہے کہ اگر میں بھی خدا کی معصیت کروں' تو میں بھی اس کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔ تو یہ جو آیت ہے قرآن حکیم نے تو ان کے اس عقیدے کی تردید کی ہے۔ اب اس کا آپ عام طور پہ یہ ترجمہ دیکھیے گا کہ انہیں ان راستوں کی طرف ڈال دیا جاتا ہے اور کہا یہ گیا ہے کہ تمہیں ان ملائکہ کی شفاعت کوئی کام نہیں دے سکتی۔ اِلَّا مِنۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَرۡضٰی (53:26) مگر یہ استثنٰی ہے کہ اللہ جس کو اجازت دے دے گا سفارش کرنے کی' بس اس کی سفارش قبول کر لی جائے گی۔ لیجیے صاحب! تو بات تو وہی ہوگئی کہ خدا کی اجازت سے سفارش کر سکتے ہیں' سفارش کر سکے گا وہ۔ یہ موضوع درس میں بہت دفعہ آ چکے ہیں' زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کریم کے بنیادی عقیدے کے خلاف ہے۔ جس چیز پہ مکافاتِ عمل کی بنیاد ہے' قرآن حمید تو کہتا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات پر بھی گرفت ہوتی ہے۔ کسی کی سفارش' کوئی کفارہ' کوئی جرمانہ' وہاں کچھ نہیں کام دے سکتا۔ یہ چیز یوں ملی ہے۔

قصہ آدم کو قرآن حکیم کے آئینہ میں سمجھے بغیر قرآنی حقائق سمجھ میں نہیں آسکتے

میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے سے بات سمجھ آتی ہے۔ یہ جو ملائکہ یا ملک ہیں' وہ جب شروع میں آپ نے قصۂ آدم پڑھا تو یہ کہا تھا کہ ملائکہ نے سجدہ کیا۔ آدمی کے سامنے یہ سجدہ کرنا کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ ہے کہ آدمی کے آگے فطرت کی قوتیں مسخر کر کے رکھ دیں اور کہا کہ جاؤ' ان سے کام لو تو یہ ملک' جن کو فطرت کی قوتیں کہا جاتا ہے' ایک تو وہ ملائکہ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کا اپنا عالمِ امر کا نظام ہے اسے بروئے کار لانے پر مامور ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے' نہیں سمجھ سکتے کہ وہاں کی کیفیات کیسی ہیں' وہاں کا کاروبارِ خداوندی کیسے چلتا ہے

لیکن یہ جو ہماری کائنات ہے' اس کائنات کے اندر خدا تعالیٰ نے یہ جو فطرت کی قوتیں ہیں' ان کے متعلق کہا ہے کہ یہ تو ہم نے انسان کے لیے مسخر کر دی ہیں کہ ان سے کام لے' قوانین فطرت کا علم حاصل کرے اور اس علم کے ذریعے ان قوتوں کو مسخر کرے۔ اب دیکھ لیجیے کہ جو قومیں ان فطرت کی قوتوں کو مسخر کر رہی ہیں وہ کہاں چلی جا رہی ہیں۔ ہم نے کیا مسخر کیا ہے!!!

اسلام اور سائنس کے عنوان پر لکھے گئے ایک مضمون کی مخالفت

عزیزانِ من! میں نے گزارش کیا تھا کہ میں نے قرآن کریم کی آیات سے وہ ایک مضمون اسلام اور سائنس ❶ لکھ دیا۔ میں نے اس میں یہ کہا کہ وہ علومِ سائنس پہ کتنا زور دیتا ہے اور سائنس کے معنی کائنات کی قوتوں کی تسخیر کے ہیں اور اس کے خلاف' ہمارے خلاف' پورے ایک رسالے میں لکھا گیا۔ کہا گیا ہے کہ اس کی یہ ساری کتابیں ضبط کر دو اور اس کے خلاف ایکشن لو کہ یہ کہتا ہے کہ ''سائنس کے جو علوم ہیں' وہ قرآن کریم میں ہیں''۔ آپ سوچیے تو سہی کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور وہ کہاں؟ کہا قرآن حکیم نے یہ ہے کہ شفاعت کے معنی کسی کی سفارش نہیں ہوتا۔ یہ شفع تو آپ نے روز سنا ہوگا۔ وہ کسی کا جو دیوار بہ دیوار ساتھ کھڑا ہونا ہوتا ہے' اس کو کہتے ہیں۔ یہ ''کسی کے ساتھ کھڑا ہو جانا' کسی کی مدد کرنا' کسی کی سچی شہادت دے دینا' کسی کی معاونت کر دینا'' ہوتا ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو تم نے طریقہ اختیار کیا ہے کہ فطرت کی یہ جو قوتیں ہیں' یہ بارش' پانی' بادل آگ' ہوا' ان کو دیوتا اور دیویاں مان کر ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر تم کھڑے ہو جاؤ گے تو اس طرح سے ان کی مدد نہیں ملے گی۔ ان کی مدد تو یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے مطابق' جب تم ان کو مسخر کرو گے تو پھر تمہیں ان کی معاونت حاصل ہوگی۔

قانون خداوندی کے مطابق تسخیر کائنات کے ماحصل کا استعمال کائناتی قوتوں کو اپنے ساتھ کھڑا کرنا ہے

عزیزانِ من! یہ تو ہم پرستی ہے کہ ان کو دیوتا اور دیویاں مان کر ان کی پرستش کی جائے اور سمجھا جائے کہ یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ یہ یوں مدد نہیں کرتے' جب ان کو تم Capture کر کے' مسخر کر کے' اپنے قابو میں لاؤ گے تو یہ مدد کریں گے۔ دیکھتے ہیں کہ بجلی کیسے آپ کی مدد کر رہی ہے اور اب تو ایٹم کی مدد نے تغیر کی ایک دنیا پیدا کر دی ہے اور یہ دنیا بدل دی ہے۔ ہمارے ہاں یہ کس طرح مدد کر رہی ہے' وہ ساری دنیا' ذرہ' ایٹم سے کانپ رہی ہے یہ جس کے قبضے میں ہے' قانونِ خداوندی کے مطابق مسخر کیا ہوا ہے' کہا ہے کہ اس طرح ان سے کام لو گے تو یہ تمہاری مدد کریں گے۔ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاؤ گے تو یہ تمہاری مدد نہیں کریں گے۔ ان کا یہ مقام ہی نہیں ہے کہ اس طرح سے مدد کریں۔ کہا کہ یہ چیزیں وہ کرتے ہیں جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ کہا ہے کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ**

---

❶ اس مضمون کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: فردوسِ گم گشتہ' طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 1998ء (تیسرا ایڈیشن)' ص-54 تا 72۔

تَسۡمِیَۃَ الۡاُنۡثٰی (53:27) یہ ان کو دیوتا بنالینا' یا دیویاں بنالینا' صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا پر' آخرت پر' مکافاتِ عمل پر' ایمان نہیں رکھتے۔ جو خدا کے اس قانون پر ایمان نہیں رکھتے ہیں' وہ دیویاں اور دیوتا بناتے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں توہم پرستیاں (Superstitions) کہتے ہیں۔

ملت اسلامیہ کی موجودہ حالتِ زار ہماری توہم پرستی اور حق سے دوری کا نتیجہ ہے

آپ دیکھیے ہماری تو ساری کی ساری قوم' توہم پرستیوں کی جکڑ بندیوں میں' جکڑے ہوئے چلی آ رہی ہے۔ آج قسم قسم کی توہم پرستیاں ہیں۔ اس لیے کہا ہے کہ وَمَا لَھُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ (53:28) ان کا یہ مسلک علم وحقیقت پر مبنی نہیں۔ محض قیاسات پر مبنی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ علم کی بارگاہ میں آ ؤگے تو ان کو اس کی دلیل اور سند نہیں مل سکے گی۔ یہ جو کچھ توہم پرستیاں کرتے ہیں' دیویاں اور دیوتے بناتے ہیں' اور قبروں میں دبے ہوئے مردے سے مدد کی درخواست کرتے ہیں' انہیں علم کی دنیا سے اس کی تائید نہیں ملے گی۔ یہ کیا چیز ہے؟ کہا ہے کہ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ (53:28) وہ ظن وقیاس کی پیروی کرتے ہیں۔ ظن وہ ہوتا ہے جو حقیقت نہ ہو اور آگے ایک چیز ہے اسے خود ہی واضح کر دیا۔ کہا کہ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا (53:28) حق کے مقابلے میں جب ظن آئے گا' قیاس آئے گا' تو وہ نہیں ٹھہر سکے گا' وہ کچھ فائدہ نہیں دے سکے گا۔ الحق خدا کی کتاب ہے' جو کچھ ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہے وہ ظنی ہے۔ ظن جب حق کے مقابل میں آئے گا تو کچھ فائدہ نہیں دے گا۔ کوئی ظنی چیز جو حق کی تائید کرتی ہے' کسی طرح سے ٹھیک ہے' وہ مان لی جائے گی' کیونکہ وہ حق کے مطابق ہے' اگر وہ حق کے خلاف ہے تو اس کو آپ کتنا ہی بڑا مقدس کیوں نہ تسلیم کر لیں' وہ مسترد کی جائے گی۔ حق کے سامنے وہ نہیں ٹھہر سکتی۔ تو جو معیار ہے بس یہ یاد رکھیے کہ دین میں' اسلام میں' حق اور باطل کا' غلط اور صحیح کا' جو معیار ہے وہ خدا کی کتاب ہے۔ الحق یہی ہے۔ بات لمبی چلی جائے گی' وہ جو میرے خلاف بڑا شور برپا ہے کہ یہ منکرین حدیث ہے' انکارِ سنت ہے' جب کہ نہ تو میں حدیث کا منکر ہوں' نہ ہی سنت کا انکاری' کہتا یہ چیز ہوں کہ حق کے مقابلے میں جب ظن آئے گا تو غالب حق رہے گا' معیار حق ہوگا' وہ ظن نہیں ہوگا' ظن کو پرکھنا ہوگا کہ حق کے مطابق ہے یا نہیں۔

حق کیا ہے اور باطل کیا اور ہماری سوچ کیا؟

احادیث کے متعلق میں نے کبھی درس میں یہ بحثیں نہیں چھیڑیں۔ اُن کے ظنی ہونے کا تو ان میں سے ہر ایک کو خود اقرار ہے۔ کوئی حدیث بھی جب یہ بیان کریں' خواہ وہ بخاری اور مسلم کی بھی کیوں نہ ہوں' تو شروع میں تو یہ چیز ہوتی ہے: "قال رسول ﷺ" کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' آگے وہ حدیث کے الفاظ ہوتے ہیں اور آخر میں ہوتا ہے کہ "او کما قال رسول اللہ ﷺ" یہ' یا جیسے رسول

اللہ ﷺ نے کہا ہو' یعنی انہیں خود اس پر حق کی طرح یقین نہیں ہوتا کہ یہی رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا۔ یہ خود ہر حدیث کے ساتھ لگاتے ہیں' قرآن حمید کی آیت کے متعلق تو کبھی نہیں کہتے کہ'' قال اللہ تعالیٰ'' پھر قرآن حمید کی آیت ہو اور آخر میں کہیں یہ ہو کہ ''او کما قال اللہ تعالیٰ'' ''یہ یا جیسے خدا نے کہا ہو' یہ نہیں لگاتے۔ یہ ہے حق' یقین کے ساتھ یہ کہنا کہ جب کہا کہ خدا نے یہ کہا ہے تو خدا نے یقینی طور پر کہا ہے کیونکہ یہ اس کی کتاب میں ہے۔ اس کے باہر جو چیز ہے' کسی کے متعلق بھی ہو' وہ اس یقین سے خود بھی نہیں کہتے۔ یہ جو ''او کما قال رسول اللہ ﷺ'' کہا تو بات صاف ہو گئی کہ جس کو تم خود ظنی کہتے ہو' اس کے پرکھنے کا معیار یہ خدا کی کتاب ہے۔ سیدھی سی بات خدا خود کہتا ہے کہ حق کے مقابلے میں ظن کام نہیں دیتا' اگر اس کے مخالف جائے گا تو وہ ظن صحیح نہیں ہوگا' اگر حق کے مطابق ہوگا تو صحیح تسلیم کر لیا جائے گا۔ اگر اس کے خلاف ہوگا' ہم کہیں گے کہ یہ ظن ہے۔ حق اپنی جگہ پر اٹل ہے' غیر متبدل ہے' وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا' اسے اس کے مطابق ہونا چاہیے تو دنیا میں کوئی عقیدہ' کوئی انکشاف' کچھ بھی آئے' عزیزانِ من! قرآن کریم ماننے والے کے لیے تو پھر اس پہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اگر وہ قرآن کریم کی حقیقت کے مطابق ہے' تو اسے وہ صحیح تسلیم کرے گا' اس کے خلاف ہے تو وہ کہے گا کہ نہیں' میں ابھی نہیں مانتا' یہ ظن ہے' قرآن کریم حق ہے' حق کے بالمقابل ظن کبھی نہیں آ سکتا' اس میں حق کے خلاف کبھی نہیں کہہ سکتا۔

انسانی زندگی کے دو اہم رخ اور ان کی قدر و منزلت کے باہمی فرق کی وضاحت

یہ سب کچھ کہنے کے بعد کہا ہے کہ فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِکۡرِنَا وَلَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا(53:29) یہ ساری چیزیں' یہ جتنی بھی تو ہم پرستیاں ہیں اور یہ دیوی دیوتا ہیں اور جو یہ کچھ مانگنا ہے' وہ اس لیے ہے کہ وہ اسی دنیا کی زندگی کو زندگی مان رہے ہیں کہ اس زندگی کے مفاد و مقاصد کسی طریقے سے حاصل کر لیے جائیں' وہ حاصل ہو جائیں۔ غلط طریقہ ہوگا تو یہ دیوی دیوتا اور یہ بخشانے والے' سفارشیں کرنے والے' شفاعت کرنے والے' چھڑا لیں گے لیکن اگر یہ بات ہو کہ دنیا کے مفاد حاصل کرنے نہایت ضروری ہیں لیکن اسی طریقے کے مطابق ہیں کہ جو خدا نے تجویز کیا ہے' اگر یہ چیز ان اقدار کے خلاف جائے گی تو یہ جسے آپ مفادِ دنیا کہتے ہیں' یہ بھی جائز نہیں رہیں گے۔ کہا کہ یہ وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعی زندگی کے مفاد سے بلند کوئی نصب العین ہی اپنے سامنے نہیں رکھتے اس لیے ہمارے اس ضابطہ حیات سے روگردانی کرتے ہیں اس لیے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا ایمان' دھرم اس دنیا کا مفاد ہی ہے اس کو وہ چھوڑنے کو تیار نہیں ہیں' اب وہ کیسے حق پر آئیں گے۔ فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی عَنۡ ذِکۡرِنَا (53:29) تُو اُن سے پہلو تہی کر' جو ہماری اس کتاب قرآن کریم سے اعراض برتتا ہے' منہ موڑتا ہے' اس کو چھوڑ دو' اس سے اعراض برتو۔

ناگفتہ حالات کے باوجود حق کی آواز کو آخری سانس تک بلند کرنے کی ہدایت

لیکن یاد رکھیے' دوسری جگہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ اعراض برتو کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پھر اس تک قرآن حکیم کی آواز بھی نہ پہنچے۔ قرآن حکیم کی آواز پہنچائے چلے جاؤ تا کہ کوئی نفس اس لیے ہلاک نہ ہو جائے کہ اس تک خدا کی کتاب کی آواز نہیں پہنچی یعنی اس مقام پہ بھی جو کہا گیا ہے کہ اب ان کے ساتھ سر کھپانے کی ضرورت نہیں' جان مارنے کی ضرورت نہیں' وہ اپنے ان مفادات کو نہیں چھوڑ رہے لیکن اس کے باوجود تاکید کی جا رہی ہے کہ قرآن حکیم کی آواز ان تک پہنچائے چلے جاؤ تا کہ یہ اس لیے ہلاک نہ ہو جائیں کہ ان تک حقیقت نہیں پہنچی۔ کہا ہے کہ ذٰلِکَ مَبۡلَغُھُمۡ مِّنَ الۡعِلۡمِ (53:30) یہ ان کے علم کی کمی ہے۔ تو ہم پرستی (Superstition) علم کی کمی کی وجہ سے ہوتا ہے' جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ ان کے علم کی حد اتنی ہی ہے اور اس سے آگے علم حاصل کرنا نہیں چاہتے' تو جب جہالت ہی علم بن جائے تو اسے اس جہالت کے قدموں سے کیسے نکالا جا سکتا ہے' چمگادڑ کو تو تاریکی راس آتی ہے' وہ تو صبح کے وقت دعائیں مانگتا ہوگا کہ سورج نہ چڑھے' روشنی میں وہ آنکھیں ہی نہیں کھول سکتا' مبلغ علم ہی ان لوگوں کا اتنا ہے کہ یہ جاہلیت نہیں پرورش پا سکتی' علم حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

آخر کار حق و باطل کا فیصلہ کتاب اللہ کی بنیاد پر ہی ہوگا نہ کہ انسانوں پر

آگے کہا کہ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ وَھُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اھۡتَدٰی (53:30) اس چیز کا جو معیار ہے کہ گمراہی پہ کون ہے اور صحیح ہدایت پر کون ہے' یہ خدا کا جو علم ہے اس کے مطابق طے ہوگا۔ یاد رکھو! کسی شخص کے اپنے عقیدے کے مطابق' اپنے مسلک کے مطابق' خواہ وہ کہے کہ یہ اسلاف سے چلا آ رہا ہے یا اس نے خود اختیار کیا ہے' اس چیز کا Criterion یا معیار نہیں ہے کہ صحیح راستہ کون سا ہے اور غلط راستہ کون سا ہے۔ وہ تو خدا کا علم ہے جو اس نے کتاب میں دیا ہے۔ اس کے مطابق جانچا اور پرکھا جائے گا اور یہ ساری بات کر کے کہا کہ یہ سب کچھ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ انسان کا کوئی کام نتیجہ برآمد کیے بغیر نہ رہ جائے۔ بس یہ ہے جی دین کا ماحصل۔ معاشرے کے اندر تو پہلی چیز یہ ہے کہ معاشرہ معاشرتی قانون کے مطابق جس چیز کو خلافِ قانون یا جرم قرار دے گا' وہی غلط اور جرم قرار پائے گا' معاشرہ جس چیز کو جرم ہی نہ قرار دے گا وہ تو جرم قرار ہی نہیں پائے گا۔ دنیا کی اقوام میں آپ دیکھیے' اس قسم کے قوانین بنائے ہوئے ہیں جو بہت ہی فحش بھی ہیں' معیوب بھی ہیں' غلط بھی ہیں' لیکن جب وہ اس ملک کا قانون بن جاتا ہے تو وہ پھر جرم نہیں رہتا۔ ہمارے ہاں بھی جو غلط چیزیں قانون بن جاتی ہیں' وہ پھر جرم نہیں رہتیں۔ یہ Basically in Reality (بنیادی طور پر حقیقت میں) کون سی چیز خلافِ انسان ہے اور کون سی اس کے مطابق ہے جس کو یہ نیکی اور بدی آپ کہیں گے' یہ ایک بڑی گہری چیز ہے۔ ایک چیز

Relative (اضافی) سی ہے' آج ایک شے کو قانون نے جائز قرار دیا' وہ جائز ہو گئی' اس پہ کوئی گرفت نہیں ہے' کل کو اس نے اسے ناجائز قرار دیا' وہ ناجائز قرار پا گئی۔ وہ شے وہی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اضافی ہوتے ہیں' انسانوں نے ان کے حق میں فیصلہ کیا تو وہ سچے ہو گئے' اس کے خلاف فیصلہ کیا تو وہ غلط ہو گئے۔ یہ قوانین روز بدلتے رہتے ہیں۔ ایک چیز ایسا قانون بھی ہے کہ اس کا انحصار انسانوں پر نہیں ہے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ مستقل بالذات ہوتے ہیں۔

اخلاقیات یعنی خیر و شر (Good & Evil) کے مسئلہ کی اہمیت اور اس کا حل

یہ اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔ یہ Good & Evil (خیر و شر) کا مسئلہ ہے جو بہت پرانا چلا آ رہا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ فی الحقیقت Good (خیر) کیا ہے' فی الحقیقت Evil (شر) کیا ہے۔ معاشرتی قوانین تو روز بدلتے ہیں۔ یہ صرف خدا بتا سکتا ہے کہ انسان کے حق میں منفعت بخش چیز کون سی ہے اور مضر کون سی ہے۔ مضر چیز کو آپ برائی کہہ لیجیے' شر کہہ لیجیے' اور جو چیز بھی انسانیت کے حق میں' اس کی منفعت کے لیے خدا نے قرار دی ہے' وہ ہے جسے خیر کہیے' جسے نیکی کہیے' اسے تو آپ حسنِ عمل کہتے ہیں۔ اس کا معیار بھی یہ قرار دیا ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (13:17) بقا اسی عمل کے لیے ہے جو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کیا جائے تو یہ چیز جو طے کرنے کی ہے کہ کون سا کام نیک ہے' Good ہے' کون سا Evil (شر) ہے' یہ انسانوں کے طے کرنے کا مسئلہ نہیں ہے۔

خیر و شر کے فرق کو سمجھنے یا جاننے کے لیے قرآن حکیم اور خدا پر ایمان لانے کی ضرورت کیوں؟

عقلِ انسانی اس معیار کو ہر آن بدلتی رہتی ہے

زماں زماں شکن از آں چہ می تراشد عقل

خود ہی ایک پارلیمنٹ آج ایک قانون بناتی ہے۔ اگلے ہی روز اس قانون کے اندر ترمیم شروع ہو جاتی ہے' بلکہ اس سے بھی پہلے اسی لمحے اس کی Amendment (ترمیم) شروع ہو جاتی ہے' اس کے خلاف قانون بنتے ہیں اور وہی جو پہلا قانون تھا' جب منسوخ ہو جاتا ہے' تو اس کے مطابق عمل کریں تو وہ جرم قرار پا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر' فی الحقیقت' یہی الفاظ اس نئے قانون کے لیے آ سکتے ہیں۔ تو فی الواقعہ کون سی چیز بری ہے' فی الواقعہ کون سی چیز اچھی ہے' یہ ہے عزیزانِ من! جس کے لیے ایمان کی ضرورت ہے' جس کے لیے قرآن حکیم کی ضرورت ہے' جس کے لیے خدا کو ماننے کی ضرورت ہے۔ اس کے متعین کیے ہوئے' بتائے ہوئے' خیر کو خیر یا کچھ نیکی بھی کہہ لیجیے اور وہ اس کے متعین کیے ہوئے کو شر قرار دیجیے۔ برائی سمجھنا' گناہ سمجھنا' جرم سمجھنا' اُسے آپ کچھ بھی کہہ لیجیے' Evil کہہ لیجیے' یہ ہے جس کے لیے خدا پر ایمان کی ضرورت ہے' یہ ہے جس کے لیے اس کی کتاب پر ایمان کی ضرورت ہے' تو جس کو اس نے منفعت بخش یا خیر کہہ دیا ہے' اس کے

مطابق میں زندگی بسر کروں گا تو میرا بھلا ہوگا' انسانیت کا بھلا ہوگا' جسے اس نے شر کہہ دیا ہے اس کے مطابق کچھ نظام قائم ہوگا یا میں کچھ کروں گا تو میری بھی تباہی ہوگی' انسانیت کی بھی تباہی ہوگی۔

ذہنی' دلی اور عملی طریق اختیار کرتے ہوئے خدا پر ایمان لائے تو تب ہی اسے ایمان کہا جا سکتا ہے

عزیزانِ من! یہ ایمان ہے' یہ ہے ایمان کی ضرورت' یہ ہے خدا کی ضرورت' ورنہ خدا اس کا محتاج نہیں ہے کہ ہم اس کو خدا مانیں اور اس کی پرستش کریں تو وہ خدا بنا رہے' ہم یہ کرنا چھوڑ دیں تو وہ خدا ہی نہ رہے۔ تو یہ تو انسان کے اپنے لیے ہے۔ اگر خدا کو مانا جاتا ہے اور اس Criterion (معیار) کو نہیں مانا جاتا کہ جسے اس نے خیر کہا ہے اسے میں خیر سمجھوں' جسے اس نے شر کہا ہے اسے میں شر سمجھوں' اگر یہ نہیں سمجھا جاتا' تو خدا کے ماننے کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ یہ ہے خدا کو ماننا۔ خدا کے اعلانیہ نہ ماننے والے تو شاید ایک آدھ Percent (فیصد) بھی دنیا میں نہیں رہتے' کسی نہ کسی شکل میں خدا کے ماننے والے ہیں۔ آپ کسی سے پوچھیے' وہ کہتا ہے کہ خدا کو مانتا ہوں۔ ان کو خدا کا ماننا قرآن مجید تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ خدا کو ماننا نہیں ہے۔ اگر وہ جس طرح تم نے اس کتاب کو مانا ہے اس طرح سے اگر وہ مانتے ہیں تو پھر سمجھو کہ وہ خدا پر ایمان لائے ہیں ورنہ یہ کہے جانا ''میں خدا کو مانتا ہوں' مانتا ہوں'' کے معنی ہی کچھ نہیں ہیں۔ مانتا ہوں کے معنی یہ ہیں کہ جسے اس نے خیر قرار دیا ہے اسے میں بہتری اور خیر اور نیکی سمجھتا ہوں' جسے اس نے شر قرار دیا ہے اسے میں شر اور معصیت سمجھتا ہوں۔

یہ ہے خدا پر ایمان اور اس کے لیے ہی کتاب کی ضرورت ہے۔ کتاب چونکہ براہِ راست نہیں اتری' ایک رسول نے ہمیں دی ہے' اس میں رسالت کی ضرورت ہے' ساری بات اتنی ہے کہ اس کے مطابق میں کروں گا تو اس کا نتیجہ میرے لیے اچھا ہوگا' اس کے خلاف کروں گا تو اس کا نتیجہ میرے لیے برا ہوگا۔

فکرِ قرآنی انسانی زندگی کو ایک جوئے رواں قرار دیتی ہے' شخصیت باقی رہتی ہے

عزیزانِ من! عمل کے نتیجے کے لیے صرف یہی زندگی جو اس دنیا کی ہے' نہیں ہے۔ زندگی ختم نہیں ہوگی۔ یہ جسم (Body) ہے جو Disintegrate (منتشر) ہو جاتا ہے۔ اب اس عمل کے نتیجے کی ضرورت کے لیے ساری بات اتنی ہی ہے کہ میں اس کے مطابق کروں گا تو اس کا نتیجہ میرے لیے اچھا ہوگا' اس کے خلاف کروں گا اس کا نتیجہ میرے لیے برا ہوگا اور نتیجے کے لیے صرف یہی زندگی' جو اس دنیا کی ہے' نہیں ہے۔ زندگی ختم نہیں ہو جاتی' زندگی نے آگے چلنا ہے۔ اس کے خلاف اگر میں نے کچھ کیا ہے تو اس کا نتیجہ کسی طرح اگر اس زندگی میں سامنے نہیں آیا' وہ ضرور سامنے آئے گا۔ زندگی تو ختم نہیں ہو رہی' اس کی عدالت سے تو کوئی مجرم مفرور ہوتا ہی نہیں ہے' اس نے

تو ایک دن پکڑے جانا ہے۔ کہاں جائے گا؟ اس دنیا میں تو خودکشی کرنے سے انسان کے سارے جرائم مٹ جاتے ہیں' وہاں تو نہیں مٹتے' وہاں تو خودکشی کرنے سے بھی جان (ذات' Self' شخصیت) باقی رہتی ہے۔

انسانی زندگی کے اعمال کو محفوظ کرنے کے سلسلہ میں کائنات کے وجود کا ذرہ ذرہ ہر آن مصروفِ عمل ہے

عزیزانِ من! زندگی باقی رہتی ہے۔ یہ جو ایمان ہے' اسے کہتے ہیں مکافاتِ عمل یا جزا و سزا کا ایمان۔ یہ ہے جس کے لیے یہ سارا سلسلہ رشد و ہدایت' خدا کی طرف سے وحی آنا' انبیائے کرامؑ کا کتابوں کو لے کر آنا' قرآنِ کریم کا محفوظ رکھنا' یہ سارا اس کے لیے ہے اور اگلی آیت یہ آتی ہے جس کے معنی میں سمجھتا ہوں آہستہ آہستہ جوں جوں حقائقِ کائنات نمودار ہوں گے' بات سمجھ میں آئے گی۔ یہ بڑی عظیم آیت ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (53:31) یہ سارا ارض و سما کا سلسلہ کائنات اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی انسان کا کوئی عمل نتیجہ نکالے بغیر رہ نہ جائے۔ یا اللہ! کہتے ہیں کہ خدا نے کائنات کو پیدا کیا تو اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کے اور مقصد کو تو ہم جانتے نہیں' جو مقصد اس نے بتایا ہے' وہ تو یہ ہے۔ اب یہ ہے کہ یہ جو اس کی مشینری Work (کام) کر رہی ہے' اس مقصد کے لیے یہ کس طرح سے کام کر رہی ہے؟ ابھی انسانی علم کی گرفت میں زیادہ بات نہیں آئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب بھی جرم کی شناخت میں یہ Circumstancial, Evidence (واقعاتی شہادت) یا فزیکل جتنی شہادتیں ہوتی ہیں' (مثلاً) مجرم کا خون' اس کی انگلیوں کے نشانات' اس کے کپڑوں کی بو' جو چیزیں ہیں' یہ بھی جرم کے تعین میں بڑی مدد دے رہی ہیں اور اس لائن کے اوپر بڑی تحقیق اور تفتیش ہو رہی ہے' دن بدن تفتیش ہو رہی ہے صاحب! یعنی وہ تو ابھی وہ بات آگے نہیں چلی' ابتدا ہوئی ہے۔ وہ تو دل کی دھڑکن سے بتا دیتے ہیں کہ یہ گواہ جھوٹ بولتا ہے یا سچ بولتا ہے۔ میں یہ مثالیں دے رہا ہوں جو اس وقت تک ہمارے سامنے بات آئی ہے۔ ہم ابھی تک یہ پورے طور پر نہیں سمجھ پائے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ خارجی کائنات کی مشینری اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ اچھا کام' خیر کے مطابق کام کرنے والے کا نتیجہ خیر' اس کو شر کے مطابق کام کرنے والا کا نتیجہ شر ہو۔ یہ ساری کائنات کی مشینری جتنی ہے وہ اس لیے سرگرمِ عمل ہے کہ کسی فرد کا کوئی عمل نتیجہ نکالے بغیر' مرتب کیے بغیر' رہ نہ جائے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ (اس کے لیے ابھی تحقیقات باقی ہیں)۔

مکافاتِ عمل کے نتیجہ خیز ہونے کی وضاحت

عزیزانِ من! یہ چیزیں جو ہم کہہ رہے ہیں کہ زندگی آگے چلے گی' دل میں گزرنے والے جو خیالات ہیں' وہ بھی اس اعمالنامے میں سامنے آئیں گے' تو یہ سمجھانے کی بات ہے کہ وہ سامنے آنا یا اعمالنامے میں لکھا ہوا ہونا' بات تو ساری یہ ہے کہ وہ دل میں گزرنے والے

خیالات کے متعلق بھی کہتا ہے کہ وہ بھی نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ وہ کیا مشینری ہے' جو ان چیزوں کو بھی اپنی گرفت میں لیتی ہے' کس طرح سے وہ نتیجہ مرتب کرتی ہے' اسے ہم سرِ دست نہیں جان سکتے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ چیز انسان کے علم میں نہیں آئے گی' علمِ انسانی ترقی کرتا چلا جائے گا' یہ چیزیں بھی آتی چلی جائیں گی لیکن یہ جو ایمان ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' آگے بھی چلتی ہے اور اس دنیا کے اندر بھی جو جو کام بھی انسان نے کیا ہے' بلکہ قرآن حکیم کی رو سے جو خیال بھی دل میں گزرا ہے' وہ بھی اپنا نتیجہ دے گا اور اسے یہ نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ ایمان ہے جس پر اسلام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

انسانی معاشرے میں اسلامی نظام کے ذمہ دار اور مکافاتِ عمل کی نوعیت

یہی وہ ایمان ہے جس کے سہارے' جسے آپ اسلامی نظام کہتے ہیں' وہ قائم ہوتا ہے۔ وہ ان لوگوں کا قائم کردہ ہوتا ہے' جو خیر اور شر کا معیار خدا کی کتاب کو قرار دیتے ہیں اور ان کا ایمان ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ تو ایک طرف' ہم جو کچھ سوچ رہے ہیں' اس کا بھی نتیجہ خدا کی کتاب کے مطابق نکلے گا' اب نہیں نکلے گا تو مرنے کے بعد نکلے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھوں سے جب نظام قائم ہوتا ہے تو وہ پھر انسانیت کے لیے خیر ہی خیر بنتا ہے۔ یہ جو میں نے عرض کیا ہے وہ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ یہ ارض و سما کی مشینری' جو سرگرمِ عمل ہے' وہ اس لیے ہے کہ ہر عملِ خیر کا نتیجہ خیر مرتب ہو' ہر عملِ شر کا نتیجہ شر مرتب ہو' تو اتنی مشینری جب اس کام کے لیے متعین کی گئی ہے تو کون سی چیز ہے جو اس کی گرفت سے باہر رہ جائے گی۔ یہ ہے ایمان مکافاتِ عمل۔ اب یہ کہا ہے کہ اس سے خیال پیدا ہوگا کہ پھر انسان' بالکل معصوم انسان ہی کوئی ہوگا کہ جسے ہم کہتے ہیں کہ جنت میں جائے گا کہ جس نے کبھی کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ہم انسان کو جانتے ہیں' ہم نے اسے پیدا کیا ہے' ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس سے لغزشیں ہو سکتی ہیں۔

زندگی کے لمحات میں ہونے والی لغزشوں سے بچاؤ کا طریق

آپ کو معلوم ہے جو اس نے وزن کرنے کا معیار مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ دونوں خیر اور شر کے پلڑے ہیں۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ جھکتا ہوا پلڑا کون سا ہے' وہ دیکھنا ہوگا کہ اس نے جو پاس ہونے کے (مثلاً) 50% مارکس مقرر کیے تھے اگر وہ مارکس 50 یا 50 سے Above (بالا) ہیں تو اسے پروموشن مل جائے گی' اگر اس سے کم درجے کے ہیں' تو اتنے تو اس کے اس پلڑے میں بھی ہیں لیکن وہ جو پلڑا اٹھا ہوا ہے' جھکا ہوا نہیں ہے' اسے پروموشن نہیں ملے گی۔ قرآنِ کریم نے خفت موازینہ و ثقلت موازینہ معیار قرار دیا ہے اور انعامِ معیار اس کی کتنی بڑی رحمت ہے اگر یہ قرار دیا جاتا کہ کسی سے کوئی لغزش نہ ہوئی ہو تو وہ جنت میں جائے گا تو وہ تو پھر کہیں اور سے ہی اس کو کوئی مخلوق لانی پڑے گی۔ اس نے کہا ہے کہ ہم نے یہ مخلوق بنائی ہے' انہی میں ہم نے یہ سب کچھ بھیجنا ہے' یہ بڑی گنجائش رکھی ہے لیکن وہ گنجائش یہ نہیں ہے کہ

جو جی میں آئے کرتے پھرو۔ یہ بات نہیں ہے۔ کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) یہاں کبائر الاثم والفواحش کہا ہے یعنی ایسے جرائم جو انسانیت میں ضعف پیدا کر دیں' انسان کی ذات میں تخریب پیدا کر دیں اور معاشرے میں فواحش بے حیائی پھیلا دیں' یہ لوگ ان سے بچے ہوئے ہوں گے۔ اور آگے کہا ہے کہ اِلَّا اللَّمَمَ (53:32) لیکن کوئی قابلِ ملامت چیز' جس سے ذرا سی کوئی جو ایسے تھوڑی ملامت والی چیز ہوگی تو یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے یا تم سے کبھی کبھی یہ سرزد ہو جاتی ہیں یا ان لوگوں سے سرزد ہو جاتی ہے اور دوسری جگہ کہا کہ ان کی بھی یہ کیفیت ہے کہ اگر بھول کے بھی انہیں اس قسم کا کوئی خیال آجاتا ہے تو فوراً اس پر نادم ہوتے ہیں اور فوراً اس کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ تو یہ اس قسم کی لغزش کا جو سرزد ہو جانا ہے' وہ کہا ہے کہ یہ چیز راستے میں مانع نہیں ہو جائے گی۔

اب جسے ہم عام الفاظ میں کہتے ہیں کہ جنت میں جانے ہی نہیں دیا جائے گا' وہ تو انہی کو جانے دیا جائے گا جن کے ہاں کوئی ایک بھی گناہ نہ ہو۔ یہ غلط بات ہے۔ اِلَّا اللَّمَمَ کہا ہے اور اس پہ بھی میں نے کہا ہے کہ یہ چھوٹ نہیں ہے' کوئی قابلِ ملامت چیزیں جو ہیں' وہ پھر ساری عمر بالکل نہیں کرتے وہ دوسری جگہ کہا ہے کہ اس قسم کی چیز کرنے کے بعد بھی اس پر ان کو فوراً ندامت ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے' ہم سے غلطی ہوگئی۔

انسان کے لیے توبہ کی قبولیت کا فارمولا اس سے عملی زندگی کا تقاضا کرتا ہے

کہے جاتے ہیں کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (7:23) ہم نے اپنے آپ پہ زیادتی کی وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (7:23) ہم سے بھول ہوگئی' غلطی ہوگئی اور اس کی اس نے گنجائش دی ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ انسان سے بھول ہو جاتی ہے اور بھول ہونے کے بعد اصلاح کے لیے جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اسی کو توبہ کہتے ہیں۔ اس نے بتایا ہے کہ یاد رکھو! یا اللہ' میری توبہ' یہ توبہ نہیں ہے۔ توبہ یہ ہے کہ اگر ایک غلطی ہوئی ہے تو اس سے بڑی نیکی کرو تاکہ اس کا وزن اس سے زیادہ بڑھ جائے۔ اسے توبہ کہتے ہیں: پہلے تو اس کا اعتراف کرو کہ غلطی ہوگئی تھی' اعترف کے بعد ایسا کام کرو کہ اس نے جتنا نقصان پہنچایا ہے' اس نقصان کو بھی وہ Cover (پورا) کرے اور اس سے اوپر بھی اس کا کچھ اور وزن ہو۔ اتنا بڑا نیکی کا کام کرو کہ پھر وہ توبہ ہوتی ہے۔ یہ ہزار دانے کی تسبیح پڑھنے سے توبہ نہیں ہوتی: عمل سے زندگی بنتی ہے' تسبیح کے دانوں سے نہیں بنتی اور مومن کی بھی کیفیت دیکھیں کہ یہ صرف حسنٰت ہیں جو سیأت کو مٹاتی ہیں۔ توبہ توبہ کہنے سے نہیں۔ وہ سیأت نہیں مٹتیں۔

خدا کا قانون ربوبیت انسانی زندگی کے ساتھ روز اول سے وابستہ ہے' سائنس بھی اس پر تحقیق کر رہی ہے

کہا ہے کہ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (53:32) کیا بات ہے! کہا کہ یونہی تتر بتر کر کے' تمہیں بھٹی! میں جھونکنا نہیں چاہتا' وہ

تمہاری حفاظت چاہتا ہے' کہا ہے کہ وَاسِــعُ (53:32) اس کے لیے اس نے بہت وسیع میدان چھوڑا ہوا ہے' وہ تنگ نظر نہیں ہے کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر پکڑ لے اور اس کے بعد گدی سے زبان کھینچ دے۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تمہاری حفاظت ہے' میدان بھی وسیع ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے جو کچھ ہم نے بتایا ہے کہ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِىْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (53:32) تم تو آج ہمارے سامنے ایک پیکرِ انسانی کی طرح کھڑے ہو۔ ہم تو اس وقت سے تمہیں جانتے ہیں جب وہ بے جان مادے سے تمہاری زندگی کی' جان کی ابتدا ہوئی تھی اس وقت سے تمہیں جانتے ہیں۔ ڈادھا واقف ہے' ہم اس وقت سے جانتے ہیں' پھر ہم جانتے ہیں جب تک رحمِ مادر کے اندر' جن حالات میں سے گزرے ہو' اسے بھی ہم جانتے ہیں' تم ہماری مخلوق ہو' ہمارے تخلیق کیسے ہوئے ہو تو خالق کو علم ہوتا ہے کہ جو مخلوق ہم نے بنائی ہے' اس نے کیا کیا چیزیں کمی کی رکھی ہوئی ہیں' کہاں کہاں کمزوری واقع ہوئی ہے۔ ہم جانتے ہیں' یہ اس لیے ہے کہ ہمارا معیار یہ نہیں کہ معصوم ہو گے تو جنت میں جاؤ گے۔ اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ ہم نے انسان کی شکل و صورت کے لیے انسان کی اور کردار کی بنیادوں کے لیے کہاں سے' بات شروع کی ہے؟ یہاں سے جب اولیں جرثومہ حیات کی نمود ہوئی ہے' پانی اور مٹی کے ملاپ سے جس وقت زندگی کی نمود ہوئی ہے اس وقت سے ہم تمہیں جانتے ہیں اور جن ارتقائی منازل سے گزرے ہو' ان تمام کو جانتے ہیں۔ رحمِ مادر میں تمہارے اوپر کیا گزری اس کو بھی جانتے ہیں۔ یہ سائیکولوجی تو آج میدان کے اندر آئی ہے وہ تو اس طرح کی بائیالوجی سے بات کو آگے لے جاتا ہے۔ علوم سائنس کی تحقیق ہو رہی ہے۔ جواب تحقیق ہو رہی ہے اس میں بھی یہ چیزیں آ رہی ہیں۔

ایک غیر مسلم قرآن کریم کا محقق ہونے کے باوجود مسلمان کیوں نہ ہوا؟

بہر حال یہ تو علومِ سائنس ہیں۔ میں پھر اپنا نام لوں گا تو مجھ پہ پھر کفر کا فتویٰ لگ جائے گا۔ سائنس بڑی ترقی کر رہی ہے۔ ان قوموں میں ایک بہت بڑا محقق [1] ہے' وہاں قرآن کریم پر بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ وہ اپنی تحقیقات کے نتائج The Bible, The Quran and Science میں درج کر رہا ہے۔ مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ یہ اتنا بڑا شخص قرآن کریم کا معترف بھی ہے' یہ سب کچھ جان رہا ہے تو یہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتا؟ میں نے کہا: بابا! ابھی چند دن اس کی خیر مناؤ' اس کو اس طرح سے کام کرنے دو' جو کچھ بھی وہ قرآن کریم کے متعلق کہہ رہا ہے' کہنے دو۔ ابھی اس پہ کفر کا فتویٰ نہیں لگ رہا' اس لیے کہ وہ تو کافر ہے ہی اگر مسلمان ہو کر اس نے یہ کچھ کہا تو ایک دن میں کفر کا فتویٰ ہو جائے گا پھر وہ مرتد قرار پائے گا' اس لیے اتنی جلدی اس کے مسلمان ہونے کی بات نہ کرو۔ سنیئے! یہ چیزیں ان اقوام میں آ رہی ہیں۔

---

[1] یہ اشارہ اس کتاب کے مصنف مورس بوکائے Maurice Bueaille کی طرف ہے۔

اب تحقیق کا وہ دور شروع ہو چکا ہے کہ جس میں نت نئے انکشاف ہوں گے

عزیزانِ من! رحمِ مادر کے اندر بچہ کن حالات سے گزر رہا ہے' وہ تو معاف رکھیے میری بیٹیاں بیٹھی ہوئی ہیں' بات اشاروں کنایوں میں ہی کرسکوں گا۔ نطفے کے وقت قرار گیر ہونے سے ماپنے کا معیار صرف خدا کی کتاب قائم ہے۔ اب انہوں نے تحقیق کا سلسلہ شروع کر دیا ہے کہ کیا کیا چیزیں آتی ہیں' وہ کس کس قسم کی کیفیات کا حامل بنتا ہے' کن کن منازل سے گزرتا ہے' شکل وصورت میں ہی نہیں بلکہ وہ کون سی باتیں ہیں جن سے ان کا Behaviour بھی بنتا ہے' اس سے کیریکٹر کی بنیادیں بنتی ہیں۔ اس سے وہ لوگ جانتے ہیں جو قرآن حمید نے کہا ہے کہ اس دور سے' اس وقت سے' جب زندگی کی اولیں نمود ہوئی ہے' اور وہاں سے تم نے ارتقائی منازل طے کیں' رحمِ مادر میں آئے پھر بچے کی حیثیت سے آئے' ہم جانتے ہیں کہ تمہاری ترکیب میں کیا کیا چیزیں ہیں۔ ان لوگوں کے یہ علوم وہاں سے چلے ہوئے ہیں اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا غنیمت تھا کہ ابھی وہ جلدی نہیں کر رہے۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ اس کو چند دن کے لیے اور تحقیق کر لینے دو۔ کیا کہتا ہے کہ وہ ناحق کیوں مرے جاتے ہو' ابھی جلدی کیا ہے' تم نے مسلمان ہونا ہو تو کھا پی کر مسلمان ہونا۔ کہا ہے کہ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (53:32) وہ انسانی بچہ رحم مادر میں کن منازل سے گزرا' وہ جانتا ہے کہ اب صورت کون سی ہے۔

کسی انسان کو اپنی ذات کے متعلق خود ہی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو جانا چاہیے اور بات سرسید احمد خاں کی

عزیزانِ من! اب بڑی عظیم آیت آرہی ہے۔ کہا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (53:32) اپنے متعلق یونہی نہ خیال کر لیا کرو کہ ہم بہت بڑے روحانی بزرگ بن گئے ہیں' جناب! خود ہی پاکباز نہ بن جایا کرو' دل کے اندر خود ہی اس فریب میں مبتلا نہ ہو جایا کرو' عزیزانِ من! کچھ خود مبتلا ہوتے ہیں اور کچھ مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ والے جو ہیں' وہ کہتے ہیں کہ صاحب! کیا بات ہے حضرت صاحب کی! اللہ اکبر! ہم نے تو کبھی دیکھا سنا نہیں ہے جو کچھ آپ نے کر کے دکھا دیا۔ اس طرح اس کو فریب میں رکھ دیا۔ کہا کہ اپنے آپ کو فریب میں مت رکھو' اپنے متعلق معیار یہی ہے کہ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (53:32) اس کے معیار پر پرکھ کر دیکھو کہ کس حد تک تمہارا یہ تزکیہ ہوا ہے۔

یہ جو لفظ تزکیہ ہے' اس کی بھی عجیب صورت ہے۔ یہ آپ کا جتنا تصوف کا لٹریچر ہے اس کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تزکیہ نفس کرتا ہے۔ وہ ہمارا ابھی تزکیہ نفس ہوا ہے' وہ بیماری آج تک بھگت رہے ہیں۔ اس میں ہر چیز کی ترک ہے' ترکِ دنیا یہاں تک کہ ترکِ ترک۔ صاف سانس لینے کے لیے صرف کوٹھری ملی ہوئی ہوتی ہے' یہ بس ہر چیز کو چھوڑ کر تزکیہ نفس ہو رہا ہوتا ہے [1] قرآنِ کریم نے یہ چیز کہی کہ

---

[1] اس مقصد کے لیے ترکِ دنیا' ترکِ علائق' ترکِ خیالات' ترکِ آرزو' ہر شے کا ترک یہاں تک کہ ترکِ ترک ضروری ہے۔ بس اس کے لیے ترکِ دنیا' مرشد کی اطاعت' خاموشی اور انکساری اوّلین شرائط ہیں۔

تزکیہ کرو۔ یہ ساری اصطلاحات انہوں نے اپنے ہاں لے لیں گویا اسلام میں یہ یونہی رکھی گئی تھیں' اصل میں چیز تو وہاں تصوف کی تھی جو انہوں نے لے لی۔ اب تزکیہ نفس ہو رہا ہے' مزکی بن رہے ہیں صاحب! اپنے آپ میں ہی فریب نفس میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایک وہ ''ساتھی'' ہیں کہ وہ نکلنے ہی نہیں دیتے۔ یہ اس قسم کی خود فریبی سے تو بڑا براجال ہوتا ہے۔ ہم تو پھنسے ہوئے تھے' آہاہا! وہ جی چاہتا ہے کہ کچھ آپ کو سناؤں کہ یہ جو حضرات تزکیہ نفس کے ہیں ان کے ہاں کس طرح سے ہوتا ہے' یہ ایک بڑی دلچسپ چیز ہے۔ سر سیدؒ کا نام تو آپ نے سنا ہوگا اور اس انداز سے تو سنا ہوگا۔ ان کے اسلوبِ بیان کی شگفتگی شاید آپ کے سامنے کبھی نہ آئی ہوگی۔ وہ بڑا دلچسپ انسان تھا ہمارے ہاں کی صاحب بہت عظیم شخصیت گزری ہے۔ ان کے متعلق ذکر کرتے ہیں۔ یہ ان کی کیفیت ہے۔ کہتے ہیں کہ ان حضرت صاحبان کو آپ دیکھتے ہیں' مسکینی اور انکساری ان کو آسمان پر چڑھاتی ہے' اس لیے یہ اور زیادہ مسکین اور منکسر المزاج بنتے ہیں۔ یہ شخص بڑی گہری باتیں کہہ گیا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے پیدا کی گئی کائناتی نعمتوں سے اظہار نفرت کا نتیجہ

کہا ہے کہ سادہ وضع پر لوگ فریفتہ ہوتے ہیں اس لیے وہ اور سادہ بنتے جاتے ہیں۔ ان کو دنیا سے نفرت اور بھی انکساری میں لیے چلی جاتی ہے اس لیے دنیا سے زیادہ نفرت کرتے چلے جاتے ہیں اور اس درجہ مستغرق ہو جاتے ہیں کہ کھانے پینے تک کا بھی ہوش نہیں رہتا' بے محنت کے ملتا ہے محنت کے بغیر' حاجت کا اظہار کیے بغیر ملتا ہے اس لیے وہ زیادہ سے زیادہ منکسر المزاج ہوتے جاتے ہیں۔ لوگ ان کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہیں' اس لیے ان کے دل میں دوسروں کی حقارت جمتی جاتی ہے' برائی اور بھلائی دونوں میں امتیاز ختم [1] ہوتا جاتا ہے۔ کفر اور ایمان کی کنجی وہ اپنے ہاتھ میں سمجھتے ہیں' کسی کو کافر بناتے ہیں اور کسی کو مرتد' کسی کو جہنم دیتے ہیں' اور کسی کو جنت' کبھی خادمِ جنت ہیں' کبھی مالک جہنم۔ یہ تمام باتیں حضرت کو ایسا شخص بنا دیتی ہیں جس کے نہ کان رہتے ہیں کہ کچھ سنے' نہ آنکھیں رہتی ہیں کہ وہ کچھ دیکھیں' نہ منہ رہتا ہے جو حق کی بات کہہ سکے۔ یہ بھی [2] اسی چنگل سے نکلا تھا۔ خود اپنے متعلق یہ طے نہ کر لو کہ میں بہت مزکی اور روحانی بن گیا ہوں' بڑا بزرگ بن گیا' صاحب! بڑا نیک بن گیا۔ یہ حقیقت میں ایسا بننا بالکل نہیں ہے' عزیزانِ من! وہ تو نبی اکرم ﷺ کائنات رحمت بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی خدا کے احکام کی خلاف ورزی کروں تو اس کے عذاب سے محفوظ نہیں رہوں گا صاحب! انسان جانتا ہے جب وہ کہے کہ وہ جانتا ہے' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے پرکھنے کا معیار وہ علمِ خداوندی ہے جو اس نے کتاب میں دیا ہے۔

---

[1] اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا آف برٹینیکا اور انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجیز اینڈ ایتھکس کے مضامین کے علاوہ جے۔ او۔ ہانے کی کتاب Spirit and Origin of Christian Monasticism اور ای۔ جی۔ بٹلر کی کتاب Benedictine Monasticism مطالعہ کے قابل ہیں۔

[2] ''یہ'' کا اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

تزکیہ کا خودساختہ معیار جو قرآن حکیم کے معیار کے برعکس ہے

یہاں ایک اور چیز، اگر آپ اجازت دیں، تو میں عرض کروں۔ اس نے تزکیہ کا ایک ہی معیار دیا ہے۔ یہ جتنے مزکی حضرات ہوتے ہیں ان کا تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے، دوسروں کی کمائی پہ ہوتے ہیں۔ یہ جاتے ہیں، وہ ان کی قبروں پہ اتنا کچھ لادتے رہتے ہیں، وہ زندگی میں تو پوچھو نہیں کتنا، وہ خود کچھ کمائی نہیں کرتے۔ قرآنِ کریم نے تزکیہ کے متعلق ایک معیار دیا ہے۔ وہ جو کہا ہے کہ ہم سے پوچھو کہ مزکی کون ہوتا ہے، تزکیہ کس کو حاصل ہوتا ہے؟ کہتا ہے کہ اَلَّذِیۡ یُؤۡتِیۡ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (92:18) وہ شخص جو جان مار کر محنت کرتا ہے، اپنی محنت کی کمائی محتاجوں کو دے دیتا ہے، یہ ہے جو بزرگ ہے۔ جو معیار کہا ہے وہ ہم سے پوچھو مگر یہ کیوں پوچھیں؟ لیکن یہ کہتا یہ ہے، یہ اس نے ایک قدم بتایا ہے، اس نے مزکی بننا ہے تو اس کا معیار یہ ہے کہ اپنے لیے اتنا ہی رکھو جتنے کی ضرورت ہے، محنت کرو اور اپنی محنت کی جو کمائی ہے، وہ دوسروں کو دے دو۔ یہ ہے قدمِ اول تزکیہ کا۔ اس سے حضرت صاحب کا تزکیہ نہیں ہوتا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ کمائی کوئی اور کر رہے ہوں اور کمائی کر کے وہ دوسروں کو دے رہے ہوں۔ ان کے ہاں ان کے لیے دوسرے کمائی کرتے ہیں، اور لا کر ڈھیر کرتے ہیں صاحب! قرآن حمید نے تو یہ کہا تھا صاحب! کہ ھُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی (53:32) ان امور کے جانچنے اور ماپنے کا معیار اور پیمانہ، صرف خدا کی کتاب ہے، نہ کہ انسانوں کے اپنے خودساختہ پیمانے۔ وہ معیارِ خداوندی ہے جس کے مطابق یہ جانچنا ہوتا ہے کہ انسان کس حد تک مزکی ہو چکا ہوتا ہے، یہ معیار ہے خدا کی کتاب قرآنِ کریم۔

سورۃ النجم کی آیت 32 تک ہم آ گئے عزیزانِ من! 33ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (2:127)

❀......❀......❀

آٹھواں باب: **سورۃ النجم** (آیات 33 تا 40)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1982ء کی 19 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 33 سے ہو رہا ہے: (53:33)۔
آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درسوں میں سورۃ النجم کس طرح سے اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ پہلے وہ بلندیاں سامنے لائی گئیں جو احسنِ تقسیم انسان کا حصہ ہیں، پھر اسی نسبت سے وہ انتہائی پستیاں سامنے لائی گئیں جو اپنے ہاتھوں کا ایک تراشیدہ پتھر کا ٹکڑا ہے اور محض ایک نام رکھنے کی وجہ سے اسے خدا بنالیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ چیز سامنے آئی کہ طبعی زندگی یہی تمہاری جسمانی زندگی نہیں ہے، تمہاری ذات کا یہ نشوونما مقصود ہے اور اصول یہ ہے کہ انسان کے جسم کی پرورش تو ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ خود لیتا ہے، خود کھاتا ہے اور اس کی ذات کی پرورش اور نشوونما اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی احتیاج کو مٹانے کے لیے دے دیتا ہے، جسم کی پرورش لینے میں ہوتی ہے انسانی ذات کی نشوونما دینے میں ہوتی ہے۔ اب اس کے لیے اس نے کہا کہ اپنے آپ کو یونہی نہ سمجھ لیا کرو کہ ہمارا تزکیہ ہوگیا ہے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ریاست کی طرف سے معاشی ذمہ داریوں کا تعین

تزکیت کا معیار یہ ہے کہ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18) جو دوسروں کی احتیاج اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنا مال و دولت دے دیتا ہے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ایک معیار اور اصول ہے اور اسی بنیاد پر قرآنِ کریم کے معاشی نظام کی ساری عمارت اٹھتی ہے: تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا نظام اسلامی مملکت کے ذمے ہے، تو وہ اس سے فری ہوگیا، آزاد ہوگیا، اس کی

پریشانیاں ختم ہوگئیں' کوئی کسی قسم کے تفکرات نہ رہے۔ یہ ذمہ داری مملکت یا نظام نے لے لی۔ اب اس فرد کے ذمے یہ ہوا کہ یہ پوری پوری محنت کرے اور اس محنت کا جو ماحصل ہوا'اسے معاشرے میں اس طرح تقسیم کیا جائے کہ کسی ضرورت مند کی ضرورت رکی نہ رہے' یہ دیئے چلا جائے اور جہاں تک اس کی ضرورت کا تعلق ہے وہ معاشرہ پورا کرتا چلا جائے' تو یہ جو دیئے جلا جائے گا' یہ ہے جس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوگی' جس نے آگے چلنا ہے۔ قرآن کریم نے یہ اصول بتا دیا' یہی تھا' یہی نظام ہے جو قرآن کریم یہاں Establish (قائم) کرنا چاہتا تھا اور جسے حضورِ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کبارؓ نے Establish (قائم) کیا۔ اس کے بعد آپ اکثر یہ فقرہ سنتے رہیں گے کہ اس صدرِ اول کے دور کے بعد پھر ہماری ریل دوسری پٹڑی پر جا پڑی' تو صدرِ اول کے دین کا جو نظام تھا' ختم ہوگیا' دوسرا دور آ گیا۔ اب آپ غور کیجیے قرآن حمید کس انداز میں یہ بات کرتا ہے! میں نے کہا تھا کہ یہ ویسے تو سارے قرآن حمید کا ایک ایک لفظ اپنی اپنی جگہ ہمالیہ پہاڑ ہے لیکن یہ بعض سورتیں ایسی ہیں' جن میں وہ تمام' جتنا بھی اس کی تعلیم کا ملخص ہے' ارتکاز (Consentrate) کرکے ایک جگہ دے دیا گیا ہے۔ سورۃ النجم کے اندر یہ چیز آئی ہوئی ہے۔ اب پہلی آیت یہ تھی کہ اپنے آپ کو یونہی نہ سمجھ لیا کرو کہ ہمارا تزکیہ ہوگیا ہے۔ تزکیہ تو اس کا ہوتا ہے جو دوسرے کو اپنے تزکیے کے لیے اپنا مال و دولت دے دیتا ہے اور یہ نظام تھا جو قائم کیا۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ معاشی نظام سے منہ موڑ لینے کا نتیجہ خدا کے سامنے تھا: ایک غور طلب نکتہ

اب اگلی آیت کی طرف آیئے کہ نظام تو یہ تھا جو قائم کیا گیا۔ کہا کہ اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی (53:33) تُو نے ان کی حالت پر بھی غور کیا جو پھر اس نظام سے پھر گئے۔ اندازہ لگایئے کہ یہ نزولِ قرآن حکیم کے زمانے کی آیت ہے' نبی اکرم ﷺ پر یہ اس دور میں نازل ہوئی جب یہ نظام متمکن تھا۔ قرآن حکیم کے یہی جو اصول تھے' وہی معاشی نظام بن گئے ہوئے تھے۔ اب اس میں یہ چونکہ خدائے خبیر و علیم کی طرف سے نازل کردہ وحی تھی' اس میں تو قیامت تک کے حالات خدا کی آنکھوں کے سامنے تھے' جیسا کہ عام کہا جاتا ہے یہ بعد کے جو حالات تھے وہ اس علیم و خبیر کے علم میں تھے۔ اعراض برتنے کی' گریز کی راہیں نکال لینے کی' منہ پھیر لینے کی' مڑ جانے کی' دوسری طرف چلے جانے کی' یہ صورتِ حال اس کے سامنے تھی۔ تولّی کے یہ سارے معنی گریز کی راہیں نکالنا کے ہیں۔ میں عام طور پہ اس کا ترجمہ گریز کی راہیں نکالنا' اپنے اس راستے سے پھر جانا کیا کرتا ہوں۔ اب قرآنِ حکیم نے اس کا ذکر ساتھ ہی کر دیا کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ پھر یہ کس طرح سے اس نظام سے پھر جاتے ہیں۔ کہا کہ اَفَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ تَوَلّٰی (53:33) غور کیا تم نے ان کی حالت پر جو اس نظام کے قائم ہونے کے بعد پھر اس سے پھر گئے؟

نظامِ سرمایہ کے برعکس اسلام نے ایک نئے معاشی نظام کی بنیا درکھی مگر ہم اَعۡطٰى قَلِيۡلًا ہو گئے

پھر جانے کی وہ کون سی مثال دی' کون سی بات بتائی جس سے پتہ چل گیا یا چل جائے کہ یہ اس نظام پر نہیں رہے' اس سے پھر گئے ہیں؟ وہاں تو یہ تھا کہ الَّذِىۡ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18) اس نے اپنا مال دوسروں کی پرورش کے لیے دے دیا۔ اب اس نظام سے پھر جانے والوں کی کیا صورت ہے؟ کہا کہ وَاَعۡطٰى قَلِيۡلًا وَّاَكۡدٰى (53:34)۔ وہاں یہ تھا کہ اپنا پورے کا پورا مال دوسروں کی ضرورتوں کے لیے دے دیا۔ کہا کہ اس نظام سے پھر گئے۔ تو کیا کیا؟ اب یہ نہیں ہے کہ یہ کہہ دیا کہ ہم قرآن حمید کو نہیں مانتے' ہم اسلام کو نہیں مانتے۔ یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں ہوسکتی۔ کہا تو یہی کہ ہم اسلام پہ قائم ہیں مگر ایک نیا اسلام ایجاد کیا۔ اس اسلام نے کیا کیا؟ کیا یہ کہ اس مال و دولت میں سے تھوڑا سا دے دیا اور اس کے بعد باقی اپنا مال لے کر ایسے ہو گئے جیسے پتھر کی چٹان ہوتی ہے کہ اس میں سے ایک قطرہ بھی پانی کا نہیں نکلتا۔

غور کیجیے گا' عزیزانِ من! یہ ایک آیت میں ساری بات کہہ جاتا ہے۔ کہا تو یہ تھا کہ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ نظام یہ ہے کہ تمہاری ضروریات کی ذمہ داری مملکت نے لے لی' تمہیں اس کی پریشانی نہیں' تم محنت کرو اور جو کچھ اس سے پیدا ہوتا ہے اُسے انسانیت کی منفعت کے لیے کھلا رکھو۔ یہ تھا وہ نظام! یہ اپنی محنت کے ماحصل کو ضرورت مندوں کے لیے دے دینا ہے' اس سے انسانی ذات کا تزکیہ ہوتا ہے۔ یہ نظام قائم ہوا۔ یہ تولّٰی بتا رہا ہے' قرآن حمید بتا رہا ہے کہ اس نظام کے قائم ہونے کے بعد' اس سے پھر جانے والے کون سے لوگ ہیں؟ پھر کیا ہوا؟ یہ کہ اس سے پھر گئے۔ ان کی کیا کیفیت ہوگئی؟ تھوڑا سا دیا' باقی جتنا ہے اس کو یہ سمجھا کہ مال حلال وطیّب ہو گیا اور پھر بیٹھ گئے ایک پتھر کی طرح' اس کی ضرورت ہی باقی نہیں ہے کہ کچھ اور دینا ہے کیونکہ اسی سے مطمئن ہو گئے کہ دین کا منشا پورا ہو گیا۔ کیا کہنے ہیں قرآن حکیم کے ایک لفظ تولّٰی کے! اس میں ہماری ساری تاریخ آ جاتی ہے۔

عزیزانِ من! پھر گئے اس نظام سے' اور ایک نیا نظام قائم کیا' اس میں تھوڑا سا دیا' باقی کے متعلق مطمئن ہو گئے کہ باقی سارا مال حلال وطیّب ہو گیا۔ پھر یہ نظام قائم کیا' پہلے نظام سے پھر جانے کے بعد۔ اب آپ غور کیجیے کہ کیا وہی ہمارے ہاں نظام نہیں چلا آ رہا؟ کہ جتنا جی چاہے جمع کرتے رہو اور اَعۡطٰى قَلِيۡلًا (53:34) اس میں سے تھوڑا سا دے دو' کچھ اڑھائی فیصد ہی سہی: اَعۡطٰى قَلِيۡلًا (53:34) یہ تھا کہ یہاں وہ سارے کا سارا مال حلال وطیّب ہوا۔ بس اَعۡطٰى قَلِيۡلًا (53:34) تھوڑا سا دے دو۔ یہ ہے تولّٰی۔

دولت کے انبار میں سے تھوڑا سا دینے کا یہ جذبہ کیونکر پیدا ہوا؟

عزیزانِ من! آپ کو نہ بھی یاد ہو تو بھی ہر بار دہرانا پڑتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بے حد و نہایت مال و دولت کا جمع کرنا' انبار لگانا

اور اس میں سے اتنا سا دینا' اسلام کے اندر کیسے آیا؟ یہ سارا اسلام جو بنا ہوا ہے' یہ تو آپ کے دورِ ملوکیت کا ہے۔ ملوکیت آئی تو اسلام کی بنیاد چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ داری آئی۔ ملوکیت اس کے بغیر قائم ہی نہیں رہ سکتی اور چونکہ عوام' جمہور' اسلام پسند تھے' ان کے علی الرغم کوئی ایسی بات نہیں کی جا سکتی تھی جسے وہ سمجھیں کہ اسلام کے خلاف ہو رہا ہے' اسلام کو ہی ایسا بنا دیا' جو ان کی منشا کے مطابق ہو اور جمہور مطمئن ہو جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اسلامی ہے' یہ انبار در انبار جمع کر کے اس میں سے اتنا سا دے دینا' یہ ہوا دورِ ملوکیت کا نیا اسلام۔

دولت کے سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت اور اس کے برعکس قرآن حکیم کا ارشاد

آپ کو یاد ہو گا بخاری شریف کی یہ روایت کئی مرتبہ ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی' وہ سورۃ توبہ کی آیت کے الفاظ سامنے لے آؤ۔ کہا ہے کہ وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَ الْفِضَّۃَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (9:34) جو لوگ مال و دولت جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کھلا نہیں چھوڑ دیتے' دیکھیے یہاں "وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا" (9:34) پورے مال کے متعلق ہے۔ یہ "اس میں سے کچھ خرچ کر دیتے ہیں" نہیں ہے۔ یہ "میں سے" نہیں آیا ہے وہ تو اس کی دولت' اس کے پورے مال کے لیے آیا ہے کہ وَ لَا یُنْفِقُوْنَھَا (9:34) اور آگے جو آیت ہے وہ یہ ہے یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ (9:35)۔ یہ اس سارے کے سارے مال و دولت کے متعلق چلا آ رہا ہے کہ یہ جمع کرتے ہیں' اپنی ذات کے لیے رکھتے ہیں اور اس کو نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے کھلا نہیں چھوڑتے۔ ان کی کیفیت یہ ہے۔ ان کو عذاب الیم کی بشارت دے دو اور جب چاندی اور سونے کے مال و دولت کے یہی ٹکڑے جہنم کی آگ میں تپائے جائیں گے اور ان کو داغا جائے گا تو یہ تو سارے کے سارے کے متعلق ہے اور وہ نظام ایسا ہے جس میں کہا یہ گیا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ (2:219) پوچھتے ہیں آپ ﷺ سے کہ اپنی کمائی میں سے ہم کتنا دوسروں کی ضرورت کے لیے دے دیں۔ کہا کہ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) جتنا تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے' وہ سب کا سب دے دو۔ تمہاری ضرورت پوری ہو رہی ہے مملکت کی طرف سے' تو تم نے رکھنا کاہے کے لیے ہے' پورے کا پورا دے دو۔ یہ نظام تھا۔ یہ اس نے تو اس قدر پریشانیوں کو اور نجی اور ذاتی تفکرات کو دور کر دیا اور انسان کو پھر جو بلند مقاصد' انسانیت کے لیے ہیں' اس کے لیے تیار کر دیا تاکہ یہ کام کرے' کچھ اپنی روٹی کی فکر اس کو نہ ستائے' اپنے بال بچوں کے رزق کی فکر ہر وقت اس کے پیچھے نہ لگی رہے۔ اس سے اس نے آزاد کر دیا:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اسے غمِ جاناں بنا دیا

کہا کہ پھر کاہے کے لیے جمع کرتا ہے۔ تو یہ قرآن حکیم کی آیت ادھر ہے کہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم نے کتنا دینا ہے؟ کہا کہ اپنی ضرورت سے زائد جتنا بھی ہے سارا دوسروں کے لیے ہے' جمع کاہے کے لیے کرنا ہے؟ یہ جو مال کا جمع رکھنا ہے' یہ اسلام کے بنیادی معاشی نظام کے خلاف تھا۔

نظام سرمایہ داری کو جائز کروانے کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کے چناؤ کی ایک روایت اور قرآن کریم کا حکم

اب اس روایت کی طرف آیئے' آیت کے شانِ نزول کا تصور ہمارے ہاں آیا ہوا ہے۔ اس روایت کی رو سے یوں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہؓ میں بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ معاذ اللہ۔ خدا کی طرف سے آیت نازل ہوا اور ان میں اس کی وجہ سے بڑا اضطراب پیدا ہو جن کے لیے قرآن حکیم نے رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا سرٹیفکیٹ دیا ہے کہ ہم آہنگ ہو گئے وہ خدا کے احکام کے ساتھ۔ ان پہ یہ چیز بڑی گراں گزری صاحب! بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ معاذ اللہ بڑے بڑے سرمایہ کے مہاجن اکٹھے ہوئے تھے کہ صاحب! اب کیا بنے گا؟ انہوں نے آپس میں فیصلہ کیا کہ نمائندہ بنا کر نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک میں کس کو بھیجنا چاہیے۔ سنیئے! یہ کس انداز سے یہ روایتیں وضع ہوئی ہیں! یعنی اس خداوندی حکم کو بدلنے کے لیے ایک وفد بھیجا جائے' ایک نمائندہ بھیجا جائے۔ نمائندہ کون سا چنا؟ حضرت عمرؓ کو جن کی خلافت کے زمانے میں بائیس لاکھ مربع میل آیا تھا۔ وہ سربراہِ مملکت تھا' وہ منبر پہ کھڑا ہوا' دیر سے آنے کی وجہ بیان کر رہا تھا' ان کے تہمد میں دس پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ شخص' ان سرمایہ داروں کا' حضور ﷺ کے پاس نمائندہ بن کر جاتا ہے۔ یہ تصور کر کے کلیجہ کانپ اٹھتا ہے کہ خدا کا حکم رسول اللہ ﷺ پہنچا رہے ہیں' صحابہؓ میں اضطراب ہے' وفد بن رہا ہے' نمائندگی کر رہے ہیں' حضرت عمرؓ جا کر حضور ﷺ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ﷺ کو کچھ پتہ بھی ہے کہ اس حکم سے آپ ﷺ کے صحابہؓ پہ کیا گزری!!! خدا کے اس حکم کے متعلق ردِعمل' آپ کے صحابہؓ کا کیا ہوا؟ اوئے ہوئے!! وہ کہتے ہیں کہ جی! وہ تو سارا مال ودولت کہا جا رہا ہے کہ یہ جمع کرنا بالکل دوزخ کی آگ ہے۔ آپ ﷺ مسکرائے' کہنے لگے: انہیں پتہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ کا جو حکم آیا ہے' اس سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس میں سے اگر اڑھائی فیصد دے دیا جائے تو باقی سارا مال ودولت حلال وطیّب ہو جاتا ہے' صاحب! کہا ہے کہ یہ سننے کے بعد حضرت عمر ؓ نے وہاں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ اتنا بڑا قلعہ فتح کیا! صحابہؓ کو آ کر بتایا' سب خوش ہو گئے صاحب! معاذ اللہ۔ کہا ہے کہ **اَعۡطٰی قَلِیۡلًا** (53:34) یہ اس تولّی کے بعد **اَعۡطٰی قَلِیۡلًا** ہے۔ اس کی یہ سند بہم پہنچائی جا رہی ہے۔ قرآن کریم میں تو کہیں نہیں تھا (یا ہے) کہ اڑھائی فیصد دے دو' وہاں تو **یُنۡفِقُوۡنَهَا** (9:34) تھا' وہاں تو **قُلِ الۡعَفۡوَ** (2:219) تھا اور اس نظام میں جمع کرنے کا سوال ہی نہیں' کاہے کے لیے جمع کیا جائے' سر دردی مول لی جائے! کہا ہے کہ **تَوَلّٰی** (53:33) انہوں نے اس نظام سے گریز کی راہیں نکال لیں' پلٹ گئے اور دوسرا نظام قائم کیا۔ کہا ہے کہ **وَاَعۡطٰی قَلِیۡلًا**

وَّ اَکۡدٰی ❶ (53:34) خدا کے احکام میں تو یہ ایسی بات نہیں تھی کہ اس سے تزکیہ ہو جائے گا' باقی مال حلال وطیّب ہو جائے گا۔ کہا کہ اَعِنۡدَہٗ عِلۡمُ الۡغَیۡبِ فَھُوَ یَرٰی (53:35) تو کوئی ان کے پاس غیب کا علم ہے جس سے یہ سندیں لاتے ہیں کہ نہیں' اب ٹھیک نظام یہی ہے اور کہتے ہیں کہ اَعۡطٰی قَلِیۡلًا (53:34) والا نظام ہے۔ وہ سامنے ظاہر ہے کہ قرآن کریم میں تو ہے نہیں۔ کوئی غیب کی بات ان کے پاس ہوگی' جس سے یہ سند لاتے ہیں۔ کہا کہ انہیں بتاؤ کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو ان سے کہی گئی ہے۔

خدائے علیم اپنی طرف دی گئی اقدار کو کبھی نہیں بدلتا

دین کے اصول شروع سے ایک ہی چلے آ رہے ہیں' مختلف زمانوں میں دین پر عمل کرنے کے طریقے تو بدلتے تھے' دین کے اصول نہیں بدلتے۔ کہا ہے کہ اَمۡ لَمۡ یُنَبَّاۡ بِمَا فِیۡ صُحُفِ مُوۡسٰی o وَ اِبۡرٰھِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰی (53:36-37) کیا انہیں معلوم نہیں ہے کہ جو کتاب حضرتِ موسیٰؑ کی طرف نازل کی' حضرت ابراہیمؑ کی طرف نازل کی' یعنی جتنے بھی انبیائے کرامؑ تھے' ان کی طرف جو کتاب نازل کی تو ان میں بھی یہی کچھ تھا۔ یہ کوئی نیا دین نہیں ہے اور حضرتِ ابراہیمؑ کے متعلق تو یہ کہہ دیا کہ انہوں نے یہ پورا کر کے دکھا دیا تھا۔ یہ سارا کچھ' جو کہا گیا تھا' انبیائے کرام نے تو یہ کیا تھا۔ کہا کہ یہ نظام نیا نہیں ہے۔ یہ سارا وہاں بھی آیا ہوا تھا۔ کیا تھا نظام؟ عزیزانِ من! دو آیتیں ہیں' دو دو چار چار الفاظ کی۔ مذاکرے ہوتے ہیں' سیمینار ہوتے ہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ ان دو آیتوں کے اندر معاشی نظام بھی اور سیاسی نظام بھی دونوں آ گئے' دونوں نظاموں کی بنیاد آ گئی۔ وہ دو آیتیں یہ ہیں جو شروع سے دین کی بنیادیں چلی آ رہی ہیں۔ صحفِ موسیٰؑ اور صحفِ ابراہیمؑ کے اندر بھی یہی ہیں۔ اب یہ قرآن حمید میں بھی یہی کچھ دیا گیا ہے۔ وہ تھی بنیاد جو ان دو آیتوں میں بنائی۔

قرآن حکیم اپنے معاشی نظام کی بنیاد سرمائے پر نہیں بلکہ محنت کے صلہ پر رکھتا ہے اور یہی انسانیت کا آخری سہارا ہے

عزیزانِ من! کہا ہے کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی o وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:38-39)۔ ان دو آیتوں کے اندر بات ختم ہو گئی۔ یہی پہلی چیز یوں پہلے لے لیجئے' پھر دوسری بات سمجھ میں آ جائے گی۔ معاشی نظام کی بنیاد اس پہ ہے کہ صلہ یا معاوضہ محنت کا ہے' سرمائے کا نہیں ہے۔ آج کے دور کا بہت بڑا کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کے خلاف جو نظام اٹھا' اگرچہ یہ بات

---

❶ اَکۡدٰی کا مادہ ''ک دی'' ہے۔ اَلۡکُدۡیَۃُ بڑی سخت چٹان' سخت زمین۔ اَکۡدَی الۡحَافِرُ زمین کو کھونے والا اس مقام پہ جا پہنچا جہاں سخت زمین یا چٹان آ گئی اور وہ مزید کھدائی سے رک گیا (تاج العروس)۔ وَاَعۡطٰی قَلِیۡلًا وَّ اَکۡدٰی (53:34) وہ تھوڑا سا دیتا ہے اور پھر پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے (ابن فارس)۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص-1422)۔

کمیونزم کی طرف سے آئی۔ یہ کہتے ہیں' ان کے ہاں سے تو یہ بات کہی گئی' مارکس نے کہا تھا کہ یہ نظام تو صحیح ہے جو دنیا میں آخرالامر آئے گا لیکن میں چونکہ اس کے لیے Incentive یا جذبہ محرکہ نہیں پاتا کہ کس جذبے کے تحت یہ نظام قائم ہوگا' اس لیے میں یہ جرأت تو نہیں کرتا کہ اس کو قائم کرنے کے لیے عملی قدم اٹھاؤں لیکن میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ آخرالامر انسانیت کی نجات اسی نظام کے اندر ہوگی' جو یہ میں کہوں گا اور وہ نظام یہ ہے کہ ''معاوضہ محنت کا ہوگا' سرمائے کا نہیں''۔ یہ کیا بات ہوئی؟ سنیے! ہزار روپیہ آپ اپنی الماری کے اندر یا تجوری میں رکھ دیجیے' مہینہ دو مہینے' سال دو سال' دس سال بیس سال' جب بھی آپ اس کو دیکھیں گے' وہ ہزار کا ہزار ہی وہاں رکھا ہوا ہوگا' کچھ نیا نہیں بنتا۔ یہی ہزار آپ نے کسی دوسرے کو دے دیا' کہیں invest کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے دیکھا کہ چھ مہینے کے بعد اس میں سو روپے کا اضافہ ہوا۔ وہ سو روپے کا اضافہ کیسے ہوا؟ اس ہزار روپے نے بچے تو دیئے نہیں' وہ تو آپ نے اپنے ہاں رکھ کر دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک پیسہ بھی نہیں بڑھتا' وہ بچہ نہیں دیتا' وہ تو ویسے کا ویسا ہی ہوتا ہے' چور لے جائے تو وہ بھی نہیں رہتا۔ اس میں سے کچھ نہیں بڑھتا۔ یہ ہزار دے کر جو ایک سو اس کے اوپر آپ نے لے لیا یہ کیسے بڑھا؟ اس کے اوپر کسی اور نے محنت کی' یہ اس کی محنت کی کمائی سے' سو روپیہ ہے جو آپ کو آ گیا۔ آپ کا جو ہزار ہے اس نے تو کوئی بچے نہیں دیئے جو یہ سو اوپر اٹھ کر آ گیا۔ یہ اسے سرمایہ کا صلہ کہتے ہیں محنت کا نہیں' یہ صرف سرمایہ کا ہے۔

نظام سرمایہ داری کے خدوخال اور اس کے عملی نتائج

اب پہلی چیز یہ ہوگئی کہ جو دولت جمع کرنا ہے' اس وضعی روایت کی رو سے' وہ جائز قرار پا گیا اور پھر اس پر آپ کے سارے معاشی نظام کی روایت آتی ہیں' پھر یہ Invest کیسے کیا جائے' کس طرح سے کیا جائے؟ اور پھر آگے چلو تو عجیب قصے آتے ہیں۔ بنیاد یہاں آ گئی۔ وہاں قرآنِ کریم میں یہ تھا کہ پورے کا پورا دے دینا ہے' جمع نہیں کرنا۔ جمع وہاں کیا جاتا ہے؟ یہ ہے جسے آپ سرپلس منی کہتے ہیں۔ فالتو دولت' زائد دولت' اپنی ضرورت سے جو زیادہ ہوتا ہے' وہ ہے سرپلس منی۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد سرپلس منی پر ہوتی ہے' جو ضرورت سے زائد ہوتا ہے اس کو جمع رکھنا ہے پھر اس کو دوسرے کو دے دینا' دوسرے کو دینے کی شکلیں بڑی مختلف ہوتی ہیں۔ ہر دور میں جو اکنامکس ہے وہ بدلتی رہتی ہے۔ کسی زمانے میں تو صرف انفرادی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک فرد غریب آدمی کو ضرورت پڑتی تھی' اب وہ دوسرے سے ذاتی انفرادی قرض لیتا تھا اور اس قرضے پر یہ ہوتا تھا کہ صاحب! کوئی ایک سال کے بعد دس روپے اس کے اوپر دے دو۔ یہ سود کہلاتا تھا۔ اب اس کے بعد کئی شکلیں بدلیں۔ اب انوسٹ کیا جاتا ہے۔ سرمایہ کاری اس کا نام رکھا گیا ہے۔ یوں کسی فرد کو براہِ راست قرض نہیں دیا جاتا۔ وہ کہاں سے آتا ہے جو سال کے بعد اس میں سے آپ کو وہ سو روپیہ دے دیتے ہیں؟ وہ آپ کا جو ہزار تھا' میں نے ابھی کہا ہے کہ وہ یہاں رکھیے یا بنک میں رکھیے' وہ بچے نہیں دیتا۔ یہ سال کے بعد آپ نے اس کے اوپر سو روپیہ براہِ راست کسی سے نہیں

لے لیا۔ وہ ذہن میں آیا کہ صاحب! وہ قرض دیا تھا' ہم نے اس کے اوپر بیاج نہیں لے لیا' یہاں دے دیا جائے۔

قرآن حکیم کے نزدیک ربٰو کا لغوی مفہوم اور دیئے گئے قرضوں کی واپسی کا حل

اب آگے جو کچھ ہے' وہ وہی قصہ ہے جو آپ افراد کے ساتھ کر رہے تھے کہ دیا اور اس کی محنت میں سے یہ لیا' وہ وہاں محنت کرتے ہیں ورنہ وہ آپ کو ہزار کے بعد سو کہاں سے دیں گے۔ بنک والے نوٹ تو چھاپتے نہیں ہیں' یہ کہاں سے آ گیا؟ آپ نے تو محنت نہیں کی' محنت تو کسی اور نے کی ہے۔ وہ آپ کے سامنے بھی نہیں ہے' آپ کو اس کا علم بھی نہیں ہے لیکن یہ تو بات ہے جی! کہ یہ کسی کی محنت کی کمائی ہے جو آپ کو زائد ملی ہے۔ آپ کی محنت کی کمائی نہیں ہے' کسی اور کی محنت کی کمائی ہے۔ یہ جسے آپ ربٰو کہتے ہیں یعنی اپنے اصل کے اوپر کچھ زیادہ لینا' اس کے لیے پہلے ہی دن اس نے جڑ کاٹ کر رکھ دی جب کہا کہ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) حلال وطیّب صرف وہ ہے جو اس کی محنت کی کمائی ہے' جو محنت کی کمائی نہیں' سرمائے کی کمائی ہے' وہ ربٰو ہے اور اس تفصیل کی تشریح قرآن کریم نے خود کر دی جب یہ حکم دیا ہے کہ ربٰو حرام ہے اور ربٰو کی حرمت کی کیفیت یہ ہے کہ بڑے بڑے جرائم اور گناہ جن کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے' ان کی جڑ (Root) یہ ہے۔ ربٰو کے نظام کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اس نظام کو اگر نہیں بدلو گے تو تمہارے خلاف' اسلامی مملکت کی طرف سے اعلانِ جنگ ہوگا۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جو آپ کے ہاں کا قرآن کریم کا بنیادی معاشی نظام ہے وہ اس کے علی الرغم ایک دوسرا نظام کھڑا کرنا ہے۔ یہ بغاوت ہی تو ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

عزیزانِ من! اس اعلان کرنے کے بعد کہا کہ لوگوں نے دوسروں کو قرضے دیئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ پھر وہ کہاں جائیں؟ کہا کہ تم صرف اپنے اصل زر کے مالک ہو سکتے ہو' اصلِ زر واپس لے سکتے ہو' صرف (Principal Amount) راس المال لے سکتے ہو' اس سے زائد نہیں یعنی جو پہلے دیئے ہوئے تھے اس کے متعلق بھی یہ کہہ دیا' آئندہ دینے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ تو حکم ایسا آ گیا۔ جو پہلے دیئے ہوئے تھے' کہا کہ ان کے متعلق بھی یہ طے کر و کہ جو ان سے واپس لینا ہے' خواہ تم نے ان سے معاہدہ ہی کیوں نہ کیا ہوا تھا کہ وہ اتنا زائد دیں گے' لیکن تم نہیں لے سکتے' صرف اصلِ زر لے سکتے ہو' اس کے اوپر کچھ بھی زیادہ لو گے تو ربٰو ہو جائے گا۔ ربٰو کے معنی ہی ''زیادہ' بڑھوتری'' کے ہوتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس تولّی کے بعد' جب وہ دوسری طرف آئے تو اَعْطٰى قَلِيْلًا (53:34) کی تشریح یوں کی تو یہ باقی مال جمع ہوا۔ جمع ہوا تو پھر وہ مال کوئی گھر میں رکھنے کا تقاضا تو نہیں' دوسرے کو دینے کا ہے۔ اب اس میں سے پہلے ذرا اس سودی کاروبار میں' میں وہ کوٹڈ کہوں گا' دیانت تھی تو اس کو سود ہی کہا جاتا تھا' اب جو وہ اسلامی ہوا ہے' تو اس کو منافع کہنے لگ گئے ہیں' وہ نام دوسرا رکھ لیا: اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ (53:23)۔ اس سورہ النجم میں یہ آیت آئی کہ ''تم نے اس کا کچھ نام رکھ لیا''۔

ربوٰ کے سلسلہ میں فریب دہی کی خاطر ہم نے جو نام تجویز کرر کھے ہیں ان کی ایک دو محسوس مثالیں

غریب، زمیندار کسان کا شتکار آیا کہ شاید مجھے ہزار روپیہ دے دے، تو ایک ٹکڑا زمین کا ملتا ہے، میں وہ لے لوں، محنت کروں گا، اس میں سے کچھ نکلے گا، بچوں کا پیٹ پالوں گا، کہا کہ بھئی! میں تمہیں ہزار روپیہ تو دے دوں، سود لینا تو حرام ہے، اس سے زائد تو کچھ میں لے نہیں سکتا۔ کیا کیا جائے؟ کہنے لگا کہ میں تمہیں روپیہ نہیں دیتا، وہ زمین میں خرید لیتا ہوں، تمہیں کاشت کرنے کے لیے دے دیتا ہوں، تم اس میں کاشت کرو، محنت تم کرو، بٹائی وہی آدھی فصل تمہاری، آدھی فصل میری، یعنی اگر اس پہ کچھ بیاج لیتا تو پانچ دس روپے لیتا، وہ حرام تھا، یہ حلال ہوا جو آدھی فصل لے گیا۔ اس کا نام فقہ کے اندر مزارعت رکھ دیا، جائز ہوا اور یہ تو گاؤں کی زندگی تھی، وہاں کا شتکاری تھی۔ شہروں کی زندگی میں کیا کیا؟ اس نے آ کر کہا کہ صاحب! میں نے کاروبار کرنا ہے، پیسہ میرے پاس کچھ ہے نہیں، لہٰذا تھوڑے سے پیسے مجھے دے دیجئے، میں آپ کو لوٹا دوں گا اور پھر اس کے بعد آپ کو کچھ پانچ دس ساتھ دے دوں گا۔ کہنے لگا: لاحول ولا تم حرام خور بتا رہے ہو، مجھے سود خور بنا رہے ہو۔ میں پیسے کوئی ویسے تو نہیں دیتا، میاں! کوئی بات نہیں، یہ لے جائیے، کاروبار کرو تو جو اس میں سے منافع ہوگا اس میں میرا حصہ اتنے پر ہوگا۔ یہ سود نہیں، منافع ہے۔ اس کا نام ہے مضاربت۔ یہ سب حلال ہے۔

قرآن حکیم نے معیشت جیسے بنیادی مسئلہ کا حل صرف چار لفظوں میں پیش کر رکھا ہے: معاوضہ محنت کا ہے

قرآن حکیم کا اصول، عزیزانِ من! اتنی لمبی چوڑی اکنامکس میں لانے کا نہیں ہے، یہ اتنی لمبی چوڑی بات ہی نہیں ہے۔ وہ تو بات وہ کہتا ہے جو ایک بھیڑ بکریاں چرانے والا گڈریاں بھی سمجھ لے اور بڑا سے بڑا اکنامسٹ بھی سمجھ لے۔ آج بڑی سے بڑی جو اکنامکس ہے، وہ اس اصول پر ہے کہ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) معاوضہ محنت کا ہے، سرمائے کا نہیں ہے۔ چودہ سو سال پہلے چار لفظوں کے اندر پورا نظامِ معیشت دے دینا خدا ہی کے بس کی بات تھی، یہ وہی دے سکتا تھا۔ دنیا اس نظام سے تنگ آنے کے بعد جو دوسری طرف آ رہی ہے تو وہ اس اصول پہ آ رہی ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔

مارکس جہاں ناکام رہ گیا اس سے آگے: ایک اور سنہری اصول

آج انہیں یہ اصول دیا جا رہا ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ یہ جذبہ محرکہ جسے مارکس نے کہا تھا کہ وہ مجھے نہیں ملتا۔ اُسے یہ نہیں ملتا کہ ایک شخص اتنی محنت کر کے اتنا پیسہ کمائے، دوسرے کو دے اور اس میں سے آپ کچھ نہ لے تو وہ ایسا کیوں کرے؟ اسے وہ جذبہ محرکہ نہیں ملتا۔ یہ کیوں والی جو بات تھی، وہ قرآن حکیم نے کہی۔ يُؤۡتِىۡ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18) تمہارا ایمان ہے کہ زندگی جسم ہی کی نہیں ہے، زندگی انسانی ذات کی بھی ہے اور انسانی ذات کا تزکیہ، نشو و نما اس سے ہوتی ہے جو مال سے دیا جاتا ہے۔ یہ جذبہ محرکہ تھا۔ اس پہ یہ بخوشی دیتا چلا

جائے گا۔اس میں یہ نہیں کہے گا کہ میرا باقی حصہ واپس دیں۔روپیہ دیتے ہوتو دس روپے یا بیس روپے ساٹھ دو کہ وہ جو دینا تھا۔کہا ہے کہ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39)۔اور اسی کے ساتھ اس کا دوسرا ٹکڑا معاشی نظام میں بھی آئے گا اور یہ آپ کے سارے سیاسی عمرانی تمدنی معاشرتی نظام میں بھی آئے گا۔زندگی کے ہر گوشے میں آئے گا اور وہ ہے کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى (53:38) کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔آہاہا! کیا نظام ہے' عزیزانِ من! یہ ہمارا سارا نظام باطل کا ہے کہ ذمہ داری کسی کی ہوتی ہے' اٹھا کوئی رہا ہوتا ہے' ایسی ایسی تکنیک ایجاد کی جاتی ہیں کہ اپنی ذمہ داری دوسروں کے سر پہ پڑے۔کہا کہ یہ ہے نظام معیشت۔معاشی نظام کے اندر بھی یہ تو صاف بات ہے کہ یہ بوجھ ہے' اسے کوئی دوسرا نہیں اٹھائے گا اور زندگی کے باقی گوشے ہیں' اس کے اندر نظام یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ذمہ داری خود اٹھائے' دوسرے کے سر پہ نہ لادے۔

غیر قرآنی معاشرے میں احساس ذمہ داری کی تصویر کشی

عزیزانِ من! یہاں کوشش ہوتی ہے کہ ہر دوسرے کو کسی طرح سے ٹٹو بنایا جائے' اس کے ذمہ ڈال دیا جائے' اس پہ ذمہ داری ڈال دی جائے۔یہاں جتنا اونچا ہوتے چلے جاتے ہیں' اس چکر میں اتنا ہی اپنی ذمہ داریاں کم ہوتی جاتی ہیں' دوسروں کے اوپر زیادہ لادتے چلے جاتے ہیں۔کہا کہ نظام یہ ہے: ہر فرد اپنی ذمہ داری آپ پوری کرے گا' کسی دوسرے فرد کے سر پر نہیں لادے گا۔یہ کتنا عظیم اصول ہے! میں نے عرض کیا ہے کہ اسے پھیلایئے سیاست میں' تمدن میں' معیشت میں' معاشرت میں' یہ دوسرے کی کمائی پر اس کا کنبہ ہے جو پل رہا ہے' یہ اس کمائی پر ہے جو دوسروں کے ہاں سے آتی ہے۔اُس کی ذمہ داری تھی' مگر یہ نبھا رہا ہے۔صبح سے شام تک محنت کرتا ہے' اپنے بچوں کی ذمہ داری کو نبھا رہا ہے' اُس کے بچوں کی ذمہ داری بھی لی ہوئی ہے۔اس چیز کو بطور اصول کے یاد رکھیے' عزیزانِ من! کسی کی ذمہ داری لینا' قرآنِ کریم کے اس عبوری دور میں ہے' جب ابھی وہ نظام قائم نہ ہوا ہو' کہا ہے کہ فِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (51:19) اُس دور میں ابھی وہ نظام قائم نہ ہوا ہو اور آپ اس طرف جا رہے ہوں' ایسے لوگ ہوں گے جو محنت کرنے سے معذور ہوں' (مثلاً) اپاہج ہیں' بیمار ہیں' بوڑھے ہیں' محنت نہیں کر سکتے یا جو محنت کرتے ہیں ان کی محنت کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے پوری نہیں ہوتی' کم رہ جاتی ہے' یہ سائل ہوتا ہے' وہ محتاج ہوتا ہے' کہا کہ ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے انہیں کچھ دو تو ظاہر ہے کہ یہ تو ہنگامی چیز ہے کہ کسی کی کمائی کم رہ جاتی ہے۔یہ بھی ہنگامی چیز ہے۔معذور ہے۔یہ عبوری دور کے لیے ہنگامی طور پر کسی کی مدد کرنا ہے جسے آپ خیرات کہتے ہیں' وہ یہ دے دینا ہے۔یہ اس دور کی چیز ہے۔

اپنی ذمہ داری دوسروں سے پوری کرانا ہی گداگری ہے

کسی شخص کی، جو محنت کرنے کے قابل ہے، خود محنت نہیں کرتا، اس کی ذمہ داری کو اٹھا لینا، قرآن حکیم کے اس حکم کے خلاف ہے۔ وہ جتنے ہٹے کٹے گداگر بنے پھرتے ہیں، وہ کون ہیں جن کی ذمہ داری کسی نے اٹھالی ہے؟ ایک تو یہ ہے کہ ایک وقت کے لیے روٹی دی، ذمہ داری لی، اب وہ تھوڑے سے عرصے کے بعد محنت کرنے کا عادی نہیں رہتا، محنت اس کو ایک مصیبت نظر آتی ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ اس کی جو ذمہ داری کسی نے قبول کی تھی، وہ پھر قبول ہوتی رہے۔ یہ ہے جسے Beggary کہتے ہیں۔ وہ اس سے اترتا نہیں، آہستہ آہستہ وہ گداگر ہو جاتا ہے۔ وہ خواہ یوں دروازوں پہ جا کر مانگے یا بغیر محنت کیے ہوئے اپنی ذمہ داری دوسرے سے پوری کرائے۔ یہ گداگری ہے۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (53:38) ایسا نہ کرنا کہ جو اپنی ذمہ داری پوری کرنے کے قابل ہے اس کی ذمہ داری تم اٹھالو۔ یہ نظام بالکل غلط ہے۔ یہ گداگروں کا نظام بن جائے گا، ان لوگوں کا جو محنت سے جی چراتے ہیں۔

معاشرے کو گداگری سے محفوظ رکھنے کا طریق

جو ذمہ داری پوری کرنے کے قابل ہے، وہ اپنی ذمہ داری آپ پوری کرے۔ وقتی طور پہ، ہنگامی طور پر، اگر اس کو احتیاج آ گئی ہے، کوئی ایسا حادثہ ہو گیا ہے تو ہمیں یہ چیز ہے کہ اس کی مدد کر دیں لیکن یہ ایک پورے نظام کے طور پر ہے۔ یہ معاشرے میں نہیں ہونا چاہیے کہ ذمہ داری کسی کی ہو، پوری کوئی اور کرے۔ یہ بالکل نہ کرنا ورنہ یہ گداگروں کا معاشرہ ہو جائے گا، خواہ ان کا نام گداگر ہو یا فقیر ہو۔ یہ بڑے بڑے جو دوسروں سے اپنی ذمہ داریاں پوری کراتے ہیں، سب گداگر ہوتے ہیں۔ قرآن حمید نے دو اصول دیئے: ہر شخص اپنی ذمہ داری آپ پوری کرے گا، دوسرے پہ نہیں ڈالے گا اور معاوضہ محنت کا ہوگا، سرمائے کا نہیں ہوگا۔ اب آپ حیران ہوں گے کہ یہ آیات اس دور میں موجود تھیں جب قرآن حکیم نے تولیٰ کہا کہ تم نے گریز کی راہیں نکال لیں، یہاں سے پلٹ گئے۔ آیات تو قرآن حکیم میں موجود تھیں پھر کیا ہوا؟ ان آیتوں کے متعلق کیا کہا گیا؟ وہ تولیٰ کا لفظ بڑا عجیب ہے۔ اس کے معانی کیا ہیں کہ انکار نہیں کرنا، بلکہ گریز کی راہیں نکالنا۔

قرآن حکیم کے ایک لفظ تولیٰ کے مفہوم کو بدلنے کا نتیجہ

ان کے متعلق کہا یہ گیا اور آپ کوئی تفسیریں اٹھا کر، ترجمے دیکھیں۔ کہا ہے کہ یہ چیزیں قیامت کے متعلق ہیں جو کہی گئی ہیں، یہاں کی زندگی کے متعلق نہیں ہیں، قیامت میں کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، قیامت میں جو بدلہ ملے گا، وہ اپنے عمل کا بدلہ ملے گا، اپنی کوشش کا ملے گا، دوسرے کی کوشش کا نہیں۔ قیامت کے اندر یہ بات ہوگی۔ یہ یہاں کی بات نہیں ہے۔ اب اس کی یہ تفسیر کر دی،

مسئلہ حل ہوگیا کہ ان آیات کا تعلق یہاں سے اس دنیا سے ہے ہی نہیں' وہ تو وہاں کی بات ہے۔ قرآن حکیم تو فوراً چور کی ماں کو مارتا ہے' ساتھ ہی آیت رکھی ہوئی ہے کہ وَاَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی (53:40) اور نظام وہ ہوگا کہ ہر محنت کرنے والا اپنی محنت کا ماحصل اپنے سامنے دیکھ لے گا تو وہ تو قیامت کی بات ہے، ہی نہیں' وہ تو سامنے کہتا ہے کہ دیکھ لے گا۔ اب آیئے ذرا اس کی مزید تشریح کی طرف۔ وقت تھوڑا ہے ورنہ میں بات ذرا اور وضاحت سے کرتا' خیر' اگلی دو آیتیں یہ ہیں: وَاَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی o ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی (53:40-41) اپنی محنت کا ماصل سامنے دیکھ لے گا اور وہ دیکھے گا کہ اُسے محنت کا پورا پورا بدلہ مل گیا ہے۔ یہاں کا مسئلہ قیامت پہ اٹھا رکھیے' یہاں جو جی میں آئے کرتے رہیے۔ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ عدل کرو۔ کہا کہ یہ قیامت کے متعلق ہے' یہاں سب بے انصافیاں کرو' جو جی میں آئے کرو یہ قیامت کے متعلق ہے۔

ظہورِ نتائج کے وقت کو ہی قرآن حکیم نے قیامت کے لفظ سے پکارا ہے

ذرا یہ دیکھیے' میں عرض کردوں۔ ایک اصول یاد رکھیے۔ قیامت کے متعلق جسے روزِ جزا کہا جاتا ہے' جسے نتائج کے باہر آنے کا دن کہا جاتا ہے' اس میں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دن یا اس دور میں۔ وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19) اب ہر معاملہ خدا کے حکم کے مطابق طے ہوگا۔ جب خدا کے حکم کے مطابق معاملہ طے ہو تو اس کے بعد یہ کہا کہ وہاں یہ چیز ہوگی کہ کوئی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' کوئی محنت کا سرمایہ مانگ کر نہیں لے جائے گا' خدا کے حکم کے مطابق فیصلے ہوں گے۔ اب اس کے لیے اس نے ایک روزِ جزا یا قیامت کا بھی بتا دیا کہ خدا ہی کا حکم چلے گا' کسی اور کا نہیں' اور یہاں اس نے یہ کہا کہ صحیح نظام وہ ہے جس میں خدا ہی کا حکم چلے' کسی اور کا نہیں' تو دو چیزیں انہوں نے قیامت کے متعلق کہیں۔ وہ تو یہاں خود بخود ''آج'' ہو جائیں گی' شرط تو صرف یہ ہے کہ جس وقت' جس معاملے میں' جس نظام میں' صرف خدا کا حکم چلے' انسانوں کا نہ چلے' اس میں یہ ہوگا' وہ یہاں قائم کرو۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک نظامِ عدل کی ذمہ داریوں کا تعین

پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہاں وہ نظام قائم کرو۔ کہا ہے کہ اِلۡحُکۡمُ لِلّٰہِ (40:12) وہ نظام یہاں قائم کرو۔ جب وہ نظام قائم کرو گے تو یہ جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے کہ یہ قیامت میں ہوگا' وہ یہاں ہوگا۔ کیا ہوگا؟ مثلاً یہ ہوگا کہ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡـًٔا وَّ لَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ وَّ لَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ وَّ لَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ (2:48) جرم اور اس کے مواخذہ کے متعلق یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ عدل اسے کہا جائے گا کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم کے بدلے میں ماخوذ نہ ہو۔ پہلی چیز یہ ہے کہ کسی کی سفارش قبول نہ کی جائے' کچھ دے دلا کر مجرم کو نہ چھوڑا جائے' مجرم کی ناجائز مدد کرنے والا کوئی نہ ہو۔ قرآن حکیم نے نظامِ عدل کے متعلق یہ کہا۔ اب کہا جائے کہ

صاحب! یہ معاملہ قیامت کا ہے، وہاں یہ ہوگا، وہاں سب کچھ اس کے خلاف ہوگا۔ کیا کہا قرآن نے؟ قرآن حکیم نے کہا ہے کہ اگر حکومت خداوندی ہوگی، جب خدا کا قانون چلے گا تو اس میں یہ ہوگا۔ قیامت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہاں صرف خدا کا قانون چلے گا، انسان کا نہیں اور کہا کہ تم یہاں ایسا نظام قائم کرو کہ جہاں خدا کا قانون چلے، انسان کا نہیں، تو جب بھی خدا کا قانون چلے گا، وہ اس زندگی میں ہو، یا بعد کی زندگی میں ہو، وہی نتائج ہوں گے جو قرآن حکیم نے بتا دیئے ہیں کہ اس نظام میں کوئی مجرم جرم کرنے کے بعد چھوٹ نہیں جائے گا، کوئی کسی کو چھڑا کر نہیں لے جائے گا، رشوت دے کر نہیں چھوٹ سکے گا، سفارش سے نہیں چھوٹ سکے گا، کسی کے اثر کے ماتحت نہیں چھوٹ سکے گا، کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکے گا۔ یہ کب ہوگا؟ جب بھی خدا کے حکم کے مطابق نظامِ عدل قائم ہوگا۔ اب یہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ قیامت میں ہوگا، یہاں تو پھر یہ باطل کا ہی نظام رہے گا۔ یہ سارا سلسلہ انبیائے کرام کا اور رشد و ہدایت کا، یہ سارے کا سارا ہی باطل ہوگیا۔ یہاں تو اس نے کسی کام ہی نہیں آنا، یہ تو معاملے ہی سارے قیامت کے ہیں اور قیامت میں اللہ میاں سارا نظام خود قائم کرے گا، ہم نے تو کرنا ہی نہیں، قصہ ختم ہوگیا۔ اسلام وسلام کی باتیں افسانہ ہوگئیں۔ معاذ اللہ۔ اس اصول کو یاد رکھیے کہ قیامت کے معنی ہیں کہ اس دور میں وَالۡاَمۡرُ یَوۡمَئِذٍ لِّلّٰہِ (82:19) وہاں حکم، فیصلے، خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے اور کہا کہ تم یہاں یہ نظام قائم کرو جس میں حکم خدا کے قانون کے مطابق ہو، تو وہی نقشہ یہاں ہوگا جو ہم نے کہا ہے کہ قیامت کے دن عمل تلیں گے، کسی کی سفارش نہیں چلے گی، کفارہ نہیں ادا ہو سکے گا۔ یہاں یہ نظام قائم کرو گے تو یہاں بھی یہ صورت ہو جائے گی تو اس کو پہلے ذہن میں رکھیے کہ یہ قیامت پہ اٹھا رکھنے کی بات نہیں ہے۔

فرعون کی فرعونیت کو ختم کرنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کو دی گئی ذمہ داری کا تذکرہ

اب لیجیے اس مَا سَعٰی (53:39) کی بات۔ حضرتِ موسیٰؑ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ طور کی وادیوں پہ جاؤ۔ پہلے پہل انہیں منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ وہ ہے لمبا چوڑا کہ موسیٰؑ! ہم نے تمہیں اس سارے دوران میں ایک خاص مقصد کے لیے تیار کیا کہ ہمارا ایک بہت بڑا کام تھا، جیسے کہا جاتا ہے کہ وہ رکا ہوا تھا، پھر ہم تمہیں تیار کرتے رہے، اب تم بہت سی بھٹیوں میں گزر کر، ہمارے پیمانے پہ پورے اترے۔ اب وہ جو ہمارا کام تھا، وہ ہم تمہارے ذمہ لگا رہے ہیں کہ جا کر پورا کرو۔ اندازہ لگائیے کہ کیا چیزیں قرآن حمید کس انداز سے کہہ رہا ہے کہ اس کا ایک کام تھا۔ کیا کام تھا؟ سنیے! یہ ہو کیا رہا ہے؟ کہ جاؤ فرعون کی طرف۔

فرعون کے خلاف انقلاب برپا کرنے کا حقیقی مقصد

ہمارے پروگرام کے مطابق، اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخۡفِيۡهَا (20:15) اس سے پہلے یہ انقلاب اندر ہی اندر زیرِ زمین ظاہر بیں نگاہوں سے پوشیدہ چلا آ رہا تھا۔ یہ جو محکوم قوم تھی، جن کو کچل دیا گیا تھا، محتاج بنا دیا گیا تھا، ان کے اوپر ظلم کیے

گئے تھے'ان کے دلوں میں یہ بغاوت کا بیج پرورش پا رہا تھا۔اب وقت آ گیا ہے' ہم اس کو نمودار کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا فرعون کی طرف جاؤ' انقلاب برپا کرو۔آگے بتایا کہ کا ہے کے لیے؟ اور وہ کیا کر رہا تھا جس کے بعد یہ انقلاب برپا کرنے کی ضرورت پیش آئی ؟ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ لِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰی (20:15). یہاں وہ لفظ کہا ہے تا کہ ''ہر شخص کو اس کی محنت کا معاوضہ صحیح مل جائے''۔یہ تھا جی! وہ جو انقلاب برپا ہونا تھا۔اب یہ قیامت کی بات تو نہیں ہو رہی' حضرتِ موسیٰؑ کو تو فرعون کی طرف بھیجا جا رہا ہے کہ جاؤ۔ وہاں کی بات تھی جس کے خلاف بھیجا گیا؟ جسے الٹنے کے لیے بھیجا گیا کہ اس نظام میں ہر شخص کو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ نہیں مل رہا' ہم ایک انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں' تم جاؤ' اسے برپا کرو' تا کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا ماحصل صحیح صحیح مل جائے' تو وہ تو یہاں ملنے کی بات ہے' عزیزانِ من! اسی سورۃ میں آگے ہے کہ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّ لَا هَضْمًا (20:112) ایمان اور عملِ صالح کے مطابق نظام قائم کرو' جس میں کسی شخص پہ ظلم نہ ہو' کوئی کسی کی محنت کو Exploit نہ کرے۔ بات صاف ہو گئی صاحب! تو یہ تو اب یہاں کے اشارے ہیں۔حضرتِ موسیٰؑ نے فرعون سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم جو جی میں آئے کرتے چلے جاؤ' یہاں کھلی چھٹی ہے' قیامت میں چلنا' وہاں دیکھنا' پھر دیکھی جائے گی' ساڈے محلے کسی دن ضرور آؤ گے' وہاں تو ظالم کی کلائی مروڑنے کے لیے آتے ہیں۔یہیں وہ نظام قائم ہوا تھا۔میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابھی مزید تشریح کا محتاج ہے۔

قرآن حکیم کا پیش کردہ انقلاب انسانیت کی موجودہ زندگی سے متعلق ہے جس کی تفصیل ملاحظہ ہو

وہ چیزیں تو میرے سامنے ہیں لیکن اب آج کا وقت ختم ہوا ہے اور اسی درس کے تسلسل میں ہم اگلا درس لیں گے اور بتائیں گے کہ قرآنِ کریم میں یہ سارے معاملے قیامت پر اٹھا رکھے تھے یا یہاں کی دنیا کے متعلق یہ کچھ کہا ہوا تھا کہ کوئی کسی کی محنت کو Exploit نہیں کرے گا' جسے استحصال کہتے ہیں کہ کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا' جس کو استیلاء کہتے ہیں کہ کسی کے اوپر جبر کرنا' کسی کے اوپر ظلم کرنا' کسی کی محنت کو ہضم کر جانا۔ یہاں تو لفظ ہی ''ہضم'' آیا ہے' یہ کچھ نہیں ہوگا۔کہا کہ یہ تھا ہمارا کام جو اب تک رکا ہوا تھا' جو ہم کرانا چاہتے تھے اس مقصد کے لیے تمہیں تیار کیا گیا ہے کہ جاؤ اور وہاں جا کر ایسا انقلاب برپا کرو کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ مل جائے۔ یہ ہے انقلابِ پیغمبری' جس کے لیے خدا اپنے نبیوں کو تیار کرتا تھا' لہٰذا یہ جو چیز ان احکامِ خداوندی کی تھی' یہ تخصیص' یہ تفسیر یا تائید ہے۔ یہ تحریف ہے کہ صاحب! ان کا تعلق قیامت سے ہے' یہاں نہیں ہے۔بس یہ آیتیں پڑھتے ہیں' یہاں تو ثواب کی خاطر پڑھ لیا' معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے اور اگر کسی کو سمجھانا مطلوب ہوا' تو پھر سیدھی سی بات ہے کہ سنو! قیامت میں کیا نقشہ ہوگا؟ کہ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا' ہر ایک کو اس کی اپنی محنت کا' اپنے عمل کا بدلہ ملے گا اور خدا نے کہا ہے کہ تم اپنے سامنے دیکھو گے کہ سارا جو کچھ ہے' نظر آ جائے گا' قیامت

کے دن سب کچھ نظر آ جائے گا۔ گھنٹوں ہمارے ہاں یہ وعظ ہوتا رہے گا' قیامت کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچتے رہیں گے کہ وہاں یہ ہوگا' وہاں یہ ہوگا۔ جن پہ یہاں ظلم و جور ہو رہا ہے' جن کی محنتیں سلب ہو رہی ہیں' وہ بھی مطمئن ہوں گے کہ بھئی! خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ یہاں تو کچھ نہیں ہو سکتا تو تھوڑے دنوں کے لیے انتظار کر لو' بس پھر آ گے جاؤ گے' تم دیکھو گے وہاں اگر اس کی محنت کا جو باقی لے گیا تھا' ہضم کر گیا تھا' وہ ہزار روپیہ تو قیامت میں دو ہزار روپیہ مل بھی گیا' تو کیا کرے گا۔ اوتھے پیسے کوئی نئیں ہونے (وہاں کوئی روپیہ پیسہ نہیں ہوگا)۔

عزیزانِ من! قرآن حکیم نے تو لی کہا ہے۔ اب سمجھ میں بات آئی کہ وہ کیا کہہ گیا ہے؟ یہ کہہ گیا ہے کہ پھر یہ قوم گریز کی راہیں نکالے گی اس قرآن کریم کی آیتوں پہ' جب اور کوئی بات سمجھ میں نہ آئے گی کہ کس طرح سے ہم اس کی تحریف کریں۔ اس نے کہہ دیا کہ یہ معاملہ قیامت تک کا ہے' یہاں کا نہیں ہے' یہاں ہر قسم کی دھاندلی' یہاں ہر قسم کا استحصال (Exploitation)' ظلم سب ہوتا رہے گا' دین کو یا قرآن کریم کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ ساری چیزیں خدا کا بھی جو اپنا علاقہ ہے' جس میں معاذ اللہ اس کی حکمت چلتی ہے' وہ مرنے کے بعد کی ہے' یہاں اس کا کچھ نہیں چل سکتا اور اس نے یہ کہا تھا کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم تو خود نہیں یہاں یہ کچھ کرتے لیکن ہم تمہیں یہ کہتے ہیں کہ جنہوں نے ہم پہ ایمان لانے کا دعویٰ کیا ہے کہ یہ نظام' جسے ہم کہتے ہیں قیامت میں ہم برپا کریں گے' یہاں نظام قائم کرو' کسی محنت کرنے والے کی محنت ضائع نہ جائے' کوئی دوسرا نہ لے جائے' کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے' یہاں یہ قائم کرو' ہمارے احکام کے مطابق نظام قائم ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور اس سے تم پہچان سکو گے کہ نظام یا مملکت اسلامی ہو گیا ہے یا نہیں ہو گیا۔

عزیزانِ من! سورۃ النجم کی آیت یوں کہیے کہ ہم چالیس تک آ گئے' آئندہ درس میں ہم اسی آیت سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

نواں باب: سورۃ النجم (آیت 40: مسلسل تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج نومبر 1982ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النجم کی آیت 40 سے ہی ہوگا: (53:40)۔

قرآن حکیم کی پیش کردہ سورہ النجم کی ہر آیت کی جامعیت ایجاز کے ساتھ قابل صد غور وفکر ہے

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ درس میں، میں نے عرض کیا تھا کہ قرآنِ کریم میں چار چار لفظوں کی دو آیتوں میں، اپنے معاشی اور سیاسی اور معاشرتی نظام کی بنیادیں اس ایجاز کے ساتھ رکھ دی ہیں کہ وہ قیامت کے لیے نوعِ انسانی کے غیر متبدل اصولوں کا کام دیتی ہیں۔ چار چار لفظوں کی یہی دو آیتیں ہے۔ قرآن حکیم کی جامعیت کا ثبوت وہ اصول ہے کہ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (53:39) معاوضہ محنت کا ہے سرمائے کا نہیں ہے۔ معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ جو محنت نہیں کرتا اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی محنت کو لے جائے اور دوسری چیز اس نے یہ کہی کہ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ (53:38) ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریاں خود اٹھائے گا، کوئی کسی دوسرے کی ذمہ داری نہیں اٹھائے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ کس جامعیت سے قرآن حکیم نے دو بنیادی اصول بیان کر دیئے ہیں۔ میں نے یہ عرض

کیا تھا کہ قرآنِ کریم صدرِاول کے بعد مسلمانوں کے پاس' امت کے پاس' محفوظ تھا۔ یہ آیتیں اس میں موجود تھیں۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں یہ سرمایہ دارانہ معاشی نظام آ گیا کہ جس میں محنت کرنے والے بیچارے کو تو روٹی تک نصیب نہیں ہوئی اور جو محنت نہیں کرتا اس کے کتوں کو وہ کچھ ملتا ہے جو اس غریب کے بیٹوں کو بھی نہیں ملتا۔ وہ سب ذمہ داریاں دوسروں کے سر پہ ڈالی جاتی تھیں صاحب! یعنی پورا نظام آپ کا' جتنا تھا' وہ ان اصولوں کے خلاف تھا۔

قرآن حکیم جیسی قندیل آسمانی کو صدیوں سے ہم نے قیامت پر اٹھا رکھا ہے' قیامت کا مروّجہ محدود مفہوم اسی سلسلہ کی ہی ایک کڑی ہے

میں نے عرض کیا ہے کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ قرآن حکیم کی آیتیں موجود تھیں' قرآن حکیم محفوظ تھا' اور قرآن حکیم تو مسلسل امت کے پاس چلا آ رہا ہے' ہر گھر میں موجود چلا آ رہا ہے' تو پھر یہ ہوا کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ہے کہ بس ایک ذرا سی تکنیک انہوں نے اختیار کی اور اس پہ سارا ہی یہ قرآن حکیم کا نظام الٹ کر رکھ دیا۔ کہا یہ کہ یہ جو قرآن حکیم نے کہا ہے' یہ قیامت کی بات ہے' یہاں ایسا نہیں ہوگا' یہ یہاں کی بات نہیں ہے' یہاں محنت کرنے والے کو کچھ نہیں ملے گا' جو کچھ محنت نہیں کرتا وہ اس کا سب کچھ استحصال سے' سلب ونہب سے' چھین کر لے جائے گا' یہاں ذمہ داری کسی کی ہوگی لاد دی جائے گی کسی اور کے اوپر' یہاں تو یہ نظام چلے گا اور یہ جو نظام قرآن حکیم میں کہا ہے' یہ درحقیقت قیامت کی بات ہے اور میں اس کا ایک حصہ تو پچھلی دفعہ ہی سامنے لے آیا تھا جو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ قیامت کی بات تو ہے۔ وہاں اس لیے ہے کہ وہاں صرف خدا کا قانون چلتا ہے لیکن اس نے یہ کہا ہے کہ تمہاری دنیا میں بھی جہاں خدا کے قانون کے مطابق معاشرہ اور نظام قائم ہوگا' وہاں بھی یہی کیفیت ہوگی۔ تو قیامت کی خصوصیت کیا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہاں تو یہ ہوگا' وہاں یہ کیسے ہوگا؟ کہا ہے کہ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَـئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) وہاں حکم صرف خدا کا چلے گا اور یہاں اس نے یہ کہہ دیا کہ اپنے معاشرے میں صرف خدا کا حکم چلاؤ تو جب معاشرے میں خدا کا حکم چلے گا تو وہی خصوصیت جو قیامت کی بتائی گئی ہے' جو کچھ قیامت کے متعلق کہا ہے کہ وہاں اس طرح سے عدل ہوگا' اس طرح سے محنت کا ماحصل ملے گا' یہ چیزیں وہاں ہونگی' تو اس نظام میں وہی کچھ ملنا شروع ہو جائے گا۔ تو دونوں قیامت اور یہاں کا یہ نظام یکساں ہو گئے لیکن ان کی تاویل یہ تھی کہ نہیں' یہاں تو جس طرح سے ہوگا وہ ہوتا رہے گا اور یہ قرآن حکیم کی آیات قیامت کے لیے ہیں تو میں ایک تو پچھلی دفعہ کچھ آیات آپ کے سامنے لایا تھا' جہاں یہ تھا کہ یہیں ہوگا' یہ اسی کا نام انقلاب ہے' جو قرآن حکیم وہ لانا چاہتا ہے کہ اس دنیا میں ایسا نظام قائم ہو جائے جیسا تم سمجھتے ہو کہ خدا کا نظام قیامت میں قائم ہوگا۔ یہی چیز تھی جو اقبالؒ نے کہا کہ

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی ❶

کہا ہے کہ قیامت کے میزان اور عدل اور نامہ اعمال کی تو بہت لمبی چوڑی باتیں سننے کی ہیں

بحیرتم نہ بینی قیامتِ موجود ❷

(اقبالؒ: زبور عجم)

اور یہاں کی قیامت تجھے نظر نہیں آتی' تو وہاں کی قیامت کی باتیں کرتا ہے یہاں کا جہنم نہیں نظر آتا ان کو' وہاں کی بات ہے۔

لفظ قیامت انسانی معاشرے کے نظم وضبط کے نتائج کی عکاسی کا ہی دوسرا نام ہے

اسی ضمن میں' میں نے عرض کیا تھا کہ یہ ذرا مزید تشریح طلب ہے اس لیے کچھ دو چار حوالے اس درس میں بھی میں پہلے اسی کے دونگا کہ یہ اسی دنیا میں کچھ ہوگا بشرطیکہ خدا کا جو نظام ہے' اس کا جو حکم ہے' وہ اس دنیا کے اندر کارفرما ہو۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا (6:164)۔ یہ ہے وہ نظام جو خدا کے احکام کے مطابق جب قائم ہو تو اس کے اندر یہ ہوگا اور یہ ہونا چاہیے کہ ''ہر شخص اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے' اچھے ہیں تو بھی اس کا اس کو اچھا نتیجہ ملنا چاہیے' غلط ہیں اسی کو یہ نتیجہ ملنا چاہیے۔ یہ نہیں ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی''۔ اس نظام میں یہ بات نہیں ہے۔ یہ نظام ہونا چاہیے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے وہ سلسلہ رشد و ہدایت ہے جس کے لیے انبیائے کرام تشریف لائے' ان کی کتابیں ہیں' یہ نظام قائم کیا ہے۔ یہ سب کچھ خدا نے اس نظام کو قائم کرنے کے لیے دیا تھا۔ اگر قیامت میں یہ کچھ ہوتا تو اس کو ضرورت ہی نہیں تھی یہ کچھ یہاں بھیجنے کی۔ قیامت میں تو سب وہاں جائیں گے وہ اپنا نامۂ اعمال ہوگا۔ یہی وہ آیت ہے جو میں نے ابھی عرض کی ہے۔ پہلے تو یہ آ گیا کہ وَ لَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا(6:164)۔ جو بھی' جس قسم کا کام کرے گا' اسی قسم کا نتیجہ اسے یہاں بھگتنا ہوگا۔ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (6:164)۔ یہ وہی آیت یہاں آ گئی کہ ''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا''۔ ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داریاں آپ پوری کرے گا اور اس کے بعد اس دنیا کے بعد کی صورت ہے۔ کہا ہے کہ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ(6:164) پھر جو تم جن باتوں میں اختلاف کرتے ہو' خدا کی طرف رجوع کیا جائے گا' اس کے احکام نافذ کئے جائیں گے تو وہ اس کے ساتھ ہی سب چیزیں سامنے آ جائیں گی۔ وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ

---

❶ تُو نے (قیامت کے روز کے) نامہ اعمال اور ان کو تولنے کے ترازو کی بات تو بڑی لمبی کی ہے۔

❷ میں حیرت میں ہوں کہ تُو اس قیامت کو نہیں دیکھ رہا جو تیرے سامنے موجود ہے

اٰتٰکُمْ (6:166) یہ یہاں ہی ہے کہ اس دنیا میں بھی تمہیں تمکن عطا کیا جائے گا' اس دنیا میں حکومت بھی عطا کی جائے گی تا کہ یہ دیکھا جائے کہ تم کیا کرتے ہو۔ اس میں اختیارات دیئے جائیں گے۔ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیۡعُ الۡعِقَابِ (6:165) وہ خدا کا قانونِ مکافات پیچھا کرنے میں بڑی جلدی کرتا ہے' دیر نہیں لگاتا۔ انسان کے ہر عمل کا وہ نتیجہ تو ساتھ کے ساتھ مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے' یہ بات الگ ہے کہ اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے وہ نتیجہ محسوس شکل میں کب ظاہر ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کے لیے تو وقت لگتا ہے۔ وہ مہلت کا وقفہ ہوتا ہے کہ اس میں بھی اگر یہ اس چیز سے باز آ جائے اور اپنی اصلاح کر لے تو پھر وَاِنَّہٗ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (6:165)۔ وہ حفاظت کا سامان بھی دیدیتا ہے لیکن وہ تو ہر عمل کا ساتھ کے ساتھ انسان کے اوپر نتیجہ مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

کوئی قوم اس وقت تک زوال پذیر نہیں ہوتی تاوقتیکہ اسے حقائق سے آگاہ نہ کر دیا جائے

میں نے عرض کیا ہے کہ ایک دوسرے مقام پہ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ مَنِ اہۡتَدٰی فَاِنَّمَا یَہۡتَدِیۡ لِنَفۡسِہٖ (17:15) جو صحیح راستہ پہ چلتا ہے اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات کو پہنچتا ہے۔ تو یہ تو یہیں چلنے کی بات ہے۔ ہدایت تو اس دنیا کے لیے ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ مَنۡ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیۡہَا (17:15)۔ اور جو غلط راستہ اختیار کرتا ہے' اس کا خمیازہ بھی اسی کو خود بھگتنا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ صحیح راستے پہ چلے تو وہ غلط منزل پہ پہنچ جائے اور غلط راستے پہ چلے تو صحیح منزل پہ پہنچ جائے۔ جس قسم کا راستہ اختیار کیا ہے اسی قسم کی اس کی منزل ہے اور اسی پہ وہ جا پہنچے گا اور اس کے بعد یہ ہے کہ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (17:15) وہی آیت اب یہاں آ گئی کہ وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی (17:15)۔ اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہیں یہ کچھ ہوگا۔ کہا ہے کہ وَ مَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا (17:15) یہ قوموں پر جو تباہی آتی ہے' پہلے ہم اس قوم میں رسول بھیجتے ہیں' جو انہیں آگاہ کرتا ہے کہ یہ غلط راستہ ہے' صحیح راستہ یہ ہے' اس پہ چلو گے تو یہ ہوگا' اس پہ گامزن ہو گے تو یہ ہوگا' یہ اس قوم کو وارننگ دیدی جاتی ہے اور اس کے بعد پھر دیکھا جاتا ہے کہ وہ خود کونسا راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کے مطابق اس کا نتیجہ بھگتتی ہے اور قرآنِ کریم نے تو تمام اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ انہوں نے یہ کیا تو یوں تباہی آئی۔ اگر وہ تباہیاں قیامت میں ہی آنی ہیں تو سنیے! وہ تو یہاں ان اقوام کی مثالیں دیتا ہے جن پر ان کے غلط نظام کی وجہ سے تباہیاں آئیں۔ وہ انہیں بتاتا ہے کہ تم ان کی بستیوں کے کھنڈرات پر سے دن رات گزرتے ہو' دیکھو تو سہی' ان قوموں کے متعلق ان اینٹوں پر کیا لکھا ہے تو یہ تو یہاں کی باتیں ہیں۔

قرآن حکیم کی طرف سے پیش کردہ نظامِ حیات انسان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی سے ہے

عزیزانِ من! متعدد آیات ہیں جن میں بتصریح یہ کہا ہے کہ اسی دنیا کے اندر یہ جو نتائج ہیں وہ سامنے آجاتے ہیں۔ کہا ہے کہ مَنۡ

عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (16:97) جو بھی مرد ہو، عورت ہو، ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ ہو، اگر وہ زندگی بسر کرے، تو ہم اسی دنیا میں اس کی نہایت خوشگوار زندگی بنا دیں گے۔ یہ حیات طیبہ یہیں بن رہی ہے۔ آگے کہا ہے کہ وَ لَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ (16:97) اور ان کے اعمال کے خوشگوار نتائج ان کو یہاں مل جائیں گے۔ تو یہ کچھ یہاں سے شروع ہو جاتا ہے، اعمال کے نتائج یہاں سے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی، آگے بھی چلتی ہے تو اس لیے وہ نتائج بھی ساتھ آگے چلتے ہیں۔ اسی لیے اس زندگی میں بھی اور آنے والی زندگی، دونوں کے متعلق، بھی قرآن حکیم نے کہا کہ یہ نتائج ساتھ ساتھ چلیں گے۔ سورۃ البقرۃ میں کہا ہے کہ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّ فِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ (2:201) صحیح زندگی بسر کرنے والے وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! اس دنیا کی ہماری زندگی کو بھی خوشگوار بنا دے اور ہماری اگلی زندگی کو بھی خوشگوار بنا دے۔ پہلے اس زندگی کو کہا ہے کہ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً (2:201)۔ اور آگے کہا کہ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا (2:202) ان کو ان کے اعمال کے مطابق نتائج ملیں گے۔

کامیابیوں اور ناکامیوں کو پرکھنے کا عملی طریق: تم اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کرنے دو

عزیزانِ من! آگے یہ ہے کہ وَ اللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ (2:202)۔ ہم تو بہت جلد حساب کر دیتے ہیں، اس زندگی میں حسنات ہیں، آخرت کی زندگی میں بھی حسنات ہیں اور وہ پھر جو چیلنج نبی اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنے مخالفین کو دلایا گیا کہ لمبی چوڑی بحثوں کی ضرورت نہیں ہے، میں نے جو کچھ تم سے کہنا تھا کہہ دیا، جو سمجھانا تھا سمجھا دیا، اور اس کے بعد ہے کہ قُلۡ يٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰى مَكَانَتِكُمۡ اِنِّىۡ عَامِلٌ (6:135) اب یہ ہے کہ تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو جو تم کہتے ہو کہ یہ ہے صحیح پروگرام، میں اس میں دخل نہیں دوں گا، مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو، اس میں تم دخل نہ دینا، تو پھر اس کے بعد کہا کہ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ تَكُوۡنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ (6:135) جلدی معلوم ہو جائے گا کہ کس کا دعویٰ سچا تھا اور کس کا دعویٰ جھوٹا تھا۔ یہ تو اولیں نتائج پیدا کرنے والی بات ہے۔ تم کام کرو اپنے پروگرام کے مطابق، اپنا نظام جیسا تم کہتے ہو کہ یہی صحیح نظام ہے تم قائم کرو، میں کچھ نہیں کہتا، مجھے میرا نظام قائم کرنے دو اور اس کے بعد نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کون سچا تھا اور کون جھوٹا تھا۔ تو وہ تو یہاں کی ساری باتیں ہو رہی ہیں۔ اور یہی متعدد مقامات پر آیا ہے، یہ (11:93) اور (39:39) آیات میں کہا گیا ہے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، مجھے اپنی جگہ کام کرنے دو، تو فوراً اس کے بعد پتہ چل جائے گا کہ کس کا دعویٰ سچا ہے اور کس کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ یہاں ہی وہ ان کو بھی پروگرام کہتا ہے، اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو اور خود رسولؐ کہتا ہے کہ مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو، وہ اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنو، میں بھی نہیں بنتا، تم بھی نہ بنو، نظر

آ جائے گا اور وہ نظر آ گیا۔

جنت ارضی کی تشکیل کی خاطر صدِ اوّل کی تاریخ ایک شہادت طور پر پیش کی جاسکتی ہے

وہ جو صدرِ اول کی تاریخ کو ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ قرآن کریم کے نظام کے مطابق جب انہوں نے اپنی زندگی بسر کی اور اس پر نظام قائم کیا' اس کے نتائج کیا برآمد ہوئے اور وہ جو مخالفین تھے' انہوں نے جب اپنا پروگرام قائم کیا' اپنا نظام قائم کیا' تو اس کے نتائج کس طرح تباہ کن تھے۔ یہ تو تاریخ ہے' اس کو ساری دنیا جانتی ہے۔ یہ یہاں ہوا' اسی دنیا میں ہوا' اسی زندگی میں ہوا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ ایک فریب ہے جو دیا گیا' یا کھایا گیا کہ یہاں یہ کچھ نہیں ہوگا' یہ جو سارا کچھ نظام ہے یہ اگلی زندگی کے اندر ہے' وہاں یہ کچھ ہوگا لیکن یہ نظام تو اسی زندگی کے متعلق ہے۔

عزیزانِ من! سوچ رکھیے کہ اگر یہ دو بنیادی اصول دنیا میں نظام کے ہوں کہ کوئی کسی دوسرے کی محنت کا استحصال' سلب ونہب (Exploition) نہ کر سکے' جو محنت نہیں کرتا اسے کچھ نہ مل سکے' محنت والے کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ ملے گا' معاوضہ سرمائے کا نہیں' محنت کا ہو' اور دوسری طرف کوئی اپنی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر نہ لادسکے' اپنی اپنی ذمہ داری خود پوری کرے' یہ دو ہی اصول اگر دنیا کے اندر قائم ہو جائیں' کوئی نظام جو ان دو اصولوں کو لے کر قائم ہو جائے' آپ سوچیے کہ یہ زندگی جنت کی بن جائے گی یا نہیں اور یہی تو تھا جو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مجھے میرے پروگرام کے مطابق کام کرنے دو' پھر دیکھو نتائج کیا نکلتے ہیں اور لمبی چوڑی بات ہی نہیں ہے' اگلی ہی آیت میں تو بات صاف ہو بھی گئی۔ کہا کہ وَاَنَّ سَعۡیَهٗ سَوۡفَ یُرٰی (53:40) ہر محنت کرنے والا اپنے محنت کا نتیجہ فوراً دیکھ لے گا' جلدی دیکھ لے گا' اس کے سامنے آجائے گا۔ اگر یہ نظام قائم ہو گیا تو کہا کہ ثُمَّ یُجۡزٰىهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی (53:41) ہر محنت کش کو اس کی محنت کا بدلہ پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ کوئی اس میں سے کچھ ہضم نہیں کر سکے گا۔ یہ اگلی آیتیں خود بتاتی چلی جا رہی ہیں۔ انہوں نے ان کے متعلق کہا کہ یہ کچھ قیامت میں ایسا ہوگا' یہاں سب Exploitation ہوتی جائے گی' سلب ونہب ہوتا چلا جائے گا۔ عزیزانِ من! اب سوال یہ ہے کہ اس نظام کا یہ کچھ کیسے ہوگا' کب ہوگا؟ کہا کہ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَهٰی (53:42)۔ جب انجام کار تمہارا نظام خدا کے قانون کے مطابق ہوگا۔

مذکورہ آیاتِ قرآنی کے متعلق دنیائے تصوف کے خود ساختہ تصورات کے تحت لفظ وصال وعروس کا مفہوم

اس آیت پہ بھی ہمارے ہاں یہاں یہ تصوف والے آ گئے۔ انہوں نے یہ بتایا کہ یہ سارا' یہ خدا کی ہدایت' رشد وہدایت' یہ ساری قرآن کریم کی تعلیم' انسانی زندگی کا مقصود ومنتہیٰ یہ ہے کہ انسان کی ذات خدا کی ذات میں جا کر مل جائے گی۔ یہ قصہ ختم ہوا۔ یہ جو اس کا

الگ وجود ہے' الگ تشخص ہے' یہ ساری تباہیاں' ساری قیامتیں' اس لیے اس پہ برپا ہو رہی ہیں۔ منتہیٰ یہ ہوگا کہ انسان کی یہ ذات' خدا کی ذات کے اندر جا کر مل جائے گی۔

آپ کو کئی دفعہ میں نے یہ کہا ہے' الفاظ اس طرح سے رائج ہو جاتے ہیں کہ ہم کبھی سوچتے نہیں کہ ان کے معنی کیا ہیں' یہ جتنے بڑے بڑے بزرگ فوت ہوتے ہیں ان کے متعلق یہ نہیں کہتے کہ وہ وفات پا گئے۔ کہتے ہیں کہ حضور کا وصال ہو گیا۔ وصال کے کیا معنی ہوتے ہیں' وصل کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ یہ معنی ہوتے ہیں مل جانا دوسروں کے ساتھ۔ یہ وہی تصوف ہے یہ یکسر قرآن کریم کے خلاف ہے کہ انسان کی ذات ذاتِ خداوندی میں جا کر مل جاتی ہے۔ چلیے' قصہ ختم' اعمال' اس کا نتیجہ' یہ سارا قصہ ہی ختم۔ وہ اس میں جا کر ذات خداوندی میں مل جاتی ہے اور یہ وصال ہوا تو وصال تو آپ سمجھتے ہیں کہ کن معنی میں لیا جاتا ہے۔ عزیزانِ من! آپ کو پتہ ہے یہ عرس کیا ہوتا ہے' دعوت عروسی کے کارڈ آپ نے بھی دیکھیں ہونگے۔ وہ عروسی کے کارڈ آتے ہیں تو معنی ہم جانتے ہیں کہ شادی ہے۔ وہ عرس کا لفظ اس معنی میں نہیں لیتے' وہ کچھ اور ہی معنی لیتے ہیں۔ وہ تو وصال ❶ ہی وہی ہے ❷۔ عیسائیت کے اندر یہ Nuns (راہبات) ہوتی ہیں' شادی نہیں کرتیں مسیح (Christ) کی دلہنیں ہیں اور انہیں عروسِ مسیح (Spouses of Christ) یہاں تو وہ نہیں ہے' وہ سلسلہ ہمارے ہاں یو پی کے اندر تھے یہ ہیں جنہیں آسمانی دلہنیں (Heavenby Spouses) کہتے ہیں۔ وہ دلہنیں بنے ہوئے ہوتے تھے۔ وہی زعفرانی رنگ کے انہوں نے کپڑے پہنے ہوئے ہوتے تھے اور وہ اپنے آپ کو خدا کی دلہنیں بناتے تھے۔ یہ عرس کے معنی ہی شادی کے ہیں اور اس کے ساتھ وصال ہوتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک امت مسلمہ کا فریضہ نیز وانا اللہ وانا علیہ راجعون کا قرآنی لغوی مفہوم

عزیزانِ من! پھر یہ قوم کس تماشے میں الجھ گئی ہے۔ یہ امت خرافات میں کھو گئی ورنہ بات تو یہ تھی کہ نظامِ خداوندی کے معنی یہ ہیں کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (22:41)۔ یہ قوم جو قرآن حکیم کو لے کر اٹھی ہے جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا' ان کو اقتدار ملے گا' ان کی مملکت اور حکومت قائم ہوگی' تو پھر یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے' جس چیز کو قرآن حکیم نے صحیح کہا ہے اس کو نافذ کریں گے' جسے اس نے غلط کہا ہے اس سے روکیں گے

---

❶ صوفیاء کی وفات کو وصال اور اس کی تقریب کو عرس کہا جاتا ہے۔ لال شہباز قلندر کے ملنگ' ناک میں نتھ اور گلے میں گانی پہنتے اور کہتے ہیں کہ خدا ہمارا خاندان ہے اور ہم اس کی بیویاں۔ وارث شاہی دلنھوں (یعنی ملنگوں) کا بھی یہ انداز اور سروپا ہوتا ہے۔

❷ وہ اسے ''آسمانی دلہن'' (Heavenly Spouse) بھی کہہ کر پکارتے تھے۔

اور جس کے لیے میں نے یہ آیت لی ہے کہ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الۡاُمُوۡرِ (22:41) یوں تمام معاملات' آخرالامر' خدا کے حکم کے مطابق طے ہونگے۔ یہ ہے جو منتہیٰ ہے۔ آخرالامر ہر چیز طے کریں گے' ان کے ہاں مشاورت ہوگی' ان کے ہاں Discussion ہونگے۔ یہ سارا کچھ کس طرح طے ہوگا؟ وہ یوں ہوگا کہ ہر معاملہ خدا کے حکم کے مطابق ہوگا اور وہ جو آپ کو معلوم ہے کہ بار بار آتا ہے کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156)۔ تو اب تو وہ آیت کا ٹکڑا ہی اس لیے ہوگیا کہ کسی کی موت کی خبر آئی اور آپ نے کہا کہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156)۔ وہ موت کے سوا کہیں اور کسی جگہ بولا ہی نہیں جاتا۔ معاذ اللہ۔ اور وہ ایسی عظیم آیت ہے' اس کی تشریح کا تو پھر یہ موقع نہیں ہے وہ آ چکی ہوئی ہیں۔

عزیزانِ من! آپ دیکھیے وہ مقامات قرآنِ کریم میں کس قدر زندگی بخش ہیں جہاں وہ یہ الفاظ لے کر آیا ہے اور ہم نے کس طرح انہیں مرگ آفریں بنا دیا۔ میں یونہی ان کا ترجمہ کرتا ہوا چلا جاؤنگا۔ کہا ہے کہ وَ لَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَ الۡجُوۡعِ وَ نَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَنۡفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ (2:155) یہ جو تم اِس نظام کو لے کر اٹھے ہو' اس انقلاب آفریں دعوت کو لے کر اٹھے ہو' یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے' بڑی سخت مخالفت ہوگی۔ انسان نہ اپنا اقتدار چھوڑتا ہے' نہ سرمایہ پرست اپنی دولت چھوڑنا چاہتا ہے' نہ مذہبی پیشوائیت اپنی مقدس تعظیم کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ یہ سب مخالفت کریں گے' سخت مخالفت ہوگی' میدان جنگ تک جانا پڑے گا' جانیں دینی پڑیں گی' مال کا نقصان ہوگا' جان کا نقصان ہوگا لیکن وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌ (2:155-156) اے رسول! بشارت دیدے ان کو کہ ایسے مقامات میں' جہاں انسانوں کے قدم لغزش میں آجائیں' لڑکھڑا جائیں' ایسے مقام پہ بھی وہ نہایت استقامت سے' جم کر' کھڑے رہیں گے اور اس کے بعد وہ مخالفین سے یہ کہیں گے کہ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) جو کچھ تمہارا جی چاہے کرلو' ہم نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے خدا کے نظام کے لیے' ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھے گا' ہم بھاگ کر پیچھے نہیں جائیں گے۔ کیا بات ہے اس اعلان کی! ان پہ اس قدر صبر آزما مراحل آئیں گے کہ جانیں تک دینی پڑیں گی' وہ مقابلے میں کھڑے ہونگے۔ کہا کہ ان کو بشارت دیدو' اے رسول! کہ ایسے جانکاہ مراحل میں بھی ان کے پاؤں میں ذرا لغزش نہیں آئے گی اور وہ انہیں للکار کر کہہ دیں گے کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ہم نے تو اس کے ہاتھ میں اپنا سب کچھ بیچ دیا ہے' ہمارا تو اپنا کچھ ہے ہی نہیں' ہم تو اس کے ہو چکے ہیں' اس لیے جتنی مصیبتیں آتی ہیں' تم جتنی مخالفتیں کرتے ہو' وہ آنے دیجیے۔ اِنَّاۤ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) ہم اس کی طرف چلے جا رہے ہیں' ہمارا ہر قدم اس کی طرف ہے' یہ دوسری طرف نہیں جائے گا' یہ وہاں آیا ہوا ہے اور اب یہاں' جونہی کسی نے انا للہ کہا' انہوں نے کہا کہ ''او خیر ہے؟ نہیں جی' خیر تے ہوندی نئیں جدوں انا للہ کیا جاوے تے''۔ (کیا خیر و عافیت ہے؟ جی نہیں' جب انا للہ کہا جائے تو خیر و عافیت تو ہوتی ہی نہیں ہے)

عزیزانِ من! یہ اِنَّـا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (2:156)۔ ہم کیا جانیں، ہم تو قبرستانوں کے اندر لیٹے ہوئے ہیں اور ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ یہ حیات بخش پروگرام کیا تھا۔ کہا یہ ہے کہ ہم اس حیات بخش پروگرام کے ہو گئے، ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا، ہمارا ہر قدم اس کی طرف اٹھ کر جائے گا، تم روک نہیں سکتے ہمیں۔ کیا بات تھی ان مجاہدین کی۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَھٰی (53:42) ہماری انتہا، ہماری منزل، ہمارا نصب العین، مقصود، خدا کا نظام ہے، اس کی ربوبیت ہے، ہمارا نظام، ہمارا منتہائے زندگی یہ ہے۔ منتہائے زندگی تو ہم کہتے ہیں لیکن ان مقامات پہ جب ہم آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ نہیں، وہاں ہماری ذات اس کی ذات میں مل جائے گی۔ چلیے! قصہ ختم ہو جائے گا یعنی یہ سارا جو کچھ چکر اتنا لمبا چوڑا دیا ہے اس لیے ہے کہ اس خدا کی ذات سے الگ کیا، انسان کی ذات الگ ہوئی۔ یہ سارا ہندوؤں کا ویدانت ہے کہ وہاں سے آ کر مادے کی دلدل میں پھنس گئے۔ اب یہاں سے نکلنے کے لیے اتنی جانکاہ مشقیں کرنا پڑیں گی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بتیس کروڑ مرتبہ اِن مختلف چکروں میں سے بھٹکتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ یہاں اتنی مشقتیں اٹھانا پڑیں گی۔ پروگرام ملاحظہ فرماؤ خدا کا۔

قوانین خداوندی پر ایمان لانے والوں کے لیے امروز و فردا کی زندگی کی نوعیت

عزیزانِ من! اب یہ جو حضرات ہیں، وہ مقربین ہوتے ہیں صاحب! ان کا عقل و شعور والوں سے بھی اونچا درجہ ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَھٰی (53:42) آہاہا! کیا خوبصورت ہے اگلی آیت! کہا ہے کہ وَاَنَّہٗ ھُوَ اَضۡحَکَ وَاَبۡکٰی (53:43) یاد رکھو! وہ زندگی بھی ہے جس میں انسان مسرتوں کے جھولے جھلاتا ہوا، خوشیوں کے راگ گاتا ہوا، ہنستا کھیلتا ہوا، آگے جاتا ہے اور وہ بھی ہے جس میں انسان خود اپنی حالت پہ خون کے آنسو بہاتا ہوا، قبرستان میں جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ہنسانا بھی اس کے قانون کے مطابق ہے، یہ رلانا بھی اس کے قانون کے مطابق ہے۔ اپنے لیے خود سوچ لو کہ کونسی زندگی چاہتے ہو۔ کیا الفاظ ہیں! کہ یہ حقیقی ہنسی بھی، جو دل کی گہرائیوں سے، مسرتوں کے ساتھ ابھرے گی، وہ بھی اس کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہے اور وہ بھی ہے جو انسان خون کے آنسو روتا ہے۔ وہ اسی کے قانون کی خلاف ورزی کرنے سے کچھ ہوتا ہے، ایسے ہی نہیں ہوتا۔

قوموں کی موت و حیات کا معاملہ ہو یا عروج و زوال کا، یہ ہمیشہ قوانین خداوندی سے مشروط ہے اور بچے کی پیدائش کا بھی

عزیزانِ من! یہاں قرآنِ کریم زندگی کے دونوں گوشے، ہنسی کے ساتھ رونا، لے آیا ہے اور آگے ایک اور قدم بڑھایا ہے کہ نہیں، اتنے سے تم نہیں سمجھے ہو: وَاَنَّہٗ ھُوَ اَمَاتَ وَاَحۡیَا (53:44) زندگی بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے، موت بھی اس کے قانون کے

مطابق آتی ہے۔ یہ طبعی زندگی اور طبعی موت ہی نہیں بلکہ یہ قوموں کی زندگی اور قوموں کی موت بھی اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ قرآن حمید نے قوموں کے عروج وزوال' موت وحیات' کے لیے یہ سب قوانین دیدیئے ہوئے ہیں۔انہیں موت وحیات ہی کہا ہے اور ہمارے ہاں تو مردہ قومیں' زندہ قومیں الفاظ استعمال ہوتے ہیں حالانکہ طبعی طور پر' ڈاکٹری نکتہ نگاہ سے' تو دونوں ہی زندہ ہوتی ہیں۔ جب تک سانس آتا ہے وہ زندہ ہوتا ہے۔تو یہ زندہ قومیں اور مردہ قومیں کیا ہوتی ہیں؟ یہ قرآن مجید کی اصطلاح ہے۔کہا کہ دیکھیے! یہاں تک کیسے بات آئی؟ زندگی کی ابتدا ہوئی۔ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (53:45) زندگی کی ابتدا ہوئی ایک جرثومہ سے' پھر وہ اس کے قانونِ حیات سے یا ارتقا کے مطابق' دو حصوں کے اندر تبدیل ہوا' پھٹ گیا۔مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى (53:46)۔وہ پھر ہیئت انسانی' بشریت پیکر کے اندر آیا تو پھر اس طرح سے جیسے ہمارے ہاں یہ بچے کی پیدائش اور حمل ہوتا ہے' ہو گیا اور اس کے بعد یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔

انسانی اور حیوانی زندگی میں فرق صرف اختیار وارادے اور عقل وشعور کا ہے

میں نے کئی دفعہ عرض کیا ہے کہ یہ جو ارتقا (Evolution) کا سلسلہ ہے' یہ حیوانات کی ایک سطح تک ہے۔اس میں یہ ایک ہی طرح کی زندگی آتی ہے۔حیوانات سے آگے جب زندگی انسان کے پیکر میں آتی ہے تو وہاں ایک بہت بڑا انقلاب آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو صاحبِ عقل وشعور بنایا گیا ہے' صاحبِ اختیار وارادہ بنایا گیا ہے' اس سے پہلے یہ چیز نہیں ہے۔حیوانات کی کتنی ہی اونچی سطح کیوں نہ ہو' یہ عقل وشعور اور اختیار وارادہ وہاں نہیں ہوتا۔انسان کی زندگی میں پہنچنے کے بعد جو پچھلا ارتقائی سلسلہ ہے' اس کے اندر ایک انقلاب آفریں جسے Turning Point کہتے ہیں' آتا ہے' یہاں بالکل نئی زندگی ملتی ہے۔وقت ہوتو میں Explain (تشریح) کروں۔میں نے اپنی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ یہ جو یورپ کی Evolution Theories ہیں' ارتقا کے نظریہ والے ہیں' وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ جب درجۂ حیوانات سے انسانیت کے درجے میں زندگی آئی ہے تو یہاں اس کو Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کہتے ہیں کہ یہ پچھلے سلسلے کے مطابق نہیں ہوتی۔یہ ایک Emergent یا ہنگامی چیز ہوتی ہے اور اسے کچھ اور ہوجاتا ہے۔یوں کہیے کہ بدلے کچھ ایسے کہ اور سے کچھ اور ہو گئے۔یہ دنیا کچھ نہیں' دنیا مرا دل ہے' بدلے کچھ ایسے طور سے کہ بے طور ہو گئے۔

اختیار کی بنا پر احساسِ ذمہ داری کا یہ ملکہ صرف اور صرف انسانی زندگی سے ہی وابستہ ہے

یہاں پہنچنے کے بعد ایک اور ہی طور ہو گیا۔زندگی کا وہ طور کیا تھا؟ اس کے لیے قرآن حمید نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں کہ وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى (53:47) یہاں آنے کے بعد وہ زندگی کی ایک نشت ہے' ابھار ہے' نمود ہے' وہاں بالکل مختلف زندگی کی سطح ہے' وہ

پہلی سطح سے انسان کی بالکل الگ سطح ہے۔ یہاں اس پر ذمہ داری عائد ہوگئی' وہاں اُس پہلی سطح پہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ کوئی کسی شیر کو پھانسی نہیں دیدیتا کہ اس نے ایک آدمی کو پھاڑ کھایا' کوئی کسی سانپ کو ملزم قرار نہیں دیتا کہ اس نے ایک کو ڈس لیا تھا اور وہ مر گیا۔ یہ ان کی ذمہ داریاں نہیں۔ ذمہ داری کا سوال وہاں آتا ہے' جہاں اختیار وارادہ ہوتا ہے اور اسی لیے قرآن حکیم نے جرم کے لیے پہلی شرط یہ قرار دی ہے کہ اس میں اختیار ہو' اس کے اندر دل کا ارادہ شامل ہو تو پھر جرم ثابت ہوتا ہے۔ یہ ہے جو اختیار وارادے سے کیا جائے۔ یہ ہے نئی زندگی جو انسان کو دی ہے اور اسی سے اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے' اسی سے یہ اپنے اعمال کے نتائج کا خود ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ یہ ہے النَّشْاَةَ الْاُخْرٰی (53:47)۔ اور یہاں پہنچنے کے بعد جو ربوبیت ہے وہ ہے کہ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی (53:48) وہ اس کی ربوبیت کرتا ہے' دیتا ہے' اتنا دیتا ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ رہے۔

لفظ اغنیٰ اور تکاثر کا بنیادی مفہوم اور اس کے اثرات

اب یہاں دو الفاظ اغنیٰ اور اقنیٰ آ گئے۔ اغنیٰ تو صرف ضرورت کو پوری کرنے کی بات ہے لیکن آپ نے دیکھا یہ ہے کہ انسان کو اتنا کچھ ملا ہوا ہوتا ہے' اس کے باوجود انسان کی حرص ختم نہیں ہوتی' لالچ ختم نہیں ہوتا' ہوس ختم نہیں ہوتی' وہ اور آگے بڑھتا ہے' تکاثر ہو جاتا ہے' دوسروں سے آگے بڑھنے کے لیے مارا مارا پھرتا ہے اپنے لیے تو زیادہ سے زیادہ دو ہی روٹیاں کیا کم تھیں؟ ہم نے تو دیکھا کہ بڑے بڑے دولتمند' کروڑوں روپے کے مالک کو دو روٹیاں بھی نصیب نہیں ہیں' صحت اتنی بگڑی ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ جو روٹی کے پیچھے ہوتا ہے' پھلکے کے پیچھے وہ پردہ سا ہوتا ہے' وہ پردہ ہوتا ہے وہ دال کے شوربے میں' شوربہ بھی گوشت کا نہیں' دال کا پانی ہے' وہ اس میں روٹی کا پردہ بھگو کر کھا رہے ہوتے ہیں۔ کروڑوں روپے کے مالک ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ یہ چیز ہے کہ نیت نہیں بھرتی۔ یہ کھا رہے تھے اور وہ منشی یا کلرک یا جو منیجر تھا' اس سے باتیں کر رہے تھے کہ اچھا بھئی! وہ فلاں جو شیئرز (Shares) آئے تھے تو اس میں جو Profit (نفع) آیا ہے' کیا وہ تم نے داخل کر دیا ہے یا نہیں؟ اس کے اپنے نصیب میں یہ ہے اور وہ Profit (نفع) جو لاکھوں کا ہے' اس کا حساب کر رہے ہیں۔

لفظ ربوبیت کی بنیادی خصوصیت اور ستارہ پرستی

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن حکیم کی! کہا ہے کہ هُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی (53:48) وہ دیتا ہے' کھانے کو دیتا ہے اور وہ کیفیت پھر پیدا کرتا ہے کہ تمہیں اس کے بعد قلب کا اطمینان نصیب ہو جائے گا ورنہ صرف کھانے کو ملنے کے لیے تو میں نے کہا ہے کہ وہ پھر اگلی بات نصیب نہیں ہوتی۔ ایک اطمینان تو یہ ہے کہ جو بھوک میں ہے' وہ تو فریبِ نفس ہے' وہ اطمینان نہیں ہوتا۔ ایک بے اطمینانی یہ ہے کہ سب

کچھ ملا ہوا ہے اور اس کے باوجود دل ہے کہ وہ اسی طرح سے تڑپتا چلا جا رہا ہے جسے قرآن حکیم یَھِیْمُوْنَ (26:225) کہتا ہے کہ جھوٹی پیاس والا اونٹ ہے، پیاس بجھتی نہیں۔ کہا ہے کہ اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ o حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (102:1-2) دوسرے سے آگے بڑھنے کا جذبۂ محرکہ ہے، اس جذبے کی یہ ہوس اسے لیے چلی جا رہی ہے اور وہ اس سے بھاگے چلا جا رہا ہے۔ کہاں تک چلا جا رہا ہے؟ تا وقتیکہ قبر میں نہیں جا سکتا۔ وہاں (53:48) میں ایسی بات ہے کہ دو چیزیں ربوبیت میں ہیں۔ ایک یہ چیز ہے کہ ضرورت کے مطابق ملے۔ اس کے لیے پریشان نہ ہونا پڑے اور مل جانے کے بعد پھر ہوس اور حرص نہ ہو۔ کیا ہے یہ نظام! باتیں ہم کرتے رہتے ہیں اور یہ سارا کیسے ہوا؟ کہا ہے کہ وَاَنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (53:49)۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان عربوں کے ہاں یہ ایک بت بھی تھا جو ایک ستارہ کا نام بھی ہے، اور عربوں کا ایک قبیلہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ ستارہ پرست قومیں بھی بہت ہوئی ہیں جو ستاروں کو اپنے دیوتا دیویاں مانتے ہیں، یہ ہندوستان والے بھی مانتے ہیں۔ اس طرح سے چاند کو بھی اور سورج کو بھی اور ستاروں کو بھی مانتے ہیں۔ وہاں بھی یہ صائبین وغیرہ قومیں تھیں۔ وہ ستارہ پرست بھی تھیں۔ ان کے ہاں ایک ستارے کی پرستش ہوئی تھی۔ وہ اسے شعریٰ کہتے تھے، شاید وہ زہرا ہو لیکن یہاں تو یہ اور چیز ہے۔

انسانی شعور کی ربوبیت کو اقبالؒ نے لفظ خودی سے تعبیر کرتا ہے

وہ چیز عربی زبان کے اعتبار سے ہے اور وہ بڑی اہم ہے۔ کہا کہ یہ جو انسان کو نئی زندگی ملی ہے، ہم نے کہا ہے کہ پہلی زندگی سے الگ اس میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔ شعریٰ کو عربی زبان کی رو سے لیا جائے تو اس کے معنی شعور کے بھی ہوتے ہیں [1]۔ یہ جو انسان کا شعورِ خویش (Self Consciousness) ہے یہ انسان کی خصوصیت ہے کہ اسے یہ چیز عطا کر دی ہے اور رَبُّ الشِّعْرٰی (53:49) اس کی ربوبیت ہوتی ہے، نشوونما ہوتی ہے۔ صلاحیت تو انسان کے اندر دی جاتی ہے، اس کی اس صلاحیت کی نشوونما ہوتی ہے، پھر انسان کے شعور کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ وہ ہے جسے اقبالؒ خودی کہہ کر پکارتا چلا گیا۔ یہ اپنی ذات کا شعور ہے۔ ''میں'' [2] کا شعور ہے ''میں'' کیا ہوں؟ یہ چیز انسان کے لیے کہی۔ اب یہ بات جو تمہارے ذہن میں آئی تھی کہ یہ سارا کچھ قیامت تک کے لیے ہے، یہاں اس زندگی میں نہیں ہے، کہا کہ اس زندگی میں ہونے کی دلیلیں چاہتے ہو، ثبوت چاہتے ہو؟

اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات قرآن حکیم کے فلسفۂ حیات کی صداقت کا ثبوت قابلِ غور ہے

ابھی میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن حکیم نے اقوامِ سابقہ کی داستانیں بیان کی ہیں اور کہا ہے کہ جاؤ اور جا کر ان کی اجڑی ہوئی

---

[1] اس صورت میں یہ ہے کہ اگر شعر سے مصدر مانا جائے تو اس کے معنی عقل و شعور کے ہوں گے۔

[2] I-am-ness

بستیوں کے کھنڈرات کی اینٹوں پہ لکھی ہوئی ان کی داستانیں پڑھو۔تو یہ اس زندگی کی بات تھی تو یہاں تک آنے کے بعد اس نے کہا کہ یہ چیز ہے کہ یہ یہیں واقع ہوتا ہے: وَاَنَّهٗۤ اَهۡلَكَ عَادَا ۨالۡاُوۡلٰى (53:50) قومِ عاد کی داستانیں قرآن حکیم میں ہیں۔ یہ ہیں عاد اولی اور عاد ثانیہ یعنی پہلی قومِ عاد اور بعد کی قومِ عاد۔ اس قوم کے دو حصے ہیں۔ کہا کہ دیکھو کہ کس طرح ان کو ہلاک کیا گیا۔ آگے کہا کہ وَثَمُوۡدَا۠ فَمَاۤ اَبۡقٰى (53:51) ثمود کو جا کر دیکھو۔ یہ نہیں ہوا کہ ان میں تغیر ہی نہ ہوا' ان کی ہلاکت ہی نہ ہوا' ان کی تباہی ہی نہ ہو۔ جنہوں نے بھی غلط نظام قائم کیا' ان کی بھی یہ کیفیت ہوگی۔ تو اب آپ نے دیکھا کہ وہ جو کہہ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اسی زندگی میں شروع ہو جاتا ہے' اس کا ثبوت دے رہا ہے' اس کے لیے دلائل بہم پہنچا رہا ہے اور وہ ثبوت تو یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے Theoretical گوشے ہوتے ہیں' وہ تو ایسے محسوس ثبوت دیتا ہے جو آنکھوں سے دیکھو اور شعور سے سمجھ لو۔

یہ جتنی قومیں پہلے گزری ہیں' ایک تو یہ سمجھیے کہ قرآنِ کریم نے ان انبیائے کرامؑ کا ذکر بالتفصیل کیا ہے' جن سے اس زمانے کے عرب واقف تھے' ان کے متعلق جانتے تھے' ان قوموں کا ذکر کیا ہے جن قوموں کی بستیاں ان کے گرد و نواح میں تھیں۔ یہ تجارت پیشہ تھے' بہت سیاحت اور سفر کرتے رہتے تھے' ان شاہراہوں پر ان قوموں کی بستیاں تھیں' تو جب یہ گزرتے تھے تو وہاں ان کے متعلق یہ باتیں کرتے تھے۔ یہاں یہ پرانی بستیاں' پرانے مقامات ہیں' لوگ ان کی باتیں کرتے ہیں۔ ہڑپہ' موہنجوداڑو اور ٹیکسلا' اور یہ سارا کچھ' تو خیر ان لوگوں نے عجائب گھر بنا دیا ہے۔ یہ ان عربوں کے ہاں ان کی جو اجڑی ہوئی بستیاں ہیں تو ان کی داستانیں بیان کی جاتی تھیں۔ قرآن حکیم نے اسی لیے انہی انبیائے کرام کا ذکر کیا ہے جن سے یہ لوگ واقف تھے۔ تو جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں اگر ان سے کہا جاتا کہ صاحب! کنفیوژش خدا کا پیغمبر آیا اور اس نے یہ کہا اور اس کی اس زمانے کی قوم تھی' وہ ہلاک ہوگئی تو عرب پوچھیں گے کہ صاحب! یہ تھا کون؟ ہم تو جانتے ہی نہیں ہیں۔ وہ یہ کہتے کہ نہیں صاحب! یونہی صاحب بنا دیا ہے' ہم نہیں جانتے' بحث ہی یہ شروع ہو جاتی' ان کے دل پہ اس تاریخی شہادت کا کوئی اثر ہی نہ پڑتا۔ قرآن کریم نے وہ تاریخی شواہد بیان کیے جن سے وہ واقف تھے' دن رات ان کی باتیں کرتے تھے' ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کے پاس سے گزرتے تھے۔ کہا کہ تم دیکھتے نہیں' تمہیں اتنا ہی معلوم ہے کہ ہاں صاحب! ایک آندھی چلی تھی' یہ تباہ ہو گئے' تمہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ اس لیے تباہ ہوئے کہ یہ محنت کشوں کی محنت کو سلب کر لیا کرتے تھے۔ بس اتنا فرق تھا۔ تاریخ کے محسوس شواہد تو پڑے ہوئے ہیں' وہ دونوں ان کے سامنے تھے شعور کی رو سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا ہے' وہ مختلف ہو جاتا ہے۔

قوموں کی تباہی و بربادی کی اصل وجوہات کی نشاندہی

یہ جسے آپ اس دور کی مادہ پرستی یا سیکولرازم کہتے ہیں' اس میں یہ ساری چیزیں وہ طبعی قانون کے تابع سمجھتے ہیں کہ (مثلاً) اس قوم

سے یہ غلطی ہوئی' یہ Strategic Error (حکمت عملی کی غلطی) ہوگئی' انہوں نے اس قسم کا انتظام نہ کیا۔ان کی یہ نگاہ یہاں تک جاتی ہی نہیں ہے کہ اخلاقی طور پر' انسانیت کے طور پر' انہوں نے کیا کیا جرائم تھے جن کے وہ مرتکب ہوئے اوران کے نتیجے میں یہ تباہی آئی۔ یہ چیز ان کی نگاہ میں نہیں آ رہی۔ وہ یہی چیز تھی کہ نزول قرآن کریم کے زمانے میں نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی تھی۔ وہ نتائج اعمال یا مکافاتِ عمل کا جو قانون تھا' اس پہ ان لوگوں کی نگاہ نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھتے تھے کہ بتوں کو جا کر راضی کیا' ان کی کچھ پرستش کر لی' وہ معاملہ ختم ہوگیا۔ باقی سارے دنیا کے معاملے' وہ بعینہٖ دنیا دار کی طرح ہی طے کرتے تھے۔آج یہی کچھ ہمارے ہاں ہورہا ہے' ہم خود اسی طرح کر رہے ہیں۔ کسی کی نگاہ اس طرف نہیں اٹھ رہی کہ اس نے اپنا کاروباری بندوبست تو کرلیا ہے' مینجمنٹ بڑی صحیح ہے' ایڈمنسٹریشن بالکل ٹھیک ہے' یہ سارے انتظامات کر لیے ہیں اور سمجھ لیا کہ اب تباہی نہیں آئے گی۔ یہ بات کہ انسانیت کا گلا گھٹ رہا ہے' اس کی وجہ سے تباہی آئے گی' کسی کی نگاہ میں نہیں ہوتی۔ یہی بات ان قوموں میں تھی۔ اس نے کہا کہ ان قوموں کے حالات دیکھو۔ اس سے قبل قوم نوح کہا کہ وَقَوۡمَ نُوۡحٍ مِّنۡ قَبۡلُ (53:52) یہ اس سے قبل قوم نوح کیوں تباہ ہوئی یہ کچھ انتظام کی خرابی نہیں تھی۔ وہ اس لیے تھی کہ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰى (53:52) انہوں نے ظلم کیا تھا اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتی تھی۔

قرآن حکیم میں قوانین خداوندی کے الفاظ' جو اپنے اندر ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں' کی وضاحت

میرے درس قرآنِ کریم میں قانونِ خداوندی بار بار آتا ہے۔اسی طرح سے ''اس سے سرکشی برتنا' اس کا اتباع کرنا'' کے الفاظ آتے ہیں۔ جب ہم قانون کا لفظ بولتے ہیں تو وہ بات کچھ لیگلی سی آتی ہے کہ کچھ ایسا قانون' جیسا لا (Law) کا ہوتا ہے کہ بائیں طرف چلو' بس کچھ ذہنوں میں ایسا ہی آتا ہے۔ یہ جنہیں قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے ان سے بات آ گئی مثلاً قانون خداوندی یہ ہے کہ کسی دوسرے کی محنت کو سلب نہ کیا جائے' یہ کیا جائے گا تو تباہی آئے گی۔ اس کی خلاف ورزی نہ کرنا قانونِ خداوندی سے سرکشی برتنا ہے۔ قانونِ خداوندی یہ ہے کہ کسی انسان کی تذلیل نہ کی جائے' کسی کی تحقیر نہ کی جائے' کسی کو ذلیل نہ کیا جائے۔ یہ قانونِ خداوندی ہے۔ جس نظام میں یہ چیز باقی نہیں رہے گی' احترامِ آدمیت نہیں رہے گا' وہ قانونِ خداوندی سے سرکشی برتے گا۔ یہ ہیں وہ قوانین جن سے سرکشی برتنے سے قوموں کی تباہیاں آتی ہیں۔ کہا کہ اس لیے وہ تباہ ہوئیں کہ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا هُمۡ اَظۡلَمَ وَاَطۡغٰى (53:52) وہ ظلم کرتے تھے اور قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے تھے۔ یہ قومِ عاد اور ثمود اور قومِ نوح کا ذکر کیا۔ کہا ہے کہ وَالۡمُؤۡتَفِكَةَ اَهۡوٰى (53:53) جتنی بستیاں بھی تباہ ہوئیں' ویران ہوئیں' وہ تمہارے سامنے آتی ہیں' وہ اس لیے تباہ ہوئی تھیں کہ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى (53:54) ان کے غلط اعمال کے نتائج نے ان کو گھیر لیا تھا' انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ ہے خدا کا قانون۔ وہ پلڑوں والی بات ہے کہ کس قسم کا پلڑا جھکتا ہے؟ اگر وہ تباہی لانے

والا پلڑا ہے تو وہ قوم یا فرد تباہ ہو جاتا ہے۔

میزانِ خداوندی میں انسان کی طرف سے تمام بہتری کے اعمال ظلم واستبداد کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں رکھتے

عزیزانِ من! یہ میزانِ خداوندی میں ہے کہ کسی قوم کا کونسا پلڑا جھکتا ہے؟ اگر ظلم اور استبداد کا پلڑا جھکا ہے تو انہوں نے جو کچھ بہتری کے کام بھی کیے ہیں، سڑکیں بنوائی ہیں، جی! پل بنوا دیئے ہیں، جی! وہ کھیتوں میں ہل چلوا دیئے ہیں، جی! یہ چیزیں بہتری کی ہیں لیکن اس کے مقابلے میں دوسری طرف جو پلڑے کے اندر وہ ظلم اور سلب ونہب کا پتھر آیا ہے، اس ایک پتھر نے اس کو ایسا جھکا دیا کہ یہ کام یا چیزیں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔ یہ چیزیں جو تم نے ظلم اور سلب ونہب اور انسانیت کی تحقیر وتذلیل کی ہیں، یہ اتنے بڑے بڑے پتھر ہیں کہ ان میں سے تو ایک پتھر بھی پلڑے کو جھکا کر زمین میں لے جاتا ہے۔ تو یہ جو حد کے نظام عدل کا فغشٰی ہے وہ دیکھتا رہتا ہے کہ کہاں تک یہ آگے بڑھے ہیں۔ وہ وارننگ دیتا رہتا ہے کہ باز آ جاؤ، اب بھی بچ جاؤ گے۔ اگر تم نے تنبیہہ حاصل کر لی تو رک جاؤ۔ وہ ان سے کہتا رہتا ہے لیکن جب وہ اس پہ کان نہیں دھرتے تو فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (53:54) تو چاروں طرف سے غلط نظام کے تباہ کن نتائج گھیر لیتے ہیں۔ کہا کہ تم میں چھوٹی چھوٹی سی باتیں آتی تھیں تو جھگڑا کرتے تھے کہ نہیں، ہمارا کچھ نہیں بگڑتا، ہم نے پورا انتظام کر لیا ہوا ہے، ایسی کوئی بات نہیں۔ کہا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکَ تَتَمَارٰی (53:55)۔ یہ '' الآء '' کے معنی قوت کے ہیں۔ آگے سورۃ الرحمٰن آتی ہے جہاں ہر آیت کے بعد آتا ہے کہ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ۔ الآء کے معنی نعمت ہی نہیں ہوتے، اس کے معنی قوت کے بھی ہوتے ہیں۔ کہا کہ تم جھگڑتے تو بہت تھے کہ ہم نے بہت انتظام کر لیا ہوا ہے، ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی قوت کو بھی ذرا دیکھو کہ یہ بستی کس طرح تباہ ہوئی۔

جس قوم کا تاریخی حافظہ کمزور ہو جائے وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے

ہم نے تو کبھی ہسٹری پہ غور ہی نہیں کیا، عزیزانِ من! قرآن حمید اسے بڑی اہمیت دیتا ہے The Fall of Roman Empire کی ایک ہسٹری آپ پڑھ لیجیے۔ دیکھیے کہ ان کے وہ Historian (مؤرخ) یہ کس طرح بیان کرتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں تھی کہ ان کے ہاں کوئی انتظامی خرابی آ گئی تھی، ان کے ہاں یہ اخلاقی خرابیاں تھیں جن کو وہ اخلاقی کہتے ہیں، قرآن کریم انہیں اقدار کہتا ہے۔ وہ اقدار کی خرابیاں تھیں جن کی وجہ سے اتنی عظیم قومیں اور تہذیبیں تباہ ہو کر رہ گئیں، ان کے کھنڈرات باقی رہ گئے صاحب! تو کہا کہ کہو خدا کی کس قوت کے متعلق تم جھگڑو گے کہ نہیں صاحب! یہ اس کی قوت نہیں ہے۔ دیکھو تو سہی، ان بستیوں کو اور اس کے بعد کہا کہ یہ جو کچھ

ہم کہہ رہے ہیں' وہ ہے ھٰذَا نَذِیْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰی (53:56) یہ وہی چیز ہے جو پہلے انبیائے کرام کہتے چلے آئے تھے اور وہ آگاہ کرتے چلے آئے تھے' تمہیں وارننگ دیتے چلے آ رہے تھے' وہی وارننگ یہ ہے اور وہ وارننگ اب یہ ہے کہ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ (53:57)۔ پھر وہی بات آ گئی کہ یہ رسول تمہیں (مثلاً) گزشتہ دس پندرہ برس سے یہ کچھ کہہ رہا ہے' تم کان نہیں دھر رہے' وہ آنے والی گھڑی اب آ پہنچی ہے۔ یہ وہی بات ہے جو پیچھے سے چلی آ رہی تھی کہ یہ وحی کا ذکر ہے' وہ ہلاکت کی گھڑی آ پہنچی۔ کہا ہے کہ لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَاشِفَةٌ (53:58) وہ تباہی ایسی ہے کہ خدا کے قانون کے سوا دنیا کی کوئی قوت اس کو روک نہیں سکتی' اس تباہی کو کوئی قوت روک نہیں سکتی۔ ہاں! اگر یہ اب بھی قانونِ خداوندی کا اتباع کر لیں' تو یہ ان سے ٹل سکتی ہے۔ کہا کہ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِیْثِ تَعْجَبُوْنَ (53:59)۔ جب ہم یہ بات کہتے ہیں تو تمہیں اس پہ تعجب آتا ہے کہ اتنی بڑی قوت کی مالک قوم اتنے ان کے انتظامات' اتنے ان کی فوجیں' اتنے ان کے اسلحہ' کیا تم کہتے ہو کہ وہ اس لیے ختم ہو جائیں گی کہ انہوں نے آدمیت کا احترام کھو دیا تھا۔ کیا کہہ رہے ہو؟ کہا کہ کیا تمہیں اس چیز پر تعجب آ رہا ہے اور اس پر یقین نہیں کرتے ہو کہ ایسا ہو کر رہے گا!

کینسر کے مرض میں مبتلا قوم اپنی تباہی کا ادراک نہیں کرتی

یہ پھر وہی بات ہے۔ کیا بات ہے اس کی! کہا ہے کہ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (53:60) تم اس پہ ہنستے ہو جو کہا جاتا ہے۔ کم بختو! روتے کیوں نہیں ہو۔ آہاہا! اس پہ ہنستے کیوں ہو؟ کوئی شخص اپنی موت پہ بھی ہنستا ہے۔ یہ ہے کہ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (53:60) تم اس لیے ہنستے ہو کہ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (53:61) اپنے انجام سے تم غافل ہو۔ جس کو اپنے انجام کا پتہ چل جائے' معلوم ہو جائے کہ یہ کینسر ہے جو مجھے کھا رہا ہے' پھر وہ نہیں ہنستا۔ کہا وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ وارننگ دی ہے تمہیں' اب بھی بچ جانے کا وقت ہے اور اس کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (53:62) صرف ایک خدا کے نظام کی اطاعت اختیار کرو' جھکو اسی کے سامنے' کسی اور کے سامنے نہ جھکو۔ کہا یہ ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں' بچ جاؤ گے' اب بھی ابھی وقت ہے' مہلت (Respite) کا لمحہ ہے' فرصت کا وقت ختم نہیں ہوا ہے اور طریقہ یہ ہے کہ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (53:62) تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جاؤ۔ ان کی اطاعت اختیار کرو تو اس آنے والی تباہی سے بچ جاؤ گے۔ یہ ہے بچ جانے کا طریقہ۔

قرآن حکیم کے مروّجہ تراجم نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا؟

آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے اس پہ کیسے عمل کیا ہوا ہے۔ قرآن شریف میں آپ دیکھیں جہاں یہ ہے۔ یہ چیز کئی مقامات پہ آئی ہے۔ وہاں کنارے پر' حاشیے میں' سجدہ لکھا ہوا ہوتا ہے اور اس کے لیے تلاوت کا حکم ہوتا ہے کہ جہاں یہ آیت آئے تو تلاوت کرتے ہوئے'

قرآن شریف کو ایک طرف رکھ دیجئے' پھر سجدہ دیجیے اور پھر تلاوت کرتے ہوئے آگے چلیے تو وہ جو خدا نے حکم دیا تھا وہ جی! حکم پورا ہو گیا' اس کی تعمیل ہو گئی۔ اب مسئلے شروع ہو گئے کہ آیا وہ سجدہ واجب ہو جاتا ہے' سجدہ فرض ہو جاتا ہے' دو ہونے چاہئیں' ایک ہونا چاہیے پھر اس کے اوپر یہ فَاسْجُدُوْا (53:62) کی تعمیل ہو رہی ہے۔ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (53:62)۔ یہ کہتے ہیں کہ پرستش اسی کی کرو اور وہ کچھ یوں سجدہ کیا اور ہم نے کہا کہ ہم تو اسی کی پرستش کرتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں' روزہ رکھتے ہیں' تلاوت کے وقت میں سجدہ کرتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہاں (53:63) میں کہا یہ گیا ہے کہ ایسا نہ کرو یعنی بدستور سرکشی اختیار نہ کرو' زندگی کو مذاق نہ سمجھو۔ اب بھی وقت ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جاؤ۔ ان کی اطاعت اختیار کرو۔ اس سے تم آنے والی تباہی سے بچ جاؤ گے۔

سورۃ النجم آج ختم ہو گئی' عزیزانِ من! آئندہ درس ہم سورۃ القمر سے شروع کریں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (2:127)

❀......❀......❀

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے' وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے' وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)